DARUL-MUSANNEFIN KI ADBI TASANEEF KA TAHQIQI WA TANQIDI JAIZA

Abstract
THESIS

SUBMITTED FOR THE AWARD OF THE DEGREE OF

Doctor of Philosophy

IN

URDU

Submitted By
Zainab Roquiya

UNDER THE SUPERVISION OF
Dr. Mohd. Zahid

DEPARTMENT OF URDU
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH (INDIA)
2014

دارالمصنفین کی ادبی تصانیف کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ

تلخیص

مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی (اردو)

مقالہ نگار

زینب رقیہ

نگراں

ڈاکٹر محمد زاہد

شعبۂ اردو

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

THESIS

۲۰۱۴ء

تلخیص

تلخیص

دارالمصنفین برصغیر ہند و پاک بالخصوص عالم اسلامی کی دنیا میں محتاج تعارف نہیں، اردو زبان و ادب اور علم و فضل کا ایک اہم ترین ادارہ ہے۔ بلا شبہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے مایہ ناز علمی و تصنیفی ادارہ ہے۔ یہ علامہ شبلی کی علمی، ادبی، تعلیمی اور مذہبی زندگی کی عظیم الشان یادگار اور ان کے تخیل و خواہشات کی زندہ و تابندہ تعبیر ہے۔ دارالمصنفین کا قیام سیرت النبیؐ کی طرح شبلی کی زندگی کا خاتمہ بالخیر ہے، کیونکہ علی گڑھ، حیدرآباد ندوہ کے سلسلہ تعلیمی میں دارالمصنفین سب سے آخر میں قائم ہوا۔ دارالمصنفین کا تخیل علامہ شبلی کے ذہن میں ایک خاص تمثیل کی شکل میں نمودار ہوا۔ علامہ شبلی اپنے عہد کے حالات اور علمی ضروریات کو عہد عباسیہ کے مثل تصور کرتے تھے کیونکہ اس دور میں اسلامی علوم و فنون کو نئے سرے سے ترتیب و تدوین کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی تھی۔ علامہ شبلی نے بھی اپنے عہد میں اسی ضرورت کو محسوس کیا، اور اس کے لئے اپنے خاص باصلاحیت تلامذہ کو تیار کیا، اور پہلی مرتبہ دارالمصنفین کے قیام کا اظہار انھوں نے مارچ ۱۹۱۰ء میں ندوۃ العلماء کے اجلاس دہلی میں کتب خانہ ندوہ کی ضرورت کے سلسلہ میں کیا۔ لیکن ندوہ کے اختلافات کی وجہ سے علامہ شبلی نے ندوہ کی معتمدی سے استعفیٰ دے دیا۔ اپنے چھوٹے بھائی کی وفات پر اپنے وطن اعظم گڑھ تشریف لائے تو یہاں انہیں سکون نظر آیا۔ چنانچہ علامہ شبلی نے اعظم گڑھ میں دارالمصنفین کو قائم کرنے کا فیصلہ کیا اور اپنے شاگردوں اور دوستوں کو اس سے مطلع کیا اور اس کے لئے اپنے ذاتی باغ اور بنگلے اور خاندان کے افراد کی زمینوں کو ان کی مرضی سے دارالمصنفین کے لئے وقف کر دیا۔ دارالمصنفین کے قیام عمل کا یہ کام ابھی دور آغاز ہی میں تھا

کہ کاروان علم وفن کا یہ قافلہ اپنے خواب کو عملی جامہ پہنانے سے پہلے ہی ۱۸/نومبر ۱۹۱۴ء کو اپنے مالک حقیقی سے جاملا۔

علامہ شبلی کی وفات کے تین روز بعد یعنی ۲۱/اکتوبر ۱۹۱۴ء کو مولانا حمید الدین فراہی کی دعوت پر ''اخوان الصفا'' کے نام سے ایک مجلس قائم کی گئی جس کے صدر مولانا حمید الدین فراہی، ناظم مولانا سید سلیمان ندوی، رکن مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا مسعود علی ندوی اور مولانا شبلی متکلم قرار پائے۔ انھوں نے شبلی کے ادھورے کاموں کی تکمیل اور ان کے مشن کو جاری رکھنے کا عہد کیا۔ ۴/جون ۱۹۱۵ء کو دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کے نام سے اس کی رجسٹری ہوئی اور دارالمصنفین کا کام باقاعدہ طور پر شروع ہوگیا۔

دارالمصنفین کے قیام کا مقصد

۱۔ ملک میں اعلیٰ مصنفین اور اہل قلم کی جماعت پیدا کرنا

۲۔ بلند پایہ کتابوں کی تصنیف وتالیف وترجمہ کرنا

۳۔ ان کی اور دیگر علمی وادبی کتابوں کی طبع واشاعت کا انتظام کرنا تھا۔

یہ مقالہ چار ابواب پر مشتمل ہے۔ اس کا پہلا باب ''مختصر تاریخ، فکر اور طریق کار'' کے عنوان سے معنون ہے۔ اس باب میں علامہ شبلی کی تاریخ پیدائش، مغلیہ سلطنت کا زوال، انگریزوں کا ہندوستان پر تسلط، پہلی جنگ آزادی کا ذکر کرتے ہوئے قوم کے تئیں سرسید کی تعلیمی واصلاحی سرگرمیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ انگریزوں کا ہندوستان میں اقتدار حاصل کرنے کے بعد عیسائیت کی اشاعت وتبلیغ اور اسلام کا مٹانے کی کوشش، جانباز علماء کرام کا عیسائیوں کے مقابل آنا، راجہ رام موہن رائے کے ''برہمو سماج'' اور دیانند سرسوتی کی ''آریہ سماج''

THESIS

کی تشکیل، ان تمام چیزوں کا مختصراً ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ سرسید کی قومی و اصلاحی کاموں کا توسیعی انداز میں جائزہ لیا گیا ہے۔ انھوں نے ہندوستانی قوم کی اصلاح، ان میں سیاسی قومی بیداری، جدید علوم وفنون سے آشنائی پیدا کرنے کے لئے سائنٹفک سوسائٹی قائم کر کے اور تہذیب الاخلاق کا اجراء کر کے اپنی تحریک کو فروغ دیا۔ چونکہ سرسید اس کام میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو ساتھ لے کر چلنا چاہتے تھے، نتیجتاً ہندوستانی مسلمان ان کے خلاف ہو گئے۔ سرسید کا ماننا تھا کہ مسلمان مذہب کے سوا ہر چیز میں مغرب سے استفادہ کریں۔ انہیں وجوہات کے بنا پر ان پر کفر والحاد کے فتوے جاری کرائے گئے۔ اس کے علاوہ اس باب میں رفقاء سرسید کا بھی ذکر ہے جنھوں نے ہر محاذ پر سرسید کا ساتھ دیا۔ جن میں شبلی سب سے منفرد اور الگ شخصیت کے حامل تھے۔ یہ ۱۸۸۱ء میں علی گڑھ تشریف لائے اور اپنی صلاحیتوں سے سرسید کو اپنی طرف راغب کر لیا۔ علی گڑھ کالج میں عربی و فارسی کے معلم اور اس کے بعد پروفیسر کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ اس باب میں شبلی کی تصنیفی و تالیفی خدمات کا بھی ذکر کیا ہے۔ سرسید اور شبلی سے اختلافات اور سرسید سے علیحدگی کا بھی ذکر ہے۔ سرسید کی وفات کے بعد مولانا کا کالج سے مستعفی ہو جانا، اور سررشتۂ علوم وفنون کی نظامت پر حیدرآباد میں تقرر ہونا، ۱۹۰۵ء میں حیدرآباد سے مستعفی ہونے کے ساتھ حیدرآباد کے دوران قیام تصانیف کا ذکر ہے۔ ندوہ کی معتمدی اور اس کی اصلاح و تعلیمی ترقی کا بھی ذکر ہے۔ اس کے علاوہ مولانا شبلی کا ندوہ کی معتمدی سے مستعفی ہونے، طلباء کی اسٹرائک اور مولانا پر کفر کے فتوے جاری کروانے پر مختصراً روشنی ڈالی گئی ہے۔ آخر میں دارالمصنفین کے تخیل و قیام، قواعد و ضوابط کا ذکر اس باب میں تفصیلاً کیا گیا ہے۔

دوسرا باب ''اہم رفقاء، شخصیت، افکار اور قلمی آثار'' پر مشتمل ہے۔ اس باب میں

مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا مسعود علی ندوی، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی، مولانا ضیاء الدین اصلاحی کا ذکر مختصر سوانح عمری کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اس باب میں مذکورہ رفقاء کرام کی شخصیت کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی مجموعی تصانیف کا مختصر تعارف کیا گیا ہے۔ ان رفقائے کرام نے دارالمصنفین کی خدمت میں اپنی پوری زندگی کو وقف کر دیا تھا۔ ان رفقائے کرام نے ایک مشن کے تحت کام کیا، ان کی تحریروں کا انداز بیان اوروں کی تحریروں سے منفرد ہوتا ہے جو ان کی صلاحیت وانفرادیت کا پتہ دیتا ہے۔

تیسرا باب ''ادبی تصانیف، تعارف، تنقید، تجزیہ'' کے عنوان سے معنون ہے۔ اس باب میں دارالمصنفین سے شائع ہونے والی اردو ادب سے متعلق ادبی تصانیف کا تعارف کرتے ہوئے تنقید وتجزیہ کیا گیا ہے۔ ان ادبی تصانیف میں شبلی نعمانی کی موازنہ انیس ودبیر، مقالات شبلی، کلیات شبلی، مکاتیب شبلی، مرتبہ سید سلیمان ندوی، سید سلیمان ندوی کی حیات شبلی، عبدالسلام ندوی کی شعرالہند، اقبال کامل، شاہ معین الدین احمد کی مرتب کردہ مقالات سلیمان، مقالات عبدالسلام۔ اس کے علاوہ حیات سلیمان، سید حکیم عبدالحئی کی گل رعنا، سید صباح الدین عبدالرحمٰن کی غالب مدح وقدح کی روشنی میں (دو جلد)، سید سلیمان ندوی کی ادبی تصانیف ایک مطالعہ (اوّل)، سید سلیمان ندوی کی دینی وعلمی خدمات، عبدالرزاق قریشی کی مرزا مظہر جانجاناں اور ان کا کلام، اردو زبان کی تمدنی اہمیت، ضیاء الدین اصلاحی کی مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر یوسف حسین کی اردو غزل، ان تمام ادبی تصانیف کا تعارف کرتے ہوئے ان پر تنقیدی وتجزیاتی انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اختصار سے کام لینے کے باوجود یہ باب کافی طویل ہوگیا ہے۔

چوتھا باب ''ماہنامہ معارف کے اہم ادبی مضامین۔ایک تنقیدی جائزہ'' کے عنوان پر مشتمل ہے۔اس باب میں معارف کے اجراء کا ذکر کیا گیا ہے۔معارف نے اپنے ابتدائی دور میں جو مقالات شائع کئے ان کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔معارف چونکہ ایک علمی رسالہ ہے،اس کے زیادہ تر مضامین علمی و تحقیقی ہوتے ہیں لیکن کافی تعداد میں ادبی مضامین بھی شائع کئے ہیں۔

۱۹۱۶ء سے آج تک معارف میں کافی ادبی مضامین شائع ہوئے ہیں۔ان تمام ادبی مضامین کا تنقیدی جائزہ لینا کافی طوالت بھرا کام ہے۔چنانچہ طوالت کے خوف سے اس باب میں چند اہم ادبی مضامین کا تنقیدی جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے جو حسب ذیل ہیں۔

ارتقائے ادب اردو (ستمبر ۱۹۱۷ء)،نواح دہلی کی اردو کی دو قدیم ترین کتابیں (جنوری ۱۹۴۴ء)،اردو کی دو قدیم کتابیں اور ان کا زمانہ تصنیف (جنوری ۱۹۴۵ء)،اردو شاعری اور سیاست (جنوری فروری ۱۹۵۵ء)،کیا اردو ہماری قومی زبان ہوسکتی ہے (اکتوبر ۱۹۳۴ء)،اردو کے چند مظلوم ادیب (اگست ۱۹۶۲ء)،اردو شاعری میں تخلص کی روایت (نومبر ۱۹۹۱ء)،اردو شاعری پر تبصرہ (جنوری ۱۹۲۲ء)،خانقاہی نظام تعلیم اور اصلاح نسواں (جنوری ۱۹۹۵ء)،اردو ادب کی تاریخ کے لئے ایک نصب العین (اگست ۱۹۴۵ء)،مثنوی گلزار نسیم کے ماخذ (اگست ۱۹۴۶ء)،میر حسن کی ایک نادر مثنوی (اکتوبر ۱۹۴۳ء)،اردو کیوں کر پیدا ہوئی؟ (جولائی ۱۹۳۳ء)،قائم چاند پوری اور ان کا کلام (اپریل،مئی،جون ۱۹۵۲ء)،خواجہ میر درد اور آب حیات (جنوری ۱۹۶۳ء)،مسدس حالی اور شعریت (جولائی ۱۹۸۸ء)،غالب کا مذہبی رجحان (مارچ ۱۹۷۳ء)،مولانا ابوالحسن علی ندوی کی نثر نگاری کی ایک جھلک (ستمبر ۲۰۰۰ء)،اردو صحافت کا ارتقاء (اکتوبر ۱۹۴۲ء)،شاعر کیا ہے (نومبر ۱۹۲۹ء)،اردو شاعری کے متعلق مصحفی کا ایک اہم بیان (دسمبر ۱۹۳۷ء)،مرزا مظہر جانجاناں

کی دوغزلیں، حضرت الاستاذ سید سلیمان ندوی اپنی سیرۃ النبیؐ میں انشا پرداز کی حیثیت سے (فروری ۱۹۸۵ء)، محبت خاں محبت اور ان کا کلام (مئی جون ۱۹۶۴ء)، سید سلیمان ندوی کے اسلوب بیان پر ایک نظر (اپریل ۱۹۵۶ء)، علامہ شبلی کی تنقید نگاری (اپریل مئی ۱۹۸۸ء)، مولانا شبلی نعمانی کا نثری اسلوب (اپریل ۱۹۷۳ء)، علامہ شبلی کی شعر فہمی اور شعر العجم کا ایک مطالعہ (اکتوبر ۱۹۹۳ء)، مولانا سید سلیمان ندوی کی مقدمہ نگاری (ستمبر اکتوبر ۱۹۹۸ء)، اردو کے ادبی رسائل و جرائد کا اہم مسئلہ قارئین (دسمبر ۱۹۹۸ء)، اردو کا سب سے پہلا اخبار (اپریل ۱۹۵۱ء)، اقبال کا پیغام عمل (اپریل ۱۹۵۱ء)، مثنوی اسرار خودی پر ایک نظر (اگست ۱۹۷۸ء)، اقبال کی ایک غزل کا تشریحی تجزیہ (جولائی ۱۹۹۵ء)، علامہ اقبال کی مکتوب نگاری پر ایک نظر (اپریل ۱۹۹۸ء)، ڈاکٹر اقبال کی اردو (مئی ۱۹۲۸ء)۔ ان تمام مضامین کا اس باب میں مختصر طور پر جائزہ لیا گیا ہے۔

ماحصل ''خلاصہ کلام'' پر مشتمل ہے۔ اس حصے میں مجموعی مقالے کو مختصراً طور پر بیان کرتے ہوئے اس کے محاسن و معائب پر حتی الامکان روشنی ڈالنے کی سعی کی گئی ہے۔ یہ حصہ اگرچہ مقالے کا ایک ایک مختصر سا جز ہے لیکن اہمیت کے اعتبار سے یہ کسی دوسرے باب سے کم نہیں۔

کتابیات میں ان کتب و رسائل کا ذکر کیا گیا ہے جن سے مقالے کی ترتیب و تشکیل کے دوران مدد لی گئی ہے۔

Maulana Azad Library
Acc. No.....
Aligarh Muslim University

DARUL-MUSANNEFIN KI ADBI TASANEEF KA TAHQIQI WA TANQIDI JAIZA

THESIS

SUBMITTED FOR THE AWARD OF THE DEGREE OF

Doctor of Philosophy

IN

URDU

Submitted By

Zainab Roquiya

UNDER THE SUPERVISION OF

Dr. Mohd. Zahid

DEPARTMENT OF URDU
ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY
ALIGARH (INDIA)

2014

دارالمصنفین کی ادبی تصانیف کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ

مقالہ برائے پی ایچ۔ڈی (اردو)

نگراں

ڈاکٹر محمد زاہد

مقالہ نگار

زینب رقیہ

شعبۂ اردو

علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، علی گڑھ

۲۰۱۴ء

Maulana Azad Library
Acc. No. T-8888
Aligarh Muslim University, Aligarh

071114

T8888

Centre of Advance Studies
Department of Urdu

ALIGARH MUSLIM UNIVERSITY, ALIGARH-202002 (India)

Dated: 22-2-14

CERTIFICATE

This is to certify that this thesis for the award of Ph.D. degree entitled **"DARUL-MUSANNEFIN KI ADBI TASANEEF KA TAHQIQI WA TANQIDI JAIZA"** by **Zainab Roquiya** is an original research work done under my supervision and has not been submitted for any other degree of this or any other university.

It is now being forwarded for the award of Ph.D. degree in Urdu language and literature.

(Prof. Aqeel Ahmad)
Chairman

(Dr. Mohd. Zahid)
Supervisor

بسم الله الرحمن الرحيم

انتساب

اپنے ابّو اور امّی کے نام

جن کی دعائیں اور محبتیں میری زندگی کا حاصل سرمایہ ہیں

فہرست

	پیش لفظ	i-v
	اظہار تشکر	vi-viii
باب اوّل	: مختصر تاریخ فکر اور طریق کار	۱۔۵۲
باب دوم	: اہم رفقاء شخصیت افکار اور قلمی آثار	۵۳۔۱۱۶
باب سوم	: ادبی تصانیف تعارف، تنقید، تجزیہ	۱۱۷۔۵۵۸
باب چہارم	: معارف کے اہم ادبی مضامین ایک تنقیدی جائزہ	۵۵۹۔۶۵۰
	ماحصل	۶۵۱۔۶۶۴
	کتابیات	۶۶۵۔۶۷۲

پیش لفظ

پیش لفظ

دارالمصنفین برصغیر ہند و پاک بالخصوص عالم اسلامی کی دنیا میں محتاج تعارف نہیں، اردو زبان و ادب اور علم و فضل کا ایک اہم ترین ادارہ ہے۔ بلا شبہ ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے مایہ ناز علمی و تصنیفی ادارہ ہے۔ یہ علامہ شبلی کی علمی، ادبی، تعلیمی اور مذہبی زندگی کی عظیم الشان یادگار اور ان کے تخیل و خواہشات کی زندہ و تابندہ تعبیر ہے۔ دارالمصنفین کا قیام سیرت النبیؐ کی طرح شبلی کی زندگی کا خاتمہ بالخیر ہے، کیونکہ علی گڑھ، حیدرآباد ندوہ کے سلسلہ تعلیمی میں دارالمصنفین سب سے آخر میں قائم ہوا۔ دارالمصنفین کا تخیل علامہ شبلی کے ذہن میں ایک خاص تمثیل کی شکل میں نمودار ہوا۔ علامہ شبلی اپنے عہد کے حالات اور علمی ضروریات کو عہد عباسیہ کے مثل تصور کرتے تھے کیونکہ اس دور میں اسلامی علوم و فنون کو نئے سرے سے ترتیب و تدوین کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی تھی۔ علامہ شبلی نے بھی اپنے عہد میں اسی ضرورت کو محسوس کیا، اور اس کے لئے اپنے خاص باصلاحیت تلامذہ کو تیار کیا، اور پہلی مرتبہ دارالمصنفین کے قیام کا اظہار انھوں نے مارچ ۱۹۱۰ء میں ندوۃ العلماء کے اجلاس دہلی میں کتب خانہ ندوہ کی ضرورت کے سلسلہ میں کیا۔ لیکن ندوہ کے اختلافات کی وجہ سے علامہ شبلی نے ندوہ کی معتمدی سے استعفیٰ دے دیا۔ اپنے چھوٹے بھائی کی وفات پر اپنے وطن اعظم گڑھ تشریف لائے تو یہاں انہیں سکون نظر آیا۔ چنانچہ علامہ شبلی نے اعظم گڑھ میں دارالمصنفین کو قائم کرنے کا فیصلہ کیا اور اپنے شاگردوں اور دوستوں کو اس سے مطلع کیا اور اس کے لئے اپنے ذاتی باغ اور بنگلے اور خاندان کے افراد کی زمینوں کو ان کی مرضی سے دارالمصنفین کے لئے وقف کر دیا۔ دارالمصنفین کے قیام عمل کا یہ کام ابھی دور آغاز ہی میں تھا کہ کاروان علم و فن کا یہ قافلہ اپنے خواب کو عملی جامہ پہنانے سے پہلے ہی ۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء کو اپنے مالک حقیقی سے جا ملا۔

علامہ شبلی کی وفات کے تین روز بعد یعنی ۲۱ر اکتوبر ۱۹۱۴ء کو مولانا حمید الدین فراہی کی دعوت پر ''اخوان الصفا'' کے نام سے ایک مجلس قائم کی گئی جس کے صدر مولانا حمید الدین فراہی، ناظم مولانا سید

سلیمان ندوی، رکن مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا مسعود علی ندوی اور مولانا شبلی متکلم قرار پائے۔ انھوں نے شبلی کے ادھورے کاموں کی تکمیل اور ان کے مشن کو جاری رکھنے کا عہد کیا۔ ۴؍جون ۱۹۱۵ء کو دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کے نام سے اس کی رجسٹری ہوئی اور دارالمصنفین کا کام باقاعدہ طور پر شروع ہوگیا۔

دارالمصنفین کے قیام کا مقصد

۱۔ ملک میں اعلیٰ مصنفین اور اہل قلم کی جماعت پیدا کرنا

۲۔ بلند پایہ کتابوں کی تصنیف وتالیف وترجمہ کرنا

۳۔ ان کی اور دیگر علمی وادبی کتابوں کی طبع واشاعت کا انتظام کرنا تھا۔

یہ مقالہ چار ابواب پر مشتمل ہے۔ اس کا پہلا باب ''مختصر تاریخ، فکر اور طریق کار'' کے عنوان سے معنون ہے۔ اس باب میں علامہ شبلی کی تاریخ پیدائش، مغلیہ سلطنت کا زوال، انگریزوں کا ہندوستان پر تسلط، پہلی جنگ آزادی کا ذکر کرتے ہوئے قوم کے تئیں سرسید کی تعلیمی واصلاحی سرگرمیوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ انگریزوں کا ہندوستان میں اقتدار حاصل کرنے کے بعد عیسائیت کی اشاعت وتبلیغ اور اسلام کا مٹانے کی کوشش، جانباز علماء کرام کا عیسائیوں کے مقابل آنا، راجہ رام موہن رائے کے ''برہموسماج'' اور دیانند سرسوتی کی ''آریہ سماج'' کی تشکیل، ان تمام چیزوں کا مختصراً ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ سرسید کی قومی واصلاحی کاموں کا توسیعی انداز میں جائزہ لیا گیا ہے۔ انھوں نے ہندوستانی قوم کی اصلاح، ان میں سیاسی قومی بیداری، جدید علوم وفنون سے آشنائی پیدا کرنے کے لئے سائنٹفک سوسائٹی قائم کرکے اور تہذیب الاخلاق کا اجراء کرکے اپنی تحریک کو فروغ دیا۔ چونکہ سرسید اس کام میں ہندوؤں اور مسلمانوں کو ساتھ لے کر چلنا چاہتے تھے، نتیجتاً ہندوستانی مسلمان ان کے خلاف ہوگئے۔ سرسید کا ماننا تھا کہ مسلمان مذہب کے سوا ہر چیز میں مغرب سے استفادہ کریں۔ انہیں وجوہات کے بنا پر ان پر کفر والحاد کے فتوے جاری کرائے گئے۔ اس کے علاوہ اس باب میں رفقاء سرسید کا بھی ذکر ہے جنھوں نے ہر محاذ پر سرسید کا

ساتھ دیا۔ جن میں شبلی سب سے منفرد اور الگ شخصیت کے حامل تھے۔ یہ ۱۸۸۱ء میں علی گڑھ تشریف لائے اور اپنی صلاحیتوں سے سرسید کو اپنی طرف راغب کرلیا۔ علی گڑھ کالج میں عربی و فارسی کے معلم اور اس کے بعد پروفیسر کی حیثیت سے تقرر ہوا۔ اس باب میں شبلی کی تصنیفی و تالیفی خدمات کا بھی ذکر کیا ہے۔ سرسید اور شبلی سے اختلافات اور سرسید سے علیحدگی کا بھی ذکر ہے۔ سرسید کی وفات کے بعد مولانا کا کالج سے مستعفی ہو جانا، اور سررشتۂ علوم وفنون کی نظامت پر حیدرآباد میں تقرر ہونا، ۱۹۰۵ء میں حیدرآباد سے مستعفی ہونے کے ساتھ حیدرآباد کے دوران قیام تصانیف کا ذکر ہے۔ ندوہ کی معتمدی اور اس کی اصلاح و تعلیمی ترقی کا بھی ذکر ہے۔ اس کے علاوہ مولانا شبلی کا ندوہ کی معتمدی سے مستعفی ہونے، طلباء کی اسٹرائک اور مولانا پر کفر کے فتوے جاری کروانے پر مختصراً روشنی ڈالی گئی ہے۔ آخر میں دارالمصنفین کے تخیل و قیام، قواعد و ضوابط کا ذکر اس باب میں تفصیلاً کیا گیا ہے۔

دوسرا باب ''اہم رفقاء، شخصیت، افکار اور قلمی آثار'' پر مشتمل ہے۔ اس باب میں مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا مسعود علی ندوی، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی، مولانا ضیاء الدین اصلاحی کا ذکر مختصر سوانح عمری کے ساتھ کیا گیا ہے۔ اس باب میں مذکورہ رفقاء کرام کی شخصیت کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی مجموعی تصانیف کا مختصر تعارف کیا گیا ہے۔ ان رفقائے کرام نے دارالمصنفین کی خدمت میں اپنی پوری زندگی کو وقف کر دیا تھا۔ ان رفقائے کرام نے ایک مشن کے تحت کام کیا، ان کی تحریروں کا انداز بیان اوروں کی تحریروں سے منفرد ہوتا ہے جو ان کی صلاحیت وانفرادیت کا پتہ دیتا ہے۔

تیسرا باب ''ادبی تصانیف، تعارف، تنقید، تجزیہ'' کے عنوان سے معنون ہے۔ اس باب میں دارالمصنفین سے شائع ہونے والی اردو ادب سے متعلق ادبی تصانیف کا تعارف کرتے ہوئے تنقید و تجزیہ کیا گیا ہے۔ ان ادبی تصانیف میں شبلی نعمانی کی موازنہ انیس و دبیر، مقالات شبلی، کلیات شبلی، مکاتیب شبلی، مرتبہ سید سلیمان ندوی، سید سلیمان ندوی کی حیات شبلی، عبدالسلام ندوی کی شعرالہند، اقبال کامل، شاہ معین

الدین احمد کی مرتب کردہ مقالات سلیمان، مقالات عبدالسلام۔ اس کے علاوہ حیات سلیمان، سید حکیم عبدالحیٔ کی گل رعنا، سید صباح الدین عبدالرحمٰن کی غالب مدح وقدح کی روشنی میں (دوجلد)، سید سلیمان ندوی کی ادبی تصانیف ایک مطالعہ (اوّل)، سید سلیمان ندوی کی دینی وعلمی خدمات، عبدالرزاق قریشی کی مرزا مظہر جانجاناں اوران کا کلام، اردو زبان کی تمدنی اہمیت، ضیاء الدین اصلاحی کی مولانا ابوالکلام آزاد، ڈاکٹر یوسف حسین کی اردو غزل، ان تمام ادبی تصانیف کا تعارف کرتے ہوئے ان پر تنقیدی وتجزیاتی انداز میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ اختصار سے کام لینے کے باوجود یہ باب کافی طویل ہوگیا ہے۔

چوتھا باب ''ماہنامہ معارف کے اہم ادبی مضامین۔ ایک تنقیدی جائزہ'' کے عنوان پر مشتمل ہے۔ اس باب میں معارف کے اجراء کا ذکر کیا گیا ہے۔ معارف نے اپنے ابتدائی دور میں جو مقالات شائع کئے ان کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ معارف چونکہ ایک علمی رسالہ ہے، اس کے زیادہ تر مضامین علمی وتحقیقی ہوتے ہیں لیکن کافی تعداد میں ادبی مضامین بھی شائع کئے ہیں۔

۱۹۱۶ء سے آج تک معارف میں کافی ادبی مضامین شائع ہوئے ہیں۔ ان تمام ادبی مضامین کا تنقیدی جائزہ لینا کافی طوالت بھرا کام ہے۔ چنانچہ طوالت کے خوف سے اس باب میں چند اہم ادبی مضامین کا تنقیدی جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے جو حسب ذیل ہیں۔

ارتقائے ادب اردو (ستمبر ۱۹۱۷ء)، نواح دہلی کی اردو کی دو قدیم ترین کتابیں (جنوری ۱۹۴۴ء)، اردو کی دو قدیم کتابیں اور ان کا زمانہ تصنیف (جنوری ۱۹۴۵ء)، اردو شاعری اور سیاست (جنوری فروری ۱۹۵۵ء)، کیا اردو ہماری قومی زبان ہوسکتی ہے (اکتوبر ۱۹۳۴ء)، اردو کے چند مظلوم ادیب (اگست ۱۹۶۲ء)، اردو شاعری میں تخلص کی روایت (نومبر ۱۹۹۱ء)، اردو شاعری پر تبصرہ (جنوری ۱۹۲۲ء)، خانقاہی نظام تعلیم اور اصلاح نسواں (جنوری ۱۹۹۵ء)، اردو ادب کی تاریخ کے لئے ایک نصب العین (اگست ۱۹۴۵ء)، مثنوی گلزار نسیم کے ماخذ (اگست ۱۹۴۶ء)، میر حسن کی ایک نادر مثنوی (اکتوبر ۱۹۴۳ء)، اردو کیوں کر پیدا ہوئی؟ (جولائی ۱۹۳۳ء)، قائم چاند پوری اوران کا کلام (اپریل،

مئی، جون ۱۹۵۲ء)، خواجہ میر درد اور آب حیات (جنوری ۱۹۶۳ء)، مسدس حالی اور شعریت (جولائی ۱۹۸۸ء)، غالب کا مذہبی رجحان (مارچ ۱۹۷۳ء)، مولانا ابوالحسن علی ندوی کی نثر نگاری کی ایک جھلک (ستمبر ۲۰۰۰ء)، اردو صحافت کا ارتقاء (اکتوبر ۱۹۴۲ء)، شاعر کیا ہے (نومبر ۱۹۲۹ء)، اردو شاعری کے متعلق مصحفی کا ایک اہم بیان (دسمبر ۱۹۳۷ء)، مرزا مظہر جانجاناں کی دو غزلیں، حضرت الاستاذ سید سلیمان ندوی اپنی سیرۃ النبیؐ میں انشا پرداز کی حیثیت سے (فروری ۱۹۸۵ء)، محبت خاں محبت اور ان کا کلام (مئی جون ۱۹۶۴ء)، سید سلیمان ندوی کے اسلوب بیان پر ایک نظر (اپریل ۱۹۵۶ء)، علامہ شبلی کی تنقید نگاری (اپریل مئی ۱۹۸۸ء)، مولانا شبلی نعمانی کا نثری اسلوب (اپریل ۱۹۷۳ء)، علامہ شبلی کی شعر فہمی اور شعر العجم کا ایک مطالعہ (اکتوبر ۱۹۹۳ء)، مولانا سید سلیمان ندوی کی مقدمہ نگاری (ستمبر اکتوبر ۱۹۹۸ء)، اردو کے ادبی رسائل و جرائد کا اہم مسئلہ قارئین (دسمبر ۱۹۹۸ء)، اردو کا سب سے پہلا اخبار (اپریل ۱۹۵۱ء)، اقبال کا پیغام عمل (اپریل ۱۹۵۱ء)، مثنوی اسرار خودی پر ایک نظر (اگست ۱۹۷۸ء)، اقبال کی ایک غزل کا تشریحی تجزیہ (جولائی ۱۹۹۵ء)، علامہ اقبال کی مکتوب نگاری پر ایک نظر (اپریل ۱۹۹۸ء)، ڈاکٹر اقبال کی اردو (مئی ۱۹۲۸ء)۔ ان تمام مضامین کا اس باب میں مختصر طور پر جائزہ لیا گیا ہے۔

ماحصل ''خلاصہ کلام'' پر مشتمل ہے۔ اس حصے میں مجموعی مقالے کو مختصراً طور پر بیان کرتے ہوئے اس کے محاسن و معائب پر حتی الامکان روشنی ڈالنے کی سعی کی گئی ہے۔ یہ حصہ اگرچہ مقالے کا ایک ایک مختصر سا جز ہے لیکن اہمیت کے اعتبار سے یہ کسی دوسرے باب سے کم نہیں۔

کتابیات میں ان کتب و رسائل کا ذکر کیا گیا ہے جن سے مقالے کی ترتیب و تشکیل کے دوران مدد لی گئی ہے۔

اظہار تشکر

میں اپنے کو خوش نصیب سمجھتی ہوں کہ مجھے اپنے وطن اعظم گڑھ کے ایک اہم علمی وادبی ادارے کی خدمات کو روشن کرنے اور اس کے کارناموں میں اضافہ کرنے کا موقع فراہم ہوا۔

تعلیمی سفر میں میں نے کئی نشیب وفراز دیکھے۔ موضوع کی وسعت، گھریلو ذمہ داریوں کے باوجود منزل کو پانے کے لئے میں نے انتھک کوشش کی، رات دن ایک کئے، بے حد تھکان ہونے کے باوجود اپنے حوصلے کو بلند رکھا۔ کیونکہ

حوصلے جب بلند ہوتے ہیں　　بڑھ کے منزل سلام کرتی ہے

مذکورہ اشعار کو اپنا نقطہ نظر بنائے رکھا۔ بالآخر منزل تک پہنچ ہی گئی۔

کسی بھی کام کی تکمیل ایک مشکل مرحلہ ہے اور اس کام کی تکمیل میں کسی ایک شخص کا ہاتھ نہیں ہوتا بلکہ بہت سے لوگوں کی حوصلہ افزائی شامل ہوتی ہے۔ میرے مقالہ کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں جن لوگوں کی کرم فرمائیاں شامل ہیں ان سبھی کے لئے سراپا سپاس ہوں۔

شکریہ کے فرائض میں سب سے پہلے اللہ رب العزت کی بارگاہ میں ہدیہ تشکر پیش کرتی ہوں کہ ان کے سایہ رحمت وعنایت کی بدولت میرا یہ مقالہ پایہ تکمیل کو پہنچا۔

والدین اللہ رب العزت کی عطا کردہ سب سے بڑی نعمت ہیں۔ جن کی محبت وشفقت نے میرا حوصلہ بڑھایا اور جن کی دعاؤں نے مجھے میری منزل تک پہنچایا۔

میں اپنے نگراں پروفیسر محمد زاہد صاحب کی ممنون ومشکور ہوں جنھوں نے اس مقالہ کی تکمیل تک قدم قدم پر نہ صرف میری رہنمائی فرمائی بلکہ مختلف مواقع پر میری حوصلہ افزائی بھی کی۔ جن کی شفقت، علمی رہنمائی اور عنایت نے اس جادۂ دشوار کو میرے لئے آسان کردیا۔

استاد محترم عمر اسلم صاحب اصلاحی کا شکریہ ادا کرنے کے لئے میرے پاس الفاظ نہیں۔ بنا صلہ کی

پرواہ کئے انھوں نے میری حوصلہ افزائی کی۔ان کے علمی مشوروں اور اصلاحی تحریروں نے میرے اس مقالہ کو وقار بخشا۔

میرے شوہر شاہد جمال کی بے پایاں خلوص ومحبت شامل حال نہ ہوتی تو شاید یہ مقالہ پایہ تکمیل کو نہ پہنچتا۔ انھوں نے انتہائی مصروفیت کے باوجود مواد کی فراہمی میں میرا تعاون کیا۔ میرے ٹوٹے ہوئے حوصلوں کو ہمیشہ نئی قوت اور توانائی بخشی۔ میری خواہشات کو مقدم رکھتے ہوئے ہر مرحلے میں میرا ساتھ دیا۔ دل کی عمیق گہرائیوں سے میں ان کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔

میں اپنے عزیز بھائی، بھابھی اور بہنوں جن میں مدبر جمال، رابعہ جمال، مبشر جمال، بشریٰ جمال، مزمل جمال، ڈاکٹر ثاقب جمال، ڈاکٹر لائقہ جمال، ڈاکٹر خالد جمال، ڈاکٹر سیما جمال، اپنی بہن نغمہ پروین، نیلم نسرین، مکرمہ عنبر، عائشہ انعم، فاطمہ ارم، کوکب جمال، کوثر جمال، فرحت جمال اور طلعت جمال کا شکریہ ادا کرنا اپنا اخلاقی فرض سمجھتی ہوں۔ جنھوں نے محبت اور خلوص سے ہمیشہ میری ہمت بندھائی اور کسی طرح کی پریشانی کا احساس نہیں ہونے دیا۔

میں اپنے اس مقالے کی تکمیل میں اپنے ابو مرحوم (فادر اِن لا) اور امی مرحومہ (مادر اِن لا) کے لئے صدق دل سے دعا کرتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ وہ دونوں میری تحقیق کی تکمیل اور میرے مستقبل کے لئے فکرمند رہتے تھے اور دعا کرتے رہتے تھے۔لیکن افسوس کہ میری اس کاوش اور اس کے نتیجے کو اپنی محبت بھری آنکھوں سے نہیں دیکھ سکے اور دوران تحقیق ہی مجھ سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گئے۔

شعبۂ اردو کے دیگر اساتذہ کرام کی شکرگزار ہوں جنھوں نے گاہ بہ گاہ میری حوصلہ افزائی فرمائی۔

ناسپاسی ہوگی اگر محترم شارق بھائی، اسلم بھائی، مہتاب بھائی، شاذیہ آپا، منور سلطانہ آپا، زیبا ترنم، طوبیٰ ترنم، روبینہ رفیق، سمیہ آپا، شبانہ ثروت کا شکریہ ادا نہ کروں جنھوں نے مشکل اوقات میں میری مدد و رہنمائی کی۔

مولانا آزاد لائبریری کے اراکین کی بھی ممنون و مشکور ہوں جنھوں نے مواد کی فراہمی میں دلچسپی لی۔ اس کے علاوہ دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کے تمام اراکین خاص طور سے عمیم الصدیق صاحب، کلیم صفات اصلاحی صاحب اور نصیر بھائی کی شکر گزار ہوں جنھوں نے مواد کی فراہمی میں حتی الامکان میری مدد کی اور مفید مشوروں سے نوازا۔

عزیزی ابوطلحہ اور عثمان علی کی بھی تہہ دل سے مشکور ہوں جن کی نیک خواہشات ہمیشہ میرے ساتھ رہیں۔ تمام اعزہ و اقارب کی بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے کچھ نہ کرتے ہوئے بھی میرے لئے بہت کچھ کیا۔

سب سے آخیر میں اپنے ننھے منے بچے صہیب جمال، احسن جمال اور رافع جمال کا تہہ دل سے شکریہ و پیار۔ ان کے معصوم بچپن کو میں نے تحقیق کے نذر کر دیا۔ ان کی شرارتوں نے میرے کام میں مداخلت نہیں کی۔ ان کی مسکراہٹ میری تمام تھکن اور مشکلات کو دور کر کے مجھے میری منزل تک پہنچانے میں کامیاب رہی۔

آخیر میں طیب بھائی کی بھی شکر گزار ہوں جنھوں نے کافی محنت سے اس مقالے کی کمپوزنگ کی۔

زینب رقیہ

باب۔ اوّل

مختصر تاریخ فکر اور طریق کار

باب۔ اوّل

مختصر تاریخ فکر اور طریق کار

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور مسلمانوں کی زبوں حالی:

بانی دارالمصنفین علامہ شبلی نعمانیؒ ۱۸۵۷ء میں پیدا ہوئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب مغل سلطنت کا آفتاب اپنی سوا تین سو سالہ ضیاء پاشیوں کے بعد افق ہند سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا تھا اور انگریزوں کا تسلط اس ملک پر مکمل طور سے ہوگیا تھا۔ برطانوی سامراج نے اس ملک کو دونوں ہاتھوں سے لوٹنا شروع کردیا تھا۔ ان کی اس پالیسی کو جب یہاں کے اصل باشندوں نے اچھی طرح سمجھ لیا تو وہ متحد ہوکر ان کے خلاف صف آراء ہوگئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزوں نے پورے ہندوستان کو انتقامی آگ کے شعلوں کے حوالے کردیا۔ معصوم و بے گناہ انسان ظلم و بربریت کا شکار ہوئے اور غم و یاس کی گھٹا چاروں طرف چھا گئی۔ ۱۸۵۷ء کی اس جنگ کو جہاں انگریزوں نے غدر کے نام سے تعبیر کیا وہیں ہندوستانیوں سے اسے پہلی جنگ آزادی کا نام دیا۔

آزادی کی اس پہلی کوشش کے بعد ہندوستان کی جو حالت زار سامنے آئی وہ کسی بھی حساس دل پر اثر کرنے کے لئے کافی تھی۔ چونکہ اس جنگ آزادی میں مسلمان پیش پیش تھے اس لئے انگریزوں نے سب سے زیادہ اپنے عتاب کا شکار انہیں کو بنایا۔ علاوہ ازیں چونکہ انگریزوں نے حکومت براہ راست مسلمانوں سے چھینی تھی اس لئے وہ مسلمانوں کو زیادہ نفرت سے دیکھتے تھے۔ ان کو بطور خاص ظلم و بربریت کا نشانہ بنا رہے تھے۔ اور ان کے جان و مال کو تلف کرنے کے ساتھ ان کی قومی و مذہبی شناخت کو بھی نیست و نابود کررہے تھے۔ ان کی تاریخی و تہذیبی روایات کو مٹا دینے پر یکسر آمادہ تھے۔ مسلمانوں کے ان برے حالات کا ذکر مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے اس طرح کیا ہے:

''اور یہ وہ معرکہ تھا جس میں ملک ہندوستان میں شوکت اسلام بالکل زائل

ہوگئی تھی، اور مغلیہ سلطنت کے جسم کی جان نکل گئی تھی اور کارخانہ اسلام کا تہہ و بالا ہوگیا تھا۔ مسلمان ہونا ہی جرم ہوگیا تھا۔ اکابرین کا خاتمہ ہوگیا تھا، ہر مسلمان سراسیمہ تھا۔ ہر مومن شکستہ دل تھا، ہندوستان میں ایسی گہری اندھیری چھائی تھی، نہ میں تجھ نہ تو مجھ کا حال تھا، یا نفسا نفسی کا مقال تھا، جتنا جو بڑا تھا اتنا ہی بڑا اس پر صدمہ تھا، اکثر اکابرین جنت الفردوس کو سدھارے اور بعض جو پنجۂ اجل سے بچے اس ملک سے ہجرت فرما گئے۔ ہندوستان میں اسلام پر قریب قریب اسی کے صدمہ عظیم واقع ہوا تھا جیسے حضرت رسول مقبول ﷺ کی وفات شریف پر کل اسلام پر مسلمانوں کی قلت، کفار کی کثرت، کفر کی شدت، بظاہر یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ دین نسیاً نسیاً ہو جائے گی۔''[۱]

ہندوستانیوں کی یہ پہلی جنگ آزادی جو ایک طرف ہندوستان کی تاریخ کا دردناک باب ہے، تو دوسری طرف ہماری سماجی تاریخ کا سنگ میل بھی ہے۔ چنانچہ ایک طرف اگر یہ صورت حال تھی کہ ہندوستان کی تاریخ ہر لحاظ سے نیا لبادہ پہن رہی تھی۔ قدیم کے مقابلے میں جدید کو فوقیت حاصل ہو رہی تھی تو دوسری طرف مسلمانوں میں آگے بڑھنے کی ہمت وصلاحیت دم توڑ چکی تھی۔ ان میں پیچھے پلٹنے کی ہمت تک نہ تھی۔ پھر بھی چونکہ وہ ماضی کی قدیم عظمت کو زندگی کا قیمتی اثاثہ سمجھتے تھے اس لئے اسی کو مڑ کر دیکھتے اور اسی پر فخر کرتے تھے۔ قدسیہ خاتون نے اس کا ذکر کچھ اس طرح کیا ہے:

''مسلمان اس وقت بری طرح ٹھوکر کھا کر اندھیرے کنویں میں جا گرے تھے اور ان کا حال تاریک اور مستقبل نظروں سے اوجھل تھا۔ سرسید نے غدر کی دردناکیوں اور ان کی تمام تباہیوں کو اس کے قلب میں رہ کر قریب سے اور بہت غور سے دیکھا تھا۔ وہ نہایت حساس دل رکھتے تھے۔ چنانچہ ملک وقوم کی اس بربادی پر تڑپ اٹھے مگر اس پرآشوب زمانے میں جس ہمت اور ذہن کی

۱۔ مناظر احسن گیلانی، حیات قاسمی، جلد دوم، ص ۹۸، بحوالہ سوانح مخطوط مصنف مولانا قاسم، بحوالہ دارالمصنفین اعظم گڑھ کی ادبی خدمات، خورشید نعمانی، ص ۱۸۔۱۹

رسائی سے انھوں نے کام لیا وہ لائق تحسین ہے۔ ان کے اندر ایک مصلح اور مفکر بیدار ہوگیا۔ اور وہ قوم کے مرثیہ خواں ہونے کے بجائے اس کی راہبری کے لئے تیار ہوگئے۔ انھوں نے قوم کو بربادی کے غار سے نکالنے کا پختہ عزم کرلیا۔ مسلمانوں کی اس بربادی کی بنیادی وجوہات پر غور وخوض کیا اور اس عظیم تباہی کی بنیادوں کو سمجھتے ہوئے ملک وقوم کی ترقی کے لئے علمی قدم اٹھانا شروع کیا۔ یہیں سے سرسید کی زندگی کا وہ اہم دور شروع ہوتا ہے۔ جب کہ وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ حد سے بڑھی ہوئی جہالت نے لوگوں میں سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو مفقود کردیا ہے۔ قدیم طرز تعلیم رائج ہے۔ وہ نئے تقاضوں کو پورا نہیں کرتا بلکہ اس میں مکمل جمود آچکا ہے۔ سرسید نے اچھی طرح سمجھ لیا تھا کہ اگر زمانے کی تیز رفتاری کا ساتھ نہ دیا تو ہم معدوم ہوجائیں گے۔''[۱]

سرسید نے نامساعد حالات کے سامنے سپر ڈالنے سے انکار کردیا اور فیصلہ کیا کہ اپنی قوم کو ذلت و نکبت سے نکالنے میں زندگی کی آخری سانس تک صرف کردیں گے۔ چنانچہ انھوں نے قوم کی اصلاح کا پختہ عزم کیا اور اس یاس و ناامیدی کو جس کے سبب وہ وطن سے کوچ کرجانے کا فیصلہ کرچکے تھے، اپنے دماغ سے نکالا اور ایک نئے عزم کے ساتھ سرگرم عمل ہوگئے۔

سرسید کا خیال تھا کہ ملک وقوم کی ترقی وخوش حالی اعلیٰ تعلیم پر منحصر ہے۔ اعلیٰ تعلیم سے انسان کے اندر صلاحیت پیدا ہوتی ہے اور شعور آگہی آتی ہے۔ یہ شعور وآگہی اور صلاحیت ہی انسان کی صحیح طور پر رہبری کرتی ہے اور قوم کو باعزت بناتی ہے۔ علم وفن میں ترقی یافتہ قوم کبھی غلام ومحکوم نہیں ہوسکتی۔ بلکہ عزت وسربلندی کے منازل طے کرتی ہوئی منزل مقصود کی جانب گامزن رہتی ہے۔ سرسید نے اپنے اسی تصور کے تحت قوم کی اعلیٰ تعلیم کو وقت کا اہم ترین تقاضہ اور قومی ترقی کا بنیادی عنصر تصور کیا۔ مگر مشکل یہ تھی کہ شکست وریخت کی اس کیفیت کو فرو کئے اور حکومت کے عتاب کو ٹھنڈا کئے بغیر یہ اہم کام انجام نہیں پاسکتا تھا۔ اسی لئے ان کی خواہش اور کوشش تھی کہ پہلے لوگوں میں انگریزوں سے جو خوف ونفرت ہے وہ ختم ہو۔

۱۔ سرسید کی ادبی خدمات اور ہندوستان کی نشاۃ ثانیہ، قدسیہ خاتون، ص ۱۲۵۔۱۲۶

ساتھ ہی قوم کو نئے حالات میں حکمت پر مبنی سیاست سے آگاہی ہو۔

اسی لئے سرسید نے سب سے پہلے دشوار اور خطرناک کاموں کا بیڑا اٹھایا۔ انھوں نے ۱۸۵۹ء میں ''اسباب بغاوت ہند'' لکھی اور پہلی بار سیاست میں دخل کو ہندوستانیوں کا حق بنا کر پیش کیا۔ اسباب بغاوت ہند میں سرسید نے برطانوی حکومت پر جیسی بے باکانہ تنقید کی ہے اور بغیر کسی لاگ لپیٹ کے ہندوستانیوں کے حقوق پیش کئے وہ بے نظیر ہے۔ اس میں انھوں نے مسلمانوں پر بغاوت کے تمام تر الزامات کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی اور یہ ثابت کیا کہ بغاوت کے ذمہ دار مسلمان نہیں خود انگریزوں کی غلط پالیسی تھی۔ یہ ان کی معرکۃ الاراء تصنیف ہے جو ہندوستان میں سیاست کی پہلی کڑی کہی جاسکتی ہے اور جو مصنف کی ہمت و جرأت اور بلند سیاسی شعور کا بین ثبوت ہے۔ ان کی یہ کاوش ہندوستانی تاریخ میں آب زر سے لکھنے کے لائق ہے۔ اس کے علاوہ سرسید نے ایک اور رسالہ ''خیر خواہان مسلمانان'' لکھ کر انگریزوں اور مسلمانوں کے دلوں کی نفرت اور غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش کی۔

سرسید ایک حساس اور زمانہ شناس انسان تھے۔ ان کو اس بات کا احساس اچھی طرح ہوگیا تھا کہ انگریز قوم ہم پر پوری طرح حاوی ہوچکی ہے۔ ہم اپنی منزل سے بہت دور ہوگئے ہیں اور اپنی عظمت تو کجا اپنی شناخت بھی کھو چکے ہیں۔ اس کھوئے ہوئے وقار و اعتماد کو بحال کرنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ مسلمان جدید علوم سے آراستہ ہوں اور عہد نو کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لائق بنیں۔ سرسید جدید مغربی تعلیم کے حصول کے لئے انگریزوں سے دوستانہ تعلق ضروری سمجھتے تھے۔ کم از کم اتنے دنوں کے لئے جب تک قوم اعلیٰ تعلیم سے مزین اور ذہنی و اخلاقی تربیت سے آراستہ نہ ہوجائے اور قوم اس قابل نہ ہوجائے کہ ترقی و آزادی کی راہ اپنے بل بوتے پر طے کرسکے۔

سرسید کی یہ خواہش تھی کہ ان کی قوم اعلیٰ تعلیم اور بہترین تربیت سے آراستہ ہو۔ اس کے لئے وہ مستقل انگریزوں سے دوستی و ہمدردی کا اظہار کرتے رہے اور ہر اس چیز کی مخالفت کرتے جو ان کی انگریز دوستی کی راہ میں حائل ہوتی۔ چونکہ سرسید کا اصل مقصد اعلیٰ تعلیم اور بہترین تربیت سے ہندوستان میں اسلام اور مسلمانوں کے مستقبل کو بہتر بنانا اور ایک معزز قوم کی حیثیت سے ان کا تعارف کرانا اور انہیں تحفظ فراہم کرنا تھا۔ اس لئے انھوں نے اعلیٰ تعلیم و تربیت کے حصول میں ہر مخالف چیز کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔

کانگریس کی مخالفت بھی انھوں نے اسی بنا پر کی تھی۔ سرسید کا یہ خیال تھا کہ ابھی ہماری تعلیمی حالت اور ذہنی تربیت اس درجہ کی نہیں ہے کہ ہم انگریز جیسی ترقی یافتہ علوم وفنون سے آراستہ قوم سے اعلانیہ طور پر ٹکر لیں۔ کیونکہ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے ہمیں انہیں کے علوم وتمدن سے استفادہ کرنا ہے۔ سرسید کا خیال تھا کہ جب قومی تنظیم اعلیٰ تعلیم، ذہنی واخلاقی تربیت اتحاد کی بنیادوں پر ایک بار درجۂ تکمیل کو پہنچ جائے تو پھر کوئی طاقت اس قوم کو غلام نہیں بنا سکتی اور مضبوط ہندوستانی قوم اپنی راہ خود نکال لے گی۔ چنانچہ اپنے اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے انھوں نے جو منصوبہ بنایا اور جو تحریک شروع کی وہ بہت وسیع اور ہمہ گیر تھی۔ مسلمانوں کی قومی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے ان کی سماجی، مذہبی، اخلاقی اور تعلیمی اصلاح کا جو بیڑا اٹھایا علی گڑھ تحریک اس کی عملی صورت ہے۔ اس تحریک کے دائرے میں سیاست، معاشرت، معیشت، مذہب، تعلیم، ثقافت الغرض زندگی کے تمام اہم شعبوں کی ترقی شامل تھی۔ ان کے پیش نظر یہ بات ہمیشہ رہتی تھی کہ مسلمانوں کی اصلاح ملک کی تعمیر وترقی کے لئے ناگزیر ہے۔ بقول قدسیہ خاتون:

> ''چنانچہ انھوں نے مسلمانوں کی اس قومی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے ان کی سماجی، مذہبی، اخلاقی اور تعلیمی اصلاح کا جو بیڑا اٹھایا علی گڑھ تحریک اس کی عملی صورت ہے، اور اس میں شک نہیں کہ علی گڑھ تحریک ہی وہ پہلا چراغ راہ ہے جس نے انیسویں صدی میں ہندوستانی مسلمانوں کو مستقبل کی طرف نئی روشنی دکھائی۔ اس قافلے کو آگے بڑھانا اور اپنی راہ میں چراغ روشن کرنا سکھایا۔ اور اس طرح ہندوستان کی نشاۃ ثانیہ میں جس کا افق ایک صدی قبل ابھر چکا تھا مسلمانوں کی تاریخی اور سماجی حیثیت متعین کردی۔ یہی علی گڑھ تحریک وہ ہمہ گیر تحریک تھی جس نے دور بیداری میں آگے بڑھنا اور وقت کے تقاضوں کو پورا کرنا سکھایا۔'' [۱]

اس طرح سرسید نے رفتہ رفتہ اپنی اصلاحی کوششوں کو ملک گیر تحریک بنا کر اپنے مقصد کی راہ ہموار کرلی۔

۱۔ سرسید کی ادبی خدمات اور ہندوستان کی نشاۃ ثانیہ، قدسیہ خاتون، ص ۱۸۰

دوسری طرف ہندوستان میں برسراقتدار آنے کے بعد عیسائیت کی اشاعت کے لئے انگریزوں نے اپنی تہذیب وتمدن اور سیاست ومعاشرت کی بنیادیں مضبوط کرنی شروع کردیں۔ ان کے نزدیک زیادہ مفید حربہ تھا کہ تقریر، تحریر اور بحث ومباحثے کے ذریعے دیگر مذاہب خاص طور پر اسلام کی خامیاں ثابت کی جائیں تاکہ مسلمان اپنے مذہب سے متنفر اور بیگانہ ہوجائیں اور عیسائیت کو واحد سچے دین کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔ انگریزوں کے علاوہ اور بھی بہت سی تحریکیں مسلمانوں کو ان کے مذہب سے دور کرنے کے لئے جاری تھیں جس میں عیسائی مشنریاں بھی شامل تھیں۔ جنھوں نے اپنی نئی سیاسی طاقت کے زور پر اسلام پر ناروا حملے شروع کردیئے۔ اہل یورپ کی ملکی فتوحات کی وسعت کے ساتھ ساتھ عیسائی مبلغین کی تبلیغی سرگرمیاں بھی روزافزوں ترقی پذیر تھیں۔ ان تبلیغی سرگرمیوں کا اصل مقصد ہندوستان میں عیسائی حکومت کے زیر سایہ ایک سچے مسیحی کلیسا کی بنیاد تھا۔ اس دور کے عیسائی حکمراں جنھوں نے ہندوستان کے جنوب مشرقی علاقے میں اپنا اقتدار قائم کرلیا تھا۔ وہ دین اور سیاست کو ایک دوسرے سے الگ تصور نہیں کرتے تھے۔ چنانچہ مغرب سے آئے ہوئے اولین انگریز حکمراں اچھے حاکم اور پرجوش عیسائی مبلغ بھی تھے۔ اس لئے ان عیسائی مشنریوں کی تبلیغی کوشش اتنی بے ضرر نہ تھیں جتنا کہ ان کو سمجھ لیا گیا تھا۔ ان مبلغین کی تبلیغی سرگرمیوں سے ہندوستان میں رائج شدہ تمام ادیان ومذاہب کو خطرہ پیدا ہوگیا تھا۔ مگر خاص طور سے اسلام پر عیسائی مشنریوں کی زد زیادہ سخت اور گرفت زیادہ مضبوط تھی۔ وہ مسلمانوں کے مذہب وعقیدے پر وار کرتے اور اسلام اور مسلمانوں کی تصویر کو مسخ کرکے عوام کے سامنے پیش کرتے۔ اپنی تحریر وتقریر کے ذریعہ وہ اسلام سے متعلق بے بنیاد پروپیگنڈے اتنی عیاری وہوشیاری سے کرتے کہ کم فہم لوگ شکوک وشبہات میں مبتلا ہوجائے۔ عیسائی مشنریوں کو یہ امید تھی کہ مسلمانوں کی سیاست ختم ہوتے ہی ان کا مذہبی انحطاط بھی شروع ہوجائے گا اور اسلام کو ماننے والے عیسائیت کو قبول کرلیں گے۔ اس طرح مسلمانوں کے سیاسی اور مذہبی تشخص کو یکسر پامال کردینا آسان ہوجائے گا۔ جس سے وہ کبھی سر اٹھا کر بات کرنے کے قابل نہیں رہیں گے اور انگریزوں کا اقتدار ہمیشہ کے لئے ہندوستان میں قائم ہوجائے گا۔ اس مقصد میں کامیابی کے لئے مسلمانوں کو ان کے مذہب سے متنفر اور اسلامی اقتدار کو بالکل مٹا دینا ضروری سمجھا گیا تھا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ اس کا جائزہ اس طرح لیتے ہیں:

''اسلام اور عیسائیت سامی الاصل مذاہب تھے اور دونوں کی بنیادی اصطلاحات کسی حد تک متحد اور باہم مانوس ہونے کے علاوہ دونوں کے ارکان کا معتد بہ حصہ باہم مشترک بھی تھا۔ اس لئے اوروں کے مقابلے میں مسلمانوں کو مغالطے میں ڈالنے کی کوشش زیادہ کامیاب نہ ہوسکی تھی۔ اس کے علاوہ یہ ایک سیاسی حربہ بھی تھا۔ کیونکہ ہندوستان میں اسلامی حکومت کے اثرات کو دور کرنے کے لئے یہ بے حد ضروری سمجھا گیا کہ مسلمانوں کے دینی اور مذہبی احساس کو جہاں تک ممکن ہو مٹا دیا جائے تاکہ دینی تنظیم کی ابتری کے ساتھ ان کی سیاسی یکجہتی بھی ختم ہو جائے۔'' [۱]

اس کے علاوہ عیسائی مبلغین کے سامنے اس صدی کا سب سے خطرناک منصوبہ یہ تھا کی عیسائی پرچم کے زیر سایہ اور بوقت ضرورت عیسائی تلواروں کے بل بوتے پر ہندوستان سے اسلام کا نام ونشان مٹا دیا جائے اور مسلمانوں کے وجود کو ختم کر دیا جائے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں دین حنیف کی حفاظت کی ہے اور دشمنوں سے نبرد آزما ہونے کے لئے ہر دور میں جانباز شخص پیدا کئے ہیں جنھوں نے اپنے دشمنوں کا جم کر مقابلہ کیا۔ اس عہد میں بھی یہی ہوا۔ متعدد دانش ور منظر عام پر آئے اور عیسائیوں کو خود ان ہی کے تحریری حوالوں سے دندان شکن جواب دیا اور ان کے ہوائی قلعوں کو پوری طرح مسمار کر دیا۔ مولانا سید سلیمان ندوی حیات شبلی میں لکھتے ہیں:

''خدا نے عیسائیوں کے مقابلہ کے لئے مولانا رحمت اللہ صاحب کیرانوی، ڈاکٹر وزیر خاں صاحب (آگرہ) اور اس کے بعد مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی، مولانا رحم علی صاحب بنگلوری، مولانا عنایت رسول صاحب چریا کوٹی، مولانا سید محمد علی صاحب مونگیری (سابق ناظم ندوۃ العلماء) وغیرہ اشخاص پیدا کئے۔ جنھوں نے عیسائیوں کے تمام اعتراضات کے پرزے اڑا دیئے اور خصوصیت کے ساتھ ڈاکٹر وزیر خاں صاحب اور مولانا رحمت اللہ

۱۔ سرسید اور ان کے نامور رفقاء کی نثر کا فنی وفکری جائزہ، ڈاکٹر سید عبداللہ، ص ۲۶

صاحب کیرانوی کا وجود تو ردّ عیسائیت کے باب میں تائید غیبی سے کم نہیں۔ اور کون باور کر سکتا تھا کہ اس وقت میں پادری فنڈر کے مقابلہ کے لئے ڈاکٹر وزیر خاں جیسا آدمی پیدا ہوگا جو عیسائیوں کے تمام اسرار کا واقف اور ان کی مذہبی تصنیفات کا ماہر، کامل اور عبرانی و یونانی کا ایسا واقف ہوگا جو عیسائیوں کو خود انہی کی تصانیف سے ملزم ٹھہرائے گا اور مولانا رحمت اللہ صاحب کے ساتھ مل کر اسلام کی حفاظت کا ناقابل شکست قلعہ دم کے دم میں کھڑا کر دے گا۔'' [۱]

ان جانباز علماء کرام نے عیسائی مبلغین کی ان سرگرمیوں اور بے بنیاد باتوں کا اپنی تحریر و تقریر کے ذریعہ جم کر مقابلہ کیا اور ان کے ناپاک ارادوں کو خاک میں ملا دیا۔ مشنریوں کے ان خطروں کا مقابلہ چہار دیواری کے اندر بیٹھ کر کتابیں لکھنے سے نہیں ہو سکتا تھا۔ ڈاکٹر محمد اکرام رقمطراز ہیں:

''یہ لوگ شاہراہوں اور چوکوں میں کھڑے ہو کر لکچر دیتے۔ پمفلٹ تقسیم کرتے، مناظرے کی دعوت دیتے اور انہیں کوئی شکار مل جاتا۔ ضروری تھا کہ جو ہتھیار یہ لوگ استعمال کرتے تھے انہیں سے ان کا مقابلہ کیا جائے۔ چنانچہ مولانا رحمت اللہ مرحوم، مولوی آل حسن، ڈاکٹر وزیر خاں، مولوی سید ناصر الدین، مولانا محمد قاسم اور دوسرے بزرگوں نے اسی طرح ان کا مقابلہ کیا۔ ان سے بالمشافہ مناظرے کئے۔ ان کے مقابلے میں کتابیں لکھیں، پمفلٹ تقسیم کئے اور یہ بھی انہی بزرگوں کی کوشش تھی کہ جس سے کہ عام مسلمانوں میں مشنریاں کامیاب نہ ہوئیں۔'' [۲]

عیسائی مشنریوں کی مذہبی سرگرمیوں کی وجہ سے جہاں مسلمانوں میں فرقہ بندی کی بیماری در آئی وہیں ہندوؤں میں بھی مذہب کے بارے میں نئے طریقے سے تلاش و جستجو کا جوش پیدا ہوا۔ بنگال میں راجہ رام موہن رائے نے سب سے پہلے ہندو مذہب کی اصلاح کے بارے میں غور و خوض کیا اور ہندو دھرم کی

۱۔ حیات شبلی، دیباچہ، سید سلیمان ندوی، ص ۱۰

۲۔ موج کوثر، ڈاکٹر محمد اکرام، ص ۱۵۷

قدیم روایات ''سناتن دھرم'' سے الگ ہوکر ایک نئے خیال کی تجویز پیش کی جس کا بنیادی عقیدہ یہ تھا کہ سارے مذہب اصلاً ایک ہیں۔ اپنی اس تجویز میں سب سے زیادہ نمایاں انھوں نے اس پہلو کو کیا کہ ویدوں کی تعلیم بھی توحید ہی ہے۔ ان کی اس کوشش کا بنیادی سبب یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کا وہ اختصاص ختم کیا جائے جو ان کا تعلیم توحید کے حوالہ سے تھا۔ چنانچہ راجہ رام موہن رائے نے ویدک مذہب کی وضاحت واشاعت کے لئے ''برہمنیکل میگزین'' جاری کیا اور ۱۸۲۸ء میں ''برہموسماج'' کی بنیاد رکھی۔ راجہ رام موہن رائے کا خیال تھا کہ ویدوں کی تعلیم کی تجدید ہندوستانی سماج کی اصلاح اور جدید ہندوستان کی تعمیر میں اہم رول ادا کرے گی۔ انھوں نے اپنے مذہب کو سچے مذہب کے طور پر پیش کیا اور ہندوؤں میں ایک نئی روح پھونک دی۔ ان کی تحریک مغرب کی لڑائی کو تسلیم کرتے ہوئے اس کے بتائے ہوئے تمام طریقوں کو اپناتے ہوئے مکمل انگریز دوستی اور انگریز وفاداری کے ساتھ نئے سماج کی تشکیل میں سرگرم عمل ہوئی۔ راجہ رام موہن رائے کی تحریک کے کچھ ہی عرصہ بعد پنجاب میں سوامی دیانند سرسوتی نے ہندو عصبیت کی روح کو بیدار کرنے کے لئے ''آریہ سماج'' کی تشکیل کی۔ اس سماج کے ارکان بڑے ہی متحرک اور فعال تھے۔ انھوں نے اپنے مذہب کی اشاعت کے لئے ہر جگہ اپنے قاصد اور واعظ پھیلا دیئے۔ قریہ قریہ گھوم گھوم کر اپنے مذہب کی تبلیغ کرتے۔ ایک طرف اس مذہب کے ذریعہ یہ بتایا جاتا کہ اس کی تعلیمات دنیا کی بہترین تعلیمات ہیں۔ یہ مذہب اخلاقی اور روحانی اقدار کا بہترین سرچشمہ ہے۔ دوسری طرف غیر ہندو مذہب پر تنقید کے ذریعہ ہندو مذہب کی برتری کا احساس پیدا کیا۔ اس تحریک کی زد عیسائیت کے علاوہ اسلام پر بھی پڑی۔ وہ اسلامی تعلیمات کو بگاڑ کر پیش کرتے اور اسلام پر نکتہ چینی کرتے۔ نتیجتاً مختلف مذاہب کے پیروکاروں میں مناظرہ کی ایک صورت پیدا ہوگئی۔ اہل اسلام میں مناظرہ کرنے والوں کا جو حلقہ پیدا ہوا اس میں مولانا محمد قاسم نانوتویؒ، مولانا رشید احمد گنگوہیؒ اور مولانا ثناء اللہ امرتسری کے نام سرفہرست ہیں۔ انھوں نے مناظروں کے ذریعہ تمام مذاہب پر اسلام کی برتری کو ثابت کیا اور نہایت جامع انداز میں ان کی غلط بیانیوں اور تہمتوں کا جواب دیا۔ مولانا سید سلیمان ندوی رقمطراز ہیں:

''آریوں کے دیانند سرسوتی کے مقابلہ کے لئے خاص طور سے مولانا محمد قاسم

صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ظہور بھی تائید غیبی کا نشان تھا۔ اور پھر جس طرح عقائد حقہ کی اشاعت اور ردّ بدعات کا اہم کام مولانا محمد قاسمؒ اور مونالا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ اور اس جماعت کے دیگر مقدس افراد کے ذریعہ انجام پایا۔ اس کے آثار باقیہ اب بھی ہماری نگاہوں کے سامنے ہے۔ یورپ کی نئی نئی سائنس اور قوانین فطرت کے نئے نئے اسرار کے انکشاف نے جو شبہات پیدا کئے ان کا اصلی جواب تو علماء دے سکتے تھے جو ہمارے قدیم متکلمین کی طرح قدیم فلسفہ میں ماہر تھے۔ اس زمانہ کے نئے علوم اور نئی تحقیقات سے واقف تھے۔ مگر بہر حال مَالَایُدرک کُلّہٗ لَا یُترک کُلّہٗ، کہ اگر پورا نہ مل سکے تو ادھورا ہی سہی کے اصول کے مطابق ان ہی لوگوں میں سے جو گو نیم عالم تھے لیکن انگریزوں سے دن رات ملتے تھے اور ان کے علوم وخیالات سے کچھ کچھ واقف تھے، سرسید، مولوی چراغ علی اور مولوی کرامت علی صاحب جون پوری وغیرہ چند ایسے اشخاص کھڑے ہوئے جنھوں نے اپنے اپنے خیال کے مطابق اس فرض کو ادا کرنا چاہا۔'' [۱]

۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد ہمارے علماء پر یہ بات واضح ہوگئی تھی کہ انگریز ہمارے ملک پر پوری طرح مسلط ہو چکے ہیں۔ ہمارا اقتدار ختم ہو چکا ہے اور ہمارے لئے ان سے نجات پانا ممکن نہیں۔ اب ہماری بہتری اسی میں ہے کہ ہم خود کو ماحول اور حالات کے مطابق ڈھال لیں۔ چونکہ اس دور کا مسلم معاشرہ تین گروہ میں منقسم تھا۔ پہلا گروہ ان علماء کا تھا جنہیں مغرب کی ہر چیز سے نفرت تھی اور مغربی علوم وفنون کو سم قاتل سمجھ کر ان سے کنارہ کش تھے۔ وہ مغربی تہذیب اور ان کی ہر چیز کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے اور اس کی مخالفت کرتے تھے۔ دوسرا گروہ ان لوگوں کا تھا جن کا ماننا تھا کہ مسلمانوں کی کامیابی وکامرانی مغربی علوم وفنون کے حصول میں ہی مضمر ہے۔ خواہ اس کے لئے انھیں مغربی طرز تمدن کو ہی کیوں نہ اختیار کرنا پڑے۔ تیسرا گروہ ان لوگوں کا تھا جو جدید مغربی علوم وفنون کو حاصل کرنا از حد ضروری

۱۔ حیات شبلی، مولانا سید سلیمان ندوی، دیباچہ، ص ۱۰۔۱۱

سمجھتا تھا۔ ساتھ ہی وہ مسلمانوں کی فرسودہ روایات، توہمات، جہالت، تنگ نظری، تعصب وغیرہ کی اصلاح چاہتا تھا۔ ساتھ ہی انہیں اس بات کا اندیشہ بھی تھا کہ مغربی علوم وفنون کے چکر میں پڑ کر مسلمان اپنے اسلامی اقدار اور ہندوستانی پہچان سے بے نیاز نہ ہو جائیں۔ اور ان کا یہ اندیشہ بے وجہ نہیں تھا۔ کیونکہ مسلمان مغربی علوم وفنون کی ظاہری چمک دمک سے متاثر ہو کر ہوش وخرد سے بیگانہ ہو رہے تھے۔ ہر نئی چیز ان کو اپنی طرف راغب کرتی اور پرانی تہذیب اور پرانی چیزوں کو وہ نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگے تھے۔ یہاں تک کہ وہ مذہب سے بھی متنفر ہونے لگے تھے۔ خاص طور سے جن لوگوں کی نگاہوں کے سامنے مشنریوں یا دوسرے عیسائی مصنفوں کی یا آزاد خیال مفکروں کی کتابیں گزرتیں، وہ طرح طرح کے شکوک و شبہات میں مبتلا ہو جاتے اور اسلام کے بعض مسائل کو جو عام علماء بیان کرتے تھے، عقل کے خلاف سمجھنے لگے تھے۔ نتیجتاً یہ ڈر پیدا ہوا کہ اگر چہ وہ اسلام کو چھوڑ کر عیسائیت اختیار نہیں کریں گے لیکن مذہب سے ضرور متنفر ہو جائیں گے۔ سرسید خود لکھتے ہیں:

> ''اگر خدا مجھ کو ہدایت نہ کرتا اور تقلید کی گمراہی سے نہ نکالتا اور میں خود تحقیقات پر متوجہ نہ ہوتا تو یقینی مذہب چھوڑ دیتا۔'' [۱]

اس میں شک نہیں کہ یورپ میں جدید علوم وفنون کی اشاعت کی تحریک نے ایشیا اور یورپ میں ایک انقلاب بپا کر دیا تھا۔ سیاسی، تعلیمی اور معاشی پریشانیاں رفتہ رفتہ ختم ہونے لگی تھیں۔ لیکن یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ اسی کے سبب مذہب کے تئیں شکوک وشبہات کی گنجائش پیدا ہوتی گئی اور الحاد و دہریت کا دائرہ بڑھتا گیا۔ عیسائی مشنریاں اسلام کے رخ روشن کو داغ دار کرنے کے لئے پوری طرح سرگرم عمل تھیں۔ جن کا مقصد اہل مذہب کی نظروں میں مذہب کو مشتبہ قرار دے کر اس کی وقعت واہمیت کو ختم کر دینا تھا۔ دوسری طرف مسلمانوں کا وہ گروہ جو انگریزی تعلیم کا مداح تھا اور عقل وسائنس کے محیر العقول کرشموں سے متاثر تھا مذہبی امور ومعاملات کو عقلی لحاظ سے دیکھنے کا متمنی تھا۔ شرر صاحب لکھتے ہیں:

> ''سید صاحب کے پاس بعد کے زمانے میں متعدد انگریزی طلباء کے ایسے خطوط آئے جن کا ماحصل یہ تھا کہ اگر آپ نے ہماری رہبری نہ کی ہوتی تو ہم

۱۔ موج کوثر، ڈاکٹر محمد اکرام، ص ۱۵۶

مذہب اسلام کو چھوڑنے کو تیار تھے۔ یہ خطوط سید صاحب کو اس قدر عزیز تھے کہ ان کو احتیاط سے رکھ چھوڑا تھا۔ ان کو وہ اپنی ہمدردی اسلام اور اپنی کوشش خیر کی سند اور اپنی نجات کا ذریعہ خیال کرتے تھے۔'' [۱]

چونکہ سرسید مغربی تعلیم کے حق میں تھے، اس لئے وہ اس کی مدح سرائی بھی کرتے تھے اور اس کو نسخۂ شفا سمجھ کر اپنے ہم مذہبوں میں عام بھی کرنا چاہتے تھے۔ لیکن عام مسلمانوں کا خیال تھا کہ یہ تشکیک والحاد کا سامان فراہم کرتے ہیں۔ توقیر عالم فلاحی لکھتے ہیں:

''انگریزی تعلیم سے متعلق عام مسلمانوں کا خیال یہ تھا کہ یہ تشکیک والحاد پیدا کرتی ہے۔ مکاتب و مدارس میں پرانا ہی نظام تعلیم مروج تھا۔ قدیم تعلیمی روایات جدید زمانے کے تقاضوں کو پورا کرنے سے عاجز و قاصر تھیں۔ مغربی علوم وفنون سے نفرت پوری سوسائٹی پر مسلط تھی۔ جدید تقاضوں کے مطابق انگریز نئے اور مؤثر طریقے استعمال کر رہے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر وہ اپنی پالیسی عمل سے پھر جائیں گے تو خواب کی تعبیر ممکن نہ ہو سکے گی۔ دوسری طرف مسلمانوں کا خیال یہ تھا کہ ''نتبع مَا وَجَدنَا علیه آباء نا'' کی آوازیں لگا رہے تھے۔ مغربی تعلیم کو وہ سم قاتل قرار دیتے ہوئے بعد واجتناب بلکہ نفرت و عداوت کی روش پر گامزن تھے۔ اس طرح وہ سازشوں کے دام میں گرفتار ہو کر ایک طرف تو انگریزی حکومت کے رسوخ وثبات کا مواد فراہم کر رہے تھے تو دوسری طرف معاشی، تعلیمی اور ثقافتی لحاظ سے اپنے پاؤں پر کلہاڑی مار رہے تھے۔ اور یہ خود ان کی ناعاقبت اندیشی، کوتاہ نظری، کج فکری کا خمیازہ تھا۔'' [۲]

چنانچہ بہت غور وخوض کے بعد سرسید نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ قوم کے اندر یہ انقلاب اسی وقت برپا ہو سکتا ہے جب نئی نسل کو صحیح قسم کی تعلیم فراہم ہوگی۔ چونکہ ہندوستان میں قدیم وجدید دونوں طرح کی تعلیم

۱۔ سرسید کی دینی برکتیں، عبدالحلیم شرر، ص ۱۸

۲۔ سرسید کا اصلاحی مشن، ڈاکٹر توقیر عالم فلاحی، ص ۹۳۔۹۴

ناقص و بے سود اور مسلمانوں کے حق میں نقصان دہ تھی۔ جس سے زندگی کے مسائل کو حل کرنے میں تعاون نہیں ملتا تھا۔ اس لئے ایسی تعلیم قوم کے لئے جہالت سے بھی زیادہ خطرناک تھی۔ جدید تعلیم کی سب سے بڑی خرابی یہ تھی کہ اس تعلیم کے حصول سے انگریز حکمرانوں کے سماجی مقاصد کو تقویت حاصل ہو رہی تھی، کیونکہ انگریزوں نے ہندوستان میں جو لادینی نظام قائم کیا تھا اس کے اثرات سے مسلمانوں کو محفوظ رکھنا بہت مشکل تھا۔

عیسائی مشنریاں مسلمانوں کو دین سے برگشتہ کرنے کے لئے زوروں پر کام کر رہی تھیں۔ ہندوستان میں عیسائی مشنریوں کا سرگرم روح رواں ڈاکٹر فنڈر تھا جس کے اسرار پر سر ولیم میور نے چار جلدوں میں ''لائف آف محمدؐ'' کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ جب یہ ۱۸۶۶ء میں ہندوستان میں آئی تو لوگوں نے کھلے ذہن و دماغ سے مطالعہ کرنا شروع کیا۔ جب لوگوں کو اس بات کا علم ہوا کہ مصنف نے یہ کتاب ایک خاص مقصد کے لئے لکھی ہے تو قوم کے عام لوگوں نے اس کتاب کے بعد رنج و غم کا اظہار کیا۔ ان کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر ولیم میور کی باتیں بے بنیاد اور غلط ہیں تو صحیح اور صداقت کیا ہے؟ اس کا تو پتہ چلنا چاہئے۔ نوجوانوں کا یہی وہ طبقہ ہے جن کے شعور کو جلا بخشنے میں سرسید نے اہم رول ادا کیا۔ بالآخر انھوں نے ایک کتاب ''خطبات احمدیہ'' لکھی جس میں ولیم میور کے اعتراضات و الزامات کا دندان شکن جواب دیا اور قرآن اور سیرت نبویؐ سے متعلق صداقتوں کو دلائل و براہین سے واشگاف کیا۔

غرض یہ کہ سرسید نے مسلم معاشرے کو گمراہی سے بچانے کے لئے یہ نسخہ تجویز کیا کہ مسلمانوں کو ایسی تعلیم دی جائے جس سے مسلمان جدید علوم کے ساتھ ساتھ اسلام کی صحیح تعلیمات اور زندگی کے اعلیٰ مقاصد سے پوری طرح واقفیت حاصل کریں، اور زمانے کے بدلتے ہوئے تقاضوں کے مطابق خود کو ڈھال سکیں اور تمام مسائل کو بخوبی سمجھ سکیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے انھوں نے مسلمانوں کی تعلیم کی طرف خصوصی توجہ کی اور اپنے خیالات و نظریات کو عملی جامہ پہنانے کے لئے انھوں نے علی گڑھ میں ''محمڈن اینگلو اورینٹل کالج'' کی بنیاد ڈالی جو بلاشبہ سرسید کی دیرینہ آرزوؤں اور قیمتی خوابوں کی حسین تعبیر ہے۔ اور اب جو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے نام سے دنیا میں ایک قابل ذکر تعلیمی مرکز کی حامل ہے۔

انیسویں صدی کے مطلع ہند پر سرسید ایک نامور عالم دین، ایک عظیم محسن، ایک ممتاز مصلح، ایک

غیر جانب دار مورخ، قومی یکجہتی کے مایہ ناز نقیب اور انگریزی تعلیم کے پیامی کی حیثیت سے نمودار ہوتے ہیں۔ زندگی کے مختلف شعبوں سے متعلق ان کی منظم کوششوں اور عظیم ترین قربانیوں کو دیکھ کر یہ کہنا پڑتا ہے کہ سرسید محض ایک شخص نہیں بلکہ ایک کارواں تھے جن کا دل وطن کی محبت سے لبریز ہے، جو اقوام وطن کے عروج و اقبال اور روانی و ادبار کی تاریخ سے گہری واقفیت رکھتے ہیں۔

سرسید ایک باعمل اور ذی فہم انسان تھے۔ ان جیسے دردمند انسان کے لئے یہ کیوں کر ممکن تھا کہ وہ محض تماشائی بنے بیٹھے رہتے اور اپنے اطراف و جوانب سے بالکل بے تعلق ہو کر آگے بڑھ جاتے۔ وہ خانہ نشین، اخبار بیں نہیں تھے۔ وہ انقلاب کے داعی اور سپاہی تھے۔ اس لئے انھوں نے ایک پر جوش داعی اور جنگ آزما سپاہی کی طرح فکر و عمل کی اس آویزش میں عملی حصہ لیا۔

سرسید انیسویں صدی کے دو بڑے محاذوں عقل و مذہب کی معرکہ آرائی اور مذہب و سیاست کے تصادم میں پر جوش داعی اور سرگرم سپاہی کی حیثیت سے سرگرم عمل رہے۔ سرسید اپنے زمانے کے عظیم مذہبی مفکر تھے۔ انھوں نے مذہب پر نئے نقطۂ نظر سے نگاہ ڈالی اور اپنے زمانے کے سیاسی مسائل کو حل کرنے کے لئے دین سے مدد لی۔ اس معاملے میں ان کا نقطۂ نظر خالص مذہبی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن چونکہ سرسید ایک آزاد خیال تجدد پسند شخص تھے، وہ قدیم کے مقابلے جدید اور ماضی کے مقابلے میں عہد حاضر سے زیادہ وابستہ تھے۔ اس لئے انھوں نے مذہب کو بھی وقت کی زبان میں عام کرنے کی کوشش کی اور چونکہ علوم پر ان کو اس درجہ عبور حاصل نہیں تھا جتنا کہ اس زمانے کے بعض بڑے علماء کو تھا۔ اس لئے انھوں نے سائنس اور اسلام میں تطابق کے اصول میں غلو سے کام لیا جس کی بنا پر بہت سے مسائل میں وہ علماء سلف کی سخت تنقید کا نشانہ بنے۔ اس لئے ان کی دینی شخصیت مجروح ہوئی اور اس کی آڑ میں ان کی مصلحانہ شخصیت بھی گہنا گئی۔ طفیل احمد منگلوری کے اس تجزیے میں صداقت معلوم ہوتی ہے:

> ''اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ایک فلاسفر، محقق اور حکیم ہونے کے اعتبار سے ان کا پایہ بلند تھا اور وہ مسلمانوں کی عقلی و ذہنی سطح کو بہت بلند کرنا چاہتے تھے جو اس وقت بہت پست تھی۔ مگر عقلی ترقی جماعت کے لئے اسی حد تک مفید ہو سکتی ہے، جس حد تک کہ قدیم مذہبی جذبات متاثر نہ ہوں اور یہ امر چونکہ

سرسید کے پیش نظر تھا، اس لئے بحیثیت ایک مذہبی مصلح کے جس کے ساتھ ایک جماعت کا ہونا ضروری ہے، وہ ناکام رہے۔'' [۱]

سرسید کے تعلیمی نظریات کا جائزہ لیا جائے تو معلوم ہوگا کہ سرسید کے تعلیمی خیالات تجدد کی ہمہ گیر شہرت کے باوجود کچھ زیادہ مفید نہ تھے۔ سائنس کی طرف رغبت اور انگریزی زبان کی تعلیم اگرچہ اس دور کے لحاظ سے بڑے انقلاب انگیز خیالات تھے مگر سچ یہ ہے کہ وہ تعلیم کے معاملہ میں اتنے انقلابی نہ تھے جتنا ان کو سمجھ لیا گیا تھا۔ عام طور سے یہ خیال کیا جاتا ہے کہ سرسید انگریزی تعلیم پھیلانے کے لئے کوشاں تھے اور ملک کے بہت سے دوسرے عناصر خاص طور سے علماء انگریزی تعلیم کو مذہبی اعتبار سے ناجائز سمجھتے تھے۔ مگر یہ رائے منصفانہ نہیں ہے۔ انصاف یہ ہے کہ اس معاملے میں علماء کو اختلاف سرسید کے مذہبی عقائد سے یا پھر انگریزی تمدن سے تھا۔ انگریزی تعلیم سے ان کو اختلاف نہیں تھا۔ بقول شیخ محمد اکرام:

''علی گڑھ کی مخالفت اس وجہ سے نہیں ہوئی کہ وہاں مغربی علوم پڑھائے جاتے تھے بلکہ اس لئے ہوئی کہ اس کی بنا میں سرسید کا ہاتھ تھا۔ اور سرسید اپنی کتب اور تہذیب الاخلاق میں معاشرتی اور مذہبی مسائل کے متعلق ایسے خیالات کا اظہار کر رہے تھے جنہیں عام مسلمان اسلام کے خلاف سمجھتے تھے۔ علی گڑھ کالج کے متعلق سخت سے سخت مضامین اور درشت سے درشت فتاویٰ میں یہ نہیں لکھا کہ انگریزی پڑھنا کفر ہے بلکہ یہی درج ہے کہ جس شخص کے عقائد سرسید جیسے ہوں وہ مسلمان نہیں اور جو مدرسہ ایسا شخص قائم کرنا چاہے اس کی اعانت جائز نہیں۔'' [۲]

شیخ محمد اکرام نے غلط بات کہی ہے۔ سرسید کی مخالفت کے دو وجوہ ہیں (۱) انگریزی تعلیم کی وکالت (۲) ان کی نیچریت

جہاں تک مذہبی علماء کا تعلق ہے وہ انگریزی تعلیم کو ناجائز ہی سمجھتے تھے۔ چنانچہ اس زمانہ میں جب

۱۔ مسلمانوں کا روشن مستقبل، سید طفیل احمد منگلوری، دیباچہ، ص ۲۳۰

۲۔ موج کوثر، شیخ محمد اکرام، ص ۹۱

مدرسۃ الاصلاح میں انگریزی تعلیم کو نصاب کا جز بنایا گیا تو علماء کا شدید ردعمل سامنے آیا تھا۔ شیخ اکرام صاحب نے علماء کی بے جا وکالت کی ہے۔ سرسید کے افکار وخیالات نے اس دور کی تقریباً سبھی علمی وادبی تحریکوں پر اثر ڈالا۔ سیاست، اخلاق، اجتماعیت، تعلیم، تاریخ، سیرت اور مذہب غرض زندگی کے تمام شعبے ان کی تحریروں اور تقریروں سے متاثر ہوئے۔ مگر ان کی تحریری سرگرمیوں کے محور صرف دو ہیں۔ اوّل دینی مباحث، دوم اجتماعی مسائل جن میں سوسائٹی کی تعلیمی اصلاح اور ترقی شامل ہے۔

سرسید نے جب ہندوستانی قوم کی اصلاح کا ارادہ کیا اور ان میں سیاسی اور قومی بیداری پیدا کر کے انہیں جدید علوم وفنون سے آشنا کرنا چاہا تو اس کے لئے انھوں نے سائنٹفک سوسائٹی قائم کی اور تہذیب الاخلاق کا اجراء کر کے اپنی تحریک کو فروغ دیا۔ چونکہ سرسید ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی اتحاد کے ساتھ اپنے اس مشن کو چلانا چاہتے تھے اس لئے مسلم قوم چیں بہ جبیں ہوگئی اور میدان مخالفت میں نکل آئی۔ ماضی کی سنت کے مطابق بہت سے لوگ جدید تعلیم کے مخالف ہوگئے اور ان کی شخصیت کا دینی پہلو شک و شبہ کی نذر ہوگیا۔ اور لوگ یہ سوچنے لگے کہ یہ تعلیم نوجوان نسل کو عیسائی اور ملحد بنادے گی۔ چنانچہ جدید تعلیم کی مخالفت چاروں طرف سے ہونے لگی۔ یہاں تک کہ آپ کو کافر، ملحد، دہریہ، نیچری، زندیق، قوم کا ہاجی کہا گیا۔ کفر کے فتوے جاری کئے گئے۔ آپ کے دوست اور ساتھ دینے والے بھی نیچری اور کرسٹان کہلانے لگے لیکن آپ اپنے مضبوط ارادے سے باز نہ آئے۔ آپ کے پائے استقلال میں جنبش نہ ہوئی اور آپ نے ملک وقوم کی بقا وسالمیت اور اسے عروج پر لے جانے کے لئے اعتراض واختلاف کے وار کو خوش آمدید کہا۔ خود ان کے احساسات وخیالات اور عزم وارادے کی پوری تصویر اس تحریر میں نظر آتی ہے:

> ''قوم کیا! دنیا کی باتوں کیا! دین کے کاموں میں ایسے تاریک گڈھے میں پڑی تھی۔ پھر میرا دل آخر دل ہی تھا پتھر نہ تھا جو نہ پگھلتا۔ ایک مدت تک اسی غم میں پڑا سوچتا رہا کہ کیا کیجئے۔ آخر یہ سوچا کہ سوچنے سے کچھ کرنا بہتر ہے۔ کرو جو کچھ کرسکو ہو یا نہ ہو۔ اس بات پر دل ٹھہرا، ہمت نے ساتھ دیا اور صبر نے سہارا۔ اور اپنی قوم کی بھلائی میں قدم گاڑا۔ اس میں خدا کی طرف کا بدلہ نہ جب معلوم تھا اور نہ اب معلوم ہے۔ کافر، ملحد، زندیق، اسلام کا دشمن،

مسلمانوں کا ہاجی، قوم کا عیب جو دین و دنیا سے آزاد کہنا اور نام پر دو چار صلواتیں سنا دینا۔ مگر شکر ہے ان کی کسی بات نے ہمارا دل نہیں دکھایا اور ہمیشہ دل میں یہی آیا کہ اے خدا! ان پر رحم کر، کیوں کہ یہ نہیں جانتے۔'' ۱

چنانچہ ان نامساعد حالات میں بھی سرسید صبر و استقلال کا پیکر بنے رہے۔ اپنی مخالفت کرنے والوں کے ہر وار کو خاموشی سے سہتے رہے۔ چونکہ ان کو جس چیز کی لگن تھی وہ ان کے ذاتی یا سیاسی مفاد کے تحت نہیں تھی بلکہ وہ قوم کی تباہی و پستی کو فنا کر دینا اور اس کی شوکت و عظمت کو بلندیوں تک لے جانا چاہتے تھے۔ اس لئے انھوں نے مخالفین کی مخالفت کی پرواہ نہیں کی اور وہ اپنی تحریروں سے مسلمانوں کو خواب غفلت سے بیدار کرنے کی جدوجہد میں لگے رہے۔ اور وہ علماء جو ان کے ہر کام میں اختلاف کرنا اپنا فرض سمجھتے تھے، اس کی پرواہ نہ کرتے ہوئے منزل مقصول کی طرف گامزن رہے۔ چونکہ ان کے نزدیک مسلمانوں کی موجودہ بیماریوں کا علاج یہ تھا کہ مسلمان مذہب کے علاوہ ہر چیز میں مغرب سے استفادہ کریں۔ ایس کے بھٹناگر لکھتے ہیں:

''سرسید اعتراضات کی آندھیوں میں بھی دل برداشتہ نہ ہوئے اور شیخ عبدالقادر جیلانیؒ، امام غزالیؒ، شیخ احمد سرہندی، مجدد الف ثانیؒ اور دوسری تمام متبرک اور پاک ہستیوں سے روحانی فیض حاصل کرتے رہے جو اپنے زمانے میں کفر والحاد کے فتوؤں سے نوازے گئے۔'' ۲

سرسید اس بات کے متمنی تھے کہ جدید علوم وفنون کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کر کے مسلمانوں کو نئے علوم سے آگاہ کیا جائے۔ اپنے اس خیال کو عملی جامہ پہنانے کے لئے انھوں نے ۱۸۶۲ء میں ''التماس بخدمت ساکنان ہند در باب ترقی اہل ہند'' کے عنوان سے ایک تحریر شائع کی، جس میں اس بات پر زور دیا گیا کہ ایک ایسی مجلس قائم ہو جو قدیم مضمون اور انگریزوں کی مفید کتابوں کا اردو میں ترجمہ کرے۔ چنانچہ

۱۔ سرسید احمد خاں، تہذیب الاخلاق، جلد دوم، ص ۵۷۰۔۵۷۱، بحوالہ سرسید کی ادبی خدمات اور ہندوستان کی نشاۃ ثانیہ، قدسیہ خاتون، ص ۱۲۶

۲۔ S.K. Bhatnagar, p.97، بحوالہ سرسید کا اصلاحی مشن، توقیر عالم فلاحی، ص ۱۰۵

اس مقصد کے تحت انھوں نے غازی پور میں ۱۸۶۳ء میں سائنٹفک سوسائٹی قائم کی۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ایشیا کے قدیم مصنفوں کی کمیاب کتابوں کو تلاش کر کے چھاپا جائے اور مغربی علوم کو ہندوستان میں رائج کیا جائے۔ ڈیوک آف آرگائل اس وقت کے وزیر ہند تھے، سوسائٹی کے سرپرست بنائے گئے اور ہندو اور مسلمان امراء اس کے ممبر منتخب ہوئے۔ سوسائٹی نے مفید کتابوں کے ترجمے کا کام باقاعدہ شروع کیا اور یہ کوشش روز افزوں مقبول ہونے لگی۔ ۱۸۶۴ء میں سرسید جب علی گڑھ منتقل ہوئے تو سوسائٹی بھی وہیں منتقل ہوگئی۔ اس نے کئی مفید کتابیں انگریزی سے اردو میں ترجمہ کرائیں۔ اخبار سائنٹفک سوسائٹی کے نام سے اس کا ایک اخبار نکلتا تھا لیکن سوسائٹی کے علی گڑھ منتقل ہو جانے کے بعد وہ علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے نام سے موسوم ہوا۔ اخبار کے بہت سے مضامین ہندوؤں اور مسلمانوں کی معاشرتی اصلاح پر مشتمل تھے۔ سرسید اس بات کے لئے کوشاں تھے کہ ہندوستانیوں کا انگریزوں اور یورپ سے ایسا تعلق پیدا ہو جائے کہ مشرق و مغرب اور قدیم و جدید کا تاریخی تصادم ختم ہو جائے اور ان کا امتزاج ایک مفید اور کارآمد سنگ میل بن جائے۔ انگریزی حکومت اور ہندوستانی عوام ایک دوسرے کی ضروریات اور حالات سے باخبر ہوں۔ سرسید نے اس سوسائٹی سے پورا کام لیا۔ سرسید کی اصلاحی تحریک میں اس اخبار کا بڑا اہم رول ہے۔ چونکہ لوگوں کے خیال کو تبدیل کرنے اور معاشرے میں پھیلی ہوئی طرح طرح کی برائیوں کو دور کرنے کا احساس پیدا کرنے میں اس اخبار نے بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ اس لئے اس اخبار کے ذریعہ سرسید نے جو تعلیمی اور ادبی خدمات انجام دیں، مغربی علوم و سائنس کو دیسی زبان میں تیزی سے منتقل کرنے کی جو کوشش کی اور اس کے ذریعہ صحافت کا جو اعلیٰ معیار قائم کیا وہ سرسید کے علمی و ادبی ذوق کی آئینہ دار ہے۔ بقول قدسیہ خاتون:

> ''اس سوسائٹی کا مقصد ایک تو یہ تھا کہ مغربی علوم و فنون کو ایسی زبان میں ترجمہ کریں جو ہندوستانیوں کے عام استعمال میں ہوتا کہ عام ہندوستانی ان علوم سے مستفید ہو سکیں۔ اس وقت تک اردو ہندوستان کی لینگوا فرینکا تھی اور سرسید نے اپنے مقصد کے لئے اسی زبان کا انتخاب کیا۔ دوسرے یہ کہ ایشیا کے قدیم مصنفین کی کمیاب اور نفیس کتابوں کی جستجو اور ان کا مہیا کرنا، تیسرے یہ کہ ایک ایسا میگزین یا گزٹ شائع کرنا جس سے ہندوستانیوں کی فہم و فراست کی ترقی

مقصود ہو۔ سوسائٹی کے قانون میں درج تھا کہ اس کو کسی مذہبی کتاب سے سروکار نہ ہوگا۔'' [۱]

علی گڑھ تحریک صرف سیاسی اور تعلیمی تحریک نہیں بلکہ علمی و ادبی تحریک بھی تھی۔ اس تحریک کے زیر اثر فکر و نظر میں اہم انقلاب اور مذاق تصنیف میں گہری تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ سرسید کی علمی و ادبی تحریک نے پہلے سے موجود سبھی خیالات و رجحانات کو بدل ڈالا اور ایک ایک ایسے علمی مذاق کی بنیاد ڈالی جسے ایک طرف حقیقت اور سچائی کی تلاش تھی تو دوسری طرف افادیت اور مقصدیت کی علمبردار تھی۔ صداقت کی جستجو اور تکمیل و ترقی حیات یہ دو اہم بنیادیں ہیں جن پر سرسید کے تمام علمی کارناموں کی بنیاد ہے۔ یہی علی گڑھ کی علمی تحریک کی روح ہے۔ یہ وہ سائنٹفک نقطۂ نظر ہے جس کے پیدا کرنے کا سہرا علی گڑھ اور اس کے نامور بانی سرسید کے سر ہے۔ بقول مولوی عبدالحق:

''ان کا سب سے بڑا کام تعلیمی اور علمی تھا اور اسی کام کا ایک بڑا جزو سائنٹفک سوسائٹی کا قیام تھا۔ خود یہ نام اس تغیر کی خبر دیتا ہے جو اس وقت عمل میں آرہا تھا۔'' [۲]

غرض یہ کہ علی گڑھ تحریک کا حقیقی کام وہ نہیں جو علی گڑھ کالج میں ہوا بلکہ وہ ہے جو علی گڑھ تحریک کے علمبردار اور ان کے رفقاء کار نے انجام دیا۔ جو ان کی تحریک کی اس علمی روح سے متاثر ہوئے۔ سرسید کے انتقال کے بعد علی گڑھ کالج کی حیثیت ایک تعلیمی مرکز کی ضرور ہوگئی مگر علمی رہنمائی کا منصب اس کے ہاتھ سے چلا گیا تھا۔ تاہم سرسید کی پیدا کی ہوئی علمی لہر پورے ملک میں پھیل گئی۔ عہد سرسید سے پہلے ہندوستان میں علمی تصانیف کا دائرہ مذہبیات، تاریخ، تصوف اور تذکرہ نویسی تک محدود تھا۔ سرسید کی علمی و ادبی تحریک نے پہلے سے موجود سبھی رجحانات کو بدل ڈالا اور علم کے معیار کو اعلیٰ مقاصد کی تکمیل کی طرف منتقل کیا۔ اس تحریک کو اگر ایک طرف حقیقت اور صداقت کی تلاش تھی تو دوسری طرف وہ افادیت اور مقصدیت کی

۱۔ سرسید احمد خاں، مولوی عبدالحق، ص ۱۴۱۔۱۴۲ بحوالہ سرسید کی ادبی خدمات اور ہندوستان کی نشاۃ ثانیہ، قدسیہ خاتون، ص ۲۶۱

۲۔ عبدالحق رسالہ اردو جولائی ۱۹۳۵ء، بحوالہ سرسید اور ان کے نامور رفقاء، ڈاکٹر سید عبداللہ، ص ۶۹

علمبردار بھی تھی۔ سچائی کی تلاش اور زندگی کی تکمیل و ترقی دو اہم بنیادیں تھیں جن پر سرسید کے تمام علمی کاموں کی بنیاد کھڑی ہے۔ یہی علی گڑھ کے علمی تحریک کی روح ہے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ نے علی گڑھ تحریک کا جائزہ اس طرح لیا ہے:

''افکار کے نقطۂ نظر سے علی گڑھ تحریک کا اس انقلاب میں بڑا حصہ ہے جو انیسویں صدی کے آخر میں ہندوستان میں نمایاں طور پر رونما ہوا۔ ان مسائل میں حاضر سے لگاؤ، تجدد کی طرف میلان، مادی مسائل، زندگی سے دلچسپی اور روایات سے انقطاع کا رجحان خاص توجہ کے لائق ہیں۔ زندگی کا ''ایں جہانی'' تصور (جس کی پرورش یہاں ہوئی) قدیم ''آں جہاں'' فلسفۂ حیات کی عین ضد ہے۔ ترقی کا خیال اور ماضی کے مقابل میں مستقبل کی اہمیت کا احساس بھی علی گڑھ تحریک کے اثرات کا نتیجہ ہے۔''[۱]

ادبی لحاظ سے بھی علی گڑھ تحریک کے اثرات بہت وسیع اور دوررس معلوم ہوتے ہیں۔ نہ صرف اسلوب بیان اور روح مضمون میں بلکہ انواع ادب کے گوشوں میں بھی ناموران علی گڑھ کی توسیعی کوششوں نے بڑا کام کیا، اور مغرب سے حاصل کی گئی ادب کی بہت سی صنفوں کو اپنے ادب میں رائج کیا۔ جن کا ہمارے ادب میں یا تو ایک طرح سے وجود ہی نہ تھا یا اگر تھا بھی تو اس کی شکل ایسی نہ تھی بلکہ اس سے مختلف تھی۔ ان اصناف میں بعض رجحانات بالکل نئے اور خصوصی توجہ کے مستحق ہیں۔ جن میں آزاد اور حالی کی نیچرل شاعری اور پرانے طرز کی شاعری سے انحراف بھی علی گڑھ تحریک کا ایک حصہ ہے۔ اردو میں جدید تنقید کا آغاز بھی سرسید اور ان کے رفقاء سے ہوتا ہے۔ سرسید کی بہت سی تنقید مذہبی اور سماجی حالات پر تھیں۔ رفقاء سرسید میں شبلی اور حالی نے نقد الادب کے معیار کو بلند کیا۔ حالی نے تو مقدمہ شعر و شاعری اور شبلی نے شعر العجم لکھ کر اعلیٰ تنقید کی داغ بیل ڈالی۔ سوانح نگاری میں سرسید نے خطبات احمدیہ لکھی۔ شبلی اور حالی نے اس فن کو بلندیوں پر پہنچایا۔ حالی نے حیات سعدی، حیات جاوید، یادگار غالب اور شبلی نے ال سیریز المامون، الفاروق، النعمان، الغزالی، سوانح مولانا روم اور سیرت النبیؐ لکھ کر سوانح نگاری میں ایک

۱۔ سرسید اور ان کے نامور رفقاء کی نثر کا فنی و فکری جائزہ، ڈاکٹر سید عبداللہ، ص ۷۱

اعلیٰ مقام حاصل کیا۔ النعمان، المامون، الفاروق لکھتے وقت شبلی پر جو کیفیت طاری ہوئی وہ آگے چل کر دارالمصنفین کی شکل میں نمودار ہوئی۔ غرض یہ کہ سوانح نگاری کا سب سے بڑا سرچشمہ تحریک سرسید سے ہی نکلتا ہے۔ تاریخ نگاری کا علمی انداز بھی اسی دور سے شروع ہوتا ہے۔ شبلی، شرر، ذکا اللہ اس دور کے بڑے مورخ ہیں۔ شبلی کے شاگردوں اور رفیقوں نے اسلامی تاریخ کی تحقیق کا کام آگے بڑھایا۔ ناول نگاری بھی اسی تحریک کے زیر اثر نمودار ہوئی۔ مولوی نذیر احمد نے اردو میں ناول لکھ کر زندگی کے بعض مسائل کی ترجمانی کی۔ نیز ادب اور زندگی کے رشتہ کو استوار کیا۔ شرر نے تاریخی ناول نگاری میں نام پیدا کیا۔ مکالمہ نگاری بھی سرسید کی بدولت اردو میں اپنا مقام پیدا کرتی ہے۔ مقالہ نگاری کا فن بھی اسی دور کی رہین منت ہے۔ یہ فن بھی سرسید کی بدولت ہی اردو میں بڑے فنون ادبی کا درجہ حاصل کر سکا۔ سرسید، محسن الملک، وقار الملک، چراغ علی، شرر، شبلی اور حالی کے مقالے اردو ادب میں بلند پایہ حیثیت رکھتے ہیں۔

سرسید کا شمار انیسویں صدی کے اسلامی ہندوستان کے عظیم ترین نہ سہی دو تین عظیم شخصیتوں میں ضرور ہوگا۔ اس زمانے میں انہیں جو عزت وشہرت حاصل ہوئی وہ کسی اور کو نصیب نہ ہوئی۔ سرسید کی خوش بختی یہ تھی کہ ان کو اقتدار اور اثر ورسوخ کے علاوہ جس چیز نے سب سے زیادہ کامیاب وکامران کیا وہ ان کے مخلص احباب کا میسر ہونا تھا۔ ان کے دوستوں میں ہر ایک اپنے آپ میں ایک انجمن اور اپنے وجود میں ایک اقلیم تھا۔

سرسید کا سب سے بڑا کارنامہ اپنے حلقۂ احباب میں علم وادب کا ذوق اور تلاش وتحقیق کا جذبہ پیدا کرنا تھا۔ انھوں نے اپنے احباب ومنسلکین کے دلوں کو اتنا پُر جوش کر دیا کہ وہ مدت العمر علمی وادبی کاموں اور تلاش وتحقیق سے منسلک رہے۔

ان کے احباب نے اپنی تحریروں اور اپنے اعمال وافکار کے ذریعہ سرسید کا پورا تعاون کیا اور ان کے مشن کو جلا بخشی۔ ویسے تو سرسید کا حلقۂ احباب کافی وسیع ہے لیکن چند احباب جو خصوصی اہمیت کے حامل ہیں، ان میں بھی نواب محسن الملک، نواب وقار الملک، مولانا حالی، مولوی نذیر احمد، مولوی چراغ علی، مولوی ذکاء اللہ اور مولانا شبلی کا نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہیں۔

یہ تمام رفقاء تحریک سرسید کے پُر جوش حامی اور زبردست مبلغ تھے۔ اور انھوں نے ہر محاذ پر سرسید کا

ساتھ دیا۔ ان میں سے ہر ایک نے ادبی کاوشوں میں سرسید کے رجحانات وخیالات کا گہرا اثر لیا۔ اوران جدید رجحانات کو مختلف شعبوں کی زینت بنادیا جو اس وقت تک اجنبی اور نئے تھے۔

باوجود ان سب رفیقوں کے سرسید کے تمام رفقاء میں شبلی سب سے منفرد اور الگ نظر آتے ہیں۔ وہ ۱۸۸۱ء میں اپنے چھوٹے بھائی مہدی حسن کے داخلے کے سلسلے میں اپنے والد کے ساتھ علی گڑھ تشریف لائے۔ اس وقت سرسید کی دھوم چاروں طرف مچی ہوئی تھی۔ شبلی نے سرسید کی شان میں ایک عربی قصیدہ نذر کیا جس میں ان کے حسب ونسب اور قومی کارناموں کی توصیف وتعریف کی گئی تھی۔ ۱۸۸۲ء میں عربی و فارسی کے ایک معلم کی ضرورت محسوس ہوئی تو مولانا فیض الحسن صاحب کی سفارش کے ساتھ مولانا شبلی نے درخواست پیش کی اور ۴۰ روپیہ ماہانہ پر ان کا تقرر ہوگیا۔ شبلی غیر معمولی صلاحیتوں کے مالک تھے۔ علی گڑھ میں ان کو ایسا ماحول ملا جو ان کی فطرت کے عین مطابق تھا۔ جس میں ان کی علمی قوت کو فروغ ملا اور ان کی خوبیاں نمایاں ہونے لگیں۔ سرسید کے جوہر شناس نظر سے شبلی کے فطری جوہر کو پہچان لیا اور اپنی کوٹھی کے احاطے میں ایک چھوٹا سا بنگلہ ان کی رہائش کے لئے مخصوص کردیا۔ اور اپنے کتب خانے سے استفادے کی اجازت دے دی۔ اس کتب خانے میں نادر کتابوں کا ذخیرہ موجود تھا۔ سرسید کی صحبت میں علمی وقومی مذاکرات نے شبلی کے اندر ایک انقلاب پیدا کردیا جو ان کے بزرگ معاصرین میں پہلے ہی ہو چکا تھا۔ اس انقلاب کا پہلا اثر مولانا کی شاعری سے ظاہر ہوا۔ ۱۸۸۱ء میں جب تعلیمی کانفرنس قائم ہوئی تو پہلی مرتبہ مولانا قومی پلیٹ فارم پر ایک مقرر کی حیثیت سے نمودار ہوئے اور بڑی دل نشین تقریر کی۔ دوسرے سال مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم پر ایک تاریخی رسالہ پیش کیا۔ ۱۸۸۳ء سے ۱۸۸۷ء تک مولانا کے جو جوہر نمایاں ہوئے ان سے وہ اپنے بزرگ معاصرین کے جاذب توجہ اور مرکز امید بن گئے۔ ۱۸۸۷ء میں پروفیسری کی جگہ خالی ہونے پر اسسٹنٹ پروفیسر کی حیثیت سے ان کو ترقی مل گئی۔ شبلی تقریباً سولہ سال تک علی گڑھ میں ملازم رہے۔ یہیں انھوں نے آرنلڈ سے فرانسیسی سیکھی اور مستشرقین کی کتابوں تک رسائی حاصل کی۔ یہیں سرسید کی بااثر شخصیت نے ان کی قلب ماہیت کی۔ بقول مولانا مہدی حسن ''شبلی نے مولویت علی گڑھ میں پہنچ کر چھوڑی۔ ان کے خیالات میں تبدیلی اور وسیع النظری سرسید کے دامان تربیت کے اثر سے تھی۔ سرسید کے بعد شبلی ہی ہیں جن کی تصنیفات میں ہم جدت آزادی کی رائے اور فکری گہرائی پاتے ہیں۔ قومی

اور ملّی کاموں میں بھی سرسید کے ساتھ شبلی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ شبلی تحریک سرسید کے اہم رکن تھے۔ انھوں نے اپنی تحریر و تقریر کے ذریعہ عوام کے دلوں میں حرارت پیدا کی۔ ان کا دائرہ فکر کافی وسیع تھا۔ انھوں نے مذہبی، تہذیبی اور معاشرتی میدان میں بیداری پیدا کرنے کی بھرپور کوشش کی۔ سرسید کی طرح وہ بھی مسلمانوں کے ہمدرد تھے۔ دونوں کا نصب العین ایک مگر نقطۂ نظر جدا تھا۔ ۱۸۵۷ء کے بعد مسلمانوں میں جمود و تعطل کی جو کیفیت پیدا ہوئی اس سے متاثر ہو کر سرسید نے مفاہمت کی راہ اختیار کی۔ مگر شبلی مفاہمت کی راہ اختیار کرنے کے بجائے حالات سے مقابلہ کرنے پر زور دیتے تھے۔ ڈاکٹر خورشید نعمانی ایک جگہ لکھتے ہیں:

> ''ان کا (علامہ شبلی) کا خیال تھا کہ محض مفاہمت کوئی چیز نہیں ترقی بھی لازمی ہے۔ وہ کہتے تھے اس پرانی دعوت کو جسے اسلام کہتے ہیں اور اس روایت کو جسے اسلام نے پیدا کیا آگے بڑھانا ضروری ہے۔ وقت کے چیلنج کو قبول کرنے کا مطلب جھک جانا نہیں بلکہ دوسروں کے افکار کو سمجھ کر ان کا مقابلہ کرنا اور ان کے مقابلے کے لئے ہتھیار تیار کرنا تھا۔'' [۱]

مولانا جب علی گڑھ تشریف لائے تھے اس وقت تک ان کے کمالات صرف شاعری تک محدود تھے۔ یہاں آنے کے بعد انھوں نے اسلام کی خدمت کا سچا اور صحیح راستہ تلاش کیا۔ غور کیا تو انہیں احساس ہوا کی یورپ کی چمک دمک سے مسلمان مرعوب ہو رہے ہیں اور انہیں اپنا حال بلکہ اپنا ماضی تک تاریک نظر آتا ہے۔ یورپ کے مصنفین، مسلم سلاطین، اسلام اور علوم اسلامیہ میں کیڑے نکال نکال کر عوام میں پھیلا رہے تھے تاکہ مسلمانوں کی نئی نسل اسلام اور اپنے ورثہ سے نفرت کرنے لگے اور ان کا قومی وقار ختم ہو جائے۔ مسلمانوں کی اپنی تاریخ پر جو فخر تھا وہ اس کو مٹانے کے درپے تھے۔ مستشرقین اپنے ارادے میں کامیاب ہو رہے تھے اور مسلمان اپنی تاریخ سے متنفر ہو رہے تھے۔ وہ مغربی چمک دمک سے مرعوب ہو رہے تھے۔ مولانا نے ان کے اس ناپاک ارادے کو سمجھ لیا اور اس کے مقابلہ کے لئے اپنے قلم کو جنبش دی اور اپنا پہلا مقالہ ''مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم'' کے عنوان سے لکھا اور علی گڑھ کے ایک جلسہ میں پڑھا۔

۱۔ دارالمصنفین کی تاریخ اور علمی خدمات، حصہ اول، ڈاکٹر خورشید نعمانی، ص ۱۸

مسلمانوں کے کانوں میں اپنے بزرگوں کے کارناموں کی صدا پہلی بار آئی اور ان کے مقالے کی بڑی شہرت ہوئی۔ پھر شبلی کا بھی چاروں طرف ڈنکا بجنے لگا۔ یہ مولانا کی ایسی تحریر تھی جسے انھوں نے اپنی پہلی تالیف قرار دیا۔ اس کے بعد مولانا نے اپنی شہرہ آفاق کتاب ''المامون'' لکھ کر اس کو شائع کرایا۔ المامون کے بعد ان کی معرکۃ الآرا تصانیف ''سیرۃ النعمان''، اور ''الفاروق'' شائع ہوئیں جو بالعموم پسند کی گئیں اور جس کو اہل علم نے بڑی قدر و منزلت کی نظر سے دیکھا اور مولانا کی شہرت کا سکہ پوری علمی دنیا میں بیٹھ گیا۔ مولانا نے جب سرسید کے سامنے الفاروق لکھنے کا ارادہ کیا تو سرسید نے اس کو لکھنے سے منع کر دیا۔ اس کے پیچھے کالج کی مصلحت تھی۔ یعنی یہ کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ الفاروق کا وجود کالج کے ہمدردوں میں سنّی اور شیعہ کا جھگڑا پیدا کر دے۔ چونکہ نواب عماد الملک سید حسین بلگرامی کالج کے بہی خواہ تھے اور وہ شیعہ تھے۔ اس لئے سرسید کا خیال تھا کہ کہیں یہ کتاب کالج سے ان کی بدمزگی کا سبب نہ بنے۔ لیکن شبلی نے اس کو لکھنے کا پختہ عزم کر لیا تھا اور وہ اپنے ارادے سے باز آنے والے نہیں تھے۔ چنانچہ یہ طے ہوا کہ یہ مسئلہ خود نواب صاحب کے سامنے رکھا جائے۔ اس سلسلے میں سرسید نے ان کو ایک خط لکھا جس کا نواب صاحب نے جواب دیا۔

> ''اسلام نے ایک فاروق پیدا کیا ہے اور حیف کی اس کی سوانح عمری بھی نہ لکھی جائے اور ساتھ ہی مولانا شبلی کی تعریف و تحسین بھی کی۔'' [۱]

اس کی تائید مولانا سید سلیمان ندوی کے ایک بیان سے ہوتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

> ''مولانا جب سرسید کے روکنے سے الفاروق لکھنے کا ارادہ ترک نہ کر سکے تو سرسید نے عماد الملک کو لکھا کہ تم مولوی شبلی کو اس ارادے سے روکو۔ انھوں نے جواب میں لکھا کہ
>
> ''اسلام میں دین دنیا کی جامع کامل ذات صرف عمر فاروق کی ہے۔ لہٰذا ان کی سوانح عمری لکھنے سے مولانا کو نہ روکئے۔'' [۲]

۱۔ حیات شبلی، سید سلیمان ندوی، ص ۲۰۰

۲۔ ایضاً، ص ۲۰۰

مولانا نے الفاروق لکھی اور بہت ہی اچھے انداز میں لکھی۔ اپنی اس تصنیف میں شبلی تحقیق کے اعلیٰ معیار پر نظر آتے ہیں۔ اس کتاب کے لکھنے میں بڑی مشکلات پیش آئیں۔ لیکن اس سے غیر متوقع شہرت بھی نصیب ہوئی جس کا احساس خود شبلی کو بھی تھا۔ ایک خط میں لکھتے ہیں:

''میں اپنی تصانیف میں الفاروق کو سب سے زیادہ پسند کرتا ہوں۔'' [۱]

المامون، الفاروق اور النعمان لکھتے وقت شبلی میں جو احساس ابھرا وہ آگے چل کر دارالمصنفین کی شکل میں نمودار ہوا۔

اس کے علاوہ مسلمانوں کی تہذیب وتمدن پر بہت سے تحقیقی مضامین لکھ کر اسلام پر عائد الزامات کی تردید کی۔ ان مقالوں میں کتب خانہ اسکندریہ، اسلامی حکومتیں اور شفاخانہ اور رسالہ الجزیہ خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان مقالوں کی ترتیب وتدوین میں شبلی کو بہت جدوجہد کرنی پڑی تھی۔ دربدر کی خاک چھاننی پڑی تھی۔ اس سلسلے میں ان کو جن مرحلوں سے گزرنا پڑا وہ آگے چل کر دارالمصنفین کے قیام کا سبب بنا۔

شبلی سرسید کا گہرا اثر لیتے ہوئے بھی ان کی ہر بات سے مرعوب نہیں تھے۔ سرسید کی نظر دراصل ماضی سے زیادہ حال اور مستقبل پر تھی۔ وہ تاریخ کے بجائے ترقی پر اصرار کرتے تھے اور پیچھے مڑ کر دیکھنے کی جگہ آگے کی طرف قدم بڑھانے پر مصر تھے۔ وہ اس معاملہ میں اس حد تک سخت تھے کہ کہا کرتے تھے کہ روایات کے تسلسل سے قومی زندگی کی تعمیر ممکن ہے۔ اس سے بے نیاز ہونا بہت ضروری ہے لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ وہ ماضی کو کوئی اہمیت نہیں دیتے تھے۔ شبلی کو حال اور مستقبل کے ساتھ ماضی سے بھی لگاؤ تھا۔ شبلی سرسید سے متاثر ہونے کے باوجود ان کے بعض خیالات سے شدید اختلاف رکھتے تھے۔ شبلی نے سرسید کی ہمہ گیری عقل پسندی کو معتدل بنانے کی کوشش کی اور عقل ووجدان کے درمیان ایک معقول ربط پیدا کرنے کی سعی کی۔ سرسید اگر امام غزالی کے افکار کی تجدید تک محدود رہتے تو شاید ان کے اور شبلی کے درمیان فکری اختلاف کی خلیج وسیع نہ ہوتی۔ مگر سرسید جتنے امام غزالی سے دور ہو کر مغرب کی ارتیابی اور متشکانہ تحریکوں سے قریب ہوتے گئے اتنے ہی شبلی امام غزالی کے موقف سے الگ ہو کر امام ابن تیمیہ اور

۱۔ سرسید اور ان کے نامور رفقاء کی اردو نثر کا فنی وفکری جائزہ، ڈاکٹر سید عبداللہ، ص ۱۶۱

شاہ ولی اللہ کے مطمح نظر کی طرف بڑھتے گئے۔

رجحان کے اس اختلاف نے شبلی کو سرسید سے الگ ہونے پر مجبور کر دیا۔ اس علیحدگی نے ہی بعد میں ان کو ندوہ اور دارالمصنفین کے قیام پر مجبور کیا۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود شبلی کے کارناموں کو علی گڑھ تحریک سے الگ کر کے نہیں دیکھا جا سکتا۔ ڈاکٹر سید عبداللہ رقمطراز ہیں:

> ''ایک طرح سے ندوہ اور دارالمصنفین کی تحریک بھی علی گڑھ کے اثرات کی رہین منت ہے کیونکہ علامہ شبلی جوان تحریکوں کے روح رواں ہیں، علی گڑھ کے رکن رکین ہیں۔ اس لئے ان کے کارناموں کو ہم علی گڑھ کے کارناموں سے منقطع کر کے نہیں دیکھ سکتے۔ البتہ ان کو اصل اور جواب یا عمل اور ردعمل کا درجہ دیا جا سکتا ہے۔ دارالمصنفین کا کام ردعمل ہے علی گڑھ کے کام کا۔''[1]

شبلی کے قائم کردہ ادارے کو کافی ترقی نصیب ہوئی۔ ان کے خیالات کی لہر بہت تیز ہے لیکن کیا یہ درست نہیں کہ ندوہ اور دارالمصنفین اگر شبلی کی دین ہیں تو ایک لحاظ سے یہ سرسید ہی کا فیضان ہے۔ کیونکہ شبلی کا ذہن بھی سرسید کی روشن طبعی اور بلند خیالی سے روشن ہوا تھا۔ اس لحاظ سے ان کو دو مکتب نہیں بلکہ ایک ہی مکتب کے دو مدرسے سمجھنا چاہئے۔

ان ساری وجوہات کے باوجود شبلی کے ذہنی ارتقاء میں سرسید کا گہرا اور نمایاں حصہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ شبلی اگر سرسید سے بے نیاز ہو کر چلتے، ان کی فیض صحبت سے مستفید نہ ہوتے تو یہ ممکن تھا کہ وہ مولانا فاروق یا مولوی فیض الحسن بن جاتے مگر شبلی شاید کبھی نہ بنتے۔ شعرالعجم، سیرت النبی اور الفاروق جیسی اعلیٰ تصانیف اردو ادب کی زینت نہ بن پاتیں۔ شبلی کا وہ رنگ تصنیف جس نے انہیں اردو ادب کا عظیم رکن بنایا وہ سرسید کی رفاقت اور ہم نشینی کا اثر ہے۔

شبلی کی بات سرسید کی بات سے بہت زیادہ مختلف نہیں تھی۔ مضمون کا فرق کم لب ولہجہ کا فرق زیادہ ہے۔ شبلی کی طرز بیان عالمانہ اور ادیبانہ ہے۔ ایک ہی بات جو سرسید کی زبان سے ادا ہو کر مخاطب کو متوحش کرتی ہے، جب وہی بات شبلی کے منہ سے نکلتی ہے تو نہایت مانوس معلوم ہوتی ہے۔ شبلی قدیم روایات کے

۱۔ سرسید اور ان کے نامور رفقاء کی نثر کا فنی وفکری جائزہ، ڈاکٹر سید عبداللہ، ص ۷۰

پاسدار اور قومی مزاج شناس ہیں۔ وہ بھی سرسید کی طرح نئے کلام کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ مگر ان کا اصول یہ ہے کہ:

''بزرگان سلف کے مقررہ کردہ اصول کا سررشتہ کہیں ہاتھ سے نہ جانے پائے''

سید سلیمان ندوی ایک جگہ سرسید کے بارے میں لکھتے ہیں:

''سرسید میں ساری خوبیوں کے ساتھ ایک کمزوری یہ تھی کہ وہ اپنے ہم نشینوں سے آمنا وصدقنا کے سوا کوئی اختلاف برداشت نہیں کر سکتے تھے۔'' [۱]

مذہب اور تعلیم کی شبلی نے سرسید کی طرح بڑی وکالت کی ہے لیکن سرسید اور شبلی کے اسلوب بیان میں بڑا فرق ہے اور اسی فرق سے دونوں کے رجحان طبع کا اندازہ بھی ہوتا ہے۔ سرسید نے اپنی تعلیمی شہادت میں یہ تسلیم کیا ہے کہ ہندوستان میں حکمراں زبان انگریزی ہے اس لئے ہندوستان میں انگریزی کے ذریعہ تعلیم ممکن ہے۔ مولانا شبلی نے بھی بہت حد تک وہی بات کہی ہے لیکن الفاظ اور جملوں نے رجحان کا پتہ دے دیا ہے۔ مولانا شبلی کہتے ہیں۔

حکمراں زبان ہی کے ذریعہ قوم میں علوم وفنون کی ترقی ممکن ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اگر کوئی قوم اپنی زبان کو علوم وفنون کی زبان بنانا چاہتی ہے تو اس کو چاہئے کہ پہلے اپنی زبان کو حکمراں زبان بنائے۔ الحمد للہ آج ہماری زبان حکمراں زبان بننے کی کوشش کر رہی ہے اور علوم وفنون کے خزانوں سے مالا مال ہو رہی ہے۔

دوسرا اختلاف مذہبی تھا۔ شبلی نے سرسید کے مذہبی رجحانات سے اختلاف کیا ہے اور اپنی ایک نئی راہ بنائی ہے جو ان کی انفرادیت کو واضح کرتی ہے۔

سرسید مذہبی خیالات کو جدید خیالات کے مطابق ڈھالنے کی کوشش کرتے تھے۔ وہ عقلیت کی کسوٹی پر مذہب وعقائد کو پرکھتے تھے۔ شبلی مذہب کی روشنی میں مادیت کی وضاحت کرتے تھے اور عقلی جدیدیت کو عقیدت مندی کے تحت نباہنے کی کوشش کرتے تھے۔ شبلی کا خیال تھا کہ سرسید اسلامی تاریخ اور اس کے پس منظر سے واقف نہیں ہیں۔ بہرحال اس اختلاف کے باوجود انھوں نے اردو ادب میں

۱۔ حیات شبلی، سید سلیمان ندوی، ص ۲۳۵

مذہبیات، سیرت، سوانح اور تنقید کو جس نئے ڈھنگ سے سنوارا اور نکھارا وہ سرسید کے اثر سے۔ دونوں کی راہیں دو ہیں مگر منزل اور مقصد ایک۔ حالی حیات جاوید میں رقمطراز ہیں:

''علی گڑھ کالج کی مدرسی کے زمانے میں شبلی سرسید کے یہاں اکثر جایا کرتے تھے۔ ان کا کتب خانہ تمام مستند تاریخوں اور مغربی و مشرقی کتابوں کا بڑا ذخیرہ تھا۔ سرسید نے شبلی کو اجازت دے رکھی تھی کہ وہ اس سے مستفید ہوں۔ یہی وہ زمانہ ہے جس نے شبلی کو علامہ شبلی بنا دیا۔ وہ خود فرماتے ہیں۔ یہ سچ اور بالکل سچ ہے کہ اگر میری زندگی کا کوئی حصہ تعلیمی اور علمی قرار پا سکتا ہے تو اس کا آغاز اور اس کی نشو و نما اس کی ترقی، اس کی نمود، اس کا امتیاز جو کچھ ہوا وہ اس کالج سے ہوا۔'' [۱]

سرسید اور ان کے رفقاء کے انداز تحریر میں ایک بات اہل علم کو ہمیشہ کھٹکتی تھی کہ وہ اسلام کے متعلق ہمیشہ معذرت خواہانہ طرز بیان اختیار کرتے تھے اور ہر حالت میں اسلام کو مغربی علوم و خیالات کے مطابق ثابت کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ جب کہ شبلی مذہب کے موقف سے ایک قدم ہٹنا نہیں چاہتے تھے۔ سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''مسلمانوں کی موجودہ بیماریوں کا علاج ایک (سرسید) کے نزدیک یہ تھا کہ مسلمان مذہب کے سوا ہر چیز میں انگریز ہو جائیں۔ اور دوسرے (مولانا شبلی) کے نزدیک یہ تھا کہ صحیح اسلامی عقائد و اخلاق کی حفاظت اور بقاء کے ساتھ ساتھ نئے زمانہ کی صرف مفید باتوں کو قبول کیا جائے۔'' [۲]

اسی سلسلہ کی ایک کڑی یہ بھی ہے کہ مولانا نے ندوہ کے کسی جلسہ میں یا کہیں اور ایک تقریر میں فرمایا رتھا کہ:

''دوسری قوموں کی ترقی یہ ہے کہ آگے بڑھتے جائیں آگے بڑھتے جائیں لیکن

۱۔ تذکرہ سرسید، محمد امین زبیری، ص ۳۵۵

۲۔ حیات شبلی، سید سلیمان، ص ۲۴۱

مسلمانوں کی ترقی یہ ہے کہ پیچھے ہٹتے جائیں پیچھے ہٹتے جائیں۔ یہاں تک کہ
صحابہ کی صف سے جا کر مل جائیں۔'' [۱]

سرسید کو اس بات سے غصہ آیا۔ کیونکہ ان کا خیال یہ تھا کہ ایسی باتیں سن کر مسلمان اپنے راستے سے پیچھے ہٹ جائیں گے جس پر وہ لے جانا چاہتے تھے۔ چنانچہ اس کے خلاف انھوں نے سخت مضمون لکھا۔ شبلی کے نظریات اختلاف کے بارے میں عبدالمجید سالک رقمطراز ہیں:

''علی گڑھ میں رہ کر اور کالج کی پیداوار کو دیکھ کر مولانا شبلی سرسید کی تحریک کے
بعض حصوں سے سخت بیزار ہو گئے تھے۔'' [۲]

شبلی کو ان کے اس طرز سے اختلاف تھا کہ وہ قدیم کو جدید میں سمو دینے کے قائل تھے۔ اس کے برعکس شبلی جدید کو قدیم کے سانچے میں ڈھالنا چاہتے تھے۔ اسی وجہ سے شبلی کو حیات جاوید فقط مداحی نظر آئی، مگر اس رائے سے سب کو اتفاق ہے کہ شبلی خود سرسید کی اعلیٰ شخصیت اور اس کے عظیم اثرات سے متاثر ہوئے۔ دارالمصنفین بھی سرسید کے جدید خیالات کے فیض سے وجود میں آیا۔

ان تمام سیاسی، مذہبی اور تعلیمی اختلافات نے شبلی کو سرسید اور علی گڑھ کالج سے قطع تعلق کرنے پر مجبور کر دیا۔

مولانا کالج میں رہ کر تصنیف و تالیف کا کام کرتے تھے۔ لیکن ۱۸۹۶ء میں ان کو خیال ہوا کہ معمولی درس و تدریس سے آزاد رہ کر تصنیف و تالیف میں مستقلاً مشغول ہوں جو بہت مفید ہوگا۔ اس لئے مولانا نے حیدرآباد کا رخ کیا اور وہاں مولوی عزیز مرزا اور مولوی سید علی بلگرامی کے وساطت سے درخواست پیش کی جس میں اپنا مدعا ظاہر کیا۔ چنانچہ سو روپیہ کے ماہانہ وظیفہ پر تصنیف و تالیف کا کام شروع کیا۔

مارچ ۱۸۹۸ء میں سرسید کی وفات کے سال مولانا نے کالج سے استعفیٰ دے دیا۔ اس طرح مولانا کی زندگی کا پہلا دور ختم ہو گیا۔

مولانا فروری ۱۹۰۱ء میں حیدرآباد گئے اور مئی تک سررشتۂ علوم و فنون کی نظامت پر ان کا تقرر

۱۔ حیات شبلی، سید سلیمان ندوی، ص ۲۴۱

۲۔ مسلم ثقافت ہندوستان میں، عبدالمجید سالک، ص ۶۴۱

ہوگیا۔لیکن وہ فروری ۱۹۰۵ء میں اس سے مستعفی ہوگئے۔اس تھوڑی سی مدت میں انھوں نے تصنیف و تالیف کا باب وا کردیا اور ایسی پانچ کتابوں کی تصنیف کی جن میں ہر کتاب پانچ سال کی محنت ومراجعت کی طالب تھی۔ چنانچہ انھوں نے دوران قیام حیدرآباد، الغزالی، علم الکلام، سوانح مولانا روم، موازنہ انیس و دبیر اور شعرالعجم کی کچھ جلدیں تصنیف کیں۔۱۸۹۴ء میں جب ندوۃ العلماء قائم ہوا تو مولانا کی عین خواہش کے مطابق تھا اس لئے انھوں نے اس صدا پر نہ صرف لبیک کہا بلکہ اس وقت سے وہ ان کی زندگی کا مقصد بن گیا۔ چنانچہ انھوں نے اپنے آپ کو ندوہ کی خدمت کے لئے تیار کیا اور سررشتۂ علوم وفنون کی نظامت سے ۱۹۰۴ء کے آخر یا ۱۹۰۵ء کے شروع میں استعفیٰ دے دیا۔ اس سلسلے میں مولوی ضیاء الحسن صاحب علوی ندوی کو ۴؍جنوری ۱۹۰۵ء کو لکھتے ہیں:

''عزیزی! خط پہنچا۔ میں نے چونکہ استعفیٰ دے دیا اور مدارالمہام کے یہاں سے منظور بھی ہوگیا۔ صرف اعلیٰ حضرات کی منظوری باقی ہے۔ اس لئے جلد یہاں سے روانگی کا قصد ہے۔ لیکن ابھی متعین نہیں کہ کہاں جاؤں گا۔'' [۱]

فروری ۱۹۰۵ء کو حیدرآباد سے مستعفی ہوکر پہلے اپنے وطن اعظم گڑھ آئے۔ ۵؍فروری ۱۹۰۵ء کو اعظم گڑھ سے مولوی سمیع صاحب کو لکھا:

''میں مستعفی ہوکر وطن آگیا۔ اگرچہ مدارالمہام کو میرے قیام پر اعتراض تھا، لیکن میں نے ملازمت کے جوتے کو اتارنا ہی مناسب سمجھا۔'' [۲]

چنانچہ ۱۹۰۵ء میں اعظم گڑھ سے لکھنؤ تشریف لے گئے۔ مولانا شبلی کی مستقل تشریف آوری اور قیام کی خبر جب دارالعلوم کے طلبہ کو ملی تو طلبہ کی ایک انجمن نے ان کے تشریف آوری کے سلسلے میں ایک فارسی قصیدے سے خوشی ومسرت کا اظہار کیا۔

چنانچہ مولانا اپریل ۱۹۰۵ء میں باقاعدہ ندوہ کے معتمد منتخب ہوئے۔ مولانا نے ندوہ کی معتمدی کا باقاعدہ جائزہ لیا اور بہت تگ ودو سے نصاب تعلیم میں مجوزہ اصطلاحات جاری کیں۔ اور دارالعلوم کو جدید

۱۔ حیات شبلی، سید سلیمان ندوی، ص ۳۲۷

۲۔ ایضاً، ص ۳۲۷

نصاب کے فوائد و برکات کی ایک مثال بنا دیا۔ مولانا کے ذمہ اگرچہ اصلاح نصاب اور ادارہ کی علمی رہنمائی تھی، مگر ندوہ کی ترقی و استحکام سے ایسا شغف تھا کہ وہی مدار ندوہ بن گئے تھے اور انہیں کا اثر ہر طبقے میں کام کر رہا تھا۔ انھوں نے ندوہ میں جدید نصاب کو رائج کرنے پر زور دیا جو وقت کے تقاضوں کو پورا کرتا تھا۔ دارالعلوم کے نصاب میں انگریزی داخل کرنے پر بڑا زور دیا اور اس کی تعلیم کو لازمی قرار دیا۔ اپنی معتمدی کے زمانہ میں آپ نے ہندی اور سنسکرت کی تعلیم پر بھی زور دیا۔ تاکہ مسلمان طلبہ ان زبانوں کو سیکھ کر آریوں اور دوسری قوموں کا مقابلہ کر سکیں اور اسلام پر اعتراضات کرنے والوں کا منھ توڑ جواب دے سکیں۔ مولانا نے جدید عربی تعلیم پر بھی زور دیا اور دارالعلوم کے طلبہ نے جدید عربی زبان کے بولنے اور سمجھنے میں شہرت حاصل کی۔ دارالعلوم میں قدم رکھنے کے بعد مولانا نے کچھ باصلاحیت طالب علموں کو اکٹھا کیا جن میں مولانا ضیاء الحسن صاحب علوی، مولوی جواد علی خاں، عبدالسلام ندوی، شبلی متکلم، سید سلیمان ندوی کا نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔ مولانا نے اپنے علمی مضامین میں طلبہ کی تقریری و تحریری صلاحیتوں کو پروان چڑھانے والے مواد کافی فراہم کئے اور طلبہ کی ذہنی تربیت کی تاکہ اعلیٰ درجہ کے مصنف و مقرر پیدا ہو سکیں۔ اچھی تعلیم کے لئے اچھے مدرسین کی فراہمی پر بھی توجہ کی۔ وہ جہاں کہیں جاتے ہر مضمون سے متعلق اعلیٰ معیار کے اساتذہ کی تلاش میں رہتے۔ مولانا کی ندوہ میں تشریف آوری سے پہلے چھ سال تک تعلیم پہنچ چکی تھی۔ تین سال ابتدائی کے اور تین سال متوسط کے۔ ان کے آنے کے بعد دو سال درجہ اعلیٰ کے کھلے جس سے عربی تعلیم آٹھ سال میں پوری ہوگئی۔ اس کے بعد ۱۹۰۹ء میں تکمیل کا درجہ کھولا جس کا مقصد یہ تھا کہ طلبہ کسی ایک فن کو لے کر دو سال تک خاص اس فن کی تعلیم حاصل کریں اور اس میں کمال پیدا کریں۔ ۱۹۱۲ء میں تفسیر کا درجۂ تکمیل کھولا گیا۔ اس کا بڑا فائدہ یہ ہوا کہ دوسرے بڑے بڑے مدارس نے بھی اس کی اتباع کی اور اختصاصی کامل الفن علماء کے پیدا کرنے کی کوششیں شروع کیں۔ آپ نے جدید علوم کی طرف بھی توجہ کی اور قدیم منطق و فلسفہ کے بیکار حصے کو نکال کر اس کی جگہ سائنس اور فلسفہ و ریاضی کے نئے علوم کو شامل نصاب کیا۔ وہ علماء جو قدیم عربی نصاب کی اصلاح کی تجویز سے اختلاف کرتے تھے، وہ زمانے کے مسلسل اتار چڑھاؤ کے بعد مولانا کے ہم نوا ہو گئے۔ دارالعلوم کی اصلاح کے ساتھ مولانا کے ذہن میں ایک بہترین کتب خانہ بھی قائم کرنے کا خیال تھا۔ مولانا نے اس کی طرف بھی دھیان دیا اور

اپنے ذاتی کتب خانہ کولکھنؤ میں منتقل کردیا۔ اور ۱۹۰۷ء میں اس کو ندوہ کے لئے وقف کردیا۔ مولانا کی تحریک سے مولانا کے بہت سے احباب بھی اس طرف متوجہ ہوئے اور انھوں نے اپنے کتب خانے ندوہ کو وقف کردیئے۔ عطیات کے علاوہ نئی کتابوں کی خریداری کا سلسلہ بھی شروع ہوا اور مختلف مدوں سے وہ کتب خانے کے لئے پیسہ اکٹھا کرتے اور جوں ہی کوئی نئی کتاب منظر عام پر آتی اس کو منگواتے۔ یہاں تک کہ ۱۹۰۹ء میں کتب خانہ کے سرمایہ کی تعداد ۶۲۸۲ ہوگئی اور ۱۹۱۳ء میں جس وقت وہ ندوہ سے قطع تعلق کرکے اپنے وطن آئے اس وقت اس کی تعداد دوگنی ہوگئی تھی۔ مولانا کے ذہن میں غالبا ۱۹۰۲ء میں ندوۃ العلماء کی طرف سے ایک علمی رسالہ کی اشاعت کا خیال آیا اور کافی کوشش کے بعد ۱۹۰۴ء کے اواخر میں ''الندوہ'' کی اشاعت کے سامان اس طرح پورے ہوگئے کہ مولانا سید عبدالحئی صاحب مددگار ناظم شاہجہاں پور کے سبب شاہجہاں پور اس کا مقام اشاعت ہوا۔ رسالہ کے دو ایڈیٹر مقرر ہوئے۔ ایک مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی اور دوسرے مولانا شبلی نعمانی۔ اس رسالے میں بہت سے محققانہ اور عالمانہ مضامین شائع ہوئے۔ یہ ایک علمی رسالہ تھا۔ اس سے علماء کے سامنے جدید مباحث کا دروازہ کھلا۔ ان کو اسلام اور علوم اسلامیہ کی خدمت کے لئے نئے طریقے نظر آئے۔ ''الندوہ'' کا اثر خاص طور سے نوجوان علماء اور نو فارغ طلبہ پر ہوا۔ الندوہ کے زیر اثر لائق وفائق باصلاحیت مصنفین کا ایک گروہ پیدا ہوا جس میں مولانا ضیاء الحسن علوی ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا خواجہ عبدالواحد ندوی، مولانا سید سلیمان ندوی اور دوسرے طلبہ خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ ان کے بعد کی پیڑھی میں مولانا اکرام اللہ خاں ندوی، مولانا عبدالرحمٰن بلگرامی، مولانا قمرالدین ندوی وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

''الندوہ'' نے متعدد ایسے اشخاص کو روشناس کرایا جو آگے چل کر علم وفن کی مسند پر متمکن ہوئے اور جس سے ندوہ کی شہرت بڑھ گئی۔ جیسے جیسے ندوہ کی شہرت بڑھتی جاتی تھی اور اس کا کام آگے بڑھتا جاتا تھا ان کی ترقی کا ہر واقعہ مولانا کی شہرت ومقبولیت کا سبب بنتا جارہا تھا۔ مگر کسی کی ترقی اور اس کی شہرت کو برداشت کرنا ہر انسان کے بس کی بات نہیں۔ چنانچہ مولانا کی شہرت جہاں کچھ لوگوں کے لئے باعث طمانیت تھی، وہیں کچھ لوگ ان سے حسد کرنے لگے۔ اسی حسد نے بے اعتمادی اور بے اعتمادی نے مخالفت کا رنگ اختیار کرلیا۔

مولانا نے اپنی عمر کے سولہ سال علی گڑھ میں بسر کئے اور علی گڑھ سے ان کی وابستگی اس قدر معروف تھی کہ اکثر لوگ نہیں جانتے تھے کہ وہ اس تحریک سے وابستگی کے باوجود اس کے مخالف تھے۔ انہی وجوہات کے بنا پر وہ ندوہ میں شامل ہو گئے مگر عام علماء اور ان کے ناقدین یہ خیال کرتے تھے کہ یہ علی گڑھ تحریک کے آدمی ہیں اور علی گڑھ چھوڑ کر ندوہ میں اس لئے شامل ہوئے ہیں کہ اس مذہبی تحریک کو برباد کر دیں۔ رسمی علماء کی نگاہوں میں یہ بات کھٹکتی تھی کہ جو مذہبی تورع و تقدس و پابندی علماء دین کے اندر ہونی چاہئے وہ مولانا کے اندر نہیں تھی۔ اس لئے وہ طلبہ کے لئے ان کی تعلیم و محبت کو سخت مضر سمجھتے تھے۔

مولانا کی تصنیفات میں علم الکلام اور الکلام ایسی دو کتابیں تھیں جو مصنف کے ہزار احتیاطوں کے باوجود علماء کے نزدیک قابل اعتراض تھیں۔ اس لئے علماء کی ایک جماعت ایک مذہبی تعلیم گاہ کی صدارت کے لئے ان کو مناسب نہیں سمجھتی تھی۔ اس کے علاوہ ۱۹۱۰ء میں جلسۂ انتظامیہ میں مولانا خلیل الرحمٰن صاحب نے انتظامیہ کے سامنے یہ تجویز پیش کی کہ دارالعلوم سے مولانا کی معتمدی ختم کر دی جائے۔ لیکن ان کی یہ تجویز منظور نہ ہوئی تو انھوں نے بلا کسی اطلاع کے یہ تجویز پیش کی کہ دارالعلوم کے طلبہ کی مذہبی حالت کی تحقیق کے لئے ایک کمیشن بٹھایا جائے۔ جس پر مولانا نے تو سکوت اختیار کیا لیکن انتظامیہ نے منظور کر لیا۔ مخالفوں نے اس کمیشن میں اپنی طرف سے یہ وسعت بھی داخل کر دی کہ خود معتمد دارالعلوم کی کارکردگی کا بھی جائزہ لیا جائے۔ یعنی مجرم کی حیثیت سے ان کو بھی سامنے لایا جائے۔

اس تجویز کا مولانا پر اس قدر اثر ہوا کہ انھوں نے دارالعلوم سے مستعفی ہونے کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ ۳۱ راگست ۱۹۱۰ء کو اس کے متعلق مولانا حبیب الرحمٰن خاں صاحب کو ایک تفصیلی خط لکھا۔ پھر ۲۹ رستمبر ۱۹۱۰ء کو دوبارہ تفصیلی خط لکھا۔ یہ دونوں خط مکاتیب شبلی میں موجود ہیں۔ اس کے جواب میں مولانا شیروانی نے غالباً کچھ تسلی آمیز باتیں لکھیں۔ لیکن مولانا ان ہنگاموں سے ایسے بددل ہوئے کہ انھوں نے دارالعلوم کی معتمدی سے الگ ہونے کا فیصلہ کیا اور جولائی ۱۹۱۳ء میں بمبئی سے اپنا استعفیٰ دفتر میں بھیج دیا۔ ان کے ساتھ اور معتمدین یعنی مولانا سید عبدالحیٔ صاحب مرحوم اور منشی احتشام علی صاحب بھی اپنی اپنی معتمدیوں سے مستعفی ہو گئے اور بہت سے دوسرے ارکان نے بھی استعفیٰ دے دیا۔ اس کے بعد مولانا خلیل الرحمٰن صاحب مرحوم مستقل ناظم بنائے گئے اور ندوہ کا انتظام ان کے ہاتھ میں دے دیا گیا۔

مولانا کے استعفیٰ کی خبر جب طلبہ تک پہنچی تو ان کو بہت افسوس ہوا اور انھوں نے مولانا کے استعفیٰ کی واپسی کی پرزور خواہش کی۔ لیکن مولانا نے عہدہ کی ذمہ داری لینے سے انکار کر دیا۔ انکار کے باوجود بھی معمولی رکن کی حیثیت سے ان کی زندگی کا مقصد ندوہ ہی کی خدمت تھی۔ چنانچہ جولائی ۱۹۱۳ء کو طلبائے ندوہ کے نام حسب ذیل خط لکھا:

''آپ لوگوں کے پراثر خطوط پے در پے آئے ہیں۔ ایسا سنگدل نہ تھا کہ ان سے متاثر نہ ہوتا۔ لیکن موجودہ حالت میں کام کرنا ناممکن تھا اور میں دارالعلوم کو کسی قسم کا فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ مجھ کو اپنی تمام کوششوں اور جانفشانیوں کی (اگر میں نے بہ فرض کچھ کی ہیں) داد مل گئی اور میرا پورا صلہ ہے کہ جن کی خدمت کی گئی وہ اس کی قدر کرتے ہیں۔ آپ لوگ مایوس ہیں لیکن مایوسی کی کوئی بات نہیں۔ عام اسلامی جماعت بیدار ہوگئی ہے۔ وہ اپنے ہر قسم کے فوائد کو سمجھے گی اور اس کی نگہداشت کرے گی۔ ممکن ہے کہ کچھ دیر ہو لیکن جو تخم زمین پر پڑ چکا ہے وہ انشاءاللہ برباد نہ جائے گا۔'' [۱]

۱۹/جولائی ۱۹۱۳ء کو مولوی مسعود علی صاحب ندوی کو لکھا:

''ندوہ سے تعلق منقطع ہونا تو محال ہے لیکن یہ وہیں آکر فیصلہ ہوسکتا ہے کہ تعلق کی نوعیت کیا ہو۔'' [۲]

دارالعلوم کے عہدے سے مستعفی ہونے کے بعد مولانا حیدرآباد چلے گئے اور وہاں پوری دلجمعی کے ساتھ سیرت کی پہلی جلد کی تکمیل میں مصروف ہوگئے۔ طلبہ کے بہت اصرار پر مولانا دوبارہ لکھنؤ واپس آئے۔ ان کے آنے کی خوشی میں طلبہ نے ایک جلسہ کا اہتمام کیا۔ دسمبر ۱۹۱۳ء کے آخر میں آخری سال کے لڑکوں نے مولانا سے بخاری شریف کے درس دینے کی خواہش کی۔ جس کی اجازت ناظم دارالعلوم نے نہیں دی۔ طلبائے دارالعلوم ہر سال سیرت کی مجلس کا بڑی دھوم دھام سے اہتمام کرتے تھے جس میں

۱۔ حیات شبلی، سید سلیمان ندوی، ص ۵۰۰

۲۔ مکاتیب شبلی، جلد دوم، مرتب سید سلیمان ندوی، ص ۱۰۳

مولانا اپنی تقریر کرتے تھے۔ اسی بنا پر پہلے مجلس کو روکنے کی کوشش کی گئی لیکن بدنامی کے ڈر سے شرطوں کے ساتھ اس کی اجازت دے دی گئی۔ ان تمام واقعات نے طلباء کے اندر ہیجان کی کیفیت پیدا کردی۔ ۷/مارچ ۱۹۱۴ء کو طلبہ نے اسٹرائک کا عام اعلان کردیا۔ مولوی مسعود علی صاحب اس اسٹرائک کے ناظم منتخب ہوئے۔ یہ اسٹرائک اس زور وشور کے ساتھ جاری رہی کہ پورا ملک حیران رہ گیا۔

ان تمام حالات کے پیش نظر مستعفی ہونے کے بعد بھی مولانا نے اپنے ہمدرد دوستوں اور شاگردوں کو ندوہ کے علاج سے مایوس نہ ہونے دیا بلکہ اصلاح ندوہ کی تجویزوں کی طرف متوجہ کیا اور اس بات کا اعلان کیا کہ یہ میری تحریک ہے اور میں لوگوں سے التماس کرتا ہوں کہ وہ اصلاح ندوہ کے لئے فوراً تیار ہوجائیں۔ بالآخر اپریل ۱۹۱۳ء کی ابتدائی تاریخوں میں لکھنؤ میں مجلس اصلاح ندوہ کی بنیاد ڈالی گئی اور اخبار ورسائل میں اس عظیم الشان اصلاحی تحریک کی بربادی پر اس زور وشور سے ماتم کیا کہ ملک کے ایک حصے سے دوسرے حصے تک آگ لگ گئی اور ہر طرف ندوہ کا شور برپا ہوگیا۔

اس اصلاحی تحریک کو ناکام بنانے کے لئے مخالفین نے آخری حربہ استعمال کیا اور مولانا پر کفر کا فتویٰ جاری کرایا۔ دلی میں مخالف ارکان علماء کا مرکز مولانا عبدالحق صاحب حقانی کا مکان تھا۔ انہیں کے مشورے سے بعض علماء نے الکلام اور علم الکلام کی بعض عبارتوں کی بنا پر تکفیر کا فتویٰ مرتب کیا۔ جس میں ان پر الزام لگایا گیا کہ وہ قدیم مادہ کے قائل ہیں اور نبوت کو اکتسابی سمجھتے ہیں۔ یہ فتویٰ ملک میں شائع ہوا اور اشتہار کے طور پر مختلف شہروں کی دیواروں پر چسپاں کیا۔ جس پر سید عبدالسلام مالک نے مولانا سے اس بابت سوال کیا کہ کیا آپ ایسا سمجھتے ہیں جس پر مولانا نے ایک تفصیلی جواب لکھا کہ:

> ''میں مادہ عالم کو قدیم نہیں مانتا، البتہ تمام صفات الٰہی کے قدیم کا قائل ہوں اور اسی طرح نبوت کو اکتسابی بھی نہیں جانتا بلکہ اس کو عطیہ الٰہی مانتا ہوں۔'' [۱]

مولانا کے ہمدردوں اور موافقین نے آخری وقت تک یہ کوشش کی کہ مصالحت کی کوئی صورت نکل آئے۔ چنانچہ ۱۴/جون ۱۹۱۴ء کو ندوہ کا جلسہ انتظامیہ ہونا طے ہوا اور اس کا ایجنڈا رکن کی حیثیت سے مولانا کی خدمت میں روانہ کیا گیا۔ اس پر مولانا نے ۲۵/مئی ۱۹۱۴ء کو بمبئی سے ایک مفصل تحریر اس کے جواب

۱۔ حیات شبلی، سید سلیمان ندوی، ص ۵۰۶

میں بھیجی اور مصالحت کی تجویز پیش کی۔ مگر مولانا کی تجویز نا قابل قبول ٹھہری۔ مگر حیرت کی بات ہے اس کے چھ مہینے بعد نومبر ۱۹۱۴ء میں جب مولانا نے وفات پائی تو ناممکن ممکن اور نا قابل قبول قابل قبول ہو گیا۔ انتقال کے چار مہینے بعد ندوہ کے ارکان نے لکھنؤ میں اس کے سالانہ اجلاس کی تاریخ مقرر کی اور ۱۸/ مارچ ۱۹۱۵ء کو مولانا ابوالکلام آزاد صاحب کی رائے سے نواب سید علی حسن خاں صاحب مرحوم نے دفتر نظامت کے سامنے مصالحت کی آخری حجت پیش کی۔ ارکان نے اس تجویز کو قبولیت کی نظر سے دیکھا اور مولانا ابوالکلام اور نواب سید علی حسن خاں صاحب اور ارکان ندوہ نے متعدد صحبتوں میں بیٹھ کر غور کیا۔ بہت غور وفکر کے بعد دس آدمیوں کی ایک مجلس منعقد کی اور تمام معاملات پر نہایت مخلصانہ طور پر غور وفکر کیا۔ اور تمام اختلافات کے خاتمہ کا اعلان کیا۔ اس اعلان نے دونوں فریقین میں خوشی کی لہر دوڑا دی۔ لیکن افسوس کہ یہ اعلان اس وقت ہوا جب مولانا اس کو دیکھنے کے لئے موجود نہ تھے۔ مگر امید ہے کہ ان کی روح کو مسرت ضرور ملی ہوگی۔

شبلی ایک ایسے ادارے کے خواہش مند تھے جہاں سے مسلمانوں میں بیداری کی لہر پیدا کرنے اور سچے راستے پر چلنے کے لئے تصنیف و تالیف کا نظم ونسق ہو۔ اور بے غرض ہو کر لکھنے پڑھنے والوں کے لئے سہولیات فراہم کریں۔ وہ کام کرنے والوں کی ایک ایسی جماعت پیدا کرنا چاہتے تھے جو مسلمانوں میں اپنے مذہب، تاریخ، ادب اور تہذیب وتمدن کو اسلامی طرز میں پیش کریں۔ اس خیال کی تائید کے لئے ان کے ذہن میں ایک دارالمصنفین کا خیال پیدا ہوا اور وہ اپنے اس خیال کو عملی شکل دینے میں منہمک ہو گئے۔

مولانا شبلی کے ذہن میں دارالمصنفین کا خیال ایک تمثیلی شکل میں ظاہر ہوا۔ ان کے نزدیک اس زمانے کے حالات کی مثال عہد عباسیہ جیسی تھی۔ مولانا شبلی اس مثال کو سامنے رکھ کر اپنے دور میں قدیم علوم وآداب کو نئے طرز پر مرتب کرنے کے خواہاں تھے۔ ان کے زمانے میں فلسفہ نے ایک نئی شکل اختیار کی۔ منطق میں نئے شاخ وگل آئے۔ معانی و بلاغت کا اسلوب بدل گیا۔ تاریخ ایک طرح کا فلسفہ بن گئی اور مستشرقین یورپ کے زہر کا تریاق پیدا کرنے کے لئے اسلامی علوم وآداب میں سیکڑوں قسم کے جدید ابواب مختلف ضرورتوں سے پیدا ہو گئے۔

آل عباس صاحب تخت وتاج تھے۔ان کے پاس دولت کا انبار تھا جس سے انھوں نے بغداد میں بیت الحکمت قائم کیا۔اور جو لوگ علم وفن میں ماہر تھے ان کی ایک کثیر تعداد جمع کر لی۔لیکن مولانا شبلی ایک گدائے بے نوا تھے جن کے سامنے انھوں نے تصنیف وتالیف کے مختلف عنوان قائم کئے۔مثلاً جدید فلسفہ کو ملکی زبان میں تبدیل کرنا، فلسفہ جدیدہ کے مسائل پر جدید علم کلام کے رنگ میں روشنی ڈالنا، مختلف علوم، اسلامی تاریخ، اسماء الرجال، معانی وبلاغت اور تحقیقات مذاہب اور علوم جدیدہ کی تالیفات کو سامنے رکھتے ہوئے دونوں کا موازنہ کیا۔اسلامی خصوصیات کو سامنے رکھتے ہوئے ان ہی عناوین پر جدید تالیفات تیار کرنا، مخصوص علوم دینیہ، تفسیر، حدیث، فقہ، اصول فقہ، تصوف اور کلام کو نئے رنگ میں پیش کرنا۔پھر علوم اسلامیہ کی درجہ بدرجہ ترقیوں پر تبصرہ کرنا اور ان کے غلط اور صحیح حصوں کی تنقید واصلاح، فارسی، عربی اور اردو ادبیات کی تاریخ، اسلامی تہذیب وتمدن پر مورخانہ صحیح تنقید اور تہذیب اسلامی اور تمدن جدید کے تعلقات کی تشریح وتفصیل کرنا۔

علوم اسلامی کی تالیفات میں رنگ بھرنے کے لئے مولانا شبلی نے دارالمصنفین قائم کرنے کا فیصلہ کیا۔تاکہ ایک طرف مصنفین کے لئے صحیح تربیت گاہ کا کام دے اور ملک میں بلند پایہ مصنفین پیدا ہوں۔جو ان مقاصد کو پیش نظر رکھ کر اپنی تصنیف وتالیف کا سلسلہ قائم کریں۔مصنفین کی تصنیفی ضروریات ومطالعہ کے لئے ایک وسیع کتب خانہ قائم کیا جائے اور دارالمصنفین میں ایسا ماحول پیدا کیا جائے کہ باہم افادہ و استفادہ کا موقع ملے۔اسی طرح پریس اور تجارتی مکتبہ کا انتظام خوش اسلوبی سے قائم کر کے مصنفین کو طباعت واشاعت کی دشواریوں سے بچایا جاسکے۔

مولانا شبلی کے زمانہ میں سنجیدہ علمی تصانیف اور جدید علوم کی مفید کتابوں کے اردو ترجمے کا کام شروع ہوگیا تھا۔مگر ایک زبان کو علمی حیثیت سے سرمایہ دار بنانے کے لئے جس قدر علمی ذخیرہ کی ضرورت تھی، اردو کا دامن اس سے خالی تھا۔اس کمی کو پورا کرنے کے لئے مولانا شبلی میدان میں آئے۔وہ جانتے تھے کہ قوموں کی تاریخ میں مصنفین اور اہل قلم کی بڑی اہمیت ہے۔ملک کے خیالات میں انقلاب صرف اہل قلم ہی پیدا کر سکتے ہیں۔انہیں کے نوک قلم سے عمدہ مذہبی لٹریچر سامنے آسکتے ہیں۔وہی عمدہ تعلیمی نصاب تیار کر سکتے ہیں اور ہماری پچھلی تاریخ جس پر ہماری قومیت کی بنیاد ہے ہم کو یاد دلا سکتے ہیں۔اور ہم

کو ہمارے اسلاف کے اندوختوں اور کارناموں سے باخبر کر سکتے ہیں۔ اس لئے مولانا شبلی ایک ایسی علمی مجلس کی تشکیل ضروری سمجھتے تھے جو ہمارے قدیم سرمایہ سے ہماری آئندہ نسلوں کی ضرورتوں کے مطابق سامان فراہم کر کے اسے ان کے سامنے پیش کر سکے۔ یہ تصنیفات ذہنی واجتماعی نشو ونما کے لئے مفید خیال کی جائیں۔

۱۔ ملک میں نئی تعلیم کی ترویج واشاعت کے ساتھ پرانی تعلیم کی بساط سمٹ رہی تھی اور بیگانگی بڑھتی جارہی تھی۔ ظاہر ہے مسلمان اپنے علوم وفنون اور تہذیب وتمدن سے بے نیاز ہو کر ترقی نہیں کر سکتے تھے۔ دارالمصنفین کے قیام کا مقصد مسلمانوں کے مذہبی علوم کی بقا اور ان کے بزرگوں کی متروکہ علمی دولت کی حفاظت ہے۔

۲۔ مولانا شبلی چاہتے تھے کہ دنیا کی دوسری قوموں کی طرح مسلمان بھی اس کوشش میں لگ جائیں کہ اپنے پرانے علوم وفنون کو نئے اصول سے مرتب کریں۔ اور زمانہ جدید کے مطابق ان کو شائع کریں تا کہ نئی دنیا کے بازار میں ان کی قدر ومنزلت ہو۔ دارالمصنفین کے قیام کا مقصد دنیا کے مسلمانوں کے اسلاف کے عظیم الشان کارناموں کی عظمت سے آشنا اور آگاہ کرنا ہے۔

۳۔ قوم وملک کی ذہنی تشکیل اور دماغی اصلاح وتربیت کے لئے صحت بخش علمی غذا کی فراہمی ضروری ہے۔ اس کے لئے ایسے علمی ادارے کا ہونا ناگزیر ہے جہاں موضوع کا انتخاب، مواد کی فراہمی، کتابوں کا مطالعہ، مذاق ادبی کی درستی، تصنیف وتالیف کا سلیقہ، تعبیر وادا کے طریقے اور مباحث مہمہ پر تبصرہ وتنقید کے لئے کہنہ مشق مصنفین سے رہنمائی اور استفادہ کا مکمل انتظام ہو۔

۴۔ ہر قوم کے اندر اہل علم ونظر کی ایک چھوٹی سی جماعت ہوتی ہے۔ جو قوم کے عام علمی کاروبار اور ہنگامہ آرا جدوجہد سے الگ ہو کر اور ہر قسم کی مالی طمع اور دنیاوی عیش وعشرت سے بے نیاز وبے پرواہ ہو کر قوم کی دماغی نشو ونما اور علمی خدمت کو انجام دینے میں مصروف ہوتی ہے۔ علامہ شبلی اس قسم کی ایک جماعت مسلمانوں میں بھی دیکھنا چاہتے تھے جس کا مقصد اپنے مذہب، اپنی قوم، اپنے ملک، اپنے تمدن، اپنی تاریخ، اپنی زبان اور اپنے ادب ولٹریچر کی خدمت ہو۔

۵۔ دنیا میں تمام قوموں میں علوم وفنون کی ترقی وخدمت کے لئے عظیم الشان انجمنیں اور سوسائٹیاں

قائم ہیں جو ملک وقوم کی دماغی تربیت وتعلیم کی خدمات برابر انجام دیتی رہتی ہیں۔ یورپ میں ہر علم وفن کے لئے علاحدہ علاحدہ سوسائٹیاں قائم ہیں۔ خود ہمارے ملک میں بھی اس قسم کی متعدد سوسائٹیاں قائم ہیں۔ جس طرح سنسکرت کے قدیم لٹریچر کی نشر واشاعت، اس کی حفاظت وتدوین وتربیت کے لئے متعدد سوسائٹیاں موجود ہیں، اسی طرح عربی وفارسی کی تحفظ وترویج کے لئے بھی ان کی ضرورت ہے۔

جن لوگوں کو تصنیف وتالیف کا ذوق اور کسی قدر سلیقہ تھا ان کے لئے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ اگر وہ تصنیفی زندگی اختیار کریں تو ان کی معاش کا ذریعہ کیا ہو؟ اس کے علاوہ ان کی تصنیفات کی طبع واشاعت کا انتظام واہتمام کیسے ہو؟ قدیم مصنفین کا کام کتابیں مکمل کرنے کے بعد ختم ہوجاتا ہے۔ شائقین علم ان کے نسخے اور نقلیں تیار کرکے پورے ملک میں پہنچادیتے تھے۔ لیکن موجودہ دور کے مصنفین کا کام تصنیف سے بھی زیادہ مشکل ہے۔ کتابوں کی طبع واشاعت، کتابوں کی خرید وفروخت، کاپیوں و پروف کی تصحیح وترمیم وغیرہ صعوبتوں کے پیش نظر علامہ شبلی کو ایک علمی مجلس کی تاسیس کی ضرورت محسوس ہوئی۔ دارالمصنفین کا خیال مولانا شبلی مرحوم کے ذہن و دماغ میں لمبی مدت سے پرورش پارہا تھا۔ لیکن اس کا اظہار انھوں نے ندوۃ العلماء کی تعمیر کے سلسلے میں پہلی بار کیا۔ مارچ ۱۹۱۰ء میں ندوۃ العلماء کا اجلاس دہلی میں منعقد ہوا جس میں مولانا نے دارالعلوم کی سہ سالہ رپورٹ پیش کرتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

> ''قومی و مذہبی ضروریات میں جس قدر ایک قومی مدرسہ، ایک قومی کالج اور ایک قومی یونیورسٹی کی ضرورت ہے، اسی قدر ایک کتب خانۂ اعظم کی بھی ضرورت ہے۔ اگر مسلمانوں کے مذہب، مسلمانوں کے علوم، مسلمانوں کی قومی تاریخ کو زندہ رکھنا ہے تو ضروری ہے کہ ایسا کتب خانہ بہم کیا جائے جس میں علوم مذہبی کے متعلق نادر بیش بہا تصانیف موجود ہوں۔ جس میں مسلمانوں کے خاص ایجاد کردہ علوم وفنون کا کافی سرمایہ ہو، جس میں ہر فن کے متعلق وہ تمام کتابیں موجود ہوں جو اس فن کے دور ترقی کے مدارج ہیں۔ جس میں قدما کے عہد کی یادگاریں ہوں اور ان سب باتوں کے ساتھ یہ کتب خانہ کسی کا ذاتی نہ ہو بلکہ وقف عام ہو تاکہ تمام ہندوستان کے مسلمان اور بالخصوص

مصنفین اور اہل علم اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ یہ تجویز کہ ندوہ میں ایک دائرہ تالیف قائم کیا جائے جس کے ارکان کا کام صرف مطالعہ کتب اور تصنیف و تالیف ہو۔ جس طرح یورپ میں اکاڈیمیاں ہوتی ہیں، یہ بھی اسی وقت پوری ہوسکتی ہے جب ایک عظیم الشان کتب خانہ قائم کردیا جائے۔'' [۱]

سید سلیمان ندوی نے اس اجلاس میں مولانا شبلی کی مرضی سے ''ندوہ میں ایک عظیم الشان کتب خانہ کی ضرورت'' کے عنوان سے تقریر کی۔ یہ تقریر علامہ شبلی کی تقریر سے مشابہت رکھتی تھی جو انھوں نے کی تھی۔

سید سلیمان ندوی نے یہ تجویز ان الفاظ میں پیش کی ہے:

''ندوہ جس قسم کے علماء اپنے مدرسہ میں تیار کرنا چاہتا ہے وہ اس اسکیم سے ظاہر ہے کہ یہاں کے طلبہ درجہ عالمیت یا درجہ تکمیل کے بعد تصنیف و تالیف میں مشغول ہوں اور ایک بڑے پیمانہ پر صیغۂ تصنیف و تالیف قائم کیا جائے جس سے علوم و تاریخ اسلام کا احیا ہو۔ لیکن یہ ظاہر ہے کہ یہ کام اسی وقت پورا ہوسکتا ہے جب ندوۃ العلماء کے احاطہ میں ایک عظیم الشان کتب خانہ ہو جس میں تمام نادر تصنیفات موجود ہوں۔ اردو زبان کی بہترین مذہبی لائف الفاروق ہے، لیکن حضرات آپ کو معلوم ہے کہ پانچ سو صفحوں کی کتاب ہندوستان، مصر، قسطنطنیہ کے کتب خانوں کو کھنگال کر لکھی گئی ہے۔ یہ امر بدیہی ہے کہ ہر وقت مصنف کو یہ فرصت و وسعت نہیں مل سکتی کہ وہ ایک ایک تصنیف کی خاطر تمام روئے زمین کا سفر کرے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے ملک میں عمدہ تصنیفات شاذ و نادر شائع ہوتی ہیں۔ اگر قوم ندوۃ العلماء کے اقتدار میں ایک ایسا کتب خانہ تیار کردے جو تمام ضروری اسلامی تالیفات کو محیط ہو تو یقیناً یہ کہا جاسکتا ہے کہ مفید تالیفات کا ذخیرہ اردو زبان میں نہایت آسانی سے جمع ہوجائے۔ اور خصوصاً اس اسکیم کی قوت سے فعل میں آنے کی صورت پیدا ہوجائے گی کہ ممتاز

۱۔ بحوالہ سہ سالہ رپورٹ ندوۃ العلماء، شبلی نعمانی، مارچ ۱۹۱۰ء، بحوالہ حیات شبلی، سید سلیمان ندوی، ص ۵۲۹

طلبائے دارالعلوم کا ایک حصہ صیغۂ تالیف وتصنیف کے لئے وقف کیا جائے جس کی قوم کو اس وقت نہایت سخت ضرورت ہے۔

دارالعلوم کی جدید عمارت میں اس کتب خانہ اعظم کے مناسب شان ایک بلند عمارت تیار کی جائے جس میں کتب خانہ کے علاوہ ایک وسیع کمرہ ارباب قلم و مصنفین کے لئے بنایا جائے۔ جس میں قوم کی ایک جماعت تالیف وتصنیف میں مشغول ہو۔ مادری زبان کو جس کا گہوارہ طفولیت یہی دہلی ہے ان تصنیفات کے ذریعہ سے ترقی دی جائے۔ میں مناسب سمجھتا ہوں کہ ہندوستان کے ارباب قلم ومصنفین جن کی تعداد ہندوستان میں ایک مناسب حد تک ہے اس کے مصارف بطور یادگار اپنی جیب سے پورے کریں اور عمارت کا نام دارالمصنفین ہو۔ بظاہر یہ تجویزیں خیال کا اختراع معلوم ہوتی ہیں لیکن قوم کی امداد سے جہاں آج بہت سے مشکل اور بظاہر محال کام انجام پارہے ہیں، اس کتب خانہ کا قائم ہوجانا بھی بعید نہیں۔ جس کے لئے غالباً متوسط حیثیت میں پچاس ہزار کا سرمایہ کافی ہوگا۔''[1]

مزمل اللہ خاں مرحوم نے سرکاری خطاب پانے کی خوشی میں اگست ۱۹۱۰ء میں مولانا شبلی کو لکھا کہ وہ ان کی تصنیفات کی یادگار میں دارالعلوم میں ایک کمرہ بنوانا چاہتے ہیں۔ اس پر مولانا نے رسالہ ''الندوہ'' میں ایک نوٹ لکھا:

''جناب نواب صاحب موصوف نے ہم کو خط لکھا ہے کہ وہ دارالعلوم کے بورڈنگ کا ایک کمرہ ہماری تصنیفات کی یادگار بنوانا چاہتے ہیں۔ ہماری تصنیفات کی تو خیر کیا وقعت ہے لیکن نواب صاحب موصوف جو کہ علم دوست ہیں اس لئے انھوں نے علم پروری کا یہ ایک بہانہ پیدا کرلیا ہے۔ لیکن ہم یہ چاہتے ہیں کہ دارالعلوم میں ایک عمارت دارالمصنفین کے نام سے تعمیر ہو جس کا

۱۔ حیات شبلی، سید سلیمان ندوی، ص ۵۲۹۔۵۳۰

یہ مقصد ہو کہ اس میں تصنیف و تالیف کا ایک دفتر ہو اور اس سے باقاعدہ تصانیف شائع ہوں۔ باہر کے مصنف اگر چاہیں تو اس میں آکر رہیں۔ ان کے لئے ہر قسم کے آرام کا سامان مہیا کیا جائے۔ تمام ضروری علوم وفنون کی کتابیں مہیا رہیں۔ چونکہ ندوہ کا کتب خانہ اعلیٰ درجہ کا کتب خانہ ہوتا جاتا ہے اور ندوہ کے تعلیم یافتہ طلبہ میں تصنیف وتالیف کا مذاق خصوصیت کے ساتھ پیدا ہوتا ہے، اس لئے دارالمصنفین کی تجویز ہر طرح سے موزوں ہے۔'' [۱]

لیکن علامہ شبلی اس وقت سیرت النبیؐ کی تدوین وتالیف میں مشغول تھے۔ اس لئے دارالمصنفین کے خیالات کو عملی جامہ پہنانے کا موقع نہ نکال سکے۔ دوسری طرف ندوۃ العلماء کے اختلافات نے انہیں اور بھی زیادہ بددل کر دیا تھا۔ لیکن جولائی ۱۹۱۳ء میں ندوہ کی خدمت سے سبکدوش ہو گئے تو دارالمصنفین کی تجویز ان کے خیال وذہن میں زور پکڑنے لگی۔ چنانچہ یکم نومبر ۱۹۱۳ء کو منشی محمد امین صاحب زبیری کو جو اس وقت ہر ہائینس بیگم صاحبہ بھوپال کے لٹریری سکریٹری تھے، ایک خط میں لکھتے ہیں:

''ہاں یہ دونوں سلیمان وعبدالسلام اچھے بن گئے۔ کمبخت مخالفین نے اوقات اور کام میں خلل ڈال دیا ورنہ اور بھی داغ بیل پڑ رہی تھی۔ بہر حال یہ طے ہے کہ کہاں صدر مقام کروں تو پھر ارباب قلم کی تربیت شروع کروں۔ انشاء اللہ سیرت ہی کے دفتر کو اتنا وسیع کرتا ہوں کہ دائرۃ التالیف بن جائے۔ ہندوستان میں اور ہر کام کے لئے انجمنیں ہیں، لیکن تصنیفی انجمن کا میدان خالی ہے۔ اور یہ سب سے اہم کام ہے۔ ایک لائق مصنف ہزاروں آدمیوں کے دل پر حکمرانی کرتا ہے۔'' [۲]

بہر حال دارالمصنفین کا خیال مولانا کے دماغ میں اتنا زیادہ محکم ہو گیا تھا کہ انھوں نے اس کو پورا کرنے کا مصمم ارادہ کر لیا اور ۱۹۱۴ء میں ''الہلال'' کلکتہ کے ذریعہ اپنے اس منصوبے کو عام طور پر اہل ملک

۱۔ بحوالہ حیات شبلی، سید سلیمان ندوی، ص ۵۳۰

۲۔ مکاتیب شبلی، شبلی نعمانی، جلد اوّل، مرتب سید سلیمان ندوی، ص ۲۳۶

کے سامنے پیش کیا۔ انگریزی زبان میں بھی اپنے اس خیال کا اظہار کیا اور اپنے مخصوص دوستوں کو اس طرف خصوصی طور سے متوجہ کیا۔ چنانچہ مولوی ریاض حسن خاں صاحب رئیس رسول پور (ضلع مظفر پور، بہار) کو ۲۶ رفروری ۱۹۱۴ء کو ایک خط میں لکھا:

''ہاں دارالمصنفین کی تجویز الہلال میں کیا، نظر سے نہیں گزری، ضرور دیکھئے آپ اس کے خاص مخاطب ہیں۔ اس کے لئے خود وہاں تک آؤں گا۔ یہ میرا خیر کام ہے اور زمرۂ مصنفین کی دائمی خدمت ہے۔'' [۱]

اہل علم نے مولانا کے اس خیال کا بہت ہی گرم جوشی کے ساتھ استقبال کیا۔ اب اس خیال کے بعد شبلی کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ یہ تھا کہ دارالمصنفین کو کہاں قائم کیا جائے۔ مولانا نے اس سے متعلق سب سے پہلے ارکان ندوہ سے اتمام حجت کرنا چاہا۔ ۱۴ رفروری ۱۹۱۴ء کو مولانا شیروانی سے پوچھا:

''ہاں دارالمصنفین پر کیوں آپ نے سکوت کیا۔ آپ سے بڑھ کر اس کی شرکت کا حق کس کو ہے۔ میں اس عمارت کو انشاء اللہ پورا کر کے رہوں گا اور وہی شاید میرا مدفن ہوگا۔'' [۲]

پھر چند روز کے بعد ۳ رمارچ ۱۹۱۴ء کو انہیں دوبارہ لکھا:

''دارالمصنفین کی تجویز میں قطعاً طے کر چکا ہوں۔ کہیں سے انتظام نہیں ہوگا تو موجودہ ابتدائی عمارت جس کا تخمینہ پانچ ہزار روپیہ ہے میں خود اپنے پاس سے ادا کروں گا۔ چھوٹے چھوٹے بنگلے اور احباب سے بنوالوں گا۔ بہرحال اس وقت صرف آپ سے یہ مشورہ مطلوب ہے کہ کہاں بنے۔ اگر علی گڑھ یا کہیں اور بنے تو لوگ مولوی سمیع اللہ کا مقلد کہیں گے۔ اس لئے میں اتمام حجت کے طور پر چاہتا ہوں کہ پہلے ندوہ کے تمام ارکان سے پوچھ لوں۔ اگر وہ منظور نہ

۱۔ مکاتیب شبلی (دوم)، شبلی نعمانی، مرتب سید سلیمان ندوی، ص ۱۶۶

۲۔ ایضاً، ص ۱۹۹

کریں تو پھر مجھ پر اعتراض نہ ہوگا۔ پرلطف تجویزیں دارالمصنفین کے متعلق ذہن میں ہیں۔'' [۱]

چنانچہ حبیب الرحمٰن خان شیروانی نے دارالمصنفین کے لئے اپنے وطن حبیب گنج کا انتخاب کیا جس کو مولانا نے منظور نہیں کیا اور انہیں لکھا کہ:

''آپ دارالمصنفین کو حبیب گنج لے جانا چاہتے ہیں تو حضرت میں اعظم گڑھ کیوں نہ پیش کروں۔ اعظم گڑھ میں اپنا باغ اور دو بنگلہ پیش کرسکتا ہوں۔'' [۲]

لیکن مولانا کی خواہش تھی کہ دارالمصنفین ندوہ میں قائم ہو۔ چنانچہ مولوی مسعود علی خاں صاحب نے ان کو لکھا کہ دارالمصنفین لکھنؤ میں ندوہ کے احاطہ میں قائم ہو تو اس کے جواب میں ۲۷ر جولائی ۱۹۱۴ء کو انہیں لکھا:

''بھائی وہ لوگ دارالمصنفین ندوہ میں بنانے کب دیں گے کہ میں بناؤں میری اصلی خواہش یہی ہے۔ لیکن کیا کیا جائے۔ حالانکہ اس میں انہی کا فائدہ ہے۔'' [۳]

ندوہ سے اختلاف کے باوجود بھی وہ دارالمصنفین کو لکھنؤ میں ہی قائم کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ ۱۸ر جولائی ۱۹۱۴ء کو مولوی مسعود کو لکھا:

''ایک کام کرنے کا تو یہ ہے کہ دارالمصنفین کا بندوبست کرو۔ راجہ صاحب محمود آباد نے مجھ سے کہا تھا کہ میں نے نجف کے پاس زمین لی ہے۔ چاہو تو وہیں تم کو بھی دلوا دوں۔ کہو تو ان کو لکھوں اور تمام معاملات تمہارے ہاتھ سے انجام پائیں گے۔ اگر زمین مل جائے تو ایک پھوس کا بنگلہ اور چند چھپر کے کمرے بنوا لئے جائیں۔ پھر کام چلتا رہے گا۔ غالباً میری صحت بھی درست ہے۔'' [۴]

۱۔ مکاتیب شبلی، جلد دوم، شبلی نعمانی، مرتب سید سلیمان ندوی، ص ۱۹۹

۲۔ ایضاً، ص ۲۰۰

۳۔ مکاتیب شبلی (اوّل)، مرتبہ سید سلیمان ندوی، ص ۱۰۹

۴۔ مکاتیب شبلی، جلد دوم، شبلی نعمانی، مرتب سید سلیمان ندوی، ص ۱۱۰

آخر دارالمصنفین کے قیام کا مسئلہ قاضی تقدیر نے خود حل کر دیا۔ اگست ۱۹۱۴ء میں ان کے بھائی مولوی محمد اسحٰق مرحوم کی وفات پر انہیں مجبور ہو کر اعظم گڑھ آنا پڑا۔ یہاں پہنچ کر انہیں کچھ سکون و اطمینان محسوس ہوا۔ اور اسی جگہ پہنچ کر دارالمصنفین کو قائم کرنے کا فیصلہ کر لیا اور اپنے ایک گرامی نامہ میں ۴ر ستمبر ۱۹۱۴ء کو مولوی مسعود علی ندوی مرحوم کو لکھا:

''میں یہاں تکمیل کا درجہ کھول دوں گا۔ تم طلبہ کے نام سے مطلع کرو اور خود ان کو لکھ دو کہ مجھ سے خط و کتابت کریں۔ میں نے یہاں اپنا مستقل انتظام کر لیا ہے۔ ہر طرح کا آرام اور پھیلاؤ ہے۔ تعلیم کے کام شروع ہو گئے ہیں۔ کسی طرح کی کوئی رکاوٹ نہیں۔ بالکل ایک بادشاہت معلوم ہوتی ہے اور افسوس ہوتا ہے کہ میں نے کیوں اتنے دن پاجیوں میں بسر کئے۔ باغ ہے، بنگلہ ہے، حکومت ہے، گریجویٹ ہیں، اسکول ہے، تعلیمی انجمن ہے اور سب حسب دل خواہ کام کر رہے ہیں نا کہ وہاں سگان بازاری کے ساتھ عوعو میں مبتلا ہونا۔ دارالمصنفین بھی شروع ہو جائے گا۔'' [۱]

مولانا نے دارالمصنفین کی تاسیس کے لئے اپنے باغ اور بنگلہ کے علاوہ دوسرے اعزہ کو بھی راضی کر کے وہ زمینیں دارالمصنفین کے لئے وقف کر دیں اور ان کے پاس جس قدر کتابیں موجود تھیں اس کو دارالمصنفین کے لئے وقف کر دیا۔ چنانچہ اکتوبر ۱۹۱۳ء کو سید سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں:

''تمہارا انتظار بہت رہا۔ مسعود آئے بھی اور چلے گئے۔ وہ تو اس ویرانہ کو علمی کوششوں (دارالمصنفین و تکمیل وغیرہ) کی جولانگاہ بننے کے قابل خیال کرتے ہیں۔ کتابیں بقدر ضرورت مہیا ہو گئی ہیں۔ چھ سات الماریاں بھر گئی ہیں۔ وقف نامۂ باغ زیر تحریر ہے۔ بنگلہ کے بغل میں مختصر سا دارالضیوف بن گیا ہے۔ غالباً تم کو تکلیف نہ ہوگی، لیکن آؤ تو چند روز ٹھہرو۔'' [۲]

۱۔ مکاتیب شبلی (دوم)، شبلی نعمانی، مرتبہ سید سلیمان ندوی، ص ۱۱۸

۲۔ ایضاً، ص ۱۰۱

دارالمصنفین کی تکمیل کے بعد سب سے بڑا مسئلہ آمدنی کا درپیش تھا اور اس کا کوئی معقول انتظام نہیں تھا۔ اس لئے درجہ تکمیل کے وظائف کے لئے مولانا شبلی نے مولانا حمید الدین فراہی سے ۳۰ روپیہ ماہوار وظیفہ مقرر کرایا اور اتنا خود اپنے ذمہ بھی لے لیا۔ اور دارالتصنیف اور دارالتکمیل کے طلبہ کے قیام کے لئے اپنے والد مرحوم کا مکان جو بنگلہ کے قریب تھا اور دوسرے حصہ دار کے قبضہ میں تھا، کرایہ پر لے لیا۔ اس کے بعد دارالمصنفین کا تعلیمی خاکہ تیار کیا اور حسب ذیل قواعد داخلہ بنائے۔

۱۔ مدت تعلیم دو سال

۲۔ اس کی دو شاخیں ہوں گی۔ (۱) تکمیل (۲) تصنیف

۳۔ ہر طالب علم جو صرف ونحو کافی جانتا ہو اس درجہ میں داخل ہو سکے گا۔

۴۔ اس درجہ میں داخل ہونے کے لئے ایک سرسری امتحان لیا جائے گا۔

درجہ تکمیل : اس درجہ میں دو مضمون لازمی ہوں گے۔ ادب اور علوم ثلاثہ میں سے کوئی ایک یعنی قرآن مجید مع تفسیر، حدیث، علم کلام مع فلسفہ۔

درجہ تصنیف: (۱) اس میں وہ شخص شامل ہو سکے گا جس کا انشاء پردازی کافی الجملہ مذاق ہو اور عربی صرف ونحو کافی طور سے جانتا ہو اور ادب میں معمولی استعداد رکھتا ہو۔

(۲) اگر کوئی شخص عمدہ انشاء پرداز نہ ہو، لیکن عربی زبان سے ناواقف ہو تو اس کو موقع دیا جائے گا کہ عربی زبان حاصل کر سکے۔

(۳) طریقہ تعلیم فن تصنیف

۱۔ پہلے چھوٹے چھوٹے علمی عنوان دیئے جائیں گے اور مضامین لکھوائے جائیں گے۔

۲۔ پھر چھوٹے چھوٹے علمی رسالے لکھوائے جائیں گے۔

۳۔ ہر مضمون کے متعلق اس کے مآخذ بتائے جائیں گے اور تمام مآخذ مہیا کر دیئے جائیں گے کہ مطالعہ کر سکے۔

۴۔ پھر جو (یونہی یہ عبارت ناتمام رہ گئی ہے) اس کے بعد طلبہ کی جستجو ہوئی اور اس کے متعلق مولوی مسعود علی صاحب کو لکھا کہ درجہ تکمیل یا تصنیف والوں کے متعلق نقشہ ذیل کی خانہ پری کر کے بھیج دو۔

۱۔ نام اور پتہ یعنی سکونت وغیرہ
۲۔ مستطیع ہیں یا غیر مستطیع
۳۔ کسی فن کی تکمیل چاہتے ہیں؟ سردست صرف تفسیر اور ادب کی تکمیل کا انتظام ہوسکتا ہے۔
۴۔ کتنی مدت تک قیام کریں گے؟
۵۔ مقصد زندگی کیا ہے؟
۶۔ وضع ولباس وفرائض میں علماء کی وضع کے پابند رہ سکتے ہیں یا نہیں؟

''گو یہ جزئی بات ہے۔ لیکن میں شیروانی اور بوٹ تک کو ناپسند کرتا ہوں۔ قص لحیہ تو سخت ناگوار ہے۔ میں صرف تعلیم نہیں بلکہ تربیت بھی چاہتا ہوں۔ ایسے لوگ درکار ہیں جن کی صورت اور سیرت دونوں عالمانہ ہو۔ علماء کا ہمیشہ قاضی ابو یوسف کے زمانہ سے ایک خاص لباس رہا ہے۔ طلباء بھی اس کو قریب قریب استعمال کرتے ہیں۔''[۱]

چنانچہ مولانا اپنے بھائی کی وفات پر اعظم گڑھ تشریف لائے اور شبلی منزل میں بیٹھ کر اپنے مرحوم بھائی کے ادھورے کاموں کی تکمیل میں لگ گئے۔ بھائی کی وفات نے انہیں افسردہ کردیا تھا لیکن دین و ملت اور علم کی خدمت کے جوش میں کمی نہیں آئی۔

مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کی فکر، شبلی اسکول کی دھن، دارالمصنفین کے قیام اور سیرت نبویؐ کی تکمیل کا کام اس طرح ان کے دل سے لگا تھا کہ ان کے بارے میں ۱۶ر ستمبر ۱۹۱۴ء کو مولانا شیروانی کے نام ایک خط میں لکھا:

''مجھ کو اس کام کے علاوہ دارالمصنفین اور دارالتکمیل کی فکر ہے۔ ندوہ میں کام کرنا ممکن نہ تھا۔ ۶ برس تک کشاکش میں گزرے۔ جو ہوگیا وہ تعجب انگیز ہے۔ بہرحال صورت موجود یہ ہے کہ اسکول کے پاس میرا اور میرے خاندان کا باغ ہے جس کا کل رقبہ گیارہ بگھہ پختہ ہے اور اس کو وقف کررہا ہوں اور شرکاء بھی

۱۔ مکاتیب شبلی (دوم)، مرتبہ سید سلیمان ندوی، ص ۱۱۳

راضی ہو گئے ہیں۔ مسودہ لکھا جا چکا ہے۔ رجسٹری کرانا ہے۔ دو بنگلے پہلے سے موجود ہیں۔ کتب خانہ (دوبارہ) بقدر معتد بہ مہیا ہو گیا ہے اور بڑھتا جاتا ہے۔ دفتر سیرت کا کل سرمایہ اس طرف منتقل ہو جائے گا۔ بلکہ صرف کتب خانے کے لئے کافی ہوگا۔ اور دارالمصنفین کی عمارت کے لئے کچھ اضافہ ہوگا۔ چاہتا ہوں کہ اس کے چار کمرے چار عناصر اردو کے نام سے تعمیر ہوں اور عمارت پر تمام موجودہ معززین ارباب قلم کے نام کندہ ہوں۔ چندہ مشروط نہیں۔ ہر صاحب قلم چندہ دے بھی نہیں سکتا۔ اس کے ساتھ دارالتکمیل کھول رہا ہوں۔ یعنی ادب اور تفسیر کی تکمیل کے لئے طلبہ کو تیار کرو۔ دو مددگار ہوں گے۔ انتہائی صفوں کو خود پڑھاؤں گا۔ سردست طلبائے تصنیف کی تعلیم کا یہ طریقہ ہوگا کہ پہلے چھوٹے عنوانات اور ان کے متعلق ذخیرہ معلومات اور کتابیں ان کو دی جائیں گی۔ وظائف تصنیفی مقرر ہوں گے جو کم سے کم ۲۰ سے ۲۵ روپے ماہوار ہوں گے۔ دستاویز کی رجسٹری ہو جائے تو باغ کی کاٹ چھانٹ اور عمارت کی داغ بیل ڈالی جائے۔ ایک کمرہ مرحوم کے نام سے بھی تعمیر کرانا مقصود ہے۔ یہ آخر عمر کا خواب ہے اور امید ہے کہ ع

چوں ہنر ہائے دگر موجب حرماں نہ شود''

نواب عماد الملک نے دارالمصنفین کی صدر انجمنی قبول کر لی ہے۔ تکمیل دستاویز کے بعد انجمن کے قواعد اور ممبروں اور عہدہ داروں کے نام شائع ہوں گے۔''[۱]

تمام کام صحیح طور سے انجام پانے کے بعد مولانا کچھ نظم و نسق اور قواعد و ضوابط مرتب کئے اور مخصوص شاگردوں کو ارسال فرمایا کہ وہ رخت سفر باندھنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ لیکن ابھی یہ سب طے ہی پا رہا تھا کہ خود مولانا ۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء کو اس دار فانی سے کوچ کر گئے اور دارالمصنفین کی تجویز عملی شکل اختیار نہ کر سکی۔ لیکن ان کی یہ پیشین گوئی صحیح ثابت ہوئی کہ شاید وہی میرا مدفن ہو۔ اور ان کی نیک نیتی سے ان کی

۱۔ مکاتیب شبلی (اوّل)، بحوالہ حیات شبلی، سید سلیمان ندوی، ص ۶۷۷۔۶۷۸

وفات کے بعد ہی دارالمصنفین قائم ہوا۔ مولانا کے انتقال کے وقت دارالمصنفین کا کل سرمایہ دو کچے بنگلے اور کتابوں کی چند الماریوں پر مشتمل تھا۔ ان کی وفات کے تیسرے روز ۲۱ رنومبر ۱۹۱۴ء کو ان کی وصیت کے مطابق ان کے ادھورے کاموں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے مولانا حمید الدین فراہی کی دعوت پر ان کے احباب و تلامذہ نے ایک مجلس اخوان الصفا کے نام سے تشکیل کی جو مندرجہ ذیل افراد پر مشتمل تھی۔ مولانا حمید الدین فراہی (صدر)، سید سلیمان ندوی (ناظم)، مولانا عبدالسلام ندوی (رکن)، مولانا مسعود علی ندوی (رکن)، مولانا شبلی ندوی متکلم (رکن)۔

اس مجلس کا اولین مقصد سیرت نبویؐ کی تکمیل قرار پایا۔ مولانا حمید الدین فراہی اور مولانا سید سلیمان ندوی نواب سلطان جہاں بیگم فرماں روائے بھوپال کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اور سیرت نبویؐ کا ماہانہ وظیفہ جو مولانا کو ملتا تھا اس کو جاری رکھنے کی استدعا کی جس کو سرکار عالیہ نے منظوری دے دی۔ اس کے بعد مولانا کے باغ اور بنگلے کا وقف نامہ جو ادھورا رہ گیا تھا اس کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ دارالمصنفین کا نہ تو کوئی سرمایہ تھا اور نہ ہی کوئی باضابطہ جماعت تھی اور نہ ہی کوئی کاروائی شروع ہوئی تھی۔ اس لئے دارالمصنفین کے اغراض و مقاصد اور قواعد وضوابط مرتب کرائے گئے۔ سید سلیمان ندوی نے دارالمصنفین کے قائم ہونے کی خبر اخبارات میں مضامین کے ذریعہ عام کی اور مشہور اکابرین ملک سے خط و کتابت کے ذریعہ مدد کرنے اور اس میں مشترک ہونے کی درخواست کی۔ مولانا حمید الدین فراہی حیدرآباد تشریف لے گئے۔ ان کی کوششوں سے حضور نظام فرماں روائے دکن نے مولانا شبلی مرحوم کے منصب سہ صد ماہوار کو دارالمصنفین کے نام کرنے کی منظوری دے دی۔ اس کے بعد ارکان جماعت کی تصدیق و توثیق سے دارالمصنفین کے حسب ذیل مقاصد قرار پائے۔

۱۔ ملک میں اعلیٰ مصنفین اور اہل قلم کی جماعت پیدا کرنا

۲۔ بلند پایہ کتابوں کی تصنیف و تالیف و ترجمہ

۳۔ ان کی اور دیگر ادبی و علمی کتابوں کی طبع و اشاعت کا سامان کرنا

سرکار نظام نے وظیفہ کے اجراء کے لئے دارالمصنفین کی باقاعدہ رجسٹری ضروری قرار دی تھی۔ اس لئے اور ملک کے عام اعتماد کے لئے بھی رجسٹری کرانا ضروری تھا۔ چنانچہ مولانا حمید الدین فراہی نے

حیدرآباد کا سفر کیا اور مولانا شبلی کا وظیفہ دارالمصنفین کے نام منتقل کرایا۔ پھر ۴؍جون ۱۹۱۵ء کو لکھنؤ میں دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کے نام سے اس کی باقاعدہ رجسٹری کرائی گئی اور اس کے ساتھ ہی دارالمصنفین کا کام بھی باقاعدہ طور پر شروع ہوگیا۔

دارالمصنفین کا انتظام شروع ہی سے دو مجلسوں، مجلس انتظامیہ اور مجلس عامہ کے ذمہ تھا۔ مجلس انتظامیہ کے ارکان کی تعداد پندرہ تھی جس میں ہندوستان کے ہر خطہ اور ہر علاقہ کے مشہور فضلا اور اصحاب علم وکمال شامل ہوتے ہیں۔ مجلس عامہ سات ارکان پر مشتمل تھی۔ ابتدا میں مجلس انتظامیہ کی صدارت نواب عمادالملک نے قبول فرمائی اور اپنے قیمتی مشوروں اور وقیع عطیات سے نوازا۔ اور جسٹس سید کرامت حسین مرحوم نے نائب صدر ہونا منظور کیا اور دارالمصنفین کی رہنمائی قبول فرمائی۔ مجلس عامہ کی صدارت مولانا حمیدالدین فراہی کے سپرد ہوئی جو دارالمصنفین کے موسسوں میں سے تھے۔ جن کا وجود تاعمر دارالمصنفین کا سرمایہ اعتماد اور سہارا بنا رہا۔ اس کے بعد منصب صدارت پر نواب صدر یار جنگ بہادر، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی، ڈاکٹر سید محمود اور مولانا عبدالماجد دریابادی جیسے اساطین علم وادب فائز ہوئے۔

دارالمصنفین کے سب سے پہلے ناظم سید سلیمان ندوی عالم گیر شہرت کے حامل رہے۔ دارالمصنفین کے تحت درج ذیل شعبے ہیں۔

۱۔ دارالتصنیف، ۲۔ دارالاشاعت، ۳۔ دارالطباعت، ۴۔ شعبہ رسالہ معارف، ۵۔ دارالکتب، ۶۔ شعبہ تعمیرات

دارالمصنفین کی ابتدا دارالتصنیف اور دارالاشاعت سے ہوئی۔ شروع میں اس شعبہ سے صرف مولانا سید سلیمان ندوی اور مولانا عبدالسلام ندوی منسلک تھے۔ بعد میں بہت سے دیگر ممتاز ارباب قلم اس شعبے سے منسلک ہوگئے۔ ان لوگوں نے اپنی کوششوں سے تصنیف وتالیف کا معیاری اور بلند پایہ نمونہ قائم کرکے ملک کا مذاق بدل دیا جس سے ملک کے سنجیدہ اہل قلم اور مصنفین متاثر ہوئے اور اس کی عام طور پر تقلید کی گئی۔

دارالمصنفین کا بنیادی مقصد اردو زبان کی خدمت اور اس زبان میں علم وادب کی مستند اور محققانہ کتابوں کی طبع واشاعت ہے۔ اردو زبان کے علاوہ عربی اور انگریزی کی بھی بعض کتابیں دارالمصنفین کے

زیر اہتمام شائع ہوئی ہیں۔

اپنے وسیع کتب خانہ، برقی پریس اور کمپیوٹر سٹ کی وجہ سے دارالمصنفین پورے ملک میں ایک منفرد ادارہ ہے۔ اس کے رفقاء و مصنفین دنیاوی مصروفیت اور ہنگاموں سے الگ رہ کر ایثار و خلوص اور سادگی و قناعت کے ساتھ علم کی خدمت میں یکسوئی سے لگے رہتے ہیں۔ یہاں فارغ التحصیل طلبہ کو تحقیق و تلاش، تصنیف و تالیف، غور و مطالعہ اور توسیع معلومات کے لئے تیار کیا جاتا ہے اور ان کی ذہنی و دماغی تربیت اور تحریری مشق کے سروسامان بہم پہنچائے جاتے ہیں۔

دارالمصنفین کی ہر تحقیق، ہر کاوش، ہر مطالعہ، ہر غور و تجسس اور ہر تحریر کا مقصد اسلام اور اسلامی علوم کی خدمت ہے۔ اس نے اپنا مرکزی نقطہ اسلامیات کو بنایا ہے۔ دارالمصنفین نے مستند تحقیقی اور قابل قدر کتابیں شائع کیں۔ دارالمصنفین کی کدوکاوش اور تحقیق و تلاش کا اعتراف اہل علم و نظر نے بھی کیا اور اس کی حیثیت سے اس کے مخالفین بھی اس کی عظمت کو تسلیم کرتے ہیں۔

دارالمصنفین کی تصانیف مختلف النوع موضوعات سے تعلق رکھتی ہیں۔ اس لئے وہ ہر ذہن و دماغ اور ہر ذوق کے لوگوں کی دلچسپی کا سامان فراہم کرتی ہیں۔ دارالمصنفین نے جس طرح معیاری تصنیفات و تالیفات ملک کے سامنے پیش کی ہیں اسی طرح قدیم و جدید کتابوں کا مستند ذخیرہ بھی اپنے کتب خانے میں جمع کیا ہے تاکہ تصنیف و تالیف اور تلاش و تحقیق کے کام میں یہ ممد و معاون ہوں۔

باب۔ دوم

اہم رفقاء شخصیت افکار اور قلمی آثار

باب۔ دوم

اہم رفقاء شخصیت افکار اور قلمی آثار

یوں تو دارالمصنفین کے رفقاء کرام کی تعداد کافی ہے جن میں سیّد سلیمان ندوی، مولانا عبدالسّلام ندوی، مولانا مسعود علی ندوی، مولانا عبدالباری ندوی، مولانا حاجی معین الدین ندوی، مولانا ابوالحسنات ندوی، مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی، مولانا ریاست علی ندوی، مولانا نجیب اشرف ندوی، مولانا سعید انصاری، مولانا ابوظفر ندوی، مولانا ابوالجلال ندوی، ڈاکٹر محمد عزیز، مولانا محمد یوسف کوکن، مولانا محمد اویس نگرامی ندوی، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، مولانا حافظ مجیب اللہ ندوی، مولانا ضیاء الدین اصلاحی، مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی، مولانا محمد نعیم صدیقی ندوی، مولانا محمد عمیر الصدیق دریابادی، مولوی محمد منصور نعمانی، مولوی شاہ نصر احمد پھلواری، مولانا عبدالرحمان پرواز اصلاحی، مولانا محمد عارف عمری، پروفیسر اشتیاق احمد ظلی۔ ان تمام رفقائے کرام نے دارالمصنفین کی بے لوث خدمت کی لیکن وہ رفقائے کرام جنھوں نے خود کو دارالمصنفین کے لئے وقف کر دیا، ان کی شخصیت وتصانیف کا مختصر طور پر اس باب میں ذکر کیا گیا ہے۔

سید سلیمان ندوی

بیسوی صدی کے عظیم مفکر، یگانہ روزگار محقق اور فاضل ادیب علامہ سید سلیمان ندوی اپنے شفیق استاد علامہ شبلی کی طرح کثیر الاشواق، جامع الاذواق اور متنوع الکمالات شخصیت کے مالک تھے۔ آپ بیک وقت مفسر، محدث، فقیہ، متکلم، صوفی، معلم، محقق مورخ، ادیب، شاعر، خطیب، سیاسی مفکر اور سب سے بڑھ کر تقویٰ، طہارت اور مہر ومحبت کا اعلیٰ نمونہ تھے۔ سید صاحب کی شخصیت کی یہ بوقلمونی اور جامعیت

ان کے تاج کمال اور کلاہ افتخار کا وہ درآبدار تھی جس نے ان کو علمائے ہند کی صف میں ایک الگ پہچان بخش دی۔ اس جامعیت و انفرادیت کی مثال جدید ہند کی تاریخ میں کم ملے گی۔ آپ جس میدان کا رخ کرتے اس میں اپنی انفرادیت کی گہری چھاپ چھوڑ جاتے تھے۔ آپ کا شمار دارالمصنفین کے معماران اعظم میں ہوتا ہے۔ دارالمصنفین کے قیام کے بعد آپ نے خود کو دارالمصنفین کے لئے وقف کر دیا۔ ایک طرح سے سید صاحب اور دارالمصنفین ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم تھے۔

آپ ۲۲ رنومبر ۱۸۸۴ء کو بہار کے مردم خیز گاؤں دیسنہ پٹنہ میں جمعہ کے دن پیدا ہوئے۔ آپ ایک ایسے خاندان کے چشم و چراغ تھے جو علم وفضل اور تہذیب وشائستگی کے لئے مشہور تھا۔ آپ کے والد حکیم سید ابوالحسن ایک سنجیدہ عالم دین تھے۔ آپ کے بھائی سید ابوحبیب طبی مہارت کے ساتھ زہد وتقویٰ میں ممتاز تھے۔ آپ کے دادا نے آپ کا نام انیس الحسن اور کنیت ابونجیب رکھی۔ لیکن ایک پرلطف واقعہ کے بنا پر آپ کا نام سلیمان پڑ گیا۔ آپ نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ مزید حصول تعلیم کے لئے اپنے والد کے پاس اسلام پور چلے گئے۔ وہاں سے ۱۸۹۹ء میں پھلواری شریف پھر مدرسہ امدادیہ دربھنگہ بھیج دیئے گئے۔ مزید تحصیل علم کے لئے ۱۹۰۱ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں داخلہ لیا۔ اور پانچ سال رہ کر تعلیم کی تکمیل کی۔ ۱۹۰۵ء میں جب علامہ شبلی ندوہ کے معتمد تعلیم ہو کر لکھنؤ آئے تو ان کی جوہر شناس نگاہوں نے اس جوہر قابل کو پہچان لیا اور اپنی تربیت خاص میں لے لیا اور اس کی تصنیفی صلاحیت پر خصوصی توجہ دے کر ۱۹۰۷ء میں ماہنامہ ''الندوہ'' کا سب ایڈیٹر مقرر کیا۔ یہیں سید صاحب کی علمی زندگی کا آفتاب پوری تابانی کے ساتھ چمکا۔ علامہ شبلی کے زیر تربیت ان میں مضمون نگاری کا شوق پیدا ہوا اور پھر رسالہ ''الندوہ'' میں ان کا پہلا مضمون علم حدیث پر شائع ہوا۔ ۱۹۰۶ء میں سید صاحب نے عربی میں بھی مضمون نگاری شروع کی۔ ۱۹۷۰ء میں ندوہ سے فارغ التحصیل طلبہ کی دستار بندی کا پہلا جلسہ منعقد ہوا۔ اس میں سید صاحب نے قدیم وجدید علوم کے موازنہ پر اردو میں تقریر کی۔ پھر سامعین کی فرمائش پر آپ نے عربی میں بھی تقریر کی۔ لوگ حیرت میں پڑ گئے۔ ہر طرف سے نعرۂ تحسین بلند ہونے لگا۔ اس موقع پر علامہ شبلی نے فخر سے اپنا عمامہ اتار کر شاگرد کے سر

Acc. No. T-8888
Aligarh Muslim University Aligarh

پر باندھ کران کی قدر افزائی کی۔ چنانچہ سید صاحب اس عمامہ علم کو مہر عالم تاب بنانے کی ذمہ داری سے برابر دبے رہے۔

علمی کاموں میں شرکت کے بعد آپ کے ذہن کے دریچے کھلتے گئے اور آپ نے نہ صرف مضمون نگاری کے ذریعہ اپنے آپ کو تلاش کیا بلکہ یہ بھی احساس ہوا کہ ''علم دولت بھی ہے۔ قدرت بھی ہے، عزت بھی ہے''۔

تعلیم سے فراغت کے بعد آپ کے والد آپ کو خاندانی پیشہ کے مطابق طبیب بنانا چاہتے تھے۔ لیکن علامہ شبلی آپ کو تصنیف و تالیف کے میدان کا شہسوار بنانا چاہتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے آپ کے والد سے آپ کو علم کی خدمت کے لئے مانگ لیا۔ آپ بھی طبیب کے بجائے ادیب بننا پسند کرتے تھے اور اپنی خواہش کے مطابق آپ میدان ادب کے شہسوار بن گئے۔ اور ''الندوہ'' میں مختلف علمی و تحقیقی موضوعات پر مضامین لکھ کر اپنے جامع الفنون اور بہترین تحریری لیاقت کا ثبوت دیا۔ ۱۹۰۸ء میں آپ ندوۃ العلماء میں علم کلام اور عربی ادب کے استاد مقرر ہوئے۔ درس و تدریس کی مصروفیت کے ساتھ دروس الادب کے نام سے دو عربی ریڈرس مرتب کیں جو کافی مقبول ہوئیں۔ ۱۹۰۹ء میں الندوہ میں ان کے دو مضامین ''خواتین اسلام کی شجاعت'' اور ''اسلامی رصد خانے'' کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ ۱۹۱۰ء میں ان کی تیار کردہ عربی کے جدید الفاظ کی ایک ڈکشنری ''لغات جدیدہ'' کے نام سے شائع ہوئی۔ اسی سال علامہ شبلی نے سیرت نبویؐ کی تالیف و تدوین کے عظیم الشان منصوبے کا آغاز کیا تو سید صاحب کو اس کا لٹریری اسسٹنٹ بنایا۔ انھوں نے محنت و مطالعہ سے اس انتخاب کو جس طرح سچ ثابت کیا اس کا اندازہ علامہ شبلی کے اس خیال سے کیا جا سکتا ہے کہ اگر وہ سیرت پوری نہ کر سکے تو سید سلیمان کر دیں گے۔ ۱۹۱۱ء سے ۱۹۱۲ء تک وہ الندوہ کی ادارت کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ ۱۹۱۳ء میں شبلی کے ندوہ سے مستعفی ہو جانے کے بعد سید صاحب نے بھی ندوہ سے سبکدوش ہو کر مولانا آزاد کی دعوت پر کلکتہ کا رخ کیا اور الہلال کی ادارت میں شامل ہو گئے۔ لیکن مولانا آزاد سے ذہن مطابقت نہ پیدا کر سکا اس لئے کچھ ہی دنوں کے بعد الہلال کو

خیر آباد کہہ دیا اور علامہ شبلی کی ایماء پر پروفیسر عبدالقادر کی کوششوں سے دکن کالج پونا میں عربی و فارسی کے پروفیسر ہو گئے۔ اسی قیام کے دوران ایک اہم تصنیف ارض القرآن کی ابتداء کی۔ پہلی جلد ترتیب دی اور دوسری کا مواد فراہم کیا۔ پونا کے دوران قیام ۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء کو علامہ شبلی راہی ملک عدم ہو گئے۔ مرض الموت میں شفیق استاد نے عزیز شاگرد کو تار دے کر بلوایا، مگر سید صاحب تار کے بجائے دل کی آواز سن کر استاد کے آستانے پر پہنچے تو محبوب و مربی استاد موت و زیست کی آخری نبرد آزمائی میں مصروف تھے۔ اسی حالت میں سیرت کی تکمیل کی وصیت کی جس کو سعادت مند شاگرد نے مستعدی کے ساتھ پورا کیا۔

استاد کی وفات کے بعد سید صاحب پونا کی نوکری چھوڑ کر اعظم گڑھ آ گئے اور ان کے تخیل کے مطابق دارالمصنفین کو مولانا مسعود علی کے انتظامی تعاون، مولانا عبدالسلام ندوی کے علمی اشتراک اور اپنے خون جگر سے بقول سید صباح الدین عبدالرحمان ''علم کا قرطبہ، فن کا الحمراء اور فضل کا بیت الحکمت بنا دیا۔'' [۱]

اس طرح یہ ادارہ علامہ شبلی کے تخیل سے بھی بہت آگے بڑھ گیا۔

آپ نے اپنی تصنیف ''ارض القرآن'' کی پہلی جلد کی اشاعت سے دارالمصنفین کے تصنیفی کام کی ابتدا کی۔ چنانچہ اہل علم نے اس کتاب کے آئینہ میں دارالمصنفین کے روشن مستقبل کا نقشہ دیکھا۔

سید صاحب سیاست کے مرد میدان نہ تھے بلکہ آپ کا شوق خالص علمی تھا۔ آپ سیاست کے بھنور سے بچتے رہے۔ لیکن قومی و ملی کاموں کی شہرت کی وجہ سے مجبوراً انھیں تمام قومی و سیاسی تحریکوں میں حصہ لینا پڑا۔ اور آپ نے ۱۹۱۵ء سے ۱۹۱۶ء تک مولانا عبدالباری فرنگی محلی کے ساتھ سیاسی تحریکوں سے بھی وابستہ رہے۔ آپ اپنے استاد کی طرح ملکی سیاست میں آزادی کے حامی اور اسلامی سیاست میں اتحاد اسلامی پر ایمان رکھتے تھے۔

۱۹۱۶ء میں آپ نے دارالمصنفین کے علمی آرگن کے طور پر رسالہ ''معارف'' جاری کیا جس کی ضیا

۱۔ مطالعہ سلیمانی، مسعود الرحمان ندوی، کلیدی مقالہ، سید صباح الدین عبدالرحمان، ص ۳۰

پاشی سے دنیائے علم آج تک منور ہے۔ قیام دارالمصنفین کے ابتدائی دور میں آپ نے اس کی علمی شاخ قائم کرنے اور اسے ترقی وشہرت کے بام عروج پر پہنچانے کے لئے بہت تگ ودود کی اور آپ کی لامحدود کوششوں اور حسن نیت کے نتیجے میں دارالمصنفین کی شہرت وعزت بہت جلد پورے ملک میں قائم ہوگئی۔

سید صاحب نے ۱۹۰۹ء میں مجلس خلافت کے پہلے اجلاس میں جو لکھنؤ میں منعقد ہوا تھا ایسی پر درد تقریر کی کہ مسند صدارت سے پائیں تک ساری مجلس بزم ماتم بن گئی۔ ۱۹۲۰ء میں مولانا محمد علی کی قیادت میں مجلس خلافت کا جو وفد جزیرۃ العرب کے مقامات مقدسہ کے تحفظ اور ترکی کے معاملات میں انصاف طلبی کے لئے انگلستان بھیجا گیا تھا، اس میں خلافت کی مذہبی رہنمائی کے لئے سید صاحب کا انتخاب ہوا۔ اس وفد میں سید صاحب کی حیثیت صرف ایک معزز رکن ہی کی نہیں تھی بلکہ ایک محقق، مفکر اور فاضل کی تھی۔ ۱۹۲۰ء کے آخر میں ترک موالات کی تحریک شروع ہوئی۔ سید صاحب نے سفر یورپ سے واپسی کے بعد اس میں پورے جوش کے ساتھ حصہ لیا۔ ۱۹۲۱ء میں کانگریس کا ایک اجلاس احمد آباد گجرات میں ہوا۔ سید صاحب اس میں شریک ہوکر کانگریس ورکنگ کمیٹی کے ممبر منتخب ہوئے۔ ۱۹۲۲ء تک دارالمصنفین کا آفتاب شہرت نصف النہار پر پہنچ چکا تھا۔ رفقائے دارالمصنفین کی متعدد تالیفات نے ارباب علم ونظر کو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔

سید صاحب طویل مدت تک ندوہ کے معتمد تعلیم تھے۔ لیکن ۱۹۲۵ء میں اس کے مسائل کی طرف خصوصی توجہ کی۔ ۱۹۲۶ء میں سید صاحب اپنی قیادت میں مجلس خلافت کا ایک دوسرا وفد لے کر حجاز گئے۔ شاہ سعود نے مسئلہ حجاز کے سلسلہ میں تمام دنیا کے مسلمانوں کے نمائندوں کی ایک کانفرنس مکہ معظّمہ میں طلب کی تھی۔ اس میں بہت سے ملکوں کے وفود شریک ہوئے۔ تمام ملکوں کے نمائندوں نے سید صاحب کو کانفرنس کا نائب رئیس منتخب کیا۔ وہاں سے واپسی کے بعد آپ زیادہ تر علمی، مذہبی اور تعلیمی کاموں میں مصروف رہے۔ ۱۹۳۶ء میں آل انڈیا فلسطین کانفرنس کی صدارت میں آپ نے جو خطبہ پڑھا اس کو کافی شہرت حاصل ہوئی۔ اس وقت تک آپ کی شہرت کافی بلندیوں تک پہنچ گئی تھی۔ آپ برابر علمی سفیر بنے

رہے۔۱۹۴۳ء میں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے آپ کو ڈی لٹ کی اعزازی ڈگری عطا کر کے آپ کو ممتاز کیا۔ یہی سال ان کی زندگی کے ایک اہم موڑ کی حیثیت رکھتا ہے۔آپ کی ذاتی زندگی کافی پاکیزہ تھی۔ آپ نے مولانا اشرف علی تھانوی کے آستانہ تصوف ومعرفت پر اپنی جبیں نیاز خم کردی۔اس کے بعد سے آپ کی پوری زندگی زہدوتقویٰ میں ختم ہوئی۔

۱۹۴۵ء ہی سے آپ کی صحت کافی خراب رہنے لگی تھی۔ پھر بھی اپنے علمی مشن کی تکمیل میں آپ کی مصروفیت برابر بڑھتی ہی رہی اور آپ اپنی صحت کی پروا کئے بغیر دور دراز کے مقامات کا سفر بھی کرتے رہے۔صحت کی خرابی کے بعد بھی آپ ندوہ میں رہ کر اس کی تعلیمی و مالی حالت درست کرنے کا ارادہ کررہے تھے لیکن اس کی صورت پیدا نہ ہوسکی او نواب حمیداللہ خاں والی بھوپال کی دعوت پر ریاست کے دارالقضاء اور عربی مدارس کی اصلاح وترقی کے کام کی پیش کش کو قبول کرلیا اور ۱۹۴۶ء میں بھوپال کے قاضی القضاۃ اور جامعہ مشرقیہ کے امیر کے منصب پر مامور ہوئے۔لیکن دارالمصنفین اور ندوۃ العلماء سے آپ کا رشتہ برابر قائم رہا۔۱۹۴۶ء میں حج کی سعادت نصیب ہوئی۔جس جہاز سے روانہ ہوئے اس کے امیرالحجاج بنائے گئے۔حجاز پہنچ کر شاہ سعود کے مہمان خصوصی ہوئے۔دسمبر ۱۹۴۹ء میں بمبئی اور بھوپال سے ہوتے ہوئے دارالمصنفین میں مستقل قیام کے ارادے سے اعظم گڑھ آئے لیکن شرکاء کار کے ناروا سلوک سے دل برداشتہ ہوکر مجبوراً اپنے ہی لہو سے سینچے ہوئے اس دبستان شبلی سے الگ ہوگئے اور ۱۹۵۰ء میں پاکستان منتقل ہوگئے۔

علمی، مذہبی اور قومی خدمت انجام دیتے ہوئے علم وفضل کا یہ آفتاب ۷۱ سال تک اپنے علم کی ضیا پاشی کرنے کے بعد ہمیشہ ہمیشہ کے لئے غروب ہوگیا۔علم وعرفان کا یہ نادرالوجود سنگم ہماری ذہنی تاریخ میں ہمیشہ یاد رہے گا۔

سید صاحب اپنے علم وفضل اور سیرت وکردار کے اعتبار سے پرکشش شخصیت کے مالک تھے۔ قدرت نے آپ کو ظاہری خوبصورتی بھی بہت فیاضی سے عطا کیا تھا۔آپ سراپا وقار اور مجسم متانت

تھے۔ضبط وتحمل اور صبر وشکر ان کی شخصیت کے نمایاں جوہر تھے۔کم آمیزی، عافیت جوئی اور سنجیدگی آپ کی عادت تھی۔آپ کم سخن اور خاموش طبع تھے جس کی وجہ سے آپ کے اساتذہ آپ کو کند ذہن سمجھ کر بے اعتنائی برتتے تھے۔لیکن دنیا میں شہرت حاصل کرنے کے بعد آپ نے اپنی افتادِ طبع کو بدلنا شروع کیا اور آخر میں شگفتہ مزاج ہو گئے تھے۔آپ کا ذوق جمال بھی کافی بلند تھا۔آپ کی ایک ایک ادا خوش ذوقی اور جمال پسندی کا آئینہ دار تھی۔آپ کے مزاج میں شروع سے ہی علم و بردباری، تحمل، صلح جوئی اور عفو درگزر کا مادہ تھا۔اگر کوئی آپ سے سختی کرتا تو آپ اس کا جواب نرمی سے دیتے۔محبت، اعتماد، مسامحت تا حیات سید صاحب کا شعار اور دستور العمل رہا۔آپ مرنجا مرنج طبیعت کے مالک تھے۔آپ کو اپنے استاد علامہ شبلی سے بے پناہ محبت وعقیدت تھی۔آپ خود کو ان کا فرزند معنوی کہا کرتے تھے۔استاد کی طرح ہونہار و باصلاحیت نوجوانوں کی تربیت کا خاص ملکہ رکھتے تھے اور اپنی جوہر شناس نگاہوں سے لائق اور ذہین طلبہ کو منتخب کر کے ان کی علمی رہنمائی بڑی شفقت وتوجہ سے کرتے۔اس نیر تاباں کی شعاعوں سے نہ جانے کتنے ذرے چمک اٹھے۔

آپ کے علمی ذوق سے جو لوگ بھی استفادے کی خواہش کرتے تھے آپ انھیں مایوس نہ کرتے۔ تلاش وتحقیق اور کثرت مطالعہ آپ کی شخصیت کے خاص جوہر تھے۔بیماری اور کمزوری کے عالم میں بھی آپ کا مطالعہ جاری رہتا۔آپ کی شخصیت مجسم علم تھی ایسا علم جو پاکی عقل وخرد کا امین اور عفت قلب ونگاہ کا پاسبان ہوتا ہے۔آپ کے تحقیقی اصولوں اور علمی طریقہ کار پر خلیق احمد نظامی اس طرح رقم طراز ہیں۔

> ''سید صاحب کا احاطۂ علم اور دائرہ معلومات بہت وسیع تھا۔وہ ایک زندہ دائرۃ المعارف تھے جس سے علم وعرفان کی شعاعیں پھوٹتی تھیں۔جس موضوع پر گفتگو کرتے ٹھہر ٹھہر کر سمجھا سمجھا کر کہ سننے والے پر ''فتاد سامعۂ در موجۂ کوثر و تسنیم'' کا عالم طاری ہو جاتا۔ان کی گفتگو میں اس سمندر کی خاموش روانی تھی جس کہ تہہ میں موتیوں کے خزانے بھرے ہوں۔قرآن وحدیث، فقہ، تاریخ

چاروں کا گہرا مطالعہ علیحدہ علیحدہ کیا تھا۔ پھر ان سب کو مربوط کر کے حکمت دین کی اکائی میں ڈال دیا تھا۔ ان علوم کا ایک جگہ اس طرح جمع ہو جانا کہ وہ علمی شخصیت کا جزو بن جائیں، ان کا کا امتیازی وصف تھا۔ وسیع مطالعہ، مستحضر علم اور قوی حافظے نے ان کی علمی شخصیت کا وقار بہت اونچا کر دیا تھا۔'' [۱]

سید صاحب اپنے طریقہ تصنیف اور طرز تحقیق و جستجو میں اپنے استاد و مربی علامہ شبلی کے مسلک و روایت کے امین تھے۔ آپ کی علمی گفتگو بھی معلومات کا بیش بہا خزانہ لئے ہوتی تھی۔ ایسی نادر معلومات کتابوں کے مطالعہ سے بھی حاصل ہونا مشکل ہے۔

آپ کو مختلف علوم وفنون پر اتنی دسترس حاصل تھی کہ اس بات کا فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا کہ آپ کے شغف و مہارت کی اصل جولانگاہ کیا ہے۔ جو جس شغف سے متاثر ہوا انھیں اسی میدان کا راکب قرار دے دیا۔ مولانا علی میاں نے قرآنیات اور علم کلام کو سید صاحب کا امتیازی مضمون قرار دیتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''میں نے معاصر علماء میں کسی شخص کا مطالعہ قرآن مجید و علوم قرآن کا اتنا وسیع اور گہرا نہیں پایا اور علم کلام و عقائد پر سید صاحب کی نظر بہت عمیق و وسیع تھی۔'' [۲]

آپ کی پوری زندگی سادگی، قناعت اور بے نیازی سے معمور تھی۔ ایثار و قربانی پوری زندگی آپ کا اصول رہا۔ آپ نے کبھی علم کو جاہ و مال کا ذریعہ نہیں بنایا۔ انھیں خصوصیات کی بنا پر آپ علم و شہرت کے افق پر علامہ سید سلیمان ندوی بن کر روشن ہوئے اور دارالمصنفین علم و تحقیق اور تالیف کا تاج محل بن گیا۔ سید صاحب کی پہلو دار شخصیت کا نقشہ نعیم احمد صدیقی نے اس طرح کھینچا ہے:

''سید صاحب اپنے علمی تبحر اور فضل و کمال کے ساتھ بے حد بوقلمون، متنوع الصفات اور مختلف الکمالات شخصیت کے حامل تھے۔ وہ بیک وقت مورخ بھی

۱۔ مطالعہ سلیمانی، مرتبہ مسعود الرحمٰن ندوی، محمد حسّان ندوی، رہنما مقالہ، خلیق احمد نظامی، ص ۵۱

۲۔ پرانے چراغ، حصہ اول، سید ابوالحسن علی ندوی، ص ۵۸

تھے اور محقق بھی، متکلم بھی تھے اور معلم بھی، نقاد بھی تھے اور لغت نویس بھی۔ غرض ان کے قلم کی جولانیوں سے کوئی میدان بھی محروم نہیں رہا۔ ادب وتنقید کا میدان ہو یا تاریخ وسیر کا، سیاسی موضوعات ہوں یا دقیق علمی بحثیں، ہر موضوع پر ہر وقت ان کا اشہب قلم یکساں جولانی دکھاتا تھا۔ اور ان سب تخلیقات کے پس منظر میں سید صاحب کی رنگا رنگ شخصیت قوس قزح کی طرح نمایاں رہتی ہے۔ وہ اعتدال، توازن، وہ لینت ومروت، ومتانت اور وقار، وہ خودرائی سے نفرت، وہ انکسار وتواضع، سادگی وخاکساری ووسیع النظری، وعالی ظرفی، و احتیاط ودیانت، وحق گوئی، وثبات قدمی، وخوش طبعی اور شگفتہ مزاجی، وکثرت مطالعہ اور ذوق وجستجو وجذبہ عفو مسامحت جو سید صاحب کی سیرت وکردار کے نمایاں ترین جوہر تھے۔ ان کے عکس ونقش سے سید صاحب کی کوئی بھی تصنیف و تحریر خالی نہیں ملتی۔''[1]

سید صاحب کی دینی وعلمی خدمات کا دائرہ جتنا وسیع ہے اس کا مقصد بھی اتنا ہی بلند ہے۔ یعنی اسلامی احکامات وتعلیمات کی صحیح ودلنشین تعبیر وترجمانی اور اسلامی علوم وفنون نیز تاریخ اسلامی کی محققانہ مرقع نگاری، ان کی بیشتر ہی نہیں بلکہ جملہ تصانیف کا مرکزی نقطہ ہے۔ آپ کی ادبی تالیفات کی فہرست مختصر تعارف کے ساتھ پیش کی جاتی ہیں۔

۱۔ **لغات جدیدہ** : ندوۃ العلماء کے سالانہ اجلاس میں عربی کے جدید الفاظ کی ایک ڈکشنری ترتیب دینے کا باہمی فیصلہ ہوا اور یہ کام علامہ سید سلیمان ندوی کے سپرد ہوا۔ جس کو سید صاحب نے پوری مستعدی کے ساتھ مرتب کر کے اجلاس لکھنؤ ۱۹۱۲ء میں پیش کیا جو لغات جدیدہ کے نام سے موسوم ہوئی۔

۲۔ **ارض القرآن** : یہ سید صاحب کی ابتدائی تصنیف ہے۔ اس کا آغاز دکن کالج پونا کے دوران قیام کیا

۱۔ علامہ سید سلیمان ندوی شخصیت وادبی خدمات، نعیم احمد صدیقی، ص ۱۲۷۔۱۲۸

تھا۔ اس کتاب کو آپ نے تاریخ و سیرت کا ایک اہم ماخذ بنا دیا۔ اس میں قدیم عرب کے جغرافیہ اقوام عرب کے پرانی، مدنی و تمدنی تاریخ پر تحقیقی روشنی ڈالی گئی ہے۔ بقول شاہ معین الدین احمد ندوی:

''یہ درحقیقت سیرت النبیؐ جلد اول کا مقدمہ ہے۔ مگر چونکہ یہ زیادہ طویل ہو گیا اس لئے اس کا صرف خلاصہ سیرت میں لیا گیا ہے۔'' ۱

۳۔ سیرت النبیؐ جلد سوم تا ششم : سیرت النبیؐ جلد دوم اگرچہ علامہ شبلی کی لکھی ہوئی تھی لیکن اس کے مسودہ میں بہت سی بیاض غائب تھیں۔ سید صاحب نے اس کو پایہ تکمیل تک پہنچایا اور ۱۹۲۰ء میں اس کی اشاعت ہوئی۔ اسی سال سیرت کی تیسری جلد لکھی گئی۔ اس میں معجزہ کی حیثیت اس کے امکان و وقوع پر فلسفہ قدیم، علم کلام، فلسفہ جدید اور قرآن کے نقطہ ہائے نظر سے مبسوط تبصرہ ہے۔ سیرت کی چوتھی جلد ۱۹۲۴ء میں شائع ہوئی۔ اس میں اسلام کے بنیادی عقائد سے بحث ہے جس میں نبوت، وحی، ملائکہ، قیامت، سزا و جزا اور جنت و دوزخ وغیرہ جیسے مابعد الطبیعی مسائل پر بحث ہے۔ سیرت کی پانچویں جلد ۱۹۳۵ء میں منظر عام پر آئی۔ یہ عبادات کے موضوع پر مشتمل ہے۔ اس میں اعمال صالحہ کی اہمیت و افادیت اور اس کے اقسام پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ سیرت النبیؐ کی چھٹی جلد اخلاق کے موضوع پر مشتمل ہے جس میں اسلام میں اخلاقی تعلیمات کی مرقع آرائی کی گئی ہے۔ یہ سلسلہ سیرت کی سب سے اہم جلد ہے کیونکہ سبھی مذاہب اخلاق کو حقوق العباد کے مساوی قرار دیتے ہیں اور اسلام میں تو اس کی اور بھی زیادہ اہمیت ہے۔ یہاں تک کہ حضورؐ نے تو اپنی بعثت کا مقصد ہی مکارم اخلاق کی تکمیل بتایا ہے۔ ڈاکٹر محمد الیاس صاحب اس کی اہمیت پر اس انداز میں روشنی ڈالتے ہیں:

''اخلاقیات کے موضوع پر بلاشبہ اردو میں یہ سب سے عمدہ، جامع اور بلند پایہ تحقیقی تصنیف ہے۔ سید صاحب کا کمال ہے کہ انھوں نے سلسلہ سیرت میں اخلاقیات کے ان تمام پہلوؤں کو روشن ترین سیرت نبویؐ کا مؤثر ترین مجموعہ

۱۔ حیات سلیمان شاہ معین الدین احمد ندوی، ص ۶۰

بنادیا ہے۔''[۱]

سیرت النبی جلد ہفتم میں سید صاحب معجزات، عقائد، عبادات اور اخلاق کے بعد معاملات کا حصہ بھی لکھنا چاہتے تھے اور معارف میں اس بات کا اعلان بھی کیا تھا۔ مگر دوسری مصروفیات اور ذاتی مسائل کی وجہ سے اسے تکمیل تک نہیں پہنچا سکے۔ آپ کی وفات کے بعد صباح الدین عبدالرحمان صاحب کی کوششوں سے ۱۹۸۰ء میں ۲۷ سال بعد شائع ہوئی۔ لیکن بنیادی مباحث کے اعتبار سے یہ کتاب ناقص اور نامکمل نہیں کہی جاسکتی۔

۴۔ **خطبات مدراس** : یہ کتاب سید صاحب کے آٹھ خطبات کا مجموعہ ہے۔ یہ خطبہ انھوں نے اسلام اور پیغمبر اسلام سے متعلق مدراس مسلم ایجوکیشنل ایسوسی ایشن کی فرمائش پر پیش کئے تھے۔ پہلے خطبے میں آپ نے دکھایا ہے کہ انسانیت کی تکمیل صرف انبیائے کرام کی سیرتوں سے ہی ہوسکتی ہے۔

دوسرے خطبہ میں حضورؐ کی حیات مبارکہ کے دائمی اور عالم گیر نمونہ عمل ہونے پر بحث کر کے سیرت محمدیؐ کے تاریخ اور تکمیلی پہلوؤں اور اس کی جامعیت وعلمیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

تیسرے خطبہ میں سیرت نبویؐ کے تاریخی پہلوؤں کا مفصل ذکر ہے۔ اس میں سیرت کے تمام ماخذوں، قرآن مجید، کتب حدیث، مغازی وسیرت، تاریخ وتراجم اور شمائل سب کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔

چوتھے خطبے میں آپؐ کی کاملیت پر مفصل بحث ہے جس میں دکھایا گیا ہے کہ آپؐ کی زندگی کی ایک ایک ادا کامل محفوظ اور لائق تقلید ہے۔

پانچویں خطبے میں آپؐ کی جامعیت پر روشنی ڈالی گئی ہے اور دکھایا گیا ہے کہ آپ کے سوا کسی پیغمبر کی زندگی جامعیت کے ساتھ مکمل موجود نہیں۔

چھٹے خطبہ میں سیرت نبویؐ کے عملی پہلوؤں کو روشن کیا ہے اور دکھایا ہے کہ اسلام نے جو اخلاقی تعلیمات دیں آپؐ کی زندگی اس کا عملی نمونہ ہے۔

۱۔ دارالمصنفین کی تاریخی خدمات، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ص ۱۹۲

ساتویں خطبہ میں دنیا کے دوسرے مذاہب کے مقابلہ میں پیغام محمدیؐ کی جامعیت اور عالمگیری اور اس کی پیدا کردہ اصلاحات اور دوسری انقلاب انگیز خصوصیات پر بحث کی گئی ہے۔

آٹھویں خطبہ میں پیغام محمدیؐ کی بنیادی تعلیم کو بتلایا اور دکھایا گیا ہے۔ اور اس بات سے بحث کی گئی ہے کہ پیغام محمدیؐ نے ہی دنیا کو انسانی معراج کمال تک پہنچایا۔ شاہ معین الدین احمد ندوی اس کتاب کے بارے میں رقمطراز ہیں:

''درحقیقت یہ تنہا کتاب اسلام اور پیغمبر اسلام کی صداقت وعظمت اور دوسرے مذاہب پر اس کی برتری کے لئے کافی ہے۔'' [۱]

۵۔ سیرت عائشہؓ : سید صاحب کی مشہور ومعروف تصنیف ہے۔ اس کا آغاز آپ نے دور طالب علمی میں ہی کیا تھا مگر اس کی تکمیل بعد میں ہوئی۔ اس میں حضرت عائشہؓ کے واقعات زندگی، ان کے اخلاق و عادات، کردار کی پاکیزگی اور ان کی علمی وعملی صلاحیت پر مکمل روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ حدیث کی روشنی میں ترتیب دی ہوئی ایک علمی وعملی تاریخ ہے۔ اس کتاب کی تصنیف کا مقصد اصلاح وتربیت ہے۔ یہ کتاب سید صاحب نے مسلمان عورتوں کی اصلاح اور ان کو انحطاط سے بچانے کے لئے لکھی۔ اس میں ایک مسلم عورت کو اپنی زندگی کو بہتر بنانے کے تمام نمونے موجود ملیں گے۔ اس کتاب کی تمام طبقوں میں خاطر خواہ پذیرائی ہوئی۔ شاعر مشرق علامہ اقبال کی نظر سے جب یہ کتاب گزری تو انھوں نے سید صاحب کو ایک خط میں تحریر فرمایا:

''سیرت عائشہؓ کے لئے سراپا سپاس ہوں۔ یہ ہدیۂ سلیمانی نہیں سرمۂ سلیمانی ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے سے میرے علم میں بہت اضافہ ہوا۔ خدا تعالیٰ جزائے خیر دے۔'' [۲]

۱۔ معارف، سلیمان نمبر، ص ۱۹۰

۲۔ مشاہیر کے خطوط، ضیاء الدین اصلاحی، ص ۱۱۲

۶۔رحمت عالم : یہ مختصر مگر جامع کتاب ہے جو بچوں، عورتوں اور معمولی پڑھے لکھے لوگوں کے لئے بہت ہی آسان اور عام فہم زبان میں لکھی گئی ہے۔اس کتاب میں آپؐ کے مختصر حالات زندگی کو آسان زبان میں تحریر کیا گیا ہے۔ساتھ ہی صحابہ کرام کا ذکر بھی ہے۔آخیر میں آپؐ کے اخلاق و عادات کا ذکر بھی ہے۔یہ کتاب فن سیرت نگاری کا بہترین نمونہ ہے۔

۷۔عرب و ہند کے تعلقات : یہ سید صاحب کی خالص علمی و تاریخی تنقید ہے۔یہ کتاب اپنی معلومات کی وسعت اور تلاش و تحقیق میں شاہکار کا درجہ رکھتی ہے۔اس کتاب کا مقصد ہندو مسلمان کے تعلقات کے متعلق بہت سی غلط فہمیوں کا ازالہ اور ان دونوں کے تعلقات کی خوشگواری دکھانا ہے۔یہ کتاب پانچ ابواب پر مشتمل ہے۔یہ کتاب تلاش و تحقیق، محنت و کاوش اور حجت و استدلال کے پہلو سے بے مثل ہے۔اس کتاب کے بارے میں شاہ معین الدین احمد ندوی لکھتے ہیں:

''ان کو یورپین کی اعلیٰ سے اعلیٰ تصانیف کے مقابلہ میں بلا تکلف پیش کیا جا سکتا ہے۔''[۱]

۸۔عربوں کی جہاز رانی : یہ ان خطبات کا مجموعہ ہے جو مارچ ۱۹۳۰ء میں اسلامک ریسرچ ایسوسی ایشن بمبئی کی فرمائش پر دیئے گئے تھے جس میں زمانۂ جاہلیت اور اسلام میں عربوں کی جہاز رانی، عربوں کی دنیا کے سمندروں سے واقفیت، ان کے بعض بحری انکشافات، عربوں کے سامان و آلات، جہاز رانی اور ان کے بحر محیط کو عبور کرنے کی کوششوں وغیرہ کا تفصیلاً ذکر ہے۔یہ کتاب موضوع کی انفرادیت اور بلند پایہ تحقیق و دیدہ ریزی کا نمونہ ہونے کی وجہ سے بہت مشہور ہوئی ہے۔

۹۔خیام : یہ سید صاحب کی معرکۃ الآرا کتاب ہے۔دسمبر ۱۹۳۰ء میں سید صاحب نے آل انڈیا اورینٹل کانفرنس کے اجلاس پٹنہ میں ایک مقالہ پڑھا تھا جس نے ہندوستان کے محققین کے علاوہ ایران و افغانستان کے فضلا اور یورپ کے خاور شناسوں سے بھی داد تحسین حاصل کی۔اس میں خیام کی سوانح زندگی

۱۔ معارف، سلیمان نمبر، ص ۱۹۴

اور تصنیفات کے علاوہ ان کے فلسفہ پر عالمانہ تبصرہ ہے۔ سید صاحب نے اس میں رباعیات، عمر خیام سے متعلق مفصل بحث کی ہے اور اس کو بڑھا کر ایک مستقل کتاب کی شکل دے دی ہے۔ اس میں مشہور حکیم صوفی اور فلسفی عمر خیام کے حالات، کارناموں کا نہایت محققانہ جائزہ پیش کیا گیا ہے۔

عمر خیام کے بارے میں مغربی اہل قلم نے بہت سی غلط فہمیاں پیدا کیں اور اس کی شخصیت کو اس طرح داغ دار بنا کر پیش کیا کہ اس کی اصل شخصیت پر پردہ پڑ گیا۔ ہندوستان میں سب سے پہلے شبلیؒ نے اپنی مشہور کتاب شعرالعجم میں اس پر روشنی ڈالی۔ اس کے بعد سید صاحب نے یہ جامع کتاب لکھ کر مغربی اہل قلم کے خیالات کی تردید کی اور عمر خیام کو ایک نئی زندگی دی۔ ڈاکٹر اقبال نے اس کتاب کو پڑھ کر سید صاحب کو لکھا: ''آپ نے جو کچھ لکھ دیا ہے اس پر اب کوئی مشرقی یا مغربی عالم اضافہ نہ کر سکے گا۔'' اور ان کا یہ قول حرف بہ حرف سچ ثابت ہوا۔

۱۰۔ نقوش سلیمانی : سید صاحب نے اردو زبان و ادب اور اس کی تاریخ سے متعلق جو مضامین لکھے تھے اور اردو کانفرنسوں میں جو خطبے پڑھے تھے، یہ کتاب انھیں ادبی اور تنقیدی مقالات و خطبات اور مقدمات کا مجموعہ ہے۔ یہ خالص ادبی کتاب ہے۔ اس کا زیادہ تر حصہ اردو زبان و ادب کی تاریخ سے متعلق ہے۔ زبان و ادب پر آپ کی نگاہ بہت گہری تھی۔ سید صباح الدین عبدالرحمان اس سلسلے میں رقمطراز ہیں:

> ''ان کو پڑھ کر آج بھی اردو زبان کا بڑے سے بڑا ادیب، انشاء پرداز اور نقاد اردو زبان و ادب پر ان کی گہری نظر کا قائل ہوگا۔''[۱]

۱۱۔ حیات شبلی : یہ کتاب سید سلیمان ندوی کی مایہ ناز تصنیف ہے۔ یہ کتاب علامہ شبلی کی سوانح حیات ہے۔ اس میں سید صاحب نے شبلیؒ کی سوانح حیات اور ان کے علمی و عملی کاموں کے بارے میں مفصل طور پر تحریر کیا ہے۔ انھوں نے استاد کی خواہش کے مطابق تمام کاموں سے فراغت حاصل کرنے کے بعد اپنے مشفق استاد علامہ شبلی نعمانیؒ کی سوانح عمری لکھنا شروع کیا اور دو ڈھائی سال کی مسلسل محنت کے بعد اس کو

۱۔ سید سلیمان ندوی کی تصانیف ایک مطالعہ، سید صباح الدین عبدالرحمان، ص ۲۳

پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ یہ ضخیم کتاب صرف علامہ شبلیؒ کی جامع و ہمہ گیر شخصیت کی سوانح عمری نہیں ہے بلکہ مسلمانان ہند کے پچاس سال کے علمی و ادبی، سیاسی، تعلیمی، مذہبی اور قومی واقعات کی مستند تاریخ ہے۔ حیات شبلی آپ کی آخری تصنیف ہے اور اسی پر ان کی تصنیفی زندگی کا خاتمہ بالخیر ہوا۔

۱۲۔ مقالات سلیمان : سید صاحب کی وفات کے بعد دارالمصنفین نے معارف اور دوسرے رسائل میں منتشر سید صاحب کے علمی مضامین کو اکٹھا کر کے مقالات سلیمان کے نام سے شائع کیا۔ جس کو شاہ معین الدین احمد ندوی اور سید صباح الدین عبدالرحمان نے مرتب کر کے دارالمصنفین سے شائع کیا۔

پہلی جلد ہندوستان کی تاریخ سے متعلق ہے۔ دوسری علمی اور تیسری جلد میں مذہبی بلکہ قرآنی مقالات ہیں۔ ان کے علاوہ قرآن و حدیث، تفسیر و تاریخ، فقہ و تصوف، فلسفہ و کلام، سیرت و سوانح اور تذکرہ وغیرہ پر ان کے سیکڑوں مقالات معارف کے فائلوں میں محفوظ ہیں۔

۱۳۔ مکتوبات سلیمان : سید صاحب کے مکاتیب کا پہلا مجموعہ ''برید فرنگ'' کے نام سے خود سید صاحب نے مرتب کر کے ۱۹۵۲ء میں مکتبہ الشرق کراچی سے شائع کیا۔ یہ ان خطوط پر مشتمل ہے جو سید صاحب نے ۱۹۲۰ء کے وفد خلافت کے سفر میں یورپ سے اپنے احباب کو ہندوستان میں لکھے تھے۔ دوسرا مجموعہ مکاتیب سلیمان کے نام سے ۱۹۵۴ء میں مکتبہ چراغ راہ کراچی سے شائع ہوا۔ یہ سید صاحب کے ۱۴۵ خطوط پر مشتمل ہے۔ ان میں سے بیشتر مسعود عالم ندوی کے نام لکھے گئے ہیں۔ سید صاحب کے مکاتیب کا تیسرا اور اہم مجموعہ دو جلدوں پر مشتمل مکتوبات سلیمانی کے نام سے عبدالماجد دریابادی نے مرتب کر کے ۱۹۶۷ء میں شائع کیا۔ آپ کے مکتوبات کے یہ تینوں مجموعے گوناگوں علمی، تاریخی اور ادبی معلومات کا خزانہ اور بے حد مفید ہیں۔

مولانا عبدالسلام ندوی

دارالمصنفین اعظم گڑھ کے معماروں میں مولانا عبدالسلام ندوی کا نام خصوصیت کے ساتھ قابل ذکر ہے۔آپ کا شمار دارالعلوم ندوۃ العلماء کے نامور طالب علموں میں ہوتا تھا۔آپ علامہ شبلی کے محبوب شاگرد تھے۔اس کے علاوہ علامہ نے ناموران علم وفن کا جو قافلہ اپنے پیچھے چھوڑا تھا آپ اس کے رکن رکین تھے۔آپ کاروان علم وادب کے وہ ممتاز رہ نورد تھے جنھوں نے نہ صرف سالار قافلہ کے مقاصد کی تکمیل میں اہم فریضہ انجام دیا بلکہ دارالمصنفین کے وجود اور تصنیف وتالیف کے علمی وادبی معیار کو برقرار رکھا بلکہ اس کو رفعتوں تک پہنچایا۔آپ مولانا ابوالکلام کے خاص دوست اور سید سلیمان ندوی کے دست راست تھے۔آپ دونوں ہی دارالمصنفین کے افق پر علمی وادبی حیثیت سے مہر وماہ بن کر چمکے۔آپ دونوں ہی علامہ شبلی کے علمی جلال وادبی جمال کے مظہر تھے۔اور دونوں نے اپنی کاوشوں سے اپنے استاد کے خواہشات کی تکمیل کی۔آپ کو قدرت نے علم کا بیش بہا خزانہ عطا کیا تھا۔عموماً آپ پر جذب کی ایسی کیفیت طاری رہتی کہ ہر چیز سے بے نیاز اپنی دنیا میں بالکل مست وسرشار رہتے۔

آپ اعظم گڑھ کے ایک چھوٹے سے گاؤں علاؤالدین پٹی میں ۱۸۸۳ء میں پیدا ہوئے۔آپ کے والد ایک متوسط درجے کے زمین دار تھے۔آپ نے ابتدائی تعلیم گاؤں کے مکتب میں حاصل کی۔اس کے بعد عربی کی اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے کانپور، آگرہ اور مدرسہ چشمہ رحمت غازی پور چلے گئے جہاں مولانا شبلی مدرس تھے۔وہاں آپ نے متوسطات تک تعلیم حاصل کی۔اس کے بعد ۱۹۰۶ء میں دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ لیا۔جہاں ۱۹۱۰ء میں درسیات کی تکمیل کرنے کے بعد وہیں ادب کے مدرس مقرر ہوگئے۔اس وقت علامہ شبلی ندوہ کے معتمد تعلیم تھے۔علامہ شبلی کی جوہر شناس نگاہوں نے آپ کے اندر چھپی ہوئی لامحدود صلاحیتوں کو دیکھ لیا۔چونکہ آپ کو شعر وادب کا ذوق بچپن سے تھا اس لئے علامہ شبلی نے آپ کو اپنی تربیت خاص میں لیا اور تصنیف وتالیف کے سلسلے میں آپ کی رہنمائی کی اور آپ کے متعلق یہ پیشین گوئی کی کہ آگے چل کر ایک کامیاب مصنف ثابت ہوسکتے ہیں۔اور یہ پیشین گوئی سچ ثابت ہوئی۔

آپ کی ادبی زندگی کا آغاز دارالعلوم کے رسالے ''الندوہ'' سے ہوا۔ طالب علمی کے ابتدائی دور سے ہی آپ کی مضمون نگاری کا آغاز ہوگیا تھا۔ آپ نے ۱۹۰۶ء میں ''الندوہ'' میں ''تناسخ'' کے عنوان سے اپنا پہلا مضمون لکھا۔ یہ مضمون علامہ شبلی کو اس قدر پسند آیا کہ انھوں نے اصلاح کے بغیر تعریفی نوٹ کے ساتھ ''الندوہ'' میں شائع کیا اور انعام کے طور پر آپ کو پانچ روپیہ دیا۔ یہیں سے آپ کی ادبی زندگی کا آغاز ہوا اور آپ کے مضامین برابر ''الندوہ'' میں شائع ہوتے رہے۔ آپ کی خداداد صلاحیتوں کو دیکھ کر علامہ شبلی نے پہلے ''الندوہ'' کا سب ایڈیٹر اور اس کے بعد ایڈیٹر منتخب کیا۔ علامہ شبلی نے سیرت النبیؐ کی تالیف میں آپ کو اپنا لٹریری اسسٹنٹ بنایا۔

دارالعلوم کے زمانہ سے ہی مولانا ابوالکلام آزاد سے آپ کے تعلقات کافی دوستانہ تھے۔ آپ کی صلاحیتوں کی بنا پر مولانا آزاد نے آپ کو ''الہلال'' کلکتہ کی ادارت میں شامل ہونے کی دعوت دی جس کو آپ نے استاد محترم شبلیؒ کی رضامندی سے منظور کرلیا اور ڈیڑھ دو سال تک ''الہلال'' کی ادارت میں کام کیا اور مختلف موضوعات پر بہت سے مضامین لکھے۔ لیکن جب ۱۹۱۴ء میں بنگال گورنمنٹ نے الہلال کو بند کردیا اور اسی سال ۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء کو علامہ شبلیؒ اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ تو شبلی کے ادھورے کاموں کی تکمیل اور دارالمصنفین کے تخیل کو عملی جامہ پہنانے کے لئے آپ کے تلامذہ نے اخوان الصفا کی تشکیل کی۔ ان ادھورے کاموں کا ذمہ آپ کے شاگرد رشید علامہ سید سلیمان ندوی کے کاندھوں پر آپڑا اور آپ نے استاد کی خواہشات کو احسن طریقہ سے پورا کیا۔ اور ان کے تخیل کے مطابق دارالمصنفین کے کاموں کا آغاز کیا تو مولانا عبدالسلام ندوی کو کلکتہ سے اعظم گڑھ بلالیا۔ اس طرح آپ دارالمصنفین کے رکن مقرر ہوئے اور اپنی زندگی کی آخری سانس تک استاد کے مشن کی تکمیل کے لئے استاد کے آستانے پر جمے رہے اور مرنے کے بعد ہی اس سے جدا ہوئے۔

تصنیف و تالیف کے میدان میں آپ کے بہت سے نمایاں کارنامے ہیں جن کو آپ کی اولیات میں شمار کیا جاسکتا ہے۔ آپ کی زندگی کا زیادہ عرصہ تصنیف و تالیف میں گزرا۔ اس کے علاوہ کسی اور مشاغل

سے دلچسپی نہیں تھی۔ مولانا عبدالسلام ندوی زندگی بھر علم وفن کی خدمات اور تصنیف وتالیف سے وابستہ رہے اور دنیا کی ساری رعنائیوں سے بے نیاز رہے۔ آپ کی انہیں خصوصیات کی طرف سید احمد اکبر آبادی مرحوم نے ان کے انتقال پر جو شذرہ لکھا ہے اس میں اس طرح اشارہ کیا ہے:

''مولانا کا سب سے بڑا وصف کمال جس میں مشکل ہی سے کوئی ان کا حریف ہوگا یہ تھا کہ وہ صرف ایک نامور مصنف، بلند پایہ ادیب اور نقد سخن کے بہترین جوہری تھے اس حیثیت سے وہ لیلائے علم وادب کو مخاطب کر کے بجا طور پر کہہ سکتے تھے کہ

''سب سے بیگانہ ہے اے دوست شناسا تیرا'' [۱]

شاہ معین الدین احمد ندوی رقمطراز ہیں:

''تصنیفی قابلیت اور زور قلم میں امتیازی حیثیت رکھتے تھے۔ اس لئے کہ انھوں نے اپنا دائرہ عمل تالیف وتصنیف ہی تک محدود رکھا اور نہایت خاموشی کے ساتھ عمر بھر اس کام کو انجام دیتے رہے اور اس میں وہ دارالمصنفین کے رکن اعظم تھے جس پر ان کے مضامین اور تصانیف شاہد ہیں۔'' [۲]

قدیم علماء کی طرح آپ کی شخصیت جامع کمالات، کثیر الجہات اور متنوع صفات کی حامل تھی۔ آپ کے مضامین اور تصنیفات کا دائرہ کسی ایک ہی موضوع تک محدود ومخصوص نہیں بلکہ ہر موضوع اور ہر فن پر آپ کو یکساں طور پر قدرت تھی۔ آپ کا قلم علم وادب کے ہر میدان میں رواں دواں رہتا تھا۔ شاہ معین الدین احمد ندوی لکھتے ہیں:

''ان کو فطری لگاؤ شعر وادب سے تھا۔ لیکن مذہبیات سے لے کر شعر وادب تک

۱۔ برہان، ج ۳۷، شمارہ ۵۱۰، نومبر ۱۹۵۶ء، سعید احمد اکبر آبادی، ص ۲۵۹

۲۔ ادبی نقوش، شاہ معین الدین احمد ندوی، ص ۳۵۵۔۳۵۶

ہر موضوع پر لکھنے کی یکساں قدرت تھی۔ چنانچہ ان کے مضامین میں جس قدر
تنوع ہے وہ مشکل سے کسی دوسرے اہل قلم کے مضامین میں نکل سکتا ہے۔'' [۱]

عام مصنفین میں مولانا عبدالسلام ندوی اس حیثیت سے بھی ممتاز تھے کہ آپ کو لکھنے کے لئے یکسوئی اور اطمینان وسکون کا انتظار نہیں ہوتا تھا اور نہ ہی آپ زیادہ محنت کے عادی تھے۔ معمول کے مطابق صرف دن میں تین چار گھنٹے مستعدی سے کام کرتے تھے اور ان کے اس معمول میں کوئی فرق نہیں آتا تھا۔ شور وغل سے آپ کے کام پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا بلکہ پوری تندہی کے ساتھ آپ اپنے کام کو مقررہ وقت پر پایہ تکمیل تک پہنچاتے۔ آپ کا قلم اتنا پختہ اور منجھا ہوا تھا کہ قلم برداشتہ لکھتے اور لکھنے کے بعد مسودے پر نظر ثانی اور اصلاح کی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ آپ کا مسودہ نہایت صاف ستھرا اور کاٹ چھانٹ سے مبرا ہوتا تھا۔

ادبی حسن ولطافت اور انشاء کی رعنائی اور بانکپن آپ کا طرۂ امتیاز تھا۔ شاہ معین الدین اس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

''ادب وانشاء میں وہ نہایت ممتاز تھے۔ علامہ شبلی کی یہ وراثت ان کے حصہ
میں زیادہ آئی تھی۔ چمنستان ادب میں ان کا قلم بڑا سبک خرام تھا۔ ذہن بڑا
اخّاد پایا تھا سرسری مطالعہ سے کتابوں کا جوہر کھینچ لیتے تھے۔'' [۲]

آپ فطرتاً سنجیدہ مزاج تھے۔ گوشہ نشین اور نام ونمود سے بے نیاز تھے۔ خصوصاً پروپیگنڈے کے فن سے تو آپ بالکل ناواقف تھے۔ آپ کا دائرہ عمل دارالمصنفین کے اندر تصنیف وتالیف تک ہی محدود رہتا تھا۔ بڑے قانع اور بے نیاز تھے۔ حصول دنیا کی کبھی خواہش نہ کی۔ یہی وجہ ہے کہ قلیل تنخواہ میں دارالمصنفین میں پوری زندگی گزار دی۔ بے نیازی کا حال یہ تھا کہ انہیں اپنے کمالات تک کا احساس نہیں تھا اور نہ ہی اپنے کارناموں کو اہمیت دیتے تھے۔ آپ کا اصل موضوع شعر وادب تھا اور اس سے فطری

۱۔ ادبی نقوش، شاہ معین الدین احمد ندوی، ص ۳۵۶

۲۔ معارف، جنوری ۱۹۵۷ء، ص ۸

دلچسپی تھی۔ اردو فارسی شعر و ادب خصوصاً اردو شاعری سے بڑی دلچسپی تھی۔ ساتھ ہی ماحول بھی ایسا ملا تھا جس سے اس ذوق کو مزید جلا ملی۔ آپ بہت ہی نیک سیرت، بے نفس اور مرنجا مرنج انسان تھے۔ ایذا رسانی سے یکسر گریزاں تھے۔ ان کی ذات سے کسی کو ادنیٰ تکلیف بھی نہیں پہنچی۔ سیاست اور ریا و نفاق سے کوسوں دور تھے۔ ظاہر و باطن بالکل یکساں تھا۔ آپ کی زندگی کھلی کتاب کی طرح تھی۔ بہت صابر تھے ناگوار سے ناگوار باتیں بھی برداشت کر جاتے اور چہرے پر شکن تک نہ پڑتی تھی۔ خودی اور خودنمائی کا شائبہ تک نہیں تھا۔ ہر چھوٹے اور بڑے، ادنی اور اعلیٰ سے ایک جیسا سلوک کرتے۔ زندگی اتنی سادہ تھی کہ ضروریات زندگی کے علاوہ نمود و نمائش اور عیش و عشرت کا کوئی سامان نہیں رکھا۔ فطرتاً بڑے سادہ مزاج اور بھولے تھے۔ جو لوگ ان کی تصانیف کی وجہ سے ان کو جانتے تھے ملنے کے بعد مشکل سے ہی یقین کرتے تھے کہ وہ ان کتابوں کے مصنف ہیں۔ خیالات و عمل کی دنیا بہت محدود تھی جس سے بہت کم باہر نکلتے تھے۔ ذاتی معاملات کے علاوہ دنیا کے معاملات سے کوئی دلچسپی نہیں رکھتے اور نہ ہی اس کے بارے میں سوچتے اور اس کا اثر لیتے تھے۔ آپ کو مراق کی بیماری تھی اور کبھی کبھی دورے بھی پڑتے تھے۔ یہ دورے دو طرح کے ہوتے تھے۔ رجائی، قنوطی۔ رجائی دورے میں چست، پھرتیلے اور شاداں و فرحاں ہو جاتے۔ جب کہ قنوطی دورے میں ہر وقت غمگین، اداس اور ناامید رہتے۔ حال و مستقبل تاریک نظر آتا، ماضی پر افسوس کرتے۔ اپنی داستان سنا کر سب سے ہمدردی کے طلبگار رہتے۔ اس مرض کا اثر ان پر تاحیات رہا۔

ہر بڑے صاحب وجاہت آدمی کو خواہ وہ کسی بھی طبقے سے ہو بڑی پست نظر سے دیکھتے۔ جب تک وہ خود ملنے میں پیش قدمی نہ کرتا اس کے قریب نہ جاتے۔ سوسائٹی کے آداب و رسوم کے بالکل پابند نہ تھے۔ مزاج صحیح ہوتا تو سارے آداب برتتے ورنہ مخاطب کرنے پر بھی اوں آں کے سوا کوئی جواب نہ دیتے۔ اسی جذبے کے بنا پر سید صاحب ان کو ''بت بے پیر'' فرمایا کرتے تھے۔ مولانا عبدالغنی صاحب پھولپوری ان کو مجذوب کہتے تھے اور ان کے بھولے پن کا بڑا فائدہ اٹھاتے تھے۔

مراح اور ریاح باسوری کی شکایت کے سوا ان کی عام صحت اچھی تھی۔ بہت کم بیمار پڑتے۔ چار

پانچ میل آسانی سے چل لیتے مگر مراق کے دورے کے زمانہ میں ان پر بیماری اور موت کا بڑا خوف رہتا۔ بیماری اور موت کے لئے روپیہ جمع کرتے۔ انہیں محسوس ہوتا کہ اگر میں بیکار ہوگیا تو کیا ہوگا لیکن عجیب اتفاق ہے کہ ان کی موت اس وقت آئی جب ان پر زندگی مہربان تھی اور وہ بہت ہی خوش وخرم تھے۔ سفر سے بہت گھبراتے تھے لیکن اس دورے میں بھی سفر کا شوق پیدا ہوگیا اور اپنے رفیق مولانا ابوالکلام آزاد سے ملنے کے لئے دلی جانے والے تھے۔ ابوالکلام آزاد سے تاریخ بھی طے کر چکے تھے کہ سفر آخرت پیش آ گیا۔ ۱۳/اکتوبر ۱۹۵۶ء کو سارے معمولات سے فارغ ہونے کے بعد اچانک دل کا دورہ پڑا اور کچھ ہی دیر میں مالک حقیقی سے جا ملے۔

مولانا عبدالسلام کے مذاق ومزاج میں شبلیؒ کا علمی، تحقیقی اور تہذیبی ورثہ شعوری یا غیر شعوری طور پر در آیا تھا۔ ان میں مولانا ابوالکلام آزاد کی پروقار علم دوستی، سخن فہمی اور سخن سنجی کا براہ راست یا بالواسطہ عنصر موجود تھا۔ دونوں کا طرز نگارش آزادانہ، انشا پردازانہ یا مشکل پسندی کا تھا۔ مگر ان کا اپنا ایک جداگانہ اور منفرد انداز تھا جو اسوہ صحابہ، اسوہ صحابیات، سیرت عمر بن عبدالعزیز، تاریخ، فقہ اسلامی، حکمائے اسلام، امام رازی، ابن خلدون، انقلاب الامم، شعرالہند، مقالات عبدالسلام اور اقبال کامل میں نظر آتا ہے۔ شعرالہند تو شبلیؒ کی شعرالعجم کی طرح ہماری اردو شاعری کے میدان میں اپنی مثال آپ ہے۔ مولانا دارالمصنفین کے طویل قیام میں صرف تصنیف وتالیف میں مشغول رہے۔ اس لئے اس حیثیت سے انھوں نے جو لازوال نقوش یادگار چھوڑے ان کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

۱۔ اسوہ صحابہ اوّل دوم : دراصل مسلمانوں کے لئے صحابہ کرام کی پاکیزہ اور مقدس زندگی اسوہ عمل ہے اس لئے دارالمصنفین کے سلسلہ تصانیف میں سلسلہ سیرت النبیؐ کی طرح سلسلہ سیرت الصحابہ کو بھی بڑا احسن قبول حاصل ہوا۔ اس کے مختلف حصے مختلف رفقا نے مستند مآخذ سے کئی جلدوں میں لکھے ہیں۔ لیکن اس سلسلے کی روح یہی کتاب ہے جو مولانا ندوی کے خامۂ زرنگار سے نکلی ہے۔ یہ کتاب دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد میں صحابہ کے عقائد، عبادات، معاملات، اخلاق وسیرت، معاشرت وغیرہ کا مرقع پیش کیا ہے جس

سے زندگی کے ہر شعبہ میں اسلامی تعلیمات کا مرقع سامنے آجاتا ہے اور مسلمانوں کو ہر شعبۂ زندگی کے متعلق ہدایت ورہنمائی حاصل ہوتی ہے۔ اس کتاب میں صحابہ کرام کی سیرت، اخلاق اور اعمال کا عطر کشید کر کے مولانا نے مسلمانوں کو اس آئینے میں اپنی سیرت وکردار بنانے اور سنوارنے کی دعوت دی ہے۔

۲۔ اسوۂ صحابیات : اسلام نے نہ صرف مردوں بلکہ عورتوں میں بھی عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیا تھا۔ اور جس طرح مسلمان مردوں کے لئے صحابہ کرام کی مقدس زندگی اور پاکیزہ حالات اسوہ اور نمونہ ہیں اسی طرح مسلمان عورتوں کے لئے صحابیات کی زندگی درس عمل اور سامان عبرت ہیں۔ اس کتاب میں آنحضرتؐ کی ازواج مطہرات، بنات صالحات اور عام صحابیات کے اخلاق ومعاشرت اور عادات واطوار کے موثر واقعات جمع کئے ہیں تاکہ مسلم خواتین کے لئے شمع ہدایت کا کام دے۔

۳۔ سیرت عمر بن عبدالعزیز : خلفائے راشدین کے بعد اسلامی خلافت کو خلفائے بنوامیہ نے ملوکیت اور بادشاہت میں تبدیل کر دیا تھا اور اس میں وہ تمام خرابیاں پیدا ہوگئی تھیں جو دنیاوی بادشاہتوں کا خاصہ ہوتی ہیں۔ جب عنان حکومت عمر بن عبدالعزیز نے سنبھالی تو انھوں نے پھر حکومت کو خلافت کے قالب میں ڈھال دیا اور پھر صدیقی وفاروقی عہد کی یاد تازہ کر دی۔ عمر بن عبدالعزیز نے تخت شاہی پر بیٹھ کر جیسی فقیرانہ زندگی بسر کی اور عادلانہ حکومت کی اس کی مثال خلافت راشدہ کے علاوہ کسی اور دور میں نہیں مل سکتی اور اس حیثیت سے ان کی زندگی نہ صرف مسلمان بادشاہوں بلکہ تمام دنیا کے فرماں رواؤں کے لئے نمونہ ہے۔ یہ کتاب سیرت کا بڑا دلآویز مرقع ہے جس میں ان کی زندگی کے حالات وواقعات بڑے موثر انداز میں لکھے گئے ہیں۔ یہ کتاب ۱۹۱۹ء میں پہلی بار شائع ہوئی۔

۴۔ تاریخ اخلاق اسلامی : مولانا عبدالسلام ندوی ''لیکی کی تاریخ'' اخلاق یورپ کے طرز پر مسلمانوں کے اخلاق کی مفصل تاریخ لکھنا چاہتے تھے۔ یہ کتاب دو جلدوں میں ہے۔ لیکن کتاب کا پہلا حصہ ہی شائع ہوا ہے جس میں پہلے بعثت نبوی کے قبل عربوں کے اخلاق کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ پھر اسلام نے اس میں جو انقلاب وتغیر پیدا کیا اور عہد نبوت میں جس طرح اسلامی اخلاق کی تعمیر وتشکیل ہوئی، اس کا

تفصیلی ذکر کیا ہے۔

۵۔امام رازی : امام رازی اپنے عہد کے نامور فلسفی و متکلم تھے۔ دینی علوم میں انہیں امامت کا درجہ حاصل تھا۔ امام غزالی کے بعد انھوں نے فلسفہ و علم کلام کے مسائل پر تنقیدی نگاہ ڈالی۔ مولانا ندوی نے ان کو جامعیت، تفصیل اور وضاحت کے ساتھ پیش کیا۔

۶۔حکمائے اسلام اوّل دوم : فلسفہ کی تمام شاخوں طبیعات، الٰہیات، منطق اور ریاضی وغیرہ میں مسلمان حکماء و فلاسفہ کے بڑے کارنامے ہیں۔ مولانا کے خیال میں یونان کا فلسفہ انہیں کی وجہ سے فنا ہونے سے محفوظ رہا۔ وہ قدیم و جدید فلسفہ کی درمیانی کڑی تھی۔ جس طرح یونانی فلسفہ کے کچھ مقلد تھے اسی طرح اس کے بہت سارے ناقد بھی تھے۔ انھوں نے اس کی تہذیب کی اصلاح کی اور فلسفہ میں نئے نظریات پیدا کئے۔ مابعد الطبیعی مسائل کو فلسفہ سے ثابت کیا اور عقلیات و نقلیات میں تطبیق دی اس لئے مسلمان فلاسفہ کے حالات اور ان فلسفیانہ اور متکلمانہ کارناموں کو بیان کرنے کے لئے یہ کتاب دو جلدوں میں لکھی گئی ہے۔ اس میں حکمائے اسلام کی ہر قسم کی مذہبی، اخلاقی اور فلسفیانہ خدمات کو نمایاں کیا گیا ہے۔ اس میں تاریخ اسلام کے پہلے نامور فلسفی یعقوب کندی سے لے کر مولانا فضل حق خیر آبادی تک ہر دور کے اکابر فلاسفہ اور ہندوستان کے دوسرے نامور حکماء کے حالات، علمی خدمات اور فلسفیانہ افکار و نظریات کی تفصیل ہے۔

۷۔شعرالہند : مولانا عبدالسلام ندوی کو شعر و ادب سے فطری لگاؤ تھا اور اس پر ان کی گہری نظر تھی۔ چنانچہ انھوں نے مولانا شبلیؒ کی شعرالعجم کے طرز پر شعرالہند لکھی۔ اس کی پہلی جلد میں اردو شاعری کی ابتدا سے لے کر فانیؔ، حسرتؔ، اصغرؔ، شادؔ، عزیزؔ لکھنوی، اکبرؔ، اقبالؔ، جوشؔ یعنی جدید دور تک کے شعراء کا تذکرہ ہے اور اس کے مختلف دور قائم کر کے ہر دور کے شعراء کے الگ الگ حالات، اس دور اور اس کے شعراء کی خصوصیات، عہد بہ عہد کے تغیرات اور اس کے اسباب کی تفصیل بیان کی ہے۔ شروع میں مقدمہ ہے جس میں اردو شعراء کے قدیم تذکروں کی فہرست دی ہے اور ان کی نوعیت بتائی ہے۔

دوسرے حصہ میں اصناف شاعری مثلاً غزل، ریختی، واسوخت، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، ڈراما اور مذہبی، صوفیانہ، اخلاقی اور فلسفیانہ شاعری پر تاریخی و ادبی حیثیت سے مفصل ریویو کیا گیا ہے۔ آخر میں شعراء کے اجزاء محسنات کی بحث اور اردو شاعری میں ہندوستانی اثرات کا ذکر ہے۔ دوسری جلد کے شروع میں اردو میں تنقید کی تاریخ پر بھی گفتگو کی ہے۔ اس لحاظ سے شعرالہند اردو شعراء کا پہلا جامع تذکرہ ہے۔

۸۔ اقبال کامل : اس کتاب میں ڈاکٹر محمد اقبال صاحب کی مفصل سوانح حیات، ان کی تصانیف، ان کے فلسفہ اور شاعری پر تنقید و تبصرہ کیا گیا ہے۔ مولانا ندوی کے دور تک ڈاکٹر صاحب پر کافی کام ہو چکا تھا۔ پھر بھی کوئی جامع اور مکمل کتاب نہیں تھی جس سے اقبال کے تمام پہلوؤں کا احاطہ کیا جا سکتا ہے۔ مولانا نے اسی کمی کو پورا کرنے کے لئے یہ کتاب لکھی۔ اس میں اقبال کے سوانح، مذہبیت، اخلاق و سیرت اور تصانیف پر تبصرہ اور ان تصانیف کا بھی ذکر ہے جن کی تالیف ان کے پیش نظر تھی۔ مگر ان کے لکھنے کا موقع نہ مل سکا۔ اس کے بعد ان کی شاعری کی تاریخی سرگزشت اور اس کے مختلف ادوار قائم کر کے ہر دور کے کلام پر الگ الگ تبصرہ ہے۔ علاوہ ازیں فارسی شاعری پر بھی ریویو ہے۔ اس کے بعد ان کے کلام کے ادبی محاسن دکھائے گئے ہیں اور اس کی شہرت و مقبولیت اور مختلف زبانوں میں اس کے تراجم کا ذکر ہے۔ اس سلسلے میں ان کی ادبی و لسانی فروگزاشتیں بھی دکھائی گئی ہیں۔ پھر ان کے فلسفہ خودی پر تفصیلی بحث کی ہے اور اس کے اجزا و عناصر پر روشنی ڈالی گئی ہے اور فلسفہ خودی کا اجمالی تعارف ہے۔ پھر نظریۂ ملت، تعلیم، سیاسیات، صنف لطیف، فنون لطیفہ اور نظام اخلاق وغیرہ کے بارے میں ان کے خیالات پیش کئے گئے ہیں۔ آخر میں نعتیہ کلام پر ریویو ہے۔ اس طرح یہ کتاب اقبالیات کے ہر پہلو کا مکمل احاطہ کئے ہوئے ہے اور جن معلومات کے لئے متعدد کتابوں کے صفحات کی ورق گردانی کرنی پڑتی ہے وہ اقبال کامل میں ایک جگہ مل جاتی ہے۔

۹۔ مقالات عبدالسلام : یہ مجموعہ مقالات ۱۹۶۸ء میں شائع ہوا تھا۔ اس میں معارف میں شائع ہونے والے دو درجن سے زیادہ منتخب ادبی و تنقیدی مضامین شامل ہیں جن میں بڑا تنوع اور رنگا رنگی ہے۔ بعض

Acc. No. T-8888
Aligarh Muslim University Aligarh

مضامین میں معروف شعراء کے دیوان وکلیات اور مجموعہ کلام پر مفصل ریویو کر کے ان کی خوبیاں اور خامیاں دکھائی گئی ہیں۔ بعض میں اردو کے بعض تذکروں اور ادب اردو کی تاریخ اور شاعری کے بعض اصناف سے متعلق کتابوں پر تبصرے ہیں۔ مشاعرے اور ادبی انجمنوں میں پڑھے گئے صدارتی خطبے بھی دیئے گئے ہیں اور بعض خالص فنی نوعیت کے مضامین بھی ہیں۔ جیسے شاعری بطور پیشے کے، اردو شاعری میں انقلاب کیوں کر پیدا ہوا؟ مواد شعر، دلی اور لکھنؤ کی شاعری اور ایک کا دوسرے پر اثر، اردو شاعری اور فن تنقید وغیرہ۔

۱۰۔ القضا فی الاسلام : یعنی اسلام کا نظام عدالت۔ اس کتاب میں شہادت اور فصل مقدمات کے اسلامی قوانین واصول تحریر کئے گئے ہیں اور ان کی تشریح بھی کی گئی ہے۔ اگر چہ اس کتاب میں حدیث وفقہ کی دوسری کتابوں سے مدد لی گئی ہے لیکن زیادہ استفادہ ابن جوازی کی کتاب الطرق الحکمیہ سے کیا گیا ہے۔

۱۱۔ تاریخ فقہ اسلامی : یہ کتاب فقہ اسلامی کی مفصل تاریخ ہے۔ مصر کے ایک فاضل محمد خضری مرحوم کی تصنیف ''تاریخ التشریع الاسلامی'' کو مولانا نے اردو کے قالب میں ڈھال دیا ہے۔ اس میں ہر دور کے فقہ وفقہا کے حالات، ان کے مذاہب، ان کی خصوصیات اور ان کے علل واسباب وغیرہ ہر پہلو کو تفصیل کے ساتھ دکھایا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ جب تک اسلامی علوم کی ترقی کا دور رہا، فقہ اسلام بھی ترقی کرتی رہی لیکن جب اسلامی علوم کا زوال شروع ہوا تو اس پر بھی زوال طاری ہو گیا۔

۱۲۔ ابن خلدون : یہ مصر کے نامور فاضل ڈاکٹر طٰہٰ حسین کی کتاب کا اردو ترجمہ ہے۔ ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے ابن خلدون اور اس کے فلسفہ پر ایک کتاب فرنچ میں لکھی تھی، مصر میں اس کا عربی ترجمہ ہوا۔ ڈاکٹر طٰہٰ نے اپنی کتاب کے شروع میں ابن خلدون کے مختصر حالات پھر اس کے سیاسی اور اقتصادی واجتماعی وعمرانی خیالات پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ مولانا عبدالسلام نے اس کے عربی ترجمہ کو اردو میں منتقل کیا ہے تاکہ اردو داں طبقہ فلسفۂ تاریخ، اجتماعیات واقتصادیات کے اس ماہر، بلند پایہ عالم اور دانشور کے خیالات سے آگاہ ہو سکے۔ یہ کتاب اردو ادب کا نایاب تحفہ ہے۔

۱۳۔ انقلاب الامم : یہ کتاب مشہور فرانسیسی عالم ومفکر موسیو لیبان کی فرنچ کتاب کے عربی ترجمے کا اردو

ترجمہ ہے۔اس میں ان نفسی اصول اور اخلاقی قوانین کی تشریح کی گئی ہے جن سے قوموں کی ترقی وپستی وابستہ ہے۔یعنی اس کتاب میں قوموں کے اخلاق وعادات اوراس کے مظاہر ونتائج کو دکھایا گیا ہے۔

۱۴۔اسلامی قانون فوج داری : یہ مولانا سلامت علی خاں کی کتاب الاختیار کے اردو ترجمہ پر مشتمل ہے۔اس میں فقہ حنفی کے ایک حصے یعنی تعزیرات کے متعلق فقہ کی مستند کتابوں سے تمام مسائل مختلف ابواب میں نہایت جامعیت واختصار کے ساتھ جمع کردیئے ہیں۔ان کتابوں کی اصل عبارت کے نقل کرنے کے بعد فارسی زبان میں ان کا خلاصہ بھی درج کردیا ہے۔اس کتاب کا مولانا عبدالسلام نے اردو میں ترجمہ کیا۔انھوں نے فقہ کی جوروایتیں فقہی کتابوں کے حوالوں کے ساتھ درج کی تھیں وہ بعینہٖ انہیں کے حوالوں کے ساتھ اس ترجمے میں بھی درج ہے۔

۱۵۔تاریخ الحرمین : عباس حلمی پاشا ثانی خدیو مصر نے یہ تقریب حج مکہ معظّمہ ومدینہ منورہ کے مقامات مقدسہ کی زیارت کا شرف حاصل کیا۔محمد لبیب البتونی نے الرحلۃ الحجازیۃ کے نام سے اس کا سفرنامہ لکھا جس میں مقدس سرزمین کے ذرے ذرے پر مذہبی،تمدنی،سیاسی،علمی،تاریخی،مذہبی اور فلسفیانہ حیثیت سے اس طرح بحث کی ہے کہ اس سے مخالفین اسلام کے تمام اعتراضات وشبہات دور ہوجاتے ہیں اور خود مسلمانوں کے دلوں میں ان تمام چیزوں کے ساتھ اور بھی زیادہ حسن عقیدت پیدا ہوجاتی ہے۔مولانا نے مکہ اور مدینہ کے ساتھ خاص تعلق رکھنے والے سلسلے کے بعض ٹکڑوں کا ترجمہ کردیا ہے اور بعض کی تلخیص کردی ہے اور بعض جگہوں پر ترتیب تبدیل کردی ہے اور بہت سی معلومات اور مفید باتوں کا اضافہ اپنی طرف سے کردیا ہے۔

اس طرح یہ کتاب صرف ترجمہ ہی نہیں بلکہ مذہبی،سیاسی،تمدنی اور علمی حیثیت سے حرمین کی ایک نہایت مستند تاریخ ہوگئی ہے۔

۱۶۔التربیت الاستقلالیہ : اس کتاب میں تعلیم وتربیت کے اصول پر فلسفیانہ حیثیت سے بحث کی گئی ہے لیکن طرز تحریر افسانوی ہے۔اس میں میاں بیوی کے کردار کو نمایاں کیا گیا ہے۔اس میں ایک شوہر اور

بیوی کا مفروضہ قائم کر کے یہ دکھایا گیا ہے کہ شوہر قیدی ہے۔ اس کے دل میں زمانہ اسیری میں اپنے گھر کے مسائل اور بچے کی تعلیم وتربیت کے تعلق سے جو خیالات پیدا ہوتے ہیں وہ ان کو اپنی یادداشت میں درج کرتا چلا گیا۔ یہ کتاب انہیں مراسلات وشذرات کا مجموعہ ہے۔ اور باتوں سے قطع نظر بچوں کو وہ ایسی تعلیم وتربیت دینے کا قائل ہے جس سے ان میں آزادی واستقلال کی روح پیدا ہو اور ان کے تمام اعمال و افعال خود ان کے علم وادارہ اور اختیار سے صادر ہوں۔ جبر، اضطرار اور تقلید کی ان میں آمیزش نہ ہو۔

مولانا نے اسلامی نقطۂ نظر سے اس نظریہ کو اگرچہ قابل اعتراض بتایا ہے تاہم اس کو الحاد اور بے دینی پر مبنی قرار نہیں دیا ہے۔ ان مراسلات وشذرات میں جو ذاتی اور خانگی معاملات درج تھے، مولانا نے ان کی دوسری غیر ضروری باتوں کو چھوڑ کر صرف تعلیمی مباحث اور ان کے اصول وقواعد کو علیحدہ کر کے ان کا اردو ترجمہ کیا۔ اس طرح یہ فن تعلیم وتربیت پر مختصر لیکن مفید کتاب ہوگئی ہے۔ یہ کتاب چار حصوں میں منقسم ہے۔ پہلے حصے میں حالت حمل میں ماں کی نگہداشت اور بچوں کے صغرسنی میں ان کی حفاظت اور تربیت کے اصول درج ہیں۔ دوسرے حصے میں بچوں کی تعلیم وتربیت کے اصول درج ہیں۔ تیسرے حصے میں قریب البلوغ لڑکے کی تعلیم وتربیت کے قواعد بیان کئے گئے ہیں۔ چوتھے حصے میں نوجوان لڑکوں کی تعلیم وتربیت کے اصول ونتائج سے بحث کی گئی ہے۔

۱۷۔ فقرائے اسلام : علامہ شہاب الدین احمد بن علی دبجی نے ان علماء کے حالات میں جنھوں نے علمی کمالات کے باوجود فقر وفاقہ کی زندگی بسر کی ہے۔ ایک کتاب ''الفلاکت والمفلوکون'' لکھی ہے۔ فقرائے اسلام حذف واضافہ کے ساتھ اسی کا ترجمہ ہے۔

۱۸۔ فطرت انسانی : یہ کتاب پروفیسر ہنری مارٹن کی کتاب ''عورت کا خلق اور مرد وعورت کا طبعی موازنہ'' کا ترجمہ وتلخیص ہے۔ وہ ایک فرنچ مصنف تھے۔ یہ کتاب ان کے لکچروں کا مجموعہ ہے۔ مصر کے ایک فاضل اور الہلال کے ایڈیٹر امیل زیدان نے فرنچ زبان سے عربی میں اس کا ترجمہ کیا۔ مولانا عبدالسلام ندوی نے اس عربی ترجمے کی تلخیص وترجمہ کر کے اردو داں طبقہ کو پروفیسر صاحب کے خیالات

سے استفادہ کا موقع دیا ہے۔

۱۹۔ابن یمین : ابن یمین اور اس کے کلام پر فارسی زبان میں ایک کتاب ایران سے شائع ہوئی تھی۔ مولانا نے اس کا اردو ترجمہ کیا لیکن اپنے معمول کے مطابق اس میں غیر ضروری مباحث کو حذف کر کے بہت ساری مفید معلومات کا اضافہ فرمایا ہے۔

ان کے علاوہ شعر العرب، تاریخ اخلاق اسلامی جلد دوم، تاریخ التنقید، ہندوستان کی تمدنی تاریخ اور حیات شبلی کا کچھ حصہ آپ نے سپرد قلم کیا تھا جو سب ہنوز غیر مطبوعہ ہیں۔ بہت سے دوسرے مصنفین کی کتابوں میں بھی آپ کا حصہ ہے۔ اس کے علاوہ ہزاروں صفحات پر مشتمل کئی سو مضامین بھی قلم بند کئے ہیں۔ زیادہ تر مضامین معارف میں شائع ہوئے۔ الندوہ میں بھی کئی درجن مضامین شائع ہوئے۔ ان کے علاوہ الہلال، وکیل امرتسر اور ظل سلطان (بھوپال) وغیرہ کے لئے بھی متعدد مضامین لکھے۔ آپ کے مضامین میں بڑا تنوع ہوتا تھا۔ فقہ کلام، فلسفہ تاریخ تفسیر، حدیث، شعر و ادب اور تنقید وغیرہ پر آپ کو عبور حاصل تھا۔ آپ نے ان سب پر مضامین لکھے۔

مولانا مسعود علی ندوی

مولانا مسعود علی ندوی تصنیف و تالیف کے میدان کے آدمی نہیں تھے لیکن علامہ شبلی کی نگاہ میں ان کی اہمیت ان کے صاحب قلم تلامذہ سے کم نہ تھی۔ ان کا شمار دارالمصنفین کے معماروں میں ہوتا ہے۔ ان کے اندر ندوہ کے طالب علمی کے دور سے ہی عزم و نظم کا مادہ اور غیر معمولی انتظامی و تنظیمی صلاحیت کا اظہار ہوتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انھوں نے مولانا شبلی کے دل میں اپنا ایک خاص مقام بنالیا تھا۔ اپنی بہتر کارکردگی کے ذریعہ بہت جلد مولانا کے دل میں جگہ پا گئے اور ان کے معتمد خاص بن گئے تھے۔ دارالمصنفین کی تاسیس کے بعد اس کا نظم و نسق انہی کے ذمہ ہوا جس کو انھوں نے اپنی خداداد صلاحیتوں سے بہت جلد منظّم و مستحکم ادارہ بنا دیا۔ چونکہ مولانا مسعود علی ندوی اپنی انتظامی صلاحیت اور حسن تدبیر کے لحاظ سے دوسروں

سے ممتاز تھے اس لئے علامہ شبلی علمی و مذہبی کاموں اور مجوزہ دارالمصنفین کے لئے اہل قلم سے زیادہ ان کو ضروری خیال کرتے تھے۔ انھوں نے اپنے استاد کی خواہش کا آخری دم تک احترام کیا۔ ان کے سامنے دارالمصنفین کے علاوہ کوئی دوسرا مقصد تھا ہی نہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ دارالمصنفین کی خوش قسمتی ہی ہے کہ جہاں اس کی علمی نظامت مولانا سید سلیمان ندوی مرحوم جیسے جید اور شہرہ آفاق عالم نے سنبھالی وہیں اسے مولانا مسعود علی ندوی جیسے سلیقہ مند اولوالعزم منتظم بھی ملے جو اپنے اندر بے پناہ انتظامی صلاحیت رکھتے تھے۔ ندوہ میں مولانا شبلی کی رہنمائی میں کام کرنے کا موقع ان کو براہ راست مل چکا تھا اس لئے مولانا کو ان کی ضرورت تھی۔ ان کے انتظامی صلاحیتوں اور قوتوں کا ذکر مولانا سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی میں خاص طور سے کیا ہے اور شاہ معین الدین احمد ندوی نے بھی ان کے امتیاز کا اعتراف کیا ہے۔ وہ حیات سلیمان میں رقمطراز ہیں:

> ''دارالمصنفین کو پروان چڑھانے میں دونوں کا حصہ ہے۔ سید صاحب اگر اس کی روح تھے تو مولانا مسعود علی صاحب جسم۔ سید صاحب کی ذات سے ہندوستان اور بیرون ہند میں دارالمصنفین کی علمی شہرت ہوئی تو مولانا مسعود علی صاحب نے اس کا مقامی وقار قائم کیا اور اس کے انتظامی امور کو سنبھالا۔'' [۱]

مولانا مسعود علی ندوی بھیارہ ضلع بارہ بنکی میں قدوائی خاندان کی ایک شاخ میں ایک زمیندار گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کرنے کے بعد ۱۹۰۴ء میں ندوۃ العلماء میں داخل ہوئے اور ۱۹۱۳ء میں ندوۃ العلماء سے فراغت حاصل کی۔ انتہائی وجیہ و شکیل اور ہر عملی و انتظامی کام میں پیش پیش تھے۔ ہر چند کہ مولانا علماء کے طبقے سے تعلق رکھتے تھے لیکن ان کی نفاست، خوش سلیقگی اور حسن انتظام کی مثال جدید تعلیم یافتہ طبقے میں بھی نہیں ملتی۔ جو بھی کام ان کے ذمہ ہوتا اس کو بہت خوش سلیقگی کے ساتھ پایہ تکمیل تک پہنچاتے۔ کافی بلند حوصلہ و باہمت تھے۔ کبھی کوئی کام ناقص نہیں چھوڑا اور نہ ہی مشکلات

۱۔ حیات سلیمان، شاہ معین الدین احمد ندوی، ص ۵۲۳۔۵۲۴

و پریشانی، مایوسی وگھبراہٹ ہوئی۔

قومی وملی کاموں میں بھی شروع ہی سے دلچسپی تھی۔استاد کی تربیت کے اثر سے انھوں نے قومی اور سیاسی تحریکوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔تحریک خلافت اور ترک موالات کے زمانہ میں انھوں نے ملک کے عظیم سیاسی وقومی لیڈروں، مدبروں و دانشوروں کے شانہ بہ شانہ کام کیا۔تحریک خلافت کے بڑے متحرک، فعال اور سرگرم کارکنوں میں سے تھے۔ ہندوستان کے عظیم رہنماؤں اور قومی لیڈروں سے ان کے اچھے تعلقات تھے۔خلافت اور نان کوآپریشن کے زمانہ میں تقریباً تمام مشاہیر کا انھوں نے دارالمصنفین میں پرجوش خیر مقدم کیا اور ان کی شاندار میزبانی کے فرائض بھی انجام دیئے۔ پنڈت موتی لال نہرو اور پنڈت جواہر لال نہرو کے تو وہ فیملی ممبر معلوم ہوتے تھے۔جب یہ مشرقی اضلاع کے دورے پر آتے تو بے تکلف شبلی منزل کے مہمان خانے میں فروکش ہوتے اور مولانا مسعود علی ان کی میزبانی کرتے۔مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے ان کی شخصیت کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے:

''ان میں رعب و دبدبہ فطری تھا اور شکل وصورت کے لحاظ سے بھی وجیہہ تھے۔ جس محفل میں بھی ہوتے، اپنی باتوں سے چھا جاتے۔رکھ رکھاؤ ایسا تھا کہ بڑی سے بڑی شخصیت سے کبھی مرعوب نہ ہوئے اور نہ دب کر ملے۔ان کا مذاق و معیار بہت بلند تھا۔ بہت سے لوگوں نے سوسائٹی کے آداب ان سے سیکھے تھے۔نہایت خوش گفتار اور باغ و بہار شخص تھے۔ان کی پرلطف اور دلچسپ گفتگو سننے کے لئے ملنے والوں کا تانتا بندھا رہتا۔تعطیل کے دنوں میں وکلاء اور شہر کے عمائد و معززین دارالمصنفین ان سے ملنے کے لئے ضرور آتے تھے اور مجلس میں بلبل ہزار داستان کی طرح چہکتے رہتے تھے اور سننے والوں کی یہ کیفیت ہوتی تھی کہ وہ کہیں اور سنا کرے کوئی۔ بڑے ظریف، حاضر جواب، بذلہ سنج اور برجستہ گو تھے۔اتنے عمدہ جملے اور برجستہ فقرے کستے تھے کہ حریف کے لئے

مقابلہ مشکل ہوتا تھا۔ کوئی شخص بات میں ان سے کم ہی پیش پاتا۔ نماز باجماعت کا وہ بڑا اہتمام کرتے۔ اشراق وتہجد کے بھی پابند تھے۔ ہر سال پابندی سے اعتکاف میں بیٹھتے۔ دو مرتبہ حج بیت اللہ کی سعادت بھی حاصل کی۔ مولانا اشرف علی تھانوی سے بیعت تھے۔''[1]

ان کا ذوق تعمیر بہت صاف ستھرا اور پاکیزہ تھا۔ دارالمصنفین کی خوبصورت مسجد اور اس کی دوسری عمارتیں شبلی نیشنل کالج کا ریڈنگ روم، دارالمصنفین کی لائبریری، مہمان خانہ، ان کے لطیف ونفیس ذوق کی علامت ہیں۔ دارالعلوم ندوہ کی مسجد، ہوسٹل اور شبلی کالج کی نئی عمارت انہی کے زیر نگرانی تعمیر ہوئی۔ چمن بندی اور چمن آرائی کے بھی شوقین تھے۔ ان کی اعظم گڑھ شہر میں کافی عزت تھی۔ لوگوں کو ان کی صحبت سے کافی مسرت حاصل ہوتی تھی۔

مولانا سید سلیمان ندوی جس طرح اس ادارہ کے علمی وفکری روح رواں تھے، اسی طرح ادارہ کا نظم ونسق اور اس کا پرسکون وباوقار ماحول، طباعت کا بلند معیار، رسالہ معارف کا وقت پر نکلنا، صفائی و شائستگی، باہر اس کا تجارتی اعتبار، یہ سب مولانا مسعود علی ندوی کے دم سے قائم تھا جو ان کی بیدار مغزی، مستعدی اور رعب ودبدبہ کا رہین منت تھی۔

آخری عمر میں مختلف عوارض کی وجہ سے جسمانی طور پر معذور ہو گئے تھے۔ صحت نے ان کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ آخر کار مستقل بیماریوں کو صبر وضبط سے جھیل کر بزم شبلی کی یہ شمع بھی ۲۷/اگست ۱۹۶۷ء کو بجھ کر رہ گئی اور مولانا شبلی کی مرقد سے چند فاصلے پر سپرد خاک کیا گیا۔

شاہ معین الدین احمد ندوی

شاہ معین الدین احمد ندوی دبستان شبلیؒ کے نامور ادیب، انشاء پرداز، جلیل القدر عالم اور مورخ و مصنف تھے۔ ان کے فضل وامتیاز کے لئے یہ کافی ہے کہ وہ دنیائے اسلام کی مایہ ناز شخصیت سید سلیمان

۱۔ چند ارباب کمال اردو، ضیاء الدین اصلاحی، ص ۲۲۴، ۱۹۸۳ء

ندوی کے جانشین تھے۔ شاہ صاحب کو سید سلیمان ندوی کی رہنمائی میں تصنیف و تالیف کی تربیت اور دبستان شبلی کے نامور مصنف اور ممتاز اہل قلم مولانا عبدالسلام ندوی کی برسوں صحبت کا شرف حاصل رہا۔ ندوہ سے فراغت کے بعد سید صاحب کی خواہش پر دارالمصنفین آئے اور زندگی کی آخری سانس تک تحقیق وتدقیق اور تصنیف وتالیف میں منہمک رہے۔ مختلف موضوعات پر ایک درجن سے زائد کتابیں اور متعدد مضامین و مقالات لکھ کر علم وادب کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ شاہ معین الدین احمد ندوی مشہور صوفی بزرگ شیخ احمد عبدالحق نوشہ رودولیؒ کے خاندان کے چشم و چراغ تھے۔ ۱۹۰۱ء کو پیدا ہوئے۔ ان کے والد ماجد شاہ حسنات احمد صاحب عربی وفارسی کے اچھے عالم اور مجذوب آدمی تھے۔ صوفیانہ ماحول میں پرورش پائی۔ ابتدائی تعلیم وتربیت ان کے نانا شرف الدین احمد کی زیرنگرانی ہوئی۔ اس کے بعد فرنگی محل کے دارالعلوم میں اعلیٰ تعلیم کے لئے داخل ہوئے اور متوسطات تک تعلیم حاصل کرنے کے بعد ندوہ میں داخلہ لیا۔ وہاں سے ۳ سال میں ادب عربی کی تکمیل کی۔ آپ نہایت ذہین اور باصلاحیت تھے۔ ان کا شمار دارالعلوم ندوۃ العلماء کے ممتاز طلبہ میں ہوتا تھا۔ اسی وجہ سے سید صاحب نے دارالمصنفین کی رفاقت کے لئے ان کا انتخاب کیا۔ شاہ صاحب جب ۱۹۲۴ء میں دارالمصنفین کے رفیق کی حیثیت سے آئے تو وہ دارالمصنفین کا زریں دور تھا۔ اس وقت سید صاحب کی شخصیت لوگوں کے لئے مرجع بنی ہوئی تھی۔ وہ دارالمصنفین کی ترقی کے متعدد خطوط لکھ کر اور منصوبے بنا کر اپنے رفقاء سے تحقیق وتصنیف کا کام لے رہے تھے۔ شاہ صاحب کو تاریخ سے خاص دلچسپی تھی اس لئے سید صاحب نے انہیں سب سے پہلے سیر الصحابہ اور خیر القرون کی تاریخ کی تدوین وترتیب کا کام سپرد کیا۔

جون ۱۹۴۶ء میں سید صاحب نواب حمید اللہ خاں بھوپال کے مسلسل اصرار پر بھوپال تشریف لے گئے اور ریاست کے قاضی القضاۃ اور امیر جامعہ بنائے گئے۔ ۱۹۵۰ء تک اس عہدہ پر فائز رہے لیکن دارالمصنفین سے آپ کا رشتہ قائم رہا۔ معارف کے شذرات بھی لکھتے رہے اور خطوط کے ذریعہ دارالمصنفین کے کاموں کی دیکھ بھال اور اس کی نظامت کے فرائض بھی انجام دیتے رہے۔ لیکن عملی طور پر

اب دارالمصنفین کی تمام ذمہ داریاں شاہ صاحب کے کاندھوں پر آن پڑی تھی اور وہ ان کو بخوبی نبھا رہے تھے۔ ۱۹۵۰ء میں سید صاحب کے پاکستان منتقل ہوجانے کے بعد شاہ صاحب دارالمصنفین کے شعبۂ علمی کے ناظم بنائے گئے اور دارالمصنفین کے تمام علمی اور تحقیقی منصوبوں کی ذمہ داری کلیۃً آپ کے کاندھوں پر آپڑی اور آپ اس بار امانت کو پوری زندگی اٹھاتے رہے۔ سید صباح الدین عبدالرحمان اس سلسلے میں رقمطراز ہیں:

''مولانا سید سلیمان ندوی کے دارالمصنفین کو خیرآباد کہنے کے بعد مولانا مسعود علی ندوی کے انتظامی سلیقہ، مولانا عبدالسلام ندوی کی علمی شہرت اور شاہ معین الدین احمد ندوی کی شیفتگی بروئے کار رہی۔ سید صاحب اپنی زندگی میں دارالمصنفین کے نقشے کو دیکھ کر خوش تھے۔ اگرچہ سید صاحب کے بعد اس علمی تاج محل پر چودھویں کی چاندنی تو نہیں چھٹکی مگر یہ برقرار رہا۔'' [۱]

شاہ صاحب نے جب دارالمصنفین کی نظامت سنبھالی تو وہ کافی مشکلات کا دور تھا۔ آزادی کے بعد تقسیم وطن کے گوناگوں مسائل اٹھ کھڑے ہوئے تھے اور دارالمصنفین کی مالی و اقتصادی حالت کافی خراب تھی۔ لیکن شاہ صاحب نے صبر و استقلال اور فہم و شعور سے کام لے کر نہ صرف دارالمصنفین بلکہ شبلی و سلیمان کی عظیم یادگار اور اس کے تمام علمی، تحقیقی و تصنیفی کاموں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کی حتی الامکان کوشش کی جس کا اعتراف خود سید صاحب نے کیا۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر آدم شیخ رقمطراز ہیں:

''علامہ سید سلیمان جیسی عظیم ہمہ جہت شخصیت کے بعد شاہ معین الدین احمد ندوی کے لئے ان کی قائم مقامی اور جانشینی کا کام آسان نہ تھا۔ مگر شاہ صاحب اپنے مزاج کی سلامت روی اور اعتدال کی وجہ سے اس خارزار کوچہ سے بھی کامیاب و کامران گزر گئے اور ان کے استاد حضرت سید صاحب کو یہ لکھنا پڑا کہ

۱۔ معارف شذرات، جنوری ۱۹۷۵ء، ص ۳

اب س (سید سلیمان ندوی) اور م (معین الدین احمد ندوی) میں شاید ہی کوئی فرق محسوس ہوتا ہو۔'' [۱]

شاہ صاحب کے شذرات بھی بڑے خاصے کی چیز ہوتے تھے۔ وہ اظہار رائے میں بہت بے باک اور بے لاگ تھے۔ ان کا قلم جادۂ اعتدال سے کبھی نہیں ہٹتا تھا۔ وہ بڑی صائب اور متوازن رائے رکھتے تھے۔ ان کی تحریر اردو نثر نگاری کا اچھا نمونہ ہوتی تھی۔

شاہ صاحب نصف صدی تک دارالمصنفین سے جڑے رہے لیکن ان کے پائے استقلال میں کبھی جنبش نہیں ہوئی۔ انھوں نے ادارے کی خدمت کو دنیا کی سب سے قیمتی دولت سمجھا۔ اچھے سے اچھے عہدے ان کے انتظار میں تھے لیکن دارالمصنفین کے عشق نے ان کو کسی اور آستانے کی جانب نظر اٹھانے کی مہلت نہ دی۔

وہ متعدد تعلیمی اور علمی اداروں اور تنظیموں کے رکن تھے۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی، قاضی محمد عدیل عباسی کی انجمن تعلیمات دین، انجمن ترقی اردو ہند، ہندوستان اکیڈمی الہ آباد، اردو اکادمی لکھنؤ اور جامعہ اردو علی گڑھ کے رکن تھے۔ شاہ صاحب کی تحریریں بھی لطف و حلاوت اور دلکشی و دلچسپی سے بھری ہوتی تھیں۔ بقول سید صباح الدین عبدالرحمان:

> ''شبلی کا ایجاز، سلیمان کا وقار، پھر ان کی انفرادی سلاست و روانی، شگفتگی اور پختگی، ان کے اسلوب کا امتیازی رنگ ہو گیا تھا۔ وہ اپنی تحریروں کی بے ساختگی میں عالمانہ رنگ اور عالمانہ رنگ میں وزن اور وزن میں نکھار پیدا کرتے رہے۔ اپنی تصنیف و تالیف میں دبستان شبلی کے انداز بیان اور مسلک کا پورا لحاظ رکھتے۔ آپ کی ادبی خوش مذاقی اور تصنیفی خوش سلیقگی کے مولانا عبدالسلام ندوی بھی معترف تھے۔'' [۲]

۱۔ علم و حلم و فضل کی شمع فروزاں، شاہ معین الدین احمد ندوی، ڈاکٹر آدم شیخ، ص ۸

۲۔ معارف شذرات، جنوری ۱۹۷۵ء، ص ۵

شاہ صاحب کی علمی وادبی خدمات کا اعتراف اہل علم کے علاوہ ارباب حکومت ہند نے ۱۹۷۰ء میں صدر جمہوریہ ایوارڈ برائے عربی خدمات عطا کر کے کیا۔ دو بار فریضہ حج کی سعادت نصیب ہوئی۔ سید صاحب کے بعد شاہ صاحب نے بزم شبلی کی رونق اور دارالمصنفین کی عزت وعظمت اور اس کی علمی شہرت اور شاندار روایات کو برقرار رکھنے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ ان کے یہ علمی کمالات اور تصنیفی خدمات ان کو بقائے دوام اور شہرت دوام بخشنے کے لئے کافی ہیں۔

شاہ صاحب شرافت اور حسن اخلاق کا اعلیٰ نمونہ تھے۔ آپ کی سیرت وشخصیت کا نقشہ مولانا ضیاء الدین صاحب اصلاحیؒ نے اس طرح کھینچا ہے:

''ان سے قطع نظر ان کی سیرت وشخصیت بھی نہایت دلکش اور پاکیزہ تھی اور ان کا دل اخلاقی عظمتوں اور خوبیوں سے بھی منور تھا۔ وہ نہایت شریف النفس، پاک طینت اور بڑے ستودہ صفات تھے۔ ان کی زندگی سادہ، درویشانہ اور تکلفات سے یکسر خالی تھی۔ موجودہ دور کی دلفریبیوں اور نئے تمدن کی ظاہری چمک دمک کا ان پر کوئی اثر نہ تھا۔ طبیعت میں نرمی ومروت اور دل اخلاص ومحبت کا ایسا آئینہ تھا جو نفاق، بناوٹ، تصنع اور حسد وکدورت کے گرد وغبار سے یکسر پاک تھا۔

شاہ صاحب کی اکثر ادائیں معصومانہ اور زندگی بڑی پاکیزہ اور بے داغ تھی۔ معصیت اور فجور کا ارتکاب تو درکنار اس کا تصور اور خیال بھی دل میں نہ آیا ہوگا۔ تہذیب وشائستگی اور وقار ومتانت کے خلاف کوئی بات نہیں کرتے تھے۔ ان کے بے تکلف احباب بھی مذاق اور تفریح میں مبتذل اور عامیانہ کوئی لفظ زبان پر لاتے تو اونھ کہہ کر ان کو ٹوک دیتے تھے۔ ان میں غرور وتمکنت کا کوئی شائبہ تک نہیں تھا۔ ان کی کسی ادا سے رعونت ونخوت کا اظہار نہ ہوتا تھا۔ وضع وقطع، چال ڈھال اور رفتار وگفتار ہر ہر چیز سے انکسار اور فروتنی کا پتہ چلتا تھا۔ ان میں خودستائی بالکل نہ تھی۔ میں نے کبھی ان سے اپنی تعریف وتوصیف اور عظمت و بڑائی کا ایک کلمہ بھی نہیں سنا۔ وہ اپنی تحریر تک پڑھنے کی کسی سے فرمائش تک نہ کرتے اور نہ کبھی اپنے کسی مضمون اور کتاب کی تعریف وتحسین فرماتے۔ اگر کوئی ان کے سامنے ان کی تحریروں کی تحسین کرتا تو محجوب

ہو جاتے اور گفتگو کا رخ کسی اور جانب موڑ دیتے۔ وہ بڑے کشادہ، روادار، اور انصاف پسند تھے۔ جماعتی عصبیت اور تنگ نظری سے ان کا دل خالی تھا اس لئے جس جماعت اور مسلک بلکہ جس مذہب وملت کے لوگوں میں بھی ان کو عظمت و بلندی کا کوئی نقش اور شرافت واخلاق کا کوئی جلوہ نظر آتا اس کی ستائش ضرور کرتے۔ آپ کسی جماعت اور تحریک سے وابستہ نہیں تھے۔ مگر ہر جماعت کے رہنماؤں اور اکابر سے ان کے مخلصانہ روابط تھے جس کی وجہ سے ہر شخص کو ان پر اعتماد واعتبار تھا..... شاہ صاحب بڑے مرنجا مرنج تھے اس لئے ہر طبقہ، ہر جماعت کے لوگوں میں بہت مقبول تھے۔ ہر شخص سے تپاک اور خندہ روی کے ساتھ پیش آتے۔ معمولی سے معمولی آدمی اور اپنے ماتحتوں اور ملازموں کے ساتھ بھی ان کا یہی رویہ اور برتاؤ تھا۔ کسی کو بھی ان سے کوئی شکایت نہیں تھی۔ وہ کسی کی دل شکنی اور دل آزاری نہیں کرتے تھے..... ان کی طبیعت میں جلد بازی، عجلت اور گھبراہٹ تھی۔ اس لئے خلاف مزاج بات ہو جاتی تو بگڑ جاتے۔ مگر آہستہ آہستہ ٹھنڈے ہونے لگتے۔ طبیعت میں بڑی سخاوت، فیاضی اور خیر خیریت کا جذبہ تھا۔ غریبوں کی خبر گیری کرتے اور ان کی چپکے چپکے مدد کرتے رہتے تھے۔'' [۱]

مولانا علی میاں ندوی نے شاہ صاحب کی شخصیت کو اس طرح واضح کیا ہے:

''شاہ صاحب کی سب سے بڑی نمایاں صفت ان کی فطری شرافت، کریم النفسی اور عالی ظرفی تھی۔ اس میں خاندانی روایات، علوئے نسب اور اودھ کی قدیم تہذیب کا بھی دخل تھا۔ اس شرافت کا تجربہ کم وبیش ان سب لوگوں کو ہوگا جن کا ان سے واسطہ پڑا یا کچھ دن ساتھ رہنے کا موقع ملا۔ اس کی ایک مثال یہ ہے کہ مولانا مسعود علی صاحب ندوی کے معذور ہو جانے کے بعد انھوں نے ان کی خدمت واحترام میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔'' [۲]

۱۔ علم وحلم وفضل کی شمع فروزاں، شاہ معین الدین ندوی، ڈاکٹر آدم شیخ، ص ۲۴۔۲۶

۲۔ پرانے چراغ اوّل، مولانا ابوالحسن علی ندوی، ص ۴۶۱

ان کی ذات، شہرت اور نام ونمود سے بالکل پاک تھی۔ جس بلند عہدے پر فائز تھے چاہتے تو بڑے سے بڑا اعزاز واکرام حاصل کر لیتے لیکن آپ کو نہ دنیا کی لالچ تھی نہ حصول زر کی آرزو۔ آپ کے مقام ومرتبہ کی وجہ سے ہر علمی ادارہ اور ادبی انجمن آپ کا خیر مقدم کرنے کے لئے تیار رہتی تھی۔

شاہ صاحب نہایت خاموشی سے علمی کام میں لگے رہتے تھے۔ کسی دوسرے کام سے مطلب نہیں رکھتے تھے۔ مسلسل علم وادب کی خدمات کو انجام دیتے ہوئے علم وفن کا یہ گنجینۂ خوبی ۱۴ر دسمبر ۱۹۷۴ء کو سپرد خاک ہوا اور رودولی میں اپنے آباء واجداد کی قبرستان کے پاس تدفین ہوئی۔

شاہ صاحب ادیب، انشا پرداز، شعروادب کے رمز شناس، صحابہ کرام کے سوانح نگار، مورخ اسلام، دین ورحمت کے شارح اور معارف کے ایڈیٹر تھے۔ آپ نے شبلی وسلیمان کی علمی روح وروایت کو باقی رکھنے میں اپنی ساری علمی وادبی صلاحیتیں صرف کر دیں۔ اب شاہ صاحب کی تصانیف کا مختصر تعارف پیش کیا جاتا ہے۔

مہاجرین حصہ دوم : یہ شاہ صاحب کی پہلی تصنیف ہے۔ اور دارالمصنفین کے سلسلہ صحابہ کے حصہ مہاجرین کی تیسری جلد ہے۔ اس میں صحابہ کرام کے حالات وسوانح اور ان کی مذہبی وسیاسی خدمات کا مرقع مستند ماخذوں سے پیش کیا گیا ہے۔

۱۔ سیر الصحابہ ششم : سیر الصحابہ کی اس جلد میں حضرت حسینؓ، حضرت امیر معاویہ اور حضرت عبداللہ ابن زبیرؓ کے حالات زندگی، اخلاق وکردار، فضائل ومناقب اور ان کے مذہبی وسیاسی اور مجاہدانہ کارناموں کی تفصیلات قلم بند کی گئی ہے۔

۲۔ سیر الصحابہ جلد ہفتم : یہ سلسلہ سیر الصحابہ کی سب سے آخری جلد ہے۔ علامہ شبلی کی خواہش کے مطابق مولانا عبدالسلام ندوی نے اسوہ صحابہ سے اس کا آغاز کیا تھا جو شاہ صاحب کے قلم سے پورا ہوا۔ اس میں ایک سو پچاس ایسے صحابہ کے حالات وسوانح اور کارنامے بیان کئے گئے ہیں جنھوں نے فتح مکہ کے بعد اسلام قبول کیا یا فتح مکہ سے پہلے ہی مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے مگر ہجرت نہ کر سکے تھے۔ نیز ان صحابہ کرام کا

بھی ذکر ہے جو عہد رسالت میں صغیر السن تھے۔

۲۔عرب کی موجودہ حکومتیں : اس میں جزیرۃ العرب کی تمام قابل ذکر حکومتوں اور ملکوں نجد وحجاز، عسیر و یمن، لحج، نواحی تسعہ، بحرین، کویت، عراق، بشمول فلسطین وشام کی اجمالی تاریخ اور جغرافیہ لکھا گیا ہے۔

۳۔تاریخ اسلام جلد اوّل تا چہارم : تاریخ اسلام کی پہلی جلد میں عہد رسالت وخلافت راشدہ کی مذہبی، سیاسی اور علمی تاریخ قلم بند کی گئی ہے۔مقدمہ میں حضورؐ کی بعثت سے پہلے عرب کی تاریخ اور اس کے قدیم جغرافیہ پر عمدہ بحث کی گئی ہے۔ پھر آنحضرتؐ کی ولادت باسعادت سے وفات تک مختصر حالات ہیں۔ نیز آپؐ کے اخلاق وفضائل اور اس انقلاب آفریں دور کے سیاسی، تہذیبی اور تمدنی نقوش پیش کئے گئے ہیں۔اس کے بعد الگ الگ ابواب میں خلفائے راشدین حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ، حضرت علی مرتضیٰؓ کے حالات وسوانح، اخلاق وعادات، فضائل ومناقب اور عہد خلافت راشدہ کے ہر قسم کے سیاسی اور علمی وتہذیبی واقعات، فتوحات اور نظام خلافت کی مفصل تاریخ معتبر ومستند ماخذوں سے بیان کی گئی ہے۔

تاریخ اسلام کی دوسری جلد میں بنی امیہ کے سوسالہ دور حکومت کی اجمالی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ شروع میں خاندان بنی امیہ کی مختصر تاریخ ہے۔ پھر دولت اموی کے بانی حضرت امیر معاویہ سے لے کر آخری اموی حکمراں مروان ثانی تک کے تمام حکمرانوں کے حالات، نظام حکمرانی اور ان کے عہد حکومت پر تنقید وتبصرہ کیا گیا ہے۔آخر میں اس عہد کی علمی حالت اور علوم وفنون کی ترقی وایجادات وغیرہ پر خاص طور سے تبصرہ کیا گیا ہے جس سے سیاسی تاریخ کے ساتھ اس عہد کی علمی تاریخ کا ایک مرقع سامنے آجاتا ہے۔

تیسری جلد میں خلافت عباسیہ کے دو برسوں کی تاریخ قلم بند کی گئی ہے۔ساتھ ہی عباسی حکمرانوں کے حالات، کارناموں اور ان کے عہد خلافت کی سیاسی وعلمی تاریخ کی تفصیل سپرد قلم کی گئی ہے۔

چوتھی جلد تاریخ بنوعباس کا دوسرا حصہ ہے۔اس میں مستکفی باللہ سے لے کر آخر عباسی خلیفہ معتصم باللہ تک کی سیاسی تاریخ تحریر کی گئی ہے۔

۵۔تابعین : اس میں صحابہ کرام سے فیض یافتہ چھیانوے اکابر تابعین کے سوانح زندگی اوران کے مذہبی اصلاحی، تبلیغی، سیاسی اور مجاہدانہ کارناموں کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔ دیباچہ میں کتاب کی اہمیت وضرورت اوراس کے مشتملات کا ذکر ہے۔

۶۔ادبی نقوش : شاہ صاحب نے اپنے نوادبی مضامین کی مقبولیت وافادیت کے پیش نظر ادبی نقوش کے نام سے مرتب کیا جسے ۱۹۶۰ء میں ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ نے شائع کیا جو بہت مقبول ہوا۔ آپ کے ان مضامین سے آپ کی ادبی وتنقیدی فہم وبصیرت کا اندازہ ہوتا ہے۔

۷۔دین رحمت : اسلام ایک دین رحمت ہے۔ یہ پوری انسانیت کے لئے نازل کیا گیا ہے جو بلاتفریق مذہب وملت اور بلا امتیاز دوست ودشمن سب کے لئے یکسر رحمت ونعمت ہے۔ شاہ صاحب نے اس کتاب میں اسی پہلو کا اختصار مگر جامعیت کے ساتھ ذکر کیا ہے اور قرآن وحدیث کی روشنی میں اس کی تمام تفصیلات پیش کردی ہیں۔ یہ پندرہ ابواب پر مشتمل ہے۔ آخری ابواب میں مسلمانوں کے علوم وفنون اور ان کی ایجادات واختراعات اوران کے علمی احسانات کا ذکر ہے۔ یہ اپنے موضوع پر ایک منفرد کتاب ہے۔ اپنی تصانیف میں شاہ صاحب کو یہ تصنیف سب سے زیادہ پسند تھی۔

۸۔حیات سلیمان : یہ سید سلیمان ندوی کی سوانح عمری ہے۔ یہ کتاب حیات شبلی کی طرح ضخیم اوراسی طرز پر لکھی گئی ہے۔ اس میں سید صاحب کی تحریروں کے اقتباس کثرت سے دیئے گئے ہیں۔ اس لئے اس کتاب کی اہمیت سوانح عمری کے ساتھ خودنوشت کی بھی ہوگئی ہے۔ یہ کتاب نوابواب پر مشتمل ہے۔ پہلے میں وطن، خاندان اور تعلیم وتربیت کا ذکر ہے۔ دوسرے باب میں تعلیم سے فراغت اور قیام دارالمصنفین سے پہلے کے حالات وخدمات کا بیان ہے۔ تیسرا باب دارالمصنفین کے قیام اوراس کے ابتدائی خدمات کی تفصیل ہے۔ چوتھے باب میں سید صاحب کی قومی وسیاسی خدمات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ پانچویں باب میں ۱۹۲۷ء سے ۱۹۳۴ء تک کے قومی وملی خدمات کا ذکر ہے۔ چھٹا باب ۱۹۳۴ء سے ۱۹۴۷ء تک کے حالات وکارناموں پر منحصر ہے۔ ساتویں باب میں قیام بھوپال کے حالات ہیں۔ آٹھویں باب میں ذاتی

حالات اور اخلاق و عادات کی تفصیل ہے۔ آخر میں وفات پر لکھے جانے والے چند مراثی قطعات ہیں۔ ضمیمہ میں بعض اہم شذرات، معارف کے اقتباسات سے ان کے قومی وملی احساسات پیش کئے گئے ہیں۔ اس طرح یہ سید صاحب کی سوانح عمری کے ساتھ ساتھ عہد سلیمانی کی تاریخ بھی ہوگئی ہے۔ اس کا شمار دارالمصنفین کی مقبول ترین کتابوں میں ہوتا ہے۔

۹۔ انوارالعیون فی اسرار المکنون : یہ شاہ صاحب کے جدامجد مخدوم شیخ احمد عبدالحق رودولی کے ملفوظات کا مجموعہ ہے جسے شیخ عبدالقدوس گنگوہی نے مرتب کیا تھا۔ شاہ صاحب نے اسے اردو کا جامہ پہنایا اور مطبع معارف سے طبع کرایا۔

۱۰۔ اسلام اور عربی تمدن : یہ کتاب شام کے مشہور فاضل علامہ محمد کرد علی کی کتاب ''الاسلام والحضارۃ العربیۃ'' کا اردو ترجمہ ہے۔ اس میں اسلام اور اسلامی تہذیب وثقافت پر مغربی مصنفین اور اہل قلم کے اعتراضات کا جواب دیا گیا ہے اور یورپ پر اسلام اور مسلمانوں کے علمی، اخلاقی اور تمدنی احسانات اور ان پر مسلمانوں کے اثرات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ آخر میں مسلمانوں کی علمی وتمدنی تاریخ پر اجمالی تبصرہ کیا گیا ہے۔

۱۱۔ خریطہ جواہر : شاہ صاحب کے محبوب شاعر مرزا مظہر جان جاناں کے مشہور فارسی اشعار کی بیاض خریطہ جواہر سے ان کو بڑی شیفتگی تھی۔ اس کے اشعار ہر وقت آپ کی زبان پر رہتے۔ آخر میں آپ کو احساس ہوا کہ لوگوں کا رجحان شعر وادب کی طرف سے ختم ہو رہا ہے اس لئے اس کا اردو ترجمہ تشریح کے ساتھ کر دیا جائے۔ معارف میں یہ سلسلہ شروع کیا تو بہت پسند کیا گیا اور بہت فراخ دلی کے ساتھ اس کو داد تحسین ملی۔ شاہ صاحب کی ان مایہ ناز تصانیف سے ان کی گراں قدر علمی وادبی خدمات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

سید صباح الدین عبدالرحمانؔ

سید صباح الدین عبدالرحمانؔ ایک عظیم مورخ، مایہ ناز محقق، ملک کے نامور اور صف اوّل کے ادیب وانشا پرداز کی حیثیت سے ہمہ گیر شہرت رکھتے تھے۔ جس طرح سید سلیمان ندوی، حمید الدین فراہی

اور مولانا مسعود علی ندوی کا شمار دارالمصنفین کے معماروں میں ہوتا ہے، اسی طرح آپ کا شمار بھی دارالمصنفین کے معماروں میں ہوتا ہے۔ آپ ان خوش نصیب لوگوں میں سے تھے جن کی علمی وادبی اور مذہبی خدمات کا اعتراف بہت فراخ دلی کے ساتھ آپ کی زندگی میں ہی کیا گیا۔

آپ دسنہ کے ایک معزز سادات خاندان میں ۱۹۱۱ء میں پیدا ہوئے۔ پیدائش سے دو مہینے قبل سایہ پدری سے محروم ہوگئے۔ سات سال کی عمر میں والدہ محترمہ بھی داغ مفارقت دے گئیں۔ اس طرح مادری و پدری محبت سے لذت آشنا نہ ہوسکے۔ نانی نے اپنے سایہ عاطفت میں لیا اور پرورش و پرداخت کی۔ ابتدائی تعلیم دسنہ کے مکتب میں حاصل کی۔ وہاں اردو، فارسی اور حساب کے ساتھ قرآن مجید ناظرہ پڑھا۔ پھر ۱۹۱۵ء میں انگریزی تعلیم کے لئے پٹنہ گئے۔ وہاں نیم سرکاری اسکول محمڈن اینگلو عربک اسکول میں داخلہ لیا۔ ۱۹۱۵ء میں نالندہ کالجیٹ اسکول سے میٹرک پاس کیا۔ اس کے بعد وہ مظفر پور چلے گئے اور جی بی بی کالج مظفر پور میں داخلہ لیا اور ۱۹۲۷ء میں انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کیا۔ انٹر پاس کرنے کے بعد مظفر پور سے پٹنہ آگئے اور پٹنہ کالج میں داخلہ لیا۔ یہاں انہیں اچھا علمی ماحول ملا۔ باصلاحیت اور قابل اساتذہ کے زیر سایہ صباح الدین صاحب کا علمی ذوق مسلسل ترقی کررہا تھا۔ ایم اے کے دوران امتحان ہی صباح الدین صاحب کا داخلہ سید سلیمان ندوی کی سفارش پر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے ٹریننگ کالج میں ہوگیا اور ۱۹۳۳ء میں وہ علی گڑھ کے ٹریننگ کالج میں داخل ہوئے۔ ۱۹۳۴ء میں بی اے کی ڈگری حاصل کی پٹنہ یونیورسٹی سے علی گڑھ کے زمانہ تک حصول تعلیم کے ساتھ ساتھ وہ تحریری کام بھی دلچسپی سے کرتے تھے۔ آپ نے سید حسن برنی کی کتاب ''ضیاء الدین برنی'' کا انگریزی میں ترجمہ کیا۔ اس کے علاوہ سید سلیمان ندوی کی کتاب ''خواتین اسلام کی بہادری'' اور مولانا شبلی کی کتاب ''اورنگ زیب عالم گیر'' کا بھی انگریزی میں ترجمہ کیا۔ مستشرقین کے خلاف علمی جہاد کیا اور ان کے زہرناک لٹریچر کا اپنی تحریروں سے تریاق پیش کیا۔ ۱۹۲۵ء میں دارالمصنفین کے رفقاء میں شامل ہوئے لیکن تعلیمی سلسلہ بدستور جاری رہا۔ ۱۹۳۶ء میں پٹنہ یونیورسٹی سے ایم اے (اردو) اور ۱۹۳۷ء میں ایم اے (فارسی) فرسٹ کلاس پاس کیا۔

سید سلیمان ندوی نے ان کی صلاحیت تحقیق وجستجو اور انشاء پردازی کے جذبہ کو دیکھ کر دارالمصنفین بلالیا اور انگریزی ترجمہ وتالیف کا کام ان کے سپرد کیا۔

صباح الدین صاحب نے بہت ہی کم مشاہرہ پر قناعت کے ساتھ بڑی بے نیازی سے نصف صدی تک دارالمصنفین کے گوشہ میں بیٹھ کر علمی، مذہبی اور ادبی خدمات انجام دیں اور اپنے خون جگر سے علم وفن کی آبیاری کی۔ اپنے پیش روؤں کی طرح وہ بھی اسی کو اپنا سب کچھ سمجھتے تھے۔

جب سید سلیمان ندوی پاکستان منتقل ہوگئے اور مسعود علی ندوی کے قویٰ بھی جواب دے گئے اس وقت دارالمصنفین کی مالی حالت بھی عالم نزع میں تھی۔ لیکن صباح الدین صاحب نے بہت ہی حوصلہ، ہمت اور بلند ارادے کے ساتھ حالات کا مقابلہ کیا اور ان حالات پر قابو پا گئے۔ انھوں نے بہت ہی نازک دور میں دارالمصنفین کی خدمت کا بیڑا اٹھایا تھا لیکن اپنی کوششوں سے ہر طرح کامیاب رہے۔ ڈاکٹر محمد طاہر نے اپنے مضمون ''سید صباح الدین عبدالرحمٰن کی یاد میں'' آپ کی خدمت کا اس طرح اعتراف کیا ہے:

> ''دارالمصنفین کے علمی پروگرام ومشن کو فروغ دینے، اس کی روایت کو آگے بڑھانے اور عالمی سطح پر اس ادارے کو شہرت دینے نیز مالی اعتبار سے مستحکم کرنے میں سید صاحب مرحوم نے جو خدمات انجام دیں اور جو منصوبہ مرتب کیا وہ محض ان کی ذاتی کوششوں اور صلاحیتوں کا ثمرہ ہے۔'' [۱]

سید صاحب ہندوستان کے بہت سے علمی، ادبی، مذہبی اکاڈمیوں، انجمنوں اور سوسائٹیوں کے چیئرمین اور ممبر رہے۔ ان کی خدمات کے پیش نظر حکومت بہار، حکومت اتر پردیش، اردو اکاڈمی یوپی، اردو اکاڈمی بہار اور دوسرے اداروں کی جانب سے ان کی تصانیف پر انعامات وایوارڈ ملے۔ اس کے علاوہ یونیورسٹی گرانٹس کمیشن نے مرزا غالب پر کتاب لکھنے کے لئے مبلغ ۲۱ ہزار روپیہ کی مجموعی رقم منظور کی۔

۱۔ نیا دور، لکھنؤ، مارچ تا ستمبر، سید صباح الدین عبدالرحمٰن کی یاد میں، ڈاکٹر محمد طاہر، ص ۱۳۹

اس موضوع پر سید صاحب نے دو جلدیں مرتب کیں۔ فارسی زبان و ادب پر مسلمہ قابلیت کے بنا پر ۲۸ / مارچ ۱۹۸۱ء کو حکومت ہند نے صدر جمہوریہ ایوارڈ منظور کیا۔ پانچ ہزار روپیہ سالانہ تاحیات تھا۔ ایک سند توصیفی بھی عطا کیا۔ بعد میں یہ رقم ساڑھے سات ہزار ہوگئی۔ دارالمصنفین جیسے ادارہ کا سربراہ ہونا سید صباح الدین کے لئے نہ صرف فخر و شرف کی بات تھی بلکہ مسلمانوں کے علمی و اجتماعی زندگی میں ان کے ایک مقتدر شخصیت ہونے کی دلیل بھی تھی۔ سید صباح الدین اور شاہ معین الدین نے اس سربراہی کو نہ صرف احسن ڈھنگ سے پورا کیا بلکہ اس عظیم ملی و علمی ادارے کو ترقی دی اور اپنی علمی و تحقیقی کاوشوں سے بھی ادارے کی علمی شہرت کو قائم و دائم رکھا اور اسے آگے بڑھایا۔

سید صاحب اپنے علمی، تحقیقی اور ادبی پہلوؤں کے ساتھ ساتھ اپنی شخصی زندگی میں بھی مرنجان مرنج صفات کے مالک تھے۔ نہایت شگفتہ مزاج اور ملنسار تھے۔ تواضع اور انکساری کے حامل، زبان کے بڑے میٹھے اور محبت کرنے والے شخص تھے۔ وہ دشمنوں سے ہمدردی کا سلوک کرتے۔ عالمانہ ظرافت اور ادبی اسلوب سے اپنی گفتگو کو دل نواز بنا دیتے۔ انھوں نے اپنے حسن اخلاق سے بہت سے لوگوں کو اپنا گرویدہ اور قدردان بنالیا تھا۔ علمی و ادبی حلقوں میں ان کو امتیازی درجہ حاصل تھا۔ آپ کی شخصیت کا خاکہ ڈاکٹر محمد طاہر نے اس طرح کھینچا ہے:

> ''آپ بہت ہی خلیق وضع دار، ملنسار، بامروت اور مہمان نواز تھے۔ وہ علم کی برگزیدگی کے پاسبان اور محافظ تھے۔ کاملان علم و ادب اور تشنگان علم و فن کی بڑی قدردانی و پذیرائی فرماتے تھے۔ آپ کے واقف کاروں اور مداحوں کا حلقہ بہت وسیع تھا۔ نا صرف ہندوستان بلکہ بیرون ہند بالخصوص پاکستان میں آپ کو بڑی قدر و منزلت اور عزت و احترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ وہاں کے علمی، مذہبی، ادبی، سرکاری و غیر سرکاری اداروں کی جانب سے سید صاحب کے پاس برابر دعوت نامے آتے اور سید صاحب حتی الوسع شرکت فرماتے۔''[۱]

۱۔ نیا دور، مارچ تا ستمبر ۱۹۸۸ء، ڈاکٹر محمد طاہر، ص ۱۳۸

سید سلیمان ندوی کو آپ کی تاریخ نگاری کے شعور وفن پر مکمل بھروسہ تھا اور انھوں نے آپ سے بہت سی امیدیں بھی وابستہ کر رکھی تھیں جس کو انھوں نے پورا بھی کیا۔ جس کا ذکر سید صاحب نے اپنے بہت سے خطوط میں کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''اللہ تعالیٰ تم کو صحت و عافیت کے ساتھ تادیر دارالمصنفین کی خدمت کا موقع دے۔ اب تم سے اور برادرم شاہ معین الدین احمد ندوی سے ساری امیدیں وابستہ ہیں۔ تم دونوں دارالمصنفین کا چراغ ہر طرح سے روشن رکھنا ہے اور ہاں بھئی اب پورے عزائم کے ساتھ تاریخ ہند کے سلسلہ کو بھی جاری رکھو۔ اللہ تبارک تعالیٰ پورا فرمائے۔'' [۱]

اسی تاریخ ہند کے سلسلہ میں سید صباح الدین کو ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں:

''میں تو چراغ سحری ہوں۔ شاہ معین الدین صاحب دوسرے کاموں میں لگیں گے۔ اب تم کو ہی تاریخ ہند کے سلسلہ کو مکمل کر کے چھپوانے کا انتظام کرنا ہے۔'' [۲]

ڈاکٹر محمود الٰہی نے آپ کو تاریخ ہند کا مرمیدان بتایا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''سید صباح الدین صاحب علم تاریخ کے مرمیدان تھے اور یہ عنصر بھی دبستان شبلی کے خمیر میں شامل ہے۔ انھوں نے بطور خاص ہندوستان کی تاریخ کے ان ابواب کا مطالعہ کیا جو قومی یکجہتی، رواداری اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے ترجمان ہیں۔ انھوں نے اپنی تحریروں سے یہ ثابت کیا کہ ہندوستان میں ہم آہنگی اس کا

۱۔ حیات سلیمان، شاہ معین الدین احمد ندوی، ص ۵۲۳۔۵۲۴، بحوالہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن حیات اور کارنامے، ڈاکٹر خورشید عالم، ص ۴۵۔۴۶

۲۔ ایضاً، ص ۴۵۔۴۶

طرۂ امتیاز ہے۔''[۱]

صباح الدین صاحب کو تحریر و تصنیف کا خاص ملکہ اور اس پر بڑی قدرت تھی۔ وہ جس موضوع پر جب چاہتے بڑی ہی بے تکلفی سے لکھ دیتے۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر بہت سی تصانیف کا بڑا وسیع ذخیرہ چھوڑا ہے۔ ان کی تصانیف کمیت و کیفیت دونوں ہی لحاظ سے بہت اہم ہیں جو دارالمصنفین کے دوسرے مصنفین کی طرح معیاری اور بلند پایہ ہونے کے بنا پر علمی اور تحقیقی کام کرنے والوں کے لئے مستند ماخذ ہیں۔ آپ کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ ایک ایک کتاب کا مواد اکٹھا کرتے وقت ضمنی موضوعات پر بھی مواد فراہم کرتے جاتے۔ اس طرح ایک کتاب کی تیاری میں دوسری کتاب بھی مکمل ہو جاتی۔ سید صباح الدین صاحب کا مقام علمی، ادبی، تاریخی ہر حلقہ میں کافی بلند تھا۔ آپ کی تحریریں علم کی گہرائی اور پختگی کے ساتھ ادب کی چاشنی بھی رکھتی تھیں۔ مبالغہ سے احتراز کرتے تھے۔ اپنی پوری زندگی علمی و تحقیقی کاموں میں صرف کرتے ہوئے آستانہ شبلی کا یہ مجاور علم و فن کے آسمان پر کم و بیش ۵۲ سال تک آفتاب و ماہتاب بن کر چمکنے کے بعد ۱۸ر نومبر ۱۹۸۷ء کو سرزمین لکھنؤ پر ایک معمولی حادثہ میں موت سے ہم آغوش ہو گیا۔

سید صباح الدین کی حیثیت کوکب تاباں کے مانند تھی۔ تقریباً تیرہ سال تک دارالمصنفین اعظم گڑھ کے سربراہ کی حیثیت سے شبلی و سلیمان کے روایات کی پاسبانی کرتے رہے۔ دبستان شبلی کی جملہ خصوصیات ان کی ذات میں جمع ہو گئی تھیں۔ علم و ادب، تاریخ و تحقیق، تنقید و صحافت اور تصنیف و تالیف کے ایوانوں میں آپ کی گونج ہمیشہ سنائی دیتی رہے گی۔

سید صباح الدین صاحب کی مندرجہ ذیل کتابیں ارباب علم و نظر سے خراج تحسین حاصل کر چکی ہیں۔

۱۔ بزم تیموریہ : ان کی پہلی تصنیف ہے جو دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب بہت مشہور و مقبول ہوئی۔ اس میں تیموری سلاطین، بابر، ہمایوں، اکبر، جہانگیر، شاہجہاں، عالم گیر اور بہادر شاہ ظفر وغیرہ نیز مغل شہزادوں اور امراء کی علمی سرپرستی اور علم دوستی کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔

۱۔ نیا دور، مارچ۔ستمبر، ۱۹۸۸ء، ص ۱۱۸

۲۔ بزم صوفیہ : صباح الدین صاحب کی شاہکار تصنیف ہے جس میں تیموری عہد سے پہلے کے بزرگان دین اور صوفیائے کرام کے حالات، تعلیمات اور ارشادات بیان کئے گئے ہیں۔ اس کتاب میں مصنف نے بعض ایسے بزرگوں کے حالات اور واقعات لکھے ہیں جو ان سے پہلے کسی نے نہیں لکھے۔

۳۔ بزم مملوکیہ : اس میں آپ نے ہندوستان کے غلام سلاطین یعنی سلطان ناصر الدین، قطب الدین ایبک اور دوسرے فرماں رواؤں کی علمی سرپرستیوں کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ ان سلاطین کے زمانے میں جن عالموں، فاضلوں، ادیبوں اور شاعروں نے اپنی لافانی تصانیف اور علمی کاوشوں سے ہندوستان کی علمی زندگی کو مالا مال کیا اور جن کے ادبی کارناموں کو بقائے دوام حاصل ہوا، ان کا تفصیلی بیان اس کتاب میں پڑھنے کے لائق ہے۔

۴۔ ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے : اس میں سلاطین دہلی اور شاہان مغلیہ کے عہد کے دربار، محلات، حرم، لباس، پارچہ باقی، زیورات، جواہرات، خوشبوئیں، اشیائے خورد ونوش، ساز و سامان، ظروف، تہوار، تقریبات، موسیقی اور مصوری وغیرہ کی مکمل تفصیل بیان کی گئی ہے۔ مولف کے قلم نے تاریخ کے آئینہ میں تہذیب کا ایسا رنگ بھر دیا ہے کہ تاریخ میں افسانے کا لطف پیدا کر دیا ہے۔ اس میں مملوک اور مغل فرماں رواؤں کے دور کے تمدن کی مرقع آرائی کی گئی ہے۔ اس سے دونوں دور کے تمدن کا فرق نمایاں ہو گیا ہے۔

۵۔ ہندوستان کے سلاطین علماء اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر : مسلمانوں کے طویل دور حکومت میں مختلف مذاق و عادات کے ۴۸ بادشاہ گزرے ہیں۔ ان میں سے بعض نے تعلیم کی ترقی میں حصہ لیا اور بعض نے تو اپنے حسن طبیعت سے اس کو رشک جناں بنا دیا۔ اس کے ساتھ ہی انھوں نے اپنے عہد کے علماء و مشائخ سے بھی تعلقات رکھے۔ اس کتاب میں اس کی تفصیل پیش کی گئی ہے جس سے اسلامی ہند کی مذہبی، علمی، ذہنی اور فکری تاریخ پر اجمالی تبصرہ بھی ہو گیا ہے۔

۶۔ ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں : یہ کتاب امیر خسرو کی مندرجہ ذیل مثنویوں دواوین کا انتخاب

ہے۔قران السعدین، مفتاح الفتوح، شیریں، خسرو، ہشت بہشت، دول رانی، خضر خاں، از شہر اور نہایۃ الکمال۔شروع میں مصنف کے قلم سے ایک مقدمہ ہے اس میں امیر خسرو کے حالات اور ان کے وطن دوستی، وطن نوازی اور وطن پروری سے متعلق ان کے تاثرات کو یکجا کر دیا گیا ہے جس سے اس زمانے کا پورا منظر نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔

۷۔ظہیر الدین محمد بابر : اس میں سلطنت مغلیہ کے بانی ظہیر الدین محمد بابر سے متعلق ترک بابری کے علاوہ مغلیہ عہد، اس کے بعد دور جدید کے مسلمان اور ہندو مورخین نے فارسی، اردو اور انگریزی میں جو کچھ لکھا ہے اس کے اقتباسات نقل کر کے بابر کے جنگی، سیاسی، علمی، تمدنی اور تہذیبی کارناموں کا مرقع پیش کیا گیا ہے۔مرتب نے جن مورخین کی تحریریں نقل کی ہیں ان پر کوئی نقد وتبصرہ نہیں کیا ہے۔یہ کتاب مصنف کی سخت محنت وکاوش کا نتیجہ اور دارالمصنفین کے سلسلہ تاریخ ہند کی اہم کڑی ہے۔

۸۔ ہندوستان کے بزم رفتہ کی سچی کہانیاں : یہ کتاب دو حصوں میں ہے۔پہلے حصہ میں عہد مغلیہ سے پہلے کے مسلم حکمرانوں کی اور دوسرے میں ظہیر الدین بابر سے نورالدین جہانگیر تک کے حکمرانوں کی اور مذہبی رہنماؤں و دینی پیشواؤں کی سبق آموز کہانیاں تحریر کی گئی ہیں۔

یہ کتاب مصنف نے اس جذبہ سے لکھی ہے کہ ماضی کے ان پرشکوہ واقعات وحکایات سے اخلاقی، معاشرتی، سیاسی اور ملکی زندگی کی تعمیر میں مدد لی جائے۔ان رنگارنگ قصوں اور حکایتوں کے ذریعہ انھوں نے ماضی کے روشن اور تابناک پہلوؤں کو پیش کر کے بلند و پاکیزہ جذبات کو ابھارنے کی کوشش کی ہے۔

۹۔ڈاکٹر سید محمود : ڈاکٹر سید محمود نے ملک کی آزادی کی تحریک میں نمایاں اور سرگرم حصہ لیا اور ان کے لئے ہر قسم کی قربانی بھی دی۔وہ دوقومی نظریہ کے ہمیشہ مخالف اور ہندو مسلم اتحاد کے علمبردار رہے۔گاندھی جی، پنڈت نہرو اور مولانا ابوالکلام آزاد سے بہت قریب رہے۔ان کا علمی وادبی ذوق بھی بہت اچھا تھا۔انہیں تاریخ ہند سے بہت دلچسپی تھی۔ان کا تعلق دارالمصنفین سے بہت پرانا تھا اور مدتوں اس کی مجلس انتظامیہ کے صدر بھی رہے۔اس رشتہ سے وہ دارالمصنفین برابر تشریف لاتے تھے۔سید صباح الدین

عبدالرحمٰن صاحب نے ان کے اخلاق کی پاکیزگی، کردار کی بلندی، طبیعت کی شرافت اور وطن سے ان کی مخلصانہ محبت سے بہت متاثر تھے۔ چنانچہ انھوں نے معارف میں ان کے انتقال کے بعد خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے مقالہ لکھنا چاہا تو ان کے تاثرات بہت طویل ہوگئے جن کو انھوں نے اس کتاب میں جمع کر کے ۱۹۷۲ء میں شائع کیا۔

۱۰۔ ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری : اس میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، فراخ دلی، ان کی دوسری اور ہندوؤں کے ساتھ محبت و ہمدردی کی تفصیلات مستند ماخذوں اور معاصر تاریخوں کے حوالے سے پیش کی گئی ہے۔ یہ تین جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد میں عہد مغلیہ سے پہلے کے حکمرانوں اور دوسری تیسری جلد میں مغل حکمرانوں کی رواداری کا ذکر ہے۔ اس کتاب سے مولف کی حب الوطنی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس کتاب کا مقصد ملک کے دو بڑے فرقوں کے درمیان پھیلی ہوئی نفرت، بدگمانی اور ذہنی شکوک وشبہات کو دور کر کے ان میں موانست ویگانگت کی فضا پیدا کرنا اور ملک میں قومی یکجہتی اور جذباتی ہم آہنگی کو فروغ دینا ہے۔

۱۱۔ مولانا محمد علی کی یاد میں : سید صباح الدین صاحب ہندوستان کے سیاسی قائدین میں مولانا محمد علی مرحوم سے سب سے زیادہ متاثر تھے۔ ان پر ایک فرمائشی مضمون لکھنے بیٹھے تو اتنا طویل ہوگیا کہ ایک کتاب وجود میں آگئی جو مولانا محمد علی کی مکمل سوانح عمری تو نہیں بلکہ اس عظیم رہنما کو ایک خراج تحسین ہے۔ اس سے مولانا محمد علی کی قومی وملی خدمات اور دینی حمیت وحب الوطنی کی مکمل تصویر سامنے آجاتی ہے۔

۱۲۔ غالب مدح وقدح کی روشنی میں : یہ کتاب دو جلدوں پر مشتمل ہے۔ پہلی جلد میں مرزا غالب کے وقت سے ۱۹۲۸ء تک اور دوسری میں ۱۹۲۹ء سے ۱۹۶۹ء تک ان کی زندگی اور شاعری کے متعلق موافقت ومخالفت میں جو کچھ لکھا گیا ہے، اس پر مفصل ناقدانہ تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس سے غالب کی مدح و قدح کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

۱۳۔ صوفی امیر خسرو : اس میں ہندوستان کے شہرہ آفاق فارسی شاعر اور حضرت نظام الدین اولیا کے

جانثار مرید امیر خسرو کو معاصر تذکرہ و تاریخ اور ان کے کلام کی روشنی میں ایک صاحب دل صوفی کی حیثیت سے پیش کیا گیا ہے۔ یہ رسالہ ان لوگوں کی تردید کی غرض سے لکھا گیا ہے جو تصوف میں امیر خسرو کے پایہ و مرتبہ کے مفکر ہیں۔

۱۴۔ **بزم رفتگاں** اوّل و دوم : یہ مصنف کے ان مضامین اور تاثراتی تحریروں کا مجموعہ ہے جو مشہور و ممتاز اصحاب علم و سیاست کی وفات کے بعد لکھی گئی ہیں۔ ان سوانحی خاکوں میں متعلقہ اشخاص کے حالات و واقعات اور ان کی سیرت و کردار کے گوناگوں تابناک پہلوؤں کو نمایاں کیا گیا ہے۔

۱۵۔ **سلاطین دہلی کے عہد میں ہندوستان سے محبت و شیفتگی کے جذبات** : اس میں سلاطین دہلی کے دور کے ایسے واقعات جمع کئے گئے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ خود ان بادشاہوں نیز ان کے عہد کے لوگوں کے دل ہندوستان کی محبت و الفت کے جذبات سے سرشار تھے۔ تاتاریوں کے جس عظیم سیلاب کو دنیا کی حکومتیں روکنے میں ناکام رہیں ان کا رخ ان سلاطین کی وطن پرستی نے موڑ دیا اور ہندوستان ان کی زد سے محفوظ رہا۔ ساتھ ہی مسلمانوں کے بارے میں اس الزام کی تردید ہوگئی کہ وہ حب الوطنی کے جذبے سے عاری تھے۔ اس کتاب سے ملک میں اتحاد و یکجہتی اور جذبات و ہم آہنگی کو فروغ دینے و سمجھنے میں بڑی مدد ملتی ہے۔

۱۶۔ **اسلام اور مستشرقین** اوّل : شبلی اکیڈمی کے زیر اہتمام منعقد ہوئے ایک بین الاقوامی سمینار میں اسلام اور مستشرقین کے موضوع پر یہ کتاب ساری روداد لئے ہوئے بہت دلچسپ اور شگفتہ انداز میں لکھی گئی ہے۔

۱۷۔ **مولانا شبلیؒ پر ایک نظر** : یہ کتاب علامہ شبلی نعمانی کے حالات و کمالات کا اجمالی مرقع ہے۔ یہ کتاب حیات شبلی کی تلخیص ہے۔ اس میں مولانا کی کتابوں کا مختصر تعارف بھی ہے۔

۱۸۔ **اسلام میں مذہبی رواداری** : ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری تحریر کرنے کے بعد سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کو احساس ہوا کہ قرآن مجید اور حدیث نبویؐ میں مذہبی رواداری سے

متعلق جو تعلیم و ہدایات بیان کی گئی ہیں اور رسولؐ، خلفائے راشدین اور دوسرے مسلمان فرماں رواؤں نے اس کے جو عمدہ اور اعلیٰ نمونے پیش کئے ہیں، ان سب کو اکٹھا کر کے یہ کتاب لکھی گئی ہے۔ سید صباح الدین صاحب نے اسلام اور مسلمانوں کی رواداری اور غیر مذہب والوں کی ساتھ فراخ دلی کے واقعات تحریر کرنے کے ساتھ ہی عیسائی حکمرانوں اور مذہبی پیشواؤں کی عدم رواداری، چیرہ دستی، سیاسی سفا کی، ظلم و بربریت اور جور و تشدد کی ہولناک مثالیں بھی عیسائی مورخین کی کتابوں کے حوالوں سے پیش کی ہیں۔

۱۹۔ سید سلیمان ندوی کی تصانیف ایک مطالعہ اوّل : اس کتاب میں سید سلیمان ندوی کی تصانیف کا مبسوط تعارف کرا کے ان پر مفصل تبصرہ کیا گیا ہے جس سے سید صاحب کی تصانیف کی خصوصیات اور خوبیاں پوری طرح نمایاں ہوگئی ہیں۔ کتاب کے شروع میں سید صاحب کے حالات و کمالات کا مختصر مگر جامع مرقع پیش کیا گیا ہے۔

۲۰۔ مغل بادشاہوں کے عہد میں ہندوستان سے شیفتگی و محبت کے جذبات : اس کتاب میں مغل بادشاہوں اور ان کے متعلقین کے حب وطن کے جذبات کی تصویر کشی کی گئی ہے۔ یہ کتاب قومی یکجہتی اور اتحاد کی استواری کے لئے مشعل راہ کا کام دے گی۔ ان درجنوں تصانیف کے علاوہ صباح الدین صاحب نے بے شمار مضامین لکھے۔ ان میں بعض شبلی اور سید سلیمان ندوی کی تصانیف کے انگریزی ترجمے ہیں۔ لیکن بعض انگریزی میں لکھی گئی ان کی چند کتابیں ہیں اور بہت سی کتابوں کو ایڈٹ کر کے بھی شائع کیا ہے جس میں سید سلیمان ندوی کے تاریخی واقعات کا مجموعہ ''مقالات سلیمان جلد اول'' ہے۔ اس کے علاوہ اسلام اور مستشرقین جلد اول تا چہارم بھی انھوں نے لکھی ہے۔

مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی

مولانا عبدالسلام قدوائی ۷ر مارچ ۱۹۰۷ء کو تھولینڈی ضلع رائے بریلی میں پیدا ہوئے۔ آپ کی شخصیت مختلف اوصاف کی حامل تھی۔ علمی و ادبی میدان میں نمایاں حیثیت کے ساتھ ساتھ اچھے استاد، اچھے مصنف اور نامور ماہر تعلیم تھے۔ علوم دینیہ اور اور علوم حاضرہ دونوں میں اچھی دسترس تھی۔ اگر ایک طرف

قرآن وسنت کے علوم سے واقفیت تھی تو دوسری طرف علم کلام اور تاریخ وادب میں بھی اچھی دستگاہ تھی۔ عصر جدید کے علوم کو سمجھنے کے لئے انگریزی زبان کی ضروری صلاحیت بھی پیدا کرلی تھی۔ آپ کا شمار مراکز دینیہ کی علمی وتعلیمی ماحول کی اعلیٰ شخصیتوں میں ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ عصری تعلیم کے ماحول میں بھی خاصی عزت حاصل تھی۔ فراغت کے بعد ندوۃ العلماء لکھنؤ میں استاد مقرر ہوئے۔ ندوۃ العلماء کی تعلیمی خدمات کو انجام دینے کے بعد جامعہ ملیہ کو بھی استفادے کا موقع دیا۔ وہاں سے سبکدوش ہونے کے بعد ایک طرف ندوۃ العلماء کے اعزازی معتمد تعلیم رہ کر ندوۃ العلماء کے مقاصد وتعلیمی نظریات کو مفید طریقہ سے بروئے کار لانے میں اپنے مشوروں اور رہنمائیوں سے فائدہ پہنچایا تو دوسری طرف دارالمصنفین جیسے وقیع تحقیقی و تصنیفی ادارہ کی سرپرستی کی۔ مولانا قدوائی ایک ممتاز عالم اور اچھے انسان تھے۔ ان کی ذات علم وانسانیت دونوں کا مجموعہ تھی۔ دوسرے ہم عصر علماء کے برخلاف ماحول کے ساتھ ساتھ دنیاوی ماحول میں بھی زندگی بسر کی۔ ہندوستان کی دو مشہور دینی اور عصری درسگاہوں دارالعلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے طالب علم رہے اور استاد بھی۔ اس کے علاوہ جامعہ کے ناظم دینیات اور ندوہ کے معتمد تعلیمات بھی رہے اور آخر میں دارالمصنفین کی نظامت کا بارگراں بھی اپنے کاندھوں پر اٹھالیا۔ اور نہایت شوق وذوق اور انشراح کے ساتھ یہاں کے علمی کاموں میں شریک رہے۔ اخلاق ومروت، شرافت وخودداری، بے تکلفی، مجلس آداب، غرض کہ ہر خوبی کے جامع بزرگ تھے۔ انداز گفتگو معصومانہ تھا۔ مخاطب کو بہت جلد متاثر کرلیتے تھے۔ غرض یہ کہ مختلف اوصاف کا مجموعہ تھے۔ محمود الازہار ندوی نے مولانا قدوائی کی مجموعی شخصیت کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے:

> ''مولانا عبدالسلام قدوائی ندویؒ فرزندان ندوہ کے اس حلقہ سے تعلق رکھتے تھے جس پر ندوہ کو ناز وفخر ہی نہیں تھا بلکہ وہ ندوی فکر وتخیل کے پوری طرح علمبردار نمونہ تھے۔ مولانا کی تعلیم وتربیت خالص ندوی طرز فکر اور ماحول میں ہوئی۔ ان کے جلیل القدر اساتذہ میں مولانا عبدالرحمٰن ندوی نگرامی، مولانا سید

سلیمان ندوی، اور مولانا حیدر حسن خان کا نام نامی لیا جا سکتا ہے۔ جن سے ان کو حد سے زیادہ لگاؤ اور محبت تھی۔ مولانا سادہ لوح اور خوش طبع اور خاموش کام کرنے والے انسان تھے۔ اور یہ خوبیاں ان کی تعلیمی و تدریسی زندگی، رسالہ الندوہ کی ادارت، ادارہ تعلیمات، اسلام کا قیام، درس قرآن پھر رسالہ تعمیر حیات کا اجراء اور جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی میں صدر شعبہ دینیات اور آخر میں ندوہ میں معتمد تعلیمی اور دارالمصنفین میں شاہ معین الدین احمد ندوی کے انتقال کے بعد نظامت، ان سب میں جلوہ گر نظر آتی ہے۔ وہ جہاں بھی گئے جس حال میں رہے اپنی ملنساری کو باقی رکھا اور شگفتہ بیانی کی وجہ سے مقبول و محبوب رہے اور مختلف طریقوں سے تشنگان علوم کی پیاس بجھاتے رہے۔ ان کی زندگی کا بڑا حصہ تدریس میں گزرا۔ تصنیف و تالیف کی طرف ان کی طبیعت مائل نہیں تھی۔ اسی وجہ سے بہت کم لکھا لیکن وہ بہت کم بھی کچھ ایسا کم نہیں۔'' [۱]

زندگی سادہ، تحریر لفظی صناعی سے دور لیکن موثر وضع قطع تکلفات سے پاک غرض ان کی ہر چیز سادہ تھی۔ کسی موضوع پر لکھتے وقت ایسا انداز اختیار کرتے کہ ان کی بات دل میں اتر جائے۔ آپ کو یکسو ہو کر تصنیف و تالیف کی طرف توجہ دینے کا موقع نہیں ملا۔ یوں بھی لکھنے سے بہت بھاگتے تھے جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا۔ رسالوں میں منتشر مضامین کے علاوہ مولانا کی جو کتابیں اور رسالے علاحدہ سے شائع ہوئے ہیں ان سے ایک طرف موضوع کا تنوع ظاہر ہوتا ہے تو دوسری طرف ان موضوعات پر مولانا کی اچھی گرفت کا پتہ چلتا ہے۔

مولانا کو سیاست سے شغف نہیں تھا اور نہ ہی اس طرح کی محفل میں شریک ہوتے تھے لیکن اس کے باوجود پختہ سیاسی شعور رکھتے تھے۔ ان کا یہ سیاسی ذہن الہلال اور البلاغ کے مطالعہ سے پیدا ہوا تھا۔

۱۔ تعمیر حیات، بیادگار عبدالسلام قدوائی ندوی مرحوم، خصوصی نمبر ۱۹۸۳ء، ص ۱۱۴

ذہنی طور پر قوم پرور سیاست کے حامی تھے مگر کسی جماعت کے باقاعدہ ممبر نہیں بنے۔

مولانا کی شخصیت ہر طرح کے تکلفات سے مبرا تھی۔ اپنے مضامین میں نہ تو طویل تمہید باندھتے تھے اور نہ ہی مرادفات کی بھرمار رکھتے تھے۔ تحریر اور تقریر دونوں میں تفصیلات سے احتراز کرتے۔ کبھی کبھی تو اشاروں ہی میں بات ختم کر دیتے۔ مولانا قدوائی کی تصنیفات حسب ذیل ہیں۔

۱۔ ہماری بادشاہی : مولانا نے یہ کتاب بچوں کے لئے لکھی تھی اس لئے اس کی عبارت سادہ اور آسان ہے۔ واقعات کا بیان اختصار سے کیا گیا ہے تاکہ بآسانی بچے ذہن نشین کر سکیں۔ زبان کے استعمال میں بچوں کی پسندیدگی اور دلچسپی کا خاص لحاظ رکھا گیا ہے۔ بہت سی جگہوں پر ان کے قومی وقار اور مذہبی خودداری کو اجاگر کیا گیا ہے تاکہ تاریخ سے مستفید ہو سکیں۔ اس میں مسلمانوں کی تمام بڑی سلطنتوں کی مختصر اور آسان تاریخ پیش کی گئی ہے جو گزشتہ صدیوں میں روئے زمین کے اطراف میں انھوں نے قائم کیں۔ تمام سلطنتوں کو مختصراً پیش کیا گیا ہے تاہم کوئی بڑی سلطنت چھوٹنے نہیں پائی ہے۔

۲۔ ہندوستان کی کہانی : یہ کتاب ابتدائی مدرسوں کے بچوں کے لئے لکھی گئی ہے۔ یہ بہت ہی مفید اور پر از معلومات ہے۔ اس میں ہندوستان کی مختصر تاریخ، قدیم ہندوستان، مسلمانوں کی آمد سے پہلے اور بعد کے واقعات پھر ہندوستان کے جن سیاسی حالات میں مسلمانوں کی آمد شروع ہوئی تھی اس کا ذکر، محمد بن قاسم کا داخلہ، محمود غزنوی اور غوری کی آمد، ہندوستان میں خودمختار غلام حکومت کا قیام۔ خلجیوں اور تغلق خاندان کے عروج وزوال کی کہانی، افغان پٹھانوں کے کارنامے، مغل حکمرانوں کے پرشکوہ دور کا تذکرہ اور انگریزوں کی غلامی سے لے کر آزاد ہندوستان تک، تقسیم ہند سے لے کر آج کے دور تک کی تاریخ کو آسان زبان میں پیش کیا ہے۔

۳۔ حدیث نبوی کے اوّلین صحیفے : اس میں حدیث کے ان صحیفوں کا ذکر ہے جو رسولؐ کے عہد مبارک میں مرتب ہوئے۔ یہ رسالہ ''الندوہ'' میں ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا تھا جس کو کسی قدر ترمیم کے ساتھ کتابی شکل میں شائع کیا گیا ہے۔ اس میں مولانا نے حدیث کی ضرورت، آنحضرتؐ کی توجہ، کتابت حدیث کی

اجازت، عہد رسالت کی تحریری کوشش، آنحضرتؐ کی طرف سے املا، عہد صحابہ کی تحریری جدوجہد، صحابہ کرام کے مرتب کردہ حدیث کے مجموعے، حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی تصنیفات، حضرت ابوہریرہؓ کی کتابیں، حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی مرویات، حضرت جابرؓ کے صحیفے، حضرت عائشہؓ کے تحریری مجموعے، حضرت ابوسعید خدریؓ کی روایات، مکثہ بن صحابہ کی تصانیف، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی تصنیفات، حضرت زید بن ثابتؓ کی مرویات، دوسرے اہم صحابہ کی کتابیں جیسے عنوانات کو اس کتاب میں تحریر فرمایا ہے۔

۴۔ عربی زبان کے دس سبق : یہ کتاب عربی زبان کے صرف دس اسباق پر مشتمل ہے۔ یہ کتاب مولانا نے بذریعہ ڈاک ان لوگوں کے لئے شروع کی تھی جو عربی سے نابلد تھے۔ اس میں روزمرہ کی چیزیں اور قواعد کا مختصر تعارف بھی ہے تاکہ کوئی اس کتاب کے بعد قرآن مجید کا ترجمہ وتفسیر تھوڑا بہت پڑھنا چاہئے تو پہلی دوسری اور تیسری کتاب پڑھ کر قرآن کے معانی ومطالب کسی حد تک اس کی سمجھ میں آجائیں۔ اس اسباق میں دو باتوں کا خاص خیال رکھا گیا ہے جس کا اظہار مولانا نے کتاب کے مقدمہ میں کیا ہے۔ فرماتے ہیں:

۱۔ قرآن مجید کے ابتدائی الفاظ سے واقفیت ہوجائے

۲۔ روزمرہ کے عربی الفاظ سے تعارف ہوجائے۔ اس کے لئے عربی سے اردو اور اردو سے عربی کے جملے جمع کردیئے گئے ہیں تاکہ روزمرہ کی بات چیت میں سہولت ہو۔

۵۔ مثالی حکمراں : ''سروری دردیں ما خدمت گریست'' کے عنوان سے مولانا کا تحریر کردہ مضمون ''الفرقان'' میں ۱۹۴۸ء میں شائع ہوا۔ اس کے بعد رسالہ ''تعمیر حیات'' لکھنؤ میں کئی مہینوں تک ان مضامین کا سلسلہ جاری رہا۔ ان مضامین کو پیش کرنے کی غرض خود مولانا نے مقدمہ میں یہ تحریر فرمایا ہے:

''خوش قسمتی سے کاروان رفتہ کے نقوش ادب بھی اوراق تاریخ میں محفوظ ہیں۔
ایک عرصہ سے جی چاہتا تھا کہ ان نقوش کو اوراق تاریخ سے نکال کر منظر عام پر
لایا جائے اور ساتویں صدی کے جمہوری نظام سے بیسویں صدی کے جمہور کو

باخبر کیا جائے۔''[۱]

بعد میں دوستوں کے اصرار پر مولانا نے اس پر نظر ثانی کی، اس کے تمام واقعات اصل مآخذ سے لئے گئے ہیں۔ ان پر غور کر کے ان کی صحت کا اطمینان کر کے کتاب کی شکل میں شائع کروایا ہے۔

۶۔ **دنیا اسلام سے پہلے اور اسلام کے بعد** : یہ مولانا کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جن کو انھوں نے درس وتدریس سے وقت نکال کر مکتبہ جامعہ سے شائع کیا۔ اس میں ''دنیا ڈیڑھ ہزار سال پہلے''، ''مصلح''، ''بنیادی عقیدہ''، ''انسانیت کی فصل بہار'' جیسے اہم عنوانات کا ذکر ہے۔

۷۔ **قرآن مجید کی پہلی دوسری اور تیسری کتاب** : مولانا نے غیر عربی داں حضرات کے لئے جو قرآن مجید کے معانی اور کسی حد تک تشریح وتفسیر کو بھی پڑھ لیں یہ کتاب ترتیب دی۔ اس کتاب میں مولانا نے اصل عربی عبارت کے ساتھ اردو ترجمہ بھی دے دیا ہے اور اخلاقی مضامین سے صرف نظر حکایات اور آسان تر اخلاقی قصے دیئے ہیں۔

۸۔ **حیدر حسن خاں** : اس کتاب میں مولانا ندوی نے مولانا حیدر حسن خاں کے خاندانی حالات، ابتدائی تعلیم وتربیت اور حصول تعلیم کے لئے لاہور کا سفر اور وہاں کا قیام، زمانہ تدریس اور ٹونک کے مدارس کا تذکرہ، سفر حج اور اصحاب ثروت سے اغراض، تدریس کی شہرت اور ندوہ میں بحیثیت شیخ الحدیث آمد، امام ابوحنیفہ سے غیر معمولی عقیدت ومحبت نیز طریقہ درس اور اپنے چھوٹوں سے برتاؤ، غریب نوازی، مہمان نوازی، رواداری، شاگردوں کا خیال، جدید مسائل سے دلچسپی، ندوۃ سے استعفیٰ اور اولاد وشاگرد سب کا خوش اسلوبی کے ساتھ ذکر کیا ہے۔

۹۔ **میزان ومنشعب جدید** : یہ مجموعہ دو کتابوں پر مشتمل ہے۔ اس میں عربی زبان کے قواعد کو سہل اور آسان طریقہ پر پیش کیا گیا ہے۔

۱۔ مثالی حکمراں، عبدالسلام قدوائی ندوی، ص ۴

مولانا ضیاء الدین اصلاحی

نامور اہل قلم، محقق اور مایہ ناز ادیب و انشاء پرداز، ناظم دارالمصنفین و مدیر معارف، ممتاز عالم دین مولانا ضیاء الدین اصلاحی ۳ر جولائی ۱۹۳۷ء کو اپنے ننیہال جیراج پور، اعظم گڑھ میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد شیخ عبدالرحمٰن اردو و فارسی کے عالم اور صاحب ذوق آدمی تھے۔ انہیں کی زیر سرپرستی مولانا کی تعلیم و تربیت کا آغاز ہوا اور مدرسہ اسلامیہ نظام آباد میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے مدرسۃ الاصلاح، سرائے میر، اعظم گڑھ میں داخلہ لیا اور انیس سال کی عمر میں تعلیم سے فراغت حاصل کیا۔ آپ مدرسۃ الاصلاح کے نامور فرزند اور گوہر شب چراغ تھے۔ مولانا نے اس ادارے کے لائق اساتذہ مولانا شبلی متکلم، مولانا ابوالجلال ندوی، مولانا اختر احسن اصلاحی، مولانا صدرالدین اصلاحی اور مولانا احمد علی فاضل دیوبندی جیسے ارباب کمال سے کسب فیض کیا۔

بچپن سے ہی پڑھائی سے شغف تھا محنت، لگن، شوق، جستجو یہ ساری خوبیاں طالب علمی کے دور سے ہی تھیں۔ لکھنے پڑھنے کی شروعات بھی اسی دور سے ہوئی۔ تکمیل تعلیم سے پہلے ہی معارف کے مضمون نگار بن چکے تھے۔ معارف میں مولانا کا پہلا مضمون ''امام ابوحنیفہ کی فقہ (ترک حدیث کے الزام کا جواب)'' فروری ۱۹۵۵ء میں شائع ہوا۔ اور پھر کئی مضامین شائع ہوئے۔ شاید یہی وجہ تھی کہ تکمیل تعلیم کے بعد ۱۹۵۷ء میں دارالمصنفین سے وابستہ ہوگئے۔ پھر دم واپسیں تک اسی کی خدمت میں رہے۔ دینی و علمی خدمات اور ذاتی اوصاف کے اعتبار سے بڑے بلند مقام پر فائز تھے۔ تصنیف و تالیف کے میدان میں آپ کو خاص امتیاز حاصل تھا۔ جس موضوع پر قلم اٹھاتے اس کا حق ادا کر دیتے۔

مولانا ضیاء الدین اصلاحی دارالمصنفین میں مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کے زیر تربیت رہے۔ دارالمصنفین سے تصنیف و تالیف اور ترجمہ خاص طور سے ادب و انشاء کی دلآویزی کا ہنر سیکھا اور علم و ادب کے آسمان پر اس طرح روشن ہوئے کہ بے شمار علمی و ادبی اور تحقیقی مضامین و مقالات اور کئی کتابیں آپ کے نوک قلم سے نکلیں جس نے آپ کو زندہ جاوید کر دیا۔

مولانا کے علمی کارناموں کی فہرست کافی طویل ہے۔ ۱۹۵۷ء سے ۲۰۰۸ء تک دارالمصنفین اور معارف کی علمی داستان میں کسی نہ کسی طرح موجود رہے۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن کے بعد اس ادارہ میں سب سے زیادہ ماہ وسال صرف کیا۔ مولانا کی تصانیف، قرآن وحدیث کی تعلیم، عرب و ہند کے تعلقات، تذکرہ وشخصیات مختلف موضوعات سے تعلق رکھتی ہیں جس میں ایضاح القرآن، تذکرۃ المحدثین، ہندوستان عربوں کی نظر میں، چند ارباب کمال اردو، مولانا ابوالکلام آزاد، مذہبی افکار، صحافت، قومی جدوجہد، انتخاب کلام سہیل، خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔

مولانا کے علم وفضل اور علمی خدمات کے علاوہ ان کی شخصیت کا ایک قابل قدر پہلو وہ اوصاف و خصائص ہیں جن کا امتزاج علم وفضل، کسی عظیم منصب اور ناموری کے ساتھ کم ہی ملتا ہے۔ یعنی انکساری، تواضع اور خاکساری، تکلف وتصنع سے دوری، سادگی اور اعلیٰ ظرفی مولانا نے اس سلسلے میں ایسی مثالیں قائم کی ہیں جس کے نقوش بہت گہرے ہیں۔ ہر کسی سے والہانہ انداز میں ملتے تھے۔ دل کینہ وکدورت سے بالکل مبرا تھا۔ نرم دم گفتگو اور گرم دم جستجو کے سچے مصداق تھے۔ تکبر واحساس برتری کے کبھی شکار نہیں ہوئے۔ اپنے اعلیٰ رتبے پر کبھی فخر نہیں کیا۔

مولانا میں قومی حمیت وغیرت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ جب بھی مسلمانوں پر کوئی مصیبت آتی بے چین ہوجاتے اور اپنی تقریر وتحریر کے ذریعہ واضح انداز میں اس کا اظہار کرتے۔ کوسود میں سربوں کا ظلم ہو یا افغانستان وعراق میں امریکی تشدد، فلسطینیوں پر اسرائیل کی بمباری ہو یا گجرات کا قتل عام، ہر موقع پر مولانا کا قلم خون کے آنسو رویا اور اسے انسانیت کا ناقابل تلافی نقصان بتایا۔

مولانا مسلمانوں کی تعلیمی پسماندگی سے دل برداشتہ نہیں تھے۔ ان کا خیال تھا کہ تعلیم کے بغیر کوئی قوم ترقی نہیں کرسکتی۔ اس لئے مسلسل مسلمانوں کو تعلیم کی طرف متوجہ کرتے رہے۔ البتہ افسوس اس بات کا تھا کہ مسلمان زیادتیوں کا شکوہ تو کرتے ہیں مگر اپنی لاپرواہی کا مداوا نہیں کرتے۔

۸/نومبر ۱۹۸۷ء میں صباح الدین عبدالرحمٰن کی وفات کے بعد دارالمصنفین کے ناظم اور ماہنامہ

معارف کے مدیر منتخب ہوئے اور پھر تاحیات دارالمصنفین کی تعمیر و ترقی کے لئے سرگرم عمل رہے اور اس کے وقار و معیار کو بنائے رکھا۔ چراغ سے چراغ روشن رکھنے کی بزرگوں کی روایت کو آگے بڑھایا۔ اس کے انتظام و انصرام کو مضبوط کیا۔ نئی عمارتیں تعمیر کروائیں۔ کتابوں کے جدید ایڈیشن شائع کروائے۔ قاضی عبدالاحد ازہری صاحب مولانا کے بارے میں رقمطراز ہیں:

''مولانا اصلاحی صاحب بالکل شبلی و سلیمان کے رنگ میں رنگے ہوئے تھے۔ آپ کی تحریروں میں شبلی و سلیمان کی تحریروں کا رنگ جھلکتا تھا۔ ان کی نگارشات پڑھنے سے ایسا محسوس ہوتا تھا کہ ہم مولانا شبلی اور مولانا سید سلیمان ندوی کو پڑھ رہے ہیں۔ ان کی تحریروں میں وہی ادبیت اور چاشنی ہوتی تھی جو شبلی نعمانی اور سید سلیمان ندوی کی تحریروں میں ہوتی تھی اور سطر سطر سے ان کی علمیت اور پختگی ٹپکتی تھی۔ مولانا اصلاحی صاحب نے کسی بھی طرح ادارہ کے اعتماد اور وزن کو مجروح نہیں ہونے دیا۔'' [۱]

پروفیسر ظفر الاسلام صاحب اصلاحی مولانا کی شخصیت کا ذکر اس طرح کرتے ہیں:

''مولانا پورے پچاس سال ۱۹۵۷ء سے ۲۰۰۸ء تک اس ادارہ (دارالمصنفین شبلی اکیڈمی) سے وابستہ رہے جس سے معمولی انتساب وجہ شرف سمجھا جاتا ہے۔ بیس برس اس بین الاقوامی شہرت کے حامل ادارہ کے سربراہ رہے اور اردو کے نہایت قدیم و معیاری رسالہ معارف کے مدیر رہے۔ تقریباً گیارہ برس وہ مدرسۃ الاصلاح میں ناظم رہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے متنوع موضوعات پر بیش بہا کتابیں اور رسالے تصنیف کئے لیکن ان سب کے ساتھ انھوں نے علمی زندگی میں جس منکسرانہ مزاجی، متواضعانہ برتاؤ، شریفانہ

۱۔ معارف، اپریل ۲۰۰۸ء، ص ۲۹۴

اخلاق، سادہ رہن سہن اور تکلفات سے دوری کا مظاہرہ کیا وہ موجودہ دور کے مزاج کے لحاظ سے کچھ تعجب خیز معلوم ہوتا ہے لیکن یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ یہ مولانا کا امتیاز تھا۔'' ۱

علمی مشاغل اور اسلامی مصروفیات کے ساتھ ساتھ مولانا قومی وملی مسائل میں دلچسپی رکھتے تھے۔ حالات حاضرہ پر مولانا کی گہری نظر تھی۔ مسلمانوں کی اجتماعی فلاح و بہبود کے مسائل پر غور وفکر کے صائب وسنجیدہ رائے کا اظہار کرتے۔ زبان وادب پر گہری نگاہ تھی۔ اردو ادب کا مطالعہ خصوصی طور پر بہت وسیع اور ذوق نکھرا ہوا تھا۔

جب وہ ادبی موضوعات پر قلم اٹھاتے تو اس کا حق ادا کر دیتے۔ ان کی زبان مستند اور حسن انشاء کا نمونہ تھی۔ ان کی ادبی عبارتیں تحقیقی اور ادبی دلآویزی کی خوبصورت نثر کا نمونہ تھی۔ ایک بہترین مقالہ نگار تھے۔ مختلف موضوعات پر بے شمار تحریریں یادگار چھوڑی ہیں۔

ہندوستان کے ممتاز علمی و تعلیمی اداروں کے رکن رکین اور سرپرست تھے۔ ندوۃ العلماء، لکھنؤ، دارالعلوم تاج المساجد بھوپال، اردو اکاڈمی لکھنؤ، ہندوستان اکاڈمی الہ آباد، مجلس تحقیقات ونشریات اسلامی لکھنؤ کے بھی ممبر رہے۔ مولانا کی ان علمی خدمات کا اعتراف بھی دل کھول کر کیا گیا۔ چنانچہ یوپی اردو اکاڈمی لکھنؤ اور بنگال اردو اکاڈمی نے انعامات سے نوازا۔ آل انڈیا میر اکاڈمی نے نوائے میر اور امتیاز میر ایوارڈ سے نوازا۔ ۱۹۹۵ء میں سابق صدر جمہوریہ ہند عالیجناب ڈاکٹر شنکر دیال شرما نے بھی اپنے دور صدارت میں مولانا کو صدارتی ایوارڈ سے نوازا اور سند توصیف عطا کی۔

مولانا اصلاحی تقریباً نصف صدی تک دارالمصنفین اور معارف کی داستان میں کسی نہ کسی شکل میں موجود رہے۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن کے بعد اس ادارے میں اپنی عمر کا سب سے زیادہ حصہ مولانا نے ہی وقف کیا۔ تقریباً بیس سال تک معارف کے مدیر رہے۔ یہ ادارت خود اپنے آپ میں ایک اہم خدمت

۱۔ معارف، مئی ۲۰۰۸ء، ص ۳۷۶

ہے۔اپنی ادارت میں مولانا نے اس کے معیار کو بلند کیا اور تحقیق وتدقیق کی ان عظمتوں کو جو انہیں شاہ معین الدین احمد ندوی اور سید صباح الدین عبدالرحمٰن سے ورثہ میں ملی تھی، ان میں اضافہ کیا اور نئے برگ و بار لائے۔اس کے لئے انھوں نے اپنی تمام صلاحیتوں کو اس طرح لگا دیا کہ دارالمصنفین کے دور اول کی یاد تازہ ہوگئی۔نظم وانتظام کو قائم رکھنے اور اس کے علمی وتحقیقی معیار کو بلند رکھنے کے لئے آپ نے بڑی محنت اور جگر کاری کا مظاہرہ کیا اور کہیں سے بھی یہ احساس نہ ہونے دیا کہ اس کے معیار ووقار میں کچھ فرق آ گیا ہے۔

حقیقت میں مولانا اصلاحی جامع کمالات، مقبول اور ہر دل عزیز شخصیت کے مالک تھے۔لامحدود کمالات اور اعزازات کے باوجود نہایت منکسر المزاج، سادہ لوح، خوش اخلاق اور ملنسار انسان تھے۔ فاخر جلال پوری نے آپ کی شخصیت کا ذکر اس طرح کیا ہے:

> ''مولانا حد درجہ منکسر المزاج، وضع دار، صوفی صفت، خلیق ونرم خو، ٹھہری ہوئی گفتگو میں لہجے کی حلاوت، غرض مولانا کی کن کن خوبیوں کو گنایا جائے۔علمی اعتبار سے وہ دین وادب کے علوم کے ایک مرقع تھے۔ان کے خاموش خاموش انداز واطوار میں علم کا ایک سمندر موج زن رہتا تھا۔مولانا کی واقعی یہ مومنانہ صفت تھی کہ وہ آفاق میں نہیں آفاق ان میں گم تھا۔ ان کے دم سے دارالمصنفین کے درودیوار اس کی فضاؤں میں توکلت علی اللہ کی جلوہ گری اور اصول وضوابط کی شیشہ گری جو کل تھی وہی آج بھی تھی۔مولانا کی ذات جگر لالہ میں جس سے ٹھنڈک پڑ جائے وہ شبنم تھی۔اور دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان تھی۔مراد یہ کہ حق گوئی وبے باکی ان کا نصب العین تھا۔جس کا اندازہ معارف کے شذرات سے ہوتا ہے۔''[۱]

مولانا نے تقریباً ڈیڑھ درجن کتابیں اور سیکڑوں مضامین لکھے۔مضامین کا آغاز قرآنیات اور فقہ

۱۔ معارف، اپریل ۲۰۰۸ء، ص ۲۹۸

کے موضوعات سے ہوا۔ قرآن، تفسیر، حدیث، تذکرہ اور ادب ان کی دلچسپی کے خاص موضوعات تھے جن پر ان کے قلم گہربار نے اپنی جولانی کا خوب خوب مظاہرہ کیا۔ مولانا کی تصانیف حسب ذیل ہیں۔

۱۔ **ہندوستان عربوں کی نظر میں** : یہ کتاب دو جلدوں پر مشتمل ہے جس میں مولانا نے عرب و ہند سے متعلق نہایت متنوع اور مفید معلومات یکجا کی ہیں۔ اس میں عرب سیاحوں، مورخوں اور جغرافیہ دانوں کی کتابوں کے اقتباسات اور ان کے ترجمے دیئے گئے ہیں۔ مورخین کے مختصر حالات بھی قلم بند کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی اور موضوع کی انفرادیت کی وجہ سے کافی مشہور ہوئی۔

۲۔ **تذکرۃ المحدثین** جلد اوّل تا سوم : جلد اول میں دوسری صدی ہجری کے آخر سے چوتھی صدی ہجری کے اوائل تک کے مشہور اور صاحب تصنیف محدثین کرام کے حالات وسوانح اور ان کی خدمات کی تفصیل ہے۔

جلد دوم میں چوتھی صدی ہجری کے نصف آخر سے آٹھویں صدی ہجری کے اکثر مشہور اور صاحب تصنیف محدثین کرام کے حالات وسوانح اور ان کی خدمات کی تفصیل ہے۔

جلد سوم میں چھٹی صدی ہجری سے خانوادۂ شیخ عبدالحق دہلوی تک کے ممتاز اور صاحب تصنیف ہندوستانی محدثین کرام کے حالات وسوانح اور ان کی علمی و دینی خدمات کی تفصیل ہے۔

۳۔ **مولانا ابوالکلام آزاد۔ مذہبی افکار، صحافت، قومی جدوجہد** : اس کتاب کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ مذہبی افکار، صفات الٰہی کے عنوان سے ماخوذ ہے۔ جس کے عناوین میں ربوبیت، رحمت، عدالت، صفات الٰہی کا قرآنی تصور پر مولانا آزاد کے خیالات کو جمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ربوبیت کے عنوان کے تحت پہلے سورہ فاتحہ کی اہمیت و جامعیت، حمد کا مفہوم اور لفظ اللہ کی حقیقت اور اس کا مفہوم بیان کیا گیا ہے۔ پھر سورہ فاتحہ میں بیان کردہ صفات الٰہی، ربوبیت، رحمت اور عدالت کے متعلق مولانا آزاد کے افکار و خیالات اور تصورات پر مفصل اور دل آویز بحث کی گئی ہے۔ صفت ربوبیت کی توضیح میں ربوبیت الٰہی کے مظاہر، رب و ربوبیت کی حقیقت، نظام ربوبیت، عناصر حیات، نظام پرورش، نظام

ربوبیت کی وحدت کی کارفرمائیوں وغیرہ کے متعلق مولانا کے خیالات کی ترجمانی کی گئی ہے۔

ربوبیت کے بعد رحمت کا تذکرہ ہوا ہے۔اس کے بعد خدا کی صفت عدالت کا ذکر ہے جس کے ذیل میں دین کے معنی، مالک یوم الدین کی حقیقت اور عدالت الٰہی کا اعلان، وضع و میزان وغیرہ کی وضاحت وترجمانی کی گئی ہے۔

دوسرے حصے میں مولانا آزاد کی ادارت میں نکلنے والے رسائل وجرائد کا ذکر ہے۔ان ادبی وعلمی رسالوں میں نیرنگ عالم، المصباح، لسان الصدق، الندوہ، وکیل، دارالسلطنت، الہلال، البلاغ، اقدام، پیغام، الجامعہ، پیام، الہلال ثانی، ثقافت الہند، ریویو، البصائر، مرقع عالم، مخزن الپنچ، عصر جدید، علی گڑھ ماہ نامہ، معارف کا ذکر ہے۔

تیسرے حصے میں مولانا کی قومی وسیاسی خدمات، ملک کی آزادی، ہندوستانی قومیت کے استحکام اور فرقہ وارانہ اتحاد وہم آہنگی کے لئے ان کی کوششوں کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے۔

۴۔ **چند ارباب کمال** : اس کتاب میں مولانا ضیاء الدین اصلاحی کے اردو کے علاوہ عربی کے بھی ناموران علم وفن کے حالات اور علمی وادبی خدمات کی داستان بیان کی گئی ہے۔حرف آغاز میں ان مضامین سے متعلق چار صفحات پر مشتمل ان کی ایک تحریر بھی ہے۔ پہلے باب میں عرب کے تین ادیب شاعر حافظ اور اس کی انشاپردازی، ابوالعلامعری اور اس کی فلسفیانہ شاعری، امراءالقیس کی عاشقانہ شاعری پر مشتمل ہے۔

دوسرے باب میں علامہ شبلی اور ان کے تلامذہ ومنتسبین ہیں جن میں علامہ شبلی اور اعظم گڑھ، مولانا عبدالماجد دریابادی کی عقیدت ونفرت کے اصول، اقبال سہیل کی غزل گوئی، مرزا احسان احمد کی نثر نگاری اور غزل گوئی پر ایک نظر، مولانا مسعود علی ندوی شامل ہیں۔

تیسرا باب چند قومی وسیاسی رہنماؤں اور ماہرین تعلیم پر مشتمل ہے جس میں ڈاکٹر ذاکر حسین، مولانا محمد شفیع وقاضی عدیل عباسی کا ذکر ہے۔ چوتھا باب اردو کے دو ہندو محسنین نیز ایک محقق اور ایک نقاد پر مشتمل ہے۔اس میں منشی دیا نرائن نگم اور ان کے رسالہ ''زمانہ'' کی سرگزشت، منشی نول کشور اور ان کا

پریس، مولانا امتیاز علی خان عرشی، ڈاکٹر خلیل الرحمٰن اعظمی پر مشتمل ہے۔

۵۔انتخاب کلام سہیل : یہ کتاب اتر پردیش اردو اکاڈمی نے ۱۹۸۹ء میں شائع کی جو کہ ۱۰۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب میں محمود الٰہی چیئر مین، اردو اکاڈمی کا ابتدائیہ اور مولانا ضیاء الدین اصلاحی کا مقدمہ ہے اور مولانا سہیل کی ۵۵ غزلوں اور نظموں کا انتخاب ہے۔ مقدمہ سیر حاصل ہے جس میں مولانا ضیاء الدین صاحب مرحوم نے مولانا سہیل کی حب الوطنی و کردار شاعری، من جملہ غزلیں اور نظمیں اور وفات کا اجمالاً بحث کی ہے۔

۶۔ایضاح القرآن : یہ قرآنی مضامین کا مجموعہ ہے جس میں قرآن کے اسلوب، طریقہ خطاب، سورۃ فاتحہ کے مباحث، اصحاب الاعراف وغیرہ پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور بعض آیات کی دلنشیں تاویل وتشریح کی گئی ہے۔ اور آخر میں امام رازی کی تفسیر کبیر اور ابن کثیر کی تفسیر پر اظہار خیال کیا گیا ہے۔ بالکل آخر میں مولانا حمید الدین فراہی کی تصنیف التکمیل فی الاصول التاویل کی روشنی میں قرآن کے اصول تاویل پر بحث کی گئی ہے۔

باب۔ سوم

ادبی تصانیف تعارف، تنقید، تجزیہ

باب۔ سوم

ادبی تصانیف تعارف، تنقید، تجزیہ

موازنہ انیسؔ و دبیرؔ (مولانا شبلی نعمانی)

موازنہ انیس و دبیر نہ صرف شبلی کی بلکہ اردو کی پہلی مقبول ترین کتاب ہے۔ اس کتاب میں ایک خاص صنف سخن اور اس کے ماہر ایک خاص شاعر پر تفصیلی تبصرہ کیا گیا ہے۔ اس میں انھوں نے اردو کے دو مشہور مرثیہ گو شاعر میر انیسؔ اور مرزا دبیرؔ کے کلام کا آپس میں مقابلہ کیا ہے۔ اس سلسلہ میں انھوں نے اپنے بتائے ہوئے اصولوں سے کام لیا ہے اور انہیں کی روشنی میں دونوں کی شاعری پر بحث کی ہے۔ فصاحت و بلاغت اور معانی و بیان کے دوسری اصطلاحات سے متعلق موازنہ انیس و دبیر میں بحث ملتی ہے۔ اس موازنہ میں مرثیہ کے بارے میں بہت سی اہم باتیں ملتی ہیں جو تاریخی اور تنقیدی دونوں اعتبار سے کافی حد تک بصیرت افزا ہیں۔ یہ کتاب شروع سے لے کر آج تک اہل علم اور ارباب نظر کی توجہ کا مرکز بنی ہوئی ہے۔ اس کی اہمیت و عظمت کا اعتراف بہت سے نقادوں نے کیا ہے۔ یہ کتاب ہماری ادبی تاریخ میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

علی گڑھ سے قطع تعلق کرنے کے بعد جب مولانا شبلی حیدر آباد کے سررشتہ علوم وفنون سے وابستہ ہوئے تو یہاں کے دوران قیام وہ ادبی محفلوں میں شرکت کرتے تھے۔ اس وقت وہاں کے ارباب ذوق کا بڑا اچھا مجمع ہوتا تھا۔ ان ادبی محفلوں میں میر انیس اور مرزا دبیر کے آپسی تقابل اور موازنے کی باتیں زیر بحث ہوتی تھیں۔ مولانا میر انیس کے مداح اور ان سے بے پناہ عقیدت رکھتے تھے۔ چنانچہ یہاں کے ادبی ماحول میں انھیں خیال آیا کہ کسی ایسے شاعر کے کلام پر تقریظ و تنقید لکھی جائے جس سے اردو شعر و ادب کی کم

مائیگی کا احساس ختم ہو۔ چنانچہ انھوں نے میر و غالب کے مقابلے میں میر انیس اور مرزا دبیر کا انتخاب کیا اور موازنہ انیس و دبیر کے نام سے ایک پوری کتاب لکھ ڈالی۔

مولانا شبلی نے موازنہ کے مقدمہ میں اس تصنیف کی وجہ بھی بیان کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''مدت سے میرا ارادہ تھا کہ کسی ممتاز شاعر کے کلام پر تقریظ و تنقید لکھی جائے جس سے اندازہ ہو سکے کہ اردو شاعری باوجود کم مائیگی زبان کیا پایہ رکھتی ہے۔ اس غرض کے لئے میر انیس سے زیادہ کوئی شخص انتخاب کے لئے موزوں نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ ان کے کلام میں شاعری کی جس قدر اصناف پائی جاتی ہیں اور کسی کے کلام میں نہیں پائی جاتی۔ شکر ہے کہ آج اس ارادے کے پورے ہونے کی نوبت آئی اور یہ کتاب ناظرین کی خدمت میں پیش ہے۔ اس کتاب میں میر انیس کا موازنہ مرزا دبیر سے کیا گیا ہے۔ اور اسی مناسبت سے اس کا نام موازنہ ہے۔''[۱]

مولانا کے میر انیس کی طرف متوجہ ہونے کی دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ وہ اپنے زمانے کی زوال پذیر شاعری کی اصلاح چاہتے تھے۔ اس دور کے تمام مفکروں، ادیبوں، شاعروں اور حالات کا اندازہ لگانے والے کارکنوں کی ساری توانائی اس بات پر صرف ہو رہی تھی کہ ہر ممکن طریقے سے ملک اور قوم کو اس زوال سے باہر نکالیں۔ چنانچہ شبلی بھی موازنہ کی تمہید میں اسی خیال کا اظہار کرتے ہیں:

''فلسفہ اور شاعری برابر درجہ کی چیزیں ہیں۔ لیکن قوم کی بدمذاقی سے جس قسم کی شاعری نے ملک میں قبول عام حاصل کر لیا ہے اس نے لوگوں کو یقین دلا دیا ہے کہ اردو شاعری میں زلف و خال و خط یا جھوٹی خوشامد اور مداحی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔ میر تقی میر کی غزلیت، درد کا تصوف، غالب کا فلسفہ شاعری کی

۱۔ موازنہ انیس و دبیر، شبلی نعمانی، تمہید، ص ا

جان ہیں۔ لیکن ان بیش بہا خزانوں میں سے بھی عام لوگوں کی نگاہ صرف خزف ریزوں پر پڑتی ہے۔ میر انیس کا کلام شاعری کے تمام اوصاف کا بہتر سے بہتر نمونہ ہے لیکن ان کی قدر دانی کا طغرائے امتیاز صرف اس قدر ہے کہ کلام فصیح ہوتا ہے اور بین اچھا لکھتے ہیں۔ بدمذاقی کی نوبت یہاں تک پہنچی کہ وہ اور مرزا دبیر حریف و مقابل قرار دیئے گئے اور مدت ہائے دراز کی غور وفکر کدوکاوش بحث وتکرار کے بعد بھی فیصلہ نہ ہوسکا کہ ترجیح کا مسند نشیں کس کو کہا جائے۔''[۱]

شبلی سے پہلے آزاد اور حالی نے میر انیس کی ادبی اہمیت کا ذکر کیا ہے۔ لیکن شبلی اپنے اصول و معیار شاعری کے آئینے میں انیس کو ایک منفرد اور مکمل شاعر کی حیثیت سے پیش کرنا چاہتے تھے۔ دوسری وجہ یہ بھی ہوسکتی ہے کہ شبلی جن شاعرانہ خصوصیات کو اہمیت دیتے تھے ان کے مناسب ترین نمونے انھیں انیس کے کلام میں نظر آتے تھے۔

بہر حال مختلف وجوہات کے بنا پر شبلی نے میر انیس کا انتخاب کیا۔ ان کے تاریخی نقطۂ نظر میں ہیرو کا جو تصور تھا۔ یہاں اس کی بھی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ مولانا نے میر انیس کو اپنا ہیرو تسلیم کر کے یہ ثابت کیا کہ ان کے کلام میں شاعری کے جس قدر اوصاف پائے جاتے ہیں اور کسی کے کلام میں نہیں پائے جاتے۔ یہ ان کی پہلی ادبی تصنیف ہے اس لئے ان کی بعض ادبی خوبیاں جو ان کی پچھلی تصنیف میں نہیں ابھر سکی تھیں وہ اس کتاب میں نکھرتی نظر آتی ہیں۔ مگر اس کتاب کے شائع ہونے کے بعد شبلی کو بہت سی تنقیدوں کا سامنا کرنا پڑا۔ انھوں نے میر انیس کے سارے کمالات ومحاسن کو قلم بند کرنے پر اکتفا کرنے کے بجائے ان کا موازنہ مرزا دبیر سے کر کے ان کو میر انیس سے کم درجے کا مرثیہ نگار اور شاعر قرار دیا۔ نتیجتاً مرزا دبیر کے حامی شبلی کے خلاف اٹھ کھڑے ہوئے اور ان کی کتاب کے رد میں (ردالموازنہ میر افضل علی) تردید

۱۔ موازنہ انیس ودبیر، شبلی نعمانی، تمہید، ص ۲

الموازنہ حسن رضا محمد جان عروج) المیزان۔نظیر الحسن فوق) نے لکھی۔ اور ان پر مختلف طرح کے اعتراضات ہوئے۔مثلاً مولانا شبلی نے جانب داری سے کام لے کر مرزا دبیر کے کلام کا صحیح انتخاب نہیں کیا اور انیس کے کمالات دکھانے میں مبالغہ سے کام لیا ہے اور دبیر کے محاسن کو بیان کرنے میں بخل سے کام لیا ہے۔ وہ انیس کی محبت میں غیر جانب دار ناقد نہیں بن سکے۔ وہ اردو مرثیہ نگاری کی تاریخ کی ناقص معلومات رکھتے تھے۔ان کے یہاں رائے زنی کا معیار اپنا ہے۔وغیرہ وغیرہ۔موازنہ سے متعلق پروفیسر سید احتشام حسین نے اپنے خیال کا اظہار اس طرح کیا ہے:

''مرزا دبیر کا ذکر درحقیقت موازنہ کے طور پر نہیں بلکہ انیس کی خصوصیات کو کسی قدر زیادہ نمایاں کرنے کے لئے کیا گیا ہے۔اور سچ یہ ہے کہ انھوں نے دبیر کا مطالعہ اس طرح نہیں کیا تھا جس طرح انیس کا،اس بات کا اعتراف مولانا شبلی نے مصنف ''المیزان'' کے نام ایک خط میں بھی کیا تھا۔'' [۱]

وہیں دوسری طرف مرزا محمد زماں آزردہ نے مرزا سلامت علی دبیر کو اپنی تحقیق کا موضوع بنایا اور خاص طور پر شبلی پر اس طرح تنقید کی ہے کہ انھوں نے دبیر کی بے جا مخالفت اور انیس کی بے جا حمایت کی ہے:

''اس حقیقت سے چشم پوشی نہیں کی جاسکتی کہ مولانا شبلی نے مرزا دبیر کا مطالعہ ہمدردی اور شغف سے نہیں کیا۔متحد المضامین کلام کی مثالیں پیش کرنے میں موصوف نے جانب داری کا رویہ اختیار کیا۔میر انیس سے اپنی ذاتی دلچسپی کے بنا پر وسیع النظر ناقد و محقق کے بجائے میر انیس کا وکیل بن کر جائز و ناجائز ہر طرح کے حربے استعمال کر کے اپنے مؤکل کی کامیابی کے لئے جدوجہد کی۔ یہاں تک کہ اکثر و بیشتر ایسا کلام مرزا دبیر کی طرف منسوب کر دیا جو الحاقی ہے۔'' [۲]

۱۔ ادیب،شبلی نمبر،ستمبر ۱۹۶۰ء،سید احتشام حسین،ص ۱۰۴

۲۔ اردو سوانح نگاری آزادی کے بعد،حسن وقار گل،ص ۱۴۷

موازنہ میں مرثیہ سے متعلق بہت سی اہم باتیں ملتی ہیں جو تاریخی اعتبار سے بہت زیادہ بصیرت افروز ہیں۔ موازنہ کی پہلی سرخی مرثیہ کی اجمالی تاریخ ہے جس میں عرب کی مرثیہ نگاری کا تاریخی منظر پیش کیا گیا ہے۔ اور ان شاعروں کا ذکر کیا گیا ہے جنھوں نے اپنے ذاتی جذبات کا اظہار مرثیوں میں کیا ہے۔ واقعات کربلا کا قیامت انگیز ذکر ہے۔ بنوامیہ اور بنوعباسیہ کے دور میں اس واقعہ سے متعلق کچھ بھی تحریر نہیں کیا گیا ہے۔ اس کے بعد فارسی شاعری کا ذکر ہے جس میں فردوسی نے سہراب کا مرثیہ اس کی ماں کی زبان میں لکھا ہے۔ سلطان محمود کی وفات پر فرخی کا مرثیہ اور محتشم کاشی نے شاہ طہماسپ کی فرمائش پر اہل بیت کی شان میں بین کہے ہیں۔ محتشم کے بعد مقبل نے مرثیہ گوئی کی طرف توجہ کی اور اس کو شاعری کا موضوع بنایا۔ اس کے بعد ہندوستان میں مرثیہ گوئی کی ابتدا کا ذکر کیا ہے۔ اور اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ اردو مرثیے کی ابتدا کس نے کی اور ساتھ ہی یہ بھی قیاس کرتے ہیں کہ سودا اور میر سے پہلے اردو مرثیہ نگاری کا آغاز ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر فضل امام ان کے اس قیاس پر اس طرح اپنے خیال پیش کرتے ہیں:

> ''شبلی کو اردو مرثیہ نگاری کی تاریخ اور دکن میں اردو مرثیہ نگاری کے آغاز و ارتقاء کی تاریخ کا بھی قطعی علم نہیں تھا۔ ورنہ وہ نہ عاجز نظر آتے اور بساط قیاس وظن پر خامہ فرسائی بھی نہ کرتے۔'' [۱]

شبلی نے مرثیہ کے ارتقاء سے متعلق بہت سی مفید باتوں کا ذکر کیا ہے جو انیس و دبیر کے ہاتھوں عروج پر پہنچا۔ میر تقی میر اور مرزا سودا کے کلام کی مثالیں دے کر یہ بتایا ہے کہ ان جیسے قادرالکلام شاعر نے بھی مرثیہ کو ترقی نہیں دی۔ جب تک یہ فن اپنی ابتدائی حالت میں رہا میر ضمیر نے اس فن کو ترقی دی۔ میر انیس اور مرزا دبیر کے کلام میں جو محاسن ہیں وہ میر ضمیر کے یہاں بھی پائے جاتے ہیں۔ اگر چہ میر ضمیر کے یہاں ان کا رنگ ہلکا تھا، ان دونوں صاحبوں نے اسے شوخ کر دیا۔ ساتھ ہی اس بات کا ذکر ہے کہ میر خلیق نے اس فن کو کافی ترقی دی لیکن ان کا کلام دستیاب نہ ہونے پر تاسف کا اظہار کیا ہے۔ پس منظر کے

۱۔ مقدمہ وتعارف، موازنہ انیس و دبیر، شبلی نعمانی، مرتبہ ڈاکٹر افضل امام، ص ۱۶

بعد میر انیس کے مختصر حالات زندگی اور خاندانی احوال کا ذکر ہے۔ سید احتشام حسین کا خیال ہے کہ شبلی نے میر انیس کے احوال بھی سرسری لکھے۔ جب کہ موازنہ انیس کے انتقال کے تیس سال بعد لکھا گیا۔ پھر مولانا کے مراسم لکھنؤ سے گہرے تھے۔ اس لئے انیس کے حالات دریافت کرنا کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ اس موازنہ سے انیس کی شخصیت، سیرت اور شاعرانہ زندگی کی کوئی تصویر نہیں بنتی، سوانحی مواد کی کمی موازنہ کی اہمیت کو کم کر دیتی ہے۔ محمد الیاس الاعظمی ان کے خیالات کی تردید اس طرح کرتے ہیں:

> ''یہ اعتراض اپنی نوعیت کے لحاظ سے درست معلوم ہوتا ہے لیکن سوال یہ ہوتا ہے کہ کیا شبلی انیس کے حالات لکھنا چاہتے تھے اور انھوں نے حق ادا نہیں کیا؟ حقیقت یہ ہے کہ انیس کے حالات اور سوانح لکھنا مصنف کے پیش نظر تھا ہی نہیں، بلکہ انیس کے شاعرانہ کمالات کا ذکر مقصود تھا۔ اس لئے انھوں نے کتاب کے ضمنی مباحث پر زور صرف نہیں کیا، ورنہ الفاروق کے مصنف کو جس نے الفاروق کے لئے روم و مصر کا سفر کر ڈالا ہو اس کے لئے انیس کے حالات دریافت کرنا کیا مشکل تھا؟''[۱]

اس کتاب کا سب سے اہم حصہ میر انیس کی شاعری کی خصوصیات ہے۔ یہ حصہ کافی تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے اور اپنی پوری کتاب کا اصل جز معلوم ہوتا ہے۔ اس کی ابتدا فصاحت کی تعریف اور اس کی وضاحت سے کی گئی ہے۔ جس میں الفاظ کے انتخاب اور اس کے اصول کا ذکر کیا ہے کہ الفاظ قواعد اور صورت دونوں حیثیت سے صحیح اور دلکش ہوں۔ میر انیس کے کلام میں اس صفت کا ذکر اس طرح ہے:

> ''میر انیس کے کمال شاعری کا بڑا جوہر یہ ہے کہ باوجود اس کے انھوں نے اردو میں سب سے زیادہ الفاظ استعمال کئے اور سیکڑوں مختلف واقعات بیان کرنے کی وجہ سے ہر قسم اور ہر درجے کے الفاظ ان کو استعمال کرنے پڑے۔

۱۔ معارف، نومبر ۲۰۱۰ء، مضمون موازنہ انیس و دبیر ایک مطالعہ، محمد الیاس الاعظمی

تاہم ان کے تمام کلام میں غیر فصیح الفاظ نہایت کم پائے جاتے ہیں۔'' [۱]

فصاحت کے مدارج میں اختلاف ہے۔ بعض الفاظ فصیح اور بعض فصیح تر اور بعض اس سے بھی فصیح تر۔ علامہ شبلی میر انیس کی عظمت بیان کرتے ہوئے اس کی فصاحت کا ذکر یوں کرتے ہیں:

''میر انیس کے کلام کا بڑا خاصہ یہ ہے کہ وہ ہر موقع پر فصیح سے فصیح الفاظ ڈھونڈ کر لاتے ہیں۔ مرزا دبیر اور میر انیس کے ہم مضمون اشعار لو۔ اگر مرزا صاحب کے یہاں غریب اور ثقیل الفاظ ہوں گے تو ان کے مقابلے میں میر صاحب کے یہاں فصیح الفاظ ہوں گے۔ اگر مرزا صاحب کے یہاں فصیح الفاظ ہوں گے تو میر صاحب کے یہاں فصیح تر ہوں گے۔ مرزا دبیر کی تخصیص نہیں تمام مرثیہ گویوں کے مقابلے میں میر انیس کے کلام کا یہی حال ہے۔'' [۲]

فصاحت کے بعد ابتذال کے فرق کو سمجھا کر لکھتے ہیں:

''میر صاحب کو اگرچہ واقعہ نگاری کی وجہ سے نہایت چھوٹی چھوٹی چیزوں اور ہر قسم کے جزئی واقعات وحالات کو بیان کرنا پڑتا ہے لیکن یہ ان کی انتہا درجے کی قادر الکلامی ہے کہ پھر بھی ان کی شاعری کے دامن پر ابتذال کا دھبہ نہیں آنے پاتا۔'' [۳]

اس کے بعد کلام کی فصاحت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کلام کی فصاحت میں صرف لفظ کا فصیح ہونا ہی کافی نہیں بلکہ ان میں ایک خاص تناسب اور توازن ہو ورنہ فصاحت باقی نہیں رہے گی۔ میر انیس کا سارا کلام اسی خوبی سے معمور ہے۔

۱۔ موازنہ انیس و دبیر، شبلی نعمانی، مرتبہ ڈاکٹر فضل امام، ص ۴۳

۲۔ ایضاً، ص ۴۳۔۴۴

۳۔ ایضاً، ص ۴۵

کلام کی اصلی ترتیب سے متعلق لکھتے ہیں کہ نظم کا سب سے بڑا کمال شعر میں الفاظ کی اسی ترتیب کو باقی رکھنا ہے جو نثر میں معمولاً ہوا کرتی ہیں اور یہ خوبی میر انیس کے کلام میں سب سے زیادہ ہے۔ روزمرہ اور محاورہ کے استعمال میں صاف، سادہ اور سہل الفاظ ہوں۔ ساتھ ہی یہ لازم ہے کہ الفاظ فصیح ہو۔ میر انیس کے کلام میں اس کا استعمال کثرت سے ہے۔

مضامین کی نوعیت کے لحاظ سے الفاظ کے استعمال کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ کلام کے حسن کا ایک بڑا نکتہ یہ ہے کہ مضامین کی نوعیت کے لحاظ سے الفاظ استعمال کئے جائیں۔ اس سلسلہ میں میر انیس کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے رزم و بزم، فخر و ہجو، نوحہ سب پر طبع آزمائی کی، لیکن موقع و محل کے لحاظ سے الفاظ ان کی نوک قلم سے نکلتے۔ آخر میں بحروں کا انتخاب حسن قافیہ و ردیف، تنسیق الصفات وغیرہ کی میر انیس کے کلام میں کثرت سے مثالیں پائی جاتی ہیں۔ اسی پر فصاحت کی تفصیل کا خاتمہ اور بلاغت کا تذکرہ ہے اور بلاغت کے بہت سے باریک نکات جن میں واقعیت، جذبات نگاری، مناظر قدرت کی مرقع کشی، واقعہ نگاری اور رزمیہ سبھی شامل ہیں۔ اس کو بہت واضح مثالوں سے نمایاں کیا ہے۔ بلاغت کی پہلی شرط یہ ہے کہ کلام فصیح ہو۔

> ''بلاغت کی تعریف علمائے معانی نے یہ کی ہے کہ کلام اقتضائے حال کے موافق ہو اور فصیح ہو اعلیٰ درجے کی بلاغت معانی کی بلاغت ہے۔'' [۱]

مولانا شبلی میر انیس کے کلام کی مدح سرائی کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''میر انیس صاحب کے کلام میں بلاغت الفاظ بھی اگرچہ انتہا درجے کی ہے لیکن یہ ان کے کمال کا اصلی معیار نہیں۔ ان کے کمال کا اصلی جوہر معانی کی بلاغت میں کھلتا ہے۔'' [۲]

۱۔ موازنہ انیس و دبیر، شبلی نعمانی، مرتبہ ڈاکٹر فضل امام، ص ۵۹

۲۔ ایضاً، ص ۴۶

علامہ شبلی فصاحت و بلاغت کے سلسلہ میں میر انیس اور دبیر کے موازنہ سے متعلق لکھتے ہیں:

''انیس و دبیر کے موازنہ میں یہ فقرہ ضرب المثل ہو گیا ہے کہ میر صاحب کے کلام میں فصاحت زیادہ ہے اور مرزا صاحب میں بلاغت لیکن یہ فقرہ جس قدر زیادہ مشہور ہے اسی قدر بلکہ اس سے زیادہ غلط اور بے معنی ہے۔ بلاغت کی جو تعریف کتابوں میں مذکور ہے اور جس سے کسی کو کسی قسم کا اختلاف نہیں۔ اس کی رو سے بلاغت کی پہلی شرط یہ ہے کہ کلام فصیح ہو اس لئے فصاحت و بلاغت کو باہم حریف قرار دینا اجتماع النقیضین ہے۔ اگر مرزا صاحب میں بلاغت زیادہ ہے تو اس کے یہ معنیٰ ہیں کہ فصاحت بھی زیادہ ہے۔ کیونکہ کلام اس وقت تک بلیغ نہیں ہو سکتا ہے جب تک اس کے تمام الفاظ مفردات مرکبات، فصیح نہ ہوں۔ اگر فصاحت میں کسی قسم کی کمی ہوگی تو بلاغت میں بھی کمی ہوگی اس لئے کسی کلام کی نسبت یہ کہنا کہ اس میں بلاغت زیادہ ہے اور فصاحت کم۔ گویا یہ کہنا ہے کہ فصاحت زیادہ بھی ہے اور کم بھی ہے۔''[۱]

اس کے بعد مولانا نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ نسبتاً دونوں میں سے کس کا کلام شاعری کے معیار پر پورا اترتا ہے۔ انھوں نے پہلے یہ موازنہ فصاحت، بندش کی مستی اور ناہمواری، تعقید، مضمون بندی، خیال آفرینی کے نکات کو سامنے رکھ کر ان دونوں کے اشعار میں کیا ہے۔ اور دوسرے میں میر انیس اور مرزا دبیر کے متحد المضمون مرثیوں مثلاً پردہ کا اہتمام، صغریٰ کی آزردگی، اصغر سے خطاب، اعلیٰ و ادنیٰ کا مقابلہ، حر کا مقابلہ، حر کا واقعہ، قید خانے کے واقعات، علی اصغر کے لئے پانی مانگنا وغیرہ کو سامنے رکھ کر کیا ہے۔ اور یہ ثابت کیا ہے کہ میر انیس کا پلڑا مرزا دبیر سے بھاری ہے۔

واقعات کے بیان میں ایک بڑا ضروری اصول یہ ہے کہ کہیں سے سلسلہ بیان ٹوٹنے نہ پائے۔

۱۔ موازنہ انیس و دبیر، شبلی نعمانی، مرتبہ ڈاکٹر فضل امام، ص ۵۸

جب کوئی واقعہ مختلف اور متعدد واقعات پر مشتمل ہوتا ہے تو ایک واقعے سے دوسرے واقعے کی طرف منتقل ہوتے ہوئے اکثر وہاں بیان کا سلسلہ ٹوٹ جاتا ہے۔ مرزا دبیر کے کلام میں اس کی مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔ انیس کے اکثر مرثیے بہت سے متعدد واقعات پر مشتمل ہوتے ہیں اور ہر واقعہ ایک جداگانہ مرثیے کا موضوع معلوم ہوتا ہے۔ لیکن تسلسل بیان کا یہ اثر ہے کہ تمام مختلف واقعات ایک مسلسل زنجیر بن جاتے ہیں جس کی تمام کڑیاں آپس میں ملی ہوئی نظر آتی ہیں۔

اس کے علاوہ بلاغت کے بیان میں شبلی نے میر انیس کے یہاں مختلف قسم کی صنائع مثلاً استعارات وتشبیہات صنائع و بدائع، مبالغہ حسن التعلیل، صنعت طباق، مراعات النظیر، لف ونشر، تلمیح جیسے صنائع کو مثالوں کے ساتھ نہایت خوش اسلوبی سے استعمال کیا ہے۔

میر انیس اور مرزا دبیر کے موازنہ کے لئے یہ دو مصرعے ہی کافی ہیں۔

میر انیس۔ مولا نے سر جھکا کے کہا میں حسینؑ ہوں

مرزا دبیر۔ فرمایا میں حسین علیہ السلام ہوں

اس کے بعد مولانا شاعری کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور انسانی جذبات واحساسات سے شاعری کی بحث شروع کرتے ہیں اور اس کو شاعری کی اصل روح تسلیم کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''اگر مل صاحب کی رائے تسلیم کی جائے تو صرف اسی چیز کا نام شاعری ہے۔ شاعری درحقیقت مصوری ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ مادیات اور محسوسات کی تصویر کھینچنا اس قدر دشوار نہیں جس قدر غیر محسوسات اور غیر مادی اشیاء کا نقشہ اتارنا مشکل ہے۔ ایک درخت کی تصویر کھینچنی ہو تو کسی قسم کے تخیل اور دیدہ ریزی کی ضرورت نہیں۔ ٹہنیاں، پھل، پھول، پتے سب سامنے ہیں اور ہر شخص ان کو محسوس کر سکتا ہے۔ مصور کا صرف یہ کمال ہے کہ ہر چیز کا پورا نقشہ کھینچ دے لیکن رنج وغم، جوش، محبت، غیظ، بے قراری، بے تابی، مسرت، خوشی،

محسوس اور مادی چیزیں نہیں ہیں۔ آنکھ ان کو محسوس کر سکتی ہے البتہ دل پر ان کا اثر ہوتا ہے۔ لیکن یہ اثر سب پر یکساں نہیں ہوتا۔ اس لئے ان کی ہو بہو اور اصلی تصویر اتارنا مشکل ہے۔ میر انیس کا اصلی جوہر یہیں آ کر کھلتا ہے۔ اور یہیں ان کی شاعری کی حد ان کے ہم عصروں سے بالکل الگ ہو جاتی ہے۔ انسانی جذبات کی سیکڑوں قسمیں ہیں اور پھر ہر ایک کے مختلف مراتب اور مدارج ہیں۔ باپ بیٹے کی محبت، بھائی بھائی کی محبت، یار آشنا کی محبت، آقا اور غلام کی محبت وغیرہ وغیرہ۔ میر انیس کے مرثیوں میں نہایت کثرت سے ان جذبات اور ان کے مختلف مدارج کا ذکر ہے لیکن جس جگہ جس چیز کو لیا جائے اس کمال کے ساتھ اس کی تصویر کھینچی ہے کہ اس کا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے پھر جاتا ہے۔'' [۱]

مولانا شبلی کے اس خیالات پر عبدالمغنی نے اس طرح روشنی ڈالی ہے:

''اس بیان سے مرثیے میں تمثیلی شاعری کے عناصر پر روشنی پڑتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اردو مرثیہ منظوم تمثیل رسمی طور پر نہ ہونے کے باوجود فی الواقع ایک تمثیلی نظم ہے اور اس میں نظم و تمثیل دونوں کے وہ فنی اجزاء پائے جاتے ہیں جو اسے بیک وقت ٹریجڈی اور ایپک دونوں کے معیار پر لے آتے ہیں۔ اس انداز سے اردو میں مرثیہ نگاری کا مطالعہ شبلی کی تنقید نگاری کا ایک کمال اور کارنامہ ہے۔'' [۲]

مناظر قدرت سے متعلق علامہ شبلی نے مختصراً ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ میر انیس نے اس صنف میں اگرچہ دو تین مرثیے لکھے ہیں لیکن جو کچھ لکھا ہے کمال کے درجے پر پہنچا دیا ہے۔

۱۔ موازنہ انیس و دبیر، شبلی نعمانی، مرتبہ ڈاکٹر فضل امام، ص ۱۰۹۔۱۱۰

۲۔ اسلوب تنقید، عبدالمغنی، ص ۱۰۵

منظر نگاری کے بارے میں تحریر کرتے ہیں کسی خاص واقعے یا حالت کی تصویر کھینچنا جس کو انگریزی میں سین کہتے ہیں واقعہ نگاری کی ایک قسم ہے۔ میر انیس نے شاعری کی اس صنف کو جس کمال تک پہنچایا اردو کیا فارسی میں بھی اس کی بہت کم مثالیں ملتی ہیں۔

اردو شاعری میں واقعہ نگاری کی کمی اور اس کی قسموں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ واقعہ نگاری جب کمال درجے تک پہنچ جاتی ہے تو اس کو مرقع نگاری کہتے ہیں جس کو آج کل کی زبان میں کسی چیز کا سماں دکھانا یا سین دکھانا کہتے ہیں۔ میر انیس کی واقعہ نگاری پر آکر وہ کہتے ہیں:

''میر انیس نے واقعہ نگاری کو جس کمال کے درجہ تک پہنچایا ہے اردو کیا فارسی میں بھی اس کی نظیر مشکل سے مل سکتی ہے۔ ان کے کمال کی خصوصیات حسب ذیل ہیں۔

> ہر قسم کے واقعات و معاملات و حالات اس کثرت سے نظم کئے ہیں کہ واقعہ نگاری کی کوئی صنف باقی نہیں رہی جو ان کے کلام میں پائی جاتی ہو۔ کوئی واقعہ جب سامنے آتا ہے تو عام نگاہیں صرف نمایاں باتوں پر پڑتی ہیں اور اس لئے جب لوگ ان کو بیان کرنا چاہتے ہیں تو انھیں نمایاں باتوں کو بیان کرتے ہیں۔ لیکن ایک دقیق النظر ان تمام جزئیات پر بھی نظر ڈالتا ہے اور ان کو ظاہر کرتا ہے۔ میر انیس چونکہ فطرت اور معاشرت انسانی کے بہت بڑے رازداں ہیں اس لئے دقیق سے دقیق اور چھوٹے سے چھوٹا نکتہ بھی ان کی نظر سے نہیں بچ سکتا۔ اس کے ساتھ زبان پر یہ قدرت ہے کہ کہیں ان کو دقت پیش نہیں آتی۔'' [۱]

مولانا شبلی رزمیہ کو واقعہ نگاری کی ایک قسم مانتے ہیں۔ لیکن وسعت و اہمیت کی وجہ سے جداگانہ عنوان تجویز کرتے ہیں۔ مولانا شبلی کا ماننا ہے کہ اردو کے علاوہ عربی میں بھی رزمیہ شاعری کو کچھ ترقی نہیں ہوئی۔ میر ضمیر نے مرثیے میں رزمیے کی ابتدا کی لیکن وہ بالکل نقش اولین تھا۔ میر انیس نے اس صنف کو

۱۔ موازنہ انیس و دبیر، شبلی نعمانی، ص ۱۷۴

کمال کے درجے تک پہنچایا۔ اس کے لحاظ سے اردو شاعری فارسی کی برابری کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ لیکن عربی سے کسی طرح نیچے نہیں۔ اس میں مولانا نے رزمیہ کے کمال کے امور کی ایک فہرست دے کر ہر امر کی ایک مثال پیش کی ہے۔ لیکن مداحی مثال سے ہٹ کر مولانا لکھتے ہیں:

''اس موقع پر شاید تمہارے ذہن میں یہ خیال آئے کہ میر انیس کی رزمیہ میں گو الفاظ کی شکوہ وشان کی کچھ انتہا نہیں لیکن اصلیت اور واقعیت سے یہ مراحل دور ہے۔ کربلا کا واقعہ نتائج کے لحاظ سے بے شبہ ایک اہم واقعہ ہے لیکن معرکہ آرائی کے لحاظ سے صرف یہ حیثیت ہے کہ ایک طرف سو سو آدمی تشنہ لب اور بے سروسامان دوسری طرف تین ہزار کا مجمع تھا جو دفعتاً ٹوٹ پڑا اور تین چار گھنٹوں میں لڑائی کا فیصلہ ہو گیا۔ ایسے واقعہ کے متعلق یہ کہنا کہ زمین تھرا گئی، آسمان کانپنے لگا، پہاڑ جگہ سے ہٹ گئے، دریا ہل پڑے، فرشتے آسمان پر چھپتے پھرتے تھے وغیرہ وغیرہ واقعیت سے کس قدر دور ہے۔'' [۱]

لیکن اس کے بعد علامہ شبلی اس اعتراض کی معذرت میں کہتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ شاعری میں اصلیت اور واقعیت کا لحاظ تاریخی حیثیت سے نہیں کیا جاتا۔ صرف یہ دیکھا جاتا ہے کہ شاعر کو ان واقعات کا یقین ہے کہ نہیں؟ اگر وہ ان باتوں پر یقین رکھتا ہے ان کے اثر سے لبریز ہے اور جس قدر اس کے دل پر اثر ہے اسی جوش کے ساتھ ان کا اظہار بھی کرتا ہے تو اس کی شاعری بالکل اصلی ہے۔'' [۲]

مولانا شبلی کے اس خیال کی تردید احسن فاروقی اس طرح کرتے ہیں:

۱۔ موازنہ انیس و دبیر، شبلی نعمانی، ص ۲۲۹

۲۔ ایضاً، ص ۲۲۹

''میر انیس کے یہاں جذبات، مناظر قدرت یا دیگر مناظر اور واقعات کے ملک عرب، معاشرت، عرب اور ہنگامۂ کربلا کی اصلیت اور واقعیت سے بہ مراحل دور ہونے کا احساس نہ ہوا۔ مگر رزمیہ بیانات کے سلسلہ میں واقعیت کا عدم انھیں کھٹکے بغیر نہیں رہا لیکن غور کرنے پر یہ بات یوں سمجھ میں آجاتی ہے کہ مولانا تاریخ اور مورخ میں نقاد نہیں۔'' [۱]

مولانا مرثیہ میں سلام کو غزل کی ایک شکل مانتے ہیں۔ مضمون کے لحاظ سے اس کا ہر شعر الگ الگ ہوتا ہے۔ سلام کی خوبی یہ ہے کہ طرح شگفتہ اور نئی بندش سادہ اور صاف مضمون دردانگیز اور پرتاثیر ہو۔ میر انیس کے سلاموں میں یہ تمام باتیں نہیں پائی جاتی ہیں۔

رباعی کو مولانا صوفیانہ اور اخلاقی مضامین کے اظہار کے لئے سب سے موزوں مانتے ہیں۔ اردو میں ان مضامین کی ادائیگی کم ہونے کی وجہ سے اس کا فقدان ہے۔ میر انیس کی رباعیوں کا ایک بڑا دفتر ہے اور ہر رباعی میں کوئی نہ کوئی اخلاقی مضمون ادا کیا گیا ہے۔ اس کی مثالیں بھی بصیرت افروز ہیں۔

اعتراضات سے متعلق لکھتے ہیں کہ میر انیس کے کمال کا جس قدر مجھ کو اعتراف ہے شاید ہی کسی کو ہو۔ تاہم میرا یہ دعویٰ نہیں کہ ان کا کلام فروگزاشتوں اور غلطیوں سے پاک ہے۔ عبدالغفور خاں نساخ نے میر انیس کے کلام کی بہت سی غلطیاں ایک رسالے میں جمع کی تھیں۔ ان کے اعتراضات کا جواب دیا ہے اور ساتھ ہی خود بھی چند اعتراضات کئے ہیں پھر تمام اعتراضات کا یہ جواب دیا ہے کہ:

''لفظی رعایت کی پابندی کے سوا جو لکھنؤ کا خمیر بن گیا تھا باقی عیوب لازمۂ انسانی ہیں، اور کسی بشر کا کلام ان سے پاک نہیں ہوسکتا۔''

اعتراضات سے متعلق صباح الدین عبدالرحمٰن لکھتے ہیں:

''انھوں نے اعتراضات کے عنوان سے ان کی فروگزاشتوں اور غلطیوں کی بھی

۱۔ اردو میں تنقید، احسن فاروقی، ص ۱۰۴

نشان دہی کی ہے مگر یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان معائب کو دکھانے میں ان کا وہ زور
قلم نظر نہیں آتا جو میر انیس کے کمالات دکھانے میں آتا ہے۔'' ۱

سرقات کے عنوان سے ان موضوعات کی نشاندہی کی ہے جو انیس کے پیش رو مرثیہ نگاروں نے باندھے تھے جنھیں انیس نے بھی باندھا ہے۔ اس کے بعد مولانا شبلی نے ''میر انیس اور مرزا دبیر کا موازنہ'' کا عنوان قائم کیا ہے جو خاص توجہ کے لائق ہے اور اسی عنوان پر مولانا نے اپنی پوری کتاب کا نام رکھا ہے۔ اس لئے اس کی اہمیت زیادہ ہے۔ مولانا اس کی شروعات میں لکھتے ہیں:

''اردو میں علم و ادب کی جو تاریخ لکھی جائے گی اس کا سب سے عجیب واقعہ یہ
ہوگا کہ مرزا دبیر کو ملک نے میر انیس کا مقابل بنایا اور اس کا فیصلہ نہ ہو سکا کہ ان
دونوں حریفوں میں ترجیح کا تاج کس کے سر پر رکھا جائے۔'' ۲

مولانا شاعری کے بارے میں ایک نظریہ لے کر چلتے ہیں۔ اس کا اظہار دوران بحث ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''شاعری کس چیز کا نام ہے؟ کسی چیز کا، کسی واقعے کا، کسی حالت کا، کسی کیفیت
کا۔ اس طرح بیان کیا جائے کہ اس کی تصویر آنکھوں کے سامنے پھر جائے۔'' ۳

مولانا دونوں شاعروں کا موازنہ کرنے سے پہلے تفصیل کے ساتھ فصاحت و بلاغت کی تعریف و تشریح کرتے ہیں اور دونوں کی شاعری کو سمجھنے کے لئے ان دونوں اصطلاحوں کو سمجھنا ضروری قرار دیتے ہیں۔ فصاحت کے بارے میں لکھتے ہیں:

''علمائے ادب نے فصاحت کی یہ تعریف کی ہے کہ لفظ میں جو حروف آئیں ان

۱۔ مولانا شبلی پر ایک نظر، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ص ۵۱

۲۔ موازنہ انیس و دبیر، ڈاکٹر فضل امام، ص ۴۵۲

۳۔ ایضاً، ص ۲۵۳

میں تنافر نہ ہو۔ الفاظ نامانوس نہ ہوں، قواعد صرفی کے خلاف نہ ہوں۔'' ۱

مولانا نے اس میں میر انیس کی برتری اور مرزا دبیر کو کم تر درجے کا شاعر فرمایا ہے۔ میر انیس پر تفصیلی محاکمہ کرنے کے بعد وہ مرزا دبیر کی طرف متوجہ ہوتے ہیں اور لکھتے ہیں:

''اس کے ساتھ الفاظ میں فصاحت، سلاست، روانی، بندش میں چستی اور چستی کے ساتھ بے تکلفی، دلآویزی اور برجستگی، لطیف اور نازک تشبیہات اور استعارات، اصول بلاغت کے مراعات، ان تمام اوصاف میں سے کون سی چیز مرزا دبیر میں پائی جاتی ہے؟ فصاحت ان کے کلام کو چھو بھی نہیں گئی۔ بندش میں تعقید اور اغلاق، تشبیہات و استعارات اکثر دور از کار، بلاغت نام کو نہیں، کسی چیز یا کسی کیفیت یا حالت کی تصویر کھینچنے سے وہ بالکل عاجز ہیں۔ خیال آفرینی اور مضمون بندی البتہ ہے لیکن اکثر جگہ اس کو سنبھال نہیں سکتے۔'' ۲

تشبیہات و استعارات کے سلسلے میں مرزا صاحب سے متعلق لکھتے ہیں:

''مرزا صاحب کے کلام کا خاص جوہر تشبیہات و استعارات ہیں۔ اس میں شبہ نہیں وہ اپنی دقت آفرینی سے ایسے عجیب اور نادر تشبیہات پیدا کرتے ہیں جن کی طرف کبھی کسی کا خیال منتقل نہیں ہوا ہوگا۔'' ۳

مضمون بندی اور خیال آفرینی سے متعلق رقم طراز ہیں:

''میر انیس اور مرزا دبیر میں اصلی مابہ الامتیاز جو چیز ہے وہ خیال بندی اور دقت پسندی ہے اور یہی چیز مرزا صاحب کے تاج کمال کا طرہ ہے۔ اس میں کچھ شبہ

۱۔ موازنہ انیس و دبیر، شبلی نعمانی، ص ۲۸

۲۔ ایضاً، ص ۲۴۷

۳۔ ایضاً، ص ۲۶۹

نہیں کہ مرزا صاحب کی قوت متخیلہ نہایت زبردست ہے۔ وہ اس قدر دور کے استعارات وتشبیہات پیدا کرتے ہیں کہ وہاں تک کے حریفوں کا طائر وہم پرواز نہیں کرسکتا۔'' ۱

بلاغت کی تعریف اس طرح کرتے ہیں:

''بلاغت کی تعریف علمائے معانی نے یہ کی ہے کہ کلام اقتضائے حال کے موافق ہو اور فصیح ہو۔ مقتضائے حال کے موافق ہونا ایسا جامع لفظ ہے جس میں بلاغت کے تمام انواع واسالیب آجاتے ہیں۔'' ۲

موازنہ کا زیادہ حصہ میر انیس کے شعری کارناموں پر مشتمل ہے۔ مرزا دبیر محاکے کے دوران کم ہی نظر آتے ہیں۔ آخری باب میں ان کا ذکر مختصراً کیا گیا ہے۔ میر انیس سے متعلق مولانا شبلی اس بات پر زور دیتے ہیں کہ وہ اپنے کلام کی زیب وزینت میں زیادہ تر تشبیہات پر بھروسہ کرتے ہیں۔ استعارے کا استعمال انھوں نے کم ہی کیا ہے۔ انھوں نے مراثی میں بیشتر جگہ اس کی مثالیں بھی دی ہیں۔ بقول صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم کے:

''موازنہ انیس ودبیر میں متنازعہ فیہ باتوں سے ہٹ کر اس کے طرز تحریر میں جو صناعی اور کاریگری ہے اس سے بھی لطف لینے کی ضرورت ہے۔ یہ چھوٹے چھوٹے جملے کاہے کو ہیں؟ ادب وانشا کے جھلملاتے موتی ہیں۔ فلسفہ اور شاعری برابر درجہ کی چیزیں ہیں۔''

شاعری کے دو جز ہیں مادہ وصورت یعنی کیا کہنا اور کیوں کر کہنا چاہئے؟

جوش ومسرت، عشق ومحبت، درد ورنج، فخر وناز، حیرت واستعجاب، طیش وغضب

۱۔ موازنہ انیس ودبیر، شبلی نعمانی، ص ۵۹

۲۔ ایضاً، ص ۴۴

وغیرہ وغیرہ کی جو حالت پیدا ہوتی ہے اس کو جذبات سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان جذبات کا ادا کرنا شاعری کا اصلی ہیولیٰ ہے۔ خیال بندی، مضمون آفرینی، دقت پسندی، مبالغہ، صنائع و بدائع، شاعری کی حقیقت میں داخل نہیں۔ اگر چہ یہ چیزیں نقش و نگار اور زیب و زینت کا کام دیتی ہیں۔

کلام کی فصاحت میں صرف لفظ کا فصیح ہونا کافی نہیں بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ جن الفاظ کے ساتھ وہ ترکیب میں آئے ان کی ساخت، ہیئت، نشست، سبکی اور گرانی کے ساتھ اس کو خاص تناسب اور توازن ہو۔ ورنہ فصاحت قائم نہ رہے گی۔ روزمرہ اگر چہ ایک جداگانہ وصف سمجھا جاتا ہے لیکن درحقیقت وہ فصاحت ہی کا ایک فرد خاص ہے۔ لفظ چونکہ آواز کی ایک قسم ہے اور آواز کے مختلف اقسام ہیں۔ مہیب، پر رعب، نرم، شیریں، لطیف۔ اسی طرح الفاظ بھی صوت اور وزن کے لحاظ سے مختلف ہوتے ہیں۔ بعض نرم شیریں اور لطیف ہوتے ہیں بعض سے جلالت اور شان ٹپکتی ہے اور بعض سے درد اور غم گینی ظاہر ہوتی ہے۔

بلاغت کو الفاظ سے چنداں تعلق نہیں۔ محض مضامین کو بھی بلیغ یا غیر بلیغ کہا جا سکتا ہے۔ بلاغت الفاظ درحقیقت بلاغت کا ابتدائی درجہ ہے۔ اصلی اور اعلیٰ درجہ کی بلاغت معانی کی بلاغت ہے۔

اکثر صنائع و بدائع شاعری اور انشا پردازی کا دیباچۂ زوال ہیں۔ واقعہ نگاری جب کمال کے درجہ تک پہنچ جاتی ہے تو اس کو مرقع نگاری کہتے ہیں۔

سلام کی خوبی یہ ہے کہ طرح شگفتہ، بندش نئی، الفاظ سادہ اور صاف، مضمون درد انگیز اور پر تاثیر ہو۔'' [۱]

۱۔ مولانا شبلی پر ایک نظر، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ص ۵۲۔۵۳

موازنہ انیس و دبیر کے منظر عام پر آنے سے پہلے بلکہ انیس و دبیر کے زمانے سے ان کے حامی باہم برسر پیکار تھے۔ چنانچہ موازنہ کے منظر عام پر آنے اور انیس کے کلام کے محاسن اور حمایت نے ایک ہنگامہ برپا کر دیا۔ دبیر کے حامی چراغ پا ہو گئے اور موازنہ کی مخالفت میں کتابیں لکھیں۔

موازنہ انیس و دبیر اور علامہ شبلی پر طرح طرح کی تنقیدیں کی گئیں اور ایک متنازعہ کتاب قرار پائی لیکن چونکہ شبلی نے اپنے خیالات کو مضبوط دلائل کے ساتھ پیش کیا تھا اس لئے عام طور پر ان کے خیالات کو تقسیم کیا گیا اور آج ایک صدی گزرنے کے بعد بھی شبلی کے موقف کی صداقت سب پر واضح ہے۔ اور مخالفت میں لکھی جانے والی کتابوں سے بہت کم لوگ واقف ہیں۔ ڈاکٹر فضل امام موازنہ سے متعلق لکھتے ہیں:

> ''مجھے اس حقیقت سے قطعی انکار نہیں کہ سب سے پہلے باضابطہ اور باقاعدہ طور پر انیس شناسی کے میدان میں علامہ شبلی نعمانی کا موازنہ منصۂ شہود پر آتا ہے۔ لیکن اس حقیقت کو تسلیم کرنے میں قطعی تردد نہیں ہونا چاہئے کہ موازنہ انیس و دبیر کی جہتیں ہی فی نفسہٖ موزوں اور مناسب نہیں۔ دونوں شاعروں کی نہاد فکر ہی مختلف اور منفرد ہے تو موازنہ اور تقابل کس کام کا؟ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ردالموازنہ، تردیدالموازنہ اور المیزان تک نوبت پہنچی۔ بہر حال اس کے علاوہ کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ تمام تر اختلافات اور تردیدات کے باوجود شبلی نعمانی کے موازنہ انیس و دبیر کو شبلی شناسی کی سرخیل تسلیم کر لیا جائے گا۔'' [۱]

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

> ''دراصل شبلی کے موازنہ انیس و دبیر کی اس لئے زیادہ اہمیت ہے کہ سب سے پہلے انھوں نے اردو تنقید میں تقابلی مطالعے کا فنی ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ اردو شاعری میں مرثیہ اور مرثیہ نگاروں کی خصوصیات و امتیازات کا واضح تذکرہ

۱۔ موازنہ انیس و دبیر، ڈاکٹر فضل امام (مقدمہ تعارف)، ص ۵۷۔۵۸

دیگر اصناف سخن کے ذیل میں تنقیدی اور تاریخی حیثیت سے کیا ہے۔ گو کہ اس سے قبل بھی مولانا محمد حسین آزاد اور خواجہ الطاف حسین حالی نے آب حیات اور مقدمہ شعر و شاعری میں مرثیہ نگاری اور مرثیہ نگاروں کا ذکر مجمل طور پر کیا ہے۔ لیکن مجموعی حیثیت سے اس قدر تفصیلی بحث اردو کے کسی بھی مورخ اور نقاد نے نہیں پیش کی۔ اس کا سہرا شبلی نعمانی کے سر ہے۔ شبلی نے موازنہ جیسی تصنیف پیش کر کے اردو مرثیہ نگاری پر سنجیدگی اور دلائل اور براہین کی روشنی میں گفتگو کرنے کے لئے پہلی بار راہ کھولی۔'' ۱

ڈاکٹر مسیح الزماں موازنہ سے متعلق یہ تنقیدی نظریہ پیش کرتے ہیں:

''موازنہ انیس و دبیر میں شبلی نے محقق اور ناقد دونوں حیثیتوں سے لغزشیں کی ہیں۔ اور اس میں ان کی تحقیق اور رائے زنی کا وہ بلند معیار نظر نہیں آتا، جو ان کے نام کے ساتھ وابستہ ہے۔'' ۲

پروفیسر سید احتشام حسین اس سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

''اگر یہ کتاب ذرا غور و فکر سے لکھی گئی ہوتی، ابواب کی ترتیب و تنظیم بہتر ہوتی، محض مثالوں کے سہارے خصوصیات کو واضح کرنے کی کوشش کے بجائے تنقیدی تجزیہ سے بھی کام لیا گیا ہوتا، مرثیہ نگاری کا جائزہ بحیثیت فن کے لیا جاتا اور انیس و دبیر کے تقابلی مطالعہ کو ذرا بھرپور شکل میں پیش کیا گیا ہوتا، اصول شاعری کے متعلق جو مباحث چھیڑے گئے تھے ان پر ذرا منطقی اور استدلالی رنگ میں بحث کی گئی ہوتی تو موازنہ کی اہمیت اور زیادہ بڑھ جاتی۔ لیکن اپنی

۱۔ موازنہ انیس و دبیر، ڈاکٹر فصل امام (مقدمہ تعارف)، ص ۵۷۔۵۸

۲۔ آج کل نومبر ۱۹۵۵، مضمون شبلی موازنے کی روشنی میں، ڈاکٹر مسیح الزماں، ص ۱۴

موجودہ حالت میں بھی یہ تصنیف اردو تنقید کی ارتقاء میں ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔'' [۱]

موازنہ سے متعلق عبدالمغنی لکھتے ہیں:

''موازنہ انیس و دبیر میں نظریاتی و اصولی بحثوں سے زیادہ عملی تنقید کی مثالیں ہیں اور کہا جا سکتا ہے کہ یہ کتاب درحقیقت ایک عملی تنقید ایک پوری صنف سخن اور اس کے اہم ترین شاعر کے کلام پر مجموعی و عمومی طور سے ہے۔ اتنے بڑے پیمانے پر عملی تنقید کی نظیر دنیائے ادب میں مفقود ہے۔ اس کے علاوہ شبلی دنیا کے پہلے نقاد ہیں جنھوں نے اس پیمانے پر عملی تنقید کا نمونہ پیش کیا۔'' [۲]

شارب ردولوی اس کتاب سے متعلق اس طرح رقم طراز ہیں:

''موازنہ انیس و دبیر اپنے انداز تنقید کی وجہ سے تنقید میں اہمیت رکھتی ہے۔ اس لئے کہ اس میں عام طور پر شعری محاسن و معائب پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اور انیس کی فضیلت ظاہر کرنے کے لئے تقابل میں بھی ایک سائنٹفک انداز اختیار کیا گیا ہے۔ موازنہ کو جمالیاتی تنقید کی مثال کہا جا سکتا ہے۔'' [۳]

ڈاکٹر سید عبداللہ اس کتاب سے متعلق اس طرح رقم طراز ہیں:

''موازنہ انیس و دبیر بھی عملی تنقید کی کتاب ہے۔ تنقید کا یہ انداز شبلی کا اختراع نہیں ہمارے پرانے نظام نقد و انتقاد میں ادبی گروہ بندیوں کے ماتحت مختلف شاعروں کی شاعری کی قدر و قیمت کا فیصلہ اور طریقوں کے علاوہ اس انداز

۱۔ ادیب، شبلی نمبر، ستمبر ۱۹۶۰ء، ص ۱۰۶

۲۔ اسلوب تنقید، عبدالمغنی، ص ۱۰۶

۳۔ جدید اردو تنقید، شارب ردولوی، ص ۴۴۳

سے بھی کیا جاتا تھا۔شبلی نے بھی اس طریقے پر عمل کیا ہے۔اس خاص بات کے علاوہ شبلی کے محاکمے کے اصول بہت حد تک سائنٹفک ہیں۔انھوں نے سب سے پہلے شاعری کو پرکھنے کے صحیح اصول واضح کئے ہیں۔پھر دونوں شاعروں کی تقابلی اہمیت ان اصولوں کی روشنی میں ظاہر کی ہے۔انھوں نے کتاب میں بلاغت اور وضاحت کے قدیم تصور سے بہت استفادہ کیا ہے۔مگر ان کی تشریح سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ معاملہ میں قدیم تصور کی ساری غلط فہمیوں کے بری طرح شکار ہیں۔تاہم فصاحت و بلاغت کی ناقص بحث کے سوا ان کا تنقیدی عمل بے عیب اور صحیح ہے۔'' [۱]

ڈاکٹر خورشید نعمانی سید عبداللہ کی اس بات سے متفق نہیں ہیں۔ان کا ماننا ہے کہ:

''ڈاکٹر عبداللہ کے اس خیال سے کہ فصاحت و بلاغت کی ناقص بحث کے سوا ان کا تنقیدی عمل عموماً بے عیب اور صحیح ہے اتفاق نہیں کیا جا سکتا۔یہ دونوں نکات موازنہ کی اہم بنیاد ہیں۔اور اگر ان سے صرف نظر کر لیا جائے تو موازنہ کا مطلب ہی خبط ہو جائے گا۔'' [۲]

حقیقت یہ ہے کہ انیس اور دبیر کی شاعری کے درمیان دہلی اور لکھنؤ کے رنگ کا فرق ہے۔انیس کا سارا خاندان میر حسن اور خلیق سے لے کر انیس تک اپنی رفتار و گفتار میں آخر تک دہلوی رہا۔یہی روایات ان کی شاعری میں موجود ہیں۔وہ جذبات نگاری پر زیادہ زور دیتے ہیں اور شاعری میں ان کا مسلک مضمون آفرینی کی جگہ اثر آفرینی ہوتی ہے۔مرزا دبیر اگرچہ دہلی میں پیدا ہوئے لیکن بچپن ہی میں لکھنؤ آ گئے۔ان کی والدہ بھی لکھنؤ سے تعلق رکھتی تھیں اس لئے دہلی کی خصوصیات ان کا مزاج نہ بن سکیں۔اس

۱۔ سرسید اور ان کے نامور رفقا کی نثر کا فنی و فکری جائزہ، ڈاکٹر سید عبداللہ، ص ۲۳۷

۲۔ تاریخ دارالمصنفین کی ادبی اور علمی خدمات، حصہ دوم، خورشید نعمانی، ص ۱۳۴

کے علاوہ دبیر نے تحصیل علم میں بھی بہت وقت صرف کیا۔ چنانچہ علمیت نے اس میں شاعرانہ اختراع کی استعداد کو جو تخیل کی پیداوار ہے، مزید قوت پہنچائی۔ ڈاکٹر آفتاب احمد صدیقی دونوں کا موازنہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

''اگر یہ تسلیم کر بھی لیا جائے کہ شبلی نے دبیر کے ساتھ وہ انصاف روا نہیں رکھا جس کے وہ مستحق تھے اور ان کے لئے پاس داری کی ہے تو بھی اس میں شک نہیں کہ انیس میں شاعری کا ملکہ خداداد تھا۔ وہ مرثیہ کے دم سے زندہ نہیں ہیں۔ مرثیہ کو ان کے دم سے فروغ ہوا۔ دبیر مرثیہ گو نہ ہوتے تو شاید ان کو وہ شہرت حاصل نہ ہوتی جو مرثیہ کی وجہ سے ان کو حاصل ہوئی۔ دبیر اپنا کمال منوانے کی کوشش کرتے ہیں۔ انیس کے سامنے ہم خود جھک جاتے ہیں۔''[۱]

میر انیس کی شاعرانہ خوبیوں کو مدنظر رکھتے ہوئے شبلی کے حسن انتخاب کی مدح سرائی نہ کرنا ان کے ساتھ ناانصافی ہوگی۔ ان کی لامحدود صلاحیتوں نے لوگوں کے ذوق سخن اور ذوق انتخاب کی تربیت کی ہے۔ دور حاضر کے مشہور محقق رشید حسن خان کا یہ قول ملاحظہ ہو:

''موازنہ میں انیس کے محاسن شاعری کے ذیل میں انھوں نے جو طویل اور مختصر مثالیں درج کی ہیں، بعد کے اکثر لکھنے والے بہت کم اضافہ کر سکتے ہیں۔ اور بہتوں نے تو انھیں کی تکرار کی ہے۔ اب تک انصاف کے ساتھ اس کا اعتراف نہیں کیا گیا ہے کہ شاعرانہ حیثیت سے انیس کے کلام و کمال کی جو شہرت ہے اس میں شبلی کی تصنیف موازنہ انیس و دبیر کا کتنا حصہ ہے۔ میر انیس کے کمال شاعری کے سب کے سب قائل ہیں۔ لیکن بہت کم لوگوں نے مراثی انیس کی جلدیں پڑھی ہوں گی یا دیکھی ہوں گی۔ مگر مثالیں بہتوں کے ذہن میں

۱۔ شبلی ایک دبستان، آفتاب احمد صدیقی، ص ۱۳۴

محفوظ اور زبان پر رواں ہوں گی ۔ اگر یہ کہا جائے کہ قبول عام میں شبلی کی تصنیف کا بہت بڑا حصہ ہے تو اس میں مبالغہ نہ ہوگا۔'' ۱

رشید حسن خاں موازنہ کو ایک منفرد کتاب مانتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''موازنہ اپنے انداز کی منفرد کتاب ہے۔ یہ انیس و دبیر کے شاعرانہ کمالات کا جائزہ اور ان کی شاعرانہ قدر و قیمت کے تعین کی دستاویز ہے لیکن اس میں کئی بحثیں ایسی آ گئی ہیں جو تنقید میں اہم اور بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔'' ۲

موازنہ سے متعلق اسلوب احمد انصاری کے یہ خیالات ملاحظہ ہوں:

''موازنہ انیس و دبیر کی بنیاد سرتا سر انداز بیان کے کلاسیکی فارمولے پر رکھی گئی ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ انھوں نے فصاحت و بلاغت جیسی دو ترکیبوں کو اپنے موازنہ کے لئے قدر تعین کا پیمانہ بنایا ہے۔ مشرقی شعریات میں ان دونوں تراکیب کو خصوصاً اہمیت حاصل رہی ہے۔ جدید نقطہ نظر سے چاہے یہ معروضات کافی نہ ہوں۔ مرثیہ گوئی کے ضمن میں یہ امر قابل لحاظ ہے کہ چونکہ یہ صنف سخن واقعات نگاری سے مختص ہے اور اس کی رسمیات مقرر اور منظم ہیں۔ یعنی اس کے موضوعات تاریخ اساطیر کا ایک ناقابل تنسیخ کا جزو ہیں۔'' ۳

اسی مضمون میں دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''انیس و دبیر کے سلسلے میں بھی ایسا ہوتا رہا ہے اور ایک دوسرے پر توارد نہیں

۱۔ موازنہ انیس و دبیر، شبلی نعمانی، مرتب خورشید حسن خاں، تعارف، ص ۵۶

۲۔ ایضاً، ص ۵۷

۳۔ فکر و نظر، شبلی نمبر، علی گڑھ، ص ۲۰

بلکہ سرقے کا الزام لگانا بھی معمول میں داخل رہا۔لیکن مولانا شبلی کی کتاب اس روایات سے ہٹ کر ہے۔انھوں نے اس بات کی کوشش کی ہے کہ حتیٰ الامکان عصبیت سے احتراز کرتے ہوئے اور غیر جانب داری کے ساتھ دونوں شاعروں کے محاسن و معائب کو سامنے رکھ کر ان کی ادبی انفرادیت کا یقین کیا جائے اور اس معاملے میں جذباتیت اور وابستہ مفادات کا دخل نہ ہو۔'' ۱؎

انیس و دبیر کے کلام سے متعلق مہدی افادی رقم طراز ہیں:

''ادبی تنقید کی حیثیت سے ایک نصابی اسٹینڈرڈ کی چیز ہے۔اس کی تنقید کا انداز بالکل مشرقی ہے۔لیکن اس سے شاعری کے متعلق ایک خاص نقطۂ نظر کا اندازہ ضرور ہو جاتا ہے اور انیس و دبیر کے کلام کی خصوصیات ذہن نشین ہو جاتی ہے۔'' ۲؎

آل احمد سرور نے مہدی کے اس خیال کی تردید کی ہے۔ان کا ماننا ہے کہ:

''اس مرثیے میں مرثیے کی تاریخ ناقص اور سرسری ہے اور دبیر پر تنقید سطحی ہے۔ لیکن اس کا نقطۂ نظر صحیح اس کی تنقید اہم اور اس کا فیصلہ قطعی ہے۔انیس کے مطالعہ کے لئے اس کی وہی اہمیت ہے جو غالب کے لئے یادگار غالب کی۔'' ۳؎

موازنہ سے متعلق سید صباح الدین عبدالرحمٰن رقم طراز ہیں:

''مولانا کے نوک قلم سے مرزا دبیر کو جو گھاؤ لگا وہ ہر قسم کے مرہم پٹی سے اب تک مندمل نہیں ہو سکا ہے۔اسی کے ساتھ وہ انیس کو جس طرح سمجھا گئے ہیں

۱۔ فکر و نظر، شبلی نمبر، علی گڑھ، ص ۲۰

۲۔ اردو تنقید کا ارتقاء، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ص ۷۲

۳۔ تنقید کیا ہے، آل احمد سرور، ص ۶۹

اس سے بہتر آج تک کوئی سمجھا نہ سکا۔ اس کتاب کے رد میں جو کتابیں لکھی گئیں وہ بھلا بھی دی گئیں۔ محض ان کا ذکر کسی مضمون میں سرسری طور پر آتا ہے۔ لیکن موازنہ انیس و دبیر کا سدا بہار پھول اردو شعر و ادب کے چمن کے لئے زینت بنا ہوا ہے۔ یہ اردو کی ان چند کتابوں میں سے ہے جس سے اقلیم اردو کے رہنے والوں کا ادبی اور تنقیدی ذوق بنا اور پورے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اس میں جو ادبی درس دیا گیا ہے وہ اس سے بہتر طریقہ پر اردو زبان و ادب میں نہیں دیا گیا۔'' [۱]

موازنہ کی عظمت کا ذکر محمد الیاس الاعظمی نے اس طرح کیا ہے:

''موازنے کی عظمت کا اعتراف کسی نہ کسی وقوع سے ضرور کیا گیا۔ کسی نے شبلی کے تنقیدی شعور اور دلائل کی مضبوطی کی مدح کی تو کسی نے ان کے فکر و نظر کی داد دی۔ اس طرح کسی نے حسن انتخاب کی تحسین کی تو کسی نے موازنے کے تصور کو لائق ستائش قرار دیا۔ غرض مدح و قدح کے اس طویل سلسلے نے موازنے کو حیات جاوداں عطا کی جو اس دور کی کسی ادبی اور تنقیدی کتاب کے نصیب میں نہ آسکی۔ حتیٰ کہ مقدمہ شعر و شاعری کے بھی۔'' [۲]

موازنہ انیس و دبیر صرف تنقیدی نظریات کا مجموعہ نہیں بلکہ اردو کی علمی تنقید کا اولین نمونہ ہے۔ موازنہ پر تنقید و تنقیص کا طوفان کھڑا کیا گیا اور شبلی کو میر انیس کا وکیل اور جانب دار نقاد قرار دیا گیا کہ انھوں نے دبیر کے ساتھ انصاف سے کام نہیں لیا۔ اور بہت سے ایسے کلام کو دبیر کی طرف منتقل کر دیا جو دبیر کے تھے ہی نہیں۔ دبیر کے محاکموں کے دلائل کی مضبوطی اور تجزیے کی سنجیدگی کی طرف دھیان نہیں دیا وغیرہ

۱۔ مولانا شبلی پر ایک نظر، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ص ۵۸

۲۔ معارف، نومبر ۲۰۱۰، موازنہ انیس و دبیر ایک مطالعہ، محمد الیاس الاعظمی، ص ۳۷۶

وغیرہ الزامات عائد کئے۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس کتاب سے بہتر کیا اس کے برابر بھی کوئی کتاب آج تک نہیں پیش کی جاسکی۔ حقیقت میں یہ کتاب ہماری تاریخ کا نادر نمونہ ہے۔

کلیات شبلی شبلی نعمانی مرتب سید سلیمان ندوی

علامہ شبلی اپنے ہم عصروں میں ایک خاص امتیازی حیثیت رکھتے ہیں۔ انھیں دنیائے ادب بحیثیت محقق، مورخ اور نقاد تسلیم کر چکی ہے۔ لیکن بحیثیت شاعر اردو ادب کی اکثر تاریخوں میں ان کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔ حالانکہ ان کے دوسرے عظیم الشان علمی و تحقیقی اور ادبی کارناموں کی تابناکیوں کے ساتھ ان کی شاعری کی چمک بھی کچھ کم نہیں ہے۔ اس لئے ان کی اردو شاعری کا ذکر کئے بغیر ان کی شخصیت ادھوری رہ جاتی ہے۔ انھوں نے اردو، عربی، فارسی تینوں زبانوں میں دادِ سخن دی ہے۔ ان کا فارسی کلام اساتذہ کے کلام سے کم حیثیت کا نہیں۔ لیکن انہیں عزت و عظمت اور شہرت دوام ان کی اردو شاعری کی وجہ سے حاصل ہوئی۔

شبلی کو شروع سے ہی شعر و سخن کا ماحول ملا۔ شعر و ادب کے ادا شناس اور قادر الکلام شاعر مولانا فاروق چریاکوٹی کی صحبت نے شبلی کے ذوق ادب کو جلا بخشی۔

شبلی چشمہ رحمت غازی پور میں طالب علم کی حیثیت سے قیام پذیر تھے تو وہاں ایک ممتاز شاعر عبدالاحد شمشاد سے بھی استفادہ کا موقع ملا۔ ان دنوں شعر و شاعری سے لوگوں کو بڑی دلچسپی تھی۔ اعظم گڑھ میں ایک ادبی فضا قائم تھی اور ایسی مجلسوں کو منعقد کیا جاتا تھا جس میں غزلیں پڑھی جاتی تھیں۔ آپ بھی اس میں شرکت کرتے، ایک مبتدی کی حیثیت سے اپنا کلام پڑھتے اور داد و تحسین حاصل کرتے۔ آپ تسنیم تخلص کرتے تھے۔ جس کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں منشی امیر اللہ صاحب تسلیم لکھنوی کی شہرت کی وجہ سے ان کی تقلید میں تخلص تسنیم اختیار کیا تھا۔ لیکن بعد میں اپنے نام شبلی کو ہی تخلص قرار دیا۔ سید صاحب آپ کی شاعری کے بارے میں تحریر کرتے ہیں کہ:

''مولانا شبلی کی اردو شاعری بالکل خودرو پودا ہے۔ نہ انھوں نے اس میں کسی سے

اصلاح لی، اور نہ جم کر کبھی اردو کی شاعری کی، اور نہ کبھی اردو کی شاعری کو عزت دی، اور شہرت کا ذریعہ سمجھا۔ یہاں تک کہ ۱۸۸۳ء میں علی گڑھ جانے سے پہلے وہ اردو میں خط و کتابت کرنا بھی پسند نہیں کرتے تھے۔ اس زمانہ کے اہلِ علم کی طرح وہ فارسی میں خط لکھتے تھے اور غالب کی طرح محنت سے لکھتے تھے۔'' ۱

مولانا شبلی نے اگرچہ فارسی اور اردو دونوں میں شاعرانہ کمالات دکھائے لیکن انھوں نے خود اسے کبھی قابل اعتنا نہ سمجھا۔ اس لئے وہ کبھی اپنے ہم عصروں کی صف میں حریفانہ حیثیت سے کھڑے بھی نہیں ہوئے۔ بلکہ یہ صرف ان کا تفریحی مشغلہ تھا، جس کی وجہ سے آپ نے کبھی باقاعدہ اور سنجیدگی کے ساتھ شاعری نہیں کی۔ اسی وجہ سے آپ کا شعری سرمایہ محدود و مختصر ہے۔ سید سلیمان ندوی نے کلیات شبلی کے دیباچہ میں تمہیدی جملوں میں دلچسپ انداز میں یہ بات کہی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''مولانا شبلی نعمانی شاعر نہ تھے۔ مولانا شبلی شاعر تھے۔ دونوں باتیں اپنی جگہ درست ہیں۔ وہ شاعر نہ تھے کیونکہ ان کا نام شاعروں کی فہرست میں نہیں، اور پبلک میں شاعر کی حیثیت سے ان کی شہرت نہیں، لیکن وہ شاعر تھے، کیونکہ ان کا اردو اور فارسی کا دیوان موجود ہے۔'' ۲

یوں تو شبلی کے اردو کلام کے کئی ناقص مجموعے شائع ہوئے لیکن ان میں سید سلیمان ندوی صاحب کی مرتب کردہ ''مجموعہ کلیات شبلی'' سب سے زیادہ جامع اور مکمل ہے۔ لیکن اس میں بھی ان کے ابتدائی دور کی غزلیں شامل نہیں ہیں۔ کلیات شبلی سے اندازہ ہوتا ہے کہ شبلی نے متعدد اصناف شاعری میں طبع آزمائی کی ہے۔ لیکن انھوں نے جو سرمایہ یادگار چھوڑا یا زمانے کے بے رحم ہاتھوں سے جو محفوظ رہ گیا، وہ اپنی

۱۔ دیباچہ کلیات شبلی، مرتب سید سلیمان ندوی، شبلی اردو شاعری کے لباس میں، ص ۵

۲۔ ایضاً، ص ۳

عظمت اور فکر وفن کے لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔

مولانا کی شاعری ہنگامی شاعری ہوتی تھی۔ اکثر وہ کسی خاص واقعہ سے متاثر ہوکر کوئی نظم کہتے تھے اور کسی مخصوص جلسہ میں اپنی تقریر سے قبل پڑھتے تھے۔ انھوں نے اس قسم کی نظمیں خاص طور سے علی گڑھ کالج، علی گڑھ ایجوکیشنل کانفرنس، اور ندوۃ العلماء کے جلسوں میں پڑھی تھیں۔ ان کے بہت سے شعری خصائص ایسے ہیں، جن کی وجہ سے وہ آج بھی زندہ وتابندہ ہیں۔

کلیات شبلی: یہ اردو مثنوی، مسدس، قصائد، مرثیہ، اخلاقی، مذہبی اور سیاسی نظموں پر مشتمل ۱۱۸ صفحات کا مجموعہ ہے۔ مولانا نے اگرچہ شاعری کی طرف کوئی خاص توجہ نہیں کی پھر بھی اپنے عہد میں شاعر کی حیثیت سے تسلیم کئے جاتے تھے۔ چنانچہ نذیر احمد اپنی نظم کو شبلی کی نظم کے سامنے پھیکی اور بے آب تصور کرتے تھے۔ اپنے ایک شعر کے ذریعہ انھوں نے اس کا اعتراف بھی کیا ہے۔

تم اپنی نثر کو لو نظم کو چھوڑو نذیر احمد　　کہ اس کے واسطے موزوں ہیں حالؔی اور نعمانؔی

سید سلیمان ندوی نے مولانا کی شاعری کے حسب ذیل چار ادوار قائم کئے ہیں۔ ان کی اس تقسیم کے ذریعہ ہم کو شبلی کی شاعری کے ارتقاء کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔

پہلا دور شروع سے ۱۸۸۳ء تک جب وہ علی گڑھ کالج گئے تھے۔

دوسرا دور علی گڑھ قیام کا زمانہ ۱۸۹۸ء تک۔

تیسرا دور حیدرآباد کا زمانہ اور کچھ لکھنؤ کا ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۸ء تک۔

چوتھا دور ۱۹۰۸ء سے ۱۹۱۴ء تک جس سال انھوں نے وفات پائی۔

پہلا دور : اس دور کی یادگار ان کی چند غزلیں، ایک قصیدہ اور ایک لمبی نظم ہے۔ غزل میں روایتی رنگ اور فرمائشی نظموں میں فرمائشی رنگ نمایاں ہے۔ اس زمانہ کا قصیدہ سلطان عبدالحمید خاں کی تعریف میں ہے۔

دوسرا دور : دوسرے دور میں چند غزلیں، مثنوی، مسدس اور قصیدے ہیں۔ اس دور میں انھوں

نے جو اردو غزلیں کہیں وہ تین چار سے زیادہ نہیں اور ان میں بھی کوئی خاص ندرت نہیں ہے۔ تاہم وہ فارسی ترکیبوں سے مزین ہے، اور اس کا ان کو خاص سلیقہ تھا۔ شبلی کو شاعر بنانے والی چیز ان کی غزل نہیں بلکہ ان کی نظم ہے۔

مثنوی : اس دور میں مولانا نے ایک مثنوی ایک مسدس اور دو قصیدے لکھے۔ مثنوی کو انھوں نے اپنی تصنیفات سے باہر کر دیا تھا۔ لیکن یہ مثنوی (صبح امید) بہت اہم ہے جو قیام علی گڑھ کی یادگار ہے اور سرسید تحریک کے پس منظر میں لکھی گئی ہے۔ یہ پنڈت دیا شنکر نسیم کی مثنوی گلزار نسیم کی بحر میں ہے، اور اس لحاظ سے منفرد ہے کہ اس میں پہلی بار حسن و عشق کے فرسودہ اور فرضی واقعات سے احتراز کر کے قومی عروج وزوال کی داستان غم قلم بند کی گئی ہے۔ یہ مثنوی قومی ترقی و تنزل کا عبرت انگیز مرقع بن گئی ہے۔ شبلی کی اس مثنوی میں روح کی بیداری اور اصلاح قوم کا پیغام ہے۔ اس کی ابتداء ان اشعار سے ہوئی ہے، جس میں انھوں نے قوم کے احساس و شعور کو بیدار کیا ہے۔ اس میں انھوں نے سب سے پہلے قوم کو اس کی عظمت کا بھولا ہوا سبق یاد دلایا ہے۔ ؎

کیا یاد نہیں تمہیں وہ ایّام　　جب قوم تھی مبتلائے آلام
وہ قوم کی جان تھی جہاں کی　　وہ تاج تھی فراق آسماں کی
تھے جس پہ نثار فتح و اقبال　　کسریٰ کو جو کر چکی تھی پامال

شبلی کا ماننا تھا کہ ان کی قوم صرف بہادری ہی میں نہیں بلکہ علم و فن میں بھی اعلیٰ مقام رکھتی تھی۔ وہ لکھتے ہیں ؎

ہیئت میں بلند پایہ اس کا　　تھا فلسفہ زیر سایہ اس کا
منطق میں جو ہوا گرم جولاں　　تھامے تھے رکاب مصر و یوناں

انھوں نے مسلمانوں کی پستی و زبوں حالی، اپنے عصر و عہد کے شعرا کی روش، پست خیالی، علم و فن میں تنزل، اور اخلاقی و سماجی کمزوریوں کا ذکر بھی تفصیل سے کیا ہے ؎

اندوختۂ سلف تھا جو کچھ　　وہ لعل تھا یا خزف تھا جو کچھ
تھے ذرہ خاک یا ستارے　　اب کچھ نہیں ہاتھ میں ہمارے

اس کے بعد علی گڑھ تحریک کا ذکر کیا ہے۔

ماتم تھا یہی کہ آئی ناگاہ　　ایک سمت سے ایک صدائے جانکاہ
اس شان سے تھی وہ آہ دل گیر　　پہلو میں اثر بغل میں تاثیر
ڈوبی ہمہ تن جو تھی اثر میں　　نشتر سی اتر گئی جگر میں

اس نازک موقع پر سرسید میدان عمل میں آئے۔ انھوں نے اپنی قوم کی از سر نو شیرازہ بندی کی اور مسلمانوں کی سیاسی، معاشرتی، تمدنی، معاشی، مذہبی اور تعلیمی حالت کو سدھارنے میں منہمک ہو گئے۔ شبلی ان کی انقلاب آفریں شخصیت کی مرقع آرائی اس طرح کرتے ہیں۔

صورت سے عیاں جلال شاہی　　چہرے پہ فروغ صبح گاہی
وہ ریش دراز کی سپیدی　　چھٹکی ہوئی چاندنی سحر کی
پیری سے کمر میں ایک ذرا خم　　توقیر کی صورت مجسم

مسلمانوں کو بیدار کرنے اور قوم کو پستی سے نکالنے میں سرسید نے جن مشکلات کا سامنا کیا اس کو شبلی نے اس طرح بیان کیا ہے۔

ناکام رہا صدائیں دے کر　　دشنام سنیں دعائیں دے کر
حنظل پائے شکر کے بدلے　　سنگ اس کو ملے گہر کے بدلے
لعل اس نے دیئے شرر پائے　　گل نذر کئے تو خار پائے
خود قوم کو ہوگئی تھی یہ کد　　زندیق کہا کسی نے مرتد

بالآخر سرسید کی مسلسل جدوجہد اور پرخلوص خدمت کامیاب ہوئی اور مسلم کالج کی بنیاد پڑ گئی جس

سے خاص وعام مستفیض ہونے لگے، اور قوم کا سر فخر سے اونچا ہو گیا۔ مثنوی کا خاتمہ ان اشعار پر ہوتا ہے۔

اسلاف کے وہ اثر ہیں اب بھی　　اس راکھ میں کچھ شرر ہے اب بھی

اس جام میں ہے شراب باقی　　اب تک ہے گہر میں آب باقی

ڈاکٹر سلام سندیلوی اس مثنوی کی اہمیت کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ مثنوی صبح امید ایک تابدار آئینہ ہے جس میں اس دور کی معاشرت اور تہذیب، اس عہد کی سراسیمگی اور زبوں حالی، اور اس زمانہ کی ذہنیت اور رجحان کا عکس صاف طور پر نظر آتا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ مثنوی سرسید کی تحریک علی گڑھ کی حمایت میں لکھی گئی ہے..... مثنوی صبح امید ادبی نقطۂ نظر کے علاوہ تمدنی نقطۂ نظر سے بھی اہم ہے۔'' [۱]

حقیقت میں یہ مثنوی فکر وفن کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ اس میں وہی ایجاز واختصار و بلاغت ہے جس کے لئے مثنوی گلزار نسیم شہرت رکھتی ہے۔ علامہ شبلی نے بہت سی جگہوں پر استعاروں سے کام لے کر دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ فصیح الفاظ، بلند معانی، دل پذیر ترکیبیں، نازک استعارے اور تشبیہات، سلاست وروانی وغیرہ مثنوی کی جو خصوصیات ہیں وہ سب اس میں جلوہ گر ہیں۔ اسی وجہ سے یہ مثنوی قدیم مثنویوں سے ممتاز اور مثنوی نگاری میں سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

مسدس : علامہ شبلی کو اس صنف سے بہت دلچسپی تھی۔ ۱۸۹۴ء میں آپ نے ایک مسدس ''تماشائے عبرت'' کے عنوان سے اس وقت لکھا تھا، جب سرسید نے علی گڑھ کی سالانہ نمائش کے موقع پر ''تماشائے عبرت'' کے نام سے عبرت کا تماشا دکھایا تھا۔ سرسید کے اس قومی تھیٹر میں مولانا نے جب یہ مسدس ایک خاص موثر انداز میں پڑھا تو محفل کی عجیب کیفیت ہو گئی۔ سارا مسدس درد واثر میں ڈوبا ہوا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ بہت کامیاب ہے، اور شعریت کے لحاظ سے حالی کی مسدس پر فوقیت نہیں رکھتا تو اس

۱۔ ادبی اشارے، ڈاکٹر سلام سندیلوی، ص ۱۱۴

سے کم تر بھی نہیں۔ یہ مسدس چودہ بند پر مشتمل ہے۔ ایک بند ملاحظہ ہو۔

مرد شیرازہ صفاہاں کے وہ زیبا منظر　　بیت حمرا کے وہ ایوان وہ دیوار و در
مصر و غرناطہ و بغداد کا ایک ایک پتھر　　اور وہ دلی مرحوم کے بوسیدہ کھنڈر
ان کے ذروں میں کچلتے ہیں وہ جو ہر اب تک
داستانیں انھیں سب یاد ہیں از براب تک

قصیدے : مولانا شبلی نے چار قصائد کہے ہیں جس میں سے ایک قصیدہ پہلے دور سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ قصیدہ سلطان عبدالحمید خاں کی مدح میں ہے۔ باقی تین قصائد دوسرے دور سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں سے ایک قصیدہ ترکیب بند ہے جس میں تین بند شامل ہیں۔ اس قصیدے کو شبلی نے ۱۸۹۳ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس میں پڑھا تھا۔ یہ قصیدہ اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ اس سے قوم کی بیداری کا کام لیا گیا ہے۔ ایک بند ملاحظہ ہو۔

بجا ہے آج اگر اس بزم میں یہ زیب و ساماں ہیں　　یہ ان کی بزم ہے جو یادگار نسل عدناں ہیں
خلیل اللہ سے مہماں نوازی جن کو پہنچی ہے　　ہزاروں کوس سے آ آ کے وہ اس گھر میں مہماں ہیں

شبلی نے اس قصیدہ سے قوم کی بیداری کا کام لیا ہے۔ یہ قصیدہ دراصل مسلمانوں کی گزشتہ عظمت کا آئینہ اور مستقبل کی ترقی کا زینہ ہے۔

تیسرا قصیدہ شبلی نے جسٹس سید محمود کی شادی کے موقع پر کہا تھا۔ ان کا یہ قصیدہ دیگر قصائد سے ممتاز ہے۔ اس قصیدہ میں مولانا نے رسمی مبالغہ سے کام نہیں لیا ہے بلکہ واقعی ممدوح کی تعریف کی ہے۔ ان کو قومی خدمت کے لئے اکسایا ہے۔ یہ قصیدہ اردو قصیدہ نگاری میں ایک نئے رجحان کا حامل ہے۔

باپ کی طرح ہے تو قوم کا بن پشت پناہ　　جانشینی کے لئے کون ہے تجھ سے افضل

شبلی کے اس قصیدے میں ایک خصوصیت یہ پائی جاتی ہے کہ انھوں نے اس میں خودداری اور خودستائی کی وہی فضا پیدا کی ہے جو عرفی نے اپنے قصیدے میں شہزادہ سلیم کی مدح میں کہا تھا۔ مولانا لکھتے ہیں۔

مجھ کو خود احسن طبیعت پہ ہے اپنے وہ غرور　　نہ لکھوں مدح تو اپنی ہی لکھوں علم و عمل

میں بھی عبقری وقت جو محمود ہے تو　　میں بھی ہوں ناز سلف تو ہے اگر فخر اوّل

شبلی نے ایک اور قصیدہ کہا ہے جو ۱۸۹۴ء میں ''تماشا گاہ عبرت'' میں پڑھا تھا۔ یہ قصیدہ اپنے رجائی رجحانات کے بنا پر بہت قابل قدر ہے۔ اس کے آخری اشعار قابل غور ہیں۔

تم بھی سن لوگے حریفو کبھی انشاء اللہ　　قافلہ قوم کا منزل پہ وہ پہنچا کیسا

مولانا شبلی کو سودا، ذوق اور منیر، محسن اور عزیز وغیرہ جیسے قصیدہ نگاروں کی فہرست میں نہیں رکھا جا سکتا، لیکن ان کا قصیدہ جو جسٹس محمود کی مدح میں ہے شعریت کے اعتبار سے انشاء، سحر اور قدر بلگرامی کے قصائد سے کم تر نہیں۔

تیسرا دور : مولانا کی اردو شاعری کا تیسرا دور حیدر آباد کے چار سالہ قیام تک کا ہے۔ مولانا شبلی وہاں داغ سے ملتے تھے اور ان کی شاعری کے بڑے مداح تھے۔ لیکن اس دور کی صرف ایک غزل کے سوا کچھ نہیں ملتا۔

ایک فارسی قصیدہ شروع کیا تھا اس میں کہا تھا۔

ہاں تو دعویٰ کنا و مانیز مسلّم داریم　　شبلی سحر فن و داغ غزل خوان از تست[۱]

غزل کے دو شعر ملاحظہ ہوں۔

اثر کے پیچھے دل حزیں نے سراغ چھوڑا نہیں کہیں کا　　گئے ہیں نامے جو سوئے گردوں تو اشکوں نے رخ کیا زمیں کا

یہ نظم آئیں یہ طرز بندش سخن وری کیا فسوں گری ہے　　کہ ریختہ میں تھی تیرے شبلی مزہ ہے طرز علی حزیں کا

چوتھا دور : یہ دور ۱۹۰۴ء سے ہو کر ۱۹۱۴ء تک یعنی ان کی وفات تک قائم رہا اور حقیقت یہ ہے کہ یہی ان کی شاعری کا امتیازی دور ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب اسلامی دنیا میں انقلاب برپا تھا۔ مسلم لیگ کا ہنگامہ، مسلم یونیورسٹی کا قیام اور اس کے بعض حقوق کے لئے گورنمنٹ اور مسلمانوں کے درمیان شدید اختلاف، کانپور کی مسجد کا خونی منظر، بنگال کی تنسیخ، طرابلس کی لڑائی، بلقان کی جنگ، ندوہ کے طلباء کی وہ اسٹرائک جس

۱۔ کلیات شبلی اردو، سید سلیمان ندوی، ص ۱۷

نے پورے ہندوستان میں شورش پھیلا دی تھی، اور آخر میں دنیا کی بڑی لڑائی۔ ان سب نظموں میں شبلی کا سوز دل اور درد جگر شامل ہے۔ چونکہ علامہ شبلی نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی تھی لیکن ان کو حیات جاوداں بخشنے والی ان کی نظمیں ہیں۔ ان نظموں کی تخلیق کر کے شبلی نے اسلامی روایت کو ایک نئی زندگی دی ہے۔ انھوں نے اپنی نظموں میں اسلامی درس و اخلاق کا ایک دستور العمل مرتب کیا ہے۔ ان نظموں کی خصوصیت یہ ہے کہ ان میں سچے واقعات صاف و سادہ زبان میں نظم کئے گئے ہیں۔ اس طرح شبلی نے شعریت اور واقعیت میں ایک باہمی توازن قائم کیا ہے جس میں سادگی و پرکاری کا ایک بہترین نمونہ موجود ہے۔

مولانا شبلی کے کلیات میں مذہبی و اخلاقی نظموں کی کافی تعداد موجود ہے۔ ان کی نظموں کے بارے میں سید صاحب لکھتے ہیں:

> ''اس دور میں سیاسی نظموں کے علاوہ مولانا نے تاریخی اور اخلاقی نظموں کے دو الگ سلسلے شروع کئے، جن میں سے ہر ایک اپنی خوبی اور بلندی کے لحاظ سے اردو کے بڑے بڑے ضخیم دیوانوں کے مقابلہ میں بھاری ہے۔ بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ اردو ادب میں ان کی کوئی مثال نہیں۔ اور نہ اب تک ان کی تقلید کی جا سکی۔ ان نظموں نے ایک طرف اسلامی تاریخ کے انمول موتیوں کو ایک دھاگے میں پرو کر قومی اخلاق کے حسن کو دوبالا کیا دوسری طرف ہماری زبان کی شاعری میں صحیح واقعات کو نظم کرنے کے بہترین نمونے پیش کئے۔''[۱]

ہجرت نبویؐ کے سلسلے میں یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

جب کہ آمادۂ خوں ہوگئے کفار و قریش — لا جرم سرور عالم نے کیا عزم سفر
کوئی نوکر تھا نہ خادم نہ برادر نہ عزیز — گھر سے نکلے بھی تو کس شان سے نکلے سرور

۱۔ کلیات شبلی، مرتب سید سلیمان ندوی، ص ۲۳

اہل بیت رسولؐ کی زندگی سے متعلق جو نظم انھوں نے لکھا وہ بہت موثر اور پر درد ہے۔ اس میں واقعیت نگاری کے ساتھ جذبات نگاری بھی ہے۔ یہ مولانا کی آخری نظم ہے۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

افلاس سے تھا سیدہ پاک کا یہ حال　　گھر میں کوئی کنیز نہ کوئی غلام تھا
گھس گھس گئی تھیں ہاتھ کی دونوں ہتھیلیاں　　چکی کے پیسنے کا جو دن رات کام تھا

یہ اشعار واقعہ نگاری کی بہترین مثال ہیں۔ ان اشعار میں میر انیسؔ کی واقعہ نگاری کی جھلک موجود ہے۔ اس نظم کا ہر شعر جذبات نگاری کی بلند ترین مثال ہے۔ آخری شعر بہت پر تاثیر ہے ؎

یوں کی ہے اہل بیت مطہر نے زندگی　　یہ ماجرائے دختر خیرالانام تھا

اس کے علاوہ علامہ نے ایثار کی اعلیٰ نظیر، مساوات اسلام، اسلامی خلافت، فاروقی کا ایک واقعہ، عدل فاروقی کا ایک نمونہ، اظہار و قبول حق، جرأت صداقت، نظام حکومت اسلام، ہمارا طرز حکومت، عدل جہانگیری، اسلام کی تنزل کا اصلی سبب، خلیفہ عمر بن عبدالعزیز کا انصاف، شغل تکفیر، مذہب یا سیاست، خواتین عرب کا ثبات و استقلال، ان سب عنوانات پر اپنے خیالات کا اظہار موثر نظموں کے ذریعہ کیا ہے۔ ان میں سے بعض نظموں میں ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کی رواداری، انصاف اور حسن اخلاق پر روشنی پڑتی ہے۔ مثلاً ''ہمارا طرز حکومت'' نظم میں شبلی نے یہ دکھایا ہے کہ اکبر نے جے پور کے راجہ کی لڑکی سے جہانگیر کی شادی کی اور دلہن کی پالکی خود اکبر اور جہانگیر اپنے کاندھوں پر لائے۔ اس طرح صلح و آشتی کی ایک سنہری مثال قائم کی، لیکن آج غیر مسلم مغلوں کی اس رواداری کو بھول گئے اور صرف ان کے ظلم و ستم کی جھوٹی داستانیں ان کو یاد ہیں۔ اس سلسلے میں یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

تمہیں لے دے کے ساری داستاں میں یاد ہے اتنا　　کہ عالم گیر ہندوکش تھا ظالم تھا ستمگر تھا

طنز کا بھرپور جواب اردو ادب میں ملنا مشکل ہے۔ اپنی نظم عدل جہانگیری کے ذریعہ شبلی نے جہانگیر کی انصاف پسندی کو منظر عام پر لانے کی سعی کی ہے، اور اس طرح مغلوں کی عظمت کو بلند کیا ہے۔ اس سلسلے میں یہ اشعار ملاحظہ ہوں ؎

ترکنوں کو یہ دیا حکم کہ اندر جاکر　　پہلے بیگم کو کریں بستہ زنجیر و رسن
پھر اسی طرح کھینچ کے باہر لائیں　　اور جلاد کو دیں حکم کہ ہاں تیغ بزن
یہ وہی نور جہاں ہے کہ حقیقت میں وہی　　تھی جہانگیر کے پردہ میں شہنشاہ زمن
اس کی پیشانی نازک پہ جو پڑتی تھی گرہ　　جاکے بن جاتی تھی اوراق حکومت پہ شکن
اب نہ وہ نور جہاں ہے نہ وہ انداز غرور　　نہ وہ غمزے ہیں نہ وہ عربدہ صبر شکن
ایک مجرم ہے کہ جس کا کوئی حامی نہ شفیع　　ایک بیکس ہے کہ جس کا نہ کوئی گھر نہ وطن

شبلی نے اپنے دور کے مسلمانوں کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی تباہی و بربادی کے وجوہات تلاش کئے، اور اس کا یہ نتیجہ اخذ کیا کہ مسلمان اسلام وشریعت کے پابند نہیں رہے۔ نتیجتاً وہ تنزل وپستی کے شکار ہورہے ہیں۔ اس سلسلے میں ان کی نظم ''اسلام کے تنزل کا اصلی سبب'' بہت ہی اہم ہے۔ اس میں انھوں نے اپنے خیالات کی وضاحت ان الفاظ میں کی ہے۔

کون ہے شائبہ شرک سے خالی اس وقت　　کون ہے جس پہ فریب ہوس جام نہیں
اب عمل پر جو نظر کیجئے آئے گا نظر　　کہ کسی ملک میں پابندیٔ احکام نہیں
ان حقائق کی بنا پر سبب پستی قوم　　ترک پابندی اسلام ہے اسلام نہیں

اس حقیقت سے انکار نہیں کہ اقبال کے اسلامی ادب پر شبلی کی نظموں کا اثر کچھ نہ کچھ ضرور پڑا۔ اقبال کے سامنے شبلی کی نظموں کے نمونے موجود تھے اور انھوں نے ان نمونوں سے استفادہ بھی کیا۔ اگرچہ فکر وفن کے لحاظ سے اقبال کی نظمیں شبلی کی نظموں سے زیادہ بلند ہیں مگر شبلی کی نظمیں نقش اولین کا درجہ رکھتی ہیں۔ شبلی نے مذہبی واخلاقی نظموں کے علاوہ سیاسی نظمیں بھی کہی ہیں۔ ان کی اردو شاعری میں ان کی سیاسی نظمیں بہت اہمیت کی حامل ہیں۔ وہ نہ صرف ان کا بلکہ شعر وادب، تاریخ وسیاست کا بڑا قیمتی سرمایہ ہیں۔

مولانا شبلی کی سب سے اہم اور قابل ذکر نظم ''شہر آشوب اسلام'' ہے جو لکھنؤ کے ایک عام جلسہ میں

پڑھی گئی تھی جس کا اثر یہ تھا کہ صدر سے لے کر پائیں تک ماتم برپا ہو گیا۔ چند اشعار یہ ہیں۔

حکومت پر زوال آیا تو پھر نام و نشان کب تک　　چراغ کشتۂ محفل سے اٹھے گا دھواں کب تک
قبائے سلطنت کے گر فلک نے کر دیئے ٹکڑے　　فضائے آسمانی میں اڑیں گی دھجیاں کب تک
مراکش جا چکا فارس گیا اب دیکھنا یہ ہے　　کہ جیتا ہے یہ ٹرکی کا مریض خستہ جاں کب تک

بلاشبہ اس وقت عالم اسلام کے جو حالات تھے اس نے مسلمانوں کو مضطرب و مشتعل بنا دیا تھا۔ ایک طرف اٹلی نے ترکی پر حملہ کر کے طرابلس چھین لیا تھا تو دوسری طرف بلقان نے بھی ترکی پر حملہ کر کے اس کو بڑا نقصان پہنچایا تھا، جس کی وجہ سے مسلمانوں کے جذبات برانگیختہ ہو گئے تھے۔ جس کا اظہار شبلی نے اس پرسوز اور دردانگیز لہجہ میں کیا ہے۔ ان نظموں کی فضا میں اڑتی ہوئی چنگاریاں شاعر کے آتش کدہ دل کی تپش اور سوز کی غماز ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

زوال دولت عثماں زوال شرع ملت ہے　　عزیز و فکر فرزند و عیال و خانماں کب تک
پرستاران خاک کعبہ دنیا سے اگر اٹھے　　تو پھر یہ احترام سجدہ گاہ قدسیاں کب تک

شبلی کی دوسری مشہور سیاسی نظم ''خیر مقدم ڈاکٹر انصاری'' ہے۔ بلقان کی لڑائی میں ڈاکٹر انصاری کا طبی وفد ہندوستان سے ترکی گیا تھا۔ ان کی واپسی پر بمبئی میں ان کا شاندار خیر مقدم کیا گیا۔ اس موقع پر مولانا شبلی نے یہ نظم پڑھی جو سوز و درد میں ڈوبی ہوئی ہے۔ چند اشعار بطور نمونہ ملاحظہ ہوں۔

مسلمانوں کے تم نے طالع اژدوں بھی دیکھے ہیں　　نئے سب انقلاب گردش گردوں بھی دیکھے ہیں
تمہارا درد دل سمجھیں گے کیا ہندوستاں والے　　کہ تم نے وہ مظالم ہائے روز افزوں بھی دیکھے ہیں
یتیموں کے سنے ہیں نالہ ہائے جاں گزا تم نے　　زنان بے نوا کے چہرہ محزوں بھی دیکھے ہیں

آخر میں کہتے ہیں۔

سہارا ہے اگر امید کا اب بھی کوئی باقی　　تو تم نے وہ رموز قوت مکنوں بھی دیکھے ہیں
عجب کیا ہے یہ بیڑا غرق ہو کر پھر ابھر آئے　　کہ ہم نے انقلاب چرخ گردوں یوں بھی دیکھے ہیں

شبلی کی وہ نظمیں جو انھوں نے ہنگامہ مسجد کانپور کے سلسلے میں کہی ہیں انہیں سوز و گداز کے اعتبار سے اردو ادب کی بہترین نظموں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ یہ نظم مچھلی بازار مسجد کانپور کے انہدام اور مسلمانوں پر گولیاں برسانے کی وجہ سے پورے ملک میں انگریزوں کے خلاف غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی تھی۔ اس پر علامہ شبلی نے کئی نظمیں لکھیں جو بہت مقبول ہوئیں۔ ایک نظم کے چند شعر ملاحظہ ہوں۔

پہنائی جا رہی ہے عالم دیں کو زنجیریں　　یہ زیور سید سجاد عالی کی وراثت ہے
عجب کیا ہے جو نوخیزوں نے سب سے پہلے جانیں دیں　　کہ بچے ہیں سویرے ان کو سو جانے کی عادت ہے

اس سلسلے کی سب سے موثر نظم کے چند اشعار تاثیر میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ ملاحظہ ہو

کل مجھ کو چند لاشۂ بے جاں نظر پڑے　　دیکھا قریب جا کے تو زخموں سے چور ہیں
کچھ طفل خورد سال کہ جو چپ ہیں خود مگر　　بچپن یہ کہہ رہا ہے کہ ہم بے قصور ہیں
آئے تھے اس لئے کہ بنائیں خدا کا گھر　　نیند آ گئی ہے منتظر نفخ صور ہیں

آخر میں لکھتے ہیں۔

کچھ پیر کہنہ سال ہیں دلدادۂ فنا　　جو خاک و خون میں بھی ہمہ تن عرق نور ہیں
پوچھا جو میں نے کون ہو تم آئی یہ صدا　　ہم کشتگان معرکۂ کانپور ہیں

اس کے علاوہ شبلی نے کچھ اور سیاسی نظمیں کہی ہیں جن کا تعلق زیادہ تر مسلم لیگ سے اور کچھ مسلم یونیورسٹی اور کچھ کا ندوۃ العلماء سے ہے۔ یہ نظمیں وقتی اور ہنگامی ہیں۔ مسلم لیگ جس نے سوٹ ایبل گورنمنٹ کا نقاب اپنے چہرے پر ڈال لیا تھا۔ مولانا نے اس کی بھی خوب دھجیاں اڑائی ہیں۔ اس وقت ان کی صرف ایک نظم پر اکتفا کرتی ہوں جس میں اس بات کا ذکر ہے کہ سرسید کی وفادارانہ پالیسی ان کی طبیعت کی اصلی آمد نہ تھی بلکہ کالج اسٹاف کے انگریز ممبروں کی سکھائی ہوئی تھی۔ فرماتے ہیں:

کوئی پوچھے گا تو کہہ دوں گا ہزاروں میں یہ بات　　روش سید مرحوم خوشامد تو نہ تھی

ہاں مگر یہ ہے کہ تحریک سیاسی کے خلاف　　ان کی جو بات تھی آورد تھی آمد تو نہ تھی

مسلم یونیورسٹی فاؤنڈیشن کمیٹی نے مسلمانوں کے عام مطالبہ کے برخلاف جس میں علی گڑھ یونیورسٹی کے بجائے مسلم یونیورسٹی نام رکھے جانے اور تمام ہندوستان کے اسلامی کالجوں کے الحاق کے حق میں وائسرائے کے اختیارات کم کئے جانے کے مطالبے پر بہت سخت تھے جس پر مولانا نے نہایت پرزور نظمیں لکھیں۔ ان نظموں سے ان کے دلی جذبات واحساسات کا بھرپور اندازہ ہوتا ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا مولانا کی سیاسی نظموں سے متعلق لکھتے ہیں:

> ''شبلی مرحوم کے لئے قومی یا ملکی معاملات بھی واردات قلب کی حیثیت رکھتے تھے، اور ان کی اجتماعی صورت کے باوصف وہ ان سے اسی طرح متاثر ہوتے تھے، جیسے اپنے ذاتی معاملات سے۔ چنانچہ شبلی کی نظموں کا مابہ الامتیاز ان کا وہ پرخلوص لہجہ ہے، جو ناظر کو بھی متاثر کر دیتا ہے۔ شبلی کی ان سیاسی نظموں کی ایک بہت بڑی خوبی یہ ہے کہ بالعموم ان نظموں کی سرحدیں ادب کی سرحدوں میں ضم ہو جاتی ہیں اور اس انضمام کے نتیجہ کے طور پر ایک ایسی شاعری معرض وجود میں آتی ہے جس کے موجد بھی شبلی نعمانی ہیں اور جو غالباً ان پر ختم بھی ہو جاتی ہے۔''[۱]

مولانا کی طبیعت بہت ہی حساس تھی اس لئے وہ قومی واقعات سے بہت جلد متاثر ہو جاتے تھے۔ یہی تاثیر ان کی شاعری کی روح ہوا کرتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اپنی زندگی کے آخری سانحہ یعنی اپنے بھائی مولوی محمد اسحٰق وکیل ہائی کورٹ الہ آباد کی وفات پر جو دل دوز نوحہ لکھا ہے، وہ ہماری زبان کے بہترین مرثیوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ اس مرثیہ میں درد کی پوری تصویر عیاں ہے۔

۱۔ البصیر، شبلی نمبر، ص ۶۲۔۶۳، وزیر آغا

وہ برادر کہ میرا یوسف کنعانی تھا　　وہ کہ مجموعۂ ہر خوبی انسانی تھا

وہ کہ گھر بھر کے لئے رحمت یزدانی تھا　　قوت دست و دل شبلی نعمانی تھا

جوش اس کا تھا جو میرے سر پر شور میں تھا

بل اسی کا میرے خامہ پرزور میں تھا

یہ مرثیہ تاثیر اور دیگر ادبی محاسن کے اعتبار سے ایک قابل قدر شاہکار ہے۔

ان کے کلیات میں کچھ قطعات بھی ہیں جن کا موضوع علی گڑھ اور ندوہ کے چند واقعات ہیں۔ان میں چند مشہور ہستیوں کی طرف اشارہ ہے۔ان کا مخصوص شاعرانہ طنز یہاں بھی ادبی لطافت سے خالی نہیں۔

فوری واقعات پر ان کے دو دو تین تین شعر کے قطعے اردو ادب میں ایک نیا اضافہ ہیں جیسے

عجم کی مدح کی عباسیوں کی داستان لکھی　　مجھے چندے مقیم آستان غیر ہونا تھا

مگر اب لکھ رہا ہوں سیرت پیغمبر خاتمؐ　　خدا کا شکر ہے یوں خاتمہ بالخیر ہونا تھا

لیکن ابھی سیرت النبیؐ پائے تکمیل کو پہنچی بھی نہیں تھی کہ ہندوستان کا یہ زبردست ادیب، باکمال مورخ، اور جلیل القدر شاعر اپنے آخری پیغام کے ساتھ ہمیشہ ہمیشہ کے لئے خاموش ہو گیا۔اس طرح ان کی شاعرانہ پیشین گوئی تاریخ کا واقعہ ہو کر رہی۔

ڈاکٹر سلام سندیلوی شبلی کی اخلاقی اور سیاسی نظموں سے متعلق اپنے خیالات کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''مولانا شبلی کی اخلاقی اور سیاسی نظموں کے مطالعہ کے بعد ہم اتنا ضرور کہہ سکتے ہیں کہ اگر مولانا شبلی سنجیدگی کے ساتھ اور مستقل طور پر شاعری کرتے رہتے تو اردو کے بڑے شاعر ہوتے۔مولانا شبلی میں ایک اہل قلم کی ساری صلاحیتیں موجود تھیں۔ان کی یہ صلاحیتیں نثر نگاری کی صورت میں ظہور پذیر ہوئیں اور وہ صف

اول کے نثر نگار بن گئے۔ اگر مولانا اپنی انہیں فطری صلاحیتوں کو شاعری کے لئے وقف کر دیتے تو وہ یقیناً صف اول کے شاعر بھی ہوتے۔'' [۱]

ڈاکٹر عبدالودود صاحب شبلی کی شاعری سے متعلق لکھتے ہیں:

''شبلی کا سرمایہ شاعری مختصر لیکن اہم ہے۔ ان کی بدولت اردو شاعری کی لے تیز ہوئی۔ شبلی کی شاعری اس انقلابی لب ولہجہ کا پیش خیمہ تھی جو بعد میں اردو شاعری پر چھا گیا۔ ان کا قومی شعور گہرے غور وفکر کا نتیجہ ہے۔ ان کے سیاسی تصورات نے مذہب وملت کے قیود توڑ دیئے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ وہ محبّ وطن، سامراج دشمن، اتحاد واتفاق کے پیامبر، ہونے کے ساتھ ساتھ پکے مسلمان بھی تھے۔ ان کے علمی کارناموں کا کثیر سرمایہ اسلامیات پر مشتمل ہے، لیکن سیاسی امور میں انھوں نے مذہب کو درمیان میں نہ آنے دیا۔ ان کی نظموں اور تحریروں نے مسلمانوں کو بیدار کیا۔ ان میں جوش وخروش پیدا کیا۔ سامراجی نظام سے ٹکر لینے کا حوصلہ پیدا کیا لیکن وہ ہمیشہ اس پر زور دیتے رہے کہ مسلمانوں کو دوسرے ہم وطنوں کے ساتھ مل جل کر قومی جدوجہد میں حصہ لینا چاہئے۔ [۲]

ڈاکٹر سلام سندیلوی ان کی نظموں سے متعلق رقمطراز ہیں:

''اگر اردو کی بہترین نظموں کا کوئی انتخاب شائع کیا جائے تو اس میں شبلی کی چار نظموں یعنی عدل جہانگیری، شہر آشوب اسلام، خیر مقدم ڈاکٹر انصاری، اور ہم کشتگان معرکہ کانپور ہیں، کو آسانی سے شامل کیا جاسکتا ہے۔ اگر شبلی زیادہ

۱۔ ادبی اشارے، ڈاکٹر سلام سندیلوی، ص ۱۳۰

۲۔ شبلی نقادوں کی نظر میں، ناز صدیقی، ص ۱۸۴

نظمیں نہ کہتے اور صرف انہیں چار نظموں کے خالق ہوتے اس وقت بھی شبلی کو ایک اچھا شاعر کہنے میں کوئی تامل نہیں ہوسکتا۔'' ۱

سید صباح الدین عبدالرحمٰن شبلی کی شاعری سے متعلق تحریر کرتے ہیں:

''شاعری کی حقیقت اور اس کے فن سے اچھی طرح واقف تھے۔ شاہراہ کمال پر گامزن تھے اس لئے کبھی کبھی غزل کہتے تو اس میں طرز حزیں کا رنگ پیدا کر دیتے۔ کبھی مثنوی لکھنے پر آجاتے تو فصیح الفاظ، دل پذیر ترکیبوں، نازک تشبیہوں اور استعاروں سے اس میں جان پیدا کر دیتے۔ مسدس قلم بند کر کے خود پڑھتے تو اپنی ترنم آمیز آواز سے سماں باندھ دیتے۔ خود روتے دوسروں کو بھی رلاتے۔ کبھی قصیدے میں طبع آزمائی کرتے تو انشاء اور محسن کاکوروی کی یاد تازہ کر دیتے۔ اپنے محبوب بھائی مولوی محمد اسحٰق وکیل الہ آباد ہائی کورٹ کی موت پر جو ماتم کیا وہ تو دل گداز نوحہ کا بہترین نمونہ ہے۔ جس شان سے انھوں نے قومی نظمیں کہی ہیں وہ بہت ہی موثر اور نشتر سے زیادہ تیز ہیں..... تاریخی اور اخلاقی نظموں کے لکھنے میں تو کوئی ان کی ہمسری نہیں کرسکا۔'' ۲

اس کے علاوہ سرفراز نواز شبلی کی شاعری کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں۔

''دنیائے علم وادب میں شبلی جیسی جلیل القدر شخصیت کم ہی ملے گی۔ ان کی جامع شخصیت کا ایک پہلو ان کی شاعرانہ فنکاری بھی ہے۔ شبلی کا یہ امتیاز رہا ہے کہ

۱۔ ادبی اشارے، ڈاکٹر سلام سندیلوی، ص ۱۳۲

۲۔ شبلی نعمانی پر ایک نظر، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ص ۹۸

انھوں نے جس صنف میں طبع آزمائی کی اسے اپنی صلاحیتیں اور جوہر سے صرف تقویت ہی نہیں بخشی، بلکہ ان میں نئے پہلو کے امکانات بھی روشن کئے۔ ان کی نظمیں اپنی اثر آفرینی اور اعلیٰ فنکاری کی بدولت اردو ادب کا بہترین سرمایہ ناز ہیں۔ ان نظموں میں وہ آفاقی عناصر موجود ہیں جو ہر آنے والے دور میں ان کی اہمیت اور قدر و قیمت کو محفوظ رکھنے کے لئے کافی ہیں۔'' [۱]

علامہ شبلی کی اردو شاعری کے اس مختصر سے جائزے کے بعد یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اگر انھوں نے اس طرف توجہ کی ہوتی تو وہ اپنے معاصرین میں سب پر فائق ہوتے، پھر ان کی اردو شاعری اور خاص طور سے تاریخی، قومی اور سیاسی نظمیں ناقابل فراموش ہیں۔

مقالات شبلی اوّل شبلی نعمانی

علامہ شبلی کی شخصیت جامع کمالات تھی۔ انھوں نے مدت العمر علم وفن کی جو بیش بہا خدمات انجام دی ہیں اس کا اعتراف ہر ذی علم کو ہے۔ آپ نے ۳۲ سال تک اپنے قلم کی روانی سے اسلامی دنیا کو سیراب کیا، اپنی شعلہ نفسیوں سے گرم اور اپنی نوا سنجیوں سے پرشور رکھا۔ آپ نے ایسی معرکۃ الآراء کتابیں اور گراں قدر مقالات سپرد قلم کئے جو کافی مقبول و معروف ہوئے، اور دنیا کی بہت سی زبانوں میں متعدد کتابوں کے ترجمے بھی ہوئے۔ آپ نے جس موضوع پر قلم اٹھایا اس کا حق اس طرح ادا کیا کہ تعلیم یافتہ طبقہ آپ کے انداز بیان سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔

مولانا شبلی نے مختلف اور متنوع موضوعات مثلاً مذہبی، علمی، ادبی، تنقیدی، تاریخی، تعلیمی اور فلسفیانہ مقالات سپرد قلم کئے، تاکہ جو لوگ ان کی تصانیف سے براہ راست استفادہ نہ کر سکیں وہ ان کے مقالات سے مستفید ہوں۔ یہ مقالات ملک کے مؤقر رسائل و جرائد مثلاً معارف (علی گڑھ)، دکن ریویو، انسٹی

۱۔ علامہ شبلی معنویت کی بازیافت، ڈاکٹر شباب الدین، ص ۳۷۲

ٹیوٹ گزٹ، تہذیب الاخلاق، الندوہ، مسلم گزٹ لکھنؤ وغیرہ میں شائع ہوئے۔ دوستوں کی فرمائش پر مولانا سید سلیمان ندوی نے نہایت تلاش وجستجو اور لگن کے ساتھ ان مقالات کو مجتمع کر کے دارالمصنفین سے آٹھ جلدوں میں شائع کروایا۔

مقالات کی پہلی جلد مذہبی مضامین سے متعلق ہے۔ مقالات کے آغاز میں سید سلیمان ندوی کا تحریر کردہ دیباچہ ہے جس میں مقالات کی ترتیب وتدوین پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس مجموعہ کا پہلا مضمون ''تاریخ ترتیب قرآن'' ہے جس میں قرآن مجید کے نزول اور جمع وترتیب سے بحث کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ پہلی وحی کا ذکر ہے جو غار حرا میں چالیس سال کی عمر میں نازل ہوئی تھی۔ آپ ﷺ پر غار حرا میں جو پہلی وحی نازل ہوئی وہ قرآن مجید کی سورہ اقرا کی ابتدائی پانچ آیتیں تھیں۔

اس کے بعد وحی کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ وحی کا نزول کسی خاص واقعہ اور ضرورت کے پیش آنے پر ہوتا ہے۔ جب آپ ﷺ پر کسی آیت کا نزول ہوتا، آپ ﷺ کسی پڑھے لکھے صحابی کو بلوا کر لکھوا لیتے تھے۔ قرآن مجید کی سورتوں کی ترتیب وتدوین حضرت ابوبکر کے زمانے میں انجام پذیر ہوئی۔

ترتیب وتدوین کے علاوہ بہت سے صحابہ نے ذاتی طور پر قرآن کی ترتیب وتدوین کی تھی۔ حضرت عثمان نے انھیں ضائع کرنے کا حکم دیا تو لوگوں نے اس کی اطاعت نہیں کی۔ ان مصاحف کے نام حسب ذیل ہیں۔

مصحف عبداللہ بن مسعود، مصحف علی، مصحف ابی بن کعب، مصحف عائشہ وغیرہ۔

مصحف کے اس اختلاف سے بعض لوگوں کو شبہ ہوا کہ قرآن مجید میں بھی توریت وانجیل کی طرح بہت کچھ تبدیل ہو گیا ہے۔ شبہ کرنے والوں کے دلائل بھی پیش کئے گئے ہیں۔ ان واقعات نے عیسائیوں کو موقع فراہم کیا کہ وہ تحریف انجیل کی مذمت اس الزامی جواب سے مٹائیں۔ مولانا شبلی نے ان تمام اعتراضات والزامات کا جواب دلائل وبراہین کے ساتھ دیا اور ثابت کیا کہ ہمارا قرآن ہی صحیح ہے۔ دنیا میں کروڑوں لوگ اس کے حافظ ہیں۔

اس جلد کا دوسرا مقالہ ''علوم القرآن'' کے عنوان سے ہے جس میں مولانا شبلی نے قرآن، تفسیر قرآن اوران سے متعلق تصانیف کا تاریخی جائزہ پیش کیا ہے۔

تیسرا مقالہ ''اعجاز قرآن'' کے عنوان سے ہے جس میں شبلی نے قرآن کے اعجاز پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ قرآن کا جواب نہیں اور اس بات سے تقریباً مسلمانوں کے تمام فرقے متفق ہیں لیکن اختلاف اس وقت ہوتا ہے جب یہ سوال ہوتا ہے کہ قرآن کا اعجاز کس وصف کے لحاظ سے ہے۔ تو کوئی اس کی پیشین گوئی اور کوئی فصاحت و بلاغت کو قرآن کے وصف کا اعجاز مانتا ہے لیکن خود قرآن میں خدا نے اسے پیشین گوئی اور فصاحت و بلاغت کا بے مثال نمونہ نہیں بتایا ہے بلکہ اس کی فضیلت کا ذکر حکیم ناصح، رہنما، بشیر ونذیر وغیرہ جیسے الفاظ سے کیا ہے۔

چوتھا مقالہ ''قرآن مجید میں خدا نے قسمیں کیوں کھائیں؟'' کے عنوان سے ہے۔ شبلی نے اس میں اس سوال کا جواب فراہم کرنے کی سعی کی ہے کہ قرآن مجید میں خدا نے قسمیں کیوں کھائی ہیں۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلے قسم کی حقیقت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

قرآن مجید میں خدا نے قسمیں کیوں کھائیں اس بارے میں شبلی نے مولانا حمید الدین فراہی کے حوالے سے اپنے خیالات کو مدلل طریقے سے ثابت کیا ہے کہ قرآن میں جہاں قسم کا لفظ آیا ہے پہلے معنی کے لحاظ سے آیا ہے اس سے مراد شہادت یا گواہی ہے۔ خدا جب اپنی قدرت وشان کا اظہار کرتا ہے تو آفتاب کی، چاند ستاروں کی، دن رات کی قسم کھاتا ہے تو گویا خدا انھیں گواہ ٹھہراتا ہے اور یہ تمام چیزیں خدا کی خدائی پر گواہی دے رہی ہیں اور اس کی نشانیاں ہیں۔

پانچواں مقالہ ''قضا وقدر اور قرآن'' کے عنوان سے ہے۔ شروع سے ہی قضا وقدر کا مسئلہ ایسا مسئلہ رہا ہے جس کی گرہ فلسفہ اور مذہب دونوں میں سے ایک بھی نہ کھول سکا۔ ایک مسئلہ یہ بھی ہے کہ فلسفہ کو مذہب پر تقدم کا دعویٰ ہے اس کے بعد اس کے کچھ مقدمات درج ہیں۔ اس سے متعلق قرآن مجید سے کچھ آیتیں بھی درج ہیں اور ان سے دلیل بھی پیش کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ محدث ابن القیم کی کتاب ''شفاء العلیل'' سے

بھی دلیل پیش کی ہے۔اس کے بعد تمام دلیلوں کا جو حاصل پیش کیا ہے وہ مولانا ہی کے الفاظ میں یہ ہے:

''تمام تقریر کا حاصل یہ ہے کہ عالم سلسلۂ اسباب پر قائم ہے۔سبب کے ساتھ مسبب کا وجود ضروری ہے۔سلسلہ اسباب خدا نے پیدا کیا ہے۔انسان کا ارادہ اور خواہش بھی منجملہ اسباب کے ہے اس بنا پر انسان اپنے افعال کا سبب اور خالق ہے لیکن علت العلل ہونے کے لحاظ سے ان افعال کا خالق بھی خدا ہی ہے۔انسان جو افعال کرتا ہے اپنی فطرت کے لحاظ سے کرتا ہے اور ان افعال کے جو لازمی نتائج ہیں یعنی عذاب وثواب وہ خود بخود اسی سلسلہ اسباب کے بنا پر وجود میں آتے ہیں۔انسان کی فطرت میں خدا نے بڑائی کا مادہ بھی رکھا ہے اور ایسا کرنا حکمت کا اقتضا تھا۔ان اصول کے سمجھنے کے بعد اعتراضات رفع ہو جاتے ہیں اور یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ قرآن مجید نے اس بحث کو ہر پہلو کے لحاظ سے فیصل کر دیا ہے۔'' ۱

اس مجموعہ کا چھٹا مقالہ ''یورپ اور قرآن کا عدیم الصحت ہونے کا دعویٰ'' ہے۔اس میں لندن ٹائمز کے ایک آرٹیکل جو مورخہ ۱۲/اپریل کو شائع ہوا تھا اس میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ:

''قرآن مجید کے چند ایسے نہایت قدیم اجزا ہاتھ آ گئے ہیں جو موجودہ قرآن مجید سے مختلف العبارۃ ہیں اور جن کی صحت پر موجودہ قرآن سے زیادہ اعتبار کیا جا سکتا ہے۔'' ۲

یہ مقالات ڈاکٹر منگانا کے تحریر کردہ تھے۔انھوں نے قرآن پر جو الزامات عائد کئے تھے علامہ شبلی نے اس کا دندان شکن جواب دیا۔مولانا شبلی لکھتے ہیں۔

۱۔ مسلمانوں کی کوئی مذہبی کتاب عیسائیوں کے ہاتھ میں آ کر ہر قسم کی ناجائز کوششوں سے کہاں تک محفوظ رہ سکتی ہے۔

۱۔ مقالات شبلی، جلد اول، سید سلیمان ندوی، ص ۶۵

۲۔ ایضاً، ص ۶۶

۲۔ جو آیت اختلاف کے ثبوت میں پیش کی ہے افسوس ہے کہ اصلی عربی عبارت نقل نہیں کی ہے بلکہ اس کا ترجمہ لکھا ہے۔

۳۔ تیسرے یہ کہ جو شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اوراق مذکورہ کا ماخذ حضرت زید بن ثابت کے زمانے سے پہلے کا ہے وہ اس کے ثبوت میں کیا دلائل پیش کر سکتا ہے۔ یعنی ڈاکٹر منگانا کے اس الزامات کی کوئی بنیاد یا شہادت نہیں۔ اس لئے مسلمان اس کو تسلیم نہیں کر سکتے۔

مولانا نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ انھوں نے قرآن کی تدوین اور تحریر و کتابت کی تاریخ سے بحث کی ہے۔ اس کے کچھ ضروری نتائج بھی پیش کئے ہیں۔ ان نتائج کے بعد ڈاکٹر منگانا کے الزامات کو بے بنیاد ثابت کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر منگانا جن ماخذوں کو حضرت زید اور حضرت عثمان سے پہلے کا بتاتے ہیں ان کی صحت کے کیا دلائل پیش کر سکتے ہیں۔ جب یہ ثابت ہے کہ حضرت زید نے انتہائے تفحص اہتمام و تلاش اور تمام صحابہ کی متفقہ کوشش سے مدون کیا تھا۔ جب یہ ثابت ہے کہ حضرت عثمان نے تمام مصاحف ضائع کر دیئے جو حضرت زید بن ثابت کے نسخوں کے مطابق نہ تھے جب قرآن مجید کا ایک ایک حرف ابتداء سے آج تک بہ تواتر محفوظ چلا آیا تو کیا ڈاکٹر منگانا کا بلا دلیل استنباط تمام عظیم الشان شہادتوں کے مقابلہ میں ایک ذرہ بھی وقعت نہیں رکھتا ہے۔'' [۱]

شبلی ان دلائل کے بعد بجا طور پر یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ قرآن مجید ہزاروں دلائل سے بھی انجیل نہیں بن سکتا۔

اگلا مقالہ ''مسائل فقیہ پر زمانہ کی ضرورتوں کا اثر'' کے عنوان سے ہے۔ قدما اسلام کے نزدیک مسائل فقیہ میں کسی اصلاح اور تغیر کی گنجائش نہیں۔ یہ اعتراض کچھ زیادہ مستحکم نہیں۔ زمانہ کی ضرورتوں کے

۱۔ مقالات شبلی، جلد اول، سید سلیمان ندوی، ص ۷۴

مطابق مجتہدین نے اسلامی فقہ میں تبدیلیاں کی ہیں۔علامہ شافی نے اس قسم کی تقریباً سو مثالیں پیش کی ہیں جن میں زمانہ کے اختلاف کی وجہ سے احکام فقہی بدل گئے ہیں۔لیکن اس سلسلے میں ایک بات کا خاص طور سے خیال رکھنا پڑے گا کہ تمام چیزوں کے حدود مقرر ہیں۔لہٰذا تبدیلیاں بھی ایک حد کے اندر تک ہی کی جاسکتی ہیں۔

اس کے بعد ''وقف اولاد'' کا عنوان قائم کیا گیا ہے اور وقف ہبہ،صدقہ وغیرہ موضوعات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔یہ مضمون مولانا نے اس وقت تحریر کیا جب انگریز حکام نے وقف اولاد کو ناجائز قرار دیا تھا۔ مولانا نے اپنی دلیلوں اور کوششوں سے اسے جائز قرار دیا۔سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب اس مضمون کے بارے میں رقم طراز ہیں:

> ''وقف اولاد پر ایک مدلل اور محققانہ مضمون لکھ کر یہ جتایا کہ تمام حدیثوں اور فقہی روایتوں سے یہ ثابت ہے کہ اسلام میں اولاد پر وقف کرنا جائز ہے اور واجب النفاد ہے۔کسی حکومت کو اس میں مداخلت کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ یہ مضمون آج بھی شمع ہدایت بنا ہوا ہے۔''[۱]

اس کے بعد ''پردہ اسلام'' کے عنوان سے اپنا مقالہ تحریر کیا ہے۔مولانا نے یہ مضمون مشہور اور مستند مولوی امیر علی کے مضمون مسلمان عورتوں کے عنوان سے جو رسالہ نائن ٹینتھ سنچری میں شائع ہوا تھا اس کے جواب میں تحریر کیا تھا کہ مذہب اسلام میں پردہ کا رواج نہیں۔مولوی امیر نے اپنے مضمون میں تحریر کیا تھا کہ مذہب اسلام میں پردہ کا رواج نہیں۔اعلیٰ طبقہ کی عورتیں بنا برقع کے مردوں کے سامنے آتی تھیں۔مولانا اپنے وقت کے جید عالم تھے۔اس مضمون پر انھیں غیرت آئی۔انھوں نے پردہ کی تاریخ سے بحث کی ہے اور دور جاہلیت کے شعراء کے اشعار کے حوالے سے یہ ثابت کیا ہے کہ اسلام سے پہلے بھی امراء اور اعلیٰ طبقہ کی عورتیں پردہ کرتی تھیں۔عورتیں ہی نہیں بلکہ مرد بھی پردہ کرتے تھے۔زمانہ جاہلیت کے بعد اسلام نے بھی

۱۔ مولانا شبلی پر ایک نظر،صباح الدین عبدالرحمٰن،ص ۵۵

برقع پر پابندی نہیں لگائی بلکہ اس کو قائم رکھا اور اس میں اور بھی سختی برتی۔ قرآن میں پردہ سے متعلق آیتیں بھی نازل ہوئیں۔

اس کے بعد ''الاسلام'' کے عنوان سے مضمون لکھا۔ یہ ایک کتاب کا نام ہے جو فرانس کے نامور فاضل کانٹ ہنری دی کاستری نے فرنچ زبان میں لکھا تھا جس کا ترجمہ احمد فتحی بک زغلول مصر کے ایک مصنف نے ۱۸۹۸ء میں شائع کیا۔ مصنف نے اس کتاب میں وجہ تالیف بیان کرنے کے بعد رسول ﷺ کی مختصر سوانح عمری لکھی ہے۔ اور ان تمام مسائل سے بحث کی ہے جس پر یورپ کے مصنفین ہمیشہ نکتہ چیں رہے تھے۔ مولانا نے اس کتاب کا ترجمہ اختصار کے ساتھ کیا ہے۔

اس کتاب میں کاستری نے تین فصل سے بحث کی ہے۔ پہلے فصل میں حضور ﷺ کی سچائی کا ذکر کیا ہے اور افترا پردازیوں کا نہایت مخلصانہ اور ایماندارانہ جائزہ لیا ہے جو یورپین مصنفین نے حضور ﷺ پر لگائے تھے۔ اس طرح دوسری فصل میں عربوں کی صلح پسندی اور بے تعصبی پر روشنی ڈالی ہے۔ اور تیسری فصل میں کاستری نے دولت فرانس اور اسلام پر روشنی ڈالی ہے اور اسلامی دنیا کے ایک عام خوف جو کہ انہیں اسلام کی طرف سے ہے روشنی ڈالی ہے۔ وہ اسلام کی حیرت انگیز طاقت سے خوف زدہ ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ اگر کوئی آفت آئی تو یہ شبہ نہیں کی تمام مغرب میں یہ سلطنت حامی اسلام ثابت ہوگی۔ وہ دیکھتے ہیں کہ دنیا کی تمام قومیں ذرا سی تحریک پر اسلام قبول کر لیتی ہیں لیکن مسلمان قوم کبھی عیسائیت کو قبول نہیں کر سکتی بلکہ اس کے مقابلے میں آ کھڑی ہوتی ہے۔ ان کو یقین ہے کہ ان کا مذہب عیسائیت سے افضل ہے۔

اسلام اور بانی اسلام پر ایک بڑا اعتراض ''تعدد ازدواج'' کے سلسلے میں ہے۔ یورپ میں کافی دنوں تک اس پر شور وغل بھی رہا۔ اس کے بعد تعدد ازدواج سے متعلق اسلام کے حوالے سے بحث کی ہے اور تعدد ازدواج کو جائز قرار دیا ہے۔ ان مضامین کے علاوہ ''مسلمانوں کو غیر مذہب حکومت کا محکوم ہو کر کیوں رہنا چاہئے'' غیر قوموں کی مشابہت، خلافت، حقوق الذمین، الجزیہ، اختلاف اور مسامحت کے عنوان سے بھی اپنے گراں قدر مقالے تحریر کئے۔ ان مقالات کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کو جہاں تحقیق سے دلچسپی تھی وہاں انھیں طرح طرح کے مسائل سے بھی شیفتگی اور محبت تھی۔

مقالات شبلی جلد دوم

مقالات شبلی جلد دوم مولانا کے ادبی مضامین کا مجموعہ ہے۔اس میں مولانا نے خالص ادبی حیثیت سے ان موضوعات پر بحث کی ہے اور صحیح نقطۂ نظر پیش کیا ہے۔اس جلد کے مقالات حسب ذیل ہیں۔

(۱) عربی زبان، (۲) فن بلاغت، (۳) نظم القرآن وجمہرۃ البلاغۃ، (۴) شعر العرب، (۵) عربی اور فارسی شاعری کا موازنہ، (۶) سرسید مرحوم اور اردو لٹریچر، (۷) املا اور صحت الفاظ، (۸) اردو ہندی، (۹) بھاشا زبان اور مسلمان، (۱۰) تحفۃ الہند ہندی صنائع و بدائع

جلد دوم کا پہلا مضمون ''عربی زبان'' ہے۔مولانا کو عربی زبان سے کافی دلچسپی تھی اور انہیں اس پر عبور بھی تھا۔انھوں نے اس مقالہ میں عربی زبان کے آغاز وارتقاء سے بحث کی ہے۔اس مقالہ میں مولانا نے بتایا ہے کہ سامی زبانوں کے بارے میں اکثر بحث کی جاتی ہے۔اور عربی کو سریانی اور عبرانی کی شاخ کہا جاتا ہے۔ کچھ لوگ سریانی اور عبرانی کو عربی سے زیادہ قدیم زبانیں مانتے ہیں اور کچھ لوگ عربی کو ان دونوں سے زیادہ قدیم مانتے ہیں لیکن مولانا نے یہ ثابت کیا ہے کہ عربی ان زبانوں میں سب سے قدیم ہے۔

شبلی نے ایک دلیل پیش کی ہے۔عبرانی زبان کی سب سے زیادہ قدیم کتاب ''سفر ابواب'' تسلیم کی جاتی ہے۔اس کتاب میں نہایت کثرت سے عربی کے الفاظ موجود ہیں جو عربی زبان کے قدیم ہونے کا ثبوت ہے۔ یہ اور بات ہے کہ عربی تصنیفات بہت بعد میں منظر عام پر آئیں۔اس بارے میں مولانا کا خیال ہے کہ کسی زبان کا وجود اور اس زبان میں تصنیفات کا وجود دو مختلف امر ہیں اور دونوں میں کوئی لزوم نہیں۔

فن بلاغت سے مولانا کا خاص شغف تھا جس کا اندازہ ان کے مضمون سے ہوتا ہے۔فن بلاغت کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں نے اسے یونان حاصل کیا ہے۔لیکن مولانا شبلی مسلمانوں کو خود اس فن کا موجد بتاتے ہیں۔مولانا نے فن بلاغت کی پہلی کتاب عبدالقاہر الجرجانی کی دلائل الاعجاز بتائی ہے۔اس کے بعد فن بلاغت پر ایک سلسلہ تصنیف کا سراغ دیا ہے جو مطول اور مختصر معانی پر آکر ختم ہوئے۔

اس مقالے میں شبلی نے اپنی ساری بحث فصاحت تک محدود رکھی۔ان کے نزدیک بلاغت کا پہلا

زینہ فصاحت ہے اس لئے انھوں نے اپنا سارا زور اسی پر صرف کیا ہے۔

اس مضمون میں انھوں نے فصاحت کی تعریف، معانی و الفاظ کی مناسبت، کلام کی فصاحت، ایتلاف الوزن مع المعنی وغیرہ کی تعریف سے بھی بحث کی ہے۔

اس مجموعہ کا اگلا مقالہ ''نظم القرآن وجمہرۃ البلاغت'' ہے۔ یہ کتاب دراصل مولانا حمیدالدین فراہی کی کتابوں پر مولانا کا تبصرہ ہے۔ اس مضمون میں شبلی نے پہلے حمیدالدین صاحب کی زندگی کا تعارف کرایا ہے۔ ان کے تبحر علمی اور نکتہ سنجی کی وضاحت کی ہے۔ اس میں مولانا شبلی نے مولانا حمیدالدین کی کتاب کے مطالب سے بحث کی ہے۔ چونکہ مولانا حمیدالدین نے یہ کتاب عربی میں لکھی اس لئے شبلی نے اس کا ترجمہ اردو میں کیا ہے۔ وہ تحریر کرتے ہیں کہ نظم قرآن سے متعلق یہ باتیں زیر بحث رہی ہیں کہ قرآن مجید کی اکثر آیات میں کوئی خاص ترتیب نہیں ہے۔ کسی آیت میں فقہی حکم ہے تو اس کے فوراً بعد ہی کوئی اخلاقی بات شروع ہوجاتی ہے۔ پھر کوئی قصہ شروع ہوجاتا ہے۔ پھر کوئی اور بات نکل آتی ہے۔ غرض یہ کہ عام تصنیفات کی طرز سے ان کا انداز جدا ہے۔ مولوی حمیدالدین صاحب نے دلیلوں کے ساتھ یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ قرآن کی آیتوں میں کوئی نہ کوئی قدر مشترک ضرور ہے۔ ان کا دعویٰ ہے کہ جس طرح ہر کتاب کا ایک خاص موضوع ہوتا ہے، اسی طرح ہر سورہ کا ایک خاص موضوع ہے اور تمام آیتیں اس موضوع سے متعلق ہیں۔ جمہرۃ البلاغت، فصاحت و بلاغت کے باب میں جدید کوشش ہے۔ اس میں مصنف نے ایک نئے نقطۂ نظر سے (بلاغت) ہر چیز پر روشنی ڈالی ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ علمائے اسلام نے فن شعر اور بلاغت کی بنیاد ارسطو کی کتاب پر قائم کی ہے لیکن ارسطو عرب کے بجائے یونان میں پیدا ہوا اور یونانیوں کا کلام ہی اس کے پیش نظر رہا۔ اس لئے شاعری اور فن بلاغت کے جو اصول اس نے قائم کئے یونانی شعراء کے کلام سے منضبط کر کے قائم کئے۔ اس کا اطلاق عربی شاعری پر نہیں ہوسکتا۔

مولوی حمیدالدین صاحب لکھتے ہیں کہ شاعری کی اصلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ نہایت سریع انفعال اور موسیقی طبع ہوتا ہے۔ جب اس پر خاص اثر طاری ہوتا ہے تو نغمہ، وزن، رقص کی قوتیں جو اس میں فطری

ہوتی ہیں دفعتاً تحریک میں آجاتی ہیں۔ مولوی حمید الدین ارسطو اور جان مل کے اس خیال سے اختلاف کرتے ہیں کہ وزن شعر کا ضروری جز نہیں۔ وہ اس بات پر اصرار کرتے ہیں کہ:

''شعر وزن نغمہ اور رقص کے مجموعہ کا نام ہے لیکن چونکہ یہ چیزیں جذبات کے کمال شدت کے وقت پیدا ہوتی ہیں اس لئے ہر شعر میں ان چیزوں کا پایا جانا ضروری نہیں۔ تاہم کوئی شعر نغمہ اور راگ سے بالکل خالی نہیں ہوسکتا۔ خود وزن جو شعر کا ضروری جزو ہے راگ کی ایک قسم ہے اور یہی وجہ ہے کہ اہل عرب ہمیشہ شعر کو گا کر پڑھتے تھے، اور یہی وجہ ہے کہ شعر پڑھنے کو اہل عرب انشاد کہتے ہیں جس کے معنی گانے کے ہیں'' [۱]

شعرالعرب : اس مقالے کی حیثیت تبصرہ کی سی ہے جو مولانا نے ابن رشیق کی کتاب ''العمدہ'' پر کیا ہے۔ یہ تنقید ادب کی ایک معرکۃ الآراء کتاب ہے۔ مولانا عربی زبان و ادب کو پوری تابناکی کے ساتھ دیکھنا چاہتے تھے۔ وہ عربی زبان وادب کی باریکیوں اور حکمتوں سے واقف تھے۔ انھوں نے قرآن کو عربی ادب کا معیار و محور قرار دیا ہے۔

عربی شاعری کے متعلق مولانا کا خیال ہے کہ ہماری قوم شعرالعرب کی تاریخ سے محروم ہے۔ وہ اپنے بارے میں سوچتے ہیں کہ مجھے شعرالعجم سے پہلے شعرالعرب پر قلم اٹھانا چاہئے تھا کیوں کہ عربی شاعری کی دنیا بہت وسیع ہے۔ اس کی پوری تاریخ تہذیب کی آئینہ دار ہے۔ چنانچہ انھوں نے ابن رشیق قیراونی کی مشہور کتاب ''کتاب العمدہ'' کی روشنی میں شعرالعرب کا خاکہ پیش کیا۔ ابن رشیق کی دیگر تصانیف میں یہ کتاب سرتاج کے مانند ہے۔ علامہ ابن خلدون نے اسے اپنے موضوع پر منفرد کتاب قرار دیا ہے۔ اس مضمون میں شاعری کی ابتداء کا ذکر ہے جس میں قصیدہ کا پہلا شاعر مہلہل بن ربیعہ کو قرار دیا۔ زہیر بن ابی سلمٰی پہلا شخص تھا جس نے بادشاہ کی مدح لکھی۔ اس کے بعد نابغہ ذبیانی نے سلاطین کی مداحی کی۔ لبید بن

۱۔ مقالات شبلی، جلد دوم، سید سلیمان ندوی، ص ۲۸

ربیعہ مشہور مہمان نواز شاعر تھا۔ اس کے علاوہ عمر بن ابی ربیعہ جو عورتوں کی مدح میں اشعار کہتا تھا ابن میادہ نے خلیفہ منصور کی مدح میں قصیدہ لکھا۔ اس کے علاوہ یزید ثقفی فرزدق بنی امیہ نصیب وغیرہ کا بھی ذکر کیا ہے اور عرب شعراء کے کلام سے نمونے بھی پیش کئے ہیں۔

مولانا ابوسفیان اصلاحی مولانا کی عرب شاعری سے متعلق ان کے خیالات اس طرح پیش کرتے ہیں۔

> ''عربوں کی شاعری پر اظہار خیال کرتے ہوئے علامہ نے فرمایا کہ فارسی شعرا علوم وفنون میں ماہر اور عرب شعرا علم وفن سے آشنا تھے۔ یہی وجہ ہے کہ عربی شاعری فطری جذبات اور صداقت و دیانت سے دور ہو جاتی ہے اور اس میں تکلف و تصنع آجاتا ہے۔'' [۱]

عربی اور فارسی شاعری کا موازنہ: یہ مقالہ مولانا شبلی کے تنقیدی تفکر کی مزید وضاحت کرتا ہے۔ عربی اور فارسی شاعری مختلف المزاج ہیں۔ دونوں ملکوں کے تمدن، معاشرت اور مقامی حالات میں فرق تھا۔ عربوں کا تمدن فطری تھا۔ وہ آزادی اور خودسری کے خیالات ساتھ لے کر پیدا ہوتے تھے۔ طبیعت جنگجو اور شوریدہ تھی۔ محکومی اور غلامی کو پسند نہیں کرتے تھے۔ لڑائی جھگڑا ان کا طریقہ تھا۔ فصاحت و بلاغت کا ملکہ فطری تھا۔ اس لئے جو خیالات پیدا ہوتے اور جو حالات پیش آتے وہ جوش وخروش کے ساتھ ادا کر دیتے۔ اسی وجہ سے ان کے اشعار میں شجاعت فی طرہ نفس اور دلیری کے خیالات پائے جاتے۔ بقول علامہ شبلی ''ان حماسیات کو پڑھو تو یہ عالم نظر آتا ہے کہ جنگل میں شیر گونج رہا ہے'' فارسی شاعری اس کے بالکل برعکس ہے۔

عرب کی شاعری میں مفاخرت بھی پائی جاتی ہے جس میں شاعر اپنے کارناموں کو جوش وخروش کے ساتھ فخریہ بیان کرتا ہے جو اس کو زیب دیتا ہے۔

اس کے علاوہ عرب کا شاعر مناظر قدرت کی تصویر جس طرح کھینچ سکتا ہے ایران کا شاعر نہیں کرسکتا۔ ایرانی شاعری میں باغ وبہار کے مضامین کثرت سے ملتے ہیں۔ جذبات انسانی کی مصوری میں

۱۔ معارف، مارچ ۲۰۰۷ء، ص ۲۱۸، مقالات شبلی اور عربی زبان وادب

اہل عرب کو جو قدرت حاصل ہے وہ ایرانی تمدن و معاشرت کی خصوصیات میں بھی عرب کی شاعری ایران کی شاعری سے ممتاز ہے۔ اس کے علاوہ فارسی شاعری چند باتوں میں عربی شاعری سے ممتاز ہے۔ اس مضمون سے متعلق عبدالمغنی صاحب رقم طراز ہیں:

''ان تقاضی بیانات پر غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ علامہ شبلی پورے انصاف اور اعتدال کے ساتھ عرب و عجم میں جس کی جو امتیازی خصوصیت اور کمالات ہیں، انہیں بلا کم و کاست بیان کر دیتے ہیں۔ اس معاملہ میں وہ فکر و فن، مواد ہیئت اور موضوع و اسلوب دونوں پر یکساں نگاہ ڈالتے ہیں۔ وہ شعر العرب نہیں لکھ سکے اور شعر العجم کی تصنیف انھوں نے کر دی، مگر وہ عربی ادب سے اتنے ہی واقف تھے جتنے فارسی ادب سے..... دونوں ادبیات کی پوری قدر شناسی بھی وہ بڑے ناقدانہ انداز سے کرتے ہیں۔'' [۱]

سرسید مرحوم اور اردو لٹریچر : یہ مضمون سرسید احمد خاں کے انتقال کے بعد کالج کے اصرار پر شبلی نے قلم بند کیا جس کا اعتراف انھوں نے مضمون کے آخر میں کیا ہے۔ اس مضمون میں علامہ شبلی نے سرسید احمد خاں کے مختصر حالات زندگی پر تصنیف و تالیف کا ملکہ، کتابت و انشا پردازی، قوم کی اصلاح و ترقی کے لئے تگ و دو، مذہبی مسائل اور اردو زبان و ادب میں سرسید مرحوم نے جو اضافہ کیا جس نے اردو ادب کو ذرے سے آفتاب بنایا ان سب کو نہایت خوبصورتی اور خوش اسلوبی کے ساتھ اس مضمون میں بیان کیا گیا ہے۔

املا اور صحت الفاظ : یہ مختصر سا مضمون ایک طویل خط کے جواب میں لکھا گیا ہے۔ محمڈن اینگلو اورینٹل کالج میگزین میں کسی صاحب علم بزرگ کو کچھ ایسی غلطیاں نظر آئیں جس کو دور کرنا ان کے نزدیک اہم تھا۔ ان کا خیال تھا کہ اگر غلطیوں کی اصلاح نہ کی گئی تو اردو زبان میں بہت سے ایسے الفاظ رائج ہو جائیں گے جس سے قومی زبان برباد ہو سکتی ہے۔ انھوں نے اس کی کچھ مثالیں بھی دی ہیں۔ مقالے کی

۱۔ معارف، مئی ۱۹۸۸ء، ص ۳۲۸، مضمون علامہ شبلی کی تنقید نگاری

ابتداء میں یہ خط نقل کیا گیا ہے۔اس حقیقت کو تسلیم کرنے کے بعد علامہ شبلی نے یہ اہم سوال اٹھایا:

''سوال یہ ہے۔آیا یہ عام قاعدہ قرار پا سکتا ہے یا نہیں۔ جو لفظ اصل لغت کے لحاظ سے غلط ہے اس کا استعمال بھی عموماً غلط ہے۔'' ۱

اس سوال کا جواب دیتے ہوئے انھوں نے فارسی زبان کے اس تشکیلی دور کی طرف واضح انداز میں اشارہ کیا ہے جب عربی زبان کے بہت سے الفاظ بلا تکلف فارسی زبان میں داخل کئے جا رہے تھے۔ فارسی شعرا اور نثار دونوں نے جو عربی الفاظ برتے اس قدر غلط تھے کہ آج کم مایہ اردو داں اس سے زیادہ غلطی نہیں کر سکتے۔ تاہم وہی فارسی آج مستند فصیح اور شیریں زبان سمجھی جاتی ہے۔ اس کے جواب میں علامہ شبلی تحریر کرتے ہیں:

''اصل حقیقت یہ ہے کہ زبان کی ابتدا عوام سے ہوتی ہے اور یہ گروہ صحت الفاظ سے بالکل بے خبر ہوتا ہے۔ خواص اسی زبان کو لے کر کاٹ چھانٹ کر اصلاح کرتے ہیں۔ اصلاح میں وہ بہت سے الفاظ کو اس طرح چھوڑ دیتے ہیں جس کی وجہ کبھی تو یہ ہوتی ہے کہ وہ غلط الفاظ اس قدر عام استعمال میں رواج پا چکے ہوتے ہیں کہ صحت کے ساتھ بولے جائیں تو عام لوگوں کی سمجھ میں نہ آئیں اور کبھی یہ کہ یہ امر زبان کی عزت اور خود مختاری کی دلیل سمجھی جاتی ہے کہ دوسری زبان کے الفاظ اس میں آئیں تو اسی کے قالب میں ڈھل کر آئیں۔'' ۲

بہر حال شبلی کا خیال ہے کہ غیر زبانوں کے الفاظ صحیح اور تلفظ اور ترکیب کے ساتھ قائم رکھے جائیں۔ تاہم یہ کلیہ ہے کہ جو الفاظ فصحا اور مسلم الثبوت اہل زبان کے عام استعمال میں آ جائیں وہ صحیح استعمال ہیں اور جن کو اہل زبان نے عموماً قبول نہ کیا ہو ان کا استعمال صحیح نہیں۔ اس مقالے سے متعلق ڈاکٹر

۱۔ مقالات شبلی، جلد دوم، سید سلیمان ندوی، ص ۶۹

۲۔ ایضاً، ص ۷۰

شباب الدین صاحب اس طرح رقم طراز ہیں:

''یہ مقالہ اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس میں شبلی نے زبان کو کوئی جامد اور ساکت شئے نہیں بلکہ ایک زندہ اور متحرک چیز قرار دیا ہے۔ جس میں نئے نئے الفاظ بھی داخل ہوتے رہیں گے۔ پرانے الفاظ کے معنی اور مفاہیم میں تبدیلیاں بھی ہوتی رہیں گی اور جو الفاظ اپنی معنویت برقرار نہ رکھ سکیں گے وہ متروک ہوتے رہیں گے۔'' [۱]

اردو ہندی : ۱۹۱۲ء میں الہ آباد گورنمنٹ نے ایک ورینکلولر اسکیم کمیٹی قائم کی تھی، جس کا مقصد یہ تھا کہ اسکولوں اور کالجوں میں دیسی زبان کا کورس ایسی زبان میں مرتب کیا جائے جو اردو ہندی دونوں زبانوں میں ایک ہی الفاظ اور عبارت کے ساتھ پڑھایا جاسکے۔ نیز اردو کے کورس میں بھاشا لٹریچر بھی ضروری قرار دیا جائے۔

اس کمیٹی کے چیف سکریٹری مسٹر برن تھے۔ مولانا مرحوم اس کمیٹی کے ممبر تھے۔

مسٹر برن نے اس موضوع پر اپنی دانست میں اردو ہندی کو دراصل ایک ہی زبان قرار دیا تھا کیونکہ ان دونوں کی گرامر متحد ہے۔ ان کے خیال میں دو زبانوں کی گرامر ایک ہونے پر زبان بھی ایک ہوتی ہے۔ مولانا شبلی مسٹر برن کے اس خیال کی تردید کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اگر دونوں زبانوں کی گرامر ایک ہو اور الفاظ بالکل مختلف ہوں تو ان کو ایک زبان نہیں کہہ سکتے۔ مشرقی ہندوستان کی زبانوں کی گرامر بالکل متحد ہے۔ باوجود اس کے نہ وہ ایک زبانیں کہی جاسکتی ہیں نہ ان کا کوئی مشترکہ کورس بن سکتا ہے۔'' [۲]

۱۔ دارالمصنفین کی ادبی خدمات، شباب الدین، ص ۶۰۔۶۱

۱۔ مقالات شبلی، جلد دوم، مرتبہ سید سلیمان ندوی، ص ۷۶۔۷۷

مسٹر برن کے خیال میں ہندی زبان کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس کی نظم ونثر کی گرامر مختلف ہے۔ اس لئے ہندی نظم کی گرامر کی جانکاری کے لئے رامائن اور تلسی داس نصاب میں داخل کئے جائیں۔ ہندوؤں کے لئے اس کو لازم کر دیا جائے اور مسلمانوں کو بھی اس کا پڑھنا مناسب ہوگا۔ مولانا شبلی نے ان کے اس خیالات کی تردید کی ہے اور کہا ہے کہ ہندی نظم ونثر کی گرامر میں ہی اختلاف نہیں بلکہ ہر زبان میں ہے۔ اس لئے مسٹر برن نے جو باتیں کہی ہیں اس کے لحاظ سے ان کتابوں کو کورس میں داخل کرنا مناسب نہیں کیونکہ اس سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں کشمکش رہے گی کہ علمی اصطلاحات عربی سے اخذ کئے جائیں یا سنسکرت سے۔ اور اس طرح جو زبان وجود میں آئے گی وہ نہ تو ہندی ہوگی اور نہ اردو۔ اس لئے دونوں کو الگ الگ ترقی دینی چاہئے کہ ایک دوسرے کی راہ میں حائل نہ ہوں۔

بھاشا زبان اور مسلمان : یہ مضمون شبلی نے ایک ہندو اڈیٹر کے مضمون کے جواب میں لکھا تھا۔ جس کا ماننا تھا کہ مسلمان مذہبی تعصب کی وجہ سے ہندی علم وادب پر توجہ نہیں دیتے۔ مولانا نے اس مضمون میں یہ ثابت کیا ہے کہ مسلمانوں نے ہر دور میں بھاشا اور سنسکرت میں شاعری کی۔ اس زبان کا پہلا مسلمان شاعر مسعود سعد سلمان ہے پھر امیر خسرو، ملک محمد جائسی وغیرہ کا بھی ذکر کیا ہے۔ اکبر کے زمانے میں بھی ہندی کو کافی مقبولیت ہوئی۔ غرض یہ کہ نہ صرف مسلمانوں نے اس زبان میں شاعری کی بلکہ تیموری سلاطین نے ہندی شعراء کی قدر دانی بھی کی۔ عالم گیر جیسے فرماں روا کے دور میں ہندوؤں کے علوم وزبان کی جتنی ترقی ہوئی وہ پہلے نہیں ہوئی تھی۔ سید صباح الدین صاحب اس مقالے سے متعلق لکھتے ہیں:

> ''مسلمانوں نے بڑی فیاضی سے سنسکرت اور بھاشا کی تصانیف کی حفاظت کی۔ ان کے ترجمے کئے۔ پھر خود بھاشا میں بہت سی تصنیفات کیں اور اس کی شاعری میں کمال کا درجہ حاصل کیا۔'' [۱]

تحفۃ الہند : یہ ایک کتاب کا نام ہے جو اورنگ زیب عالم گیر کے زمانہ میں مرزا خان بن فخر الدین

۱۔ مولانا شبلی پر ایک نظر، سید صباح الدین عبد الرحمٰن، ص ۵۶

محمد نے اس کے شاہزادہ اعظم خان کے لئے لکھی تھی جس کا موضوع ہندوؤں کی فن بلاغت، عروض اور قوافی وغیرہ کا ذکر ہے۔ اس میں سات ابواب ہیں۔

(۱) اینگل، (۲) تک، (۳) النکار، (۴) سرنگاررس، (۵) ساعدک، (۶) کوک، (۷) لغات ہندی

یہ کتاب اس لئے اہمیت کی حامل ہے کہ یہ عالم گیر کے دامن پر لگے تعصب کے داغ کو مٹاتی ہے۔ اس سے متعلق سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب رقم طراز ہیں:

> ''یہ مضامین جذباتی ہم آہنگی پیدا کرنے میں آج بھی مفید ہو سکتے ہیں۔ مولانا اس قسم کے مضامین لکھنے میں بڑی فراخ دلی اور رواداری کا ثبوت دیا کرتے تھے۔''[۱]

مقالات شبلی جلد سوم

یہ مولانا کے تعلیمی موضوعات پر مشتمل مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کے سبھی مضامین بہت ہی اہم اور معلومات سے بھرے ہوئے ہیں۔ وہ مضامین حسب ذیل ہیں۔

(۱) مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم، (۲) مدرسہ اور دارالعلوم، (۳) قدیم تعلیم، (۴) ملاّ نظام الدین بانی درس نظامیہ، (۵) درس نظامیہ، (۶) ندوہ اور نصاب تعلیم، (۷) فن نحو کی مروجہ کتابیں، (۸) تعلیم قدیم و جدید، (۹) مشرقی کانفرنس، (۱۰) ریاست حیدرآباد کی مشرقی یونیورسٹی، (۱۱) احیاء علوم اور ایک ریڈیکل

مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم : مولانا نے ۱۸۸۷ء میں مسلمانوں کی گزشتہ تعلیم کے عنوان سے یہ مضمون لکھا اور اسے محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے اجلاس میں پڑھا۔ اس مضمون میں مسلمانوں نے کس طرح علوم و فنون کو حاصل کیا اور دنیا کی تمام قوموں کو ان علوم کی تعلیم کیوں کر دی؟ اس سلسلے میں مولانا نے اپنے مقالے کا یہ اقتباس سامعین کے نذر کیا:

۱۔ مولانا شبلی پر ایک نظر، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ص ۵۶

''سچ یہ ہے کہ افلاطون اور ارسطو وغیرہ کے ناموں کو عموماً اسلامی ممالک نے جو عزت دی، یونان میں ان کو نصیب نہ ہوئی ہوگی۔ لیکن مسلمانوں نے ایک ذرہ پایا تھا اس کو آفتاب بنا دیا۔ ہیئت کو بہت ترقی دی۔ طبیعات کے متعلق ارسطو کی بہت سی غلطیاں دریافت کیں۔ منطق کو بالکل نئے طریقے سے ترتیب دیا اور چند اصول اضافہ کئے۔ نئے نئے آلات رسد ایجاد کئے۔ نور کی رفتار دریافت کی۔ علم مناظر میں انعکاس کا قاعدہ معلوم کیا۔ جبر و مقابلہ جو چند جزئی مسئلوں کا نام تھا ان ہی کی طباعی سے ایک علم کے رتبے پر پہنچ گیا۔ دوا سازی نسخوں کی ترتیب، عرق کھینچنے کے آلے، موالید ثلاثہ کی تحصیل، تیزابوں کے فرق باہمی اور مشابہت کا امتحان ان کی ہی ایجادات ہیں۔ کیمسٹری کی بنیاد ان ہی نے ڈالی۔ علم نباتات میں اپنے تجربوں سے دو ہزار پودے اور اضافہ کر دیئے۔ غرض آج یونانی عربی تصنیفات کا کوئی شخص موازنہ کرے تو قطرہ اور دریا کا فرق پائے گا۔''[۱]

مولانا کے اس مضمون سے متعلق صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب اپنے خیالات کو ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''مولانا کے تحریر کیے اس جوش و خروش میں حدی خوانی کا مزہ آ گیا، جس کو مولانا نے اپنی تحریروں میں اور تیز کیا۔ ایسے انداز بیان سے مسلمانوں کے ذہن میں بڑی جلا پیدا ہوئی۔ جب یہ مضمون پڑھا جا رہا تھا تو انگریزی تعلیم یافتہ سامعین میں سے کچھ لوگ اٹھ اٹھ کر پوچھتے کہ مولانا کیا ہمارا علمی ماضی ایسا ہی شاندار تھا جیسا کہ آپ بیان کر رہے ہیں۔ یہ اس وقت پڑھا گیا جب اردو کی نثر نگاری

۱۔ مقالات شبلی جلد سوم، سید سلیمان ندوی، ص ۱۷

کی تاریخ لمبی نہیں تھی۔ لیکن اس کے اسلوب میں جو طاقت اور توانائی تھی اس سے پتہ چل رہا تھا کہ ''ادب وانشاء کی بازی گری اور محض مدعا نگاری سے بہت آگے بڑھ کر علمی خیالات کے اظہار کے لئے جو زبان چاہئے وہ گویا حاصل ہو رہی ہے۔ یہ مضمون اس لحاظ سے بھی اہم ہے کہ مولانا نے بڑی فراخ دلی سے اس میں اعتراف کیا کہ مسلمانوں نے منطق، طبیعات، ہندسہ، ہیئت، حساب اور طب دوسری قوموں سے سیکھا اور جب اس میں اپنی علمی رواداری سے بھوجر، برہمن کا واقعہ بیان کیا تو اس میں ایک خاص کیفیت پیدا کر دی۔'' [۱]

مولانا دراصل قوم کی اصلاح چاہتے تھے اور انہیں بتانا چاہتے تھے کہ ان کے بزرگوں نے ماضی میں کتنے شاندار تعلیمی کارنامے انجام دیئے تھے۔ اگر انھوں نے ایسا نہیں کیا ہوتا تو وہ تعلیمی میدان میں اتنا زیادہ ترقی نہیں کر سکتے۔

مدرسے اور دارالعلوم : اس میں مولانا نے اسلامی درسگاہوں اور مدرسوں کا تاریخی جائزہ پیش کیا ہے۔ مولانا کا خیال ہے کہ درس وتدریس کا سلسلہ ۱۴۳ھ کے متصل ہی سے شروع ہوتا ہے۔ لیکن اس وقت کسی کالج یا اسکول کا نام ونشان نہیں تھا۔ مسجدوں کے صحن خانقاہوں کے حجرے، علماء کے معمولی مکانات یہی اس وقت کے مدرسے اور دارالعلوم تھے اور یہ عام لوگوں کا بھی خیال ہے اور علامہ ابن خلدون بھی اس سے متفق ہیں کہ اسلامی دنیا میں اوّل جس نے مدرسے کی بنیاد ڈالی وہ دولت سلجوقیہ کا وزیر اعظم نظام الملک طوسی تھا۔ لیکن شبلی کے مطابق نظام الملک سے پہلے بھی علمی عمارتوں کے آثار موجود تھے۔ ۴۰۰ھ میں حاکم مصر نے مصر میں ایک بڑا مدرسہ بنوایا۔ سلطان محمود غزنوی نے ۴۱۰ھ میں متھرا کی فتح کے بعد غزنی میں ایک عالیشان مدرسہ بنوایا۔ سلطان محمود کے بھائی امیر نصر نے ایک مدرسہ بنوایا جو سعیدیہ مشہور ہوا اور ایک مدرسہ بیقیہ تھا۔ اور شاید سب سے آخری مدرسہ وہ تھا جو نظام الملک کی علمی فیاضی کا پہلا دیباچہ تھا۔ یہ مدرسہ بھی نظامیہ کے نام سے

۱۔ مولانا شبلی پر ایک نظر، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ص ۱۲

مشہور تھا۔ مولانا اس مدرسہ سے متعلق لکھتے ہیں:

''مسلمانوں کی علمی تاریخ میں یہ بات بھی نہایت عجیب اور یاد رکھنے کے قابل ہے کہ جب ماوراء النہر کے علماء کو نظامیہ کے قائم ہونے کے تمام حالات سے اطلاع ہوئی تو سب نے ایک مجلس ماتم منعقد کی اور اس بات پر روئے کہ اب علم کے لئے نہیں بلکہ جاہ وثروت حاصل کرنے کے لئے سیکھا جائے گا۔ اس روایت سے ہم کو ایک رائے قائم کرنے میں مدد ملے گی۔ نظامیہ نے اپنے اثر سے ایک عجیب گرم جوشی تمام ملک میں پیدا کر دی۔ وہ پانچویں صدی میں قائم ہوا اور چھٹی صدی تک اسلامی دنیا کا کوئی کونہ (بجز اسپین) علمی عمارتوں سے خالی نہ رہا۔'' [۱]

چھٹی صدی میں نوریہ اور صلاحیہ اسلامی عظمت وشان وشوکت کے اصلی مرکز تھے۔ مصر وشام کا فرماں روا اور دولت نوریہ کا بانی نورالدین محمود نے حلب، حماۃ، حمرص بعلبک، منبج، رحبہ میں بڑے بڑے مدرسے قائم کئے۔ دمشق میں اس نے ایک عظیم الشان مدرسہ قائم کیا۔ اسی طرح صلاح الدین نے اسکندریہ، قاہرہ، بیت المقدس، دمشق میں مدرسے قائم کئے۔ مولانا نے نوریہ اور صلاحیہ خاندان سے متعلق مدرسوں کی فہرست بھی دی ہے۔

خاندان صلاحیہ کے ۶۵۲ھ میں منقطع ہونے کے بعد مصر وعرب کی قسمت اتراک چرائسہ کے ہاتھ میں چلی گئی۔ ان کے دور میں مدرسوں کی اور بھی ترقی ہوئی۔ ان کے دور کے مدرسوں کی فہرست بھی رقم کی ہے۔

تعلیم کے سلسلہ تاریخ میں ترک کا زمانہ تمام پچھلے زمانوں سے زیادہ نمایاں اور تابندہ ہے۔ ترکی مدارس بہت سی خصوصیات میں اولیت کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ ترکوں کا سررشتہ تعلیم پولٹیکل حیثیت رکھتا تھا۔ ترکوں میں ارخان پہلا فرمانروا تھا جس نے مدرسوں کی بنیاد ڈالی۔ اس کا ازنیق کا مدرسہ بہت مشہور ہوا۔ محمد فاتح نے قسطنطنیہ میں ایک بڑی یونیورسٹی کی بنیاد ڈالی۔ یزید خاں ۸۸۶ھ میں تخت نشین ہوا تو اس نے بھی

۱۔ مقالات شبلی جلد سوم، سید سلیمان ندوی، ص ۴۲۔۴۳

بہت سے مدرسوں کی بنیاد ڈالی۔ ترکی دور کے مدرسوں کی فہرست بھی درج ہے۔

اس مقالے میں مولانا نے اسپین اور ہندوستان کی حالت پر افسوس کیا ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ بلاشبہ اسپین کو استادی کا فخر حاصل ہے لیکن مدرسوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کی افسوس ناک حد تک کمی ہے جس کی وجہ سے وہ آخری نمبر پر ہے۔ جب کہ یہ ملک تیغ و قلم دونوں میں خلافت بغداد کا حریف مقابل تھا اور قرطبہ کی علمی شہرت بغداد سے کم نہیں تھی۔

> ''مولانا کا ماننا ہے کہ ہندوستان کے بارے میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس سرزمین پر شاید ایک بھی علمی عمارت نہیں تھی لیکن اس ملک کی عام علمی فیاضیوں سے انکار نہیں ہوسکتا۔ اکبر، جہانگیر، شاہجہاں عالمگیر نے خزانہ شاہی سے عام طور سے ان لوگوں کے لئے جاگیریں اور وظیفے مقرر کئے تھے جو درس و تدریس کرتے تھے۔''[۱]

مذکورہ مدرسوں میں اکثر مذہبی یا عقلی علوم کی پڑھائی ہوتی تھی۔ ان مدرسوں میں سے ایک بھی مدرسہ صنعتی یا حربی نہیں تھا۔ صرف خلیفہ عبدالمومن بن علی کا مدرسہ حربیہ خاص قابل ذکر ہے۔ یہ سارے مدرسے اسلامی ممالک میں قائم ہوئے لیکن مسلمانوں کی علمی فیاضی اس وسیع دائرے میں محدود نہ تھی بلکہ یورپ کے خاص شہروں میں رصد خانے، صنعت گاہیں اور مدرسے قائم کئے۔

قدیم تعلیم : جب تک تصنیف و تالیف کا سلسلہ شروع نہیں ہوا تھا جو تعلم و تعلیم تھی وہ عرب کے سادہ اور نیچرل طرز زندگی کے لئے موزوں تھی۔ علوم وہ تھے جن کا تعلق زیادہ تر حافظہ سے تھا۔ لیکن سو سال کی مدت میں جب تمدن نے ترقی کی تو اسی نسبت سے تعلیم میں بھی وسعت و باقاعدگی آتی گئی۔ اس دور میں نحو، معانی، لغت، فقہ، اصول فقہ، حدیث، اسماء الرجال، طبقات اور ان سے متعلقات علوم کا رواج ہوا۔ فلسفہ اور منطق سے اب بھی ہمدردی نہ تھی۔

تعلیم کا دوسرا دور حیرت انگیز دلچسپیوں سے بھرا ہوا تھا۔ اسلام کی اشاعت، سلطنت کی وسعت،

۱۔ مقالات شبلی جلد سوم، سید سلیمان ندوی، ص ۷۴

لوگ ایک جگہ سے دوسری جگہ آباد ہو رہے تھے۔ بہت سی قومیں اسلام میں داخل ہو رہی تھیں۔ علوم وفنون میں تیزی کے ساتھ ترقی ہو رہی تھی۔ مرو، ہرات، نیشاپور، بخارا، فارس، بغداد، مصر، شام اور اندلس کا ایک ایک شہر اور ایک ایک گاؤں علمی صداؤں سے گونج اٹھا۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ موجودہ زمانے کی طرح یونیورسٹیوں کی عالیشان عمارتیں، کالجوں کے اونچے اونچے ایوان اور اسکولوں کے خوبصورت اور علیحدہ مکانات اس زمانے میں نہ تھے بلکہ اوسط اور اعلیٰ تعلیم کے لئے مسجدوں کے صحن، خانقاہوں کے حجرے، علماء کے سادہ اور بے تکلف ذاتی مکانات ہی علمی درس گاہ تھے۔ لیکن علمی ترقی میں رکاوٹ نہ تھی۔ اگرچہ اس زمانے میں کوئی رجسٹر موجود نہ تھا لیکن تذکرے، تراجم، اسماء الرجال، طبقات کی سیکڑوں ہزاروں کتابیں موجود تھیں۔ اگرچہ متواتر انقلابات سے وہ پوری طرح محفوظ نہ رہ سکیں۔

ہر قوم، ہر فرقہ، ہر طبقہ میں کثرت سے تعلیم جاری تھی۔ اس دور میں تعلیم کا بہترین طریقہ وہی تھا جو آج مہذب ملکوں میں جاری ہے۔ استاد کسی بلند مقام، منبر یا کرسی پر بیٹھ کر کسی فن کے مسائل کو زبانی بیان کرنا شروع کرتا تھا۔ طالب علم قلم دوات لے کر بیٹھتے تھے اور ان تحقیقات کو استاد کے خاص لفظوں میں لکھتے جاتے تھے اور اس طرح ایک مستقل کتاب تیار ہو جاتی تھی۔ اعلیٰ تعلیم کے حصول کے لئے دور دراز کا سفر کر کے متعدد اہل کمال کی خدمت سے مستفید ہونا ضروری خیال کیا جاتا تھا۔ مناظرہ کی مجلسوں میں شرکت کرنا بھی اعلیٰ تعلیم کا لازمی جز تھا۔

۱۔ تعلیم مذہب کا ایک لازمی جز بن گئی تھی۔ قرآن وحدیث عربی زبان کے ساتھ مخصوص تھی۔ نحو، صرف، لغت، معانی، اسماالرجال گویا مذہبی تعلیم کے لئے ضروری تھے۔

۲۔ تعلیم مسجدوں اور علماء کی خاص درسگاہوں میں مقید نہ تھی۔

۳۔ تعلیم میں نہایت آزادی تھی۔ کسی مقررہ نصاب کی پابندی ضروری نہیں تھی۔ جو جس فن کو چاہتا حاصل کر لیتا۔

۴۔ امراء اور اہل منصب کا گروہ جو شائقین علم کی سرپرستی کرتا تھا عموماً تعلیم یافتہ اور پایہ شناس تھا۔ تعلیم

کی اشاعت کا یہ بہت بڑا سبب تھا۔

تیسرے دور میں اس بات نے تعلیم کو نہایت ابتر کر دیا کہ جو فن مقصود بالذات نہ تھے ان کی تعلیم میں وہ اہتمام اور موشگافیاں ہونے لگیں کہ عمر کا ایک حصہ انھیں کی نذر ہو گیا اور جن علوم کی تکمیل مقصود اصلی تھی ان پر توجہ نہ ہو سکی۔

تیسرے دور نے کتابی تعلیم کی بنیاد ڈالی جس میں اصلی مسائل سے زیادہ کتاب کی عبارت اور ان کے متعلقات سے بحث ہوتی تھی۔

مذہب نے تعلیم پر جو بڑا نمایاں اثر دکھایا وہ یہ ہے کہ قدیم عربی زبان نہایت احتیاط سے محفوظ رہی۔ اسلامی حکومت اس قدر وسیع تھی کہ اس کے زیر سایہ کئی ملک وقوم آباد تھے۔ ان ملکی وقومی خوبیوں نے تعلیم میں مختلف صورتیں پیدا کیں۔

انقلاب حکومت سے اسلامی ممالک میں کثرت سے تعلیم کے مقاصد پر اچھا اثر پڑا۔ حکومت کی تبدیلی سے حکمراں کی فیاضیاں اپنی عظمت وشان وشوکت کو قائم رکھنے کے لئے پہلے حکمراں کی بہ نسبت زیادہ ہوئیں۔ مولانا نے اس مضمون میں تفصیل کے ساتھ مدرسوں کے حالات بیان کئے ہیں۔

ملا نظام الدین بانی درس نظامیہ : اس مقالہ میں مولانا تحریر کرتے ہیں کہ پورے ہندوستان میں تعلیم کا جو نصاب ہے وہ نظامیہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس کے بانی ملا نظام الدین صاحب لکھنوی تھے۔ اس مضمون میں مولانا نے ان کے حالات زندگی سے بحث کی ہے۔ مولانا شبلی ان کی شہرت وعظمت کی وجہ سے اس بات کے خواہش مند تھے کہ وہ ان کی مفصل سوانح حالات دریافت کریں۔

ملا نظام الدین کا وطن لکھنؤ سے اٹھائیس میل دوری پر مشہور قصبہ سہالی تھا۔ اس قصبہ میں دو مشہور خاندان تھا۔ ایک انصاری دوسرا عثمانی۔ ملا نظام الدین انصاری خاندان سے تعلق رکھتے تھے۔ آپ کے والد ملا قطب الدین صاحب بڑے مستند عالم تھے۔ آپ کا حلقہ درس تمام مشرقی ممالک کا قبلہ گاہ تھا۔ عثمانیوں اور انصاریوں میں پرانی دشمنی چل رہی تھی۔ اسی دشمنی کی بنا پر عثمانیوں نے ملا صاحب کے گھر میں آگ لگا دی۔

اپنے والد کی شہادت کے بعد ملا نظام الدین اپنے دو بھائیوں شیخ محمد سعید اور شیخ محمد اسعد کے ساتھ بے یارو مددگار لکھنؤ چلے آئے۔ دربار شاہی تک جب اس واقعہ کی خبر پہنچی تو حکم جاری ہوا کہ قطعہ محلّہ کے ایک مکان میں تینوں بھائیوں کی سکونت کا انتظام کیا جائے۔ ملا صاحب تقریباً پندرہ سال کی عمر میں شرح جامی پڑھ چکے تھے۔ غلام علی آزاد نے سبحۃ المرجان میں لکھا ہے کہ ملا صاحب نے یورپ کا سفر کیا اور مختلف شہروں میں علم حاصل کیا۔ آخیر میں لکھنؤ واپس آ کر شیخ غلام نقشبندی سے بقیہ کتابیں پڑھیں اور انھیں سے سند فضلیت حاصل کی۔ تحصیل علم کے بعد اپنے والد کی مسند درس پر متمکن ہوئے۔

ملا صاحب شروع سے ہی بیمار رہتے تھے۔ ۷۵ سال کی عمر میں بالکل ضعیف ہو گئے۔ بالآخر نویں تاریخ جمادی الاولیٰ بروز چہار شنبہ ۱۱۶۱ھ دو پہر دن چڑھے مالک حقیقی سے جا ملے۔ ملا صاحب شروع سے ہی غنی النفس اور متوکل تھے۔ آپ کی علمی شہرت آپ کی زندگی ہی میں اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ ذرا سی خواہش پر ہر طرح کا جاہ و منصب حاصل ہو سکتا تھا لیکن آپ نے کبھی اس طرف توجہ نہیں کی۔ امراء و رؤسا سے دور رہتے۔ عوام سے گرمجوشی سے ملتے۔ ملا صاحب کی تصنیفات کثرت سے ہیں مثلاً شرح مسلم الثبوت، شرح منار مسمیٰ بہ صبح صادق، حاشیہ صدر، حاشیہ شمس بازغہ، حاشیہ بر حاشیہ قدیم۔ یہ تمام کتابیں بڑے پایہ کی ہیں۔ لیکن ملا صاحب کی شہرت درس نظامیہ کی وجہ سے ہے جس میں ان کا مقرر کیا ہوا نصاب قابل توجہ ہے۔ اس نصاب میں ہندوؤں کی متعدد کتابیں داخل ہیں۔ درس نظامیہ کی سب سے مقدم خصوصیت جو ملا صاحب کے پیش نظر تھی وہ یہ کہ قوت مطالعہ اس قدر قوی ہو جائے کہ نصاب کے ختم کرنے کے بعد طالب علم جس فن کی جو کتاب چاہے سمجھ سکے اس سے کوئی شخص انکار نہیں کر سکتا۔ اس نصاب کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں فقہ کی کتابیں بہت کم ہیں۔ جو ہیں بھی اس میں معقول استدلال سے کام لیا گیا ہے۔ نتیجتاً یہاں کے فارغ علماء پر کسی خاص مسلک کی مہر نہیں۔

درس نظامیہ : اس مضمون میں مولانا شبلی نے درس نظامیہ کا جائزہ لیا ہے اور ملا نظام الدین کے سلسلہ نسب پر روشنی ڈالی ہے۔ مضمون کی ابتداء شبلی نے قدیم اور مغربی تعلیم کے موازنہ سے کی ہے۔

درس نظامیہ اگرچہ ملا نظام الدین صاحب کی طرف منسوب ہے لیکن درحقیقت اس کی تاریخ ایک پشت اوپر یعنی ملا قطب الدین شہید سے شروع ہوتی ہے۔ اس لئے اس علمی لوح کے طغرا وہی قرار پاسکتے ہیں۔ وہ تحریر کرتے ہیں:

''تمام ہندوستان میں بلکہ انصاف یہ ہے کہ تمام دنیائے اسلام میں یہ بات صرف اسی مقدس ذات کو حاصل ہے کہ پورے دوسو برس تک متواتر اور بلافصل ان کی نسل سے علماء ہوتے چلے آئے ہیں اور آج بھی یہ سلسلہ قائم ہے۔'' [۱]

اس کے بعد شبلی نے ملا قطب الدین کے سلسلہ نسب، پیدائش، تعلیم و تدریس، شہادت اور وجہ شہادت کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد ملا صاحب کی اولاد کا ذکر کرتے ہوئے ملا نظام الدین صاحب سے بحث کی ہے جو ان کے اگلے مضمون میں بیان ہوئی ہے۔

ندوہ اور نصاب تعلیم : ندوہ کے قیام کی سب سے بڑی ضرورت نصاب تعلیم کی اصلاح تھی۔ لیکن بہت کم لوگ اس اصلاح کے خواہش مند تھے۔ اس کے علاوہ مدرسین بھی قدیم تعلیم یافتہ تھے۔ چنانچہ نصاب تعلیم کی اصلاح ایک بہت بڑا مسئلہ تھا۔ یہ مضمون اسی سے تعلق رکھتا ہے۔

ہندوستان میں ہمارے علمی تنزل کا اصلی سبب کیا ہے؟ اس کا عام جواب ہے تقدیر، سلطنت کا انقلاب، اسی طرح کی دیگر باتیں بتائی جاتی ہیں۔ لیکن شبلی کے خیال میں علمی تنزل کی سب سے بڑی اور واحد وجہ نصاب تعلیم کا ناقص ہونا ہے۔ یہ آج سے برسوں قبل مقرر کیا گیا تھا۔ لیکن اس کا نتیجہ بہت بعد میں نکلا تھا۔ مولانا شبلی نے نصاب تعلیم کے چند اصول پیش کئے ہیں۔ اسی اصول پر موجودہ نصاب تعلیم کو پرکھتے ہیں تو انھیں وہ ناقص اور ابتر معلوم ہوتی ہے۔ وہ اصول اس طرح سے ہیں۔

۱۔ تعلیم سے مقصود یہ ہے کہ نفس فن حاصل کیا جائے۔

۲۔ ہر فن کے حاصل کرنے کا یہ عمدہ طریقہ ہے کہ اس کے مسائل کو منفرداً اور بہ استقلال حاصل کیا جائے

۱۔ مقالات شبلی جلد سوم، سید سلیمان ندوی، ص ۱۰۵

تا کہ اس فن کی طرف کافی توجہ ہو سکے۔ بجائے اس کے اگر چند فنون کے مسائل کو مخلوط کر کے حاصل کر لیا جائے گا تو کسی فن کی اچھی طرح تکمیل نہ ہوگی۔

۳۔ متعدد علوم وفنون کی تحصیل میں الاقدم فالاقدم کا خیال ضرور رہے۔ یعنی یہ کہ ہر فن مقصود بالذات ہے اس لئے ان کے حاصل کرنے میں زیادہ وقت نہ صرف کیا جائے جو مقصود بالغرض ہیں۔ اسی طرح علوم مقصود بالذات میں بھی بلحاظ اہمیت کے فرق مراتب کرنا چاہئے۔

۴۔ ہر علم کی تحصیل میں سب سے پہلے یہ پیش نظر رکھنا چاہئے کہ اس فن کی جو غایت ہو وہ حاصل ہو۔

موجودہ بالا نصاب کے اصول پر مولانا شبلی اپنے مرتب کردہ اصول کا جائزہ لیتے ہوئے یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ

۱۔ نصاب میں زیادہ تر کتابیں ایسی ہیں جس میں نفس مسائل کے علاوہ نہایت کثرت سے لفظی مباحث ہوتے ہیں جن پر وقت صرف کرنا فضول ہے۔

۲۔ سب سے بڑی خرابی موجودہ نصاب کی یہ ہے کہ اس میں اکثر ایسی کتابیں شامل ہیں جن میں متعدد فن مخلوط ہیں۔ اس خلط بحث کی وجہ سے طالب علم کا ذہن پریشان ہو جاتا ہے۔

۳۔ جو علوم مقصود بالغرض ہیں، ان کو مقصود بالذات بنا لیا گیا ہے، اور ان پر زیادہ زور صرف کیا جاتا ہے۔ مثلاً نحو، صرف، منطق، مقصود بالغرض ہیں۔ لیکن وہ کتب درسیہ زیادہ تر انھیں فنون سے متعلق ہیں۔ اس طرح نحو صرف میں برسوں اوقات لگائے جاتے ہیں جو اس کی غرض وغایت ہے یعنی علم وادب تو اس میں بہت کم وقت صرف ہوتا ہے۔ نتیجتاً سیکڑوں ہزاروں طلبہ میں سے ایک بھی صاحب فن نہیں پیدا ہوتا۔

فن نحو کی مروجہ کتابیں : اس مضمون میں اس کتاب سے متعلق شبلی کا سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ وہ ناقص ہیں۔ وہ تحریر کرتے ہیں:

> ''ابن حاجب نے قافیہ میں مسائل نحویہ کو جس طریقہ سے مدون کیا وہ اس قدر مقبول ہوا کہ اس کے بعد جس قدر کتابیں اس فن میں لکھی گئیں گویا اسی کی عکسی

تصویر تھیں۔ایک مدت کی ممارست اور انس کی وجہ سے اب یہ خیال بھی نہیں آتا
کہ اس طریقہ میں کوئی نقص ہوگا۔'' [۱]

علم وفنون کی تدوین کا جو معیار قرار دیا جاسکتا ہے وہ شبلی کے الفاظ میں یہ ہیں:

۱۔ مسائل کی ترتیب اصول عقلی کے بنا پر ہو۔

۲۔ جو اصطلاحات قائم کئے جائیں ان کے لغوی اور اصطلاحی معنی میں نمایاں تناسب ہو کہ لغوی معنی سے اصطلاحی معنی کی طرف خود ہی خیال منتقل ہو جائے۔

۳۔ قواعد کلیہ کی تعداد اس قدر کم ہو کہ اس سے کم نہ ہوسکتی ہو۔

یہ معیار مقرر کرنے کے بعد شبلی نحو کی حقیقت اور ماہیت پر غور کرتے ہیں اور نحو کی کتابوں کو جانچتے ہیں۔

متاخرین کی تعریف کی رو سے نحو کا مقصد یہ قرار دیا گیا ہے کہ الفاظ کا اعراب معلوم کیا جائے۔علامہ ابن خلدون کا اصلی مقصد ادائے معنی ہے۔یعنی جب ہم ایک مطلب ادا کرنا چاہیں تو ہم کو فاعل مفعول اور متعلقات فعل وغیرہ کو کس ترتیب سے لانا چاہئے۔جب یہ ثابت ہوگیا کہ الفاظ کی ترتیب تقدیم وتاخیر سے ہے تو نحو کی ترتیب یہ ہونی چاہئے کہ کلام کے جو اجزا سب سے مقدم ہیں ان کا خیال پہلے بیان کیا جائے پھر ان سے کم درجہ کے اجزا کا حامل پھر ان سے کم کا،لیکن متاخرین نے اس معنوی حیثیت کو نظر انداز کر کے صرف اعراب پر دھیان دیا اور مرفوعات،منصوبات،مجرورات کے لحاظ سے ترتیب قائم کی ہے۔اس اعراب پرستی کی وجہ سے بہت سے مسائل کی حیثیت بدل گئی اور ان کے موقع ترتیب میں فرق آگیا۔

مولانا شبلی نے نحو میں موجودہ ایک بڑا نقص یہ بتایا ہے کہ کلمات کے بہت سے اقسام اور اصطلاحات بے فائدہ بنائے گئے ہیں۔پھر ترتیب اور ان کا ذکر بھی کیا ہے۔

تعلیم قدیم وجدید : اس مضمون کا آغاز مولانا کے ان سوالات سے ہوتا ہے کہ کیا ان میں سے کوئی غیر ضروری ہے؟ کیا ان دونوں میں تعارض ہے؟ کیا ان میں سے کسی اصطلاح کی ضرورت ہے؟ یہ دونوں مل

۱۔ مقالات شبلی،جلد سوم،ص ۱۳۴

کر کیوں کر کام کر سکتے ہیں؟

یہ سوالات قومی سطح پر بہت اہم اور ضروری ہیں۔ لیکن قوم نے کبھی اس طرف دھیان نہیں دیا۔ اس کی وجہ دنیاوی اور دینی درس گاہیں اور انجمنیں ہیں جو ملک میں قائم تھیں اور ان کو اس وقت جو کامیابی حاصل تھی وہ اس پر قانع تھیں۔ اس لئے ان مسائل کو حل کرنے کی ضرورت محسوس نہیں ہوئی۔ مثلاً اسلامی کالجوں سے فارغ شدہ طلبا نے معقول نوکریاں حاصل کیں۔ اس لئے انہیں اس بات کی ضرورت نہیں محسوس ہوئی کہ وہ قدیم تعلیم کے نتائج اور ترمیم و اصلاح کا سودا مول لیں۔

اس طرح عربی مدارس کے تعلیم یافتہ مساجد میں پھیلے ہوئے ہیں۔ ہر ضلع میں عربی کے چھوٹے چھوٹے مدرسے قائم ہوتے جاتے ہیں۔ ہر جگہ واعظوں کی مانگ ہے اس لئے انھیں اس بات سے کوئی غرض نہیں کہ وہ جدید تعلیم کی ضرورت و نتائج پر غور کرنے کی زحمت اٹھائیں۔ لیکن مولانا اس بات پر مصر ہیں کہ وہ وقت آ گیا ہے کہ تمام قوم مل کر ایک وسیع خاکہ تیار کریں، جس میں تمام درس گاہوں اور انجمنوں کی نسبت طے کر دیا جائے کہ کون کون ضروری ہیں، کس حد تک ضروری ہیں، اور مجوزہ نقشہ میں ہر ایک کی جگہ کہاں ہے؟ تاکہ جو کام ہو رہے ہیں سب مل کر ایک کام بن جائیں اور ایک کام دوسرے کام میں خلل انداز نہ ہونے پائے۔ ورنہ دو طرفہ کشمکش میں مسلمان یہ فیصلہ نہ کر سکیں گے کہ وہ کس رخ پر اور کدھر جائیں۔ اس بحث سے متعلق شبلی نے چند سوالات اٹھائے ہیں۔

قدیم و جدید تعلیم ضروری ہے یا نہیں؟ دونوں میں اصلاح کی ضرورت ہے یا نہیں؟ اصلاح کا کیا طریقہ ہے؟ علی گڑھ، دیوبند، ندوہ کے کیا حدود ہیں؟ اور کون کون کام کس کس کے حد عمل میں چھوڑ دینے چاہئیں؟

پہلے سوال کے جواب میں کوئی اختلاف نہیں۔ دوسرے سوالات کے جواب میں کچھ سوال اٹھائے گئے ہیں۔ لیکن کیا مسلمانوں کی قومیت مذہب کے سوا اور بھی کچھ ہے؟ اگر نہیں ہے تو مذہب کے قیام کے بغیر ان کی قومیت کیوں کر قائم رہے گی؟ اگر مذہب کی ضرورت ہے تو مذہبی تعلیم قدیم تعلیم کے بغیر کیوں کر ممکن

ہے؟ ان سوالات کے جواب میں یہ کہنا کہ انگریزی تعلیم کے ساتھ مذہبی تعلیم بقدر ضرورت ممکن ہے، اور اسی قدر کافی ہے، لیکن پھر سوال اٹھتا ہے کہ مذہبی امور سے متعلق مسائل کا حل اس درجہ کی تعلیم سے ہوسکتا ہے۔ قرآن و حدیث کی حفاظت، مشکل اسلامی مسائل کی تشریح، غیر مذہب والوں کے اعتراضات اور مذہبی خدمات کیا اتنی تعلیم سے ممکن ہے؟ اگر تعلیم جدید کے ساتھ کسی قدر مذہبی تعلیم ضروری ہے تو ان سوالوں کا اٹھنا ناگزیر ہے کہ اس کی ضرورت کی مقدار کیا ہے؟ اور اس کا طریقہ کیا ہے؟

ظاہر ہے انگریزی تعلیم یافتہ لوگوں سے ہم کو مذہبی خدمات کا کام نہیں لینا ہے بلکہ وہ خود بہ قدر ضرورت مسائل اسلامی اور تاریخ اسلام سے واقف ہوں۔ رہا سوال کہ قدیم تعلیم میں اصلاح کی ضرورت ہے یا نہیں اس کا جواب صاحب فکر و نظر اثبات میں دے گا لیکن بڑے بڑے علماء اب تک اس ضرورت کے قائل نہیں۔ لہٰذا ان سے چند سوالات کئے جاسکتے ہیں۔

۱۔ یورپ کے مصنفین مذہب پر جو حملے کر رہے ہیں ان سے واقف ہونے کی ضرورت ہے یا نہیں۔

۲۔ اگر علما خود ان خیالات سے واقف نہ ہوں گے تو کیا انگریزی خواں مسلمانوں میں ان خیالات کا شائع ہونا کوئی روک سکتا ہے۔

۳۔ مذہب پر عموماً مذہب اسلام پر خصوصاً جو اعتراضات یورپ کے لوگ کر رہے ہیں ان کا جواب دینا کس کا فرض ہے۔

۴۔ علما جب تک ان خیالات سے واقف نہ ہوں گے جواب کیوں کر دے سکیں گے۔

۵۔ کیا علمائے سلف نے یونانیوں کا فلسفہ نہیں سیکھا تھا اور ان کے اعتراضات کے جواب نہیں دیئے تھے۔

۶۔ اگر اس وقت زمانے کا فلسفہ سیکھنا جائز تھا تو اب کیوں جائز نہیں ہے؟

ان سوالات کا جواب یہی ہوگا کہ تعلیم قدیم کے ساتھ جدید خیالات سے آگاہ ہونے اور انگریزی علوم پڑھنے کی ضرورت ہے

قدیم تعلیم یافتہ واعظ اسلامی احکام کی تبلیغ، امامت و فتوی وغیرہ کی خدمت انجام دے سکتے ہیں۔

لیکن علماء نے جس گروہ کی جدید ضرورتوں کا اندازہ کیا ہے، اور اس کے موافق عربی تعلیم میں اصلاح واضافہ کرنا چاہتے ہیں۔ وہ ان اصولوں کے سوا اور کیا اختیار کر سکتے ہیں جو ندوہ نے اختیار کیا ہے اور جو عملی صورت میں ظاہر ہونا چاہئے۔

ہوا کا رخ دوسری طرف مشرقی کانفرنس : یہ مضمون مولانا نے ندوہ پر اعتراضات کے وقت لکھا تھا۔ اس دوران گورنمنٹ کی طرف سے شملہ میں مشرقی کانفرنس کا اعلان ہوا۔ یہ کانفرنس ایسے نامساعد حالات میں غنیمت تھی۔ شبلی اس سے بہت پر امید نظر آتے ہیں۔ مشرقی کانفرنس کے مقاصد کچھ اس طرح تھے۔

۱۔ مشرقی ومغربی تعلیم میں اتحاد پیدا کرنا۔

۲۔ علم الآثار (ارکیالوجی) کی تعلیم دینا اور جدید طریقہ تحقیقات، آثار قدیمہ سے واقف کرانا۔

۳۔ اعلیٰ طریقہ پر قدیم وقلمی کتب خانوں کی فہرست سازی، کیٹیلوکنگ کی تعلیم دینا۔

۴۔ اعلیٰ مشرقی تعلیم کے لئے بیش قرار وظائف مقرر کرنا۔

۵۔ دیسی زبانوں کو ترقی دینا اور ان کے لئے امتحانات قائم کرنا۔

۶۔ مشرقی تعلیم یافتوں کے لئے کالجوں میں پروفیسری، مدرسوں میں ٹیچری، عجائب خانوں میں تحقیقات، آثار قدیمہ اور قدیم کتب خانوں میں ترتیب فہرست کے لئے عہدے قائم کرنا۔

۷۔ کلکتہ کی مشرقی درسگاہوں کو متفق ومتحد کرنا

۸۔ افسروں کی زبان دانی کا امتحان لینا۔

۹۔ کلکتہ میں اغراض بالا کے لئے ایک عظیم الشان مشرقی درسگاہ قائم کرنا۔

مشرقی کانفرنس سے مولانا نے حسب ذیل نتائج کی توقع کی تھی۔

۱۔ گورنمنٹ کی طرف سے ایک انسپکٹر ہوگا جو قدیم عربی مدارس کا معائنہ کر سکے گا۔ اگر مدرسہ کے مہتمم ایسی نگرانی کو پسند کریں گے۔

۲۔ جن مدرسوں کو گورنمنٹ اس قابل سمجھے گی ان کو کچھ ماہوار امداد دے گی۔

۳۔ کلکتہ میں بہت بڑے اور وسیع پیمانے پر ایک مشرقی درسگاہ قائم ہوگی۔ مدارس عربیہ کے فارغ شدہ اگر چاہیں گے تو اس درسگاہ میں تعلیم حاصل کریں گے۔

۴۔ اس درس گاہ کے تعلیم پانے والوں کو بیش قرار وظیفے دیئے جائیں گے۔

۵۔ اس درس گاہ سے سبق لینے کے بعد ان کو متعدد اسامیاں مل سکیں گی جو مشرقی تحقیقات سے متعلق ہوں گی۔

۶۔ مدارس عربیہ جن کو گورنمنٹ تسلیم کرے گی اور جس کے تعلیم یافتہ کم سے کم انگریزی زبان جانتے ہوں گے ان کو کالجوں اور اسکولوں کی پروفیسری اور مدرسی مل سکے گی۔

ریاست حیدرآباد کی مشرقی یونیورسٹی : مولانا کے خیالات کے مطابق ریاست حیدرآباد کی مشرقی یونیورسٹی پنجاب یونیورسٹی کے ناقص نصاب کی تقلید کرتی رہی۔ پنجاب یونیورسٹی نے مولوی فاضل اور عالم کے جو امتحانات مقرر کئے ہیں وہ نہ دنیا کے کام کے ہیں نہ دین کے، پھر اسی کی محکومی کی گئی اور اس وقت تک آزادی کا خیال نہیں آیا جب تک خود یونیورسٹی کے طلبا کو دوسرے ممالک نے اپنے امتحانات میں شامل ہونے سے روک نہیں دیا، اور جب انھوں نے روکا تب حیدرآباد کے ارباب حل وعقدہ کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ وہاں کی یونیورسٹی کا نصاب طلبا کی ضرورتوں کے لحاظ سے تیار کیا جائے۔ نواب عماد الملک کی بہادر بلگرامی سی ایس آئی ممبر آف انڈیا کونسل اس وقت ناظم تعلیمات تھے۔ انھوں نے سرکار میں یہ تجویز پیش کی اور منظور ہوئی۔ اس کے بعد نواب صاحب نے مولانا شبلی کے نام بھی ایک خط لکھا، جس میں دارالعلوم حیدرآباد کا تعلق پنجاب یونیورسٹی سے منقطع ہونے کی طرف اشارہ کیا تھا۔ ساتھ ہی یہ بات بھی بطور خاص مذکور تھی کہ عربی و فارسی نصاب تعلیم کی غرض سے ایک کمیٹی مقرر کی جائے جو زمانہ حال کی ضرورتوں کے لحاظ سے مرتب کرے تاکہ یہاں سے کامیابی حاصل کرنے والے سرکاری خدمات ادا کرنے کے اہل قرار پائیں۔ مراسلہ میں نصاب تعلیم کی ترمیم واصلاح کے سلسلے میں جن دو باتوں پر زور دیا گیا تھا وہ یہ تھیں۔

۱۔ اصلاح نصاب موجودہ پنجاب یونیورسٹی بہ لحاظ مقتضائے وقت وزمانہ ضروریات وخدمات حکومتی۔

۲۔ تکمیل تحصیل علوم شرقیہ

جب مولانا کو یہ خط ملا وہ صاحب فراش تھے۔ صحت یاب ہونے پر وہ حیدرآباد گئے۔ اور چند روز میں ایک نصاب تیار کیا اور اس کے متعلق ایک یادداشت لکھی، جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نصاب کن اصول پر تیار کیا گیا تھا۔

نصاب تعلیم کی ترتیب کا مقصد بیان کرتے ہوئے مولانا شبلی اپنا خیال یوں ظاہر کرتے ہیں کہ دارالعلوم کا مقصد پنجاب یونیورسٹی کے علیحدہ ہونے کے بعد ایسے اشخاص پیدا کرنا ہے جو نہ صرف سرکاری دفاتر میں کام کرنے کے قائل ہوں بلکہ شرعی خدمات انجام دینے کے بھی اہل ہوں جو قدیم علوم کے ساتھ ساتھ جدید علوم وفنون سے بھی واقف ہوں۔

پھر یہ امر بھی قابل لحاظ ہے کہ موجودہ جدید تعلیم جو ہندوستان میں رائج تھی ضروریات کے اعتبار سے ناکافی تھی۔ چنانچہ نصاب تعلیم کی ترتیب کا مقصد یہ قرار پایا کہ ایک خالص ایسا سلسلہ تعلیم متعارف کرایا جائے جس کے تعلیم یافتہ گویا دونوں قسم کی تعلیم کا مجموعہ ہوں۔ ان اغراض کے لحاظ سے جو تغیر واضافہ کیا گیا تھا وہ یہ ہے۔

۱۔ ہر فن کی تعلیم کا عمدہ طریقہ یہ ہے کہ ایسی کتابیں درس میں رکھی جائیں جن میں تمام مسائل نہایت سادہ صاف اور واضح طریقے سے بیان کئے گئے ہوں تاکہ طالب علم بآسانی تمام مسائل پر حاوی ہو جائے۔

۲۔ قدیم نصاب میں اکثر ایسی کتابیں ہیں جن میں دوسرے علوم کے مسائل مخلوط کر دیئے گئے تھے اس خلط بحث کی وجہ سے طالب علم کو پریشانی کا سامنا کرنا پڑتا تھا۔ اس لئے نصاب حال میں ہر فن میں وہی کتابیں رکھی گئیں جن میں خالص اسی فن کے مسائل استیعاب کے ساتھ مذکور ہیں۔

۳۔ قرآن مجید کا حصہ نصاب حال میں بڑھا دیا گیا ہے۔

۴۔ قدیم نصاب میں ادب اور لٹریچر کا حصہ بڑھا دیا گیا ہے۔

۵۔ نصاب حال میں انشاء پردازی کے لئے خاص گھنٹے مقرر کئے گئے۔

۶۔ عقائد وعلم کلام میں صرف ایک کتاب تھی اس لئے فن میں متعدد اور بلند پایہ کتابیں نصاب میں رکھی گئیں۔

۷۔ تاریخ اسلام اور عام تاریخ کی کتاب بھی اس فن کی کتاب میں داخل کی گئیں۔

۸۔ علوم جدیدہ کی بعض کتابیں جو عربی میں ترجمہ ہوگئی ہیں نصاب میں شامل کی گئیں اور ایسے پروفیسر مقرر کئے گئے جنھوں نے بی اے میں سائنس لیا ہو اور عربی زبان ان کی سیکنڈ لینگویج رہی ہو۔

۹۔ انگریزی زبان بطور سیکنڈ لینگویج کے لازمی قرار دی گئی ہے۔ نصاب میں گنجائش کی وجہ سے انگریزی زبان دانی کی کتابیں انٹرس تک کی اس میں شامل کی جاسکتی ہیں۔ اور درجہ فاضل کے بعد دو برس اس غرض سے رکھے گئے کہ جو شخص چاہے تو ان دو برسوں میں صرف انگریزی زبان دانی کی تعلیم حاصل کرے۔

۱۰۔ مدت تعلیم ۱۹ برس سے گھٹا کر ۱۴ برس کردی گئی۔

۱۱۔ نصاب مرتبہ کی ترتیب یہ ہے کہ ابتدائی تعلیم کی مدت ۵ سال قرار دی گئی ہے اس میں اردو اور ابتدائی فارسی اور حساب اور کسی قدر انگریزی کی تعلیم ہوگی۔ اس درجہ کے بعد دو الگ شاخیں شروع ہوں گی۔ یعنی منشی اور عالم۔ طالب علم کو اختیار ہوگا کہ ان دو شاخوں میں سے جس شاخ کو چاہے اختیار کرے۔ منشی کے لئے ۳ سال اور منشی عالم کے لئے ۲ سال اور منشی فاضل کا دو سال مقرر کیا گیا ہے۔ منشی فاضل تک طالب علم کو فارسی زبان میں عمدہ مہارت اور عربی کے سوادخوانی اور انگریزی بقدر عام ضرورت آجائے گی۔ عربی کے دو درجے قرار دیئے گئے۔

عالم : اس کی مدت ۸ برس ہے اور یہ بی اے کے برابر ہے۔ اس میں تمام علوم متداولہ عربی اور بعض علوم جدیدہ اور انگریزی زبان دانی انٹرس کے درجہ تک آجائے گی۔

فاضل : اس کی مدت تعلیم دو برس ہے اور یہ درجہ ایم اے کے برابر ہے۔ اس میں کسی ایک خاص فن کی پوری

تعلیم ہوگی اور طالب علم اس خاص فن کی تکمیل کرے گا اور اسی فن کے انتساب سے موسوم ہوگا۔ مثلاً مفسر، ادیب، فقیہ وغیرہ۔ عالم یا فاضل کے درجے کے بعد انگریزی زبان میں تقریر و تحریر کا ملکہ پیدا کرنے کے لئے دو برس تک انگریزی زبان سکھائی جائے گی۔

۱۲۔ نصاب تعلیم کے نقشے سے ہر فن کی کتابیں یکجا طور پر پیش نظر نہ ہوں اس لئے ہر فن کی الگ الگ کتابیں لکھ دی گئیں۔ اس کے بعد ادب و معانی و بیان، فقہ و اصول فقہ، قرآن مجید و تفسیر، فلسفہ کلام و اسرار دین کی کتابوں کا تذکرہ ہے۔ اس نصاب سے یہ حقیقت ابھر کر سامنے آتی ہے اور شبلی نے خود اس کا اعتراف کیا ہے کہ تعلیم اسی وقت کارآمد اور سودمند ثابت ہوسکتی ہے جب قدیم و جدید تعلیم کا موزوں مرکب تیار ہو اور جس کا ایک حصہ مشرقی اور دوسرا مغربی ہو۔

احیاء علوم عربیہ اور ایک ریڈیکل : اس مضمون کا شان نزول وہ تحریک ہے جس کا منشا یہ ہے کہ علی گڑھ میں علوم عربیہ کی تعلیم کا انتظام کیا جائے۔ قومی لیڈروں نے اس تجویز کی شدید مخالفت کی۔ ارکان کالج نواب محسن الملک اور مولوی نذیر احمد نے بھی اس کی مخالفت کی اور پرزور آرٹیکل لکھے کہ ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ مسلمانوں کو انگریزی تعلیم سے ایک منٹ کے لئے بھی دوسری چیزوں کی طرف متوجہ ہونے کی اجازت دی جائے۔ ایسا ہی ایک مضمون احیاء علوم عربیہ کے عنوان سے علی گڑھ میگزین میں شائع ہوا۔ مولانا نے ایک مضمون لکھا اور اس کو ریڈیکل کے نام سے موسوم کیا۔ ریڈیکل صاحب نے اپنے مضمون میں لکھا کہ علوم عربیہ کے پڑھنے سے طبیعت میں آزادی اور دلیری نہیں پیدا ہوتی۔ یہ علوم عربیہ اس قابل نہیں کہ ان کی تعلیم پر وقت ضائع کیا جائے۔ اس کے بعد ان کا تحریر کردہ اقتباس نقل کیا ہے جس میں انھوں نے عرب کو جاہل اور وحشی قوم قرار دیا ہے۔ شبلی نے اس مضمون میں مضمون نگار کی قلعی کھولی ہے اور اس کے ایک ایک الزام کی تردید کی ہے۔ انھوں نے تحریر کیا ہے کہ جدید گروہ علم کو علم کے لئے پڑھتا ہے۔ کیا انگریزی تعلیم سرکاری ملازمت کا ذریعہ نہ رہے تو ایک شخص بھی کسی کالج کے احاطہ میں نظر آئے گا۔ اس کے بعد مولانا نے ریڈیکل صاحب کے تحریر کردہ مضمون کے تمام الزامات کا جواب نہایت دلیری، استقلال اور واضح انداز میں دیا اور آخر میں اپنا نقطہ نظر ظاہر کیا ہے اور وہ

یہ ہے کہ:

''میری ہرگز یہ رائے نہیں کہ مسلمانوں کو انگریزی تعلیم سے ہٹا کر عربی کی طرف متوجہ کیا جائے۔ ایسا کرنا بے شبہ قوم کے ساتھ دشمنی ہے۔ لیکن اس بحث میں خواہ مخواہ علوم عربیہ کی تحقیر نہایت ظلم اور ناانصافی ہے۔''

انھوں نے مزید لکھا ہے کہ:

''عربی کی تحقیر نے ثابت کر دیا کہ قوم واقعی ذلت کے آخیر درجہ پر پہنچ گئی ہے۔ کیونکہ کوئی قوم اس وقت تک ذلیل نہیں ہوتی جب تک وہ خود اپنے آپ کو ذلیل نہ سمجھے اور یہ درجہ اب قوم نے حاصل کر لیا ہے۔''[۱]

مقالات شبلی جلد چہارم (تنقیدی)

مقالات کی چوتھی جلد تنقیدی مضامین پر مشتمل ہے۔ یہ مضامین الندوہ اور دیگر رسائل سے اکٹھے کئے گئے ہیں۔ یہ مضامین اصل میں تبصرے ہیں جو مختلف کتابوں پر کئے گئے ہیں۔ اس مجموعہ میں کل ۱۷ کتابوں پر چھوٹے چھوٹے تبصرے ہیں جو مندرجہ ذیل عناوین پر مشتمل ہیں۔

۱۔ **طبقات ابن سعد** : یہ کتاب مشہور محدث ابن سعد کی تصنیف ہے جو واقدی کے شاگرد تھے۔ اس کتاب میں انھوں نے آنحضرتؐ سے لے کر اپنے زمانہ تک کے تراجم اور حالات لکھے ہیں۔ یہ کتاب ۱۲ ضخیم جلدوں میں ہے۔ لیکن تمام جلدیں آج تک دستیاب نہ ہوسکیں۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت تفصیل اور جامعیت ہے جو بعد کی کتابوں میں نہیں ملتی۔ اس کتاب میں ایک جزئی واقعہ کو بہ سند مفصل لکھا گیا ہے۔ چونکہ مصنف کا زمانہ عہد نبوت کے قریب ہے اس لئے سلسلہ روایت میں تین چار راوی سے زیادہ نہیں ہوتے۔

۱۔ مقالات شبلی جلد سوم، سید سلیمان ندوی، ص ۱۷۷

۲۔ **مناقب عمر بن عبدالعزیز** : علامہ ابن جوزی کی کتاب ''سیرۃ العمرین'' کا دوسرا حصہ ہے جس میں عمر بن عبدالعزیز کے حالات زندگی کو بڑی تفصیل سے قلم بند کیا گیا ہے۔ مولانا شبلی نے مصر میں کتب خانہ خدیو میں یہ کتاب دیکھی تھی۔ الفاروق کی تصنیف کے وقت مولانا نے اس کتاب کے پہلے حصے سے استفادہ کیا تھا۔ اس کتاب میں ۴۴ ابواب ہیں اور اسے ہر اعتبار سے سوانح عمری کہا جا سکتا ہے۔ اگرچہ موجودہ زمانے کی سوانح عمری کے اصول پر یہ کتاب پوری نہیں اترتی۔ اس کتاب کا سب سے بڑا نقص یہ ہے کہ اس میں مصنف نے صرف اپنے ہیرو کی خوبیاں گنائی ہیں۔ اس کے کسی قول و فعل پر کسی قسم کی کوئی تنقید نہیں کی گئی ہے۔ دوسری خامی یہ ہے کہ صحیح اور ثابت شدہ واقعات کے ساتھ لغو اور دور از کار قصے بھی منقول ہیں جن کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔ اس سے متعلق عبدالرحیم صاحب رقم طراز ہیں:

> ''علامہ ابن جوزی نے اس کتاب میں حضرت عمر بن عبدالعزیز کے ان حالات کو جو خاص امور سلطنت سے متعلق تھے قلم انداز کر دیا ہے، اور صرف انہی باتوں کو لیا ہے جو زیادہ تر ان کے اخلاق و عادات اور عدل و انصاف سے علاقہ رکھتی ہیں۔ مولانا شبلی نے چند واقعات بطور مثال پیش کئے ہیں۔ ان واقعات سے عمر بن عبدالعزیز کے عدل و انصاف بے غرضی، بے تعصبی، مستقل مزاجی، ارادے کا استحکام، اسلام سے بے ریا محبت، حق گوئی اور بے باکی واضح ہوتی ہے۔''[۱]

۳۔ **بلاغات النساء** : یہ کتاب احمد بن ابی طاہر بغدادی کی تصنیف ہے جو تیسری صدی ہجری میں لکھی گئی۔ دو سو صفحات پر مشتمل یہ کتاب مصر میں شائع ہوئی تھی۔ اس کتاب کا سب سے پہلا حصہ حضرت عائشہؓ کا ہے۔ پھر حضرت فاطمہؓ، زینبؓ اور ام کلثومؓ کے خطبے ہیں۔ ان کے بعد مصنف نے ان عورتوں کے خطبے نقل کئے ہیں جو حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کے معرکہ میں شریک تھیں۔ ان خطبوں کے ساتھ ان کے متعلق

۱۔ مقالات شبلی کا تنقیدی جائزہ، عبدالرحیم، ص ۱۰۸

مزید حالات بیان کئے ہیں۔

۴۔ **یورپ کا ایک اور علمی احسان۔عمر خیام کا جبر و مقابلہ** : عمر خیال کو لوگ ایک شاعر اور رباعی گو کی حیثیت سے جانتے تھے۔پہلی بار علامہ شبلی نے انہیں ریاضی داں کی حیثیت سے بھی متعارف کرایا۔پیرس میں ایک کتاب شائع ہوئی تھی علامہ نے اسی سے استفادہ کر کے یہ بتلایا کہ خیام صرف شاعر ہی نہیں بلکہ جبر ومقابلہ کا بھی ماہر تھا اور کئی قاعدے اس نے خود ایجاد کئے۔

۵۔ **تجارب الامم ابن مسکویہ (گب موریل سیریز)** : مشہور حکیم اور فلاسفر علامہ ابن مسکویہ اس کتاب کے مصنف ہیں۔زیر نظر مضمون تجارب الامم پر تبصرہ ہے۔شبلی نے یہاں صرف سیریز کا ذکر کیا ہے۔گب ایک رئیس انگریز تھا جس نے لاکھوں روپیہ خرچ کر کے عربی و فارسی کی نایاب و نادر تصانیف کو شائع کروایا۔مشرق میں علوم کی دو قسمیں ہیں۔معقول ومنقول۔ابن مسکویہ کی یہ تصنیف منقول کے زمرے میں آتی ہے۔انھوں نے پہلی بار تاریخ کو ایک فلسفی کی نظر سے دیکھا ہے۔ابن مسکویہ نے اس بات پر تاسف کا اظہار کرتے ہوئے بتایا کہ تاریخ کا فن اپنے اصلی مرکز سے ہٹ گیا ہے اور لوگوں کا خیال عموماً ان واقعات کی طرف جاتا ہے جو علت ومعلول کا سلسلہ قائم کرتے ہیں۔ابن مسکویہ نے اپنی کتاب میں اسی مقصد کو پیش نظر رکھا ہے۔اور جو واقعات اس کسوٹی پر پورے نہیں اترتے ان کو اس نے نظر انداز کر دیا ہے۔یہاں تک کہ اس کے نزدیک انبیاء کے معجزات بھی قابل اعتنا نہیں ٹھہرے۔کیوں کہ ان سے علت ومعلول کا سلسلہ قائم نہیں ہوتا۔

ابن مسکویہ کو سب سے زیادہ شکایت ایران کی تاریخ سے ہے جہاں حقیقی واقعات کم اور افسانوی اور توہمی واقعات زیادہ ہیں۔مثلاً ضحاک کی نسبت مشہور ہے کہ اس کے کاندھے پر دو سانپ تھے جن کی غذا آدمی کا دماغ تھا۔طہورت کی نسبت مشہور ہے کہ شیطان اور جن اس کے قبضے میں تھے۔ابن مسکویہ نے اس کی تردید کی اور اصل واقعہ بتایا ہے۔

ابن مسکویہ کی تاریخ کی سب سے بڑی خامی یہ ہے کہ آنحضرتؐ اور خلفائے راشدین کے حالات

نہایت ناتمام اور جستہ جستہ لکھے ہیں اور معذرت کی ہے کہ میری کتاب کا مقصد ایسے حالات بیان کرنا ہے جو ظاہری اسباب سے تعلق رکھتے ہیں۔ ابن مسکویہ کے اس خیال سے اختلاف کی بڑی گنجائش ہے اور شبلی نے جابجا اختلاف بھی کیا ہے۔

۶۔ **لغت فرس اسدی طوسی** : عام طور پر لوگوں کا خیال ہے کہ اسدی طوسی فردوسی کا استاد تھا لیکن مولانا شبلی نے اس خیال کی تردید کی ہے۔ ان کے خیال کے مطابق وہ مشہور شاعر فارسی لغت کا سب سے پہلا مدون تھا۔ لغت فرس اس کی تدوین ہے۔ یورپ کے مشہور مستشرق پاول ہارن نے آٹھ سال تک اس کتاب کی تصحیح وتحشیہ میں صرف کیا ہے۔ ۱۸۹۷ء میں ان کو شائع کیا۔ مصنف نے لغت میں شعر کی سند کا بھی التزام کیا ہے جس کی وجہ سے بہت سے قدماء کا کلام محفوظ ہو گیا ہے۔ اس زمانے میں شعراء کے کلام سے اس عہد کی ہزالی اور محسن گوئی کا اندازہ ہوتا ہے۔ مولانا شبلی لکھتے ہیں:

> ''اس کتاب سے معلوم ہوا کہ یہ بلا اسی زمانہ میں پیدا ہو چکی تھی۔ لبیبی جو اس زمانہ کا ممتاز شاعر ہے جعفر زٹلی سے ذرہ بھر کم نہیں۔ یوشکور اور منجیک بھی اکثر فحش کہتے ہیں۔'' [۱]

۷۔ **الملل والنحل اور ابن حزم ظاہری** : یہ ابن حزم کی کتاب ہے۔ مولانا شبلی اس کتاب پر کچھ لکھنا چاہتے تھے لیکن انھوں نے پہلے مختصراً ان کے حالات زندگی سے بحث کی ہے۔ اس کے بعد اس کتاب سے متعلق بحث کی ہے کہ اس میں مصنف نے فلاسفہ، ملاحدہ، مادین، یہود، نصاریٰ غرض اکثر اہل مذاہب کے عقائد و خیالات نقل کئے ہیں اور ان کا رد لکھا ہے۔ اور اس کی تردید نہایت تحقیق کے ساتھ کی ہے۔ غیر مذاہب کے ابطال کے بعد مصنف نے خود اسلامی عقائد سے بحث کی ہے اور ہر فرقہ کے ان مسائل کو رد کیا ہے جو ان کے نزدیک غلط اور باطل ہے۔

علامہ شبلی کے مطابق فلسفۂ حال کے مسائل میں سب سے زیادہ مسئلہ مسلم الثبوت مانا جاتا ہے۔

۱۔ مقالات شبلی، جلد چہارم، مرتب سید سلیمان ندوی، ص ۳۲

قانون قدرت کا مسئلہ ہے اور کچھ شبہ نہیں کہ اس سے زیادہ کوئی چیز قطعی اور یقینی نہیں لیکن عام خیال یہ پھیلا ہوا ہے کہ یہ مسئلہ زمانہ حال کی تحقیقات میں سے ہے۔ قدیم لٹریچر میں یہ اصلاح موجود نہیں۔ لیکن یہ خیال تمام تر غلط ہے۔ فلاسفہ اسلام تو عموماً اس کے قائل تھے۔ فقہا اور محدثین میں بھی اشاعرہ کے سوا اس کا کوئی منکر نہیں۔ ابن تیمیہ نے اپنی تصنیفات میں نہایت تصریح سے اس کو لکھا ہے۔ علامہ ابن حزم نے اس بحث پر ایک مستقل عنوان قائم کیا ہے۔

ان کے قول کو مولانا شبلی نے اس مضمون میں رقم کیا ہے۔ اس کے علاوہ اس کتاب میں بعض خیالات بالکل جدید ہیں۔ مثلاً یہ بحث کہ کیا عورتیں پیغمبر ہو سکتی ہیں؟ کیا عورتوں کا درجہ مردوں سے کم ہے؟ علامہ ابن حزم کا خیال ہے کہ عورتیں پیغمبر ہو سکتی ہیں اور ان کا درجہ مردوں سے کسی طرح کم نہیں۔ انھوں نے یہ باتیں یونہی نہیں کہی ہیں بلکہ اس کے دلائل بھی دیئے ہیں۔

۸۔ **تفسیر کبیر امام رازی پر ریویو** : تفسیر کبیر امام رازی کا عظیم کارنامہ ہے۔ یہ تفسیر غالباً ۵۹۵ء سے کچھ پہلے شروع ہوئی۔ اس تفسیر کا زمانہ تصنیف کم و بیش آٹھ سال ہے۔ امام رازی اپنی اس کتاب کی تکمیل خود نہ کر سکے۔ ان کی وفات کے بعد ایک فاضل نے بقیہ جلدیں تمام کیں۔ لیکن پوری تفسیر امام صاحب کے نام سے ہی مشہور ہے۔ اکثر لوگوں کو اس واقعہ کا سرے سے علم ہی نہیں ہے اور ہے بھی تو یہ نہیں معلوم کہ تکملہ لکھنے والے کون بزرگ تھے۔ شبلی لکھتے ہیں کہ انھوں نے اس طرز کو اس کمال تک پہنچایا اور خود گم ہو گئے کہ آج دنیا ان کی تحریر کو اما رازی کی تحریر سمجھ رہی ہے۔ امام رازی نے تفسیر کہاں تک لکھی اور تکملہ نگار نے کہاں سے شروع کیا اس میں اختلاف ہے۔ بعض شہادتوں سے پتہ چلتا ہے کہ سات جلدیں امام رازی نے خود تصنیف کیں۔ یہ زمانہ بہت پریشانی اور بے سروسامانی میں گزرا۔ سلطنت کی برہمی، طوائف الملوکی، خانہ جنگی اور عزیز و جوان فرزند محمد کی وفات نے ان کی زندگی کو آزمائش میں ڈال دیا تھا۔ پھر بھی وہ تصنیف و تالیف سے بے نیاز نہیں ہوئے۔ وہ روزانہ کم و بیش بیس صفحات لکھتے تھے۔ ساتھ ہی درس و تدریس افتاء وعظ و پند وغیرہ کا کام بھی جاری رکھتے۔ امام رازی سے پہلے جتنی تفسیریں لکھی گئی ہیں وہ خاص خاص موضوع پر

تھیں لیکن تفسیر کبیر کا امتیاز یہ ہے کہ اس میں تمام موضوعات سموئے گئے ہیں۔اس سے کتاب کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

اس کتاب کی تصنیف کے وقت قدماء کی کتابوں میں ابو مسلم اصفہانی کی کتاب اور کعبی کی تفسیر سے استفادہ کیا ہے۔امام صاحب نے محدثین کی تفسیر سے بہت کم فائدہ اٹھایا۔

۹۔ **یادگار سلف کتاب الکافی فی الکحل** : شبلی کو یہ کتاب حکیم اجمل خاں کے کتب خانہ میں عربی زبان میں آنکھ کے امراض وتشریح سے متعلق ملی تھی۔ یہ کتاب چار سو صفحات پر مشتمل ہے۔اس کے مصنف کا نام ہارون بن حکیم موفق الدولہ ابی الحسن الحلبی ہے۔دیباچہ سے پتہ چلتا ہے کہ اس فن پر پہلے بھی کثرت سے کتابیں لکھی جا چکی تھیں۔مصنف نے ایسی ۱۸ کتابوں کے نام گنوائے ہیں جو خاص امراض چشم سے متعلق ہیں۔اس کتاب کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس وقت تک جو آلات ایجاد ہو چکے تھے نام، طریقہ عمل سب اس کتاب میں دے دیا گیا ہے۔اسی سے اندازہ ہوتا ہے کہ آنکھ سے متعلق علاج اس وقت کس قدر ترقی کر چکا تھا۔

۱۰۔ **ہمایوں نامہ از گلبدن بیگم** : یہ کتاب گلبدن بیگم کی تصنیف ہے جو بابر کی بیٹی، ہمایوں کی بہن اور شہنشاہ اکبر کی پھوپھی تھی۔انھوں نے بابر اور ہمایوں کے حالات میں بھی ایک کتاب لکھی تھی اور اس کا نام ہمایوں نامہ رکھا۔یہ کتاب چونکہ ایک خواتین کی لکھی ہوئی تھی اس لئے اس کی اشاعت کے لئے ایک خاتون ہی کا انتخاب کیا گیا جس کا نام لیڈی انیٹ ایس بیورج تھا۔لیڈی موصوف نے اس کتاب کی جستجو میں بہت جانفشانیاں کیں اور چند اضافوں کے بعد اس کتاب کو شائع کیا۔اس میں انھوں نے گلبدن بیگم کی مفصل سوانح عمری بھی لکھی۔کتاب کا انگریزی ترجمہ کیا۔ترکی الفاظ کی تحقیق کی اور ان کو حل کیا۔کتاب میں مذکور سیکڑوں شاہی بیگمات کے حالات لکھے اور ان کی مفصل فہرست لکھی۔یہ کتاب ۱۹۰۲ء میں لندن سے شائع ہوئی۔

گلبدن بیگم تاریخ نویسی سے بہت کچھ واقفیت رکھتی تھی۔انھوں نے جو واقعات لکھے ہیں بہت محتاط انداز میں لکھے ہیں۔تاریخ کا سب سے بڑا کمال یہ ہے کہ اس کے مطالعے سے ہمیں کسی زمانے کے

حالات جنگ وواقعات ہی کا علم نہ ہو بلکہ اس زمانے کی معاشرتی اور خانگی زندگی کی پوری تصویر بھی آنکھوں کے سامنے پھر جائے۔ شبلی نے عہد اکبری کی تہذیب و معاشرت کی تصویر ہمایوں کے حوالے سے پیش کی ہے جس میں انھوں نے ذکر کیا ہے کہ اس زمانے میں عورتوں کو کافی عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ انھیں ہر طرح کی آزادی تھی اور ہر چیز میں مہارت رکھتی تھیں۔

گلبدن بیگم نے اس زمانہ کے آداب معاشرت اور خانگی زندگی کی تصویر ہی نہیں کھینچی بلکہ ملکی اور سیاسی واقعات بھی قلم بند کئے اور اختصار کو ملحوظ رکھا۔ شبلی لکھتے ہیں:

> ''گلبدن بیگم اس بات سے بخوبی واقف ہے کہ کس واقعہ کو سمیٹ کر کس واقعہ کو پھیلا کر لکھنا چاہئے۔ وہ خوب جانتی ہے کہ کون سا واقعہ کیا اثر رکھتا ہے اور اس کے لئے اس کے اسباب وعلل سے کہاں تک بحث کرنی چاہئے۔''[۱]

آخر میں شبلی نے اس انگریز خاتون کی تعریف کی ہے جس کی کوشش سے یہ کتاب منظر عام پر آئی اور جو ہماری قوم کے مردوں سے بھی بن نہیں آئی۔

۱۱۔ مآثر رحیمی اور عبدالرحیم خان خاناں : یہ عبدالباقی کی تصنیف ہے۔ اس کا نسخہ شبلی کو کلکتہ میں ایشیاٹک سوسائٹی میں نظر آیا جو مصنف کا اصلی مسودہ ہے۔ جس کو کسی کاتب سے لکھوایا گیا ہے لیکن الماقات اور اضافے مصنف کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں۔ دوسو صفحات پر مشتمل یہ کتاب نصف کے قریب خانخاناں کے اسلاف اور سلاطین تیموری کے حالات کے لیے وقف ہے۔ باقی خانخاناں کے حالات سے متعلق ہے جس میں خانخاناں کی فتوحات معرکہ جنگ، تعلیم و تربیت، فضائل اخلاق، علمی لیاقت، انشا پردازی، شاعری، نثر ونظم، سپہ گیری، تیغ زنی، نیزہ بازی اور دربار شاہی سے تعلقات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مختلف زبانوں پر ان کی دسترس اور ان کی فیاضیوں کا بھی ذکر ہے۔ ان کی فیاضی کا مقصد ادب وانشا کی ترقی تھا۔ وہ صرف شعراء کے ساتھ فیاضانہ سلوک ہی نہیں کرتا تھا بلکہ ان کے کلام پر تنقید واصلاح بھی کرتا تھا جس کی

۱۔ مقالات شبلی، جلد چہارم، مرتب سید سلیمان ندوی، ص ۶۴

وجہ سے شاعری کو فروغ حاصل ہوا۔ اس کی فیاضی کا نادر و نایاب ثبوت اس کا کتب خانہ ہے جس کی حیثیت دارالحکمت کی ہے۔

شعر و ادب کے علاوہ خانخاناں کو صنعت و زراعت سے بھی دلچسپی تھی۔ مصنف نے شعرائے دربار کا تذکرہ اور کلام کا انتخاب حالات زندگی کے ساتھ تفصیل سے کیا ہے۔ عبدالرحیم خانخاناں ذاتی ہنر میں طاق اور مجسم اخلاق تھا۔ مصنف نے خانخاناں کی زندگی کے کئی واقعات قلم بند کئے ہیں جن سے اس کے حسن اخلاق پر روشنی پڑتی ہے۔ شبلی آخر میں اس کتاب سے متعلق رقم طراز ہیں:

''اس کتاب (مآثر رحیمی) میں تمام خوبیوں کے ساتھ یہ بہت بڑا عیب ہے کہ خانخاناں کی خوبیاں ہی خوبیاں گنائی گئی ہیں۔ نکتہ چینی کا نام نہیں۔''[۱]

۱۲۔ **جہانگیر اور تزک جہانگیری** : یہ کتاب جہانگیر کا روزنامچہ ہے۔ اس میں اس کے تمام واقعات و حالات اور مشغولیات کا ذکر تفصیل سے ہے۔ اس کتاب کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں واقعات صحیح اور سچے بیان ہوئے ہیں۔ دوسری خصوصیت زبان و بیان کی ہے۔ اس میں ہر قسم کے واقعات کو انتہائی سادگی، صفائی اور بے تکلفی سے ادا کر دیا گیا ہے۔

تزک جہانگیری میں جہانگیر کی قدرت زبان کے ساتھ مہمات ملکی کی طرف اس کی توجہ جغرافیائی تحقیقات، علم الحیوانات اور مصوری سے دلچسپی، تحقیقات اشیاء، سپہ گری کے مذاق، رعایا کی خبر گیری، دادرسی، علما اور فقرا کی قدر دانی، ہندوؤں سے تعلقات کا ذکر بہت دلکش طریقے سے کیا ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ کے بعد جہانگیر کو سمجھنے کے لئے کسی اور کتاب کی ضرورت نہیں۔ ہندوؤں کے ساتھ اس کی پالیسی پر تبصرہ کرتے ہوئے سید صباح الدین عبدالرحمٰن رقم طراز ہیں:

''ان کی یہ بات آج بھی قابل غور ہے کہ اکبر اور جہانگیر دونوں اس بات پر متفق تھے کہ ہندو اور مسلمانوں کے حقوق یکساں ہیں اور دونوں پر یکساں

۱۔ مقالات شبلی، جلد چہارم، مرتب سید سلیمان ندوی، ص ۸۱

حکومت کرنا فرض سلطنت ہے۔لیکن اکبر کا خیال تھا کہ اس مقصد کے لئے مذہبی جوش واثر کا رنگ ہلکا کرنا ضرور ہے۔ جہانگیر سمجھتا تھا کہ پکا مسلمان، پکا دین دار رہ کر بھی غیر مذہب والوں کو مسلمانوں کے برابر حقوق دے سکتے ہیں۔ پھر کیسے پیارے انداز میں مولانا بھی لکھ گئے ہیں کہ ہندورانیاں مغلوں کے حرم میں داخل ہوتیں تو ان کی رواداری کے برتاؤ سے یہ تیموریوں کی عزیز ترین بیویاں اور محبوب سے محبوب ترمائیں بن گئیں۔'' [۱]

۱۳۔ **النظر فی السفر الی المؤتمر** : یہ احمد زکی آفندی کا ایک سفرنامہ ہے جو مصر کا ایک تعلیم یافتہ نوجوان مشہور مصنف اور خدیو کے محکمۂ ترجمہ کا رئیس المترجمین تھا۔اس سفرنامہ کو اس نے یورپ کی مشرقی کانفرنس کے نویں جلسہ جو ۱۸۹۲ء میں لندن میں ہوا تھا اس میں شرکت سے واپسی پر قلم بند کیا تھا۔مولانا شبلی کو اس سفرنامے میں جو سب سے بڑی خامی نظر آئی وہ تھی کہ وہ یورپ کے طرز تحریر سے متاثر تھی۔ وہ لکھتے ہیں:

''بے شبہ بہت سی ایسی زبانیں ہیں جو یورپ کی تقلید کی وجہ سے ترقی کے سانچہ میں ڈھلی ہیں اور خصوصاً ہماری اردو میں تو جو کچھ آب وتاب رنگینی و لطافت جوش واثر پیدا ہوا ہے سب انگریزی کی بدولت ہے۔لیکن عربی کی حالت مختلف ہے۔اس کا اسلوب بیان اور طرز ادا انگریزی سے اس قدر مختلف ہے کہ دونوں کا پیوند بدنما ہو جاتا ہے۔'' [۲]

مصنف نے اس سفرنامے میں کچھ مخصوص ممالک کا ذکر اور ان کے حالات بھی قلم بند کئے ہیں لیکن اصل موضوع یورپ کی مشرقی کانفرنس پر بہت کم لکھا ہے۔ جو لکھا ہے وہ بھی اس کانفرنس کے رتبہ کے شایان شان نہیں۔شبلی سفرنامے کی خصوصیات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

۱۔ مولانا شبلی نعمانی پر ایک نظر، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ص ۵۸

۲۔ مقالات شبلی، جلد چہارم، ص ۱۱۷

''مصنف اگر چہ یورپ کے ملکوں کا ذکر کرتا ہے لیکن ساتھ ساتھ ہر موقع پر اسلامی معلومات کے دلچسپ نکتے ایسے تناسب اور موزونی سے بیان کرتا جاتا ہے، جس سے اس کے لٹریچر اور وسعت نظر دونوں کا کمال ثابت ہوتا ہے.....مصنف ہر موقع پر ان اسباب کی تلاش کرتا ہے جس کی وجہ سے یورپ کو آج یہ ترقی نصیب ہوئی۔'' [۱]

پیرس کی تعریف میں مصنف کی رطب اللسانی حد درجہ پر جوش ہے۔ اور وہ ان کے بارے میں کہتا ہے کہ وہ بہشتوں کی بہشت ہی نہیں بلکہ وہ پیرس ہے۔ مصنف فرانس کی عورتوں کی حالت پر تعجب کا اظہار کرتا ہے اور ساتھ ہی تحسین آفرین کلمات سے بھی نوازتا ہے۔ اس کے بعد مصنف نے متعدد عناوین قائم کئے ہیں۔ مثلاً عجائب خانے، کارخانے، کتب خانے، عبادت گاہیں، مذہبی عمارتیں، نباتات کا باغ، مدارس اور خیراتی کارخانے، تھیٹر وغیرہ۔ مصنف نے پیرس کے صرف دو تین مدرسوں کا ذکر کیا ہے جس میں اندھوں اور گونگوں کے مدرسوں کو گفتگو کا خاص موضوع بنایا ہے۔ آخر میں مصنف لکھتا ہے:

''اگر چہ عرب اس ملک میں نہیں ہے لیکن ان کی یادگاریں ہر جگہ موجود ہیں۔ ملک میں جو قوانین اور انتظامات رائج ہیں ان میں اسلامی قوانین کی جھلکیاں ملتی ہیں۔ یہاں تک کہ لوگوں کے اخلاق و عادات میں عرب کے اخلاق و عادات کی جھلک پائی جاتی ہے۔ تمام یورپ کے برخلاف یہاں کے لوگ بیگانہ نواز اور مہمان پرست ہیں۔ یہ لوگ اجنبی آدمیوں کے ساتھ نہایت اخلاق سے پیش آتے ہیں اور ہر کام میں اس کی اعانت کرتے ہیں۔'' [۲]

۲۔ مقالات شبلی، جلد چہارم، ص ۱۱۸

۲۔ ایضاً، ص ۱۲۶

۱۴۔ **تلفیق الاخبار پر ریویو** : اس مضمون کے آغاز میں شبلی تحریر کرتے ہیں یہ ایک ضخیم کتاب خاص ترک و تاتار کی تاریخ میں ہے جو ایک روسی مسلمان کی تصنیف ہے۔ مصنف کا نام م م رمزی درج ہے جو ایک تاتاری ترک ہے اور قومیت کے نشہ میں چور ہے۔ یہ کتاب ترک و تاتار کی پہلی مفصل تاریخ ہے۔ مصنف نے سیکڑوں کتابوں سے استفادہ کر کے کافی تلاش و تحقیق کے بعد یہ کتاب لکھی ہے۔ اس کتاب میں مصنف نے یورپ کے ایک خاص مقصد کا جواب دیا ہے۔ وہ مقصد یہ ہے کہ ترکوں نے دنیا کے تمدن کو برباد کر دیا۔ بلاشبہ انھوں نے بڑی بڑی فتوحات حاصل کیں لیکن عرب نے جس تمدن کی بنیاد ڈالی تھی، ترکوں نے اس کو ویران کر دیا۔ مولانا شبلی لکھتے ہیں کہ:

> ''میں مدت سے یورپ کی اس غلط بیانی پر حیرت زدہ تھا۔ میرے سامنے ترکوں کے سیکڑوں علمی کارنامے موجود تھے۔ لیکن چونکہ مصنفین حال کے زمرہ میں مجھ کو کوئی اور ہم نوا نہیں ملتا تھا اس لئے زبان کھولنے کی جرأت نہیں ہوئی۔ لیکن کتاب زیر ریویو کے مصنف نے نہایت دلیری سے یورپ کی غلط بیانیوں کا پردہ فاش کیا۔'' [۱]

مصنف نے ترکوں کی ابتدائی زندگی ان کے مسکن اور قبائلی زندگی کے حالات تفصیل سے بیان کئے ہیں۔ اس کے بعد اختصار سے یلغاری رات کا ذکر کیا ہے۔ عام طور سے یہ مشہور ہے کہ یلغار میں رات اس قدر چھوٹی ہے کہ آفتاب کے غروب و طلوع میں صرف آدھے گھنٹے کا فرق ہوتا ہے۔ اس لئے وہاں عشاء کی نماز نہیں ہوتی۔ لیکن مصنف نے ثابت کیا ہے کہ یہ محض مبالغہ ہے۔

۱۵۔ **تمدن اسلام مصنفہ جرجی زیدان کی پردہ دری** : جرجی زیدان ایک عیسائی مصنف تھا جس نے یہ کتاب چار حصوں میں تقسیم کی اور مسلمانوں کی تہذیب و تمدن کی تاریخ لکھی۔ اس کتاب میں مصنف نے در پردہ مسلمانوں پر نہایت سخت اور متعصّبانہ حملے کئے ہیں۔ ہر چند کہ بظاہر مسلمانوں کی تعریف کی ہے جس

۱۔ مقالات شبلی، جلد چہارم، ص ۱۲۹

کی وجہ سے اس کی فریب کاریوں کی طرف کسی کا دھیان نہیں گیا۔ اور اس کتاب کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ شبلی نے اس مقالے میں انہی کے ریویو کے ذریعہ فریب کاریوں کا پردہ فاش کیا ہے۔ سب سے پہلے انھوں نے مصنف کے اصل مقصد کا سراغ لگانے کی کوشش کی ہے۔ اس سلسلہ میں علامہ شبلی نے جو کچھ لکھا ہے اس کی مندرجہ ذیل عنوانات ہیں:

۱۔ عرب کی تحقیر اور ان کی مذمت ۲۔ خلفائے (بنوامیہ و عباسیہ) مذہب کی توہین کرتے تھے۔
۳۔ مسلمانوں پر عام اعتراضات

مصنف نے ان اغراض کو حاصل کرنے کے لئے جو طریقے اختیار کئے ان کی تفصیل شبلی نے ان پر تبصرہ ان عناوین کے تحت کیا ہے۔

۱۔ صریح کذب و دروغ ۲۔ روایات کی نقل میں خیانت و تحریف ۳۔ کسی صحیح واقعہ میں اپنی طرف سے ایسا اضافہ کر دینا کہ واقعہ کی صورت بدل جائے۔ ۴۔ غلط اشتباط اور استدلال

اس کے بعد علامہ شبلی نے مصنف کے مقاصد کو کسی قدر تفصیل سے بیان کیا ہے۔ جس میں علامہ شبلی نے عام عرب کی نسبت سے مصنف کا یہ قول نقل کیا ہے کہ وہ غیر عرب کو حقیر اور ذلیل گردانتے تھے اور ان کے پیچھے نماز پڑھنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔ اس کے علاوہ خلفاء کا کعبہ اور شعائر اسلام کی توہین کرنا، کے ذیلی عنوان کے تحت لکھتے ہیں کہ خلفائے عباسیہ کی نسبت یہ ثابت کیا ہے کہ ان کے زمانہ میں عرب اس قدر حقیر کر دیئے گئے تھے کہ عرب کا لفظ سب سے بدتر لفظ خیال کیا جاتا تھا۔ شبلی کے نزدیک مصنف نے سچائی اور ایمانداری سے کام نہیں لیا اور متعصّبانہ طور پر تمام واقعات کو توڑ مروڑ کر غلط انداز میں پیش کیا ہے تاکہ اسلام کی شبیہ کو خراب کر سکے۔

صریح جھوٹ کے ذیلی عنوان کے تحت ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ مصنف نے تمدن اسلام کے حصہ دوم میں ''عصر بنی امیہ'' ایک عنوان قائم کیا ہے جس کے ذیل میں بنوامیہ اور عمال بنوامیہ کے تمام مظالم ترتیب وار گنائے ہیں۔ اس کے علاوہ انھوں نے مصنف کی خیانت، بنی امیہ، مذہب کی توہین،

بنوامیہ کا ظلم، رعایا پر ظلم، جزیہ کے متعلق ظلم، دولت عباسیہ ان سبھی ذیلی عنوانات کے تحت مصنف کے خیال کی تردید کرتے ہوئے تنقیدی بحث کی ہے۔ اس بحث میں تاریخ نویسی کا منصب تو مجروح ہوتا ہی ہے ساتھ ہی مصنف کی عصبیت بھی اجاگر ہوتی ہے۔ بنوامیہ کے پردے میں مصنف نے قرن اول کے عام مسلمانوں کی ہر قسم کی برائیاں ثابت کی ہیں۔ اس کے اس اسلوب نے اس کتاب کو تاریخی پایہ سے بھی اور مصنف کو مورخ کے منصب سے گرادیا ہے۔ مولانا شبلی نے اردو اور عربی دونوں زبانوں میں اس پر ریویو لکھی ہے۔ اس سے جرجی زیدان کو جو زخم پہنچا اس سے وہ مسلمانوں کے حلقہ میں کبھی اچھی نظر سے نہیں دیکھا گیا۔ ساتھ ہی شبلی ان ہی مضامین میں یہ بات بھی تسلیم کرتے ہیں کہ یورپ کو آج ہمارے عوام کے ساتھ جو اعتنا ہے اور جس طرح وہ ہمارے قدیم خزانہ کے بیش بہا نوادر ڈھونڈھ کر پیدا کر رہا ہے، ہم خود نہیں کرتے بلکہ نہیں کر سکتے۔

۱۶۔ **معرکہ مذہب و سائنس (مترجم مسٹر ظفر علی خاں، بی اے پر ریویو)** : امریکہ کے مشہور عالم اور نیویارک یونیورسٹی کے مشہور پروفیسر ڈاکٹر ڈریپر کا یہ مضمون ترجمہ سے تعلق رکھتا ہے۔ یہ ریویو مصنف کے دور آخر کی تصنیف ہے۔ مولانا شبلی نے مترجم اور ترجمہ کے بارے میں تعارف کراتے ہوئے تحریر کیا ہے:

> ''مترجم صاحب مشہور مترجم ہیں۔ ان کی کتاب ''ضیابان فارس'' متداول ہو چکی ہے۔ دکن ریویو نے بھی ان کو کچھ کم روشناس نہیں کیا ہے۔ ترجمہ کی خوبی پر میں کچھ رائے نہیں دے سکتا کیوں کہ میں انگریزی نہیں جانتا۔ اس لئے ترجمہ کی صحت اور غلطی کا فیصلہ نہیں کر سکتا۔ البتہ اس قدر کہہ سکتا ہوں کہ کسی علمی کتاب کا ترجمہ اس سے زیادہ صاف اور قریب الفہم نہیں ہو سکتا۔'' [۱]

مولانا شبلی نے موضوع کتاب کے زیر عنوان کے تحت بحث کی ہے۔ مصنف نے اس مضمون میں تحریر کیا ہے کہ مذہب اور سائنس کی معرکہ آرائی ازل سے رہی ہے جس کی وجہ سے یہ مضمون کافی دلچسپ رہا

۱۔ مقالات شبلی، جلد چہارم، ص ۱۷۸۔۱۷۹

ہے۔لیکن مصنف نے ایک عام موضوع کوتصنیف کی طرف موڑ دیا ہے اور جہاں کہیں مذہب سے بحث کی ہے صرف عیسائی اور اسلام مذہب سے سروکار رکھا ہے۔ جبکہ عیسائیت کے علاوہ اور بھی مذاہب ہیں لیکن دلچسپی کی بات تو یہ ہے کہ ڈریپر صاحب نے اسلام کو عیسائیت کی ایک شاخ قرار دیا ہے۔اس سلسلے میں شبلی نے ڈریپر کا ایک اقتباس بھی نقل کیا ہے۔اس کے علاوہ اس کتاب میں ڈریپر صاحب نے مسلمانوں کے علمی ایجادات اکتشافات کی ذکر بھی تفصیل سے کیا ہے۔ان کے نزدیک مسلمانوں کے علوم وفنون انہی عیسائی اصول کے نتائج ہیں جو بحیرا نے تعلیم دی تھی۔مسلمانوں کو اپنی خالص توحید پر بڑا ناز ہے لیکن ڈریپر صاحب کے بتانے سے معلوم ہوا کہ وہ بھی بحیرا کا فیض تعلیم ہے۔اس طرح مسلمانوں کی تمام علمی کاوشیں مصنف کے قلم کی ایک ہی جنبش سے نسطوی مذہب کا فیض قرار پائیں۔مصنف نے اسلامی فتوحات کے ذکر میں کتب خانہ اسکندریہ کے جلائے جانے کا ذکر بھی کیا ہے۔اس کے علاوہ مصنف نے مسلمانوں کے عقائد،مسائل علوم وفنون،صنائع ہنر سے بحث کی ہے اوران سے اپنی واقفیت بھی دکھائی ہے۔لیکن شبلی کے بقول جگہ جگہ اس کی اصلی فطرت کی جھلک بھی نظر آجاتی ہے۔مصنف کی کتاب کا بہترین حصہ وہ ہے جس میں ان تمام علمی مسائل کو الگ الگ بیان کیا ہے۔جو مذاہب کے مخالف خیال کئے جاتے تھے اس پر انھوں نے تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔آخر میں علامہ شبلی فخر وانبساط کے ساتھ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ:

> ''اسلام نے کبھی حکماء اور فلاسفہ کو نقصان نہیں پہنچایا۔فارابی،کندی،بوعلی سینا، نوبخت،بہمینار،ابن مسکویہ،بیرونی،ابوبکر رازی،خیام ٹھیٹ حکیم تھے اور فلسفی تھے لیکن ان میں کسی شخص کو انکویزیشن کی کی عدالت میں نہیں جانا پڑا۔نہ وہ زندہ جلائے گئے نہ شکنجے میں کسے گئے اور نہ ان کو کسی طرح کی تکلیف دی گئی۔خلفا اور سلاطین اسلام نے ان کا نہایت عزت واحترام کیا۔''[1]

ہومر کے الیڈ کا عربی ترجمہ : اس کتاب کا عربی ترجمہ پروفیسر سلیمان بستانی نے کیا۔ساتھ ہی دو صفحات

۱۔ مقالات شبلی،جلد چہارم،ص ۱۸۸

پر مشتمل ایک مبسوط دیباچہ بھی سپرد قلم کیا جس میں ہومر کے حالات اور ریویو کے علاوہ عرب کی شاعری پر ایک محققانہ مضمون لکھا ہے۔ مولانا شبلی رقم طراز ہیں:

> ''اگر یہ سوال ہو کہ کل دنیا کا سب سے بڑا شاعر کون ہے تو مختلف قوموں کی زبان سے مختلف جواب ہوں گے۔ عجم فردوسی کا نام لیں گے، انگریز شیکسپیئر کو پیش کریں گے، رومی ورجل کے حق میں ووٹ دیں گے، عرب امراؤ القیس کو مقابلہ میں لائیں گے۔ غرض کسی شخص پر اتفاق عام نہ ہو سکے گا۔ تاہم وطن پرستی سے قطع نظر کر کے اگر کسی شخص پر اتفاق عام ہو سکتا ہے تو وہ یونان کا شاعر ہومر ہے۔'' [۱]

اس ترجمہ کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ہر جگہ حاشیہ میں ہومر کے کلام کی بلاغت کا ایک ایک اسلوب بتایا ہے۔ پھر اکثر جگہ عرب کے اشعار نقل کر کے دونوں کا موازنہ و مقابلہ کیا ہے۔

مقالات شبلی جلد پنجم (تاریخی)

مقالات شبلی جلد پنجم علامہ شبلی کے تاریخی مقالات پر مشتمل ہے۔ علامہ شبلی ابن خلدون کے بعد پہلے مسلمان مورخ ہیں جنھوں نے ایک نظریہ تاریخ پیش کیا اور اس پر عمل پیرا ہوئے۔ علامہ شبلی نے درجنوں معرکہ آرا تاریخی مقالات بھی سپرد قلم کئے جو اپنی قدر و قیمت کے لحاظ سے خود مستقل تصنیف کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کے مقالات اپنی انفرادیت کے لحاظ سے آج بھی لائق مطالعہ ہیں۔ یہاں پر کچھ اہم تاریخی مقالات کا تعارف و تجزیہ پیش کیا جا رہا ہے۔

۱۔ **حضرت اسماء (اخلاق عرب):** شبلی نے ماہنامہ الندوہ میں مضامین کا ایک سلسلہ شروع کیا تھا۔ عام طور پر کسی کمال کا ذکر ہوتا ہے تو اسلامی ناموروں کے بجائے یورپ کے ناموروں کا نام لیا جاتا ہے۔ علامہ شبلی نے ناموران اسلام کا سلسلہ اس لئے شروع کیا کہ مسلمان یورپ اور ان کے اہل قلم کے بجائے اپنے

۱۔ مقالات شبلی، جلد چہارم، ص ۱۸۹

اسلاف کے کارناموں سے واقف ہوں اور ان کی عظمت و سربلندی سے خود اپنی سربلندی کا سامان پیدا کریں۔ یہ مضمون اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے۔ اس میں تاریخ اسلام کی دو عظیم ماؤں حضرت اسماءؓ والدہ عبداللہ بن زبیرؓ اور ہندہ والدہ حضرت امیر معاویہؓ کی شجاعت و بہادری، استقلال و ثبات، دلیری و بے جگری پر واقعہ کے توسط سے روشنی ڈالی ہے۔

۲۔ **المعتزلہ والاعتزال** : اس مقالہ میں اعتزال کی اجمالی تاریخ قلم بند کی گئی ہے جس میں اعتزال کی ابتدا، ارتقا، عروج، معتزلہ کے عقائد و خیالات، علمائے معتزلہ کی خدمات اور کارہائے نمایاں کا ذکر ہے۔ اس مقالہ میں علامہ شبلی کے تاریخی اصول صاف ظاہر ہیں اور ان کے نظریہ تاریخ کے اہم عناصر صحت واقعہ، روایت و درایت، قیاس و اجتہاد، علوم و فنون سے واقفیت اور صاحب تذکرہ کے دونوں رخوں کی تصویر واضح نظر آتی ہے۔

۳۔ **ابن رشد**: اس مقالہ میں بارہویں صدی عیسوی کے نامور فلسفی ابن رشد کی ولادت سے وفات تک کے حالات بالترتیب لکھے گئے ہیں۔ اس میں ابن رشد کی تعلیم و تربیت، عادات و اطوار، فضل و کمال، عظمت و بلندی، تصنیفات، فلسفہ سے دلچسپی اور یورپ میں اس کی اشاعت و مخالفت وغیرہ کی تفصیلات مختصراً قلم بند کی گئی ہیں۔

۴۔ **مجددان اسلام علامہ ابن تیمیہ حرانی**: اس سے متعلق علامہ شبلی رقم طراز ہیں کہ اسلام میں سیکڑوں، ہزاروں بلکہ لاکھوں علماء، فضلا، مجتہدین، ائمہ فن اور مدبرین ملک گزرے ہیں لیکن مجدد یعنی ریفارمر بہت کم پیدا ہوئے ہیں۔ شبلی نے رفارمر یا مجدد کے لئے تین شرطیں ضروری قرار دی ہیں۔

۱۔ مذہب یا علم یا سیاست (پالٹیکس) میں کوئی مفید انقلاب پیدا کردے۔

۲۔ جو خیال اس کے دل میں آیا ہو کسی کی تقلید سے نہ آیا ہو بلکہ وہ اس کا اجتہاد ہو۔

۳۔ جسمانی مصیبتیں اٹھائی ہوں جان پر کھیلا ہو، سرفروشی کی ہو۔

ان تینوں شرطوں کے اصلی مصداق علامہ ابن تیمیہ ہیں۔ اس کے بعد علامہ شبلی نے علامہ ابن تیمیہ

کے نام ونسب، ولادت، وطن، تعلیم وتربیت، فضل وکمال، علوئے مرتبہ اوران کے کارناموں کے ساتھ ان کی پرآشوب زندگی کے واقعات کو خاص اپنے رنگ تحقیق وتحریر کے ساتھ اس طرح پیش کیا ہے کہ امام ابن تیمیہ کی تجدیدی خدمات کا نہایت عمدہ مرقع نظر کے سامنے آ گیا ہے۔ علامہ شبلی کو ناموران اسلام سے خاص دلچسپی تھی اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ وہ مسلمانوں کو مغرب کی علمی ترقیوں اور نیچر کاریوں کے رعب واثر سے دور رکھنا چاہتے تھے۔ اسی وجہ سے انھوں نے امام ومجدد وقت علامہ ابن تیمیہ کے حالات وکارنامے قلم بند کئے ہیں۔

۴۔ متنبّی : اس مضمون میں علامہ شبلی لکھتے ہیں کہ متنبّی چوتھی صدی ہجری کا شاعر ہے۔ چونکہ اس کی زندگی کے کچھ اوقات صحرانشینوں اور بدویوں کے درمیان بسر ہوئے تھے اس لئے وہ بھی عرب کی فطرت رکھتا تھا۔ اس کے بعد علامہ شبلی نے متنبّی کے نام ونسب کا ذکر کیا ہے۔ متنبّی فطری شاعر تھا۔ بدویوں کی صحبت نے اس خوبی کو اور جلا بخشی۔ اس نے نبوت کا دعویٰ بھی کیا اور قرآن کے جواب میں ایک کتاب بھی لکھی۔ قبیلہ بنو کلب اس کے مرید ہو گئے۔ جب یہ فتنہ جڑ پکڑنے لگا تو گورنر حمص نے اسے گرفتار کرلیا اور قید خانے میں ڈال دیا۔ کچھ دن قید میں گزارنے کے بعد اس نے توبہ کرلی۔ اس کے اندر غرور، خودداری اور نخوت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ وہ مداحی اور بھٹئی سے بالطبع متنفر تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی صوبہ کی حکومت مل جائے تو وہ آزادانہ زندگی بسر کرے۔ اس غرض سے اس نے سیف الدولہ، کافور، مہلبی، محمد بن العمید، عضدالدولہ سب کے دربار میں حاضری دی۔ لیکن صوبہ کی حکومت نصیب نہ ہوئی۔ آخر میں اس کی دولت کی خبر بدویوں کے سردار فاتک اسدی کو ملی تو وہ اپنے ساتھ ستر آدمی لے کر ایک کمین گاہ میں چھپ گیا۔ متنبّی جب سامنے سے گزرا تو وہ اپنے تمام آدمیوں کے ساتھ حملہ آور ہوا۔ اکیلا متنبّی کیا کرتا لڑتا بھڑتا مارا گیا۔

۵۔ موبدان مجوس (ہندوستان میں): ہندوستان کی تاریخ میں موبدان مجوس کا تذکرہ بہت کم ملتا ہے۔ مغربی اہل قلم نے اس کی وجہ مسلم حکمرانوں کا تعصب بتایا ہے۔ علامہ شبلی نے یہ مقالہ اس کے جواب میں لکھا ہے اور پارسیوں کے ان مذہبی پیشواؤں کا مختصر حال لکھا ہے جو اسلامی دور حکومت میں عرصہ سے ہندوستان

میں سکونت پذیر تھے اور جن کی خدمت کو مسلمان اہل قلم نے بھی سراہا۔ ان کو مسلم حکمرانوں کے دور میں مکمل طور پر مذہبی آزادی حاصل تھی اور دوسری قوموں اور باشندوں کی طرح انھیں کسی قسم کی تکلیف نہیں پہنچائی گئی تھی۔ اور ان کے ساتھ تعصب کا کوئی واقعہ بھی تاریخی شہادتوں میں مذکور نہیں۔

زیب النساء : علامہ شبلی نے یہ مضمون انڈین میگزین اینڈ ریویو کے ایک آرٹیکل کے جواب میں لکھا تھا، جس میں اورنگ زیب کی بیٹی شہزادی زیب النساء کی نہایت بدنما تصویر پیش کی گئی تھی۔ اور اس کی شخصیت پر رکیک اور نازیبا حملے کئے گئے تھے۔ علامہ شبلی نے اس کی تردید کرتے ہوئے اس کا جواب لکھا اور زیب النساء کی اصل شخصیت سے لوگوں کو آگاہ کیا۔ اس مضمون میں زیب النساء کی ولادت، تعلیم و تربیت، اخلاق و عادات، فضل و کمال، شاعری اور اس کی علم پروری وغیرہ کا ذکر کیا ہے اور اس پر لگائے گئے الزامات کو غلط ثابت کیا ہے۔ اس مضمون میں شبلی نے زیب النساء کی ولادت کا ذکر کیا ہے۔ زیب النساء نے شادی نہیں کی۔ عام طور پر یہ مشہور ہے کہ تیمور لڑکیوں کی شادی نہیں کرتے تھے جس کو یورپین نے بہت شہرت دی۔ لیکن شبلی نے اس بات کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ خود عالم گیر کی دو بیٹیاں شادی شدہ تھیں۔ کمالات علمی اور عام اخلاق و عادات سے متعلق لکھتے ہیں کہ زیب النساء کو علوم عربیہ اور فارسی زبان دانی میں کمال حاصل تھا۔ وہ شاعر بھی تھی لیکن اس کا کلام ضائع ہو گیا۔

علم پروری سے متعلق شبلی لکھتے ہیں کہ زیب النساء نے خود کوئی تصنیف کی ہو یا نہ کی ہو لیکن اپنی نگرانی میں اہل فن سے بہت سی عمدہ کتابیں لکھوائیں جن میں تفسیر کبیر کا ترجمہ قابل ذکر ہے۔ اخلاق و عادات سے متعلق لکھتے ہیں کہ زیب النساء درویشانہ اور منصفانہ مزاج رکھتی تھیں۔ اپنے بھائیوں سے بہت محبت کرتی تھیں۔

زیب النساء سے متعلق جھوٹے قصے مشہور ہو گئے تھے کہ عاقل خاں سے اس کا تعلق عشق و محبت کا تھا اور وہ اس سے ملنے محل میں چوری چھپے آیا کرتا تھا۔ ایک بار عالم گیر کو اس کی موجودگی کا علم ہوا تو وہ محل میں آیا اور پانی گرم کرنے کا حکم دیا۔ عاقل خاں ڈر سے حمام کی دیگ میں چھپ گیا تھا۔ عالم گیر نے انجان بن

کراسی دیگ میں پانی گرم کرنے کا حکم دیا۔ راز فاش ہونے کے ڈر سے عاقل خاں نے جان دے دی لیکن اف نہیں کیا۔ لیکن شبلی نے اس کی تردید کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ان تمام تذکرہ میں جہاں اس کے حالات مذکور ہیں اس واقعہ کا کہیں ذکر نہیں۔

علامہ شبلی نے مستند مآخذ سے یہ واقعات نقل کئے ہیں۔ یہ اردو میں پہلی کتاب ہے جس سے انگریزی مورخین کی غلط بیانیوں کا پردہ چاک ہوا اور ان کے غلط خیالات کو اپنی علمی و تحقیقی صلاحیت سے رد کیا اور زیب النساء کی اعلیٰ علمی و ادبی ذوق و صلاحیت اور اچھے کردار سے بھی اردو داں طبقہ کو روشناس کرایا۔

مولوی غلام علی آزاد بلگرامی : اس مختصر مضمون میں نامور مورخ مولوی غلام علی آزاد بلگرامی کے حالات و سوانح قلم بند کئے گئے ہیں۔ اور ولادت سے وفات تک کے حالات، فضل و کمال اور ان کی تصانیف کا تعارف کرایا گیا ہے۔ آزاد بلگرامی کثیر التصانیف مصنف و مورخ گزرے ہیں۔ اگرچہ متعدد موضوعات پر ان کی کتابیں ہیں لیکن ان کا اصل میدان فن تاریخ تھا اور اسی وجہ سے علامہ شبلی کو ان سے خاص مناسبت تھی۔ فن تاریخ میں آزاد بلگرامی کی تصانیف کو خاص مقام حاصل ہے۔ سرو آزاد، ید بیضا، مآثر الکرام، خزانۂ عامرہ، روضۃ الاولیاء، سند السعادات، فی حسن خاتمۃ السادات، دیوان عربی، دیوان فارسی، شرح بخاری وغیرہ تاریخ ہند پر داد تحقیق دینے والوں کے لئے ناگزیر مراجع کی حیثیت سے معروف ہیں۔ مولانا شبلی نے اس مختصر مضمون میں آزاد بلگرامی کی تصویر کشی اس عمدگی سے کی ہے کہ ان کی پوری زندگی کا خاکہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔

فرید وجدی بک : مصر کے مشہور محقق و مصنف فرید وجدی بک نے فلسفہ جدیدہ سے اسلام کی تطبیق کی کوشش کی تھی۔ یہ خالص علامہ شبلی کے ذوق کی چیز تھی اس لئے وجدی بھی علامہ کے ممدوح ہو گئے۔ اگرچہ یہ مضمون مختصر ہے لیکن وجدی کے کارناموں کا مرقع ہے۔ علامہ شبلی نے اس میں وجدی کے مختصر حالات زندگی سے بحث کی ہے۔ انھوں نے جب یہ مضمون لکھا، وجدی اس وقت نوجوان تھے اور ان سے بڑی امیدیں تھیں۔ شاید اسی لئے علامہ شبلی نے ان کی تحسین کے ساتھ ان کی بہت سی خامیوں کی طرف یہ لکھ کر

اشارہ بھی کیا ہے کہ:

''فرید وجدی کے کمالات کے باوجود ہم کو کسی قدر افسوس کے ساتھ لکھنا پڑتا ہے کہ ان کی مذہبی معلومات سطحی اور سرسری ہیں۔ اس لئے حدیث یا قرآن مجید کے متعلق کچھ لکھتے ہیں تو ان کی کم مائیگی کی جھلک صاف نظر آتی ہے۔'' [۱]

مقالات شبلی جلد ششم (تاریخی)

مقالات شبلی جلد ششم بھی مولانا کے تاریخی مقالات پر مشتمل ہے۔ چونکہ علامہ شبلی کا اصل میدان تاریخ ہی ہے اس لئے سب سے زیادہ انھوں نے اپنی قابلیت کے جوہر اسی میں دکھائے ہیں۔ مولانا نے اپنے عزیزوں کے واقعات کو پیش کرنے میں ذرا بھی تعصب سے کام نہیں لیا ہے۔ اس جلد کا پہلا مقالہ ''تراجم'' ہے۔

یہ طویل اور قیمتی مقالہ علامہ شبلی نے ۱۸۸۷ء میں ایجوکیشنل کانفرنس کی تحریک پر لکھا تھا جس میں بنیادی طور سے یہ بحث ہے کہ مسلمانوں نے دنیا کی کون کون سی زبانیں سیکھیں اور غیر قوموں کے کون کون سے علوم وفنون کے ترجمے کئے اور اس میں کس قدر شغف، انہماک اور دلچسپی کا مظاہرہ کیا۔ علامہ نے اس مضمون میں مسلمانوں کی علم دوستی اور معارف پروری کی داستان بیان کی ہے اور یورپ کے مورخین کے اس الزام کی تردید بھی کی ہے کہ مسلمانوں نے اپنے دور عروج میں غیر قوموں کے علوم وفنون، تہذیب و تمدن اور ان کے آثار کو برباد کر دیا تھا۔ مولانا نے ثابت کیا ہے کہ حقیقت یہ ہے کہ مسلمانوں نے دوسروں کے علمی خزانوں سے پوری طرح واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اس کے لئے دارالترجمے قائم کئے۔ فارسی، سنسکرت، یونانی، لاطینی زبان کے ماہر مترجمین کا انتظام کیا، اور مختلف علوم وفنون مثلاً فلسفہ یونان، ہیئت، جبر و مقابلہ، حساب، علم آلات، جغرافیہ، طب، موسیقی، جامیٹری وغیرہ اور دیگر علوم و فنون کی اہم

۱۔ مقالات شبلی، جلد پنجم، ص ۱۰۴

کتابوں کا ترجمہ کرایا۔ اور انھوں نے مترجمین اور ترجمہ کی ہوئی کتابوں کی ایک طویل فہرست بھی دی ہے۔ اور ان علوم وفنون سے مسلمانوں کی گہری دلچسپی کے واقعات لکھ کر ثابت کیا ہے کہ:

''عہد وسطی میں مسلمانوں نے دنیا کی تمام قوموں کا علمی سرمایہ اپنی زبان میں منتقل کرلیا تھا اور اگر دنیا میں مسلمانوں کا قدم نہ آتا تو یونان، مصر، ہند، فارس کے تمام علمی ذخیرے آج برباد ہو چکے ہوتے۔''[1]

کتب خانہ اسکندریہ : اسلام اور مسلمانوں پر مورخین یورپ کے من گھڑت اور بے سروپا الزامات میں یہ الزام سب سے زیادہ مشہور ہوا کہ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں جب مسلمانوں نے مصر واسکندریہ کو فتح کیا تو انھوں نے وہاں کے قدیم اور مشہور یونانی کتب خانہ کو جو بطلیموسیوں کے زمانہ سے قائم تھا اور صدیوں کا علمی خزانہ تھا جلا کر خاک کر دیا اور دنیا کو ایک عظیم علمی میراث سے محروم کر دیا۔

اس کی آڑ میں دراصل یہ ثابت کرنا تھا کہ اسلام اور مسلمان علم دشمن ہیں۔ اس مفروضہ کی اس قدر تشہیر کی گئی کہ اسے تاریخ کے مسلمات میں شمار کیا جانے لگا۔

اس بے سروپا الزام کے جواب میں علامہ شبلی نے تاریخی دلائل سے یہ ثابت کیا کہ مسلمانوں پر یہ الزام سراسر غلط ہے۔ کیونکہ مسلمانوں کی فتح سے پہلے ہی اس کتب خانہ کو خود عیسائیوں نے تباہ و برباد کر دیا تھا۔ اس کام میں بڑے بڑے مذہبی رہنما بھی شریک تھے۔ مسلمانوں نے جب مصر واسکندریہ کو فتح کیا تو اس کتب خانہ کا وہاں نام ونشان تک باقی نہ تھا۔

علامہ شبلی نے کافی مدلل انداز میں تحقیق و جامعیت کے ساتھ مقالہ لکھا جس نے پوری علمی و تحقیقی دنیا میں ہنگامہ بپا کر دیا۔ اور اس بیش قیمت تحریر نے مسلمانوں کا سر فخر سے بلند کر دیا۔ مورخین یورپ کو تسلیم کرنا پڑا کہ مسلمانوں پر حقیقت میں سراسر یہ غلط الزام تھا اور افترا کا موجد چھٹی صدی عیسوی کا مورخ ابوالفرج مکشی تھا۔

۱۔ مقالات شبلی، جلد ششم، ص ۱

علامہ شبلی نے اس غلط اور بے بنیاد الزام کی تردید میں تاریخ اور اس کے اصولوں کو برتتے ہوئے نہایت دیانت داری سے کام لیا اور اصل واقعہ کی تحقیق میں غیر جانب داری سے کام لیا۔ اس الزام کو غلط ثابت کرنے کے ساتھ ساتھ یہ بھی بتلایا ہے کہ مسلمانوں نے تعلیم کو عام کرنے کے لئے کیا کیا قدم اٹھائے اور اس سلسلہ میں لوگوں کو بلکہ دوسرے فرقوں تک کو کیا کیا امداد بہم پہنچائیں۔

اسلامی کتب خانے : اس میں علامہ شبلی نے کتب خانوں کی اجمالی تاریخ لکھی ہے۔ اور عہد اسلامی کے اکثر کتب خانوں کا تعارف کرایا ہے۔ ان کے انتظام اور طریقہ کار پر روشنی ڈالی ہے اور کتب خانوں کی اہم کتابوں کا ذکر کر کے یہ دکھایا ہے کہ مسلمانوں نے اپنے دور حکومت میں جس کثرت سے کتب خانے قائم کئے تھے اس کی نظیر کہیں اور ملنی مشکل ہے۔ اس مقالہ میں علامہ شبلی نے خاص طور سے ثابت کیا کہ مسلمانوں نے غیر قوموں کی یادوں کو محفوظ رکھنے اور ان کے حالات و واقعات لکھنے میں بڑی احتیاط سے کام لیا جو ان کی رواداری اور وسیع النظری کا ثبوت ہے۔

یہ مقالہ اگرچہ تاریخ کے ایک پہلو پر مشتمل ہے تاہم علامہ شبلی نے بہت تحقیق و تدقیق اور مورخانہ تلاش و تفحص کے ساتھ اصول تاریخ کا بھرپور خیال رکھا ہے اور اپنے تاریخی نظریہ سے کہیں بھی انحراف نہیں کیا۔ اس مقالے میں شبلی نے عرب کی تحریر کی ابتدا کب ہوئی؟ بیت الحکمۃ، مامون الرشید نوح، عضدالدولہ، سیف الدولہ، اسپین کا ایک قصہ، پہلا پبلک کتب خانہ، مصر کا دارالعلم، پبلک کتب خانوں کا عام رواج، پہلے سوال کا جواب، فارس کی علمی تاریخ، فارسی تصنیفات کے مترجم، فن اخلاق کی کتابیں، فن حرب کی کتابیں، فارسی زبان کے ناول اور قصے، الف لیلیٰ اصل میں فارس کا ایک ناول ہے، فارس کے بانیان مذہب کی کتابیں، سنسکرت کی تصنیفات، کتب خانوں کی تباہی کے اسباب، مصر کے کتب خانہ کی بربادی، تاتاریوں کا کتب خانوں کو برباد کرنا، ان تمام عنوانات کا مختصراً ذکر کیا ہے۔

اسلامی حکومتیں اور شفاخانے : یہ آرٹیکل پبلک ورکس کی ایک خاص شاخ یعنی شفاخانوں سے متعلق ہے۔ اس مضمون میں حارث بن کلدہ، سب سے پہلا شفاخانہ، ویدک کا داخل ہونا، انسپکٹر جنرل شفاخانہ جات

کی تنخواہ، ایک جدت، خلیفہ مقتدر باللہ کے عہد میں شفاخانے، جیل خانے کا ہسپتال، عارضی شفاخانے، امتحان کا طریقہ قائم ہوا۔ جراح وطبیب سند یافتہ تھے۔ نوریہ عمدہ دواؤں کے بہم پہنچنے کا اہتمام جیسے عنوانات پر اپنی تحقیقات پیش کی ہیں۔ علامہ شبلی نے تاریخ میں بکھرے ہوئے اس مواد کو اکٹھا کر کے عہد اسلامی کے شفاخانوں کا مرقع تیار کیا ہے اور ثابت کیا ہے کہ عہد اسلامی عوامی اور رفاہی کاموں اور انسانی ہمدردی کے کاموں میں بھی کسی سے پیچھے نہیں رہا۔ بعض شفاخانوں کے انتظام وانصرام سے اندازہ ہوتا ہے کہ موجودہ دور کے شفاخانوں سے وہ کسی طرح کم نہ تھے۔ اور حکومت کے ذمہ داران ان کی پوری دیکھ بھال کرتے تھے۔

علامہ شبلی جب علی گڑھ کالج میگزین کے ایڈیٹر بنائے گئے تو انھوں نے یہ اعلان کیا کہ اسلامی تہذیب وتمدن کے متعلق متعدد عنوانات کے تحت تحقیقی وتاریخی مضامین لکھے جائیں تاکہ مسلمانوں کی تہذیب وتمدن کی تاریخ کی ایک جھلک مرتب شکل میں سامنے آجائے۔ یہ مضمون اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے جو جولائی ۱۸۹۰ء میں شائع ہوا اور اپنے انفرادی موضوع کی وجہ سے بڑا مقبول ہوا۔

ہندوستان میں اسلامی حکومت کے تمدن کا اثر : اس مقالے کی ابتدا عہد مغلیہ سے قبل ہندوستان کی تہذیبی، تمدنی، معاشرتی اور سیاسی صورت حال سے ہوئی ہے۔ اس میں ان تہذیبی وتمدنی ترقیوں کا ذکر ہے جو مغل حکمرانوں کی کوششوں کی وجہ سے ہندوستان میں ہوئیں۔ اس کے بعد بابر سے پہلے عہد عالمگیر تک ہندوستانی تہذیب وتمدن میں جو تبدیلی اور ترقی ہوئی ان کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس میں زمین کی پیداوار، صنعت اور مصنوعات، بندوبست اراضی اور پیمائش، افزائش وترقی حیوانات، رفاہ عام کے کام عمارت اور سڑک وغیرہ کی تعمیر، ایجادات واختراعات، توپ کی صناعی، نفاست پسندی، ضروریات کی وسعت و آسائش کے سامان وغیرہ کے عنوانات کے تحت مسلمانوں کے جو کارنامے بیان کئے ہیں ان کو پڑھ کر ہندوستانی مسلمانوں کا سر فخر سے بلند ہو جاتا ہے۔ اس مضمون کا ماخذ تزک بابری، تزک جہانگیری، آئین اکبری، مآثر الامراء جیسی مستند ومعتبر کتابیں ہیں۔

مسلمانوں کی علمی بے تعصبی اور ہمارے ہندو بھائیوں کی ناسپاسی : یہ مضمون کلکتہ کے مشہور اخبار بھارت متر کے ایڈیٹر کے ایک بے بنیاد الزامی مضمون کے جواب میں لکھا گیا تھا۔ اس ہندو مضمون نگار نے ملا مسیحی کی رامائن پر تبصرہ کرتے ہوئے مسلمانوں پر متعدد الزامات عائد کئے تھے۔ شبلی نے مضمون نگار کے خیالات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے:

> ''صدیوں سے ایک ایسی کتاب گم نامی کے ظلمات میں پڑی ہوئی تھی وجہ شاید یہ ہو کہ مسلمانوں نے اسے پسند نہ کیا ہو۔'' [۱]

اس کا ماننا تھا کہ مسلمانوں نے صدیوں اس ملک پر حکومت کی لیکن ہندوؤں کے علم و ادب سے بالکل بے خبر تھے۔ امیر خسرو نے محض تفریحاً اس طرف توجہ دی یا اگر کوئی مسلم توجہ دیتا تو اس کو کافر قرار دیا جاتا۔ عہد اکبری میں جو کچھ ہوا بہت محدود تھا۔ البتہ داراشکوہ نے ہندوؤں کے اونچے درجہ کی کتابوں کی طرف توجہ دی تھی جس کی وجہ سے آپ کو کفر کا فتویٰ ملا اور جان سے ہاتھ دھونا پڑا۔

انھیں الزامات کی تردید میں علامہ شبلی نے یہ مضمون قلم بند کیا اور معتبر تاریخی حوالوں سے مسلمانوں کی علمی بے تعصبی، علم پروری، ادب نوازی، رواداری، فراخ دلی اور ہندوؤں کی زبان و ادب سے دلچسپی کے سیکڑوں واقعات ثبوت کے طور پر پیش کئے اور ثابت کیا کہ علمی بے تعصبی میں دنیا کی کوئی اور قوم مسلمانوں کے ساتھ برابری کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔

> ''ہمارے ہندو دوست کی تاریخ دانی سے اسی جواب کی توقع ہو سکتی تھی۔ لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ مسلمانوں نے نہ صرف ہندوؤں کے علوم بلکہ ہندوستان کی سرزمین کو بھی اسی وقعت کی نگاہ سے دیکھا جس کی کسی اجنبی قوم سے کبھی توقع نہیں کی جا سکتی۔'' [۲]

۱۔ مقالات شبلی، جلد ششم، ص ۱۷۳

۲۔ ایضاً، ص ۱۷۷

اس کے علاوہ علامہ شبلی لکھتے ہیں کہ ملا مسیح اور ان کی رامائن کے متعلق جو خیالات ہمارے ہندو دوست نے ظاہر کئے ہیں اس کی یہ کیفیت ہے کہ بے شبہ رامائن کو قبول عام نہیں حاصل ہوا لیکن اس کی وجہ تعصب نہیں ہے۔ مسیح ایک معمولی درجہ کا شاعر تھا۔ اس سلسلے میں علامہ شبلی نے یہ مثال پیش کی ہے کہ:

''فردوسی نے شاہنامہ میں گبروں کے قصے لکھے۔ صولت ترکستانی نے صولت فاروقی میں حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کی فتوحات نظم کئے اور فردوسی کو گالیاں دیں کہ اس نے کافروں کے نام کو کیوں زندہ کیا۔ لیکن نتیجہ کیا ہوا؟ فردوسی کا شاہنامہ بچے بچے کی زبان پر ہے اور صولت فاروقی کا کوئی نام تک نہیں جانتا۔ ملا مسیح صاحب اگر خود بانی اسلام کے حالات لکھتے تب بھی مقبول نہ ہوتے۔''[۱]

مکینکس اور مسلمان: مکینکس یونانی لفظ ہے جس کو ہماری زبان میں کل سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ مسلمانوں نے جب یونان کے علوم وفنون سیکھے تو صرف علم پر قناعت نہیں کی بلکہ اس فن سے عملی کام بھی لئے اور میکینکل ترقی کی۔ اس مضمون میں یہ دکھایا ہے کہ ماضی میں مسلمان علمی و عملی ترقی اور ایجادات واختراعات میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ اس مضمون کا مقصد غالباً مسلمانوں کے اندر حوصلہ اور جذبہ پیدا کرنا تھا کہ ان کے اسلاف سائنسی علوم میں ایسے بلند مقام پر فائز تھے کہ یورپ نے بھی ان سے خوشہ چینی کی۔

ان مقالات میں شبلی نے منطقی دلائل اور تاریخی شہادتوں سے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ یورپین مورخین کے اعتراضات بالکل بے بنیاد ہیں۔ ان مقالات کے مطالعہ سے شبلی کے رچے اور منجھے ہوئے تاریخی شعور کا اندازہ ہوتا ہے۔ اور اس بات کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے سنی سنائی باتوں اور سطحی معلومات پر اکتفا نہیں کیا ہے۔ ان کے مقالات اردو زبان وادب کا بیش قیمت سرمایہ ہیں۔

۱۔ مقالات شبلی، جلد ششم، ص ۱۸۵

مقالات شبلی جلد ہفتم (فلسفیانہ)

مولانا شبلی کے یہاں موضوعات کا تنوع ہے۔ان کی نگاہ کا دائرہ وسیع و ہمہ گیر ہے۔یہ مجموعہ شبلی کے فلسفیانہ مضامین پر مشتمل ہے۔ چونکہ علامہ شبلی کو خود فلسفہ میں دسترس حاصل تھی اس لئے ان کے یہ مقالات ان کے شاہکار نظر آتے ہیں۔ان مقالات میں انھوں نے ہر طرح کے مسائل پر بحث کی ہے اور بعض دوسرے لوگوں کی غلطیوں کی طرف اشارہ بھی کیا ہے۔اس مجموعہ میں شبلی کے مندرجہ ذیل مضامین ہیں۔

(۱) فلسفہ یونان اور اسلام (۲) فلسفہ یونان اور اسلام (یونانی منطق کی غلطیاں) (۳) فلسفہ یونان اور اسلام (یونانی منطق کی غلطیاں) (۴) فلسفہ یونان اور اسلام (اجرام فلکی) (۵) فلسفہ اسلام اور فلسفہ قدیم و جدید (۶) علوم جدیدہ (علم کی حقیقت) (۷) جذب یا کشش (۸) فلسفہ اسلام (مسئلہ ارتقاء اور ڈارون) (۹) ڈاکٹر برٹن اور تاریخ فلسفہ اسلام (۱۰) فلسفہ اور فارسی شاعری (۱۱) حقائق اشیا اور معشوق حقیقی (۱۲) ندوۃ العلماء کا اجلاس سالانہ اور علمی نمائش گاہ۔

شروع کے چار مضامین ایک ہی سیریز سے تعلق رکھتے ہیں۔مولانا شبلی لکھتے ہیں:

> ''چونکہ عام طور پر یہ مشہور ہے اور مسلمانوں کی موجودہ تصنیفات بھی اس کی شہادت دے رہی ہیں کہ مسلمانوں میں مقلدین ارسطو کے سوا اور کوئی فرقہ موجود نہ تھا۔اس لئے اس نمبر میں ہم صرف تاریخی طور سے اس واقعہ کی غلطی ثابت کرتے ہیں۔''[۱]

مولانا شبلی نے یہ مضمون مخالفوں کے جواب میں لکھا تھا جنھوں نے کہا تھا کہ مسلمان ارسطو کی گاڑی کے قلی تھے۔ پروفیسر رینان کے ایک تحریر میں کہا تھا کہ اسلام اور علم دونوں ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مسلمانوں میں فلسفہ حکومت حکمت و سلطنت کے راستے سے آیا۔یعنی خلفائے عباسیہ نے اپنے شوق سے یونانی کتابوں کے ترجمے کرائے۔جس کی وجہ سے مسلمانوں

۱۔ مقالات شبلی، جلد ہفتم، ص ۱

نے بھی فلسفہ میں تصنیفات وتالیفات شروع کیں۔ مسلمانوں میں شروع سے ہی دو گروہ پیدا ہو گئے تھے۔ ایک وہ جو فلسفہ ارسطو کا حامی تھا اور دوسرا اس کا مخالف جس نے ارسطو کے فلسفے پر نکتہ چینی کی اور اس کا رد لکھا۔ شبلی نے ان سبھی فلسفیوں کے نتائج تحریر سے بحث کی ہے۔

فلسفہ یونان اور اسلام (یونانی منطق کی غلطیاں) : اس میں یونانی منطق کی غلطیوں کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اور ساتھ ہی اس بات کا بھی ذکر کیا ہے کہ علمائے اسلام نے اس فن میں کیا کیا اصلاحات کیں۔ اس سلسلے میں شبلی تحریر کرتے ہیں:

> ''اس موقع پر صرف یہ ظاہر کرنا ہے کہ اس شاخ کو چھوڑ کر یورپ کو بھی تسلیم ہے کہ ارسطو کی منطق پر آج تک نہ اضافہ ہو سکا نہ اصلاح و ترمیم۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ حکمائے اسلام نے اس فن میں نہ صرف اصلاح و ترمیم کی بلکہ بہت سے مسائل کی غلطیاں ثابت کیں۔'' [۱]

اس کے علاوہ ارسطو نے اپنی منطق کو آٹھ حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ اس کا نمبروار ذکر بھی مولانا شبلی نے کیا ہے اور حکمائے اسلام نے اس میں کیا ترمیم و اضافہ کیا ان سب کا ذکر ہے۔

اس سلسلے کا تیسرا مضمون ''فلسفہ یونان اور اسلام'' (یونانی منطق کی غلطیاں) سے متعلق ہے۔ اہل منطق کے نزدیک علم کی دو قسمیں ہیں، تصور اور تصدیق اور ان دونوں کے ادراک کے طریقے مختلف ہیں جنھیں معرف اور حجہ کہتے ہیں۔ معرف کا مطلب ہے کسی شئے کی حقیقت کا ادراک۔ اب سوال یہ ہے کہ حقیقت شئے کے ادراک کا طریقہ کیا ہے۔ تو اس سلسلے میں شئے کی ذاتیات اور عرضیات پر نظر ڈالنی ہوتی ہے اور اسے معلوم کرنے کے بعد ان کو ترکیب دینا ہوتا ہے۔ یہی مرکب اس شئے کا معرف ہوتا ہے۔ اس طرح اشیا کی مختلف قسموں کا ذکر بھی کیا ہے۔

علامہ شبلی ذاتی اور عرضی عنوانات کے تحت ذاتیات اور ماہیت سے متعلق رقم طراز ہیں:

۱۔ مقالات شبلی، جلد ہفتم، ص ۱۱

''مختصر یہ کہ ماہیت کے علم کے لئے ذاتی کا علم ہونا ضروری ہے اور ذاتی کے علم کے لئے ماہیت کا علم ضروری ہے۔ کیونکہ جب تک ماہیت متعین نہ ہو چکے یہ کیوں کر فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ فلاں چیز اس کی ماہیت میں داخل ہے اور فلاں چیز خارج..... جب تک ایک ایک چیز کی نسبت یہ فیصلہ نہ ہو جائے کہ اس کی حقیقت کیا ہے اس وقت تک یہ بھی فیصلہ نہیں ہو سکتا کہ اس کے ذاتیات کیا ہیں۔''[1]

اس مضمون میں ذیلی عنوان ''قیاس'' سے متعلق لکھتے ہیں کہ اہل منطق کے نزدیک قیاس ہمیشہ دو یا دو سے زیادہ قضایا سے مرکب ہوتا ہے۔ یعنی ایک قضیہ سے استدلال نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن اس پر اعتراض اٹھایا جا سکتا ہے کہ اکثر دلائل میں صرف ایک قضیہ مذکور ہوتا ہے۔ اس مسئلہ کی تحقیق کے لئے علامہ شبلی نے کچھ مقدمات بھی نمبروار پیش کئے ہیں اور شکل اول کے عنوان کے تحت بڑے قیمتی خیالات کا اظہار کیا ہے۔

فلسفہ یونان اور اسلام (اجرام فلکی) : شبلی کے مطابق یونانیوں نے اجرام فلکی کے متعلق عجیب عجیب بیہودہ خیالات قائم کئے تھے۔ اور وہ اس قدر یقینی اور قطعی سمجھے جاتے تھے کہ آج تک لوگ کسی نہ کسی شکل میں اس پر قائم ہیں۔ افلاطون اور ارسطو وغیرہ کا اس سلسلے میں یہ خیال تھا کہ آسمان سخت اور ٹھوس ہے وہ کسی طرح ٹوٹ یا پھٹ نہیں سکتے۔ اس کے ساتھ ان میں روح اور عقل بھی ہے اور ان کی روح اور عقل ہمارے مقابلے میں اعلیٰ اور افضل ہے۔ تمام عالم کا نظام انھیں کی دست قدرت میں ہے اور دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے انھیں کے اشاروں پر ہوتا ہے۔

یونانیوں نے آسمان کے عاقل اور صاحب روح ہونے پر جو استدلال کیا ہے، علامہ شبلی نے اس کا ذکر کر کے ان کا تعاقب کیا ہے۔ ابن رشد کا ماننا ہے کہ حکمائے اسلام نے یونانیوں کا فلسفہ سمجھنے میں غلطی کی ہے۔ یہاں پر علامہ شبلی نے ان کی دلیلیں بھی پیش کی ہیں۔ آخر میں شبلی لکھتے ہیں کہ یہ بیہودہ خیالات اور

۱۔ مقالات شبلی، جلد ہفتم، ص ۱۹

دلائل ہیں جن پر یونانیوں کو ناز ہے اور کئی ہزار برس تک دنیا انہی مہملات کو رموز آسمانی سمجھتی رہی لیکن متکلمین اسلام پر یہ جادو نہ چل سکا۔ انھوں نے اس طلسم کی دھجیاں اڑا دیں۔ سب سے پہلے انھوں نے اس سے انکار کیا کہ آسمان ٹھوس ہے، مجسم ہے، حرکت کرتا ہے اور دوری پر حرکت کرتا ہے۔ آسمان کے جو اوصاف یونانی حکماء بیان کرتے ہیں وہ نص قرآنی کے خلاف ہیں اور متکلمین انھیں تسلیم نہیں کر سکتے۔

فلسفہ اسلام اور فلسفہ قدیم وجدید : یہ مضمون درحقیقت تین مضامین پر مشتمل ہے۔ یہ مضمون گو علمی حیثیت سے خود ایک اہم مضمون ہے۔ مصنف کا خیال ہے کہ فلسفہ یونان کو فلسفہ حال تک پہنچنے کے لئے ایک زینہ کی ضرورت تھی جس کو فلسفہ اسلام نے پورا کیا۔ اس سلسلے میں انھوں نے یہ بھی وضاحت کردی ہے کہ اگر فلسفوں کا مقابلہ وموازنہ کیا جائے تو ظاہر ہوگا کہ فلسفہ حال یونان کی بہ نسبت فلسفہ اسلام سے زیادہ قریب ہے۔ چونکہ یہ مضمون بہت وسیع ہے اور اس میں ایک ایک مسئلہ کی نسبت خاصی تفصیلی بحثیں ہیں اس لئے اس کا ایک اجمالی نقشہ بھی درج کردیا ہے جس میں دکھایا ہے کہ مسلمانوں نے فلسفہ ارسطو کے کس قدر مسائل سے اختلاف کیا۔ جسم کی حقیقت سے متعلق شبلی لکھتے ہیں کہ ارسطو وغیرہ کے نزدیک جسم دو چیزوں سے مرکب ہے۔ ہیولیٰ اور صورت۔ جسم ایک متصل اور پیوستہ چیز ہے۔ اس بنا پر اتصال جسم کی حقیقت میں داخل ہے۔ اتصال جسم کی پوری حقیقت ہے یا اتصال کے سوا جسم میں کوئی اور چیز بھی ہے۔ اس سوال کے حل کے لئے کسی جسم کو لو اور کاٹ کر اس کے دو ٹکڑے کردو۔ اس صورت میں جو اتصال پہلے موجود تھا وہ جاتا رہے گا اور دو نئے اتصال پیدا ہو جائیں گے۔ لیکن جسم فنا نہیں ہوتا۔ دو حصوں میں تقسیم ہو جاتا ہے اور یہ دونوں حصے اسی جسم سے پیدا ہوتے ہیں۔ عدم سے نہیں آتے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اتصال کے سوا بھی جسم میں کوئی چیز ہے جو دونوں حالتوں میں باقی رہتی ہے۔ اسی چیز کا نام ہیولیٰ ہے۔ لیکن متکلمین اسلام ہیولیٰ کے قائل نہیں۔ ان کے نزدیک جسم بہت چھوٹے چھوٹے اجزا سے مرکب ہوتا ہے جو ناقابل تقسیم ہے، متکلمین اسلام اس بات کے قائل ہیں کہ جسم مہین اور باریک ذرات یا اجزا سے مرکب ہے۔ اس کے علاوہ علامہ شبلی نے جوہر فرد، فلسفہ عناصر اربعہ وغیرہ پر بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

علوم جدیدہ علم کی حقیقت : علوم جدیدہ کے بہت سے مسائل کی تشریح فلسفہ حال کی رو سے کی جاتی ہے۔علم کی حقیقت یونانیوں نے یہ بیان کی تھی کہ کسی چیز کی صورت جو ذہن میں حاصل ہوتی ہے اس کا نام علم ہے۔ پھر اس سے متعلق بہت سی طویل بحثیں تمام متداول کتاب میں مذکور ہیں۔حکمائے حال نے علم کی جس طرح تشریح کی ہے وہ حسب ذیل ہے۔

انسان کو خدا نے مختلف حواس دیئے۔ ہر حاسہ کے مدرکات جدا جدا ہیں۔ اکثر چیزیں مختلف چیزوں کا مجموعہ ہوتی ہیں جو مختلف حواسوں سے محسوس ہوتے ہیں۔اس سے جو کیفیت محسوس ہوتی ہے وہ ہمارے حافظہ کے خزانہ میں جمع ہوتی ہے۔ان میں سے جب کسی ایک کا احساس ہوتا ہے تو اس چیز کی باقی کیفیتیں ہم کو یاد آجاتی ہے۔اس مضمون میں احساس کے مدراج اور تصور کی تعریف کے ذیلی عنوان بھی قائم کئے ہیں اور ان پر سیر حاصل گفتگو کی ہے۔

یونانی تعریف کی غلطیاں : اس عنوان کے تحت لکھتے ہیں کہ:

> ''پہلی غلطی تو یہ ہے کہ ذہن یا عقل کوئی مادی شئے نہیں جس میں صورت کا انعکاس یا انطباع ہو۔ دوسری یہ ہے کہ تصور کے وقت کوئی نئی صورت حاصل نہیں ہوتی بلکہ ایک حاصل شدہ صورت کا تذکرہ ہوتا ہے۔ ہمارے حافظہ میں بہت سی معلومات ہیں۔ جب ان کی طرف متوجہ ہوتے ہیں تو کہا جاتا ہے کہ ہم نے ان کا تصور کیا۔اب اگر تصور کی حقیقت وہ ہو جو یونانی بیان کرتے ہیں تو معنیٰ یہ ہوں گے کہ اس وقت کوئی نئی صورت حاصل ہوئی ہے۔ حالانکہ اس وقت کوئی نئی صورت حاصل نہیں ہوئی بلکہ جو صورت پہلے سے حاصل تھی اس کی طرف ہمارا ذہن متوجہ ہوا ہے کیونکہ کسی شئے کی صورت حاصل اس وقت ہوتی ہے جب وہ شئے ہمارے حواس کے سامنے موجود ہو۔'' [۱]

۱۔ مقالات شبلی جلد ہفتم، ص ۴۳۔۴۴

جذب یا کشش : جذب یا کشش مشہور فلاسفر سر آیزک نیوٹن کی ایجاد ہے اور سیکڑوں فلسفیانہ مسائل اسی مسئلہ پر مبنی ہیں۔ کشش کا یہ مسئلہ مدت دراز سے تسلیم ہوتا چلا آیا ہے۔ یہ جدید نہیں بلکہ قدیم خیالات پر مبنی ہے۔ حکمائے اسلام نے بھی اس اصول کو وسعت دی۔ ثابت بن قرہ اس بات کا قائل تھا کہ ہر جسم کے اجزاء میں باہم کشش ہوتی ہے۔ مولانا روم کی مثنوی میں بھی یہ خیال سمایا ہوا ہے۔

فلسفہ اسلام مسئلہ ارتقاء اور ڈارون : ڈارون نے اپنی بیس سال کی کوششوں کے بعد یہ ارتقا کا نظریہ پیش کیا ہے۔ شبلی کا ماننا ہے کہ جب کسی نئے مسئلہ کا ثابت کرنا مقصود ہو تو اس کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ پہلے وہ باتیں استدلال میں پیش کی جائیں جن کو فریق مخالف بھی تسلیم کرتا ہے۔ پھر وہ باتیں جو ان تسلیم کردہ باتوں سے خود بخود لازم آتی ہیں وہ پیش کی جائیں۔ اس طرح رفتہ رفتہ اصل مطلب تک آئیں۔ ہم بھی یہی طریقہ اختیار کرتے ہیں۔

انسانی دنیا کے تمام موجودات کی چار قسمیں ہیں۔ جمادات، نباتات، حیوانات، انسان۔ ان میں سے ہر قسم کی کئی قسمیں ہوتی ہیں جنھیں اختلاف کے باوجود لوگ ایک ہی نوع میں شمار کرتے ہیں۔ مثلاً کبوتر، گھوڑے وغیرہ کے اقسام اور ایک دوسری قسم ہے جو ترقی کر کے دوسری قسم میں داخل ہوتی ہے۔

یہ قسمیں شروع ہی سے ایک ہی زمانہ میں الگ الگ پیدا ہوئی تھیں۔ پھر انھیں میں سے ادنیٰ درجہ کی قسم ترقی کر کے اعلیٰ ہوئی۔ پھر اس سے اعلیٰ پھر اس سے اعلیٰ تر۔ یہاں تک کہ انسان وجود میں آ گیا۔ عام لوگوں کا ماننا ہے کہ دنیا جب پیدا ہوئی تو جمادات، نباتات، حیوانات سب ایک ہی زمانہ میں پیدا ہوئے اور الگ الگ پیدا ہوئے۔ ڈارون کی رائے ہے کہ پہلے صرف نوع پیدا ہوئی۔ وہی ترقی کرتے کرتے انسان کی حد تک پہنچ گئی۔ بہر حال ان دونوں احتمالوں میں سے کوئی قطعی نہیں بلکہ احتمال ہے۔ یہ بھی سچ ہو سکتا ہے اور وہ بھی۔ لیکن ان احتمالوں میں زیادہ قرین قیاس کون ہے، اور روزمرہ کے تجربے کیا شہادت دیتے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ ہم روزمرہ دیکھتے ہیں کہ تمام چیزیں ترقی کرتی ہیں۔ گلاب کی صرف دو تین قسمیں ہیں۔ اسی طرح ترقی کر کے ایک قسم دوسری قسم ہوتی گئی۔ اس پر اعتراض یہ ہے کہ یہ سلسلہ اب

بند کیوں ہوگیا۔ اس کا سیدھا جواب یہ ہے کہ یہ انقلاب سو دوسو برس کا کام نہیں، ہزاروں برس میں یہ انقلاب وقوع میں آتے ہیں۔

علامہ نے مضمون ''حکمائے اسلام'' میں تربیت موجودات، کھجور حیوانی نبات ہے، نباتات میں بھی قوت لامسہ ہوتی ہے، سب سے کم درجہ کا حیوان، اس درجہ کا حیوان حیوان بھی ہے اور نبات بھی، کم درجہ کے نباتات، سب سے کم درجہ کا حیوان، انسان کے مدارج وغیرہ جیسے ذیلی عنوانات کے تحت اپنے خیالات کو صفحہ قرطاس پر منتقل کیا ہے۔ عبیداللہ خاں ایم۔اے اس سے متعلق لکھتے ہیں:

> ''آج لوگ ڈارون کی تھیوری کا اکثر ذکر کرتے ہیں، لیکن علامہ نے ثابت کیا ہے کہ حکمائے اسلام کا دعویٰ اس سلسلہ میں کیا تھا، اور انھوں نے ڈارون سے برسوں پہلے یہ ثابت کر دیا تھا کہ انسان ارتقاء کی کتنی منزلیں طے کرنے کے بعد اس مقام پر پہنچا ہے۔ انسان کا جمادات، نباتات، حیوانات سے کیا تعلق ہے۔'' [۱]

ڈاکٹر برٹن اور تاریخی فلسفہ اسلام : ڈاکٹر برٹن جرمنی کے مشہور فاضل اور مختلف زبانوں سے واقف تھے۔ انھوں نے تین یونیورسٹیوں سے فلسفہ کی ڈگری حاصل کی تھی۔ وہ بن یونیورسٹی میں مشرقی زبانوں اور اسلامی فلسفہ کی تعلیم کے پروفیسر تھے۔ انھوں نے اپنی پوری زندگی فلسفہ، عربی کی تحقیقات پر صرف کر دی۔ فلسفہ اسلام سے متعلق ان کی دو تصنیفات جرمن زبان میں شائع ہو چکی ہیں۔ ان کی دوسری کتاب خاص فلسفہ اسلام کی تاریخ پر ہے۔ انھوں نے اس کتاب کا نام درجات الفلسفہ فی الاسلام رکھا ہے اور فلسفہ اسلام کے چار دور قائم کئے ہیں اور ان کا تاریخی تعین بھی کیا ہے۔

فلسفہ اور فارسی شاعری (سحابی نجفی) : اس سے متعلق شبلی رقم طراز ہیں کہ فارسی شاعری ترقی کے اس منزل تک پہنچ گئی جس کی نظیر سے ایشیاء کی تمام زبانیں خالی ہیں۔ بلاشبہ عرب نے شاعری کو معراج کمال تک پہنچا دیا۔ لیکن شاعری کی ایک اعلیٰ صنف یعنی فلسفہ کا مطلق پتہ نہیں لیکن فارسی شاعری اس فلسفہ سے

۱۔ البصیر، شبلی نمبر، ص ۱۸۱

عنقا نہیں۔ اگر ان سب کو ترتیب دیا جائے تو فلسفہ کی ایک مستقل کتاب بن جائے گی۔ فلسفیانہ شاعری کے مشہور شعراء خیام اور ناصر خسرو ہیں لیکن سحابی نجفی جو اس اقلیم کا شہنشاہ تھا وہ گمنامی کے پردے میں پڑا رہا۔ تذکروں میں بھی اس کی زندگی پر کچھ خاص روشنی نہیں ڈالی گئی۔ سحابی نے صرف ایک صنف یعنی رباعی میں دلچسپی لی۔ اس کی رباعیاں ستر ہزار بیان کی جاتی ہیں لیکن سب کی سب محفوظ نہیں۔ خود شبلی نے اس کی دس ہزار رباعیاں دیکھی ہیں۔ رباعیوں کے علاوہ غزلیں اور مثنویاں ہیں جو اتنی اہم نہیں۔ رباعیاں فلسفیانہ، صوفیانہ اور اخلاقی مضامین پر ہیں۔ ان میں شبلی نے سحابی کی چند رباعیاں بطور نمونہ تشریح کے ساتھ پیش کی ہیں۔

حقائق اشیاء اور معشوق حقیقی : اس میں صوفیانہ شاعری کے حوالہ سے معشوق حقیقی کے تصور کو ابھارا گیا ہے۔ شبلی رقم طراز ہیں:

> ''تصوف کا راستہ عام شاہراہ سے اس قدر الگ ہے کہ نیا شخص اس عالم میں آتا ہے تو ہر طرف سے اس کے کان میں صدائیں آتی ہیں کہ اس نے آج تک جو کچھ دیکھا تھا سنا تھا سمجھا تھا سب غلط ہے لیکن ایک مدت کا تجربہ علم اور یقین دفعتاً بدل نہیں سکتا..... حضرات صوفیہ بھی اس بات کو جانتے ہیں کہ جو کچھ وہ سمجھانا چاہتے ہیں آسانی سے سمجھ میں آنے والی بات نہیں۔ اس لئے تلقین و ہدایت سے پہلے ان کو عام طرح پر اس مسئلہ کی طرف لوگوں کو متوجہ کرنا پڑتا ہے کہ حقائق اشیاء کیا ہیں۔ وہ پہلے تلقین کرتے ہیں کہ ہر چیز کی حقیقت کا پتہ لگاؤ کہ وہ اصل میں کیا ہے؟ پھر نہایت کثرت سے مثالوں کے ذریعہ سمجھاتے ہیں کہ جس چیز کو تم ایک چیز کی حقیقت سمجھتے ہو یہ اس کی حقیقت نہیں۔''[1]

ندوۃ العلماء کا اجلاس سالانہ اور علمی نمائش گاہ : اس میں علامہ شبلی نے ایک نمائش گاہ کے مختلف صیغوں کا

۱۔ مقالات شبلی جلد ہفتم، ص ۷۵

حال رقم کیا ہے۔اس سلسلے میں شبلی لکھتے ہیں کہ:

اسلام کا یہ ایک خاصہ لازمی تھا کہ جس سرزمین پر قدم رکھتا تھا وہاں کا ذرہ ذرہ علم کی روشنی سے چمک اٹھتا تھا۔ ہندوستان میں چھ سو سال تک اسلامی حکومت سایہ گستر رہی۔اس لئے ضروری تھا کہ یہاں بھی ہر جگہ اس کے آثار پائے جاتے۔لیکن سو سوا سو برس کے بعد ملکی انقلابات نے قدیم یادگاروں کو اس طرح برباد کر دیا کہ ۔

کبھی گویا یہ چیز تھی ہی نہیں

لیکن زیادہ چھان بین تفحص و تلاش سے ثابت ہوتا ہے کہ اب بھی اس ویرانہ میں سیکڑوں ہزاروں بیش بہا خزانے پڑے ہیں جن کی کسی کو خبر نہیں۔ یا ہے تو قدردانی کی نگاہ سے نہیں دیکھے جاتے یا اس درجہ کی قدردانی ہے جو بخالت اور تنگ دلی کی حد سے بھی گزر گئی ہے۔جس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ان چیزوں پر گمشدگی کا پردہ پڑ گیا۔اسی خیال کے بنا پر ندوۃ العلماء کے سالانہ اجلاس میں علمی نمائش گاہ کا صیغہ قائم ہوا اور نہایت قلت فرصت کے ساتھ جو کچھ ممکن تھا کیا گیا۔

ندوہ کے پہلے اجلاس مورخہ ۱۴/اپریل ۱۹۰۶ء مقام بنارس میں یہ تمام علمی سرمایہ ٹاؤن ہال میں ایک خاص ترتیب سے سجایا گیا۔شہر کے انگریزی حکام بڑے شوق سے شریک ہوئے۔علماء اور فضلاء جو دور دراز مقامات سے آئے تھے ان کو اگرچہ فرامین وغیرہ سے چنداں دلچسپی نہ تھی لیکن فن حدیث کی جو نادر کتابیں مہیا کی گئی تھیں اور جن میں سے متعدد کتابیں صحیح بخاری سے بیش تر زمانہ کی تصنیف تھیں ان کو خواہ مخواہ اپنی طرف مائل کرتی تھیں۔اس تمام نادر سرمایہ کی تقسیم حسب ذیل تھی۔

فرامین و توقیعات شاہی، نادر الوجود کتابیں، نہایت قدیم زمانہ کی لکھی ہوئی کتابیں، مشہور خطاطوں کے خط کے نمونے، مصنفین کے ہاتھ کے مسودے، سلاطین اور امراء کے ہاتھ کی تحریریں، فن بلاغت کا پورا سلسلہ، فارسی شاعری کا پورا سلسلہ، ان تمام ذیلی عنوانات پر شبلی نے اپنی کاوشوں سے فراہم کئے گئے مواد قارئین کے سامنے پیش کئے ہیں۔

مقالات شبلی جلد ہشتم

یہ مولانا شبلی کے مذہبی، اصلاحی، تعلیمی، معاشرتی اور سیاسی مقالات کا مجموعہ ہے جو الندوہ، مسلم گزٹ اور دوسرے اخبارات ورسائل سے اکٹھا کیا گیا ہے۔ اس مجموعہ پر نظر ڈالنے سے مصنف کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر ایک ساتھ نظر پڑتی ہے۔ مولانا شبلی کے مذہبی مقالات میں صیغۂ اشاعت اسلام، نومسلم راجپوت اور حفاظت اسلام، حفاظت و اشاعت اسلام، نومسلموں کی دوبارہ ہندو ہوجانے سے بچانے کے لئے تمام برادران اسلام کی خدمت میں فریاد، کاروائی انجمن وقف علی الاولاد، وقف اولاد کی کاروائی کہاں تک پہنچی، اوقاف اسلامی، وقف اولاد کے مسئلہ کے متعلق ایک نہایت ضروری تحریک، مہموریل، متعلق نماز جمعہ، علمی وتاریخی ایک عظیم الشان تحریک، یعنی آنحضرت ﷺ کی مفصل اور مستند سوانح عمری مرتب کرنے کی تجویز، ایک اور آفتاب عالم غروب ہوگیا (یعنی مولانا فاروق چریاکوٹی کا اس دار فانی سے کوچ کر جانا)، ابن رشد، المامون، اشاعت کتب قدیمہ، انگریزی قرآن مجید کا ترجمہ اور ندوۃ العلماء مجلس علم کلام، ایک اہم تجویز، اثبات واجب الوجود مصنفہ مولوی مفتی انوار الحق صاحب سکریٹری صیغۂ تعلیمات ریاست بھوپال، ندوۃ العلماء کا گیارہواں سالانہ اجلاس بنارس میں اور علمی نمائش خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ ان میں سے کچھ مضامین مولانا شبلی نے الندوہ، مسلم گزٹ، آزاد، الہلال میں شائع کرائے اور قوم کے سامنے قومی اور مذہبی تجویزیں پیش کیں۔ ان میں سے کچھ کو اپنی کوششوں سے پایہ تکمیل تک پہنچایا اور کچھ مناسب فضا نہ ہونے کی وجہ سے بارآور نہ ہوسکیں۔

علامہ شبلی نے اشاعت اسلام کا کام باقاعدہ طور پر شروع کیا اور سید سلیمان ندوی کو قومی خدمت کی تعلیم کی غرض سے مددگار ناظم بنادیا۔ علامہ شبلی کا ماننا تھا کہ اشاعت اسلام کی اہمیت کا احساس پورے ہندوستان کے مسلمانوں کو ہوگیا ہے۔ لیکن اس کے متعلق جو کوششیں ہورہی ہیں وہ ناتمام اور ناکافی ہیں۔ دیہات میں رہنے والے احکام اسلام سے ناواقف ہوتے ہیں۔ اس لئے آریہ وغیرہ ان کو مرتد کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ نئی نسل بچپن سے انگریزی تعلیم حاصل کرنے لگی جن میں سے اکثر اسلام

سے ناواقف ہوتے ہیں۔ چنانچہ انگریزی تعلیم ان کے عقائد کو متزلزل کر دیتی ہے۔ انہیں دونوں گروہوں سے اسلام کی حفاظت کرنا اشاعت اسلام کا اصلی کام ہے۔

سید صاحب دیباچہ میں وقف اولاد، اوقاف اسلامی، نماز جمعہ کی تعطیل اور سیرت نبوی سے متعلق لکھتے ہیں:

''وقف اولاد کا مسئلہ جس میں سرسید کا ناکام ہو گئے تھے مولانا شبلی کی کوششوں سے ایسا کامیاب ہوا کہ حکومت وقت کو اس کے آگے سر تسلیم خم کرنا پڑا، اور مسٹر محمد علی جناح کی تحریک سے اسمبلی نے اس قانون کو بنانا منظور کیا..... نماز جمعہ کی تعطیل کے مسئلہ کو اٹھایا اور اس حد تک کہ اس کو گورنمنٹ سے منوالیا کہ جو مسلمان نماز جمعہ میں جانا چاہیں وہ ایک مقررہ وقت کے لئے جاسکتے ہیں۔ اسی سلسلہ میں مولانا کی ایک گفتگو یاد آئی جن دنوں وہ اس تحریک کو چلا رہے تھے۔ فرمایا بھائی اگر تعطیل منظور ہوگئی اور مسلمان عام طور سے نماز پڑھنے نہ جائیں تو اسلام کی کیسی بدنامی ہوگی۔ ان کی سیرت نبوی کی تجویز ایسی پھولی پھلی کہ آج ہماری زبان اس مقدس لٹریچر کی فراوانی، بلندی اور افادیت پر بجا فخر کر سکتی ہے..... عام اوقاف اسلامی کا کام انھوں نے اخیر زندگی میں شروع کیا تھا اور ناتمام رہا تھا۔ مگر اکثر صوبوں میں ان کی ناتمام کوششوں کی آواز بازگشت گونجی اور سالہا سال کے بعد صوبوں کی حکومتوں نے اس کے متعلق اب کچھ نہ کچھ کیا ہے۔''[1]

مقالات شبلی جلد ہشتم کے تعلیمی مضامین میں ندوۃ العلماء کیا کر رہا ہے؟ ندوہ کی نئی زندگی کا آغاز، خاتونان قوم کی عزت اور یادگار، زندہ زبیدہ خاتون، ایک مذہبی یونیورسٹی یعنی دارالعلوم ندوۃ العلماء کے

۱۔ مقالات شبلی، جلد ہشتم، ص ۶

سنگ بنیاد کا جلسہ اور جلسہ سالانہ ندوۃ العلماء، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے سنگ بنیاد کا عظیم الشان میلہ، ایک مذہبی مدرسہ اعظم کی عمارت کے لئے تمام ہندوستان کے مسلمانوں سے درخواست، جلسۂ عالی مقام جناب مستطاب حضور ہز ہائنس سر آغا خاں بہادر دام عزہ ومجدہ، دارالاقامہ کے کمروں کی تیاری، مصر کی یونیورسٹی، بھوپال میں ندوۃ العلماء کا وفد اور حضور سرکار عالیہ خلدھا اللہ تعالیٰ کی فیاضی، ندوۃ العلماء کا نیا دور اور اس کا جلسۂ سالانہ (بنارس میں)، البشیر اور ندوۃ العلماء، مولوی عبدالکریم صاحب کی معطّلی اور مولانا عبدالحیٔ صاحب، مولانا عبدالباری کی شہادت، اسٹرائک کا سبب کون تھا۔ اصلاح ندوۃ اور ہمدرد، جلسۂ دہلی کے متعلق ایک غلط فہمی کی تردید، دارالعلوم ندوہ کی ایک اور خصوصیت، علمی گروہ، مولانا کے یہ تعلیمی مضامین سید سلیمان ندوی نے الندوہ، وکیل، ہمدرد، زمیندار میں سے اکٹھا کر کے مقالات کی شکل میں پیش کیا۔

سیاسی مضامین میں مسلمانوں کی پولٹیکل کروٹ، لیڈروں کا قصور ہے یا لیڈر بنانے والوں کا، اور مسئلہ آرمینیا کے عنوان سے مضامین تحریر کئے ہیں۔ یہ مضامین مسلم گزٹ، معارف، اور آزاد لکھنؤ میں شائع ہوئے۔

متفرق مضامین میں اضلاع سرحدی کا مختصر دورہ، حضور نظام کی چالیسویں سالگرہ اور اراکین ندوۃ العلوم کا تہنیت نامہ، مولانا حالی کی ذرہ نوازی، ہائے نواب محسن الملک مرحوم ان تمام عنوانات کے تحت سید صاحب نے علامہ شبلی کے متفرق مضامین جلد ہشتم میں یکجا کر کے قارئین کو سہولت فراہم کر دی ہے۔ مقالات شبلی جلد ہشتم سے متعلق عبیداللہ خاں صاحب ایم۔اے رقم طراز ہیں:

> ''ان میں مولانا نے بڑی بے باکی سے اپنے نظریات کو پیش کیا ہے۔ اس سلسلہ میں ان کا مسلک مولانا رشید احمد گنگوہی، شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب اور دوسرے انقلاب پسند علماؤں کی طرح ہے۔ وہ کسی نہ کسی طرح اپنے لوگوں کی حکومت قائم کرنا چاہتے ہیں اسی لئے وہ جا بجا اس وقت کانگریس سے وابستہ ہو جاتے ہیں جب کہ ابھی کانگریس ابتدائی دور سے گزر رہی تھی اور

وہ مکمل آزادی کی حامی بھی نہ تھی۔ لیکن مولانا کی دوررس نگاہ یہ دیکھ رہی تھی کہ جب تک ہندوستان کے تمام فرقے ایک پلیٹ فارم پر جمع ہو کر انگریز کے خلاف جدوجہد نہ کریں گے، انگریز ہندوستان سے جانے کا نام نہیں لے گا۔ چنانچہ علامہ نے جابجا کانگریس کے کام کو سراہا ہے اور اس وقت کی فرقہ پرست جماعتوں کی مخالفت کی ہے۔ علامہ کے یہاں ایک کمال ضرور ہے کہ وہ کانگریس کے مداح ہوتے ہوئے بھی عدم تشدد کے قائل نظر نہیں آتے۔ اگر وہ زندہ رہتے تو اس مسئلہ پر اور بعض دوسرے مسئلوں پر ان کا گاندھی جی سے اور دوسرے لوگوں سے ٹکراؤ ہوتا۔ کیونکہ وہ سیاست ہند کو بھی اسلامی نقطۂ نگاہ سے لیتے تھے۔ اس لئے وہ مولانا حسرت موہانی کی طرح کبھی یہ گوارا نہ کرتے کہ ان کے اس سیاسی مسلک سے اسلام یا مسلمانوں کو کسی طرح کا نقصان پہنچے۔'' [۱]

مقالات شبلی سے متعلق خورشید نعمانی اپنے خیالات اس طرح رقم کرتے ہیں:

''مولانا شبلی کی رگ و پے میں حب الوطنی اور نیشنلزم کا جذبہ جاری و ساری ہے۔ وہ جہاں عربوں کے کارنامے بیان کرتے ہیں اور ترکوں سے محبت کرتے نظر آتے ہیں، وطن اور مادر وطن کے لوگوں کو فراموش نہیں کرتے بلکہ بڑے فخر کے ساتھ ان کا تذکرہ کرتے ہیں۔ انہیں حرم پاک سے محبت ہے اور اس کے لئے وہ اپنی جان تک قربان کرنے کے لئے تیار رہے۔ انہدام مسجد کانپور کا حادثہ بھی انہیں ایک تماشائی کی طرح بیٹھنے نہیں دیتا بلکہ وہ اس کے لئے خون کے آنسو بہاتے ہیں۔ اور کانپور سے دوری اور قید نہ ہو سکنے پر اظہار افسوس کرتے ہیں۔ یہی حب الوطنی کا جذبہ انہیں برادران وطن کے ساتھ اشتراک

۱۔ البصیر، شبلی نمبر، ص ۱۸۱

THES

عمل پر مجبور کرتا ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح ایک غیر ملکی حکومت سے نجات مل جائے اور اپنے وطن میں ہم وطنوں کی حکومت ہو۔''

خورشید نعمانی مزید لکھتے ہیں:

''ان مقالات میں جا بجا انگریزی کے الفاظ مثلاً ریمارک، آئیڈیل، پوزیشن، ڈسکوریز، پالیٹیکل، پالیٹکس، لٹریچر وغیرہ نظر آجاتے ہیں۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ایک تو انگریزی حکومت کے پاؤں مضبوط ہونے کے بعد نہ صرف ہماری روزمرہ کی زندگی بلکہ رہن سہن بول چال پر بھی اس کا اثر پڑ رہا تھا۔ لیکن مولانا کا انگریزی الفاظ کے استعمال سے یہ مطلب بھی تھا کہ وہ اردو زبان کو وسیع کر کے اسے ایک عام ربط کی زبان کا درجہ بھی دے سکیں۔''[1]

مولانا شبلی کی تصانیف کا اگر بنظر غائر مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ منتخب موضوع سے متعلق جب تک وہ اچھی طرح مطمئن نہیں ہوتے قلم نہیں اٹھاتے۔ وہ موضوع کے ہر پہلو کا تنقیدی جائزہ لیتے ہوئے چلتے ہیں۔ ان کے مقالات کی زبان عالمانہ اور انداز بیان محققانہ ہوتا ہے۔ آپ کے انداز کو بلاشبہ سرسید تحریک کے انداز بیان کی انتہائی اعلیٰ وارفع توضیح کا نام دیا جاسکتا ہے۔ مولانا ہر مسئلہ کے بارے میں اپنی رائے، دلائل و براہین رکھتے ہیں اور ذی فہم اور غیر متعصب شخص کو اسے ماننے پر آمادہ کر دیتے ہیں۔ آپ کی تحریروں میں بے پناہ اعتدال و توازن پایا جاتا ہے۔ آپ کے مقالات میں نہ تو الفاظ کی جلوہ گری کے منظر ہوتے ہیں اور نہ بلا مقصد صنائع و بدائع کا استعمال کرتے ہیں۔ اعتدال کا دامن کبھی ہاتھ سے نہیں جانتے دیتے۔ اگر کہیں جذباتیت نظر بھی آتی ہے تو ہوش مندی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ آپ جو کچھ بھی کہتے ہیں کافی اعتماد و وثوق کے ساتھ لکھتے ہیں تاکہ آپ کے قلم سے نکلی ہوئی کوئی بات علمی دنیا میں پایۂ اعتبار سے ساقط نہ قرار دی جائے۔ اگر آپ کو اپنے ہم عصروں میں کسی کے افکار و نظریات سے

۱۔ دارالمصنفین کی تاریخی اور علمی خدمات، حصہ دوم، ڈاکٹر خورشید نعمانی، ص ۱۴۴

اختلاف ہوتا ہے تب بھی آپ ایک ایماندار ناقد کی طرح اس کی اچھی اور صحیح بات کو بہ بانگ دہل اچھی اور صحیح قرار دیتے ہیں۔

مولانا کے مضامین سے متعلق سید صباح الدین عبدالرحمٰن لکھتے ہیں:

''مولانا کا یہ بھی کارنامہ ہے کہ انھوں نے ان مضامین کے ذریعہ سے احقاق اور ازہاق باطل کے لئے زمانہ کے مطابق ایک دل نشین شکل پیدا کردی اور جب مسلمان اپنی عظیم الشان سلطنت اور تہذیب کھو کر ذہنی طور سے شکست خوردہ ہو رہے تھے تو مولانا نے اپنے مضامین کی للکار اور پکار سے ان کو ماضی کی عظمت کو یاد دلا کر ان کے سروں کو سربلند رکھنے کی کوشش کی جس سے ان کو اپنی حیات نو کو پھر سے سنوارنے میں بڑی مدد ملی۔ اس لحاظ سے ان کو عہد جدید کا ''معلم اوّل'' کہنا صحیح ہے۔'' [۱]

ڈاکٹر شباب الدین صاحب مقالات شبلی سے متعلق لکھتے ہیں:

''مقالات شبلی کے موضوعات تو اپنی جگہ اہم ہیں ہی مگر ان کی قدر و قیمت شبلی کے انداز بیان میں پنہاں ہے جس نے اس کے تعارفی تحریر کو تخلیقی حسن سے مزین کردیا ہے۔ شبلی کی پوری نثر نگاری اسی تخلیقی صلاحیت اور شعور کی غماز ہے۔ اور یہی چیز ان کے معاصرین میں ان کو منفرد و یگانہ بناتی ہے۔ شبلی کا کوئی مقالہ لے لیجئے خواہ وہ مذہبی موضوعات سے متعلق ہو، خواہ تاریخی یا ادبی موضوعات سے ہر جگہ ان کا یہی انداز بیان نظر آئے گا۔'' [۲]

۱۔ مولانا شبلی پر ایک نظر، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ص ۹۰

۲۔ دارالمصنفین کی ادبی خدمات ۱۹۸۰ء تک، ڈاکٹر شباب الدین، ص ۷۰

مکاتیب شبلی جلد اول، دوم

خطوط نویسی یا نامہ نگاری کا آغاز اسی زمانے میں ہوگیا تھا جب انسان نے رسم الخط ایجاد کیا اور لکھنا سیکھا۔ قدیم یونان میں خط و کتابت کا رواج تھا۔ اس کے علاوہ دنیا کی ہر زبان میں خط و کتابت کا رواج تھا۔ عربی میں خط لکھنا ایک پیشہ تھا اور اس پیشہ کو اختیار کرنے والے کو کاتب کہا جاتا تھا۔ عربی زبان کا وقار ختم ہونے اور فارسی زبان کے فروغ پانے پر عہد وسطیٰ میں تعلیم کا نصاب اس طرح بنایا گیا تھا کہ بچوں کو پہلے ذخیرہ الفاظ سے روشناس کرایا جاتا۔ پھر انھیں خطوط نویسی کی تعلیم دی جاتی تھی۔ فارسی میں خطوط نویسی کو رسمی اور کاروباری مقاصد کے علاوہ مذہبی اور اخلاقی تعلیم کے لئے بھی استعمال کیا گیا۔ انیسویں صدی کے نصف اوّل تک خانگی خطوط بھی فارسی میں لکھنے کا رواج تھا اور اسے علم و کمال کی نشانی سمجھا جاتا تھا۔ اردو میں جو خطوط لکھے بھی گئے وہ مسجع و مقفع اور پر تکلف اردو میں ہیں جہاں لفظوں کے جنگل میں معنی روپوش ہو جاتے ہیں۔ سر برآوردہ و ممتاز اردو شعراء میں سب سے پہلے مرزا اسداللہ خاں غالب نے اردو خطوط نویسی کی بنیاد ڈالی۔ وہ بھی فارسی نگارش کے دلدادہ تھے لیکن ۱۸۵۷ء کے غدر کے بعد جو عام بے دلی اور افسردگی چھا گئی تھی اس سے اداس ہو کر مرزا غالب نے سیدھے سادے لفظوں میں اظہار مطالب کر کے بقول خود ''مراسلہ کو مکالمہ'' بنا دیا۔ اس طرح اردو خطوط نگاری کا ابتدائی دور فارسی مکتوب نگاری کی تتبع میں ہے۔ چونکہ فارسی میں مکتوب نگار طویل و عریض القاب و آداب، مسجع و مقفی عبارت اور تکلف و تصنع کے ساتھ اپنے خیالات کا ظہار کرتا تھا، اردو مکتوب نگاروں نے فارسی مکتوب نگاری کی اتباع کی لیکن غالب پہلے مکتوب نگار ہیں جنھوں نے خطوط میں القاب و آداب کے پرانے اور فرسودہ طریقہ کو اختیار کرنے سے احتراز کیا اور ایک نئی طرز ایجاد کی۔ انھوں نے اردو مکتوب نگاری کو تمام تکلفات، القاب و آداب کا پرانا طریقہ، شکر و شکوہ، شادی و غم کے قدیم رویے سے یکسر پاک کیا اور عام فہم انداز میں خطوط نویسی کی بنیاد ڈالی۔ وہ خط اس انداز میں لکھتے جیسے مکتوب الیہ ان کے سامنے بیٹھا محو گفتگو ہو۔ انداز بیان سے بے تکلفی اور یگانگت کا اظہار ہوتا۔ ان کا یہ انداز کافی پسند کیا گیا۔ ان کے خطوط مقبول ہونے لگے۔ بعد کے اردو

مکتوب نگاروں نے اسی نئی روش کو اختیار کیا اور سیدھے سادے انداز میں خط لکھے جانے لگے۔ غالب کو شعوری طور پر اپنے خطوط کی خصوصیت کا احساس ہو گیا تھا۔ چنانچہ ایک دوست کو لکھتے ہیں کہ:

''میں نے وہ انداز اختیار کیا ہے کہ مراسلے کو مکالمہ بنا دیا ہے۔''

اس کے علاوہ غالب کے خطوط کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ وہ آپ بیتی کو جگ بیتی بنا کر پیش کرتے ہیں۔ ان کے خطوط کی بے تکلفی، ادبی چاشنی اور دل نواز اسلوب سے متاثر ہو کر مرزا غالب کے کچھ دوستوں نے ان کے خطوط کو اکٹھا کر کے ''عود ہندی'' کے نام سے شائع کیا جس سے ہماری ادبی اور سماجی زندگی کی تاریخ مرتب کرنے کا مواد فراہم ہو گیا۔ سرسید احمد خاں نے بھی اردو میں سائنٹفک اور آسان نثر کی بنیاد رکھی۔ ابتداء میں وہ بھی مرصع نگاری کے دلدادہ تھے لیکن مغربی ادبیات سے بالواسطہ تاثر نے انھیں سہل نویسی کی اہمیت کا احساس دلایا تو انھوں نے اپنی عبارت کو آسان بنایا۔ چنانچہ سرسید کے دور میں غالب کے اختیار کردہ طرز کو اپنانے اور اردو زبان کو عام فہم اور علمی زبان کا مرتبہ دینے کے لئے جو کوشش کی اسے باقاعدہ تحریک کہا جا سکتا ہے۔ سرسید کے ہم نواؤں میں شبلی نعمانی، الطاف حسین حالی، ڈپٹی نذیر احمد، محمد حسین آزاد، وقار الملک، محسن الملک، اکبر الہ آبادی، امیر مینائی، مہدی افادی وغیرہ نے اس طرز اور اس روش کو اختیار کیا۔ لیکن ان مکتوب نگاروں میں علامہ شبلی کے مکتوب کو ایک امتیازی اور انفرادی اہمیت حاصل ہے۔

خطوط سے متعلق عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ وہ صرف مکتوب الیہ ہی کی نظر سے گزریں گے اس لئے انسان اپنے اصلی جذبات و احساسات کا اظہار کر دیتا ہے اور غیر محسوس طریقے سے اس کی روزمرہ کی زندگی مرتب ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ خطوط میں بے ساختہ پن اور آمد سخن ہوتی ہے اس لئے اس میں ادبیت بھی اعلیٰ درجے کی ہوتی ہے۔ مولانا عبدالحق خطوط شبلی کے مقدمہ میں رقم طراز ہیں:

''خانگی خطوں میں اور خاص کر ان خطوں میں جو اپنے عزیز اور مخلص دوستوں کو لکھے جاتے ہیں ایک خاص دلچسپی ہوتی ہے۔ تکلف کا پردہ بالکل اٹھ جاتا ہے

اور مصلحت کی دراندازی کا کھٹکا نہیں رہتا۔ گویا انسان اپنے سے خود باتیں کررہا ہے۔ جہاں اندیشہ لومت لائم نہیں ہے۔ یہ دلی خیالات و جذبات کا روزنامچہ اور اسرار حیات کا صحیفہ ہے۔ پھر کون ہے جو اس خاموش آواز کو سننے کا مشتاق نہ ہوگا۔ ہماری فطرت میں ہے اور یہی وجہ ہے کہ ہم روزنامچوں، آپ بیتیوں اور خطوں کو بڑے ذوق وشوق سے پڑھتے ہیں۔ ان میں وہ صداقت اور خلوص ہے جو دوسرے کلام میں نظر نہیں آتا۔ یہاں انسان بچپن کی سی سادگی سے بلاتصنع ان خیالات کو بیان کرتا ہے جو اس کے دل و دماغ میں گزرتے ہیں۔ جنھیں نہ انشا کی صنعت مسخ کرسکتی ہے اور نہ تشبیہات واستعارات کا بوجھ دبا سکتا ہے۔ گویا وہ کاغذ کے صفحے پر اپنا دل اور دماغ کھول کر رکھ دیتا ہے جس میں ہر حرکت، ہر خیال، ہر تمنا جیتی جاگتی اور گھٹتی بڑھتی نظر آتی ہے۔'' [۱]

مولانا شبلی کا شمار اردو کے بہترین مکتوب نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کے خطوط اپنی تازگی، شگفتگی، صفائی و برجستگی کی وجہ سے خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ غالب کے بعد جو جدت اور لطافت تازگی و بے ساختگی ادب وانشا ان خطوط میں ہے وہ ان کے ہم عصروں میں سے کسی اور کے یہاں نہیں ہے۔ علامہ شبلی کئی وجوہات سے اپنے ہم عصروں میں ممتاز تھے۔ وہ اپنے خیالات اور مذاق طبیعت میں اپنے دور سے بہت آگے دیکھ رہے تھے۔ ان کی ہر چیز میں جدت وذہانت تھی۔ جس میدان میں بھی انھوں نے قدم رکھا اپنی الگ راہ نکالی۔ افکار وتصورات، تالیف وتصنیف، تحقیق وتنقید اور ادب وانشا میں ایک انقلاب برپا کردیا تھا۔ ان کی شخصیت بہت جامع وہمہ گیر تھی۔ وہ عربی وفارسی کے عالم تھے۔ اردو کے مایہ ناز ادیب و مصنف تھے۔ مذہبی علوم کے ماہر تھے اور جدید خیالات ورجحانات کے واقف کار بھی تھے۔ نقاد ومحقق بھی تھے اور شاعر وانشا پرداز بھی، ادیب ومورخ بھی تھے اور رہنمائے قوم وملت وسیاست بھی ان سب کا عکس

۱۔ خطوط شبلی، محمد امین زبیری، ص ۵

کمالات واوصاف کے مختلف جلوے ان کے خطوط میں نظر آتے ہیں۔ جس سے ان کی سیرت وشخصیت کی تکمیل کی جاسکتی ہے۔

مولانا شبلی کے وہ خطوط جوانھوں نے دوستوں اور شاگردوں کے نام تحریر کئے ہیں، دارالمصنفین نے مکاتیب شبلی کے نام سے دوجلدوں میں شائع کردیئے ہیں۔ پہلی جلد میں وہ خطوط شامل ہیں جوانھوں نے اپنے عزیزوں اور دوستوں کے نام وقتاً فوقتاً لکھے۔ جس میں ملکی، قومی، علمی، اصلاحی خیالات ومسائل کا بڑا ذخیرہ موجود ہے۔ دوسری جلد مع ضمیمہ کے شائع ہوئی ہے جس میں مولانا کے وہ خطوط ہیں جو مولانا نے وقتاً فوقتاً اپنے تلامذہ اور شاگردوں کے نام لکھے ہیں۔ ان خطوط میں زیادہ علمی واصلاحی خیالات کی تلقین کی گئی ہے۔ ضمیمہ اول میں عزیزوں اور دوستوں کے خطوط ہیں جو دیر میں پہنچنے کی وجہ سے حصہ اول میں جگہ نہ پاسکے اور ضمیمہ دوم میں ان کے قدیم فارسی وعربی خطوط ہیں۔ ان تمام خطوط میں مولانا کی نثر نگاری کی ساری خصوصیات موجود ہیں جس سے شبلی کی رنگارنگ شخصیت مثلاً علم وفن کے تذکرے، شعروادب پر مباحث، تصنیف وتالیف سے دلچسپی، تحقیق وتدقیق کے مسائل، تنقید وتبصرہ، مطالعہ کا شوق، مذہبی جوش و خروش، عزیز واقارب سے محبت، سیر وتفریح، شوخی وظرافت، رنج ومسرت اور طنز وتعریض کے چھینٹے ان کے خطوط کے ذریعہ ان کی شخصیت کی عکاسی کرتے ہیں۔ ان کے خطوط اپنی تازگی وندرت اور ایجاز کے باعث مستقل قدر وقیمت کے حامل ہیں۔ جس سے ان کے ذہنی وفکری رجحانات اور قومی وملی مسائل سے گہری دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے۔ ان کے مختصر سے مختصر خط سے بھی ایسا سکون حاصل ہوتا ہے جیسے کسی نے کوئی دلچسپ داستان چھیڑ دی ہو۔

شبلی کے خطوط کی خصوصیت یہ ہے کہ وہ غالب کے طرح القاب وآداب کی پرواہ کئے بنا سلام ودعا کے بعد فوراً مطلب کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ خط مختصر لکھتے ہیں مگر اس میں مقصد کی وضاحت اور معنی کی وسعت موجود ہوتی ہے۔ ان کا ہر لفظ اس طرح جچا، تلا اور پرتاثیر ہوتا ہے کہ قاری اس کی لطافت میں کھو جاتا ہے۔ مولانا شبلی اپنے مخاطب کے مقام ومراتب اور جذبات ونفسیات کا پورا خیال رکھتے ہیں اور ہر

شخص کو اس کے ذوق کے مطابق خط لکھتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کے خطوط مستقل قدر و قیمت کے حامل ہیں۔ شبلی کے خطوط سے متعلق پروفیسر خورشید الا اسلام صاحب اس طرح رقم طراز ہیں:

''شبلی کے خطوط ہمارا قومی اعمال نامہ ہیں۔ ان میں شبلی کی خانگی زندگی نمایاں نہیں ہے لیکن پس پردہ جلوؤں کی ایسی کمی بھی نہیں ہے۔ بہر حال ان خطوط میں ندوے کی دریافت پر خوشی کا اظہار ہے۔ تبصرے میں تنقیدی اشارات ہیں، دوستوں سے سرگوشیاں ہیں، عزیزوں کی سفارش ہے، اپنی عظمت کا شعور ہے اور وہ لطائف ہیں جو روح و بدن کو مخمور کئے بغیر حاصل نہیں ہوتے۔'' [۱]

سید سلیمان ندوی نے مکاتیب شبلی کے مقدمہ میں شبلی کے خطوط نویسی کی جو چند اہم خصوصیات بتائی ہیں وہ یہ ہیں۔

۱۔ نہایت مختصر لکھتے تھے۔ ''صرف ہاں'' ''ناں'' پر اکتفا کرتے تھے۔ مفصل اور طویل سوالوں کا جواب بھی ایک دو فقروں میں دیتے تھے۔

۲۔ لیکن درحقیقت مختصر نویسی کوئی ایسی خوبی کی بات نہیں ہے۔ اصل خوبی یہ ہے کہ اختصار لفظ کے ساتھ معنی میں پوری وسعت موجود ہو۔ یہی خصوصیات مولانا کی انشا پردازی اور بلاغت کی جان ہے۔ ان ہی ایک دو فقروں میں وہ جو کچھ کہہ جاتے ہیں ہم صفحوں میں ان کو نہیں کہہ سکتے۔

۳۔ القاب و آداب کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ اکثر بلا تمہید مطلب شروع کر دیتے تھے۔

۴۔ خطوط کے جواب نہایت پابندی کے ساتھ اور نہایت جلد بلکہ اسی دن لکھتے تھے۔ بیماری میں بھی وہ اس وضع کو نبھاتے تھے۔ بہت مجبور ہوتے تو دوسروں سے لکھواتے۔

۵۔ ابتداً مولانا کا خط شکستہ تھا۔ پھر خوشخط نستعلیق لکھنے لگے۔ آخر میں شکستہ اور نستعلیق مل کر ایک عجیب خود سواد خط پیدا ہو گیا تھا۔

۱۔ تنقیدیں، شبلی خطوط کی روشنی میں، ڈاکٹر خورشید الاسلام، ص ۵۸

۶۔ مولانا ہر شخص سے اس کے مذاق اور تعلقات کے مطابق گفتگو کرتے تھے۔ شاگردوں کے خطوط میں علمی و اصلاحی مشورے نظر آتے ہیں۔ مولوی حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کے خطوط میں فارسی شاعری، نوادر کتب اور ندوہ کے متعلق باتیں ہیں۔ پروفیسر عبدالقادر سے ادب، تاریخ، فارسی کے مباحث پر گفتگو، مولانا حمید الدین صاحب سے تفسیر اور سیرت پر مکالمات ہیں۔ مسٹر عبدالماجد سے مغربیات کی باتیں ہیں، مسٹر مہدی حسن صاحب مصنف دائرہ ادبیہ کے خطوط میں ''محاسن ادبی'' اور لطافت شعری پر گلفشانیاں ہیں۔

مولانا شبلی اپنی تحریروں میں ایجاز پیدا کرنے کے لئے استعاروں کا استعمال بھی کثرت سے کرتے تھے۔ یہ استعارے ادبی اور اختراعی ہوا کرتے تھے۔ بعض استعارے خطاب کے قائم مقام ہوا کرتے تھے۔ عطیہ فیضی کو قرۃ العینی، مولانا ابوالکلام کو عالم السرائر، مہدی کی بیوی کو ایمان بالغیب، اپنے بھائی کو نفوس قدسیہ، دوسری شادی کو احرام جدید۔

شبلی کے مزاج میں شوخی وظرافت اور تندی تھی جو ان کے مکاتیب میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ ان کے مکاتیب اپنی تازگی، طرفگی، ندرت، ایجاز واختصار، آشنا پایہ، سخن گسترانہ انداز کے باعث مستقل اہمیت کے حامل ہیں۔ ان کے خطوط میں مقصد کا وجود اور پیغام کا اختصار اور مخاطبوں کے رتبہ و مقام کا لحاظ موجود ہے۔ وہ جذبات ونفسیات کا بھی پورا پورا خیال رکھتے تھے۔ ڈاکٹر سید عبداللہ اپنے ایک مضمون ''اردو خطوط نگاری'' میں شبلی کے خطوط نگاری پر تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''ان کے خطوط میں ذوق وشوق اور دل و دماغ کو سیراب وشاداب رکھنے کی پوری صلاحیت موجود ہے۔ کچھ اس طرح معلوم ہوتا ہے جیسے ان کا ہر خط ایک زعفران کا پھول ہے جس میں باغ فردوس کی خوشبو ہے۔ اس پر طرہ یہ کہ ان کے خط بالکل مختصر ہوتے ہیں۔ ایجاز یوں بھی شبلی کی تحریر کا خاصہ ہے مگر جو ایجاز ان کے خطوط میں ہے ان کو جان ایجاز ہی کہا جا سکتا ہے۔ ان کی مکتوب نگاری فرصت اور وقت گزاری کا مشغلہ نہیں۔ ان کا ہر خط کسی جمیل یا جزیل مقصد سے

وابستہ ہے۔ان کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ وقت کی اہمیت کو جانتے ہیں اور اس کی قدر کرتے ہیں۔لہٰذا زندگی کا ایک لمحہ بھی ان کے نزدیک رائگاں نہیں۔اسی تناسب سے ان کے خط کا شاید ایک لفظ بھی بیکار اور بے ضرورت نہیں۔جچا تلا ضروری ضروری مگر اس میں عجیب طرح کی تاثیر ہوتی ہے۔اور ان کے چھوٹے سے چھوٹے خط سے بھی ایسی تسکین ملتی ہے گویا کسی نے کوئی دلچسپ داستان ورق ورق پڑھ ڈالی ہو۔'' [۱]

شبلی کے بعض خطوط سے برجستگی اور مخاطب کرنے کا کافی انوکھا انداز ملتا ہے۔وہ چھوٹے چھوٹے جملے ایسے بے تکلف انداز اور سادہ پن میں ادا کرتے ہیں کہ بالکل غالب کی طرح مراسلے کو مکالمہ بنا رہے ہیں۔القاب و آداب کا انداز بالکل غالب کی طرح مختصر ہوتا ہے۔آپ کے خطوط میں جدت و لطافت اور سادگی و پرکاری ہے۔آپ کی سادگی میں بھی ایک ادبی بانکپن نظر آتا ہے۔آپ کے خطوط پر نام نہ ہو تو غالب کے خطوط کا اندازہ ہوتا ہے۔ایک عزیز کو خط نہ لکھنے کا شکوہ اس انداز میں کرتے ہیں:

''بھئی سب نے خط نہ لکھنے کی قسم کھالی ہے یا کسی منت پر روزہ سکوت رکھا ہے۔ آخر بات کیا ہے۔مولوی عمر صاحب الگ دم بخود ہیں۔تم جدا خاموش ہو۔ مہدی نے اعظم گڑھ پہنچنے کی رسید تک نہیں لکھی۔والد قبلہ کو کام سے کہاں فرصت،اس مہنگائی میں بھی بھائی مولوی محمد سعید صاحب کی دو سطریں اگرچہ صرف مطلب کی ہیں۔غنیمت معلوم ہوتیں،کیا سنسان کا عالم ہے۔گویا ان تلوں میں تیل ہی نہیں تھا۔خیر شکایت کیوں کیجئے۔دوسروں پر زور کیا۔جب گھر بار چھوٹے عزیز آشنا چھوٹے تو غربت میں کوئی کیوں کسی کا ساتھ دے،لو صبر آ گیا۔'' [۲]

۱۔ نقوش مکاتیب نمبر،ڈاکٹر سید عبداللہ،ص ۲۹

۲۔ مکاتیب شبلی،جلد اوّل،خط نمبر ۱۶،ص ۷۹

ایک دوسری جگہ انہیں کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''امتحان سے آئے، کہو سوالات کیسے تھے۔ افسوس جلسہ انعام میں تمہیں نہ تھے مگر مجبوری تھی۔ کیا کہئے، لڑکوں نے ماسٹر کو برا بنا دیا۔ ورنہ حکام کو بہت زیادہ نظر لطف تھی۔ ماسٹر کی تلاش میں ہوں۔ دیکھو شب و روز مدرسہ کی فکر رہے۔ ذرا قوم کو ابھارو۔'' [۱]

شبلی کے خطوط میں ایک خط ایسا ہے جو انھوں نے محمد سمیع کو مکالمہ کے طرز پر لکھا ہے۔ ان کے اس خط کو پڑھ کر غالب کا خط یاد آتا ہے جو انھوں نے میر مہدی کو لکھا تھا۔ لیکن پہلی نظر میں میرن صاحب کے نام لکھے جانے کا احساس ہوتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''بھئی کچھ سنا (محمد سمیع) خیر تو ہے۔ ہاں ایک تازہ واقعہ ہے۔ میاں شبلی کا انتقال ہو گیا (محمد سمیع) ارے سچ نہیں جھوٹ ہوگا۔ ابھی ہفتہ بھی نہیں ہوا ان کا ایک خط میرے نام آیا تھا۔ (مولوی محمد عمر صاحب) لو تم نے آج سنا ہے جی اس کو تو کئی دن ہوئے۔ انھوں نے جو کتابیں بھیجی تھیں اس کی رسید بھی تو میں نے اسی وجہ سے نہیں دی۔ (محمد سمیع) انا للّٰہ! افسوس ابھی مرنے کے کوئی دن تھے (حمید) ہاں واقعی سخت رنج ہے۔ مگر تقدیر سے کس کا زور چلتا ہے۔ (اور دبی زبان سے) ارے میاں چلو قصہ پاک ہوا۔ آئے دن کی حکومتوں سے دم ناک میں آ گیا تھا، بھلا روئداد خیر ایک بار کا کام تھا۔ لکھ بھی لیا۔ اب روز روز مدرسہ میں لڑکوں کو مسودہ لکھاتے پھرو۔ اس پر طرہ یہ کہ ہفتہ وار مدرسہ کی رپورٹ لکھ کر ان کے پاس بھیجتے رہو۔ اچھی خاصی بیگاری بھگتا کرو۔ (عبدالغفور) ارے میاں خیر مرنا تو سب کے لئے ہے۔ ہاں ان کے خط کا جواب رہ گیا۔ مگر یہ بھی کوئی زبردستی ہے۔ جی نہ چاہے تو مفت کی محنت کون گوارا کرے (حافظ حسن علی صاحب) لو اب کی ان کو خط لکھتے لکھتے رہ گیا۔ امتحان کا حال لکھنا تھا اور جو کچھ ہوا آدمی تو مزے کا تھا۔ دو گھڑی کیفیت رہتی تھی (مولوی محمد عمر صاحب) بھئی کیا کہئے دل لگی ہی جاتی رہی اور تو کس کام کا آدمی تھا۔ مگر ہاں ذرا جی

۱۔ مکاتیب شبلی، جلد اوّل، خط نمبر ۵، ص ۵۶

بہل جایا کرتا تھا۔ (مولوی احمد اللہ) اجی جی کیا بہلتا تھا، دنیا بھر کی شکایتیں ہوا کرتی تھیں۔ کبھی ان کی نقل کبھی ان کا خاکہ اڑایا اور اس کے سوا ان کا کام ہی کیا تھا۔ چلو اچھا ہوا۔ یار خوش قسمتی سے ایسے عزیز احباب ہاتھ آئے ہیں۔'' ۱

ایک دوسرے خط میں محمد سمیع کو لکھتے ہیں:

''لیجئے! اب آپ کو بھی چپ لگی۔ بھائی کوئی قصور تو نہیں ہوا۔ ناراض کیوں بیٹھے ہو۔ وہ قصیدہ یہاں نہیں ملتا، وہیں لکھوالو یا میں آؤں گا تو خود لکھ دوں گا۔'' ۲

مولانا کے خطوط میں طنز و مزاح کا ہلکا رنگ بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ مثلاً ایک عزیز کو ایک خط میں دوسرے اعزہ کو سلام لے جانے کے لئے لکھتے ہیں تو انداز بیان کی شوخی کچھ اس طرح نظر آتی ہے۔

''اچھا ذرا سلاموں کا پستارہ تو سر پر لے لو اور سب کے حصہ کا تقسیم کر آؤ۔ جناب حافظ حبیب اللہ صاحب، جناب حافظ حسن علی صاحب، جناب منشی خدا بخش صاحب (بوڑھے تو شاید ہو لئے چلو اب جوانوں سے شروع کرو) مولوی احمد اللہ صاحب، فخر الملتہ والدین کہیں ف اڑا نہ جائے، منشی حسن رضا خاں صاحب، منشی ولیجان صاحب، ہماری شادی ٹھہراتے ہی رہ گئے، عیاں خادم حسین صاحب، ہے ہے سخت غلطی ہوئی۔ ان کا نام کسی کے نام کے ساتھ ملا کر یا نیچے لکھنا تھا۔ اگر چہ ٹاٹ میں مونچ کا لحینہ سمجھا جاتا۔ مکرمی مولوی محمد عمر صاحب کیا خطوں کا جواب نہیں دیتے تو سلام کا جواب بھی نہ دیں گے۔ افتخار القوم حضرت ماموں محمد سلیم صاحب، دام فیضہ علینا، جناب مولوی محمد حسین صاحب مگر جانے وہ کہاں ہوں، میرا سلام مفت میں خاک چھانتا پھرے، کوئی بھول تو نہیں گیا۔ آہا مرزائے مختصر میاں سلیم اللہ صاحب رہ گئے۔ اتنا سا تو قد مجمع میں نظر آئیں تو کیوں کر۔ ایک اور میرا مایہ فخر و ناز رہ گیا۔ جناب مولوی مرزا محمد سلیم صاحب۔ خیر ان ہی کے صدقے مرزائے مختصر بھی یاد آ گئے تھے۔'' ۳

۱۔ مکاتیب شبلی، جلد اوّل، سید سلیمان ندوی، ص ۶۸

۲۔ ایضاً، ص ۶۹

۳۔ ایضاً، ص ۷۶۔۷۷

شبلی کے خطوط لطافت و شگفتگی اور جاندار تحریروں سے مزین ہوتے ہیں۔ ان کے خطوط ادبیت اور انشا پردازی کی جان ہیں۔ ان کے خطوں کی زمین کافی مانوس اور شاداب ہوتی ہے کہ پورا خط ہی ایک پھلواری کا حصہ معلوم ہوتا ہے۔ ان کے خطوط کو پڑھ کر دل کو خوشی و مسرت کا احساس ہوتا ہے۔ مذہب و فلسفہ پر لکھتے ہوئے بھی ادب و انشا کا دامن ہاتھ سے نہیں جانے دیتے۔ اردو کے مشہور انشا پرداز اور مولانا کے مخلص دوست ایم مہدی حسن صاحب کے نام خط کا یہ اقتباس ملاحظہ ہو۔

''آپ کے احرام جدید کی داد دوں یا رشک کروں۔ ہاں بمبئی جاتا ہوں۔ شرط یہ ہے کہ خود گاڑی تک آ کر لوا جائیں، کچھ ایسی بڑی بات نہیں، کوئی کیوں رشک کرے۔ قاضی صاحب ہمارے کام کے آدمی نکلے۔ نیچا سنتے ہوتے تو خوش صحبت بھی تھے۔ جوان ہوتا تو ان سے باتیں کر لیتا۔ بڑھاپے میں اذان دینا ذرا مشکل ہے۔ ایک ماہوار رسالہ نکالنا چاہتے ہیں۔ وہ بھی پولٹیکل۔ علی گڑھ کی خدائی کا بھی ڈر نہیں۔ بارہ دن سے شدید زکام میں مبتلا ہوں۔ خیام کا جبر و مقابلہ ہاتھ آیا۔ لیکن یورپ کی بدولت مختصر سا نوٹ الندوہ میں ملے گا اور لکھتا لیکن ہاتھ میں لغزش ہے۔ سطریں کج ہوئی جاتی ہیں۔'' [۱]

ایک دوسرے خط میں مہدی افادی کے ایک مضمون کی تعریف اس طرح کرتے ہیں۔

''مدت ہوئی البشیر میں قاموس الاسلام کے عنوان سے ایک مضمون دیکھا۔ نیچے مہدی حسن کے دستخط تھے۔ حیرت ہوئی کہ یہ وہی مرزا پوری دوست ہیں یا نذیر احمد و آزاد کی دو روحوں نے ایک قالب اختیار کیا ہے۔ کئی دن تک دیکھتا رہا اور احباب کو دکھلاتا رہا۔ دو تین ہفتہ ہوئے وہی برق ایک اور افق پر چمکی۔ اس سے زیادہ ہوش ربا اور خیرہ کن تھی۔ مصمم ارادہ ہوا کہ اب کی ضرور مبارک باد لکھوں لیکن حیدر آباد کی مصائب آمیز زندگی کسی دلی جوش کے اظہار کا موقع کہاں دیتی ہے۔ غرض وہ چوٹ زخم کا چور بن کر دل میں رہ گئی۔ آج آپ

۱۔ مکاتیب شبلی، جلد دوم، سید سلیمان ندوی، ص ۱۹۲

کا بھیجا ہوا ''البشیر'' پہنچا اور وہ چوٹ ابھر آئی۔ زیادہ کیا کہوں۔ خدا آپ کو آپ کے دست قلم کو آپ کی صنعت گری طبع کو قائم رکھے۔ بخدا مجھ کو خوشی سے زیادہ آپ پر رشک آتا ہے۔ کبھی کبھی خط بھی لکھا کیجئے۔'' ۱

شبلی کے خطوط میں ادبیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ شبلی کے خطوط ادب کے شاہکار ہوتے ہیں۔ اپنے والد کے نام لکھے گئے ایک خط میں روئیداد سفر اس طرح قلم بند کرتے ہیں کہ بے تکلف انداز بیان اور دل کش تحریروں کی وجہ سے یہ خط بھی ادب پارہ بن گئے۔

تسلیم!

گو میرا قلم خامہ نقاش کی ہمسری کرے جس سے میں اس عجیب وغریب مقام (نینی تال) کی پوری تصویر کھینچ سکوں، تاہم مجھ کو یہ امید نہیں کہ اس کوشش سے عزیزان وطن کو جو میرے خط پر آنکھ لگائے بیٹھے ہوں گے اپنے شوق وانتظار کا صلہ مل جائے گا

میں بے تکلف تسلیم کرتا ہوں کہ نینی تال ایک عجیب اور حیرت انگیز مقام ہے۔ لیکن اگر ''تعجب انگیز'' اور ''دلچسپ وفرحت زا'' ہونا دو جداگانہ چیزیں ہیں تو مجھ جیسے ایشیائی خیال کے آدمی سے یہ امید رکھنا عبث ہے کہ میں اس کو ''فرحت زا'' بھی مان لوں گا۔ ہاں جو لوگ انگریزوں کی ہر ادا پر جان دیتے ہیں ان کا مذہب کیا پوچھنا۔ ہر چہ آید در دلم غیر تو نیست'' اب حالات سنئے۔

کاٹ گودام تک ریل ختم ہوتی ہے اور پہاڑوں کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ کاٹ گودام سے نینی تال ۱۲ میل ہے۔ مگر تمام راستہ قدرت الٰہی نیرنگی وعظمت کا مرقع ہے۔ عرض میں پانچ چھ ہاتھ زمین چھوٹی ہوئی ہے جس پر رستہ چلنا ہے۔ باقی ایک طرف پہاڑ کی اور ہیبت ناک دیوار ہے۔ جس کی طرف دیکھنے سے نگاہ کانپ جاتی ہے۔ دوسری جانب نہایت عمیق ہولناک غاروں کا سلسلہ ہے اور اگر اس پہاڑ میں سخت سردی نہ ہوتی تو یہ غار بڑے بڑے اژدھا اور موذی جانوروں کے دارالسلطنت ہوتے۔'' ۲

۱۔ مکاتیب شبلی، جلد دوم، سید سلیمان ندوی، ص ۱۷۱

۲۔ مکاتیب شبلی، جلد اوّل، ص ۲۰۔۲۱

مولانا کے طنز وتعریض کا طریقہ بھی بڑا دلچسپ ہوتا ہے۔ خاص طور سے جب وہ اپنے معاصرین و مخالفین کا ذکر کرتے ہیں تو دو ایک جملے ایسے لکھ جاتے ہیں جس میں تیزی ونشتریت ہوتی ہے۔ یوں تو ظاہری طور سے وہ اپنے آپ پر حملہ کرتے ہیں لیکن نشانہ کہیں اور لگاتے ہیں۔ نواب محسن الملک کو ایک خط میں لکھتے ہیں:

''آپ کا خط پڑھ کر بے اختیار ہنسی آ گئی۔ آپ لوگ مجھ کو اتنا بھولا اور سادہ دل سمجھتے ہیں۔ اسکول کے لئے میرا یہاں رہنا مفید ہوتا تو کیا رہ جاتا۔ لیکن یہاں کا روپیہ ہمیشہ یہیں خرچ ہوتا ہے، باہر نہیں جاتا۔ مجھ کو سردست ۵۰۰ روپیے ماہوار سے زیادہ نہیں مل سکتے۔ اور یہی یہاں کا خرچ ہے۔ پھر جس قدر تنخواہ بڑھتی ہے، خرچ بڑھتا جاتا ہے۔ البتہ اگر یہاں کی سوسائٹی میں مبتذل، بدحیثیت، بے وقعت ہو کر رہوں تو پس انداز ہو سکتا ہے۔ باقی وہاں کے لئے یہاں کے لوگوں سے چندہ یہ کس قدر حماقت کا خیال ہے۔

مولوی صاحب روپیہ اور دولت کی قدر مجھ سے زیادہ کسی کو نہیں۔ میں کچھ ابراہیم ادہم یا بایزید نہیں ہوں۔ میرا تو رواں رواں دنیا کی خوشیوں سے جکڑا ہے۔ لیکن دنیا کو سلیقہ کے ساتھ حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ مجھ سے جوڑ توڑ، سازش، دربارداری، خوشامد، لوگوں کی جھوٹی آؤ بھگت نہیں ہو سکتی اور بغیر اس کے کامیابی نہیں معلوم، اس لئے میں نے گوشہ عافیت پسند کیا ہے۔'' [۱]

بمبئی کی رنگینیوں سے متعلق لکھتے ہیں:

''اب کی بمبئی میں عجیب رنگین صحبتیں رہیں لیکن عین عالم لطف میں ندوہ کی ایک فوری ضرورت سے یہاں آنا پڑا، لیکن آنکھوں میں اب تک وہ تماشا پھر رہا ہے۔ خیر اس پر فخر کرتا ہوں کہ دل کی خوشی کو قوم اور مذہب پر نثار کر سکتا ہوں اور بے تکلف کر سکتا ہوں۔'' [۲]

جمالستان بمبئی کے خوش جمالوں سے متعلق لکھتے ہیں۔

''ترسا زادے بمبئی کے ایوان جمال کے جھوٹے طلسم ہیں۔ سچی تصویریں الگ ہیں۔ اعراقی

۱۔ مکاتیب شبلی، جلد اوّل، ص ۱۸

۲۔ مکاتیب شبلی، جلد دوم، ص ۱۶۵

بھی، ایرانی بھی اور خال خال ہندی بھی۔'' [۱]

مولانا شبلی اپنے خطوط میں جہاں کہیں اشعار یا مصرعہ کا نگینہ جڑ دیتے ہیں، وہاں تحریر اور چمک اٹھتی تھی۔ حبیب الرحمٰن خاں شیروانی نے اعظم گڑھ تشریف لانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ اس خوش خبری پر مولانا لکھتے ہیں:

''کیا واقعی آپ یہاں جلوہ فرما ہوں گے اور کیا در حقیقت ؎

میرے ویرانہ میں ہو جائے گی دم بھر چاندنی

نامۂ والا کو بار بار پڑھتا ہوں اور اس سے مخاطب ہو کر کہتا ہوں

سچ سچ بتا یہ حرف انھیں کے قلم کے ہیں'' [۲]

خطوط میں اشعار لکھنے کا رواج زمانہ قدیم سے چلا آرہا ہے۔ مولانا چونکہ فطری شاعر تھے لیکن وہ بغیر کسی محرک یا دلی جذبہ کے شعر یا فرمائشی نظم نہیں کہہ سکتے تھے۔ لیکن جب کوئی محرک پیدا ہو جاتا تو ان کا شعری جذبہ بیدار ہو جاتا اور ان کے سینہ سے شاعری کا چشمہ پھوٹ نکلتا۔ چمن زار بمبئی سے وہ بہت متاثر ہوئے۔ یہاں پہنچ کر شاعری کی تحریک ان میں کثرت سے پیدا ہوئی۔ مہدی افادی کو بمبئی سے لکھتے ہیں:

''انیس برس کے بعد غزل لکھنے کا اتفاق ہوا۔ یہاں کی دلچسپیاں غضب کی محرک ہیں۔ آدمی ضبط نہیں کر سکتا اپالو یہاں ایک عجیب سیر گاہ ہے اور چوپاٹی اس کا جواب ہے۔ خواجہ حافظ کے مصرعہ کو یوں بدل دیا ہے ''کنار آب چوپاٹی وگلگشت اپالورا'' اس غزل کا ایک شعر یہ ہے

بہر سو رز ہجوم دلبران شوخ بے پروا گزشتن از سر رہ مشکل افتاد است رہرورا'' [۳]

۱۔ مکاتیب شبلی، جلد دوم، ص ۱۶۵

۲۔ مکاتیب شبلی، جلد اوّل، ص ۱۱۵

۳۔ مکاتیب شبلی، جلد دوم، ص ۱۷۸

شبلی اکثر خطوط کی شروعات کسی لطیف وعمدہ اشعار سے کرتے ہیں تو کبھی صرف ایک مصرعہ لکھ کر اپنا مقصد بیان کرتے ہیں۔ کبھی بیچ میں کوئی شعر لکھ دیتے ہیں تو کبھی کسی شعر یا مصرعے پر خط کا خاتمہ کرتے ہیں۔ چند مثالیں درج ہیں۔

مولوی محمد سمیع کے نام ایک خط کی ابتدا اس شعر سے کرتے ہیں۔

''دوستو! نذر ہیں یہ لعل و گہر تھوڑے سے اشک خوں تھوڑے سے اور لخت جگر تھوڑے سے

ایک دوسری جگہ مولوی محمد سمیع کو اپنی دوسری شادی سے متعلق لکھتے ہیں۔

''عزیزی!

میں یہاں آکر پھنس گیا کہ ؎

نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے

ہمت کہتی ہے

بے تامل آستیں افشاندن از دنیا خوش است

مصلحت فریب دیتی ہے کہ تم میں اور بہت سے لوگ شامل ہیں ان کا بھی لحاظ رکھنا چاہئے۔ افسوس اور سخت افسوس یہ ہے کہ پانچ برس کے انقطاع کے بعد میں نے جو تعلق اختیار کیا وہ صرف اس لئے تھا کہ ایک زنجیر پاؤں میں پڑ جائے تا کہ مارا مارا نہ پھروں لیکن بدقسمتی دیکھو کہ ؎

ایک چکّر ہے میرے پاؤں میں زنجیر نہیں'' [۱]

مولانا ابوالکلام آزاد کے نام خط نہ لکھنے پر لکھتے ہیں:

ازاں بہ درد دگر ہر زماں گرفتارم کہ شیوہ ہائے تیرا با ہم آشنائی نیست

بھائی! تم نے دانستہ خط و کتابت ترک کر دی ہے کہ ''الیاس احدی الراحتین! لیکن تم رہ رہ کر ایک چرکا لگا دیتے ہو۔ خیر جو مرضی یہ بھی منظور، کلکتہ گیا ایک خاص کام تھا۔ مولوی شرف الدین کے یہاں ٹھہرا۔

۱۔ مکاتیب شبلی، جلد اوّل، ص ۱۰۴

دلچسپیوں کی نئی راہیں نکلیں لیکن

چہ خط خضر بر دراز عمر جاودانہا

ایک ہفتہ رہ کر واپس آیا۔'' [۱]

مولانا ابوالکلام آزاد کے نام ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں۔

ان باتوں سے کام نہیں چلتا۔ اگر آپ اس موقع پر نہ آئے تو میں قیامت تک کلکتہ نہ آؤں گا بلکہ بعد قیامت بھی۔ میرے برابر کا کمرہ بالکل خالی ہے اور آپ کے لئے محفوظ ہے۔ اکثر احباب آرہے ہیں اور آچکے ہیں۔

دیر ویراں سہی کعبہ میرا آباد رہے یعنی مومن ہوں چلا جاؤں گا میں یاد رہے [۲]

مولانا ابوالکلام آزاد کو حیدرآباد جانے سے روکنے کی کوشش ان الفاظ میں کر رہے ہیں۔

''کیا آپ حیدرآباد چلتے ہیں تو میں افریقہ ہو کر کعبہ کو جا سکتا ہوں۔ ترکستان واپسی میں آجایئے گا۔ جزیرہ تو ہرگز جانے کا ارادہ نہیں۔ البتہ چمنستان بمبئی کو چھوڑنا ہے جو ایک زاہد سے ممکن نہیں۔ حیدرآباد میں اب چنداں لطف نہ آئے گا۔ احباب میں کوئی نہیں، خانہ بدوشوں کی طرح قیام ہوگا۔ تاہم فلک نما اور دولت آباد دیکھنے کی چیزیں ہیں۔ عمادالملک بھی مغتنمات روزگار میں ہیں۔'' [۳]

شبلی کے مکاتیب ادبی دنیا میں بہت زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ مولانا شبلی ایک بلند پایہ محقق تھے۔ ان کے خطوط علمی تذکروں سے معمور ہیں۔ انھوں نے اپنے خطوط میں علم و ادب کے بہت سے رموز و نکات کی وضاحت کی ہے۔ انھوں نے ہندوستان کے تمام مشہور کتب خانوں کو کھنگال ڈالا تھا۔ لیکن تشنگی علم

۱۔ مکاتیب شبلی، جلد دوم، ص ۲۵۱

۲۔ ایضاً، ص ۲۶۲

۳۔ ایضاً، ص ۲۶۰۔۲۶۱

کم نہ ہونے کی وجہ سے ترکی کا سفر کیا۔ قسطنطنیہ کے کتب خانوں سے استفادہ کیا۔ وہاں کے کتب خانوں کو دیکھ کر مولانا کی وہی حالت ہوئی جو پیاسے کو سمندر دیکھ کر ہوتی ہے۔ الفاروق اور سیرت النبی لکھنے کے لئے انھوں نے ہندوستان، مصر و روم و شام کی لائبریریاں اور یورپین ماخذوں سے جو استفادہ کیا تھا وہ انہیں کا حصہ تھا۔ ان کتابوں کی تصنیف کے لئے وہ تحقیق کے بنا ایک قدم بھی نہیں چل سکتے تھے۔ سیرت النبی کی تصنیف کے سلسلے میں جب ان کو یورپین محققین کی کتابوں کو دیکھنے کا موقع ملا تو ان کے علم و فضل کی حقیقت اور ظاہر ہوگئی۔ مولوی ریاض حسن خاں کو ایک خط میں ان کتابوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

''سیرت فتح مکہ تک پہنچ گئی۔ گو ابھی نظر ثانی اور ثالث باقی ہے۔ وقت اسی حصہ میں ہے۔ آگے، بہت جلد جلد کام ہوگا۔ سب مباحث اور ان کے خاکے پیش نظر ہیں۔ یورپ کے خیالات کا بڑا حصہ سامنے آگیا ہے۔ سب تاروں کی ایک صدا ہے۔ کچھ غلط فہمیاں، کچھ ناواقفیت، کچھ تعصب، باقی ہیچ، ایک جلد خاص یورپ کی نذر ہوگئی۔ یورپ کے ذخیرہ تاریخی پر ایک ایک دیباچہ تقریباً سو صفحوں کا ہوگا۔ تمام تصنیفات اور مصنفین کے نام اور حالات اور ریویو پر مباحث ان سے الگ ہیں۔'' [۱]

سیرت النبیؐ مولانا کی ایک اہم تصنیف ہے۔ جس کے لئے انھوں نے کافی جدوجہد کی۔ وہ اس کتاب کو اس معیار کا لکھنا چاہتے تھے کہ صدیوں تک اس کا جواب نہ ہو۔ پروفیسر عبدالقادر کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔

''سیرت نبوی جو زیر تصنیف ہے میں چاہتا ہوں کہ یورپ کے مصنفین نے جو کچھ آنحضرت ﷺ کے متعلق لکھا ہے اس سے کچھ واقفیت حاصل کی جائے، تاکہ ان کے تائیدی بیان حسب موقع حجت اسلامی کے طور پر پیش کئے جائیں اور جہاں انھوں نے غلطیاں اور بددیانتیاں کی ہیں، نہایت زور و شور کے ساتھ

۱۔ مکاتیب شبلی، جلد دوم، ص ۱۶۴۔۱۶۵

ان کی پردہ دری کی جائے۔اس بنا پر انگریزی کی کثرت سے تصنیفات مہیا کی گئی ہیں جو آنحضرت ﷺ کے متعلق تصنیف ہو چکی ہیں۔لیکن ان سب کا اردو میں ترجمہ کرنا ناممکن ہے۔اس لئے یہ رائے قرار پائی ہے کہ جن صاحبوں کو اس سے ذوق ہو ان کے پاس ایک کتاب بھیج دی جائے۔وہ مطالعہ کر کے قابل ترجمہ مقامات پر نشانات کرتے جائیں اور پھر کتاب واپس بھیج دیں تا کہ دفتر کے مترجمین سے ترجمہ کرایا جائے۔ اس بنا پر آپ سے درخواست ہے کہ آپ بھی اس کام میں حصہ لینا پسند فرمائیں۔'' ۱

منشی محمد امین صاحب کو ایک خط میں لکھتے ہیں۔

''سیرت کے سو صفحے ہو چکے تھے لیکن نظر ثانی میں پھر کچھ کا کچھ ہو گیا۔یورپ کی غلط بیانیوں کا ایک دفتر ہے۔ان کے ایک ایک حرف کے لئے سیکڑوں ورق الٹنے پڑتے ہیں..... ہمارے یہاں سیرت نگاروں نے خود بہت بے احتیاطیاں کیں۔میں جانتا ہوں کہ کام دو برس میں نہ ہوگا۔یہ بھی احتمال ہے کہ سرکار بھوپال رقم بند کر دیں۔لیکن اب اس کا نہیں بلکہ میری جان کا معاملہ ہے۔ہر حالت میں کام جاری رکھوں گا۔اور اگر مر نہ گیا اور ایک آنکھ بھی سلامت رہی تو انشاء اللہ دنیا کو ایسی کتاب دے جاؤں گا، جس کی توقع کئی سو برس تک نہیں ہو سکتی۔'' ۲

مولانا نے اپنے خطوط میں اکثر تصنیف و تالیف کے مسائل سے بحث کی ہے۔ان کے پیش نظر ایک اعلیٰ مقصد تھا۔وہ ملک میں مصنفین اور اہل قلم کی ایک جماعت پیدا کرنا چاہتے تھے۔اور اس کی حصولیابی کے لئے انھوں نے ذہین و ہونہار طلبا کو اکٹھا کر کے تصنیف و تالیف کی عملی تربیت بھی دی۔وہ ان طلبا سے مضمون لکھواتے، تلخیص و ترجمہ کی ہدایت کرتے۔ان کی اصلاح کرتے۔اگر انھوں نے ہونہار طلبا کی تربیت اس دقت طلب نظر سے نہ کی ہوتی تو سیرت نبویؐ کی تالیف کا دیرینہ خواب شاید کبھی پورا نہ ہوتا۔ کیوں کہ سیرت کے ابتدائی مراحل میں ہی آپ کی قوت گویائی جواب دے چکی تھی۔حالت نزع میں آپ

۱۔ مکاتیب شبلی، جلد اوّل، سید سلیمان ندوی، ص ۲۱۴۔۲۱۵

۲۔ ایضاً، ص ۲۳۰۔۲۳۱

کی زبان پر سیرت ہی کا لفظ تھا۔ آپ کی وفات کے بعد آپ کے شاگرد رشید سید سلیمان ندوی نے اس عظیم الشان کارنامے کو پورے اہتمام اور دقیقہ رسی سے پورا کیا۔

چونکہ شبلی فارغ وقت میں اپنے شاگردوں کو مفید مشوروں سے نوازتے، اور جب ان سے دور رہتے تو خطوں کے ذریعہ ہدایت کرتے۔ سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں۔

''تم اپنی نسبت سردست طے کرو کہ اگر تم انگریزی واقعی محنت سے پڑھنا چاہو اور دو برس تک مستقل پڑھو اور اس قدر پڑھو کہ اچھی طرح کتب بینی کرنے کے قابل ہو جاؤ تو تمہارے وظیفہ کا جس کی مقدار موجودہ معاوضہ کے برابر ہوگی انتظام کیا جائے گا۔ اور اگر مولویانہ کاہلی سرایت کر گئی ہے تو اور کچھ صورت سوچی جائے۔''

ایک دوسرے خط میں لکھتے ہیں۔

''دونوں پرچوں میں تمہارا مضمون بہت اچھا نکلا۔ اب تم کو تصنیفی سلیقہ آ چلا ہے۔ البتہ عبارت کی ابھی تک کمزوری باقی ہے وہ بھی جاتی رہے گی۔'' [۱]

مولانا مسعود علی ندوی کے نام دارالمصنفین کو ندوہ میں قائم کرنے سے متعلق لکھتے ہیں۔

''بھائی وہ لوگ دارالمصنفین ندوہ میں بنانے کب دیں گے کہ میں بناؤں، میری اصلی خواہش یہی ہے۔ لیکن کیا کیا جائے۔ حالانکہ اس میں انہیں کا فائدہ ہے۔'' [۲]

مولانا نے دارالمصنفین کو اعظم گڑھ میں بنانے اور اپنا وہیں قیام کرنے کا ارادہ کیا۔ اس سلسلے میں وہ مسعود علی ندوی کو لکھتے ہیں۔

''میں یہاں تکمیل کا درجہ کھول دوں گا تم طلبا کے نام سے مطلع کرو، اور خود ان کو لکھ دو کہ مجھ سے خط وکتابت کریں۔

۱۔ مکاتیب شبلی، جلد دوم، ص ۶۱

۲۔ ایضاً، ص ۱۰۹

میں نے یہاں اپنا مستقل انتظام کرلیا ہے۔ ہر طرح کا آرام اور پھیلاؤ ہے۔ تعلیمی کام شروع ہوگئے ہیں۔ کسی طرف سے کوئی رکاوٹ نہیں۔ بالکل ایک بادشاہت معلوم ہوتی ہے۔ اور افسوس ہوتا ہے کہ میں نے کیوں اتنے دن پاجیوں میں بسر کئے۔ باغ ہے، بنگلہ ہے، حکومت ہے، گریجویٹ ہیں، اسکول ہے، تعلیمی انجمن ہے اور سب حسب دلخواہ کام کرتے ہیں نہ کہ وہاں سگان بازاری کے ساتھ عوعو میں مبتلا ہونا۔ دارالمصنفین بھی شروع ہوجائے گا۔'' [۱]

مولانا اپنے ہم عصروں میں مولانا حالی کے بہت قائل تھے اور ان کا احترام بھی کرتے تھے۔ ایک خط میں ان سے متعلق لکھتے ہیں:

''میں دریا ہوں اور حالی کنواں ہیں۔ میرا علم دریا کی طرح وسیع ہے اور حالی کے پاس معلومات اگرچہ کم ہیں، لیکن وہ گہرے ہیں۔ جب تک کافی مواد تحریر موجود نہ ہو میں ایک قدم بھی نہیں چل سکتا۔ مگر حالی کی نکتہ آفرینی اس کی محتاج نہیں۔ ان کی دقیقہ رس اور نکتہ سنج طبیعت ایسی جگہ سے مطلب نکال لاتی ہے جہاں ذہن بھی منتقل نہیں ہوتا اور یہ کمال اجتہاد کی دلیل ہے۔'' [۲]

مولانا کے مکاتیب ان کے خلاق و کردار کے آئینہ دار ہیں۔ مولانا نے اپنی پوری زندگی قوم کی خدمت کے لئے وقف کردی۔ وہ اپنی صلاحیتوں کی بنا پر اگر چاہتے تو دنیاوی مال و متاع اور جاہ وجلال کو بآسانی حاصل کرسکتے تھے۔ لیکن انھوں نے دنیاوی دولت کے بجائے قومی وملی خدمت کو ہی اپنی زندگی کا حاصل سمجھا۔ آپ کی فطرت سادگی سے عبارت تھی۔ تکلفات کو بالکل پسند نہیں کرتے۔ اس کو قوم کے لئے مہلک اور زندگی کے منافی سمجھتے تھے۔ آپ ایک بھرپور اور فعال زندگی گزارنے کے خواہش مند تھے۔ آپ نے دنیاوی چیزوں کو ایک سیاح کی نظر سے دیکھا اور دکھلایا۔ مولانا کی زندگی کا مقصد قومی خدمت تھا۔ انھوں نے منجملہ طور پر خصوصیات کے ساتھ قناعت کی بھی ایک شاندار مثال قائم کی۔

آخر میں شبلی نے کچھ ایسے خطوط بھی سپرد قلم کئے جو بمبئی کے ایک علم دوست خاندان کی دو تعلیم یافتہ

۱۔ مکاتیب شبلی، جلد دوم، ص ۱۰۹

۲۔ حیات شبلی، سید سلیمان ندوی، ص ۸۰۴

خواتین عطیہ بیگم فیضی اور زہرہ بیگم فیضی کے نام ہے۔ یہ خطوط اردو مکتوب نگاری میں اپنے طرز تحریر اور انداز نگارش کی وجہ سے منفرد ہیں جس کو شیخ اکرام نے اپنی کتاب موج کوثر میں عشقیہ خطوط کہا ہے۔ وہ اس سلسلے میں لکھتے ہیں:

''آخر حالی اور آزاد محسن الملک اور وقار الملک کتنے آسمانوں کے تارے تھے۔ ایک یا دو یا تین، ان میں شبلی کی بوقلمونی کہاں سے آئے گی؟ جو رندوں میں رند، زہاد میں زاہد، نثاروں میں نثار، شعرا میں شاعر، معلموں میں معلم، مورخوں میں مورخ، سیاست دانوں میں سیاسی اردو میں عشقیہ خطوط کے بانی، تعلیم میں نئے روش کے آموز گاہ، علمی تصنیف و تالیف کے میدان میں ہماری زبان کے سب سے بانکے شہسوار۔''

قلیل مدت حیات اور کمزور صحت کے باوجود شبلی نے جو کچھ کر دکھایا وہ ایک معجزہ سے کم نہیں۔

دبیرم شاعرم رندم ندیمم شیوہ ہا دارم گرفتم رحم بر فریاد و فغانم نمی آید'' [۱]

ان خطوں کو محمد امین زبیری نے خطوط شبلی کے نام سے شائع کیا جس پر بابائے اردو مولوی عبدالحق نے مقدمہ لکھا ہے۔ ان خطوط سے متعلق شبلی کی رنگین زندگی پر بہت سی کتابیں منظر عام پر آئیں جن میں ڈاکٹر وحید قریشی کی ''شبلی کی حیات معاشقہ''، شیخ اکرام کی ''شبلی نامہ'' اور محمد امین زبیری کی ''شبلی'' ہیں۔ ان کتابوں سے متعلق ڈاکٹر سید عبداللہ کی اس رائے سے اتفاق کیا جا سکتا ہے۔

''بعض بزرگوں نے خطوط شبلی چھاپ کر شبلی کی اخلاقی کجروی کا ثبوت بہم پہنچایا ہے۔ مگر یہ بھول گئے کہ ہر زمانہ کا ایک خاص مذاق ہوتا ہے۔ یہ شبلی کی خوش قسمتی تھی کہ ان کو زمانہ اچھا ملا کیونکہ موجودہ زمانے کو تو شبلی کی یہ ادا کچھ اور بھی اچھی لگی۔ بالغرض اگر کوئی اور زمانہ ہوتا تو شاید شبلی کے یہ راز ان کی رسوائی کا سبب

۱۔ موج کوثر، شیخ محمد اکرام، ص ۲۳۴

بنتے یا بنائے جاتے، مگر اس دور میں تو یہ بے نقابیاں اور بے حجابیاں رنگین مزاج شبلی کے قصے کو کچھ اور بھی رنگین بنا گئیں اور سچ تو یہ ہے کہ یہ خط نہ بھی چھپتے تو بھی شبلی کی جذباتی تشنگی کے راز تو ''شعر العجم'' کے انداز بیان سے ہی کھل جاتے۔ اس لئے شعر العجم کا مصنف اگر خطوط شبلی کا ہیرو نکلا تو چنداں تعجب نہ ہوا۔'' [۱]

اس کے علاوہ ڈاکٹر ابن فرید نے اپنے مقالے ''شبلی چوں بہ خلوت می رود'' میں ان تمام مصنفوں کے خیالات کا تجزیہ کر کے ساری غلط فہمیاں دور کر دی ہیں۔

یہ سچ ہے کہ مولانا شبلی کے خطوط کے جو اقتباسات یہاں نقل کئے گئے ہیں اس سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کے خطوط ایک طرف علمی و ادبی معلومات کا ذخیرہ فراہم کرتے ہیں تو دوسری طرف اپنے دل کش اور پرزور اسلوب بیان کی وجہ سے وہ ادب عالیہ کا نمونہ بھی ہیں۔ شبلی کے مکاتیب سے متعلق ڈاکٹر شباب الدین صاحب کے یہ خیالات ملاحظہ ہوں:

''شبلی کے خطوط میں ان کی انشا پردازی بھی اپنے تمام جلوؤں کے ساتھ نمایاں ہے۔ علاوہ بریں ان کے خطوط کا اسلوب دلچسپ و دل کش ہونے کے ساتھ ساتھ فصیح و بلیغ بھی ہے اور جدت و لطافت اور سادگی و پرکاری کا نمونہ بھی۔ شبلی اپنی بات کو سیدھے سادے الفاظ میں بلا تکلف اور دلچسپ پیرایہ میں بیان کرتے ہیں اور ہر موقع محل کے لحاظ سے اسی کے مطابق طرز تحریر کا انتخاب کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے خطوط میں عبارت کی صفائی، سلاست و روانی اور نزاکت و شگفتگی ملنے کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں لطیف و نازک تشبیہ و استعارے بھی دکھائی دے جاتے ہیں جن سے ان خطوط کا ادبی حسن اور نکھر جاتا ہے۔'' [۲]

۱۔ نقوش، مکاتیب نمبر، ص ۳۰

۲۔ دارالمصنفین کی ادبی خدمات ۱۹۸۰ء تک، ڈاکٹر شباب الدین، ص ۵۲

شاہ معین الدین احمد ندوی کی اس رائے سے انکار ممکن نہیں:

''مولانا نے جس میدان میں قدم رکھا ان کی امتیازی شان قائم رہی۔ یہی امتیازی شان ان کے خطوط میں بھی ہے۔[۱]

حیات شبلی سید سلیمان ندوی

حیات شبلی عہد جدید کے معلم اوّل، سیرت نگار رسول اعظم اور بانی دارالمصنفین علامہ شبلی نعمانی کی سوانح حیات اور علمی و عملی کارناموں کی تفصیل ہے۔ ایک جلیل القدر استاد کے حضور میں ایک فاضل شاگرد رشید کا نذرانہ عقیدت ہے۔ چنانچہ مصنف نے اس میں اپنا پورا تصنیفی کمال اور زور قلم صرف کر دیا ہے۔ آپ کی سوانحی تصانیف میں حیات شبلی کو اہم ترین درجہ حاصل ہے۔

سید صاحب دراصل تحقیق کے مرد میدان تھے اور اپنی سنجیدہ نگاری اور عالمانہ طرز بیان کے لئے مشہور تھے۔ ان کی تحریریں ادب و انشا کے بہترین نمونوں سے مزین ہیں۔ اس سلسلے میں حیات شبلی کی یہ ابتدائی تحریر ملاحظہ ہو:

''پیش نظر کتاب ایک ایسی ہستی کے اوراق سوانح ہیں جس نے ۳۲ برس (۱۸۸۲۔۱۹۱۴ء) تک ہندوستان اور ہندوستان سے باہر کی اسلامی دنیا کو اپنے قلم کی روانی سے سیراب اور اپنی شعلہ نفسیوں سے گرم اور اپنی نواسنجیوں سے پرشور رکھا۔''[۲]

اس کتاب کو تصنیف کرنے میں مصنف نے اپنا پورا زور اور تصنیفی کمال صرف کر دیا ہے۔ علامہ شبلی کی سوانح عمری ان کی زندگی میں ''حیات النذیر'' کے مصنف افتخار عالم مارہروی نے لکھنے کی خواہش ظاہر کی تھی۔

۱۔ ادیب، شبلی نمبر، علی گڑھ، ص ۱۵

۲۔ حیات شبلی، سید سلیمان ندوی، ص ۱

اوراس سلسلہ میں انھوں نے علامہ شبلی کو کافی خطوط لکھے تھے لیکن علامہ شبلی یہ کہہ کر ٹال گئے تھے کہ:

''میری لائف میرے بعد لکھئے گا ورنہ مکمل لائف کیوں کر ہوگی۔'' ۱

اسی طرح دوبارہ فرمائش کرنے پر ہونہار شاگرد کو لکھا تھا کہ:

''دوسرے لوگ میری سوانح عمری کیا لکھیں گے تم ہی جب کبھی دنیا کے اور کاموں سے فرصت پانا تو اس کام کو انجام دینا۔'' ۲

چنانچہ استاد کی خواہش کے مطابق حیات شبلی کی تالیف ہمیشہ مصنف کے زیر نظر رہی اور واقعی وہ اس کے اہل اور اصل مستحق تھے۔

سید صاحب نے محبوب استاد کے انتقال کے ۲۶ برس بعد ۱۹۴۰ء میں اس فرض وقرض کی ادائیگی کا آغاز کیا اور تین سال کی مسلسل محنت کے بعد ۱۹۴۲ء میں حیات شبلی کو مکمل کیا۔ یہ اتفاق ہے کہ ان کو اسی وقت اس کی تالیف کا موقع ملا جب دنیا کے اور کاموں سے بڑی حد تک فرصت مل چکی تھی اور یہی ان کی آخری تصنیف ثابت ہوئی اور اسی پر ان کی تصنیفی زندگی کا خاتمہ ہوگیا۔

علامہ شبلی کی شخصیت خاصی پیچیدہ، عظیم اور پروقار تھی۔ زندگی کے آخری دس سال تک سید صاحب ان کے سب سے زیادہ قریب رہے اس لئے ان سے زیادہ واقف کار کوئی دوسرا صاحب قلم اور سوانح نگار نہیں تھا۔ علامہ شبلی کی زندگی کا یہ آخری دور مختلف وجوہات سے اہمیت کا حامل بھی تھا۔ ان باتوں کے پیش نظر سید صاحب نے اپنی تمام تر صلاحیتوں کا استعمال کرتے ہوئے معتبر اور مستند مآخذ کی مدد سے حیات شبلی کا شاندار مرقع تیار کیا ہے۔ انھوں نے اس کی تلاش وجستجو میں کوئی دقیقہ، فروگزاشت نہیں کیا۔ ذاتی معلومات شبلی کے اعزہ واقربا سے استفسار کر کے اکٹھا کیں۔ اور ان کے بعض دوستوں اور شاگردوں کے بیانات سے بھی کافی فائدہ اٹھایا۔ اس کے علاوہ علی گڑھ گزٹ، الندوہ کے پرانے پرچے اور ندوۃ العلماء اور

۱۔ مقدمہ حیات شبلی، سید سلیمان ندوی، ص ۳

۲۔ مکاتیب شبلی، جلد دوم، سید سلیمان ندوی، جلد ۲، ص ۱۰۷

ایجوکیشنل کانفرنس کے رودادیں بھی اس سلسلہ میں مفید ثابت ہوئیں۔شبلی کے اردو اور فارسی کلام کے مجموعوں سے بھی بعض مواقع پر استفادہ کیا گیا ہے۔سب سے بڑا مآخذ مکاتیب شبلی کی دو جلدیں ہیں جنھیں خود سید صاحب نے مرتب کیا ہے۔ان خطوط سے شبلی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے۔ایک لحاظ سے حیات شبلی مولانا شبلی کی خودنوشت سوانح عمری ہے اور یہی حیات شبلی کا بنیادی مآخذ ہے جس سے سید صاحب نے مواد فراہم کر کے ایک بلند عمارت تیار کر دی۔

حیات شبلی کی چند بنیادی خصوصیات میں سے ایک جس کی وجہ سے اسے معتبر اور مستند سمجھا جاتا ہے یہ ہے کہ یہ تین بار لکھی گئی۔سب سے پہلے حیات شبلی کو مرتب کرنے کا کام مولانا عبدالسلام ندوی کے سپرد ہوا۔انھوں نے محنت کر کے ایک سوانح عمری مرتب کر لی لیکن سید صاحب کو یہ سوانح عمری پسند نہیں آئی۔ اس کا سب سے بڑا نقص یہ تھا کہ اس میں علامہ شبلی کی ۱۶ سال کی وہ زندگی جو انھوں نے علی گڑھ میں گزاری تھی اس کا ذکر نہیں کیا گیا تھا۔لہٰذا یہ کام علامہ شبلی کے دوسرے شاگرد مولانا اقبال سہیل کے سپرد ہوا۔اس میں علی گڑھ کے حالات پوری شرح و بسط کے ساتھ آ گئے لیکن سید سلیمان ندوی کے ذہن میں حیات شبلی کا جو اعلیٰ خاکہ تھا اس پر یہ سوانح عمری بھی پوری نہیں اترتی تھی۔چنانچہ اس کام کی ذمہ داری خود فاضل اجل سید سلیمان ندوی نے اپنے سر پر لی اور مذکورہ دونوں سوانح عمریوں کی روشنی میں اپنی ذاتی معلومات سے ایک نئی عمارت تیار کر دی جو مذکورہ سوانح عمریوں سے مختلف تھی۔اس میں علامہ شبلی کی ذاتی زندگی، پبلک لائف اور علمی زندگی پوری طرح سے مصور کی گئی ہے۔حیات شبلی میں ۸ صفحات پر مشتمل پیش لفظ اور ۲۶ صفحات پر مشتمل دیباچہ اور ۳۷ صفحات پر مشتمل مقدمہ ہے۔یہ سب سوانح نگار کے تخلیقی مزاج، تاریخی ذوق اور تنقیدی شعور کے مظہر ہیں۔

دیباچہ میں سید صاحب نے حضرت مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ، مولانا محمد احمد اللہ، مولانا قاسم، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولوی کرامت علی جونپوری، مولوی چراغ علی اور سرسید کی ان خدمات پر ایک طائرانہ نظر ڈالی ہے جنھوں نے دین حنیف کی حفاظت کے سلسلے میں اپنی خدمات انجام دی ہیں۔سرسید

کے ذکر کے بعد اس کتاب حیات شبلی کے ہیرو مولانا شبلی کی جامعیت پر زور دیا ہے کہ اردو کو علمی زبان بنانے اور اسے ترقی دینے میں بلاشبہ ان کا بہت حصہ ہے۔ ان کا مطالعہ بہت وسیع، ان کا اسلوب سادہ، رنگین اور عالمانہ تھا۔ ان کا علم حاضر تھا، ان کے ذہن میں کوئی الجھن نہیں تھی اور نہ ہی ان کی تحریر میں پیچیدگی تھی۔ حیات شبلی کا یہ حصہ کافی اہمیت رکھتا ہے اور مصنف کی مولانا شبلی کے تئیں عزت وعقیدت کے علاوہ مصنف کے اسلوب پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔

۳۷ صفحات پر مشتمل ایک مقدمہ ہے جس میں خلجی اور تغلق عہد کے علمائے خراسان کے ذکر سے بات کا آغاز ہوتا ہے۔ اس میں سید صاحب نے بڑی محنت سے پورب کے علمی ماحول ومرکز اور وہاں کے علماء کرام کا ذکر کیا ہے جہاں رشد و ہدایت کے علاوہ درس وتدریس کا بھی فرض انجام دیتے تھے۔ ان مدرسوں کا تذکرہ ہے جن کے دم سے ان علاقوں میں علم کی شمع روشن تھی۔ اس سلسلے میں سیکڑوں کتابوں، رسالوں، کتب خانوں اور علمی کارناموں کا جائزہ لیا ہے۔ یہ طویل مقدمہ مدرسہ چشمہ رحمت غازی پور کے ذکر پر آکر ختم ہوجاتا ہے۔ اس مقدمہ میں اسلامۂ ہند کے مسلمانوں کی پوری علمی، دینی اور قومی وملی جدوجہد کی طویل داستان کی اجمالی تاریخ آگئی ہے۔ خاص طور سے دیار پورب اور خطہ اعظم گڑھ کی علمی و ادبی، ثقافتی اور دینی تاریخ کا خاکہ اس طرح پیش کیا ہے کہ یہ اپنے موضوع پر اولین کاوش ہونے کے باوجود آج تک حرف آخر کا درجہ رکھتی ہے۔ یہ مقدمہ اپنے آپ میں ایک مستقل تصنیف کا درجہ رکھتا ہے۔

اس کے بعد اعظم گڑھ اور اس کے اطراف کا عنوان قائم کیا گیا ہے جس میں سرکار جون پور کا رقبہ، اعظم گڑھ کے نومسلم خاندان، اعظم گڑھ کی وجہ تسمیہ، اعظم گڑھ کے بانی، اعظم گڑھ کے بعض مردم خیز قصبات اور دیہات کے بارے میں تاریخی وجغرافیائی حقائق پیش کئے گئے ہیں۔ مولانا شبلی کے حسب و نسب اور مولد، خاندانی حالات، خاندان کے مورث اعلیٰ کا قبول اسلام اور بزرگوں کے حالات کا ذکر ہے۔ علاوہ ازیں اس باب میں جن باتوں کا ذکر کیا گیا ہے اس کی فہرست میں شبلی کی ولادت، بچپن، تعلیم، تربیت، اساتذہ، رام پور اور لاہور کا تعلیمی سفر، دیوبند کی حاضری، تکمیل تعلیم، سفر حج، پہلا قومی کام ان ایا

میں مولانا کے علمی اور ادبی مشاغل، وکالت کی تعلیم، اعظم گڑھ میں وکالت، ملازمت، نیل کا کام، بستی میں وکالت آخیر ۱۸۸۳ء، مولانا کا اپنی طالب علمانہ زندگی پر خود اپنا تبصرہ، علی گڑھ کا سفر ۱۸۸۱ء اور سرسید سے ملاقات، علی گڑھ کالج کا تعلق ۱۸۸۳ء، قیام علی گڑھ کے ابتدائی مشاغل اور احباب سرسید سے میل جول، کالج میں مولانا کے شاعرانہ کمال کا شہرہ، نیا رنگ، جدید تعلیم پر مولانا کا پہلا تبصرہ، علی گڑھ کے اثرات، موضوع شعر میں تغیر، انگریزی تعلیم کی ضرورت کا احساس، تاریخی ذوق، تصنیفی ذوق، تصنیف کی تیاری، مثنوی صبح امید، یورپ کی تحقیقات علمی سے آگاہی، مصری مطبوعات کا سرمایہ، کالج پر مولانا کے اثرات، کانفرنس کی خدمت، نینی تال کا سفر مئی، غرض یہ کہ ۱۸۵۷ء سے لے کر ۱۸۸۷ء تک کے علمی و ادبی مشاغل کا احاطہ کیا گیا ہے۔

تصنیف کا آغاز، سفر نامہ کلیات اور رسائل، ندوۃ العلماء یعنی علما کی مذہبی اور تعلیمی اصلاح کی تحریک میں شرکت، اس باب میں ۱۹۰۴ء تک کے تمام واقعات و حالات اور مشاغل جس میں فیض عام فیض، ندوۃ العلماء ندوہ کا پہلا اجلاس، دوسرا تیسرا اجلاس، پٹنہ کا وفد، چوتھا اجلاس، کالج سے رخصت لینے کی تجویز، الفاروق کی تالیف، بھوپال کا دوسرا سفر اور عربی مدارس کی تنظیم فروری و مارچ، سرسید کی وفات رخصت اور ترک تعلق مئی، اعظم گڑھ کو رجعت جون، کتب خانہ کی یکجائی، علالت، سفر کشمیر جولائی، الفاروق کی تکمیل و اشاعت، سلسلہ علالت کا اشتداد، اس عالم کے علمی مشاغل، علالت کا سخت دورہ، ڈاکٹر مصطفیٰ خاں کا علاج اور عارضی صحت، اورینٹل کانفرنس اٹلی کا ارادہ، امیر کابل کی پیشکش، شکایات کا عود اور علمی مشاغل، قصیدہ کشمیر، مولانا حالی کی قطعہ تہنیت، ندوہ کی یاد، سفر ایران کا قصد، شبلی منزل میں درس الغزالی کا خاکہ، ندوہ کے چھٹے اور ساتویں اجلاس میں عدم شرکت، پھر افغان دارالترجمہ، نیشنل اسکول علی گڑھ کی مجلس دینیات اور ندوہ کی طرف سے حکومت کی سیاسی بدگمانی کا زمانہ، والد کی علالت اور خانگی پریشانی، خانگی مصائب، حیدرآباد میں مقام، امور مذہبی کی نیابت، دماغی کشمکش، سلسلہ آصفیہ اور سررشتۂ علوم و فنون، سررشتۂ علوم و فنون کی نظامت، مولوی سید علی بلگرامی کی حیدرآباد سے علاحدگی اور سررشتۂ علوم و

فنون کا تذبذب، قیام حیدرآباد کی تصنیفات، حیدرآباد کی ادبی دلچسپیاں، حیدرآباد میں ان کا حلقۂ ادب، حیدرآباد کی سیاسی کشمکش اور مولانا کی دل برداشتگی، نواب محسن الملک کی علی گڑھ کے لئے کوشش اور گورنمنٹ سے صفائی، قرض سے نجات اور نوکری سے سبک دوشی کی کوشش، ندوہ کی یاد، زیارت کا پہلا موقع، تبدیل نصاب کی کوششیں، ندوہ کا انتشار، ندوہ کا سالانہ اجلاس، مدارس میں انجمن ترقی اردو کی نظامت، حیدرآباد سے استعفا، بھوپال کی تحریک، طلبائے دارالعلوم کی خوشی، ان تمام موضوعات پر سید صاحب نے استاد محترم شبلی نعمانی کے تمام مشاغل اور واقعات کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد ۱۹۰۵ء سے دارالعلوم ندوہ کی معتمدی اس میں ۱۹۰۵ء سے ۱۹۱۳ء تک کے حالات و واقعات کا احاطہ کیا گیا ہے۔ الندوہ، دارالعلوم ندوہ کی مالی ترقی سے متعلق مولانا کی کاوشوں کا ذکر اور دارالعلوم کی خدمات کا تذکرہ ہے۔ علامہ شبلی کے پیر کے حادثہ کی پوری روداد اور اس سلسلہ میں شعراء کے مراثی وغیرہ بھی نقل کر دیئے گئے ہیں۔ بعض دوسری تعلیمی خدمات، مذہبی اور قومی کام کا جائزہ پیش کیا ہے۔ ایک باب میں مولانا شبلی کی سیاسیات کا مختلف پہلو سے جائزہ لیا گیا ہے۔ ندوۃ العلماء میں مولانا کی مخالفت اور معتمدی سے استعفیٰ، مولانا شبلی کے بھائی مولوی محمد اسحٰق (وکیل ہائی کورٹ الہ آباد) کی وفات کا سانحہ، وطن کی طرف بازگشت اور مرحوم بھائی کے ادھورے کاموں کے عزم کو موثر انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس میں علامہ شبلی کا مشہور مرثیہ اسحاق بھی نقل کر دیا گیا ہے۔ اعظم گڑھ میں شبلی اسکول (جواب پوسٹ گریجویٹ کالج بن گیا ہے) کی ابتدا اور عہد بعہد کی ترقیوں کی تفصیل، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر کی مختصر تاریخ اور اس سے علامہ شبلی کی دلچسپیوں کا بھی ذکر الگ الگ ہے۔ اس میں دارالمصنفین کے ابتدائی تخیل سے وجود میں آنے تک کی تاریخ بھی ہے۔ اس میں سیرت النبیؐ کے عظیم الشان منصوبہ کی تاریخ بھی آ گئی ہے جو علامہ شبلی کے انتقال پر محیط ہے۔ آخر میں علامہ شبلی کی وفات، اولاد اور اخلاق و عادات کو بھی بیان کیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ مراثی و قطعات جو مولانا شبلی کی وفات پر قلم بند کئے گئے تھے، رقم ہیں۔ اس طرح اس ضخیم کتاب میں علامہ شبلی کی زندگی کے تمام حالات و واقعات اس طرح پیش کئے گئے ہیں کہ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی

کے اوائل کے اسلامیۂ ہند کی علمی و عملی جد و جہد کی پوری تاریخ اس میں سمٹ آئی ہے۔

سید صاحب کا تحریر کردہ یہ مقدمہ بلاشبہ بہت مفید اور پر از معلومات ہے۔ ساتھ ہی یہ مقدمہ حیات شبلی کے پس منظر کا کام بھی دیتا ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ سید صاحب نے اس قدر طویل مقدمہ لکھ کر اس دانشوری کی روایت کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے، جس پر آگے چل کر شبلی کو اپنی تصنیفات کی بلند و بالا اور سنگین عمارت قائم کرنی تھی۔ سید سلیمان ندوی اس کتاب سے متعلق رقم طراز ہیں کہ:

> ''نو سو صفحوں کی کتاب صرف اس عہد کے ایک شخص کی سوانح عمری نہیں بلکہ درحقیقت مسلمانان ہند کے پچاس برس کے علمی، ادبی، سیاسی، تعلیمی، مذہبی اور قومی واقعات کی تاریخ بن گئی ہے۔ اس سلسلہ میں بہت سے ایسے اشخاص کے مختصر حالات اور سوانح بھی درج ہوئے ہیں جن کو اس عہد کو سمجھنے کے لئے جاننا ضروری تھا۔ شروع میں ایک مفصل دیباچہ ہے جس میں دیار مشرق میں علوم اسلامیہ کی تعلیم و اشاعت کی تاریخ ہے جو بڑی دیدہ ریزی سے یکجا ہوئی ہے۔''[۱]

سید صاحب کا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ شبلی کا اس زمانے کے بنانے میں بہت کچھ حصہ ہے۔ ان کی زندگی کے چالیس سال خالص علمی زندگی میں بسر ہوئے۔ انھوں نے اپنی تحریر و تقریر کے ذریعہ سے نہ صرف صحیح علمی مذاق پھیلانا چاہا بلکہ قدیم و جدید کا ایک ایسا سنگم بنانا چاہا جس میں دونوں دریاؤں کے دھارے آکر مل جائیں۔ وہ قدیم ماحول میں پیدا ہوئے لیکن انھوں نے جدید تحریک کی بہت سی مفید باتوں کو اپنایا۔ وہ یورپ کے علمی کارناموں کا احترام کرتے تھے۔ وہاں کے لوگوں کی تحقیق و تدقیق کی داد دیتے تھے۔ وہ یورپ سے بہت متاثر تھے لیکن سرسید کی طرح مرعوب نہ تھے۔ سرسید نے انگلستان کا رخ کیا تو انھوں نے مصر و شام اور ترکی کا سفر کیا۔ اس سفر نے ان کو مسرت و عبرت دونوں کا سامان دیا۔ وہ ترکوں کی شان و

۱۔ پیش لفظ، حیات شبلی، سید سلیمان ندوی، ص ۷

شوکت سے خوش تھے تو قدیم علوم کی کسمپرسی اور ناقدری دیکھ کر خون کے آنسو روئے۔ ان تاثرات کا اظہار انھوں نے اپنے اشعار کے ذریعہ کیا ہے۔ وہ ادیب و شاعر تھے۔ عالم دین تھے۔ بہتر سے بہتر جمالیاتی ذوق رکھتے تھے۔ دریائے علم کے غواص اور مضبوط قوت ارادی کے مالک تھے۔ تاریخ و کلام ان کا علمی میدان تھا۔ سیاست اور قومی کاموں کے رہنما اور سرگرم و فعال رکن تھے۔ وہ انتہائی خوددار، بلند ہمت، وضع دار، حسن پسند اور رقیق القلب تھے۔ اخلاقی اعتبار سے بہت بلند اور ہمدرد تھے۔ اپنے اس دعویٰ کے ثبوت میں سید صاحب نے حیات شبلی میں مولانا شبلی کے کارناموں اور اولیات پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ حیات شبلی میں سید صاحب نے حتی الامکان کوشش کی ہے کہ تمام اولیات کا سہرا ان کے استاد کے سر رہے۔ چنانچہ انھوں نے شبلی کے کارناموں اور ان کی اولیات پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔

۱۔ مستشرقین اور عیسائیوں کے مقابلہ میں جو شیر دل اسلام کی صف میں سب سے پہلے نکلا وہ مولانا شبلی تھے۔

۲۔ فارسی شاعری میں نئی شاعری کی بنیاد مولانا شبلی نے رکھی۔

۳۔ آج کل اسلام کے سیاسی اور اقتصادی نظام پر جو کچھ لکھا جا رہا ہے اس کا مواد الفاروق سے لیا جا رہا ہے۔

۴۔ ہندوستان میں وہ عالم گیر اتحاد کے داعی اول تھے۔ سیاسی مسائل سے علماء حضرات کو جو دلچسپی ہوئی وہ مولانا شبلی کی پکار کا نتیجہ ہے۔

۵۔ اوقاف اسلامی، وقف علی الاولاد، تعطیل جمعہ اور دوسرے اسلامی مسائل کو علماء کے سامنے پیش کر کے تحریک کو کامیابی تک پہنچانا انھیں کی اولیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مہدی افادی نے انھیں تاریخ کا ''معلم اول'' کہا ہے۔

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سرسید اور شبلی دونوں کے فکر و نظر میں اختلاف تھا جو کہیں پر معمولی انحراف کی شکل میں ہوتا ہے تو کہیں سنگین اختلاف کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ یہ اختلاف تعلیمی، مذہبی، سیاسی قسم

کے مسائل میں تھا۔ سرسید کا ماننا تھا کہ اس کتاب سے کالج میں شیعہ وسنی کی منافرت پیدا ہوگی مگر مولانا شبلی نے سرسید کی ناراضگی کی کوئی پرواہ نہیں کی۔ سرسید کے نزدیک مسلمانوں کی موجودہ بیماریوں کا علاج یہ تھا کہ وہ مذہب کے سوا ہر چیز میں انگریز بن جائیں لیکن شبلی کے نزدیک یہ تھا کہ صحیح اسلامی عقائد واخلاق کی حفاظت اور بقا کے ساتھ ساتھ نئے زمانہ کی صرف مفید باتوں کو قبول کیا جائے۔ اس کے علاوہ مولانا نے ندوہ کے کسی جلسہ میں یہ تقریر کی تھی:

''دوسری قوموں کی ترقی یہ ہے کہ آگے بڑھتے جائیں آگے بڑھتے جائیں لیکن مسلمانوں کی ترقی یہ ہے کہ پیچھے ہٹتے جائیں پیچھے ہٹتے جائیں۔ یہاں تک کہ صحابہ کی صف سے جا کر مل جائیں۔''[1]

سرسید کو ان کی تقریر پر بہت غصہ آیا کہ اس سے مسلمانوں کی ترقی رک جائے گی۔ چنانچہ اس کے خلاف انھوں نے ایک سخت مضمون لکھا۔

آل احمد سرور شبلی اور سرسید کے اختلافات کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''شبلی کے لئے علی گڑھ کا میدان بہت جلد تنگ ہوگیا۔ سید سلیمان ندوی کے نزدیک اس کے کئی وجوہ تھے۔ ادب، معاملہ داں، شوق، مصلحت، دشمن، سرسید ترکوں کے مخالف تھے۔ شبلی ان کے فدائی۔ سرسید انگریزوں کے حامی تھے۔ شبلی انگریزوں پر نکتہ چینی سے باز نہ آتے تھے۔ سرسید جمہوریت کے خلاف تھے اور انتخاب کو برا کہتے تھے۔ شبلی کی رائے دوسری تھی۔ سرسید الفاروق لکھنے کے خلاف تھے، شبلی اس کو اپنی زندگی کا اہم کارنامہ سمجھتے تھے۔ مذہبی عقائد میں فرق تھا ہی کچھ سیاسی اختلافات تھے، کچھ ذاتی چشمک ہے۔ غرض شبلی سرسید کے مرنے کے بعد علی گڑھ سے رخصت ہوئے۔ کچھ دن حیدرآباد میں خالص علمی کارناموں میں

۱۔ حیات شبلی، سید سلیمان ندوی، ص ۲۴۱

لگے رہے۔ سلسلہ آصفیہ میں کئی کئی کتابیں تیار کیں مگر شوق انھیں شمالی ہند لایا اور اب ندوہ کی اصلاح میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔'' [۱]

سید محمد ہاشم صاحب اپنے تحقیقی مقالے میں حیات شبلی سے متعلق رقم طراز ہیں:

''حیات شبلی ایک تاریخی سوانح ہے لیکن ایسا کم ہوا ہے کہ تاریخی رو میں مصنف نے سوانحی آداب کو یکسر نظر انداز کر دیا ہو۔ جہاں کہیں سوانحی اصولوں کو ٹھیس پہنچی ہے وہاں تاریخیت کے ساتھ ساتھ استاد (صاحب سوانح) کی عقیدت کو بڑا دخل ہے۔ سید صاحب اپنے استاد کی سوانح لکھ رہے تھے اس لئے ان کے ذہن سے ''خطائے بزرگان گرفتن خطا است'' کے مقولہ کا محو ہو جانا مشکل تھا۔ پیش کش کے انداز میں ''حیات جاوید'' کا اثر بھی خاص نمایاں ہے..... سید صاحب کے لئے اپنے موضوع شبلی کا انتخاب کر لینے کے بعد فراہمی مواد، ترتیب سوانح طرز استدلال اور اسلوب بیان کے جو مواقع میسر تھے ان پر دنیا کی بہتر سے بہتر سوانح لکھی جا سکتی ہے اور سید صاحب نے اس کی کوشش کی۔ لیکن سوانح نگار کے لئے موضوع سے ہمدردی اور جانب داری کے ساتھ غیر جانب داری اور لاتعلقیت کی ناگزیریت مسلم ہے۔ موصوف اس سے بہت دور ہیں۔ اسی وجہ سے شبلی کی بعض خامیوں اور کمزوریوں پر یا تو خاموش ہیں یا پھر ان کی تاویلیں کرتے نظر آتے ہیں۔ اس کا سبب خواہ یہی ہو کہ استاد سے گہری محبت و عقیدت کے ساتھ ساتھ ان کی پیدائش کو وقت کی اہم ضرورت خیال کرتے ہوں۔'' [۲]

۱۔ تنقیدی اشارے، آل احمد سرور، مضمون حیات شبلی ایک تبصرہ، ص ۲۱۸

۲۔ سید سلیمان ندوی حیات و خدمات، سید محمد ہاشم، ص ۲۹۴

سید سلیمان ندوی حیات شبلی میں رقم طراز ہیں:

''اللہ تعالیٰ ہر زمانہ کی ضرورت کے مطابق اشخاص و افراد پیدا کرتا ہے۔ اور جس طرح مجدد الف ثانی شاہ ولی اللہ دہلوی، سید احمد شہید، ڈاکٹر وزیر خاں، مولانا رحمت اللہ کیرانوی، مولانا قاسم نانوتوی، مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا کرامت علی جونپوری، مولوی چراغ علی، اور سر سید احمد خاں نے اپنے عہد کے فتنوں کا مقابلہ کیا، اور اسلام کا دفاع کیا اسی طرح علامہ شبلی کو بھی اللہ تعالیٰ نے وقت اور زمانہ کے مطابق پیدا کیا تھا۔ ان کے الفاظ یہ ہیں۔

''جب یورپ کے مستشرقین نے مسلمانوں کی تصنیفات کو پڑھ کر اور ان کے علوم کو سیکھ کر اسلام اور مسلمانوں کے علوم و تاریخ و تمدن کو اپنے اعتراضات کا نشانہ بنایا اور ان کے یہ اعتراضات بڑی تیزی کے ساتھ تعلیم یافتہ نوجوانوں میں سرایت کرنے لگے۔ اس دور میں اسلام کی خدمت کی سعادت جس کے حصہ میں آئی وہ ہمارے ان اوراق کا ہیرو ہے۔'' [۱]

سید محمد ہاشم صاحب اس اقتباس سے متعلق رقم طراز ہیں:

''یہ بات خلاف توقع نہیں لیکن سوانح میں شخصیت کے مطابق واقعات کی تدریج و منطقیت اور شخصیت کی بوقلمونی پر نظر رکھنا جتنا ضروری ہے اتنا کچھ اور نہیں۔ حیات شبلی کا مصنف اس میں ہر موقع پر کامیاب نہیں رہا۔ اس نے اپنی پسند کے مطابق جس پہلو کو زیادہ اہم بلکہ بہتر سمجھا وہاں دلائل کا ایک انبار لگا دیا ہے اور جو گوشے تشنہ ہیں یا پسند کے معیار پر پورے نہیں اترتے ان کو ہاتھ تک نہیں لگایا گیا ہے۔'' [۲]

۱۔ حیات شبلی، سید سلیمان ندوی، ص ۱۱

۲۔ سید سلیمان ندوی حیات و خدمات، سید محمد ہاشم، ص ۲۹۵

ڈاکٹر احتشام احمد ندوی حیات شبلی سے متعلق رقم طراز ہیں:

''سید صاحب نے علامہ شبلی کو ایک مصلح امت اور مدافعت اسلام کے مجاہد کے طور پر پیش کیا ہے۔ ان کے کارناموں کو نمایاں کیا ہے اور اس سیمابی اور مضطرب شخصیت کی جیتی جاگتی تصویر کو ہماری نگاہوں کے سامنے کر دیا ہے۔ چونکہ یہ علمی کام انھوں نے اپنی زندگی کے آخر میں کیا تھا اور حیات شبلی کے بعد سید صاحب نے پھر کوئی بڑا کام نہیں کیا اسی بنا پر اس کتاب میں ان کی زندگی کے علمی و ادبی تجربات، مشاہدات، وسیع معلومات اور علامہ شبلی کے ساتھ آٹھ سالہ صحبت کا نچوڑ آ گیا ہے۔ کتاب کا آخری حصہ تو صرف سید صاحب کے ذاتی تجربات پر منحصر ہے۔ پوری کتاب میں علامہ شبلی کے اقوال و افعال ستاروں کی طرح بکھرے پڑے ہیں جن کا علم صرف سید صاحب کو ذاتی طور پر تھا۔ اس سے انھوں نے پورا کام لیا ہے اور حیات شبلی کی ترتیب میں ان کو سنگ منزل بنایا ہے اس لئے باوجود علمی معلومات، تاریخی مباحث اور عصری تحریکات و رجحانات کے مصنف نے کتاب کی عظمت کو شبلی سے اپنی ذاتی واقفیت کے باعث دو چند کر دیا ہے۔ اس تار حریر دو رنگ سے حیات شبلی کی فنی عظمت عبارت ہے۔''[۱]

جب حالی نے سرسید کی سوانح عمری ''حیات جاوید'' لکھی تو شبلی نے اسے مدلل مداحی اور کتاب المناقب کہا۔ حیات شبلی کے شائع ہونے پر بعض ناقدین نے اسے بھی اسی نظریہ سے دیکھا کیونکہ دونوں سوانح نگاروں نے اپنے محسن کی تعریفیں بیش از بیش کی ہیں اور ان کی خامیوں کا ذکر برائے نام کیا ہے۔ دونوں مشرقی تہذیب کے علم برداروں میں سے تھے جہاں تک سرسید پر تنقید کا سوال ہے سرور صاحب کی یہ رائے درست ہے:

۱۔ افکار سلیمانی، مجیب اللہ ندوی، ص ۱۴۶

''شبلی نے علی گڑھ پہنچ کر بہت ترقی کی تھی۔ وہ سرسید سے بھی آگے دیکھ رہے تھے۔''

دوسری جگہ لکھتے ہیں:

''اکرام نے موج کوثر میں شبلی کو سرسید کا مدمقابل ٹھہرایا ہے یہ بات صحیح نہیں۔ شبلی کی تحریک کا مقصد سرسید کی تحریک کو ختم کرنا نہیں اس کی اصلاح کرنا تھا۔ اگر حیات شبلی کا غور سے مطالعہ کیا جائے تو یہ بات اچھی طرح واضح ہو جائے گی۔''[۱]

پروفیسر محمد ڈار نے حیات شبلی پر تبصرہ کرتے ہوئے اس طرح تنقید کیا ہے:

''حیات شبلی کے کتاب المناقب ہونے میں کوئی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ آخر یہ کیا ضروری ہے کہ محاسن اور معائب کا توازن قائم رکھ کر ہیرو کی داستان کو کتاب المحاسن والمساوی بنا دیا جائے۔ حیات شبلی میں مدلل مداحی سے بھی کافی کام لیا گیا ہے اور بہت سے نزاعی واختلافی امور میں پوری قوت دلائل کے ساتھ شبلی کے طرز عمل کو حق بجانب ٹھہرایا گیا ہے۔ لیکن اس بحث میں سید صاحب کی حیثیت بعض اوقات محض ایک طرف دار کی سی رہ جاتی ہے۔ اور وہ ایک کامیاب مناظر کی طرح مسئلہ کے صرف ان پہلوؤں پر زیادہ زور دیتے ہیں جو ان کے مفید مطلب ہیں..... کتاب کے سرورق پر حیات شبلی کو علامہ شبلی کے سوانح حیات اور علمی وادبی کارنامے بتایا گیا ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں کی شبلی کے علمی وعملی کارناموں کا تذکرہ بڑی تفصیل سے کیا گیا ہے اور کہیں کہیں ان کی تعریف وتحسین کے ساتھ تنقید کا فرض بھی ادا کیا گیا ہے۔ شبلی کے

۱۔ تنقیدی اشارے، آل احمد سرور، ص ۲۱۲۔۲۱۳

مقالات اور تصنیفات کی مقبولیت اور شہرت کو سید صاحب نے بڑی خوبی اور قابلیت کے ساتھ بیان کیا ہے۔ تاہم یہ امر واقع ہے کہ شبلی کے علمی کمالات پر بحث بہت حد تک تشنہ ہے۔ یہ سچ ہے کہ کہیں کہیں شبلی کی خوبیاں بحیثیت ایک ادیب، شاعر، ناقد اور مورخ کے بیان کی گئی ہیں لیکن یہ پیرایہ بیان موضوع کی اہمیت کے پیش نظر ناکافی ہے.....'' [۱]

شدید نقد و جرح کے باوجود ایک دوسری جگہ ڈار صاحب نے حیات شبلی کی عظمت و اہمیت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے:

''حیات شبلی کے اوراق سے مولانا شبلی کی سیرت و عظمت کا درجہ حقیقت میں بلند نظر آتا ہے۔ سوانح کی مناسب ترتیب، مصنف کا عالمانہ اسلوب بیان، حوالوں کی کثرت، معلومات کی فراوانی اور مولانا شبلی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں پر سیر حاصل تبصرہ کتاب کے گوناگوں حسن اور سید صاحب کی کامیابی کے بہترین ضامن ہیں۔ اس کتاب کی کامیابی کا سب سے بڑا سبب سید صاحب کی اپنے استاد کے تئیں عقیدت مندی ہے۔ سید صاحب نے یہ کتاب لکھ کر مرحوم استاد کی شاگردی کا حق ادا کر دیا.....اس ضخامت کے باوجود اس میں زندگی کی روح موجود ہے۔ ایک اور سبب مصنف کا علمی تبحر ہے جس کا ثبوت کتاب کے صفحات پر جابجا ملتا ہے۔ حیات شبلی کے بعض حاشیے علمی اور تاریخی اعتبار سے بہت مفید اور قیمتی ہیں۔'' [۲]

یہ حقیقت ہے کہ سید صاحب نے حیات شبلی میں شبلی کی اچھائیوں کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی

۱۔ مضامین ڈار، محمد ابراہیم ڈار، ص ۲۴۰۔۲۴۱

۲۔ ایضاً، ص ۲۴۲

ہے۔شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک سوانح نگار کے علاوہ ایک مشفق استاد کے عزیز شاگرد تھے۔اگر وہ اپنے استاد کی غلطیوں کا شمار کرتے تو مشرقی تہذیب کے معیار کے مطابق خود ایک خطا ہوتی لیکن پھر بھی انھوں نے جگہ جگہ شبلی کی خوبیوں کے ساتھ بعض خامیوں کی طرف اشارہ بھی کیا ہے۔مثلاً وہ لکھتے ہیں ''شبلی میں روحانیت کی کمی ہے''۔اس سلسلے میں وہ رقم طراز ہیں:

''اس اظہار میں کوئی پردہ نہیں کہ مولانا میں وہ پابندی واتقیا اور مذہبی تورع و تقدس جو علمائے دین کا خاصہ ہے نہیں تھا۔'' ۱

اس کے علاوہ علامہ شبلی کی شاہکار تصنیف الفاروق میں بھی انہیں یہ کمی نظر آتی ہے۔وہ فرماتے ہیں:

''الفاروق کی نسبت یہ کہنا سچ ہے کہ اس میں حضرت عمر فاروقؓ کی روحانی زندگی کا خاکہ پوری طرح نہیں ابھارا گیا ہے۔'' ۲

سید صاحب پر طول کلام کا الزام بھی عائد کیا گیا ہے۔طویل مقدمہ، ندوہ کے واقعات، قراردادوں اور تجاویز کا مفصل بیان، شبلی کے پاؤں کے حادثہ پر قصائد اور نظموں کا انبار، سرسید کی انگریز پرستی پر اعتراض لیکن گورنر ہیوٹ کی ندوہ کا سنگ بنیاد رکھنے پر دبی زبان سے تعریف، حیات شبلی میں خواتین بمبئی سے یکسر اجتناب، شبلی کی کتابوں پر بغیر کچھ لکھے ہوئے یوں ہی گزر جانا یہ سب خامیاں بھی بتائی جاتی ہیں۔

ایک اور وجہ یہ ہے کہ سید صاحب نے سرسید کے ساتھ انصاف سے کام نہیں لیا۔شبلی جس قافلے کے رکن تھے سرسید اس قافلے کے امیر کارواں تھے لیکن سید صاحب نے شبلی کو ان کا معاصر ہی نہیں مقابل ٹھہرایا ہے اور کئی جگہوں پر انہیں سرسید پر فوقیت دی ہے۔ان کے اس تعصّبانہ سلوک کی وجہ سے کچھ تنقیدی کتابیں بھی وجود میں آئی ہیں اور سرسید کے عقیدت مندوں نے ردعمل کے طور پر بہت سی غلط فہمیاں بھی پھیلائیں جس میں مولوی عبدالحق کا مقدمہ خطوط شبلی، امین زبیری کا تبصرہ ذکر شبلی اور عبدالوحید قریشی کی

۱۔ متعلقات شبلی، ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی، ص ۱۶۱

۲۔ حیات شبلی، سید سلیمان ندوی، ص ۲۱

کتاب شبلی کی حیات معاشقہ، شیخ محمد اکرم کی شبلی نامہ اسی ردعمل اور معاندانہ طرز عمل کا نتیجہ ہیں جو ان کے ذہن کی پستی کی وجہ سے وجود میں آئیں۔ جب کہ سید صاحب نے حیات شبلی کے دیباچہ میں اس بات کا اعتراف بھی کیا تھا کہ:

''خاکسار کو یہ دعویٰ نہیں کہ یہ تالیف سوانح عمری کے صحیح اصولوں پر پوری منطبق ہے تاہم یہ کوشش کی گئی ہے کہ جو کچھ معلوم ہو اس کو بے کم و کاست سپرد قلم کر دیا جائے۔ مولانا کی سوانح میں بعض رفقائے کار اور معاصرین سے کچھ الجھاؤ رہا ہے۔ کوشش کی گئی ہے کہ اس کشمکش کے تاریخی اظہار میں تعلقات کے شیشوں کو قلم کی بے اعتدالی سے ٹھیس نہ لگنے پائے اور کسی ناگوار واقعہ کے ذکر کے موقع پر بھی دامن کو راہ کے کانٹوں سے بچا کر نکلا جائے۔ تاہم نقائص اور عیوب بشریت کا خاصہ ہیں اس لئے کوئی سوانح نگار اپنی نسبت معصومیت کا دعویٰ نہیں کر سکتا۔ اور نہ کسی ایک فیصلہ کے متعلق سب کی رائیں ایک ہو سکتی ہیں۔ کیوں کہ محبت اور عقیدت کی نظر جہاں مخدوموں کی بہت سی خامیوں کو دیکھنے سے قاصر رہتی ہے وہاں بدگمانی کی نگاہیں سب سے پہلے ان ہی پر پڑتی ہیں اور ان کے تکرار و اعادہ میں ان کو ایسی لذت ملتی ہے کہ وہ ممکن کمالات سے بھی اغماض برت جاتی ہیں۔ لیکن یہ دونوں باتیں درحقیقت نفسیات فطرت کے مطابق ہیں اور اس میں معتقد و منتقد دونوں معذور ہیں۔ بہر حال شبلی شبلی تھے۔ جنید و شبلی نہ تھے۔''[1]

سید محمد ہاشم صاحب اپنے مقالے میں حیات شبلی کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''مجموعی حیثیت سے حیات شبلی مواد کی جامعیت، سائنٹفک طریقۂ کار کی کوشش، ترتیب کی عمدگی، بیان کی خوبی، مفصل فہرست مضامین اور تفصیلی اشاریوں کے

۱۔ حیات شبلی، سید سلیمان ندوی، ص ۶

اندراج کے باوجود ہیرو کی حمایت میں اس کی بعض کمزوریوں کی پردہ پوشی اور خامیوں پر تاویلات کا شکار ہے۔ تاریخی پس منظر مناسب ہونے کے باوجود کئی جگہ ضرورت سے زیادہ طویل ہوگیا ہے جس کی متحمل سوانح عمری نہیں ہوسکتی۔ جزئیات نگاری بری چیز نہیں لیکن اگر زندگی کی ایک ایک بات کو پیش کردیا جائے تو دفتر کے دفتر تیار ہوجائیں۔ اس لئے صرف ان جزئیات کا انتخاب کرنا ضروری ہوتا ہے جو شخصیت کی تعمیر میں لازمی طور پر معاون ہوں۔ حیات شبلی اس حسن سے عاری ہے۔ غرض یہ کتاب فنی خوبیوں سے معمور ہے اور خامیوں سے منزہ نہیں ہے۔'' [۱]

یہ سچ ہے کہ حیات شبلی میں محاسن کے مقابلے میں معائب کا پلڑا ہلکا ہے پھر بھی حیات شبلی کی تاریخی حیثیت سے انکار ممکن نہیں۔ اردو سوانح عمریوں کے ذخیرہ میں حیات شبلی اسی طرح ممتاز ہے جیسے ستاروں کے جھرمٹ میں چاند۔ اس کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہے اور اس کو علی العموم پسند بھی کیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر عبدالقیوم نے اپنی کتاب تنقیدی نقوش میں حیات شبلی کو ایک گراں قدر اضافہ قرار دیا ہے۔ اور شیخ محمد اکرام نے شبلی نامہ میں رقم کیا ہے:

''سید سلیمان نے حیات شبلی لکھ کر حالی سے وہ تاج فضلیت چھین لیا ہے جو حیات جاوید کی بدولت سر پر تھا۔'' [۲]

''گل رعنا'' حکیم سید عبدالحئی

گل رعنا حکیم سید عبدالحئی صاحب کی کتاب ہے۔ اس کا شمار دارالمصنفین کی ادبی کتابوں میں ہوتا ہے۔ اس کتاب میں شعراء کا تذکرہ ہے۔ مولانا مرحوم ندوۃ العلماء لکھنؤ کے ناظم اور عربی کے اعلیٰ معیار کے مصنف تھے۔ اس کتاب کے مقدمہ میں مولانا نے عرض حال بیان کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

۱۔ سید سلیمان ندوی حیات وخدمات، سید محمد ہاشم، ص ۳۰۱۔۳۰۲

۲۔ شبلی نامہ، شیخ محمد اکرام، ص ۲

''میں نے اپنے بچپن میں جن بزرگوں اور عزیزوں کو دیکھا ان میں کا ہر ایک ایک بیاض کا مالک تھا۔ میں نے بھی انہیں بزرگوں کے دامن تربیت میں پرورش پائی تھی۔ مجھ کو بھی بیاض بنانے کا شوق پیدا ہوا اور تقریباً پچیس تیس برس کے سن تک رہا۔ جب زمانہ نے آنکھیں کھولیں اور کاموں میں لگ گیا پھر خبر نہیں رہی کی وہ کہاں ہے اور کس حالت میں ہے..... انہیں کتابوں میں وہ بیاض بھی نکل آئی جو کسی زمانہ میں ہر وقت پیش نظر رہتی تھی۔ دیکھنے سے معلوم ہوا کہ مشہور شاعروں کا کلام اس میں اتنا جمع ہو چکا ہے کہ اگر اس کو ترتیب دے کر شائع کر دیا جائے تو پڑھنے والوں کو اس سے دلچسپی ہو سکتی ہے۔ اسی کے ساتھ خیال ہوا کہ جن کا کلام ہو ان کے مختصر حالات بھی لکھ دیئے جائیں۔ تذکرے جمع کئے اور کام شروع کیا۔ بات میں بات نکلتی آئی اور وہ ایک خاص کتاب بن گئی جس کا نام میں نے گل رعنا رکھ دیا ہے۔'' [۱]

اس طرح ایک بیاض دلچسپ تذکرے میں تبدیل ہوگئی۔ اس کتاب کو لکھنے کا مقصد مولانا محمد حسین آزاد کی ''آب حیات'' میں موجود کمیوں کو دور کرنے کی سعی ہے۔ لیکن مقدمے میں حکیم صاحب نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔ البتہ آب حیات میں جن مشہور شعراء کو نظر انداز کر دیا گیا تھا ان کے حالات درج کئے ہیں اور ان کی شاعری پر تنقید و تبصرہ ہے۔ مولانا نے مقدمہ میں اردو زبان اور اردو شاعری کی تاریخ سے بحث کی ہے۔ اس کے عہد بہ عہد ترقی کا ذکر کیا ہے۔ اس میں انھوں نے ذکر کیا ہے کہ اردو شاعری میں طرح طرح کی گیت اور پہیلیوں کا ایجاد امیر خسرو نے کیا اور اردو شاعری کی بنیاد ڈالی۔ خسرو کے بعد سلطان حسین شرقی نے جو فن موسیقی کا بے نظیر ماہر تھا اس میں برگ و بار کیا اور تھوڑے دنوں کے بعد سکندر لودی نے ملکی مصالح کے لحاظ سے ہندوؤں کو فارسی پڑھنے میں دلچسپی دلائی تا کہ وہ دفتری زبان سیکھ کر ملکی کاروبار میں حصہ لے سکیں۔ اس طرح سکندر لودی کے حکم سے ہندوؤں کی زبان پر فارسی عربی کے الفاظ رواں ہو گئے۔ اور مسلمانوں کی زبان پر ملکی زبان کا قبضہ ہو گیا اور آپسی میل ملاپ کی وجہ سے ان میں روانی پیدا

۱۔ مقدمہ گل رعنا، حکیم سید عبدالحئی، ص ۳

ہوگئی۔ بابر مغل ہونے کے باوجود اس زبان سے متاثر ہوا۔ اکبر کے زمانہ میں یہ میلاپ اور بڑھ گیا اور بادشاہ کی زمانہ سازی سے ہندورانیاں گھر کی مالک بن بیٹھیں اور ہندوؤں کے سارے رسم ورواج بادشاہ نے اختیار کئے۔ شعراء کے برابر کیشتریوں اور گویوں کو جگہ ملی اور ہتھیاروں اور گھوڑوں کے نام ہندی میں رکھے گئے۔ یعنی سبھی ہندوستانی چیزوں کے نام ہندی میں رکھے گئے اور سب کی زبانوں پر چڑھ گئے اور فارسی عبارتوں میں بھی ہندی الفاظ بے تکلف استعمال ہونے لگے۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی آپسی میل جول کی وجہ سے مخلوط زبان نے قدم آگے بڑھانا شروع کیا۔ پھر بھی بازاروں اور بے لطف صحبتوں اور گیتوں تک محدود رہی۔

اس کے بعد اردو شاعری کی حقیقت کے عنوان سے بحث ہے جس میں مولانا نے ذکر کیا ہے کہ اردو شاعری کا ظہور دکن سے ہوا۔ اس کے بعد تفصیلاً اس کا ذکر کیا ہے۔ حیدرآباد کے تباہ ہونے کے بعد بہت سے لوگوں نے اورنگ آباد میں پناہ لی۔ عالم گیر مرحوم کی عمر کا زیادہ حصہ بھی وہیں بسر ہوا۔

اس طرح ہر طبقہ کے امراء، علماء اور مشائخ جن کا تعلق دربار شاہی سے تھا اورنگ آباد آگئے اور ایک مدت تک اردو شاعری کا مرکز اورنگ آباد رہا۔ اس کے بعد اردو شاعری کا مرکز نقل دکن سے دلی کو منتقل ہوگیا۔ عالم گیر کی وفات کے بعد کچھ دنوں تک اردو ادھر ادھر آوارہ رہنے کے بعد دلی میں ریختہ سے اردوئے معلیٰ کا خطاب پاکر ہندوستان کے گوشہ گوشہ میں پھیل گئی اور دلی کی آب وہوا میں پرورش پاکر کافی ترقی حاصل کی۔ اس کے بعد ذکر کیا گیا ہے کہ شمس ولی اللہ کے ظہور سے پہلے ہی اردو میں قصیدہ خوانی، غزل سرائی شروع ہوچکی تھی اور مثنویاں لکھی جاچکی تھیں لیکن بعض تذکرہ نویسوں نے ولی کو اولیت کا تاج پہنایا ہے اور آزاد نے آب حیات میں تحقیق کرنے کے بعد تصدیق کی ہے جس پر مولانا عبدالحئی صاحب نے اس طرح اعتراض کیا ہے:

> ''معلوم ہوتا ہے کہ آزاد نے اردو نظم کی تدریجی ترقی پر خوب غور نہیں فرمایا اور جن شاعروں نے ولی سے پہلے اردو زبان کو ترقی دینے میں جانکاہیاں کی ہیں

ان کی کاوشوں اور کاہشوں پر خاک ڈال دی ہے۔'' [۱]

اس کے بعد اردو نثر کی تاریخ کا عنوان آتا ہے جس میں فضلی کو اردو نثر کا پہلا مصنف اور ''مجلس'' کے عنوان سے لکھی کتاب کو پہلی کتاب قرار دیا ہے۔ اس کے بعد شمس ولی اللہ نے شہدائے کربلا کے حالات میں ایک کتاب لکھی اور میر محمد حسین دہلوی کلیم نے ''فصوص الحکم'' کا اردو میں ترجمہ کیا۔ عطا حسین تحسین نے امیر خسرو کی کتاب چہار درویش کا ترجمہ کر کے نوطرز مرصع نام رکھا۔ مرزا لطف علی نے گلزار ابراہیم کا ترجمہ کیا اور اس کا نام گلشن ہند رکھا۔ سید حیدر بخش نے طوطا کی کہانی لکھی۔ میر بہادر علی حسینی نے مثنوی سحر البیان کو نثر میں لکھا اور نثر بے نظیر نام رکھا۔ میر امن دہلوی نے باغ و بہار آراستہ کیا جو نوطرز مرصع کا ترجمہ ہے۔ دوسری کتاب گنج خوبی کے نام سے لکھی۔

پروفیسر فورٹ ولیم نے ابوالفضل کی ''عیار دانش'' کا ترجمہ کیا اور خرد افروز اس کا نام رکھا۔ میر سید علی افسوس نے شیخ سعدی کی گلستان کا ترجمہ کر کے ''باغ اردو'' نام رکھا اور دوسری کتاب ''آرائش محفل'' لکھی۔ کاظم علی جوان نے شکنتلا کا قصہ لکھا۔ اکرم علی نے اخوان الصفا، سری لالو گجراتی نے پریم ساگر، مظہر علی ولا نے بیتال پچیسی لکھی۔ غرض یہ کہ اس زمانہ میں اردو زبان سے رغبت اتنی زیادہ بڑھ گئی تھی کہ علماء کو اسی زبان میں قرآن شریف کا ترجمہ لکھنے کا خیال پیدا ہو گیا۔

اس کے بعد اردو شاعری پر تبصرہ ہے جس میں پہلے طبقہ میں متقدمین کا ذکر تین ادوار پر ہے۔ پہلے دور کے شعراء میں صرف ایک شاعر مولانا نصرتی کا ذکر ہے۔ دوسرے دور میں شعرائے دکن اور تیسرے دور میں شعرائے دلی کا ذکر ہے۔ دوسرے حصہ میں متوسطین کا ذکر ہے اس میں بھی تین دور ہے۔ پہلا دور میر و مرزا، دوسرا مصحفی، میر حسن کا، تیسرا ذوق، غالب کا ہے۔

تیسرا طبقہ متاخرین کے ساتھ مخصوص ہے۔ اس میں بھی تین دور ہیں۔ پہلا دور ناسخ و آتش کا، دوسرا امیر و داغ کا، تیسرا حالی و اکبر کا ذکر ہے۔ ان سبھی شعراء نے جدید شاعری کی بنیاد ڈالی۔ دوسرے دور

۱۔ گل رعنا، حکیم سید عبدالحئی، ص ۳۴

کے شعرائے دکن کا ذکر ہے۔ جس میں شمس الدین ولی، فقیر اللہ آزاد، میر سراج الدین سراج، مرزا داؤد داؤد، میر عبدالولی عزلت، عارف الدین خاں عاجز وغیرہ کا ذکر مختصر حالات زندگی اور نمونہ کلام کے ساتھ کیا ہے۔ ان شعراء کا ذکر آزاد نے آب حیات میں نہیں کیا۔

تیسرا دور متقدمین شعرائے اردو کے عنوان سے معنون ہے جس میں شاہ مبارک آبرو، شیخ شرف الدین مضمون، محمد شاکر ناجی، مصطفیٰ خان یکرنگ، محمد حسین کلیم، شاہ ظہور الدین حاتم، اشرف علی فغاں کا ذکر ان کے نمونہ کلام اور سوانح حالات کے ساتھ ماخوذ ہے۔ متوسطین کا دور اول مرزا مظہر جانجاناں سے شروع ہوتا ہے جن میں مرزا محمد رفیع سودا صاحب کے حالات زندگی، ان کی غزلوں، ان کے قصیدہ شہر آشوب اور تضحیک روزگار کا ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ ان کی غزلوں کے چند اشعار اور ایک رباعی کا بھی ذکر ہے۔ میر تقی میر، میر درد، سید محمد میر سوز، شیخ قیام الدین قائم، انعام اللہ خاں یقینؔ، خواجہ احسن اللہ خاں میاں، میر محمد باقر حزیں، حکیم ہدایت اللہ خاں ہدایت، میر محمد بیدار، میر قدرت اللہ قدرت، میر ضیاء الدین ضیاء کا ذکر ان کے حالات زندگی اور ان کے نمونہ کلام کے چند اشعار پیش کئے ہیں۔

متوسطین شعرائے اردو کا دوسرا دور سید محمد میر اثر کے حالات زندگی اور نمونہ کلام سے شروع ہوتا ہے۔ اس میں بھی شیخ بقاء اللہ بقاء، مرزا جعفر علی حسرت، شیخ غلام ہمدانی مصحفی، شیخ غلام راسخ، میر غلام حسن حسن، شیخ قلندر بخش جرأت، میر انشاء اللہ خاں انشاء، مرزا سعادت یار خاں رنگین، حکیم ثناء اللہ خاں فراق تک جا کے ختم ہوتا ہے۔ اس میں ان شعراء کے حالات زندگی اور نمونہ کلام کا ذکر ہے۔

دور سوم طبقہ متوسطین کا دوسرا دور شاہ نصیر الدین نصیر سے شروع ہوتا ہے۔ میر نظام الدین ممنون، شیخ محمد ابراہیم ذوق، بہادر شاہ ظفر، حکیم مومن خاں مومن، مرزا اسد اللہ خاں غالبؔ، میر حسن تسکینؔ، نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، کرامت علی شہیدی کے حالات زندگی اور ان کی غزلوں کے کچھ منتخب اشعار درج کئے ہیں۔

حصہ سوم طبقہ متاخرین کے عنوان سے ہے جس کے دور اول میں دلی کی تباہی کے بعد کے دور کا

ذکر کیا ہے کہ دلی کے برباد ہونے کے بعد جب باصلاحیت لوگوں کا کوئی ٹھکانہ نہیں بچا تو کچھ لوگ مرشد آباد اور عظیم آباد کی طرف کوچ کر گئے۔ کچھ حیدر آباد کی طرف نکل گئے۔ لیکن یہ ساری جگہیں دلی سے دور ہونے کی وجہ سے صعوبت بھری ہوئی تھیں۔ دلی سے زیادہ قریب فرخ آباد اور فیض آباد دو ایسی جگہیں تھیں جہاں ان بدنصیب اور خانماں آوارہ لوگوں کی تھوڑی بہت قدردانی ہوتی تھی۔ فرخ آباد کی ریاست تباہ ہوئی تو نواب آصف الدولہ نے فیض آباد سے دارالسلطنت لکھنؤ کو منتقل کیا۔ دھیرے دھیرے دلی کے تمام شعراء لکھنؤ میں منتقل ہو گئے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب فرماں روایان اودھ نواب وزیر کہلاتے تھے اور دلی کے برائے نام بادشاہ کی طرف سے خطاب وخلوت وزارت ان کے لئے آتے تھے۔ سرکار کمپنی نے ایک خاص اثر کے بنا پر ان کو شہ دی اور نواب غازی الدین حیدر نے تاج شاہی سر پر رکھ کر دلی کی برائے نام وزارت سے سبک دوشی حاصل کی۔ نئے بادشاہ کی نئی امنگیں، دولت کی فراوانی، ہر طرف عیش وعشرت کی موجیں آنے لگیں۔ گھر گھر میں شادیانے بجنے لگے، یہاں تک کہ زندگی کے ہر شعبہ نے تراش خراش وضع ولباس میں نئے انداز پیدا کر دیئے۔ ان وجوہات سے دلی کے کہنہ مشق شاعر ایک ایک کر کے رخصت ہونے لگے۔ نوجوانوں کی جوانی کی امنگیں ابھر آئیں۔ زبان کی تراش خراش کی اور بدمزہ اور ناگوار الفاظ جو اس زمانے میں رائج تھے ترک کر دیئے گئے اور انھیں خلاف فصاحت قرار دیا۔ اس کو دلی والوں کو بھی ماننا پڑا اور اہل لکھنؤ دلی والوں کی تقلید سے ایسے آزاد ہوئے جیسے نواب وزیر نے دلی کی بادشاہی کے خطاب و خلعت وزارت سے آزادی حاصل کر لی۔

اس کے بعد شیخ امام بخش ناسخ کا ذکر ان کے حالات زندگی تفصیلاً بیان کی ہیں۔ ان کی ایک پوری غزل اور کچھ غزلوں کے چند اشعار بطور نمونہ دیئے گئے ہیں۔ اس کے بعد خواجہ حیدر علی آتش کے حالات زندگی، ان کی ایک پوری غزل مسلسل اور کچھ غزلوں کے منتخب اشعار درج ہیں۔ اسی طرح خواجہ محمد وزیر وزیؔر کے حالات زندگی، ایک پوری غزل، کچھ غزل کے منتخب اشعار اور ایک قطعہ نقل کیا ہے۔ میر وزیر علی صباؔ، نواب سید محمد خاں رندؔ، مرزا محمد رضا برقؔ، میر علی وسطؔ، رشکؔ، مرزا اصغر علی خاں نسیمؔ، میر مظفر علی اسیرؔ، شیخ

امداد علی بحرؔ کے مختصر حالات زندگی اور ان کی غزلوں کے چند اشعار پیش کئے ہیں۔

طبقہ متاخرین کا دوسرا دور منشی امیر احمد امیرؔ کے حالات زندگی اور ان کی تصانیف کے ذکر سے شروع ہوتا ہے۔ ان کے قصائد کا نمونہ اور ان کی غزلوں کے چند اشعار اور ایک قطعہ درج کیا ہے۔ اس کے بعد نواب مرزا خاں داغؔ کے حالات زندگی اور ان کی غزلوں کے چند اشعار پیش کئے ہیں۔ اس کے بعد سید ظہیر الدین ظہورؔ، مرزا قربان علی سالکؔ، میر مہدی مجروحؔ، حکیم ضامن علی جلالؔ، شیخ امیر اللہ تسلیمؔ، مولوی محمد محسن کے حالات زندگی اور نمونہ کلام درج ہیں۔ مولوی محمد محسن محسنؔ کے حالات زندگی اور ان کے کلام کے نمونوں میں صبح تجلی، چراغ کعبہ کا نمونہ، براق، درود، بیداری، سیر مقام اعلیٰ، مدیح خیر المرسلین، غزل، گریز، سراپا کے چند بند تضمین کا ذکر کیا ہے۔

طبقہ متاخرین کا تیسرا دور جدید شاعری کے آغاز پر منحصر ہے جس میں ذکر کیا ہے کہ اردو شاعری کا نیا دور کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم کی سرپرستی میں لاہور میں شروع ہوا۔ انھوں نے اردو زبان کی اصلاح کی طرف توجہ کی جس کے لئے قواعد کی چھوٹی چھوٹی کتابیں لکھوائیں۔ اردو نثر میں قصے لکھوائے۔ مشاعرے کی بنیاد ڈالی۔ مولوی محمد حسین آزاد اور حالیؔ نے چھوٹی چھوٹی مثنویاں لکھیں اس کے بعد محمد حسین آزاد کی سوانح ان کی غزلوں کے کچھ اشعار اور مثنوی شب قدر، مثنوی ابر کرم کے چند بند بطور نمونہ پیش کئے ہیں۔ خواجہ الطاف حسین حالیؔ کے حالات زندگی، غزلوں کے چند اشعار، حملۂ نفس، قوم کی پاسداری، موجودہ ترقی کا انجام توقع بیجا، کام کرنا جان کے ساتھ ہے۔ وقت کی مساعدت، فکر عقبیٰ کا ذکر حالیؔ کے اشعار کے ساتھ کیا ہے۔ اسی طرح مولوی محمد اسماعیل میرٹھی، سید اکبر حسین اکبر کے حالات زندگی اور ان کے کلام کے کچھ اشعار درج کئے ہیں۔ کتاب کے آخر میں ضمیمہ نمبر ا درج ہے جس میں مراثی کا بیان ہے۔ اس میں مرزا دبیر اور میر انیس کے حالات زندگی اور ان کے مرثیے قلم بند کئے ہیں۔ ضمیمہ نمبر ۲ میں حکیم صاحب نے اپنے والد محترم سید فخر الدین کی سوانح حیات اور ان کی فارسی شاعری کے کچھ اشعار اور غزل و نظم درج کئے ہیں۔

اس کتاب کو تالیف کرنے کا سبب مولانا محمد حسین آزاد کی کتاب آب حیات میں موجود کمیوں کو دور کرنے کی کوشش سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ اس کتاب میں آب حیات سے استفادہ بھی کیا گیا ہے لیکن حکیم صاحب نے اس کا ذکر اپنی کتاب میں نہیں کیا ہے۔ آب حیات میں جن جن شعراء کا ذکر محمد حسین آزاد نے نہیں کیا ہے، حکیم صاحب نے گل رعنا میں ان سب کا ذکر قدرے تفصیل سے کیا ہے۔

حکیم صاحب کا ماننا ہے کہ آب حیات میں کچھ ایسی تاریخی غلطیاں اور ایسے بیانات بھی موجود ہیں جن کی تصدیق اصل کتابوں سے نہیں ہوتی اور جن کا ذکر آزاد نے اپنی کتابوں میں کیا ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ رہی ہوگی کہ یا تو آزاد نے ان سے متعلق سنی سنائی روایات یا اپنے حافظہ پر اعتماد کیا ہو یا کتاب کی تصنیف کے وقت اصل مآخذ کی طرف رجوع کرنے کی زحمت گوارا نہیں کی ہوگی۔ بہر حال یہ بات پایہ ثبوت کو پہنچ گئی ہے کہ میر تقی میر کی نکات الشعراء غالباً آزاد کی نظر سے نہیں گزری اور آب حیات میں اس کی داخلی شہادتیں موجود ہیں۔ غالباً سب سے پہلے نواب صدر یار جنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی نے نکات الشعراء کے مقدمہ میں اس کو وضاحت اور قوت کے ساتھ ظاہر کیا اور آب حیات اور نکات الشعراء میں بہت سی جگہوں پر تضاد ظاہر کر کے آخر میں لکھا ہے:

> ''میری بدگمانی معاف ہو تو کہوں گا کہ نکات الشعراء آزاد کی نظر سے نہیں گزرا۔ قیاس کی بلند پروازی نے طوطے مینا بنا کر اڑائے ہیں اور ان کی سحر بیانی سے سامعین کو خوش کیا ہے۔''[1]

نکات الشعراء کے بارے میں آزاد نے آب حیات میں لکھا ہے کہ میر صاحب نے دیباچہ میں ذکر کیا ہے کہ اردو کا پہلا تذکرہ ہے۔ اس میں ایک ہزار شاعروں کا حال لکھوں گا۔ مگر ان کو نہ لوں گا جن کے کلام سے دماغ پریشان ہو۔ حکیم صاحب نے اس بات کی تردید کی ہے اور لکھا ہے کہ دیباچہ میں اس طرح کی کسی بات کا ذکر نہیں ہے۔

۱۔ حیات عبدالحیٔ، سید ابوالحسن علی ندوی، ص ۳۲۳

اسی طرح آزاد لکھتے ہیں کہ ایک ہزار میں سے ایک بیچارہ بھی طعنوں اور ملامتوں سے نہیں بچا اس بات کی تصدیق بھی نکات الشعراء سے نہیں ہوتی۔ اسی طرح آزاد نے آب حیات میں لکھا ہے کہ میر صاحب نے میر سوز کو پاؤ شاعر اور خواجہ میر درد کو آدھا شاعر مانا ہے لیکن حکیم صاحب نے اسے آزاد کی بذلہ سنجی قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ نکات الشعراء سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔

اسی طرح آزاد نے میر صاحب کی بد دماغی اور نازک مزاجی کی جو تصویر کھینچی ہے اور نواب سعادت علی خاں کا سامنا ہو جانے پر ان کی بے پرواہی، بے نیازی پھر خلعت بحال کرنے اور دعوت کے پیسے کو ردو کد کے بعد قبول کرنے کا جو واقعہ آزاد نے بیان کیا ہے، مصنف گل رعنا نے ان تمام واقعات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''حقیقت یہ ہے کہ آزاد نے میر صاحب کی جو تصویر آب حیات میں کھینچی ہے وہ ان کے منھ پر کھلتی نہیں کچھ شبہ نہیں میر صاحب نازک مزاج تھے مگر آزاد نے جو واقعات لکھے ہیں اگر آج وہ کسی میں پائے جائیں تو ہر شخص ان کو نازک مزاج نہیں خرد دماغ سمجھے گا۔'' [۱]

اس کے علاوہ چند تاریخی فروگزاشتوں اور غیر محتاط مبالغہ آمیز تصویر کشی کی چند مثالیں ہیں جو آب حیات میں جگہ پا گئی ہیں۔ گل رعنا میں اس کمی کو پورا کر دیا گیا ہے۔ اس کتاب کے متعلق مصنف نے کہیں اس بات کا دعویٰ نہیں کیا ہے کہ انھوں نے تنقیدی کتاب لکھی ہے یا شعراء کا تذکرہ مرتب کیا ہے بلکہ انھوں نے تحریر کیا ہے کہ ان کی پرانی بیاض میں شعرائے اردو کے کلام کا بڑا ذخیرہ جمع ہو گیا تھا جو ایک ضخیم کتاب کی شکل میں مرتب کر دیا اور اس کا نام ''گل رعنا'' رکھ دیا۔ چنانچہ مولانا کی اس کتاب کا مطالعہ اسی نقطۂ نظر سے کرنا چاہئے۔ لیکن اہل علم نے جہاں اس کتاب کی اہمیت کو پیش نظر رکھا وہیں مغرب پرست ناقدین نے اسے تنقید و تنقیص کا نشانہ بنایا۔ ڈاکٹر عبدالقیوم حسرت نعمانی اپنے مضمون میں اس سے متعلق رقمطراز ہیں:

۱۔ گل رعنا، حکیم سید عبدالحئی، ص ۱۵۹۔۱۶۰

''گل رعنا اردو ادب کی ایک نامکمل تاریخ ہے جس میں اردو نثر کی ابتدا اور ارتقاء پر بحث کا ایک باب شامل ہے۔ اس کے باقی حصہ میں یا تو آب حیات پر نکتہ چینیاں ہیں یا اسی سے ماخوذ خیالات و روایات درج ہیں۔ مختصر یہ کہ اعتراض ہو یہ اخذ و اقتباس یہ کتاب آزاد ہی سے استفاضہ ہے اور اس کا وجود آب حیات کا ممنون معلوم ہوتا ہے۔ یہ گل رعنا ایک مقصد خاص سے لکھی گئی تھی۔ چنانچہ پوری کتاب کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی تالیف کی غرض آب حیات کی خوردہ گیری و تنقیص تھی.....الغرض گل رعنا کا تخریبی پہلو اتنا نمایاں ہے کہ تنقیدی حیثیت سے اسے کوئی اہمیت نہیں دی جا سکتی۔'' [۱]

محمود الحسن رضوی نے اپنی کتاب ''اردو تنقید میں نفسیاتی عناصر'' میں گل رعنا کو قدیم تذکروں سے قریب قرار دیا ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ محمد حسین آزاد کی ''آب حیات'' پر اعتراضات اور اس کی خامیوں کو دور کرنے کی غرض سے لکھی گئی تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان کا تنقیدی معیار آزاد سے آگے نہ بڑھ سکا۔

اس کتاب سے متعلق وہ مزید رقم طراز ہیں:

''کتاب کا پورا خاکہ آب حیات ہی کا عکس معلوم ہوتا ہے۔ اور تنقیدی عنصر اس معیار تک نہ پہنچ سکا جتنا آب حیات میں موجود تھا۔ اسی لئے یہ کتاب اردو شاعری کی تاریخی ارتقاء کی منازل کے مطالعہ کے لئے تو مفید ہو سکتی ہے لیکن تنقیدی معیار میں کسی نئی خصوصیات کا اضافہ نہیں ہوتا۔'' [۲]

قیوم صادق احمد پوری اس کتاب کے متعلق رقمطراز ہیں:

''آب حیات کا اثر گہرا ہے۔ بعد کی تنقیدی کتابوں میں یہ اثر صاف نظر آتا

۱۔ اردو تنقید نگاری، مرتبہ ڈاکٹر عبادت بریلوی، ص ۱۷۸

۲۔ اردو تنقید میں نفسیاتی عناصر، محمود الحسن رضوی، ص ۳۰۷

ہے۔گل رعنا بھی اس اثر سے آزاد نہیں۔ دیکھنے میں تو اس میں آب حیات پر بہت سی نکتہ چینیاں ہیں لیکن اس کتاب کا زیادہ حصہ آب حیات پر مبنی ہے۔'' [۱]

عبدالشکور صاحب اپنی کتاب ''تنقیدی سرمایہ'' میں رقمطراز ہیں:

''اس تالیف میں وہ تمام نقائص موجود ہیں جو ایک ایسی بے ارادہ کتاب میں ہونا چاہئے۔ یہ قدیم طرز کا ایک تذکرہ ہے جس میں تنقید کا حصہ بہت کمزور اور ناقص ہے۔ حکیم صاحب نے اس کتاب میں آب حیات کی غلطیوں اور فروگزاشتوں کو پیش کیا ہے۔ لیکن یہ دیکھ کر حیرت کی کوئی انتہا نہیں رہتی کہ حکیم صاحب نے سب سے زیادہ آب حیات ہی سے استفادہ کیا ہے اور بعض مقامات پر یا تو آب حیات کی عبارت ہی نقل کر دی ہے یا اس کا ''پیرافریز'' پیش کر دیا ہے۔'' [۲]

ایک دوسری جگہ رقمطراز ہیں:

''انھوں نے محض بیاض کو ترتیب دے کر گل رعنا تیار کی۔ اس سے نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ انھوں نے اس کتاب کی تیاری کے لئے کوئی خاص اہتمام نہیں فرمایا۔ تنقید کے لئے جس تحقیق کی ضرورت ہے وہ عنقا ہے اور اسی لئے اردو شاعری کی ابتداء ایک پیچیدہ اور دقت طلب موضوع ہے۔ اس کی صحیح تصویر حاصل کرنا نہایت دشوار ہے۔ تحقیقات سے جو امور واضح ہوئے ہیں اور واضح ہوتے رہتے ہیں ان پر غور و فکر کرنا اور غور و فکر کے بعد اپنے خیالات کی صحت کرتے رہنا بہت دشوار ہے۔ اس کے علاوہ گل رعنا میں جدید شاعری پر جو تنقید

۱۔ اردو ادب میں تنقید، قیوم صادق احمد پوری، ص ۴۶

۲۔ تنقیدی سرمایہ، عبدالشکور، ص ۱۱۱

کی گئی ہے وہ ناقص اور ناکافی ہے۔ حکیم صاحب ان تحریکات سے نابلد تھے جن کے اثرات اردو شاعری پر پڑ رہے تھے اس لئے کتاب کا یہ حصہ بہت ناتواں رہا۔'' [۱]

پروفیسر کلیم الدین احمد نے اپنی کتاب ''اردو تنقید پر ایک نظر'' میں گل رعنا پر محاکمہ کرتے ہوئے تحریر کیا ہے:

''گل رعنا'' میں تنقیدی حصہ کالعدم ہے اور واقعہ نگاری اور نشاء پردازی میں بھی یہ کتاب آب حیات کی گرد کو نہیں پہنچتی۔ پرانے تذکروں کی طرح واقعات نہایت سیدھے سادے، بیرنگ طریقے سے بیان کئے جاتے ہیں۔ اس لئے ان میں دلچسپی کی کمی ہے.....گل رعنا نہ لکھی گئی ہوتی تو بہتر تھا۔ اس کتاب کی تنقیدی اور ادبی دنیا میں کوئی اہمیت نہیں۔ اس کتاب کے بدلے کہیں بہتر ہوتا اگر مصنف گل رعنا آب حیات پر ایک مفصل ریویو لکھتے اور اس ریویو میں آزاد کی غلطیوں کا انکشاف کرتے اور نئی معلومات کی روشنی میں آب حیات میں جو خامیاں رہ گئی ہیں ان کا ازالہ کر دیتے۔'' [۲]

مولانا سید ابوالحسن علی ندوی نے اپنی کتاب ''حیات عبدالحئی'' میں گل رعنا کی وجہ تصنیف کا ذکر کرتے ہوئے اس بات کی تائید کی ہے کہ آب حیات کو تاریخی فروگزاشتوں اور کمیوں کو دور کرنے کی غرض سے یہ کتاب لکھی گئی۔ خود ان کا ماننا ہے کہ یہ محض ایک بیاض تھی تاہم مولانا علی میاں جو کچھ تحریر فرماتے ہیں وہ یہ ہے:

''کوئی موضوع کسی بڑے سے بڑے مصنف پر ختم اور اس کے لئے وقف

۱۔ تنقیدی سرمایہ، عبدالشکور، ص ۱۱۲

۲۔ اردو تنقید پر ایک نظر، کلیم الدین احمد، ص ۶۷۔۶۸

نہیں ہوتا اور کوئی کتاب بھی (خواہ وہ کتنے ہی عظیم مصنف کے قلم سے نکلی ہو) اپنے فن وموضوع کی آخری کتاب قرار نہیں دی جاسکتی.....آب حیات بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں۔ وہ اپنی غیر معمولی اور اپنی اعلیٰ قسم کی انشا پردازی، دقیق نکتہ سنجی، بلکہ ذوق آفرینی اور ادب آموزی کے ساتھ ہر انسانی کام کی طرح نقائص سے یکسر مبرا اور غلطیوں اور فروگزاشتوں سے کلیۃً خالی نہ تھی۔ مولانا آزاد پیدائشی اور خلقی طور پر ادیب تھے اور ادب وحسن انشا ان کے تیغ قلم کے اصل جوہر ہیں۔ ادبی مزاج اور تاریخی مزاج میں ایک طرح کا بعد اور ادبی تقاضوں اور تاریخی تقاضوں میں بعض اوقات تعارض پایا جاتا ہے۔ ادب تخیل پسند ہوتا ہے اور تاریخ حقیقت پسند۔ ادب اپنی پرواز کے لئے آزاد اور بے قید فضا چاہتا ہے، تاریخ اپنے سفر کے لئے ایک محدود اور نپا تلا راستہ، ادب تشبیہ و استعارہ وتخیل سے آب ورنگ پیدا کرتا ہے اور تاریخ حوالوں، واقعات اور قدیم تحریروں کی پابندی سے گراں بار ہوتی ہے۔ مولانا آزاد کا اصل مزاج اور رجحان طبیعت ادب و انشاء پردازی ہے۔ وہ خواہ کسی تاریخی موضوع پر قلم اٹھائیں یہ ذوق ان پر غالب آکر رہتا ہے۔ آب حیات کے ان تشنہ گوشوں کو جو ایک نئی تصنیف کے متقاضی تھے، ایک ایسی تصنیف کی ضرورت تھی جو اس کمی کو پورا کردے اور اس عہد تک کے لئے ایک جامع تذکرہ کہلانے کی مستحق ہو۔'' [۱]

اسی سلسلے کا ایک اور اقتباس درج ہے:

''کسی تصنیفی کاوش کو اس کے زمانے کے حدود، ماحول اور مصنف کے مقرر کئے ہوئے پیمانے اور اس کی تصنیفی منصوبے سے علاحدہ کر کے کسی دوسرے زمانہ

۱۔ حیات عبدالحئی، سید ابوالحسن علی ندوی، ص ۳۱۵۔۳۱۶

کے حدود ماحول میں رکھ کر اس زمانے کے معیاروں، اصطلاحوں اور مقررہ کردہ اصولوں سے جانچنا اور ناپنا صحیح نہیں ہوتا۔ مصنف ادب وشاعری کے ان تنقیدی اصولوں سے واقفیت نہیں رکھتے تھے جو بیسویں صدی کے وسط میں مغربی ممالک میں دریافت کئے گئے۔ مصنف گل رعنا نے کہیں بھی اس کا دعویٰ نہیں کیا کہ یہ کتاب تنقید کا اعلیٰ نمونہ ہے اور اس میں وہ تنقید کے اعلیٰ معیاروں کی پیروی کریں گے۔ اردو میں آب حیات کے بعد کوئی ایسا مسلسل اور مکمل شستہ وشائستہ تذکرہ موجود نہیں تھا جو سلجھے ہوئے انداز اور سادہ وشیریں زبان میں اردو شعرا کے متعلق ایک متوسط درجہ کے طالب علم اور شائق فن کو بنیادی اور ضروری معلومات مہیا کرتا ہو۔'' [۱]

مذکورہ بالا تنقیدات کے پیش نظر اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ سبھی نقادوں کے نزدیک یہ کتاب تنقید سے عاری ہے۔ لیکن اس بات کو بار بار ذکر کرنے کی ضرورت نہیں کہ مصنف گل رعنا نے کہیں اس بات کا دعویٰ نہیں کیا ہے کہ وہ تنقیدی کتاب لکھ رہے ہیں یا شعراء کا تذکرہ مرتب کر رہے ہیں۔ یہ سچ ہے کہ کتاب کا زیادہ تر حصہ آب حیات کا فیض ہے لیکن محمد حسین آزاد کی کتاب کی تقلید کرنے کے باوجود آزاد کی رائے سے انھوں نے جتنا اختلاف کیا ہے شاید ہی کسی اور نے کیا ہو۔ اس کتاب کی خصوصیت اس لحاظ سے اور بھی ہے کہ ان میں فٹ نوٹس دیئے گئے ہیں جن میں بعض ایسے افراد کے حالات ہیں جن کے بارے میں ہماری معلومات بہت کم تھیں۔ اس کی دوسری خصوصیت ان شعراء کے کلام کا انتخاب ہے جو اعلیٰ معیار کے ہیں جس میں مولانا نے اس بات کی کوشش کی ہے۔ وہ شعراء کے نمائندہ اشعار نقل کر کے ان ہی کی روشنی میں شاعری پر رائے زنی کرتے ہیں۔ ان تنقیدات کے باوجود بھی یہ کتاب اردو زبان کی تاریخ میں کافی اہمیت کی حامل ہے۔

۱۔ حیات عبدالحیٔ، سید ابوالحسن علی ندوی، ص ۳۳۵

شعرالہند اوّل، دوم (مولانا عبدالسلام ندوی)

شعرالہند مولانا عبدالسلام ندوی کی نہایت اہم تصنیف ہے۔ یہ کتاب اردو علم وادب کا بیش قیمت خزانہ ہے۔ اس میں اردو شاعری اور اس کے مختلف اصناف کے تاریخی ارتقاء سے بحث کی گئی ہے اور قدماء کے دور سے لے کر دور جدید تک اردو شاعری کی تمام تاریخی تغیرات وانقلابات کا تفصیلی جائزہ لیا ہے۔ یہ کتاب دو جلدوں میں ہے۔ پہلی جلد کو مؤلف نے چار ابواب میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے باب میں اردو شاعری کا آغاز اور قدماء کے دور سے بحث کی ہے۔ اس میں بھی تین دور قائم کئے ہیں اور قدیم شعراء سے لے کر مصحفی، انشاء اور ان کے تلامذہ تک کا ذکر کیا ہے۔

اردو شاعری کے آغاز میں مؤلف نے یہ ذکر کیا ہے کہ اردو زبان کا مکمل خاکہ عالمگیر کے زمانہ میں تیار ہوا۔ لیکن عالم گیر کے زمانے سے بہت پہلے اس کی داغ بیل پڑ چکی تھی اور تیمور کے زمانہ تک دکن میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے آپسی میل جول سے ایک مستقل زبان وجود میں آکر پھیل چکی تھی۔ جہانگیر کے زمانہ میں اس زبان نے اور ترقی کی اور اردو کے پورے مصرعے اشعار میں استعمال ہونے لگے۔

دکن میں اردو زبان کا جو خمیر تیمور کے زمانہ میں تیار ہو چکا تھا، عالم گیر کی فوج نے جب دکن میں قیام کیا تو اس کو اس اختلاط نے اور پختہ کر دیا اور اردو زبان ہر قسم کے شاعرانہ تخیلات کی ادائیگی کے قابل ہوگئی۔ عام روایات کے مطابق اردو شاعری کا آفتاب اسی دور میں طلوع ہوا اور سب سے پہلے ولی دکنی پر اس کی شعاعیں پڑیں۔ لیکن بعض محققین کے نزدیک اردو شاعری کی ابتدا ولی سے پہلے ہو چکی تھی۔ اس لحاظ سے ولی سب میں ممتاز تھے جس نے انھیں اردو شاعری کا موجد مشہور کر دیا۔

جہانگیر کے زمانہ میں بعض اور بھی نظمیں لکھی گئیں جن کا انداز مثنوی کا تھا۔ چنانچہ غواصی نے طوطی نامہ بخشی کو نظم کیا جس کا ایک مصرعہ ہندی اور ایک مصرعہ فارسی زبان میں تھا۔ مولانا کے اس خیال کی تردید مولوی عبدالحق نے اس طرح کی ہے:

''غواصی کی مثنوی ہمارے پاس موجود ہے اس میں کہیں یہ بات نہیں پائی جاتی

۔ یہ رائے انھوں نے میر حسن کے تذکرے کی اس عبارت سے قائم کی ہے اور اسے نقل کیا ہے۔'' [۱]

قدما کا پہلا دور اور دلی میں اردو شاعری کا آغاز

دکن میں اردو شاعری کا آغاز مذہب کے زیر سایہ ہوا اور ولی کے زمانہ تک مذہبی خیالات شاعری پر غالب رہے۔ نعت و منقبت کے ساتھ عاشقانہ شاعری بھی شروع ہو چکی تھی۔ سلطان قلی قطب شاہ اور محمد قطب شاہ نے اس کا اس قدر ذخیرہ مہیا کر دیا تھا کہ تذکرہ شعرائے دکن میں اس مجموعہ کو دیوان کے نام سے موسوم کیا گیا۔

یہ سچ ہے کہ سنسکرت اور برج بھاشا کے ساتھ اردو شاعری ابتداء ہی سے فارسی زبان سے بھی متاثر ہوتی رہی ہے۔ جب تک ولی دکن میں رہے ان کا کلام بھی مضمون اور زبان دونوں حیثیتوں سے بہت کچھ قابل اصلاح تھا لیکن جب وہ دلی میں شاہ سعد اللہ گلشن سے ملے اور اپنے اشعار سنائے تو انھوں نے قدیم انداز کو بدلنے کی طرف توجہ دلائی۔ ولی نے ان کے مشورہ کو قبول کر کے اس کو بدل دیا جس کی تصدیق ان کے کلام سے بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ ولی کے کلام کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی اور ان کے کلام کے اثر سے محمد شاہی دور میں شاہ مبارک آبرو، شاکر ناجیؔ، شیخ شرف الدین مضمونؔ اور مصطفیٰ خاں یکرنگؔ وغیرہ پیدا ہو گئے جن کی ذات سے دلی میں اردو شاعری کی بنیاد قائم ہوئی۔

قدماء کا دوسرا دور اور اردو شاعری کی تجدید و اصلاح

محمد شاہی دور تک اگرچہ دلی میں اردو شاعری کا عام رواج ہو چکا تھا لیکن اس نے کوئی موزوں اور سنجیدہ قالب اختیار نہیں کیا تھا۔ شاعری کا جو انداز تھا اس میں ترمیم و اصلاح کی ضرورت تھی۔ جب شاہ عالم کا زمانہ آیا اور خواجہ میر دردؔ، فقیرؔ دہلوی، مرزا سوداؔ، میر تقی، میر حسن اور مرزا مظہر جان جاناں جیسے مصلحین فن پیدا ہوئے تو سب سے پہلے مرزا مظہر جان جاناں نے اس طرف توجہ کی اور ایک مستقل دور

۱۔ تنقیدات عبدالحق، مولوی عبدالحق، ص ۱۵۳

تجدید واصلاح کی بنیاد ڈالی۔ اگر چہ میر عبدالحیٔ تاباں نے مرزا صاحب کو غزل گوئی سے روک دیا اسی لئے غالباً وہ اسے زیادہ ترقی نہ دے سکے لیکن ان کے بعد کے اور اساتذہ نے اس کی ترقی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور اردو شاعری کے اکثر عیوب مٹا دیئے۔

محمد شاہی دور کی سب سے بڑی قابل اصلاح چیز مشہور شاعرانہ خصوصیت ایہام گوئی تھی۔ اس دور کے تمام اساتذہ نے اس داغ سے اپنے کلام کو پاک کیا۔ قدیم طرز میں شعر کہنے والے شعرا نے بھی جدید طرز کو اختیار کیا۔ اس دور کا سب سے اہم مسئلہ اصلاح زبان کا تھا۔ قدماء کے پہلے دور تک سنسکرت بھاشا اور قدیم دکنی زبان کے سیکڑوں الفاظ رائج تھے اور عربی و فارسی زبان کے الفاظ میں صحت کی بہت کم پروا کی جاتی تھی۔ شاہ حاتم نے اس کی طرف توجہ کی اور بہت سے الفاظ کی اصلاح کر کے اردو زبان کو دہلی کے محاورہ کے مطابق بنانا چاہا لیکن اس کی ابتدائی اصلاح کی تکمیل میرؔ و مرزاؔ نے کی۔ اس لئے وہی اس زبان کے مصلح بلکہ اس اصلاح یافتہ زبان کے موجد قرار پائے۔ ان بزرگوں نے قدیم الفاظ و محاورات میں جو تغیرات پیدا کئے ہیں ان کو صفیر بلگرامی نے اپنے تذکرہ میں ایک جگہ جمع کر دیا ہے جس کو مولانا نے اس کتاب میں ترتیب دے دیا ہے۔ اس پر مولوی عبدالحق نے اعتراض کیا کہ:

> مؤلف کو اس موقع پر متروکات سے بحث کرنے کا بہت اچھا موقع تھا مگر افسوس انھوں نے تحقیق سے کام نہیں لیا اور صرف جلوۂ خضر کی رائے کا بیان کر دینا کافی سمجھا جو محققانہ نہیں کہی جا سکتی۔'' [۱]

میرؔ و مرزاؔ میں مولانا نے اس بات کا تذکرہ کیا ہے کہ قدماء کے دور میں میر و مرزا حریف و مقابل تسلیم کئے گئے اور ان کی شاعری کا موازنہ و مقابلہ بھی اردو شاعری کی تاریخ کا ایک لازمی جز بن گیا تھا۔ لیکن تاریخی حیثیت سے نہیں معلوم کہ یہ دونوں حریف کب ہوئے کیونکہ ایک مدت تک آپس میں دونوں کا اتحاد تھا۔ دونوں ایک دوسرے کو اپنا شریک فن تسلیم کرتے تھے لیکن اس اتحاد کے بعد اختلاف شروع ہوا۔

۱۔ تنقیدات عبدالحق، مولوی عبدالحق، ص ۱۵۵۔۱۵۶

واقعات وقرائن سے پتہ چلتا ہے کہ اس کی ابتداء لکھنؤ سے ہوئی۔ یہاں کے درباری تعلقات نے اور کچھ اوباش لوگوں نے ان بزرگوں کو ایک دوسرے کا حریف بنا دیا۔ اس طرح یہ عام روش ہوگئی کہ اردو شاعری کے ہر دور میں دو شاعر باہم حریف قرار دیئے گئے۔

اکثر تذکرہ نویسوں کا یہ خیال ہے کہ سوؔدا کو قصیدہ نگاری میں کمال حاصل ہے اور میرؔ غزل گوئی میں اپنا جواب نہیں رکھتے۔ وہ اچھے مثنوی نگار بھی ہیں اس لئے دونوں کے راستے جدا ہیں اور ان دونوں کا موازنہ ہو ہی نہیں سکتا، یا ہو بھی سکتا ہے تو بہت آسانی سے نہیں ہوسکتا۔ بعض محققین سوؔدا کو بھی غزل گوئی میں باکمال تسلیم کرتے ہیں لیکن مولانا عبدالسلام ندوی کے بقول:

> ''دونوں بزرگوں کے کلام پر نظر ڈالی جائے تو دونوں میں کوئی نمایاں فرق نظر نہ آئے گا۔ قدماء کے دور میں جو محاسن ہیں وہ دونوں میں مشترک طور پر پائے جاتے ہیں۔ اسی طرح اس دور کے معائب بھی دونوں کے یہاں کم وبیش موجود ہیں۔'' [۱]

مولانا نے غزل گوئی میں سوؔدا کو میرؔ سے کم درجہ کا شاعر قرار دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کی غزل میں تغزل کی اصلی روح کم ہے اور میرؔ کو کمتر درجہ کا قصیدہ نگار بتایا ہے لیکن ساتھ ہی یہ بھی ذکر کیا ہے کہ:

> ''ہمارے نزدیک ان کے قصائد سے بھی سرسری طور پر گزر جانا مناسب نہیں۔ یہ سچ ہے کہ اس زمانہ میں جو چیزیں قصیدہ گوئی کا معیار کمال خیال کی جاتی تھیں ان سے ان کے قصائد خالی ہیں۔ مثلاً انھوں نے مشکل زمینوں میں کوئی قصیدہ نہیں کہا۔ دھوم دھام کی تشبیہیں نہیں لکھیں۔ طولانی قصائد بھی ان کے یہاں نہیں پائے جاتے۔ ان کے یہاں عموماً الفاظ کی شان وشوکت موجود نہیں۔ قصائد میں ان کی بندش بھی چست نہیں ہوتیں لیکن باینمہ تشبیہات میں سادگی

۱۔ شعر الہند اوّل، عبدالسلام ندوی، ص ۴۹

اور لطافت سوؔدا کے یہاں پائی جاتی ہے وہی میؔر صاحب کے قصائد میں بھی موجود ہے۔''[۱]

مولانا کی اس بات سے مولوی عبدالحق صاحب نے بھی اتفاق کیا ہے۔

قدماء کا تیسرا دور

قدماء کے تیسرے دور میں مولانا نے اردو شاعری کے آغاز پر بحث کی ہے کہ شاہ عالم کے زمانہ میں جب دلی پر تباہی آئی تو مادی ترغیبات کی بنا پر اہل دلی نے دیار مشرق کو اپنا مسکن بنایا اور دلی سے رخصت ہونے لگے۔ کچھ لوگوں نے لکھنؤ کا رخ کیا۔ اس طرح دلی نے قالب بدل کر گویا دوسرا جنم لیا اور شاعرانہ حیثیت سے جو مرکزیت اس کو دلی میں حاصل تھی وہ لکھنؤ میں حاصل ہوگئی۔ لیکن شعرا کی اصلی قدردانی کا زمانہ آصف الدولہ کے عہد وزارت سے شروع ہوا اور غازی الدین حیدر کے زمانہ تک قائم رہا جو امراء و شعراء کی قدردانی کرتے تھے۔ ان میں مرزا سلیمان شکوہ، نواب محبت خاں اور نواب محمد یار خاں کے درباروں سے بھی اس دور کے اکثر اساتذہ کا تعلق تھا۔ اس کے بعد آپ نے مصحفی انشاء کا موازنہ و مقابلہ کیا اور مثال کے طور پر ان کے چند اشعار نقل کئے ہیں۔

اس بحث کے بعد تلامذہ شعرائے قدیم کا ذکر کیا ہے جس میں سراج الدین خاں آرزو، تلامذہ مرزا مظہر جان جاناں، تلامذہ شاہ مبارک آبرو، تلامذہ مصطفیٰ خان یکرنگ، تلامذہ شیخ شرف الدین، تلامذہ شاہ حاتم، تلامذہ میر، سودا، خواجہ میر درد، میر سوز، میر حسن، جرأت، مصحفی، شیخ بقاء اللہ بقاء، رائے سرب سکھ دیوانہ، ضیاء، میر باقر حزیں، شیخ شرف الدین الہام، شیخ علی قلی ندیم، اشرف علی خاں فغاں، میر مہدی بیدار، مرزا جعفر علی حسرت، میر حیدر علی حیراں، میر شمش الدین فقیر دہلوی، شاہ قدرت اللہ قدرت، ان تمام شعراء کے ۹۱ شاگردوں کا ان کے نمونہ کلام کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد انھوں نے متبعین شعرائے قدیم کا عنوان قائم کر کے یہ ذکر کیا ہے کہ کس شعراء نے کس شعراء کی اتباع کی اور ان کے نمونہ

۱۔ شعر الہند اوّل، عبدالسلام ندوی، ص ۶۵۔۶۶

کلام کو مثال کے طور پر مختصراً پیش کیا ہے۔ اسی پر پہلے باب کا خاتمہ ہوتا ہے۔ مولانا تحریر کرتے ہیں کہ ''زمانہ اگرچہ دوسرا میر، سودا، درد اور میر سوز نہ پیدا کر سکا لیکن بہت سے لوگوں نے ان کے کلام کی اتباع کی۔ اس طرح دنیائے ادب کے در و دیوار سے مدتوں ان کے حسنِ قبول و شہرت عام کی صدائے بازگشت آتی رہے گی۔''

دوسرا باب: متوسطین کا پہلا دور

دوسرے باب میں متوسطین کے پہلے دور کا ذکر ہے جس کی ابتداء شیخ ناسخ سے ہوتی ہے۔ اس میں تفصیل کے ساتھ اس بات کا ذکر ہوا ہے کہ شیخ ناسخ نے زبان میں کافی تبدیلیاں کیں۔ پہلے اردو زبان کو ریختہ کہتے تھے۔ آپ نے اس کا نام اردو رکھا۔ غزل کو بھی ریختہ کہتے تھے اس کا نام غزل رکھا۔ غزل کی زمینوں میں تصرف کیا اور ردیف کی بنیاد حروف روابط اور حروف اثبات پر رکھی۔ جو افعال اصولاً صحیح تھے انہیں پر ردیف و قافیہ کی بنیاد رکھی۔ فحش الفاظ سے زبان کو پاک کیا۔ عربی، فارسی اور ہندی زبان میں تذکیر و تانیث کے قاعدے بنائے۔ بندش کی طرز فارسی کے طرز پر قائم کی۔ ہر قسم کے مضامین کو غزل میں شامل کیا۔

اس کے علاوہ سودا، میر، مصحفی، انشاء، میر حسن، شاہ نصیر وغیرہ کے وقت میں جو الفاظ و محاورات بولے جاتے تھے اس کو درست کر کے متروک قرار دیا۔ اس کی ایک طویل فہرست جلوۂ خضر سے نقل کی ہے۔

آپ نے جلوۂ خضر سے یہ بات اخذ کی ہے کہ جو مضمون قدماء کے خیال میں آتا اس کو باندھنے میں ان کو تکلف و توقف نہیں ہوتا اور مضمون کے لئے جس زبان کا لفظ مل جاتا اس کو باندھنے میں تامل نہ کرتے تھے لیکن ناسخ نے شعر و سخن سے متعلق سخت اصول اختیار کئے۔ خود اس کی پابندی کی اور اپنے تلامذہ سے بھی کرائی مگر مولانا نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''شیخ ناسخ نے قدماء کی بعض ایسی ترکیبیں اور بعض ایسے الفاظ بھی متروک قرار دیئے جن کا نعم البدل کیا بدل بھی پیدا نہ کر سکے۔''[1]

۱۔ شعر الہند اول، عبد السلام ندوی، ص ۲۰۳

اس کے بعد اردو شاعری کے دو مختلف اسکول دلی اور لکھنؤ کی خصوصیات کلام سے تفصیلاً بحث کی ہے۔ خواجہ آتش اور شیخ ناسخ کا موازنہ کیا ہے اور لکھنؤ اور دلی کی زبان کا بھی موازنہ و مقابلہ کیا ہے کہ لکھنؤ کے تمدن و معاشرت میں زنانہ پن تھا۔ شعرائے دلی عورتوں کی زبان نہیں استعمال کرتے تھے۔ شعرائے دہلی کے کلام میں فارسی زبان کی دلآویز ترکیبیں کثرت سے پائی جاتی ہیں۔ شعرائے لکھنؤ کا کلام ان ترکیبوں سے خالی ہے۔ شعرائے دہلی قدماء کے طرز پر اکثر مختصر غزلیں کہتے تھے لیکن شعرائے لکھنؤ لمبی لمبی غزلوں کے عادی تھے۔ شعرائے لکھنؤ اور شعرائے دہلی کے کلام میں معنوی لحاظ سے بڑا فرق ہے۔ شعرائے لکھنؤ کے کلام میں روحانی جذبات بہت کم پائے جاتے ہیں۔ شعرائے لکھنؤ کا عام میلان رعایت لفظی کی طرف زیادہ پایا جاتا ہے۔ وہ نہایت ابتذال کے ساتھ اس کو استعمال کرتے تھے۔

شعرائے لکھنؤ کا عام رنگ معاملہ بندی کا ہے۔ ان کے کلام میں وہ متانت و ثقاہت نہیں پائی جاتی جو شعرائے دلی کے کلام میں پائی جاتی ہے۔ ان خیالات کے اظہار کے بعد مولانا نے شیخ ناسخ اور خواجہ آتش کا موازنہ و مقابلہ ان کے نمونہ کلام کے ساتھ کیا ہے۔ اور اس بات کا ذکر بھی کیا ہے کہ لکھنؤ کی شاعرانہ خصوصیات ناسخ اور آتش کے کلام میں مشترک طور پر موجود ہیں۔ لیکن آتش کے کلام میں کچھ ایسی خصوصیات موجود ہیں جن کی وجہ سے ان کا کلام ناسخ کے کلام سے زیادہ پر اثر اور دل کش ہو گیا ہے۔ اس کے بعد آتش اور ناسخ کے کلام و زبان میں جو فرق ہے اس کا تفصیلاً ذکر کیا ہے۔ لکھنؤ اور دلی اسکول کے بعد اساتذہ دلی کا ذکر کیا ہے اور اس دور کی شاعری میں جو ناہمواریاں پیدا ہو گئی تھیں ان کو بیان کیا ہے اور شاہ نصیر، ذوق، غالب اور مومن کے الگ الگ رنگوں کو دکھایا ہے۔ فرماتے ہیں

شاہ نصیر اور ذوق نے ناسخ کے رنگ میں اشعار کہے ہیں۔ لیکن ذوق شاہ نصیر سے دو باتوں میں ممتاز ہیں۔ اوّل تو یہ کہ دلی کے آب و ہوا کے اثر سے ان کے کلام میں جا بجا جذبات و روحانیت کی آمیزش موجود ہے۔ دوسرے وہ محاورات کو اس برجستگی کے ساتھ باندھتے ہیں کہ طبیعت کو لطف و سرور حاصل ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ ناسخ کی تمام خصوصیات ان کے کلام میں موجود ہیں۔

مومنؔ نے بھی شروع میں ناسخ کا رنگ اختیار کیا لیکن یہ ان کی طبیعت کے خلاف تھا۔ چنانچہ انھوں نے اس کو ترک کر کے جرأت کی معاملہ بندی کی طرف توجہ کی لیکن یہاں بھی انھوں نے دہلی کی روایات کو برقرار رکھا۔

غالبؔ پہلے بیدلؔ کے رنگ میں غزل کہتے تھے لیکن ناسخ کے کلام کا غلغلہ بلند ہوا تو مومنؔ کے ساتھ غالبؔ نے بھی وہی روش اختیار کی لیکن ان دونوں بزرگوں سے یہ روش نبھ نہ سکی اور انھوں نے اپنا الگ رنگ اختیار کیا۔ غالبؔ نے میرؔ کے طرز میں شعر کہنا شروع کیا۔ اس میں ان شعراء کے کلام کا مختصر ذکر ہے۔ اس کے خاتمے پر متوسطین کا دوسرا دور تلامذہ آتش و ناسخ سے شروع ہوتا ہے جس میں اس بات کا ذکر ہے کہ ناسخ اور آتش کے بعد اردو زبان اور اردو شاعری کی اصلاح میں جو کمی رہ گئی تھی اس کو ان کے تلامذہ نے نہایت جامعیت کے ساتھ پورا کیا۔ آتش کے شاگردوں میں خلیل، صبا، رند، آغا حجو شرف اور ناسخ کے شاگردوں میں وزیر، برق، رشک، سحر وغیرہ نے بہت حد تک زبان و شاعری میں اصلاح کی مثلاً عربی فارسی کے الفاظ اور فارسی کی ترکیبوں کو کم کر دیا۔

اس کے بعد تلامذہ مومن و غالب کا عنوان قائم کیا ہے جس میں ذکر کیا ہے کہ تلامذہ آتش نے اپنے کلام میں جو لطف زبان پیدا کیا تھا مومن و غالب کے زمانہ تک دلی کی شاعری اس سے نا آشنا رہی ہے۔ مگر ان کے تلامذہ کا دور آتے ہی پیچیدہ گوئی کا خاتمہ ہو گیا اور طرز بیان میں سادگی اور زبان میں روانی پیدا ہو گئی۔ صفائی اور سادگی کی طرف زیادہ توجہ کی گئی۔ شعراء اس کو اپنا سرمایہ ناز خیال کرتے تھے۔ فارسی ترکیبیں جو مومن اور غالب کے کلام کا زیور تھیں بعد میں اس کا ذوق ختم ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ سالکؔ، حالیؔ، داغؔ اور انورؔ کا کلام ان سے خالی نظر آتا ہے۔

تیسرا باب متاخرین کا ہے جس میں یہ ذکر کیا گیا ہے کہ آتشؔ اور ناسخؔ کے زمانے میں لکھنؤ میں شاعری کے دو مختلف اسکول قائم ہو گئے تھے۔ غدر کے زمانے تک دونوں اسکول الگ الگ قائم رہے لیکن غدر کے بعد جب نواب یوسف علی خاں اور نواب کلب علی خاں کی قدردانیوں نے رام پور کو اساتذہ لکھنؤ

اور اساتذہ دہلی دونوں کی شاعری کا مرکز بنادیا اور ان کی فیاضانہ کشش نے مومن اور غالب، داغ، اسیر، امیر، منیر، بحر، قلق، تسلیم، حیا، اور جلال وغیرہ کو ایک جگہ جمع کر دیا تو دلی اور لکھنؤ کے دونوں اسکول ایک دوسرے سے قریب ہو گئے۔ شروع میں یہ اثر زیادہ نمایاں نہیں ہوا اور اسیر، منیر، بحر، قلق وغیرہ کا کلام پرانی حالت پر قائم رہا۔ لیکن زمانہ جیسے جیسے گزرتا گیا داغ کی روش مقبول ہوتی گئی۔ خود اساتذہ لکھنؤ کو اس کے مقابلے میں اپنا کلام پھیکا نظر آیا۔ اسی وجہ سے منشی امیر احمد نے داغ کا رنگ اختیار کیا۔ لیکن وہ اس میں کامیاب نہ ہو سکے۔ نتیجتاً لکھنؤ کی شاعری کا رنگ بدل گیا۔ منشی امیر اللہ تسلیم نے بھی داغ کے رنگ سے متاثر ہو کر کلام میں صفائی کی سعی کی۔ متاخرین اساتذہ لکھنؤ میں داغ کے رنگ میں سب سے زیادہ کامیابی مولانا سید علی حیدر طباطبائی کی نظم نے حاصل کی ہے۔ اس کے بعد ان شعراء کے کچھ کلام نمونہ کے طور پر پیش کئے ہیں۔ اس کے بعد داغ و امیر کا عنوان قائم کیا ہے اور ان دونوں کا موازنہ و مقابلہ کیا ہے۔ ساتھ ہی اس بات کا ذکر کیا ہے کہ ان دونوں میں کسی قسم کی مشارکت نہیں پائی جاتی تھی۔ چونکہ موازنہ کی یہ غلطی ابتدائی دور کے شعراء سے شروع ہوئی تھی تو داغ و امیر کے زمانہ تک قائم رہی۔ اس لئے مولانا نے ان دونوں کا موازنہ کر کے الگ الگ رائے کا اظہار کیا ہے۔ اس کے بعد متاخرین کا دوسرا دور تلامذہ داغؔ و امیرؔ سے شروع ہوتا ہے جس میں ذکر کیا ہے کہ ان کے تلامذہ کا زمانہ صرف یہ ہے کہ رام پور میں دلی اور لکھنؤ کی شاعری کے اختلاط نے جو نیا رنگ پیدا کر دیا تھا اس کو ان لوگوں نے آ کر جلا دے دی۔ داغ کے رنگ میں تو ترقی کی گنجائش ہی نہیں تھی اس لئے ان کے تلامذہ نے اس کو صرف قائم رکھا۔ البتہ جلال اور امیر کے تلامذہ نے اپنے اساتذہ کے رنگ کو کافی ترقی دی۔ اس کے بعد ان تلامذہ کے نمونہ کلام کو پیش کیا ہے۔ اس کے خاتمہ پر چوتھا باب دور جدید کے عنوان سے شروع ہوتا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ جدید دور میں انگریزی تعلیم رائج ہونے کے ساتھ شاعری کے متعلق بھی نئے خیالات پیدا ہوئے۔ جدید تعلیم یافتہ اصحاب نے ہمارے شعراء کے عاشقانہ اشعار کے ساتھ انگریزی شعراء کے شاعرانہ تخیلات کا مطالعہ کیا تو ان کو ہماری شاعری چند محدود، فرسودہ اور غیر شائستہ خیالات کا مجموعہ نظر آئی اور انھوں نے ہمارے شعراء

کے سامنے طرح طرح کے اصلاحی مطالبات پیش کئے۔لیکن عام طور پر شعراء نے اسے قبول نہیں کیا۔لیکن مولانا نے اس بات کا بھی ذکر کیا ہے کہ اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اردو شاعری میں اصلاح وتوسیع کی ضرورت تھی۔دور جدید کے مصلحین اور ریفارمرس میں یہ شرف مولانا حالی کو حاصل ہوا اور انھوں نے مقدمہ حالی میں اردو شاعری سے متعلق اصلاحی خیالات ظاہر کئے جس کو نمبروار پیش کیا ہے اور ان کے کلام کو بھی بطور نمونہ پیش کیا ہے۔اس کے بعد دور جدید میں شہرت حاصل کرنے والوں میں حسرت موہانی، وفا رام پوری، مولوی رضا علی وحشت، مولوی شوکت علی فانی، محمد علی جوہر، اصغر گونڈوی، شاد عظیم آبادی، عزیز لکھنوی، شبیر حسن، جوش ملیح آبادی وغیرہ کی شاعری کا مختصراً ذکر اور ان کا نمونہ کلام بھی پیش کیا ہے۔

اس کے بعد وطنی شاعری، اخلاقی شاعری، سیاسی شاعری، نیچرل شاعری، مناظر قدرت، وصف نگاری، ظریفانہ شاعری، قومی شاعری، تاریخی شاعری کا الگ الگ ذکر کیا ہے۔اس میں سودا، مہدی حسن مجروح نے بھی دلی کی تباہی کے بعد پر درد مرثیہ لکھا، لیکن جدید وطنی شاعری کی بنیاد حالی نے ڈالی۔محمد حسین آزاد، چکبست، ڈاکٹر اقبال، سرور جہان آبادی نے وطن کی محبت سے سرشار ہو کر گیت گایا۔اخلاقی شاعری میں محمد حسین آزاد، مولوی محمد اسماعیل اور مولانا حالی نے بکثرت نظمیں لکھیں جو آگے چل کر دوسرے شعراء کے لئے نمونہ بن گئیں۔بعد میں خود شبلی نے بھی اس طرف توجہ کی اور موثر تاریخی واقعہ نظم کیا۔سیاسی نظم بھی سب سے پہلے حالی نے لکھی۔اس کے بعد شبلی نے اس طرف توجہ دی۔اکبر حسین نے مخصوص ظریفانہ انداز سے کثرت سے سیاسی خیالات ادا کئے اس کے علاوہ نظیر اکبر آبادی وغیرہ کا کلام پیش کیا گیا ہے۔اس کے بعد متفرق نظموں کا عنوان قائم کیا گیا ہے جس میں ذکر کیا ہے کہ اس میں انگریزی شاعری کا پرتو صاف نظر آتا ہے۔چھوٹی چھوٹی متفرق نظموں کے ترجمے کثرت سے کئے گئے ہیں۔شیخ غلام محی الدین ایم اے نے اس قسم کی نظموں کا ایک مجموعہ ''دو آتشہ'' کے نام سے شائع کیا ہے۔

اس قسم کی نظموں کے ترجمہ سے ایک طرف تو شاعری نئے عنوانات وخیالات سے آشنا ہوئی تو دوسری طرف اردو زبان میں جدید تشبیہات واستعارات کا اضافہ ہوا۔اس کے ساتھ ہی پہلی جلد کا خاتمہ ہوتا ہے۔

شعرالہند۔ دوم

مولانا نے شعرالہند کی دوسری جلد میں جو مقدمہ لکھا ہے اس میں اردو زبان میں فن تنقید سے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان کے خیال میں اردو شاعری کا دکن میں آغاز ہوا اور دلی میں پروان چڑھی اور آخر میں لکھنؤ کو اس نے اپنا مستقر بنایا۔ دلی اور لکھنؤ کی زبان و بیان میں شروع سے ہی اختلاف پیدا ہوگیا۔ قدماء کے پہلے دور تک دلی میں دکنی زبان کا اثر قائم تھا لیکن قدماء کے دوسرے دور میں مصلحین اردو اور موجدین فن نے شاعرانہ اصلاح کی طرف توجہ کی تو ان کے پیش نظر اصلاح زبان کا مسئلہ تھا۔ چنانچہ شاہ حاتم، خواجہ میر درد، میر و میرزا نے خاص طور پر دکنی الفاظ سے دلی کی زبان کو صاف کیا لیکن پھر بھی اس کا اثر باقی رہا، قدماء کو متوسطین کے زمانے میں اصلاح زبان کا خیال پیدا ہوا اور شیخ ناسخ نے اس کی طرف توجہ کی۔

اس کے بعد لکھنؤ اور دلی کے دو مستقل اسکول قائم ہوگئے جن کی شاعرانہ خصوصیات اگرچہ معنوی لحاظ سے الگ تھیں لیکن اس کے ساتھ بھی زبان ہی کا مسئلہ تھا۔ ان تمام واقعات کا تاریخی نتیجہ یہ ہوا کہ ابتداء ہی سے ہمارے شعراء نے زیادہ تر الفاظ و محاورات ہی کو تنقیدی حیثیت سے اپنے سامنے رکھا اور انھوں نے اپنی توجہ صحت محاورہ و زبان کی طرف مبذول کی۔ رفتہ رفتہ یہ ایک فن بن گیا اور اساتذہ کی لفظی غلطیوں کو ڈھونڈھ کر ان پر اعتراضات کئے جانے لگے۔

مولانا نے دلی اور لکھنؤ کی زبان کا موازنہ کرتے ہوئے دلی کی زبان کو لکھنؤ کی زبان پر فوقیت دی ہے اور لکھا ہے کہ دلی بھی لکھنؤ کی طرح اردو زبان کا ایک مرکز تھی لیکن اہل دلی نے اہل لکھنؤ کی طرح زبان کو اپنا معیار نہیں قرار دیا بلکہ معانی و مطالب پر دھیان دیا اور اسلوب بیان کی متانت کو اپنا مطمح نظر بنایا۔

تنقیدی لحاظ سے بھی اہل دلی نے ہمیشہ معانی و مطالب کو مدنظر رکھا اور اسی حیثیت سے شعراء کے کلام پر رائے قائم کی۔ دور جدید میں جب الفاظ و محاورات کو چھوڑ کر ہمارے شعراء کی توجہ تمام تر معانی و مطالب کی طرف مبذول ہوگئی اور اردو شاعری پر معنوی پہلو سے اعتراضات کئے جانے لگے تو جدید

شاعری کے ساتھ فن تنقید کا بھی ایک نیا دور شروع ہوا۔ اور سب سے پہلے مولانا حالی نے اپنے دیوان کے مقدمہ میں اردو کے تمام متداول اصناف شاعری پر اصول فن کے مطابق بحث کی ہے اور آج معنوی لحاظ سے اردو لٹریچر میں یہی مقدمہ فن تنقید کا بہترین نمونہ خیال کیا جاتا ہے۔

پہلا باب۔ اردو کی انواع شاعری پر تبصرہ تاریخی حیثیت سے

اس باب میں مولانا نے غزل گوئی کو چار ادوار میں تقسیم کیا ہے اور چاروں کی الگ الگ خصوصیات بتائی ہیں۔ قدماء کے پہلے اور دوسرے دور میں ذکر کیا ہے کہ ان کی زبان بہت ثقیل اور مکروہ تھی۔ لفظی غلطیاں بھی کثرت سے پائی جاتی تھیں لیکن قدماء کے تیسرے دور میں مناظرہ کا رواج ہوا تو الفاظ کی درستگی پر کسی قدر دھیان دیا جانے لگا اور لفظی غلطیوں پر اعتراضات کئے جانے لگے۔ زبان کو فحش الفاظ سے پاک کیا۔ متوسطین کے دور میں ناسخ نے زبان کو نہایت مہذب اور شائستہ بنا دیا۔ آج تمام شعراء اسی زبان کے مقلد ہیں۔ قدماء کے تیسرے دور میں سب سے پہلے مصحفی نے الفاظ کی طرف توجہ کی اور متوسطین میں ناسخ اور آتش نے زمین شعر کو بالکل ہموار کر دیا۔ دلی شعراء کی فارسی ترکیبوں نے اس ہمواری میں اور اضافہ کیا۔ لیکن دور جدید کے بعض شعراء انہی فارسی ترکیبوں کو شاعری کا اصلی زیور سمجھتے ہیں۔ غرض یہ کہ مولانا نے اس باب میں ہر دور کے شعراء اور ان کے تلامذہ تک سے بحث کی ہے اور یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ شاعری کس طرح زینہ بہ زینہ پروان چڑھتی رہی اور قدماء کے پہلے دور سے لے کر آخر تک کس طرح ترقی کر کے آگے بڑھی۔ کس دور میں کیا الفاظ اور ترکیب استعمال ہوئی تو کس دور کے شعراء نے اصلاح کی کوشش کی اور کس دور کے اشعار میں کیا لفظی غلطیاں تھیں۔ اور انھیں کس طریقے سے اس لفظ کو استعمال کرنا چاہئے، کون سی ترکیب غلط اور کون سی سہی ہے۔ ہر دور کے شعراء اور ان کے نمونہ کلام کو مثال کے ساتھ پیش کر کے بحث کی ہے۔ ریختی، واسوخت، قصیدہ، مرثیہ، مثنوی، ڈرامہ، مذہبی شاعری، صوفیانہ شاعری، اخلاقی شاعری و فلسفیانہ شاعری سب پر عمیق نظر ڈالی اور سب سے بحث کی ہے۔

ریختی کو مولانا نے غزل کی بگڑی ہوئی شکل بتایا ہے۔ سعادت یار خاں رنگین کو اس کا موجد قرار دیا

ہے۔مہر جہانتاب میں انشاء کو ریختی کا موجد اور رنگین کو شریک مشورہ قرار دیا ہے لیکن دریائے لطافت میں انشاء نے رنگین کو ہی ریختی کا موجد بتایا ہے۔

حکیم عبدالحئی صاحب نے اپنی کتاب گل رعنا میں اس کی تردید کی ہے اور لکھا ہے کہ قدماء میں مولانا ہاشمی بیجاپوری دور اول کا مشہور شاعر ہے جس نے یوسف زلیخا ریختہ میں لکھا ہے۔

مولانا ندوی کے نزدیک امیر خسرو کے زمانہ سے لے کر قدماء کے دور تک کے جو اشعار ان تذکرہ نویسوں نے نقل کئے ہیں ان کو ریختی نہیں کہہ سکتے وہ ہندی شاعری کے طرز پر کہے گئے ہیں۔نواب امیر خاں کے اشعار کا کوئی نمونہ موجود نہیں اس لئے سعادت یار خاں رنگین کو ہی ریختی کا موجد تسلیم کرنا پڑے گا۔

واسوخت

ایرانی شعراء کے آخری دور میں جب معاملہ بندی نے ترقی کی تو ان معاملات کو ادا کرنے کے لئے غزل کے مصرعہ واشعار ناکافی نظر آئے تو وحشی یزدی نے جو معاملہ بند شعراء کا سرخیل تھا واسوخت ایجاد کیا اور قدماء کے دوسرے دور میں ہمارے شعراء نے بھی اسی کے نمونے کو پیش نظر رکھ کر اس صنف میں طبع آزمائی کی۔تیسرے دور میں جرأت نے اور متوسطین میں آتش نے ایک واسوخت لکھی۔شعرائے لکھنؤ نے اس کو پنا محبوب موضوع بنایا۔شعرائے دلی میں مومن خاں نے متعدد واسوخت لکھی لیکن متاخرین میں داغ،جلال اور تسلیم نے اس طرف توجہ نہیں دی۔

قصیدہ

قصیدہ گوئی کا آغاز قدماء کے ابتدائی دور سے ہوا لیکن قدماء کے دوسرے دور میں اس کو ترقی حاصل ہوئی جس میں سودا نے سب سے زیادہ ناموری حاصل کی۔سودا نے مشہور قصیدہ گو خاقانی کے معرکۃ الآرا قصائد پر قصائد لکھے اور اس میں قصیدے کی متانت،پختگی،الفاظ کی شان وشوکت،مضمون آفرینی پر پورا زور صرف کیا۔مشکل اور دلآویز ردیفیں اختیار کیں اور ان کو بہت خوبی کے ساتھ نبھایا۔قصائد میں بہاریہ تمہید کی جگہ نئی تمہید لکھی ہیں۔قصائد کو صرف حمد ونعت اور مدح وستائش تک محدود نہیں رکھا

بلکہ بعض قصائد میں واقعہ نگاری بھی کی ہے۔ مضمون آفرینی اور جدت طرازی کے باوجود بعض استعارات و تشبیہات نہایت سادہ اور نیچرل ہیں۔ ان ساری خوبیوں کے ساتھ ایشیائی شاعری کے معائب یعنی مبالغہ، غلق، اغراق وغیرہ بھی موجود ہیں۔ کہیں کہیں ابتذال، فحاشی اور بے حیائی پائی جاتی ہے۔ سودا کے بعد قصیدہ گوئی میں انشاء کا نام لیا جاتا ہے۔ شعرائے دلی میں غالب، مومن، ذوق نے قصائد لکھے۔ ذوق نے قصیدہ گوئی میں سودا کے قصائد کو پیش نظر رکھا لیکن ان میں وہ فطریت اور سادگی نہیں جو سودا کے یہاں ہے۔ بہر حال ذوق کے قصائد میں الفاظ کی شان وشوکت، ترکیبوں کی دلآویزی، بندش کی چستی اور وہ تمام خوبیاں ہیں جو قصیدہ گوئی کا جوہر ہیں۔ مومن خاں نے قصائد میں غزل کی زبان استعمال کی ہے۔ اس میں متانت وجزالت نہیں البتہ غالب نے بعض قصائد ایسے لکھے ہیں جو اردو شاعری کا سرمایہ ناز ہے۔

متوسطین کے بعد اساتذہ متاخرین میں منیر، امیر، داغ اور جلال سب نے قصائد کہے لیکن ان میں سے کسی نے کوئی خاص جدت نہیں پیدا کی۔ متاخرین کے بعد جدید دور میں قصیدہ گوئی کا خاتمہ ہو گیا اور اس کی جگہ نظموں نے لے لی۔

مرثیہ

دکن میں اردو شاعری کا آغاز نعت ومنقبت سے ہوا تو اسی سلسلہ میں دو چار آنسو شبیران کربلا پر بھی بہائے جانے لگے لیکن اس بات کا پتہ نہیں چلتا کہ سب سے پہلے مرثیہ گوئی کی ابتدا کس نے کی؟ عہد جہانگیری میں اول شجاع الدین نوری نے مرثیہ گوئی میں نام پیدا کیا۔ اس کے بعد ہاشم علی برہان نے مرثیہ کہے۔ اس کے بعد رام راؤ سیوا اور کاظم نے اس صنف میں شہرت حاصل کی عالم گیر کے زمانہ میں قلی خاں شاہی نے جو تانا شاہ کا ندیم تھا مرثیہ گوئی میں بہت نام حاصل کیا۔ اس کے مرثیہ کو دکن کے علاوہ ہندوستان میں بھی قبول عام کا شرف حاصل ہوا۔ اس کے بعد قدماء کے دور اول میں میاں مسکین نے اس کو اپنا خاص موضوع بنایا اور بہت کثرت سے مرثیے کہے۔

فضل علی فضلی نے بھی مرثیہ اور مناقب میں نہایت کثرت سے اشعار کہے۔ لیکن اس زمانے تک

صوری ومعنوی دونوں لحاظ سے مرثیہ نے کوئی نمایاں ترقی نہیں کی تھی۔سودا کے دور میں مرثیہ گوئی کا انداز قائم ہوااور مسدس کی شکل میں مرثیہ لکھا۔لیکن مولانا نے یقینی طور پر سودا کو اس کا موجد قرار نہیں دیا۔میر ضمیر نے مرثیہ کو موجودہ طرز کا خلوت پہنایا اور مرثیہ میں حسب ذیل جدتیں پیدا کیں۔

(۱)رزمیہ لکھا، (۲)سراپا ایجاد کیا، (۳)گھوڑے تلوار جنگ کے الگ الگ اوصاف بیان کئے۔ واقعہ نگاری کی بنیاد ڈالی، کلام میں زور بندش صفائی چستی پیدا کی۔غلط الفاظ کو ترک کر دیا۔نئی تشبیہات لطیف استعارے، مبالغہ، واقعہ نگاری، مناظر قدرت، یہ سارے محاسن میر ضمیر کے یہاں پائے جاتے ہیں۔

میر خلیق نے بھی اس فن کو ترقی دی۔اس کے بعد میر انیس اور مرزا دبیر نے اس کو معراج کمال تک پہنچایا اور اس کو اس قدر وسعت دی کہ اردو شاعری جن مضامین اور خیالات سے اب تک خالی تھی وہ سب ان مرثیوں میں آ گئے۔انھوں نے جذبات نگاری، مناظر قدرت، واقعہ نگاری کو بہت ہی تفصیل کے ساتھ دلکش انداز میں بیان کیا ہے۔اس کے علاوہ میر انیس نے زبان میں بھی وسعت پیدا کی جو محاورے اب تک صرف اہل زبان تک محدود تھے ان کو شعرا کے لئے عام کر دیا۔

مثنوی

اردو زبان میں مثنوی کی ابتدا مذہبی حیثیت سے ہوئی۔۱۵۱۸ء میں قطب شاہ نے ایک نعتیہ مثنوی لکھی اس کے بعد دکن کے ممتاز شعراء رسمی نے 'خاور خانہ' کے نام سے ایک مثنوی لکھی جس میں علی کرم اللہ وجہہ کے کارنامے اسّی ہزار شعر میں نظم کئے گئے۔اسی زمانہ میں تاریخی اور عاشقانہ مثنویوں کی ابتداء ہوئی۔ نصرتی نے گلشن عشق اور شاہ نامہ فردوسی کے جواب میں علی نامہ کے نام سے ایک مثنوی لکھی۔دور عالمگیر میں خواجہ محمود بحری نے ۱۱۱۲ھ میں 'لگن' نام سے ایک صوفیانہ مثنوی لکھی۔شعرائے دکن کے بعد دلی میں اردو شاعری کا پہلا دور شروع ہوا تو محمد شاہی دور میں شاہ مبارک آبرو نے متعدد مثنویاں لکھیں۔اس کے علاوہ جگر، میر، سودا، ناسخ نے کثرت سے چھوٹی چھوٹی مثنویاں لکھیں۔میر اثر نے اسی دور میں 'خواب وخیال' کے نام سے ایک مثنوی لکھی۔قدماء کے تیسرے دور میں مصحفی، انشاء، جرأت نے مثنوی نہیں لکھی لیکن میر

حسن نے بدر منیر لکھ کر سب کا حق ادا کر دیا۔ متوسطین کے دور میں کسی نے مثنوی نہیں لکھی البتہ دیا شنکر نسیم نے 'گلزار نسیم' لکھ کر سب کا فرض پورا کر دیا۔

متاخرین کے دور میں قلق نے مثنوی 'طلسم الفت' لکھ کر اس دور کو امتیاز بخشا۔ واجد علی شاہ کے آخیر زمانہ میں شوق نے چند مثنویاں لکھ کر نام وری حاصل کی۔ مولانا لکھتے ہیں کہ تمام مثنویوں میں شعرائے دکن کی مثنویاں نایاب ہیں۔ ہم اس پر کوئی رائے قائم نہیں کر سکتے۔ اسی طرح میر حسن کی مثنوی پر بھی حرف رکھنے کی جگہ نہیں ہے۔ وہ ابتدا سے ہی مقبول عام رہی ہے اور آج تک ہے۔ اس سلسلے میں مولانا حالی رقمطراز ہیں:

> ''میر تقی کے بعد میر حسن کی مثنوی بدر منیر نے ہندوستان میں جو سچی شہرت اور قبولیت حاصل کی ہے وہ نہ اس کے پہلے اور نہ اس کے بعد آج تک کسی مثنوی کو نصیب ہوئی ہے۔''[۱]

میر حسن کے زمانہ تک مثنوی کا کوئی ایسا نمونہ نہیں تھا جو ان کے لئے شمع راہ کا کام دیتا۔ یہ مثنوی خود دوسروں کے لئے بہترین نمونہ بن گئی۔ البتہ محمد شاہی دور میں فضائل علی خاں قید نے خود اپنے عشق و محبت کی داستان میں ایک مثنوی لکھی جو مشہور ہوئی اور جس کا اعتراف خود میر حسن نے بھی کیا ہے۔ اگر اردو میں کوئی مثنوی میر حسن کی نمونہ کے طور پر کام دے سکتی تھی تو غالباً یہ وہی مثنوی تھی۔ مثنوی سحر البیان میں میر حسن نے سیکڑوں چیزوں کا نقشہ کھینچا ہے اور مختلف مناظر کا سماں دکھایا ہے۔ لیکن کسی بھی جگہ فطری حدود سے تجاوز نہیں کیا۔ ہر جگہ فطرت کی تصویر کشی کی ہے۔ مثنوی گلزار نسیم کی بنیاد خیال بندی، رعایت لفظی اور تشبیہ و استعارہ پر رکھی گئی ہے۔ اس لئے نیچرل طریقہ سے بالکل دور جا پڑی ہے۔ کسی بھی موقع پر اسلوب بیان فطری اختیار نہیں کیا ہے البتہ طرز ادا نہایت صاف، رواں اور شستہ ہے۔ بندش چست ہے اور ہر موقع پر ہمواری پائی جاتی ہے۔ مثنوی طلسم الفت، گلزار نسیم اور بدر منیر کا مجموعہ ہے لیکن اس میں ہر موقع پر فطری طرز

۱۔ مقدمہ حالی، ص ۲۶۲، ڈاکٹر وحید قریشی

بیان سے تجاوز کیا گیا ہے۔ اس لئے جو برائی گلزار نسیم میں نقطہ کی صورت میں نظر آتی ہے وہ اس میں بھی پھیل کر دائرہ بن گئی ہے۔

ڈراما

ڈرامے کو تمام اصناف شاعری پر تفوق حاصل ہے کیونکہ

> ''شاعری کے دوسرے اقسام مختلف جذبات انسانی کے اظہار سے تعلق رکھتے ہیں لیکن برخلاف اس کے ڈراما میں ایک ہی جگہ مختلف طبقے اور درجے کو لوگوں کی حالتوں کی تصویر جو ان پر مختلف جذبات کے غلبہ پانے سے ظاہر ہوتی ہیں، دکھائی جاتی ہیں گویا جولانگاہ انسانی کا لقب جس طرح ڈراما پر صادق آتا ہے اسی طرح دوسرے اقسام پر نہیں آتا۔''[۱]

شکنتلا ناٹک کے سوا اردو زبان میں قدماء کے دور میں ڈراما کا کوئی نمونہ قائم نہ ہوسکا۔ واجد علی شاہ کے دور میں چند انگریز مصاحبوں کے توجہ دلانے سے ڈرامے کا شوق پیدا ہوا۔ سری کرشن کا عاشقانہ زندگی کے پرانے ہندی ناٹک رہسیہ (रहस्य) نے ڈرامے کا ایک خاکہ ان کی نظر میں پیش کر دیا اور خود جان عالم پیا کے نام سے کنہیا بن گئے۔ اب وہ قیصر باغ اور اس کے آس پاس کے باغوں اور کنجوں میں عاشق مزاج معشوق بنتے، گوپیاں اور پریاں ان کے شوق میں ماری ماری پھرتیں۔ کبھی وہ خود دھونی رما کے جوگی بنتے اور کبھی پریاں ان کے فراق میں زلفیں کھول کر اور سر پہ انڈا وار کھ کر جنگلوں کی خاک چھانتی پھرتیں۔

اسی زمانے میں امانت کے نام سے ایک مشہور شاعر نے ''اندر سبھا'' کے نام سے اپنا پہلا ڈراما تصنیف کیا۔ تصنیف کے ساتھ ہی وہ عام طور پر کھیلا جانے لگا۔ اندر سبھا لکھنے سے پہلے امانت کے واسوخت نے غیر معمولی شہرت و مقبولیت حاصل کر لی تھی۔ اور اندر سبھا نے اس میں اور بھی اضافہ کر دیا۔ لیکن یہ تماشا واجد علی شاہ کے زمانے میں ہی ختم ہو گیا۔ متاخرین کے زمانہ میں کسی شاعر نے یہ کھیل نہیں کھیلا۔

۱۔ وکرم اروسی، بحوالہ شعر الہند دوم، مولانا عبدالسلام ندوی، ص ۱۹۸

مذہبی شاعری

اردو شاعری کا آغاز مذہبی حیثیت سے ہوا اور مذہبی خیالات ایک مدت تک شاعری کے جزو غالب رہے۔ اردو زبان میں قدیم شعراء میں سب سے مقدم سلطان قلی قطب شاہ اور محمد قطب شاہ ہیں۔ ان کے کلام میں نعت و منقبت کا کافی حصہ شامل ہے۔ مولانا نصرتی نے عادل شاہ کے عہد میں ایک معراج نامہ لکھا۔ اس دور میں مرثیہ گوئی کی ابتدا بھی مذہبی جذبات سے ہوئی۔ قدماء کے دور میں سودا اور میر وغیرہ نے نعت و منقبت میں متعدد قصائد مذہبی جذبات سے لبریز ہو کر لکھے۔ قدماء کے تیسرے دور میں انشاء نے اس صنف میں زیادہ زور طبع صرف کیا اور مشکل زمین پیدا کر کے منقبت میں پرزور اور متین قصائد لکھے۔

اسی دور میں شاہ غلام محی الدین اویسی نے نظم میں قرآن مجید کی تفسیر لکھی اور نظیر اکبرآبادی نے مذہبی شاعری کے بکثرت عنوانات قائم کئے۔ متوسطین کے دور میں اساتذہ لکھنؤ نے تمام اصناف سخن کو چھوڑ کر صرف غزل کو اپنی جولانگاہ بنایا اسی لئے لکھنؤ مذہبی شاعری کے کارناموں سے خالی ہے۔ البتہ اساتذہ دلی نے نعت و منقبت میں بعض قصائد لکھے۔ قدماء کے دور میں نعت و منقبت کے لئے صرف قصائد مخصوص تھے اس لئے مومن اور غالب نے بھی انھیں کی تقلید کی۔ لیکن مولوی غلام امام شہیدؒ نے اس میں زیادہ وسعت پیدا کی اور غزل و مثنوی قصیدہ ترجیع بند سب میں نعت لکھی۔

متاخرین کے دور میں کسی نے اس طرف توجہ نہیں دی۔ جلال نے آخری عمر میں نعت و منقبت میں متعدد قصائد لکھے لیکن اس میں کوئی خاص دلکشی نظر نہیں آتی۔ البتہ محسن کاکوری نے نعت گوئی کو اپنا خاص موضوع بنایا اور اس میں کافی شہرت حاصل کی۔ لیکن اس فن سے متعلق انھوں نے لکھنؤ کی مکدر شاعری کا استعمال اور بھی غلط طریقہ سے کیا جس سے ان کا کلام بے اثر ہو گیا۔

حالی نے تمام روش کو چھوڑ کر مسدس میں حضورؐ کی بعثت پر پُرزور نعتیہ نظم تحریر کی۔ اردو شاعری میں اس سے بہتر نعتیہ نظم نہیں ملتی۔ دور جدید کی نعتیہ نظمیں قدماء و متاخرین کی نعتیہ نظموں سے زیادہ پُرعظمت، زیادہ متین اور زیادہ موثر ہیں۔

صوفیانہ شاعری

مولانا عبدالسلام صاحب لکھتے ہیں کہ دکن قدیم زمانے سے ہی تصوف کا مرکز رہا ہے۔ چنانچہ اردو شاعری میں بھی صوفیانہ خیالات در آئے۔ قطب شاہ کے بعد عالمگیر کے زمانے میں اردو شاعری نے زیادہ ترقی کی تو مستقل طور پر صوفیانہ لٹریچر کی بنیاد قائم ہوگئی اور محمود بحری نے تصوف میں ایک مستقل نظم لکھی۔ اس کے بعد صوفیانہ شاعری کو اور زیادہ ترقی ملی اور متعدد شعراء نے اس کو اپنا موضوع سخن بنایا۔

اردو شاعری کے زمانہ میں خواجہ میر درد نے سب سے پہلے اس زبان کو صوفیانہ خیالات سے آشنا کیا۔ میر، سودا، ناسخ اور میر حسن کے کلام بھی صوفیانہ خیال سے لبریز ہیں۔ قدماء کے تیسرے دور میں اردو شاعری فقر و تصوف کے دامن سے نکل کر امرا اور رؤسا کی آغوش میں پرورش پانے لگی۔ متوسطین شعراء ان خصوصیات سے نابلد ہیں۔ ناسخ و آتش اور ان کے تلامذہ کے کلام میں تصوف کی چاشنی پائی جاتی ہے۔

شعرائے دہلی میں ذوق، نصیر اور مومن اس بادۂ حقیقت سے ناآشنا ہیں۔ البتہ غالب اور شیفتہ وغیرہ کے کلام دیگر محاسن شعری کے ساتھ صوفیانہ خیالات سے بھی لبریز ہیں۔ متاخرین کے دور میں داغ اور امیر کے کلام میں جابجا تصوف کی جھلکیاں پائی جاتی ہیں۔ جدید شعراء میں حالی، مولوی اسمٰعیل میرٹھی، فانی اور اکبر کے کلام میں بہت کچھ صوفیانہ شان پائی جاتی ہے۔ لیکن قدماء جیسی صوفیانہ نظیر کسی دور میں نہیں ملتی۔

اخلاقی شاعری

حالی اور اکبر نے اردو زبان میں اس صنف کو اپنا موضوع بنایا۔ نظیر اکبرآبادی کو بھی اخلاقی شاعر کہا جاسکتا ہے لیکن ان کے کلام کا زیادہ حصہ سوقیانہ اور عامیانہ انداز میں ہے۔ قدماء نے بھی قطعات، رباعیات، غزلوں کے متفرق اشعار فارسی زبان کی اعلیٰ درجہ کی اخلاقی نظموں کو پیش نظر رکھ کر لکھے ہیں۔ متوسطین شعراء نے بھی اخلاقی مسائل کو اپنا شعری موضوع بنایا لیکن وہ زیادہ اثر نہ پیدا کر سکے۔ آتش اور تلامذہ آتش نے اس کو بہت پُر اثر طریقے سے ادا کیا۔ شعرائے دلی میں غالب بھی خاص اخلاقی اثر رکھتے ہیں۔ متاخرین کے دور میں یہ خصوصیت بالکل ختم ہوگئی۔ یورپین تہذیب و تمدن نے ملک میں جو عام

انقلاب پیدا کیا اس نے قدیم شاعری کے ساتھ قدیم نظام اخلاق کو بھی بالکل بدل دیا اور فلسفہ اخلاق کا نیا باب شروع ہوا۔ دور جدید کے اخلاقی شعراء میں حالی، مولوی اسمٰعیل، مولانا شبلی اور محمد حسین آزاد نے ان عنوانات پر بکثرت نظمیں لکھیں۔

مولانا حالی نے اپنے مسدس میں فارسی شاعری کے دور کی معاشرتی اور تمدنی حالت، عام پیشہ ور لوگوں کی حالت، علماء، فضلاء، شعراء اور امراء وغیرہ کی اخلاقی زندگی کے بارے میں تفصیل سے لکھا ہے جو قوم کی مختصر سی معاشرتی، اخلاقی، تمدنی تاریخ بن گئی ہے۔ اردو شاعری میں اخلاق کی دو قسمیں ہیں شخصی اور اجتماعی۔ شخصی اخلاق کا اثر صرف ایک شخص تک محدود رہتا ہے اور اجتماعی اخلاق سے تمام قوم متاثر ہوتی ہے۔

فلسفیانہ شاعری

اردو زبان میں کوئی فلسفی شاعر نہیں پیدا ہوا۔ متعدد شعراء کے یہاں جابجا فلسفیانہ خیالات ملتے ہیں جس میں وجود باری، ذات باری، حقیقت عالم، نظام عالم، قدم، مادہ وغیرہ کلی طبعی کا وجود خارج میں نہیں ہے۔ فطرت نہیں بدل سکتی غیر حقیقی چیز حقیقی ہو جاتی ہے۔ دنیا میں رنج ہی رنج ہے۔ دنیا کی چہل پہل صرف پست ہمت اشخاص سے ہے انسان کو صحیح علم حاصل نہیں ہوسکتا۔ نیکی صرف مذہب میں موجود نہیں۔ نیکی اور بدی فطرت کا نتیجہ ہے۔ برائی اور بھلائی فرضی ہیں۔ خیر و شر اضافی ہیں۔ برائی پیدا کرنے کی مصلحت اور تربیت کے لئے جلد بازی مضر ہے۔ محقق مقلد نہیں ہوسکتا۔ گردش زمانہ کا ساتھ نہیں چھوڑنا چاہئے۔ تجربہ عزلت گزینی۔ احساس مسئلہ تقدیر وغیرہ پر فلسفیانہ شاعری میں روشنی ڈالی گئی ہے۔

دوسرا باب۔ انواع شاعری پر ریویو ادبی حیثیت سے

عبدالسلام ندوی نے اردو کی انواع شاعری پر تاریخی حیثیت سے ریویو کرنے کے بعد اس کی ادبی حیثیت کو پیش نظر رکھا اور اس کے اصناف کا ذکر کیا ہے۔ اہل ادب نے شعر کی تفسیر بحر، وزن، قافیہ، ردیف وغیرہ کے لحاظ سے کی ہے۔ اس لئے شاعری کی چند محدود صنفیں مثلاً غزل، قصیدہ اور مثنوی وغیرہ پیدا

ہوئیں۔لیکن محققین ادباء نے جن کے سامنے عربی شاعری کے بہترین نمونے تھے،شاعری کی تقسیم مضمون و معنی کے لحاظ سے کی ہے اور شاعری کی اور بھی صنفیں نکالی ہیں۔ جو گو وزن و قافیہ میں اصناف متذکرہ بالا سے مختلف نہیں۔لیکن معناً ان میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔مثلاً بعض اہل ادب کے نزدیک شاعری کی بنیاد خوف، رغبت، مسرت اور غصہ پر رکھی گئی ہے اور انہیں جذبات کے اختلاف سے شاعری کی تمام مختلف قسمیں پیدا ہوئی ہیں۔مثلاً خوف سے اعتذار و استعفاف، رغبت سے مدح و شکر، مسرت سے غزل اور غصے سے ہجو و عتاب وغیرہ کی مختلف صنفیں ظہور میں آئیں۔

بعض ادباء کے نزدیک اصولاً شعر کی چار قسمیں ہیں مدح، ہجو، حکمت اور لہو۔لیکن ان میں ہر ایک صنف اور چند صنفیں مثلاً مدح سے مرثیہ، فخریہ اور شکر، اور ہجو سے دم عتاب اور استطاء حکمت سے امثال زہدیات، و پند و موعظت اور لہو سے غزل و خمریات یعنی رندانہ شاعری وغیرہ پیدا ہو جاتی ہے۔ بہت سے ادباء کا خیال ہے کہ اصولاً شعر کی دو قسمیں ہیں۔مثلاً مدح اور ہجو۔باقی قسمیں انہی سے تعلق رکھتی ہیں۔

ان تصریحات کی بنا پر اردو شاعری کے متداول انواع و اصناف یعنی غزل، قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ کے علاوہ شاعری کی اور بھی چند صنفیں پیدا ہوتی ہیں۔جن میں اکثر اردو شاعری میں موجود ہیں۔مولانا کے نظریہ کے مطابق لفظی تقسیم کی وجہ سے عام طور پر لوگوں کی نگاہیں اس پر نہیں پڑتیں۔اس لئے مولانا نے اس باب میں تمام اصناف کو نمایاں کر کے ادبی حیثیت سے ان پر تنقید کی ہے۔

اس میں غزل، خمریات، قصیدہ، فخریہ، مرثیہ، ہجو، مثنوی، سہرا، وصف، تشبیہ و استعارہ اور اجزائے شعر کو زیر عنوان قافیہ، ردیف، وزن اور محسنات شعر کے تحت صنائع و بدائع پر لکھا گیا ہے اور مختصراً ان سب پر بحث کی ہے۔

تیسرا باب ملکی سرمایہ سے متعلق ہے۔مولانا اس میں رقمطراز ہیں کہ اس دور میں اردو شاعری پر سب سے زیادہ یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ اس کے پاس خود اس کا کوئی ذاتی سرمایہ نہیں۔یہ ایران کی طرف قدم بڑھاتی ہے اور اپنے تمام اساسی مضامین کا مواد ایران سے لیتی ہے۔غرض بحر، ردیف، قافیہ،

استعارہ، تشبیہ ہر حیثیت سے اردو شاعری فارسی شاعری کی رہین منت تھی۔ اس کی اپنی کوئی ہستی نہیں ہے۔ ایسا اس لئے ہے کہ کسی متمدن قوم اور متمدن زبان کو دوسری قوموں اور دوسری زبانوں کے اثر سے محفوظ رکھنا اصول تمدن کے خلاف ہے۔ اس لئے اگر اردو شاعری نے فارسی زبان کے سرمایہ سے مدد لی تو یہ کوئی عیب کی بات نہیں۔ البتہ اس کے ساتھ زبان کا یہ فرض بھی ہے کہ وہ خود اپنے ملکی سرمایہ ملکی خصوصیات اور ملکی رسم ورواج سے بیگانہ نہ ہو اور اردو شاعری کی کوئی صنف اس سے ناآشنا نہ رہے۔

''ہندوؤں کا تعلق اردو شاعری کے ساتھ'' کے زیر عنوان لکھتے ہیں کہ آج اگرچہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان اختلافی مسائل میں سے ایک مسئلہ اردو زبان کا بھی ہے۔ لیکن گزشتہ زمانے میں زبان کا یہی مسئلہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان شیرازہ اتحاد کا کام دیتا تھا۔ اور اس کے ذریعہ دونوں قومیں ایک دوسرے میں اس قدر مربوط اور متحد ہوگئی تھیں کہ دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنا تقریباً اسی قدر دشوار تھا جس قدر اس زمانے میں دونوں کا ملانا مشکل ہے۔

قدیم اردو تذکروں میں نہایت کثرت سے ان ہندو شعراء کے حالات ملتے ہیں جنھوں نے بغیر کسی عصبیت کے مسلمانوں کے سامنے زانوئے تلمذ تہ کیا۔ اس طرح بعض ہندوؤں نے مسلمانوں سے اپنے کلام کی بھی اصلاح لی۔ بعض شعراء نے شاعری کی مختلف اصناف میں خاص کمال پیدا کیا تھا اور ہمارے تذکرہ نویسوں نے دل کھول کر ان کے کمال کی داد دی ہے۔

غرض گزشتہ زمانے میں اردو زبان اور شاعری کی ترقی میں دونوں کا برابر حصہ ہے۔ ہندو امراء میں مسلمان شعرا کی سب سے زیادہ قدردانی راجہ چندولال نے دکن میں کی ہے۔ خصوصاً شاہ نصیر صاحب کے ذریعہ سے ہندوؤں میں شعروسخن کا مذاق زیادہ پھیلا ہے اور بکثرت ہندوؤں نے ان کی شاگردی اختیار کی۔ ہندو مصنفین نے شعراء کے تذکرے بھی لکھے جو اس زمانے میں ادبی ذوق کی ایک بڑی علامت تھی۔

''مربیان سخن'' کے زیر عنوان مولانا تحریر کرتے ہیں کہ افسوس کی بات ہے کہ اردو شاعری کا آغاز اس زمانے میں ہوا جب مسلمانوں کے شاہانہ جاہ وجلال کا جنازہ اٹھ رہا تھا۔ چنانچہ اس دور میں اس نے

سلطنت ہی کے زیر سایہ نشو ونما حاصل کی اور ہمارے شعراء نے ہر دور میں امراء وسلاطین کی سرپرستی سے خاص طور پر فائدہ اٹھایا۔

محمد شاہ کے زمانے میں شاعری نے ترقی کی۔ شاہ مبارک آبرو، مصطفیٰ خاں یکرنگ اور شاہ حاتم اس دور کی یادگار ہیں۔ شاہ عالم کے دور میں اردو شاعری نے ترقی کی۔ میرؔ، مرزا خاں آرزو، درد، فقیر دہلوی، شاہ حاتم اور میر حسن اسی دور میں پیدا ہوئے اور دلی کو اردو شاعری کا مرکز بنایا۔ چنانچہ ہر دور میں امراء اور سلاطین نے شعراء کی قدر کی۔ بعض امراء نے تو شعرا کی شاگردی بھی اختیار کی۔

اس کتاب کے خاتمہ پر مولانا نے ''اردو شاعری کا درجہ'' متعین کیا ہے اور بتایا ہے کہ اردو شاعری فارسی شاعری کا وجود ظلی ہے۔ اس لئے عربی کے مقابلہ میں جو عیوب فارسی شاعری میں ہیں وہی اردو شاعری میں بھی موجود ہیں۔

چنانچہ انھوں نے عربی شاعری، فارسی شاعری اور اردو شاعری میں جو خوبیاں اور خامیاں ہیں ان کو قلم بند کیا ہے اور ان تینوں شاعریوں کا موازنہ کیا ہے کہ کس میں کیا ہے؟ اور کس میں کیا نہیں ہے؟ مولانا نے سب میں فارسی شاعری کو برتر قرار دیا ہے کیونکہ جن چیزوں کا وجود عربی شاعری میں نہیں ہے فارسی میں ہے اور اردو چونکہ فارسی کے وجود سے ہے تو اس کا زیادہ اثر فارسی شاعری پر ہے۔ اردو شاعری میں زیادہ چیزیں فارسی شاعری سے آئی ہیں۔

ان تفصیلات و تجزیہ کے بعد یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ مولانا عبدالسلام صاحب نے کتنی کوشش و جستجو کے بعد اس کتاب کو تحریر کیا ہے۔ اردو میں قدیم شعراء کے بہت سے تذکرے موجود ہیں لیکن موجودہ تنقیدی نقطۂ نظر سے ناقص و نامکمل ہیں۔ ان سے نہ تو شعراء کے حالات زندگی اور کلام کی خصوصیات ہی معلوم ہوتی ہیں اور نہ شاعری کے عہد بہ عہد کے تغیرات اور اس کے اسباب پر بحث ملتی ہے۔ ایسی کتابیں درحقیقت تذکرے سے زیادہ بیاض معلوم ہوتی ہیں جن میں تذکرہ نگار اپنے منتخب کردہ پسندیدہ اشعار رقم کرتے ہیں۔ مولانا محمد حسین آزاد نے اس کمی کو دور کرنے کے لئے جدید نقطۂ نظر سے اپنی شاہکار تصنیف

''آب حیات''، لکھی جو اردو زبان وادب میں انتہائی اہمیت کی حامل ہے۔ اردو زبان جب تک زندہ رہے گی اس کتاب کی اہمیت پر کوئی حرف نہیں آسکتا۔ حالانکہ موجودہ دور میں ناقدین نے اس کو اردو شاعری کی تنقید کی ایک خام کوشش قرار دیا ہے جب کہ یہ کتاب فی الواقع اردو زبان کی پہلی تنقیدی کتاب ہے۔ اس لحاظ سے اس کی اہمیت مسلم ہے لیکن اس میں وہ جامعیت نہیں جو اردو شاعری کی تاریخ کے لئے ضروری ہے۔ اس میں اصناف شاعری کی تاریخ اور ان پر ریویو نہیں ہے۔ عبدالشکور صاحب شعرالہند پر افسوس کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> ''یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ ندوی صاحب کے تتبع میں اپنی تصنیف کا نام کچھ مہمل سا رکھ گئے۔ شعرالہند میں ہند کی شاعری کا ذکر ہوتا ہے اس میں صرف اردو شاعری کا ذکر ہے۔ ہندی، بنگالی، گجراتی، تامل کی شاعری کو شعرالہند میں جگہ نہیں دی۔'' [۱]

اور اسی مضمون میں دوسری جگہ رقم طراز ہیں:

> ''اس میں شک نہیں کہ اس تصنیف کی تیاری میں ندوی صاحب نے بڑی محنت و جانفشانی کی۔ تذکروں کی عبارتوں پر ان کو عبور حاصل ہے۔ لیکن یہ کتاب پڑھ کر یہ محسوس ہونے لگتا ہے کہ مختلف تذکروں کے حوالے خوان یغما کے طور پر پیش کر دیئے ہیں۔ کہیں ربط و تسلسل کا نام نہیں اور عہد بہ عہد کے میلانات کی مکمل تصویر بھی سامنے پیش نہیں کی جاتی۔ شعرالہند کو تنقید کی کتاب کے بجائے بیسوی صدی کا تذکرہ کہنا کچھ زیادہ غیر مناسب نہ ہوگا۔'' [۲]

مولانا عبدالسلام صاحب کی تحریروں میں بڑی ہمواری، یکسانیت، روانی و برجستگی ہے، تصنع کا نام

۱۔ تنقیدی سرمایہ، عبدالشکور، ص ۱۸۴

۲۔ ایضاً، ص ۱۸۶۔۱۸۷

نہیں۔ ان کی تحریروں کو پڑھنے میں کوئی رکاوٹ و پریشانی نہیں محسوس ہوتی۔ مثلاً ولی کے زمانے کی اردو شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اب شاعری صرف ایک تفریحی مشغلہ نہیں تھی بلکہ اس کی آواز اس معمورۂ عالم سے نکل کر گنبد افلاک تک پہنچ گئی تھی، اور اس صدائے بازگشت سے حظیرۃ القدس بھی گونج اٹھا تھا۔ چنانچہ ولی خود فخریہ کہتے ہیں

پڑھتے ہیں ولیؔ شعر ترا عرش پہ قدسی　　باہر ہے تری فکر رسا حد بشر سوں

اس فخر و غرور کی حالت میں ولی نے اپنے کلام پر نگاہ ڈالی تو انہیں مئے دو آتشہ کا ایک ساغر لبریز نظر آیا جس کے نشہ میں خود مستانہ وار پکار اٹھے

یوں تجھ سخن میں نشہ معنی ہے اے ولی　　جوں رنگ بوئے مئے سے ہے لبریز ایاغ گل

اور اس سرمستی میں ایک پوری غزل لکھ ڈالی جس میں شاعری کے ساتھ خود اپنی بھی مدح کی ہے۔[1]

مولانا اپنے چھوٹے چھوٹے فقروں میں شہد گھولتے ہیں جس میں ادبی چاشنی کے ساتھ ان کے فکر کی گہرائی جھلکتی ہے۔ مثلاً

''جو لوگ ولی کی شراب طہور کے متوالے تھے ان کو جرأت کی بے باکانہ مستیاں اور بھی ناگوار ہوئیں۔''[2]

ابن قدامہ اور ابن رشیق نے اہل عرب کی عاشقانہ شاعری کو پیش نظر رکھ کر غزل کی جو حقیقت بتائی ہے، مولانا نے ان کو سامنے رکھ کر غزل گوئی کے اصول قائم کئے ہیں۔ ان کی نظر میں عاشقانہ جذبات واحساسات، غزل کا اصل مایہ خمیر ہیں۔ اس لئے وہ غزل سے حیات و کائنات کی پیچیدگیوں کو سلجھانے

۱۔ شعر الہند اوّل، عبدالسلام ندوی، ص ۲۳

۲۔ ایضاً، ص ۸۸

کے قائل نہ تھے۔ ان کے نزدیک غزل میں صرف عشق ومحبت، شیفتگی وفریفتگی اور حسرت ویاس کا بیان ہونا چاہئے۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ اچھی غزل وہی ہے جس میں عشق کی نامرادی، ناکامی اور پسپائی کا ذکر ہے۔ اگر عشق کی فتح، کامرانی اور شادمانی کا ذکر ہے تو وہ تغزل نہیں ہوس ناکی اور بوالہوسی ہے۔ غزل میں عشق کی صرف قوت منفعلہ یعنی آرزو کی افسردگی، رنج وغم، شوق وحسرت اور سوز وگداز کا اظہار ہونا چاہئے۔

ان اصولوں کو سامنے رکھ کر مولانا نے اساتذہ کے جو بے شمار اشعار اپنے ثبوت میں پیش کئے ہیں ان سے ان کی سخن فہمی، سخن سنجی اور دیدہ وری کا اندازہ ہوتا ہے۔ آپ وہ پہلے مصنف ہیں جنھوں نے اردو شاعری کے دو مختلف اسکول دلی اور لکھنؤ پر تفصیل کے ساتھ شعرالہند میں روشنی ڈالی ہے اور مختلف مثالوں سے لکھنؤ اسکول کی خامیوں کی نشان دہی کی ہے جس میں خاص طور پر لکھنؤ کی تہذیب وتمدن کا زنانہ پن، مبتذل اشعار، روحانی جذبات کی کمی، رعایت لفظی کی طرف عام میلان اور معاملہ بندی ہیں۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر عبدالحق رقم طراز ہیں:

> ''ان عنوانات کے تحت مولف نے مثالوں کی کافی تعداد دی ہے۔ خیر ہم پر تو یہ الزام تھا کہ ہم دلی کی طرف کے رہنے والے ہیں لیکن مولوی عبدالسلام صاحب نہ دلی کے ہیں اور نہ دلی کی طرف کے۔ دیکھیں ان پر کیا الزام لگایا جاتا ہے۔''[1]

عبدالسلام ندوی کی تصانیف تحقیق وتاریخ کے ساتھ عمدہ اور صحت مند تنقید کی بھی حامل ہیں اور انھوں نے عربی وفارسی ادبیات کے مشاہیر نقادوں اور ان کی کتابوں سے ایسے نکات اخذ کئے ہیں جو اردو کی تمام تر شاعری کے لئے مشعل راہ بنے۔ اس کتاب کو عوام نے پسندیدگی کی نظر سے دیکھا۔ تنقیدی نقطۂ نظر سے بھی یہ ایک عظیم الشان اور قابل قدر تصنیف ہے۔ ڈاکٹر رام بابو سکسینہ شعرالہند سے متعلق رقم طراز ہیں:

> ''شعرالہند جو نظم اردو کی ایک مبسوط تاریخ ہے ان اثرات وحالات کو جو مختلف

۱۔ تنقیدات عبدالحق، مولوی عبدالحق، ص ۱۵۸

اوقات میں نظم اردو پر مرتب ہوئے مفصل اور نہایت خوبی سے بیان کیا ہے۔ اپنی نوعیت میں یہ کتاب بہت عمدہ اور قابل تعریف ہے۔ اس کتاب کو تصنیف کر کے مصنف نے فی الحقیقت زبان اردو کی بہت بڑی خدمت کی ہے..... اس کتاب میں نظم اردو کو ایک خاص نقطۂ نظر سے دیکھا گیا ہے۔ بہر حال کچھ بھی ہو کتاب کارآمد اور مفید ضرور ہے..... اس میں بعض خاص خاص باتیں ایسی ہیں جو دوسری کتابوں میں نہیں ملتیں۔'' [۱]

شعر الہند جہاں اردو شاعری کی ایک قابل قدر تصنیف سمجھی گئی وہیں تنقید و تعریض کا نشانہ بھی بنی۔ بعض نقادوں نے اسے قابل قدر تالیف سمجھا تو بعض نے اسے ناقص قرار دیا۔ اس سلسلے میں مولوی عبدالحق، مولوی نصیر الدین ہاشمی، نیاز فتح پوری اور کلیم الدین کا نام خصوصیت کے ساتھ لیا جا سکتا ہے۔ یہ معترضین اپنی اپنی جگہ پر آفتاب و ماہتاب ہیں اور ان کے اعتراضات سے صرف نظر کر لینا بھی آسان نہیں۔ ان سب کے اعتراضات مختلف قسم کے ہیں جس میں ایک عام اعتراض یہ ہے کہ شعر الہند میں ''جلوہ خضر''، ''نکات الشعراء''، ''آب حیات''، ''مقدمہ شعر و شاعری''، ''شعر العجم'' وغیرہ کے اقتباسات اس کثرت سے دیئے گئے ہیں کہ مولانا کی اپنی ذاتی رائے کہیں نہیں آسکی ہے۔ اگر کوئی رائے ہے بھی تو غور و خوض کے بعد پتہ چلتا ہے کہ وہ کسی پیش رو کی رائے کی تلخیص ہے۔ اگر اس عام اعتراض کو صحیح مان بھی لیا جائے تب بھی شعر الہند کی تنقیدی اقدار میں کسی طرح کی کمی نہیں آتی۔ قیوم صادق احمد پوری شعر الہند سے متعلق اپنے خیالات کو اس طرح رقم کرتے ہیں:

''شعر الہند کا پہلا حصہ حیات اور گل رعنا سے مختلف نہیں۔ شعر الہند دلچسپی میں آب حیات سے بہت پیچھے ہے۔ یہ درست ہے کہ اس میں مواد گل رعنا سے زیادہ ہے لیکن گل رعنا پڑھی جا سکتی ہے۔ شعر الہند کی ورق گردانی سے طبیعت میں الجھن پیدا ہوتی ہے۔'' [۲]

۱۔ تاریخ ادب اردو، رام بابو سکسینہ، ص ۴۷۶، مترجم مرزا محمد عسکری

۲۔ اردو ادب میں تنقید کی اہمیت، قیوم صادق احمد پوری، ص ۴۶

ڈاکٹر عبادت بریلوی اپنی کتاب میں اس طرح رقم طراز ہیں:

''اس کے لئے مسالے کی فراہمی میں بڑی محنت سے کام لیا گیا ہے لیکن اس میں ایک تو اشعار کے مقابلے میں تاریخی مواد کا حصہ بہت کم ہے۔ دوسرے مولانا عبدالسلام ندوی چونکہ تحقیق کے مرد میدان معلوم ہی نہیں ہوتے۔ اس وجہ سے اس میں غیر معتبر روایات اور ماخوذ خیالات کے علاوہ دوسروں کی نئی تحقیقات سے بعض ایسے مضامین جمع کر دیئے گئے ہیں جن میں اکثر آزاد کی خامیاں نکالی گئی ہیں۔ البتہ آب حیات کی طرح اس میں اردو شاعری کی تاریخ وارتقاء پر جو بحث کی گئی ہے وہ مختلف ادوار میں منقسم ہے۔ مگر اس میں بحث و بیان سے زیادہ اشعار کا حصہ ہونے کے سبب جو مختلف دور کی خصوصیات اور شعراء کے ذکر کے ساتھ یا مختلف عنوانات بحث کے تحت ہر دو تین سطر کے بعد کثرت سے پیش کر دیئے گئے ہیں۔ بڑا گنجلک پیدا ہو گیا ہے اور اس کی ترتیب میں پریشانی و بے ربطی آ گئی ہے۔ اس کے علاوہ شعر الہند میں آب حیات کا لطف بھی نہیں ملتا۔'' [۱]

مولوی عبدالحق صاحب اس کتاب کے موضوع سے متعلق لکھتے ہیں کہ:

''کتاب پڑھنے کے بعد صاف طور پر یہ نہیں معلوم ہوتا کہ مولف کا موضوع کیا ہے اور اس کتاب کے لکھنے سے ان کا منشا کیا ہے؟..... مولف نے اپنی کتاب میں شعر سے بحث کی ہے شاعر اور اس کے عہد کو چھوڑ دیا ہے اس لئے یہ کتاب ہر جگہ تشنہ نظر آتی ہے۔'' [۲]

۱۔ اردو تنقید نگاری، ڈاکٹر عبادت بریلوی، ص ۱۷۹۔۱۸۰

۲۔ تنقیدات عبدالحق، مولوی عبدالحق، ص ۱۵۱۔۱۵۹

کلیم الدین احمد نے اردو تنقید پر ایک نظر میں شعر الہند پر اس طرح اعتراض کیا ہے:

''عبدالسلام صاحب جو کچھ دیکھتے ہیں دوسروں کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں ان کی آواز اپنی نہیں۔ ایک صدائے بازگشت ہے۔ میں نے بہت غور کیا لیکن مجھے شعر الہند کی تالیف کی وجہ سمجھ میں نہیں آئی۔ کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ عبدالسلام صاحب کو شعر و شاعری سے کوئی مناسبت نہیں۔ ان کی طبیعت خشک و بے رنگ ہے اور یہ خشکی اور بے رنگی ہر جگہ ایسی پھیلی ہوئی ہے کہ پڑھنے والے کی طبیعت جلد اکتا جاتی ہے.....ان کی کتاب گویا پرانی تنقید کی تکمیل ہے۔'' [۱]

کلیم الدین احمد نے یہ بھی تحریر کیا ہے کہ:

''اس میں مواد گل رعنا سے زیادہ ہے لیکن 'گل رعنا' پڑھی جا سکتی ہے۔ شعر الہند کی ورق گردانی سے طبیعت میں الجھن پیدا ہوتی ہے۔ مصنف شعر الہند نے بہت محنت اور کاوش سے کام لیا ہے لیکن وہ تنقید کے لئے پیدا نہیں کئے گئے تھے۔'' [۲]

ڈاکٹر عبدالقیوم، کلیم الدین احمد کے اس خیال کی تردید کرتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ:

''جہاں تک ادب کا تعلق ہے عبدالسلام ندوی ان لوگوں کے ساتھ ہیں جو مغربی افکار اور جدید رجحانات کے مخالف ہیں اس لئے شعر الہند کا قدیم طرز کا تذکرہ ہونا ایک قدرتی امر تھا۔ یہ تذکرہ قدیم فضا میں سانس لیتا ہے۔ کلیم الدین کا خیال ہے کہ عبدالسلام ندوی تنقید کے لئے پیدا نہیں کئے گئے، یہ فیصلہ

۱۔ اردو تنقید پر ایک نظر، کلیم الدین، ص ۷۳۔۷۴

۲۔ ایضاً، ص ۶۹۔۷۰

حقائق پر مبنی نہیں ہے۔ ندوی صاحب شعوری طور پر قدیم تنقید نگاری کی طرف واپس جانا چاہتے ہیں۔'' ۱

شعرالہند سے متعلق نیاز فتح پوری کے خیالات ملاحظہ ہوں:

''مولوی عبدالسلام ندوی نے اس میں کلام نہیں کہ نہایت محنت وکاوش سے کام لے کر شعرالہند کو مرتب کیا اور بڑی حد تک اس میں کامیابی حاصل کی ہے کہ وہ اپنے دماغ کو ہمہ گیر ثابت کر سکیں۔ لیکن چونکہ فطرت کی طرف سے وہ ایک مخصوص ذوق شعری لے کر آئے ہیں اور اس کی بنا پر وہ صرف شعرائے دہلی کی ہی قدر کر سکتے ہیں اس لئے کہیں کہیں بے اختیارانہ حدود نقد سے گزر کر فرائض تنقید کی پابندیوں سے آزاد ہو گئے ہیں اور شعرالہند دیکھنے کے بعد ایک شخص مجموعی حیثیت سے جو رائے قائم کر سکتا ہے وہ یہی ہے کہ انھوں نے زیادہ تر اپنے معیار کے لحاظ سے تنقید کی ہے۔ اور شاعر کے حقیقی رنگ پر اسی رنگ کی خصوصیات کے لحاظ سے کم غور کیا ہے۔'' ۲

محمود الحسن رضوی اس سے متعلق رقمطراز ہیں:

''کتاب کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ شاید وہ تنقید کی بنیادی خصوصیات اور اس کے اصولوں سے پوری طرح واقف نہ تھے کیونکہ کسی جگہ امتیازی معیاروں کو پرکھنے کی باقاعدہ کوشش نہیں کی گئی ہے..... شعرالہند میں تقریباً وہی خصوصیات پائی جاتی ہیں جو قدیم تذکروں اور آب حیات میں موجود تھیں اور تنقیدی حیثیت سے کسی امتیازی خصوصیت کا پتہ نہیں چلتا..... تنقیدی

۱۔ تنقیدی نقوش، ڈاکٹر عبدالقیوم، ص ۸۸

۲۔ نگار، فروری ۱۹۲۶ء، نیاز فتح پوری، حضرت ریاض اور مولوی عبدالسلام، ص ۵۹

صلاحیت کی اس کمی کے سبب مولانا عبدالسلام ندوی کی شعرالہند میں کسی نظریۂ فن یا اصول تنقید کی جستجو نہیں کی جاسکتی ہے۔ اس لئے نفسیاتی تنقید کی بنیادوں اور ان کی خصوصیات کے مطالعہ کے سلسلہ میں بھی یہ تصنیف مفید نہیں ہوسکتی۔'' [۱]

ان تنقید کے باوجود بھی شعرالہند کی دونوں جلدیں اردو شاعری کی تنقید میں اہمیت کی حامل ہیں۔ مولانا کا مذاق سخن خاص طور پر بہت دلکش تھا۔ وہ شاعری میں خالص تغزل کے قائل تھے۔ شعرالہند میں بہترین اور اعلیٰ درجہ کے اشعار کا انتخاب اس کا بین ثبوت ہیں۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن شعرالہند کی اہمیت کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''شعرالہند کو امتیازی حیثیت اس لئے بھی حاصل ہے کہ اس کی اشاعت سے پہلے اردو میں کوئی ایسی کتاب نہیں تھی جس میں اردو شاعری اور اس کے مختلف اصناف کے ارتقاء پر علل واسباب کی روشنی میں مبسوط مباحث ہوں اور پھر ان مباحث میں فکر وفن کی جو دیدہ وری ہے وہی دراصل سب سے قابل قدر چیز ہے۔ اس کتاب کی اشاعت کے بعد اردو شاعری پر چھوٹی بڑی کتابیں نکلتی چلی جارہی ہیں لیکن اس کو اولیت اس لئے حاصل ہے کہ اس میں جو مورخانہ اور مبصرانہ مباحث ہیں وہ اس سے پہلے کسی اور کتاب میں نہیں ہیں..... شعرالہند اردو کی ان چند کتابوں میں سے ہے جن سے بعد کی نسلوں نے اردو شاعری پر مبصرانہ بلکہ ناقدانہ بحث کرنا سیکھا۔'' [۲]

اسی مضمون میں دوسری جگہ رقمطراز ہیں:

''وہ جب اردو شاعری پر لکھنے بیٹھتے تو ان کا قلم طاؤس کی طرح رقص کرنے

۱۔ اردو تنقید میں نفسیاتی عناصر، محمود الحسن رضوی، ص ۳۰۵۔۳۰۶

۲۔ بزم رفتگاں، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ص ۲۵۰

لگتا۔ ان کی شعرالہند اردو زبان کی مایہ ناز تصنیف میں سے ہے۔ اور یہ اس صف میں رکھے جانے کے لائق ہے جہاں ''آب حیات''، ''مقدمہ شعروشاعری'' اور ''شعرالعجم'' رکھی جاتی ہیں۔ شعرالہند پر تنقید و تنقیص کی چنگاریاں برابر برسائی جارہی ہیں لیکن اس کے باوجود یہ کہنے میں تامل نہیں ہے کہ یہ چمنستان اردو کا سدابہار پھول ہے۔'' [۱]

مولانا ایک اچھے انشاء پرداز تھے۔ ان کا قلم اتنا پختہ اور رواں تھا کہ قلم برداشتہ لکھتے اور لکھنے کے بعد مسودہ پر نظر ثانی اور فکر و اصلاح کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ ادب و انشاء سے ان کی دلچسپی کے بارے میں شاہ صاحب رقمطراز ہیں:

''ادب و انشاء میں وہ نہایت ممتاز تھے اور علامہ شبلی کی یہ وراثت ان کے حصہ میں آئی تھی۔ چمنستان ادب میں ان کا قلم بڑا سبک خرام تھا۔'' [۲]

نصیرالدین ہاشمی نے اپنی کتاب مقالات ہاشمی میں یہ اعتراف کیا ہے کہ:

''اگر ان فروگزاشتوں سے قطع نظر کرلیں جو کتاب کی کامل کامیابی میں حائل ہیں تو یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ اب تک اردو کے جو تذکرے لکھے گئے ہیں ان میں یہ تذکرہ قابل قدر اضافہ ہے اور ان سے کہیں زیادہ معلومات و تحقیقات پر حاوی ہے۔'' [۳]

بہرحال شعرالہند پہلی اردو شاعری کی تاریخ ہے جس میں اردو شاعری اور اس کے مختلف اصناف اور مختلف ادوار اور ترقی سے بحث کرتے ہوئے اس کے مختلف پہلوؤں پر نہایت سلیقہ کے ساتھ روشنی

۱۔ بزم رفتگاں، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ص ۲۴۸

۲۔ معارف، جنوری ۱۹۵۷، ص ۷، شاہ معین الدین احمد ندوی

۳۔ مقالات ہاشمی، حصہ اول، نصیرالدین ہاشمی، ص ۲۷۹

ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے اور ساتھ ہی ساتھ تنقیدی نظر سے بھی کام لیا گیا ہے۔ دبستان دلی اور لکھنؤ سے بحث کرتے ہوئے ان کی خوبیوں اور خامیوں سے بھی آگاہ کیا گیا ہے۔ اس کتاب نے علمی و ادبی دنیا کو اپنی طرف متوجہ کیا اور ایک خاص مقبولیت حاصل کی۔ یہ بات بھی درست ہے کہ اہل علم نے جہاں اس کی خوبیاں گنائی ہیں وہیں اس کی کمیوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ غرض یہ کہ یہ کتاب اپنی تحقیقی خامیوں، انشاء کی بے کیفیوں، اشعار کی زیادتی اور تنقیدی اختصار کے باوجود اپنی جگہ پر ایک مکمل تنقیدی کتاب ہے اور بلاشبہ یہ مولانا کا ایسا کارنامہ ہے جسے موجودہ دور کے ناقدین کی مغزی مرغوبیت فراموش کرنے سے قاصر ہے۔

اقبال کامل (عبدالسلام ندوی)

اقبال کامل مولانا عبدالسلام ندوی کی مایہ ناز تصنیف ہے۔ مولانا عبدالسلام صاحب نے اقبالیات سے متعلق کتابوں کا مطالعہ کیا تو احساس ہوا کہ ڈاکٹر اقبال کے فلسفہ شاعری پر بکثرت مضامین، رسالے اور کتابیں لکھی گئی ہیں کہ ان کی زندگی کا کوئی گوشہ شاید ہی تشنہ رہ گیا ہو۔ لیکن ان ساری تصانیف کے باوجود کوئی ایسی مکمل اور جامع تصنیف موجود نہیں جو ان کی بلند پایہ شخصیت کو واضح اور مکمل طور پر نمایاں کر سکے اور ہر زاویے سے مکمل ہو۔ اقبال کامل اسی کمی کو پورا کرنے کے لئے لکھی گئی ہے تاکہ ان کی زندگی کا ہر گوشہ پوری طرح نمایاں ہو سکے۔ اس میں ان کی مفصل سوانح حیات کے علاوہ ان کے فلسفیانہ اور شاعرانہ کارناموں کے اہم پہلوؤں کا تفصیل کے ساتھ ذکر ہے۔ سوانح حیات کے بعد ان کی اردو شاعری پھر فارسی پر ان کے بہترین اشعار کے انتخاب کے ساتھ تفصیلاً تبصرہ کیا گیا ہے۔ ان کے کلام کی تمام ادبی خوبیاں دکھلائی گئی ہیں۔ پھر ان کی شاعری کے اہم موضوع یعنی فلسفہ خودی، فلسفہ بیخودی، نظریہ ملت، تعلیم، سیاست، صنف لطیف، فنون لطیفہ اور نظام اخلاق وغیرہ کی تشریح کی گئی ہے۔

مولانا نے اس کتاب میں ڈاکٹر اقبال کی زندگی کی ابتدا سے انتہا تک ہر کارناموں کا ذکر واضح

انداز میں کیا ہے تا کہ قاری کو زیادہ دقتوں کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ اس میں مولانا ندوی نے ڈاکٹر صاحب کی شاعرانہ حیثیت کو واضح کیا ہے۔ جس کو اور لوگوں نے اس وجہ سے نظر انداز کر دیا تھا کہ ان کا کلام خشک اور فلسفیانہ مسائل کا مجموعہ ہے۔ لیکن مولانا ندوی کے نزدیک ایسا نہیں ہے۔ وہ انہیں ایک قادر الکلام شاعر کی حیثیت سے قاری کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ آپ نے ان کے فلسفیانہ اور صوفیانہ حقائق و مسائل کو بھی اسی حیثیت سے منظر عام پر پیش کیا ہے اور ان کی غزلیات، قطعات اور نظموں سے ایسی مثالیں پیش کی ہیں جس میں شاعری اور فلسفہ دونوں کا خوشگوار امتزاج موجود ہے جس سے مولانا کی وسیع النظری اور عمیق مطالعہ کا ثبوت ملتا ہے۔ اس کے دیباچے میں لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر صاحب کی شاعری اور فلسفے پر جو کچھ لکھا گیا ہے اس پر مجھ کو بہت کچھ اضافے کی ضرورت معلوم ہوئی اور اس کتاب میں میں نے جو کچھ دفاعی کاوش کی ہے وہ صرف اس حصے کے ساتھ تعلق رکھتی ہے جس کے لئے صرف اخذ و انتخاب کافی نہیں تھا۔ بلکہ ڈاکٹر صاحب کے پورے کلام کے مطالعے کی ضرورت تھی۔'' [۱]

ڈاکٹر صاحب کی اصلی حیثیت صرف شاعر کی ہے فلسفی کی نہیں لیکن لوگوں نے آپ کی شاعرانہ حیثیت کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ بقول مجنوں گورکھپوری:

> ''اقبال کے فلسفیانہ میلانات اور ان کے پیغام میں ہم کچھ اس طرح محو ہو جاتے ہیں کہ ان کی حیثیت کو جو سب سے زیادہ مستقل اور ممتاز ہے بالکل نظر انداز کر دیتے ہیں۔ ہم بھول جاتے ہیں کہ اقبال کی پہلی اور آخری حیثیت شاعر کی ہے..... اگر ہم ان کے فلسفہ اور پیغام کو نظر انداز کر دیں یا کسی ایسے زمانے کا تصور کر سکیں جب کہ ان کے افکار و میلانات کا کوئی عنصر بھی زندہ

۱۔ اقبال کامل، عبدالسلام ندوی، ص ۳

نہ رہے گا تو اس حالت میں بھی ہم کو ماننا پڑے گا کہ محض صناع اور شاعر کی
حیثیت سے اقبال دنیا کے بڑے شاعروں کے ساتھ جگہ پا سکتے ہیں۔'' ۱

اس میں شک نہیں کہ اقبال اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں داغ سے متاثر تھے اور انھوں نے ابتدائی چند غزلیں بھی داغ کو دکھائی تھیں اور ان سے شرف تلمذ بھی حاصل کیا تھا۔ لیکن داغ کا رنگ آپ کی افتادِ طبیعت میں موافقت نہ پیدا کر سکا اور عارضی ثابت ہوا۔ اقبال نہ صرف اردو شعراء سے بلکہ مغربی شعراء مثلاً ٹینی سن، امرسن، گوئٹے وغیرہ کے کلام و خیالات سے متاثر تھے۔ لیکن آپ نے جو رنگ اختیار کیا اور آپ کے کلام میں جو گہرائی اور گیرائی و رعنائی نظر آتی ہے اس پر اردو شاعری کے تمام نقادوں کا متفقہ بیان ہے کہ وہ غالب کا رنگ ہے جو آپ کی افتادِ طبیعت کے بالکل موافق تھا۔ آپ غالب سے متاثر تھے۔ شیخ عبدالقادر نے بانگ درا کے دیباچہ میں اس کا ذکر نہایت مبالغہ آمیز انداز میں کیا ہے۔

''غالب اور اقبال میں بہت سی باتیں مشترک ہیں۔ اگر میں تناسخ کا قائل نہ ہوتا تو ضرور کہتا کہ مرزا اسداللہ خاں غالب کو اردو اور فارسی شاعری سے جو عشق تھا اس نے ان کی روح کو عدم میں جا کر بھی چین نہ لینے دیا۔ اور مجبور کیا کہ وہ پھر کسی جسد خاکی میں جلوہ افروز ہو کر شاعری کے چمن کی آبیاری کرے، اور اس نے پنجاب کے ایک گوشہ میں جسے سیال کوٹ کہتے ہیں جنم لیا اور محمد اقبال نام پایا۔'' ۲

بہر حال اقبال غالب کے کلام سے متاثر تھے۔ ارشد سے صوری تلمذ حاصل کیا۔ داغ سے تحریری اصلاح لی مگر غالب سے معنوی استفادہ کیا اور یہ آخری اثر ان کی طبیعت کے مناسب تھا اس لئے وہ دیر یا اور کسی نہ کسی شکل میں نمودار ہوتا رہتا ہے۔ اقبال غالب کے ساتھ ساتھ میر سے بھی متاثر تھے جس کا اندازہ

۱۔ اقبال، مجنوں گورکھپوری، ص ۵۵

۲۔ دیباچہ، بانگ درا، عبدالقادر سروری، ص ہ

ان کے اس شعر سے ہوتا ہے۔

روح غالب درد میرا اقبال تیرے دل میں　　حسن لیلائے سخن پنہاں اسی محمل میں ہے

عبدالسلام ندوی رقم طراز ہیں:

''فارسی میں تین شاعر پیدا ہوئے جنھوں نے مختلف اقلیم سخن کی فرماں روائی کی۔

ابیات وصیدہ وغزل را　　فردوسی وانوری وسعدی

لیکن اردو میں میر و غالب صرف دو ہی مسلم الثبوت شاعر تھے اور بعض لوگوں کے خیالات میں قدرت نے ان دونوں کو ڈاکٹر اقبال کی ذات میں جمع کر کے ایک تیسرا شاعر پیدا کر دیا۔ اور اردو کی یہ کمی پوری ہوگئی اور ایران کی طرح ہندوستان میں بھی تین شاعر پیدا ہو گئے۔'' [۱]

فارسی کے مذکورہ شاعروں کے برعکس اقبال نے رومی کا اثر زیادہ قبول کیا اور بہت جوش وعقیدت سے مولانا روم کا ذکر کیا ہے۔ عبدالسلام ندوی کی شاعری کے لوازم سے بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اصل یہ ہے کہ شاعری الفاظ ومعانی دونوں کے مجموعے کا نام ہے اور جہاں تک معانی ومطالب کا تعلق ہے ڈاکٹر صاحب نے فلسفہ خودی کے ایک اہم جز یعنی عشق کو مولانا روم ہی سے اخذ کیا ہے۔ بلکہ خود فلسفہ خودی کا تخیل بھی انہی سے ماخوذ ہے۔'' [۲]

علامہ اقبال کے طرز بیان سے متعلق عبدالسلام صاحب لکھتے ہیں:

''جہاں تک الفاظ وطرز بیان کا تعلق ہے، ڈاکٹر صاحب نے متاخرین شعرائے ایران کی شستہ زبان اور خواجہ حافظ کا پر جوش انداز بیان اختیار کیا

۱۔ اقبال کامل، عبدالسلام ندوی، ص ۱۳۷۔۱۳۸

۲۔ ایضاً، ص ۱۶۵

ہے اور اس نے ان کے لہجے میں مولانا روم سے زیادہ مستی اور رنگینی پیدا کردی ہے۔'' [۱]

ڈاکٹر خورشید نعمانی اقبال کے فلسفہ سے متعلق لکھتے ہیں:

''اقبال کا فلسفہ دراصل مغرب اور مشرق کے فلسفے کا نچوڑ ہے۔ اور ان کا انداز بیان فارسی کے اکثر شعراء کے رنگ سے متاثر ہے مگر یہ ان کا اپنا انفرادی رنگ ہے۔ خود اقبال کا یہ رنگ ہے جس کے صحیح معنوں میں وہ موجد تھے۔'' [۲]

ڈاکٹر اقبال کی شاعری کا پہلا دور ۱۹۰۱ء سے ۱۹۰۵ء تک ہے جس میں آپ نے زیادہ تر غزلیں لکھیں۔ داغ اور ارشد گورگانی سے اصلاح لیتے رہے۔ آپ کی شاعری کا عوامی طرز پر آغاز نظم کوہ ہمالیہ سے شروع ہوا۔ جس کو شیخ عبدالقادر نے رسالہ مخزن کی پہلی جلد کے پہلے نمبر میں شائع کیا۔

آپ کی نظمیں مختلف حیثیتوں سے خاص اہمیت کی حامل ہیں۔ مثلاً اس دور کی بہت سی نظموں میں آپ کے فلسفۂ خودی کے بہت سے عناصر موجود ہیں۔ آپ نے خودی کو اپنا خاص فلسفہ اور خاص موضوع بنایا ہے۔

آپ کی شاعری کا دوسرا دور ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء تک ہے۔ اس دور میں آپ کی شاعری کی زبان اردو کے بجائے فارسی ہوگئی ہے۔ اس دور میں آپ نے کم نظمیں لکھیں لیکن اس دور میں جو اشعار آپ نے اردو میں کہے ہیں اس میں شاعر کے بجائے پیامبر کی حیثیت اختیار کرلی ہے۔ اس دور کی شاعری میں فلسفہ خودی کے ساتھ ساتھ کہیں کہیں بے خودی کی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ اس دور کی شاعری کو اسلامی شاعری سے تعبیر کیا جاسکتا ہے۔

شاعری کے تیسرے دور میں شاعرانہ زبان فارسی تھی۔ شاعری کا تیسرا دور بانگ درا کی آخری نظم

۱۔ اقبال کامل، عبدالسلام ندوی، ص ۱۶۵

۲۔ دارالمصنفین اعظم گڑھ کی ادبی تصانیف، خورشید نعمانی، ص ۱۵۱

طلوع اسلام پر ختم ہے۔ بانگ درا کے بعد آپ نے جو کچھ اردو میں لکھا ہے وہ آپ کے چوتھے دور میں شامل ہے۔ اس دور میں آپ کے سامنے کوئی خارجی محرک نہیں تھا۔ آپ فلسفہ خودی کے نشہ میں شرسار تھے اس لئے بال جبرئیل میں اس کا ذکر کثرت سے کیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نظم کے شاعر تھے۔ آپ کی غزلوں میں بھی نظم کی جھلک ملتی ہے۔ آپ کی غزل گوئی کے پہلے دور میں میر اور غالب کی جھلک زیادہ نظر آتی ہے۔ آپ کی غزل گوئی کا دوسرا دور یورپ کے دوران قیام شروع ہوا تھا۔ اس لئے اس دور کی غزلوں میں حسن وعشق کے جذبات میں رنگینی، رعنائی اور سرمستی زیادہ ہونی چاہئے تھی لیکن آپ کے اوپر اس کا متضاد اثر پڑا۔ اور آپ نے یورپ کے حسن و جمال پر ہندوستان کے حسن و جمال کو زیادہ فوقیت دی۔

ان دونوں دور کے غزلوں کی خصوصیت یہ ہے کہ عام متداول مضامین تو تمام شعراء کے یہاں ملتے ہیں۔ لیکن بعض میں خاص اور حقیقی جذبہ ہوتا ہے جو ان کے کلام کی امتیازی شان کو برقرار رکھتا ہے اور تمام شعراء میں ممتاز رکھتا ہے۔ مثلاً شراب وکباب، رندی وسرمستی کا ذکر تمام غزل گوشعراء کے یہاں ملتا ہے۔ لیکن خواجہ حافظ میں رندی وسرمستی کا جذبہ حقیقتاً پایا جاتا تھا۔ خواہ وہ شراب معرفت کا نشہ تھا یا بادہ انگوری نے انہیں سرمست وسرشار بنا دیا تھا۔ ان کے یہاں کسی نہ کسی شراب کا نشہ موجود تھا جس کا ذکر انھوں نے بہت جوش وسعت وتنوع کے ساتھ کیا ہے۔ اور جس نے ان کے مضامین کو خاص کر دیا ہے۔ اس طرح ڈاکٹر صاحب کا جوش ولولہ کسی ظاہری یا باطنی کیفیت کا نتیجہ تھا۔ لیکن پہلے دونوں دور میں وہ اس لذت سے ناآشنا تھے۔ یورپ سے لوٹنے کے بعد آپ نے خودی کو اپنا خاص فلسفہ اور خاص پیغام بنایا اور بہت ہی پرجوش انداز میں اس کی تبلیغ کی۔ اس لئے اس دور کی غزلوں کے الفاظ میں جو رعنائی برجستگی اور سلیقگی پائی جاتی ہے وہ پچھلے کلام میں نہیں ملتی۔

ڈاکٹر صاحب کی غزلیں لطیف نازک لوچ دار، خوش گوار، خیالات سے خالی ہیں۔ آپ کی غزل رندانہ نہیں ہے بلکہ اس کا ایک ماخذ تصوف ہے۔

مرثیہ نگاری : ڈاکٹر صاحب نے مرثیہ پر طبع آزمائی کم کی ہے۔ جو کچھ لکھا ہے اس میں مرثیہ گوئی کی شان کم پائی جاتی ہے۔ آپ نے اپنی والدہ مرحومہ کا ایک طویل مرثیہ لکھا جس میں رنج وغم کا اظہار ایک بند سے ہوتا ہے۔ باقی میں موت کا فلسفہ بیان کیا۔ سر راس مسعود کا بھی مرثیہ لکھا۔ آپ کا سب سے اچھا مرثیہ مرثیہ داغ ہے جس میں مرثیہ گوئی کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔

مثنوی نگاری: ڈاکٹر صاحب نے اردو میں کوئی مستقل مثنوی نہیں تصنیف کی۔ مثنوی سحر البیان کی بحر میں ایک ساقی نامہ لکھا ہے اور اس کے توسط سے اپنے پر جوش فلسفہ خودی کی تبلیغ کی ہے۔ پورا ساقی نامہ پر جوش، متین، سنجیدہ، باوقار اور غلغلہ انگیز مضامین والفاظ سے بھرا ہوا ہے۔

قطعات ورباعیات : کی ابتدا فارسی شاعری سے کی۔ پیام مشرق میں اس قسم کے بہت سے قطعے لکھے جس سے آپ کے خیالات کا تنوع اور روانی کا اندازہ ہوتا ہے۔

قومی اور وطنی نظمیں : ڈاکٹر صاحب سے پہلے قومی اور وطنی نظمیں قوم وملک اور مصائب ومعائب کی طویل داستان ہوتی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب کی ابتدائی نظمیں بھی اسی طرح کی تھیں لیکن آخر میں آپ نے اپنا انداز بدلا اور اپنی نظموں کی بنیاد فخر ودعویٰ پر رکھی جو بلند خیال اور دلوں میں جوش اور ولولہ پیدا کرتی ہے۔ اکبر کی تقلید میں آپ نے ظریفانہ اشعار بھی کہے۔

فارسی شاعری : ڈاکٹر صاحب کو فارسی زبان اور فارسی شاعری سے ابتدا ہی سے وہبی اور کسبی دونوں طرح کا لگاؤ پیدا ہو گیا تھا۔ چنانچہ انھوں نے اردو زبان کی شاعری کے ساتھ ساتھ فارسی زبان کی شاعری میں طبع آزمائی کی۔ ان کا کلام اردو کی بہ نسبت فارسی میں زیادہ ہے۔ چونکہ وہ اپنا پیغام ہندوستان سے باہر دوسرے ممالک میں پہنچانا چاہتے تھے۔ اس کا خلاصہ پروفیسر عبدالقادر ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''دقت یہ تھی کہ اردو زبان جو ہندوستان کی زبان ہے صرف ہندوستان تک ہی محدود ہے۔ بیرونی مسلمانوں تک اس کی رسائی ناممکن ہے، اس لئے انھوں نے فارسی زبان کو اپنی شاعری کا ذریعہ بنالیا تاکہ مسلمانوں کا زیادہ

حصہ اس کو پڑھ سکے۔'' ۱

عبدالسلام ندوی صاحب اس بارے میں یہ رائے پیش کرتے ہیں:

''فلسفیانہ اور صوفیانہ خیالات کو ادا کرنے کے لئے دنیا کی زبانوں میں فارسی زبان سے بہتر کوئی زبان نہیں۔'' ۲

شاید اسی لئے ڈاکٹر صاحب اپنے فلسفیانہ خیالات کو ادا کرنے کے لئے اردو زبان کو چھوڑ کر اس قسم کی شاعری کے لئے فارسی زبان اختیار کی۔ اپنی فارسی غزلوں میں کافی عروج پر نظر آتے ہیں۔ آپ کی اردو غزلیں اس کے مقابلہ میں پست نظر آتی ہیں۔ آپ کی فارسی غزلوں میں عاشقانہ و رندانہ مضامین کے علاوہ آپ کا پورا فلسفہ خودی اپنے تمام اجزا و لوازم کے ساتھ موجود ہے۔ مولانا عبدالسلام ندوی فارسی غزلوں کے بارے میں لکھتے ہیں:

''ان کی فارسی غزلیں تغزل کا بے مثل نمونہ ہیں۔ الفاظ کی شیرینی اور نرمی کے ساتھ مضامین میں نہایت سوز و گداز پایا جاتا ہے اور ان غزلوں میں انھوں نے خاراشگافی کے بجائے شیشہ سازی کی ہے۔'' ۳

قطعات و رباعیات : خیالات کے تنوع اور بوقلمونی میں اردو اور فارسی زبان کا کوئی شاعر ڈاکٹر صاحب کی برابری نہیں کرسکتا اس لئے ان کو اس صنف کی زیادہ ضرورت تھی اور اس ضرورت کے پیش نظر انھوں نے فارسی زبان میں دو دو شعر بکثرت قطعات لکھے جس کی ابتداء پیام مشرق سے کی اور ارمغان حجاز پر اس کا خاتمہ کردیا۔

فارسی نظمیں : ڈاکٹر صاحب نے فارسی زبان میں کوئی قومی اور وطنی نظم نہیں لکھی۔ آپ کی نظمیں فلسفہ شعر و

۱۔ آثار اقبال، عبدالقادر سروری، ص ۱۳۰۔۱۳۱

۲۔ اقبال کامل، عبدالسلام ندوی، ص ۱۶۲

۳۔ ایضاً، ص ۱۶۶

سیاست پر ملتی ہیں۔ آپ نے چند بے نظیر بہاریہ نظمیں لکھیں۔ خاص طور پر کشمیر کے دل فریب مناظر اور خوش گوار آب و ہوا نے آپ کی شاعرانہ قوت کو مزید ابھارا ہے۔ بہاریہ نظموں کے علاوہ چند نظمیں جدید ایرانی طرز میں لکھی ہیں جس میں فلسفہ خودی اور اپنے پیام زندگی کو نہایت دلآویز شاعرانہ طریقوں سے پیش کیا ہے۔ آپ نے انقلاب پر جدید ایرانی طرز میں ایک عمدہ نظم لکھی ہے۔

فارسی مثنوی : ڈاکٹر صاحب نے اپنی فارسی شاعری کا آغاز ''مثنوی اسرار خودی'' سے کیا ہے۔ جو شاعری کی سب سے مشکل صنف ہے۔ اس مثنوی سے ڈاکٹر صاحب کی شاعری کا نیا دور شروع ہوا۔ آپ اپنی فارسی شاعری میں شعرائے ایران میں سب سے زیادہ مولانا روم سے متاثر نظر آتے ہیں اور اس بات کا اظہار کرتے ہیں کہ یہ ناچیز انھیں کے فیض سے گوہر آبدار ہوا۔ آپ کے ایک معتقد نے آپ کی مثنویوں کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''ان کا رنگ شاعرانہ نہیں بلکہ واعظانہ ہے'' [۱]

بہر حال دونوں حیثیتوں سے آپ کی مثنویوں کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔

اسرار خودی اور رموز بیخودی میں آپ کا فلسفیانہ عقائد سادہ طور پر ہمارے سامنے آ گیا ہے۔ چنانچہ اقبال کے ایک معتقد آپ کے بارے میں لکھتے ہیں:

''البتہ اقبال کے شاعرانہ معتقدات کا مکمل دستور اور لائحہ عمل ہونے کی حیثیت سے ان مثنویوں کی بڑی اہمیت ہے۔'' [۲]

شاعر ہونے کے ساتھ اقبال کی حیثیت مجدد مصلح اور مبلغ کی بھی ہے۔ چنانچہ خلیفہ عبدالحکیم لکھتے ہیں:

''اس میں شک نہیں کہ آخر میں ایک مفکر شاعر اور مبلغ شاعر کا رنگ اقبال میں

۱۔ رسالہ اردو، اقبال نمبر، ص ۸۲۸، بحوالہ اقبال کامل، ص ۱۷۹

۲۔ ایضاً، ص ۱۸۰

غالب نظر آتا ہے۔ وہ اعلیٰ درجہ کی شاعری میں جو جز نبوت کا ہوتا ہے وہ اقبال کی شاعری کے آخری دور میں بہت نمایاں ہوگیا۔'' [۱]

اقبال کی اردو اور فارسی شاعری کا تفصیلی جائزہ لینے کے بعد مولانا عبدالسلام صاحب نے کلام اقبال کی ادبی خوبیوں کو جدید طریقہ اور جدید تنقید کے ساتھ معائنہ کیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب از تا ابد ایک شاعر تھے۔ لیکن لوگوں نے ان کی شاعرانہ حیثیت کو بالکل نظر انداز کر دیا ہے۔ آپ کی ذات وصفات پر کافی مضامین اور رسائل لکھے گئے لیکن ادبی حیثیت سے ان کے شاعرانہ کمالات پر گنتی کے چند مضامین لکھے گئے جو بہت مختصر، تشنہ اور نامکمل ہیں۔ جن پر اضافے کی کافی گنجائش ہے اور مولانا نے ان پر اضافے کی کوشش کی ہے۔ ان کا نظریہ ہے:

''ادبی اور شاعرانہ حیثیت سے ڈاکٹر صاحب کے کلام کی تنقید کے دو طریقے ہو سکتے ہیں۔ ایک قدیم اور دوسرا جدید۔ اور ان دونوں حیثیتوں سے ڈاکٹر صاحب کے کلام کی تنقید کی ضرورت ہے۔ کیونکہ ڈاکٹر صاحب اگرچہ دور جدید کے ایک روشن خیال آدمی ہیں لیکن درحقیقت وہ قدیم تہذیب کی یادگار ہیں اور جدید مسلک سے زیادہ ان کا رجحان قدیم مسلک کی طرف ہے۔'' [۲]

علامہ اقبال خود لکھتے ہیں:

''میرے نزدیک اقوام کی زندگی میں ''قدیم'' ایک ایسا ہی ضروری عنصر ہے جیسا کہ ''جدید'' بلکہ میرا ذاتی میلان قدیم کی طرف ہے۔'' [۳]

۱۔ رسالہ اردو، اقبال نمبر، ص ۸۲۸، بحوالہ اقبال کامل، ص ۱۸۰

۲۔ ایضاً، ص ۱۸۶

۳۔ ایضاً، ص ۱۸۶

مولانا عبدالسلام ندوی نے اقبال کی شاعری میں مندرجہ ذیل محاسن کی نشاندہی کی ہے اور اپنی شاعری کو جن صنعتوں سے مزین کیا ہے مولانا نے ان کا مختصراً ذکر کیا ہے۔ ان صنعتوں میں حسن الفاظ، لب ولہجہ، حسن قافیہ و ردیف، تشبیہ و استعارہ، تلمیحات، تضمینات، روانی و برجستگی، مدح وذم، تکرار معانی، رفعت تخیل، ان سب پر اختصار کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔

موازنہ ومقابلہ :

ایک شخص نے ڈاکٹر صاحب کا مقابلہ دنیائے اسلام کے دوسرے ممتاز شعرا سے کیا ہے۔ لیکن عبدالسلام ندوی صاحب کا ماننا ہے کہ درحقیقت قدیم و جدید شعراء میں ڈاکٹر صاحب کا موازنہ کسی دوسرے شاعر سے نہیں کیا جاسکتا۔ موازنہ کے لئے موضوع اور خیال دونوں کا مشترک ہونا ضروری ہے۔ ڈاکٹر صاحب دنیائے اسلام کے منفرد شاعر ہیں۔ ہندوستان اور ایران کے کسی شاعر سے ڈاکٹر صاحب کا موازنہ نہیں کیا جاسکتا۔ آپ کے ایجاد واختراع کی قوت نے آپ کو دنیا کے تمام شاعروں سے منفرد کردیا ہے۔

کلام اقبال کی مقبولیت :

آپ کے کلام کی شہرت ومقبولیت کا اندازہ مختلف زبانوں میں اس کے تراجم سے لگایا جاسکتا ہے۔ آپ نے اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں اپنی وطنی نظموں کی بنیاد پر مسلمانوں کے ساتھ ہندوؤں میں بھی مقبولیت حاصل کرلی۔ آپ کا ترانہ ہندی بچے بچے کی زبان پر تھا۔ چنانچہ ایک تعلیم یافتہ ہندو مضمون نگار اس بارے میں اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتا ہے:

''اقبال کو قدرت نے تغزل کی دولت عطا کرکے بہت فیاضی سے کام لیا ہے۔

چنانچہ ''ہمالیہ'' کو محض متغزلانہ انداز بیان کی وجہ سے یہ قبول عام حاصل ہوا۔

اور ان کی بعض دوسری نظموں خصوصاً ''ہندوستان ہمارا'' کی طرح (جسے ہندوستان کے قومی گیت کی حیثیت حاصل ہے) یہ نظم ہندوستان کے طول و عرض میں بگولے کی تیزی اور تندی کے ساتھ پھیل گئی۔ ہر شہر، قصبے، گاؤں کے گلی کوچوں میں لڑکوں اور لڑکیوں کی زبان سے یہی نغمہ سنائی دینے لگا۔ اور سارے ملک نے اقبال کو قومی بیداری کا پیمبر تسلیم کرلیا۔''[۱]

یورپ سے واپسی کے بعد جنگ طرابلس کے زمانے میں آپ نے نہایت پرجوش نظمیں لکھیں۔ یہیں سے آپ کی اسلامی شاعری کا آغاز ہوا۔ آپ نے ترانہ ہندی کے بجائے ترانہ ملی لکھا۔ یہاں تک کہ ہندوستان کی ہر اسلامی مجلس میں یہ ترانہ ایک جزو لاینفک ہوگیا۔

اقبال کے فارسی کلام کی مقبولیت سب سے زیادہ ایران میں ہوئی..... آپ کے کلام کا ترجمہ عربی، ترکی، انگریزی میں بھی کثرت سے ہوا جس کی بنا پر ہندوستان، افغانستان، ایران، ترکی اور عرب تمام اسلامی ممالک نے آپ کی عزت افزائی کی۔ اغلاط کے عنوان سے مولانا نے ڈاکٹر صاحب کی ان لفظی اور معنوی غلطیوں کی نشاندہی کی ہے جو آپ کے کلام میں کہیں کہیں موجود ہے اور کسی نے ان غلطیوں کا استقصاء نہیں کیا اور ان خامیوں کو تفصیل سے نہیں دیکھا جس کی نشاندہی مولانا نے اس باب میں کی ہے۔

اس کے بعد مولانا نے ڈاکٹر صاحب کے فلسفہ خودی اور فلسفہ بیخودی کی تفصیل کے ساتھ بحث کی ہے۔ وہ چیز جس سے ڈاکٹر صاحب کے کلام کو ابدی شہرت نصیب ہوئی وہ آپ کا فلسفہ خودی ہے۔ جس کی ابتدا مثنوی اسرار خودی سے ہوئی، اور جب پروفیسر نکلسن نے انگریزی میں اس کا ترجمہ کیا تو بعض انگریزوں نے اپنے تبصرہ میں یہ خیال ظاہر کیا کہ یہ فلسفہ جرمنی کے مشہور فلاسفر نیٹشے کے افکار و خیالات سے ماخوذ ہے۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے نیٹشے کی تقلید و تتبع سے انکار کیا ہے۔ اور دوسرے مواقع پر اس بات کا اعلانیہ دعویٰ کیا ہے کہ:

۱۔ نیرنگ خیال۔ اقبال نمبر، ص ۱۷۹، بحوالہ اقبال کامل، ص ۲۴۲

''اسرار کا فلسفہ مسلمان صوفیہ اور حکماء کے افکار و مشاہدات سے ماخوذ ہے۔ اور تو اور وقت کے متعلق برگساں بھی ہمارے صوفیوں کے لئے کوئی نئی چیز نہیں۔'' [۱]

ڈاکٹر صاحب نے نظریہ ملت میں فرد کو قطرہ اور قوم کو دریا سے تشبیہ دی ہے کہ ایک قوم میں دریا کی طرح وسعت و کشادگی ہونی چاہئے۔ ان کا خیال ہے کہ قومیت کی بنیاد روحانی اصول پر قائم کرنی چاہئے تاکہ دنیا کی قوموں میں محبت و اخوت کا جذبہ پیدا ہو اور انسانیت کی روح زندہ ہو۔ اسی بنا پر آپ نے قومیت کی بنیاد روحانیت پر رکھ کر قومیت کے محدود و مادی نظریہ کے بجائے ملیت کا وسیع روحانی نظریہ قائم کیا۔ اور خاص طور سے مسلمانوں کے سامنے اس کو پیش کیا اور انہیں قبول کرنے کی دعوت دی۔

تعلیم : ڈاکٹر صاحب نے اپنی تعلیم کے تیسرے دور میں تعلیم پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ جدید تعلیم سے سخت بیزار نظر آتے ہیں کہ جدید تعلیم نے لوگوں کو مذہب سے بیگانہ کر دیا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کے نزدیک تعلیم ایک اجتماعی چیز ہے۔ اس کا مقصد انتشار پیدا کرنا نہیں بلکہ اتحاد و اتفاق پیدا کرنا ہے۔ ملت اسلامیہ کی بنیاد اسی نظام پر قائم ہے۔ اس لئے جب تک مسلمانوں کی تعلیم میں دینی اور روحانی اجزا شامل نہیں ہوں گے اس کا اجتماعی وجود قائم نہیں رہ سکتا۔

ڈاکٹر صاحب کے نزدیک موجودہ دور میں تعلیم کا جو طریقہ رائج ہے وہ تاریخی زندگی سے بالکل مطابقت نہیں رکھتا اور نہ ہی مسلمانوں کے اندر وہ جوش و ولولہ اور اولوالعزمی و بلند پروازی پیدا کرتا ہے جس کی مثالیں پچھلے قوم کی تاریخ میں موجود ہے۔ ان کے نزدیک تعلیم کا اصل مقصد خودی کی نشو و نما ہے جس کی تربیت صرف مذہبی، اخلاقی تعلیم پر منحصر ہے اور موجودہ نظام تعلیم اس سے بالکل خالی ہے۔

سیاست : ڈاکٹر صاحب نے جو سیاسی نظام قائم کیا ہے اس میں انھوں نے ملوکیت کی سخت مخالفت کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ نظام ابلیس کا قائم کردہ ہے۔ آپ جمہوری نظام کے بھی مخالف ہیں۔ آپ کے نزدیک اشتراکی نظام حکومت جمہوری نظام حکومت سے کچھ درجہ بہتر ہے، اور آپ مختلف طریقے سے ان کی

۱۔ اقبال نامہ، ص ۴۵۸، بحوالہ اقبال کامل، ص ۳۰۰

تائید کرتے ہیں کہ اس میں اسلامی نظام حکومت کے بہت سے اجزاء ملے ہوئے ہیں۔ آپ اخلاقی حیثیت سے بھی اس کی تائید کرتے ہیں کہ اس میں اسلامی نظام حکومت کے بہت سے اجزاء ملے ہوئے ہیں۔ اشتراکیت آپ کی شاعری کا دلچسپ موضوع ہے اور آپ نے اس کی تائید میں پر جوش نظمیں بھی لکھی ہیں۔ جس کی وجہ سے آپ سوشلسٹ نظر آتے ہیں۔ لیکن کہیں کہیں آپ اس تحریک کے بعض بنیادی اصولوں سے مطمئن نہیں ہیں اور آپ اس کو ایک ملحدانہ مادّی تحریک مانتے ہیں جس کی بنیاد خدا پرستی کے بجائے شکم پرستی پر قائم ہے۔ چنانچہ ان کے نزدیک اشتراکیت اور ملوکیت میں کوئی فرق نہیں۔ آپ کسی بھی نظام حکومت سے متفق نہیں۔ آپ کے نزدیک نظام سلطنت کی بنیاد مذہب اخلاق پر قائم ہونی چاہئے جس میں روح و مادہ کی وحدت قائم ہے اور اس قسم کا نظام سلطنت صرف اسلام نے قائم کیا ہے۔

صنف لطیف : (یعنی عورت) اس میں ڈاکٹر صاحب کے شاعرانہ رنگ اور فلسفیانہ باتیں نہیں ملتی ہیں بلکہ اس میں انھوں نے اسلام کی صاف سادہ تعلیمات کا ذکر کیا ہے۔ آزادی نسواں کی تحریک عورتوں کو جس روش پر پہنچانا چاہتی ہے ایک یوروپین عورت نے اس کی دعوت تمام عورتوں کو اس انداز میں دی ہے کہ اب عورتوں کو قدرتی طور پر مادرانہ فرائض انجام دینے کی ضرورت نہیں کیونکہ سائنس اس قدر ترقی کر چکی ہے کہ مصنوعی طریقے سے بچے خود پیدا ہو سکتے ہیں۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے اس سے اختلاف کیا ہے۔

مولانا عبدالسلام ندوی نے اپنی کتاب ''اقبال کامل'' کے کئی ابواب کافی سلیقگی اور قابلیت کے ساتھ قاری کے سامنے پیش کئے ہیں اور علامہ اقبال کی ادبی خوبیوں کو جدید طریقہ تنقید سے منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے۔ ان کے غزل، مرثیہ اور مثنوی کی خصوصیات مستند دلائل کے ساتھ بیان کئے ہیں۔ مولانا نے اقبال کے کلام میں پائی جانے والی لفظی اور معنوی غلطیوں کی شناخت کر کے تصویر کے دونوں رخ محاسن و معائب کو واضح انداز میں پیش کر دیا ہے۔ اس کتاب کے آخری باب میں اقبال کے نعتیہ کلام کی تشریح موجود ہے۔ جو بقول عبدالسلام صاحب:

''ہماری اس کتاب کو یہ مزید شرف حاصل ہے کہ اس کا خاتمہ بھی حمد و نعت پر

ہوتا ہے۔''

اقبال کامل ایک کامیاب تالیف ہے اور اقبالیات کے سلسلے میں غور وخوض سے پڑھی جائے گی۔ تحقیق کے سلسلے میں یہ کافی معاون ثابت ہوسکتی ہے۔

حیات سلیمان شاہ معین الدین احمد ندوی

حیات سلیمان سید سلیمان ندوی کی سوانح عمری ہے۔ سید سلیمان ندوی ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ دبستان شبلی سے ان کا تعلق زندگی کے آخری ایام تک قائم رہا۔ احیاء علوم مشاہیر اسلام کے کارناموں اور تاریخ اسلام کے صحیح خدوخال کو پیش کرنا دبستان شبلی کے نمایاں کارنامے ہیں۔ تحقیق وتنقید، شعر وادب، اسلامی علوم وفنون، تعلیم وسیاست اور تقریر وخطابت ہر میدان میں سید صاحب کی خدمات نمایاں ہیں۔ نصف صدی تک آپ نے علم وفن کی خدمات انجام دیں۔ آپ کی سوانح لکھنے کا حق ایسے ہی شخص کو حاصل تھا جس سے آپ کو قربت رہی ہو، جس نے آپ کی شخصیت اور کردار کا مطالعہ اچھی طرح سے کیا ہو، جس کو دوست واحباب اور عزیز واقارب سے معلومات اخذ کرنے کی سہولت حاصل ہو اور ان کی تصانیف وتقاریر پر خطابت وخطوط سے استفادے کا موقع ملا ہو۔ یہ تمام سہولتیں شاہ معین الدین احمد ندوی کو حاصل تھیں۔ چنانچہ انھوں نے اپنی کوششوں سے زیادہ سے زیادہ مواد جمع کیا تاکہ موضوع سے انصاف کرسکیں۔ اور جس طرح سید صاحب نے اپنے مشفق استاد کی سوانح عمری ''حیات شبلی'' لکھ کر اپنی شاگردی کا حق ادا کیا تھا اسی انداز میں شاہ معین الدین احمد ندوی نے اس صحیفہ زریں کو لکھ کر اپنے مربی استاد کا حق ادا کردیا۔

یہ کتاب بھی حیات شبلی ہی کی طرح ضخیم اور اسی طرز پر لکھی گئی ہے۔ اس میں سید صاحب کی تحریروں کے اقتباسات کثرت سے دیئے گئے ہیں۔ اس طرح اس کی حیثیت خودنوشت کی بھی ہوگئی ہے۔ سید صاحب کے انتقال پر متعدد رسائل وجرائد کے ضخیم نمبر نکلے۔ معارف نے سلیمان نمبر نکال کر ان کی علمی، ادبی، مذہبی اور تاریخی خدمات کو خراج عقیدت پیش کیا۔ لیکن پھر بھی شائقین کو تشفی نہ ہوئی اور اس عظیم

المرتبت شخصیت کی سوانح عمری کا مطالبہ جاری رہا۔شاہ صاحب نے یہ کتاب لکھ کر شائقین کی تشنگی دور کردی ہے۔اس سوانح عمری کے زیادہ تر مآخذ سید صاحب کے خودنوشت مضامین اور معارف کے شذرات ہیں۔ باقی ان ہی کے اعزہ اور خود مصنف کی ذاتی معلومات پر مبنی ہے۔شاہ صاحب نے اس کتاب کے مقدمہ میں حیات سلیمان کے سات مآخذ تحریر کئے ہیں جن کی مدد سے اس کتاب کو مرتب کیا گیا ہے۔

شاہ صاحب نے حیات شبلی سے ایک اقتباس دیتے ہوئے لکھا ہے کہ سید صاحب نے جو کمالات و اوصاف مولانا شبلی میں بتائے تھے، بعض ترمیمات اور اضافوں کے ساتھ وہی اوصاف و کمالات سید صاحب میں بھی موجود تھے۔وہ لکھتے ہیں:

> ''بعض ترمیمات اور اضافوں کے ساتھ کم وبیش یہی اوصاف و کمالات سید صاحب میں بھی تھے۔ بلکہ ان کے دور میں ہر راہ میں زمانہ کا قدم بہت آگے بڑھ گیا تھا اور علمی اور عملی دونوں میدانوں میں اور زیادہ وسعت پیدا ہوگئی تھی۔ مذہبی میدان میں نئے نئے مسائل ومباحث اور قدیم وجدید دونوں طبقوں میں بہت سے مصنفین اور اہل قلم پیدا ہوگئے تھے۔تلاش وتحقیق کا معیار زیادہ بلند ہوگیا تھا۔عملی میدان میں قومی وملی اور سیاسی کاموں کا دائرہ بہت وسیع ہوگیا تھا۔خلافت ترک موالات اور ہندوستان کی جنگ آزادی کی انقلاب انگیز تحریکیں اسی دفتر میں پیدا ہوئیں اور ہندوستان آزاد ہوا۔ان سارے کاموں اور تحریکوں میں سید صاحب کا نمایاں حصہ رہا۔ پھر ان کو مولانا شبلی سے زیادہ مدت تک کام کا موقع ملا۔مولانا شبلی کے کاموں کی مدت ۳۲ سال ہے اور سید صاحب کی تقریباً نصف صدی۔ اس طویل مدت میں انھوں نے گوناگوں مذہبی، علمی، تعلیمی، قومی اور ملی اور سیاسی کام انجام دیئے.....اس لئے اس کتاب میں سید صاحب کے سوانح کے ضمن میں اس دور کے ہندوستان خصوصاً

مسلمانوں کی ہر قسم کی تاریخ آ گئی ہے۔''[۱]

پوری کتاب سنین کے لحاظ سے نو ابواب پر مشتمل ہے۔اس باب کی ابتدا میں سید صاحب کے وطن دیسنہ کا ذکر ہے۔شاہ صاحب نے سید صاحب کے خاندان ونسب کا تعارف کراتے ہوئے آپ کے بچپن کے حالات بھی قلم بند کئے ہیں اور اس وقت کی دلچسپیوں اور مصروفیتوں کا ذکر بھی کیا ہے۔ پیدائش، ابتدائی تعلیم، پٹنہ میں ندوۃ العلماء کا سالانہ اجلاس، دارالعلوم ندوۃ العلماء میں داخلہ، علمی و تعلیمی انہماک، مولانا فاروق صاحب چریاکوٹی سے استفادہ، مضمون نگاری کا آغاز، شعروادب سے دلچسپی، عربی میں قصیدہ، ندوہ میں مولانا شبلی کی آمد، استاد شاگرد میں پہلی ملاقات، مولانا شبلی کی شان میں سید صاحب کا فارسی قصیدہ، ندوہ کی تعلیمی اصلاح وترقی، مولانا شبلی سے خصوصی استفادہ، عربی مضمون نگاری کی مشق، مختلف فنون کا مطالعہ، عربی میں ایک تاریخی تقریر، ان تمام ذیلی عنوانات کا ذکر کیا ہے۔

دوسرا باب سید صاحب کے ۱۹۰۷ء سے ۱۹۱۴ء تک کے حالات پر مشتمل ہے جس میں تعلیم سے فراغت، رسالہ الندوہ، الندوہ کی سب ایڈیٹری، ندوہ کی معلّمی، دروس الادب اور لغات جدید کی تالیف، شعبہ تصحیح اغلاط تاریخی کا قیام اور اس کی لطافت، شعبۂ تبلیغ اسلام کی نظامت، سیرت نبویؐ کے اسٹاف، مدراس محمڈن کانفرنس کے اجلاس بنگلور میں شرکت، ایک تاریخی مکتوب، بنگلور کانفرنس، سیرت نگاری کی تربیت، ندوہ کی اسٹرائک اور مولانا شبلی کا استعفیٰ، الہلال کلکتہ کے عملہ ادارت میں، مسجد کانپور کی شہادت، سید صاحب کا ایک پرجوش مضمون، غیر آئینی خون ریزی، دکن کالج پونہ کی اسسٹنٹ پروفیسری، سیرت عائشہؓ اور ارض القرآن کی تالیف کا آغاز، دارالمصنفین کا ابتدائی تخیل، ان سارے موضوعات کا مناسب اور تفصیلی جائزہ لیا ہے۔

تیسرا باب ''دارالمصنفین کا قیام اور اس کے کاموں کا آغاز'' کے عنوان کے تحت شروع ہوتا ہے۔ یہ باب ۱۹۱۴ء سے ۱۹۱۸ء کی روداد پر مشتمل ہے۔اس میں مولانا شبلی کے زیر فکر دارالمصنفین کے قیام

۱۔ حیات سلیمان، شاہ معین الدین احمد ندوی، ص ۳

کی مختلف تجویزیں تھیں کہ اسی دوران اگست ۱۹۱۴ء میں ان کے چھوٹے بھائی مولوی محمد اسحاق صاحب کا انتقال ہوگیا۔ اس طرح شبلی نے مجبوراً اعظم گڑھ میں رہنے کا فیصلہ کیا اور دارالمصنفین کو اعظم گڑھ میں ہی بنانے کا ارادہ کیا۔ اس باب میں دارالمصنفین کے لئے ضروری انتظامات، مولانا شبلی کا مرض الموت، سید صاحب کی آمد، تکمیل سیرت کی وصیت اور وفات، استاد کی موت پر سید صاحب کا ''نوحہ''، استاد، معمار دارالمصنفین کا ذکر کرتے ہوئے دارالمصنفین کی ضرورت معمار دارالمصنفین کے قلم سے، ان تمام عنوانات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ان عنوانات کے ذیلی عنوانات میں ہمارا فقر علمی، علوم اسلامیہ کا بقا، علوم جدیدہ کے تراجم، فقدان دارالمصنفین، دارالمصنفین کے لئے اب تک کیا ہوا؟ دارالمصنفین کی مجلس، کام کا آغاز اور ارض القرآن جلد اوّل اور مکاتیب شبلی کی اشاعت، پریس کا قیام اور معارف کا اجرا، مولوی بشیر الدین کی مخالفت، دارالمصنفین کی تقلید میں بعض اداروں کا قیام، کتب خانہ، بیوت المصنفین، وظائف اور سرمایہ مالی، دارالاشاعت اور انسائیکلوپیڈیا کی تدوین کی تجویز اور اس کا خاکہ، اردو کانفرنس کے قیام کی تجویز، قدیم اور نادر کتابوں کی تلاش اور اس کی اشاعت کی تحریک، ہوم رول سے پہلے ہوم لینگویج مسلمانان ہند کی تنظیم مذہبی، انجمن علمائے بنگال کی صدارت، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کا اجلاس کلکتہ، کانگریس اور لیگ کے اجلاس پر تبصرہ، ندوۃ العلماء کے اجلاس ناگ پور میں شرکت ۱۹۱۸ء، شبلی سوسائٹی، سیرت النبی حصہ اوّل کی اشاعت اور بیگم صاحبہ کی خدمت میں اس کی پیش کش، ارض القرآن جلد دوم کی اشاعت اور دوسرے علمی کام کے عنوان کے تحت سید صاحب کی کاوشوں اور خیالات کا ذکر کیا ہے۔ یہ باب ۷۸ صفحات پر مشتمل ہے۔

چوتھا باب سید صاحب کی قومی و سیاسی خدمات پر مشتمل ہے۔ اس میں شاہ صاحب نے ۱۹۱۸ء سے ۱۹۲۶ء تک تمام قومی و سیاسی کاموں کا ذکر کیا ہے۔ شاہ صاحب لکھتے ہیں:

> ''دارالمصنفین کے کاموں کی شہرت، سید صاحب کی تصانیف اور ان کے فاضلانہ مضامین کی اشاعت سے پورا ملک خصوصاً مسلمانوں میں اس کی عظمت

مسلم ہوگئی تھی.....ان کا اصلی ذوق علمی تھا۔ وہ عملی سیاست کے آدمی نہ تھے۔ لیکن ان کی جیسی شخصیت کے اہم تحریکوں سے دامن بچانا مشکل تھا.....اس لئے اس دور کی تمام قومی اور سیاسی تحریکوں میں ان کا نمایاں حصہ رہا اور مسلمانوں کا کوئی کام خواہ وہ ملکی وملی ہو یا مذہبی وسیاسی، ان کی شرکت ورہنمائی سے خالی نہ ہوتا تھا۔''[1]

شاہ صاحب نے اس باب میں ذیلی عنوان کے تحت پہلی جنگ عظیم میں ترکوں کے خلاف شریف حسین کی بغاوت، ترکی کی حکومت کا خاتمہ اوراس کی قلم رو پر اتحادیوں کا قبضہ، ہندوستان میں مجلس خلافت کا قیام، وفد خلافت کی رکنیت، وفد کی روانگی، مصوع میں، پورٹ سعید میں، وینس کا حال، کام کا آغاز، فرانس کی روانگی، لندن میں ورود اور ہاؤس آف کامنس کے مباحثہ میں شرکت، ترکوں کے خلاف ارمنوں اور یونانیوں کا پروپیگنڈہ، وفد کی جدوجہد، قائم مقام وزیر ہند سے وفد کی ملاقات، سید صاحب کے فرائض و مشاغل، مستشرقین سے مسئلہ خلافت، مسٹر اسکومیتھ سے ملاقات، وزیر اعظم سے ملاقات، وفد کے مطالبات کی حمایت میں ایک متفقہ جلسہ، حجاز اور شام کے عربی وفود سے ملاقات اور تبادلۂ خیالات، لیبر پارٹی کے ایڈوائزری کمیٹی سے ملاقات اور اس پر تنقید، اتحادیوں کا دلی منشا، ترکوں کی مخالفت میں ایک کتاب، مختلف ملکوں کے مسلمانوں سے ملاقات اوران کی توقعات، مسٹر مانٹیگو سے دوسری ملاقات، مختلف اسلامی ملکوں کے مسلمانوں سے ملاقات، انگلینڈ فرانس کی جمہوریت کی حقیقت، انڈیا آفس لائبریری کی سیر، اڈنبرا، مانچیسٹر اور کیمبرج میں وفد کا دورہ اور پروفیسر براؤن سے ملاقات، اتحادیوں کا فیصلہ اور ترکی حکومت کا خاتمہ، مسٹر مانٹیگو سے مولوی ابوالقاسم بنگال کی گفتگو، آکسفورڈ یونیورسٹی، یورپ کی جمہوریت کی حقیقت، حجاز کے وفد سے دوبارہ ملاقات، صلح نامہ پر دستخط، مقامات مقدسہ کی آزادی، ہندوستان کی آزادی پر موقوف ہے۔ وفد خلافت کی واپسی اور اٹلی میں امیر فیصل سے ملاقات، تحریک خلافت کی علمی

۱۔ حیات سلیمان، شاہ معین الدین احمد ندوی، ص ۱۴۶

خدمات، تحریک ترک موالات میں اعظم گڑھ کا حصہ، آل انڈیا کانگریس کمیٹی کی ورکنگ کمیٹی کی ممبری، کانگریس اور خلافت کے اجلاس میں شرکت، بہار خلافت کانفرنس کے اجلاس کی صدارت، تحریک ترک موالات کا خاتمہ اور ہندو مسلم اختلاف کا آغاز، ہندو مسلم اختلاف کی تشخیص اور اس کا صحیح علاج، حجاز پر سلطان عبدالعزیز کا حملہ اور انقلاب، ہندوستان کے مسلمانوں میں بے چینی، وفد حجاز کی قیادت، حجاز کے حالات پر تاثرات، حجاز کے لئے ہندوستان کے مسلمانوں میں اضطراب، کانگریس اور خلافت کے اجلاس کان پور میں شرکت، جمعیۃ العلماء کے اجلاس کلکتہ کی صدارت، مؤتمر اسلامی کا انعقاد اور دوسری مرتبہ وفد خلافت کی قیادت، مجلس العلماء کا انعقاد، اس کے علاوہ باب چہارم میں شاہ صاحب نے علمی و تعلیمی خدمات کا بھی ایک موضوع قائم کیا ہے جس کے تحت جامعہ ملیہ کا قیام، مسلم یونیورسٹی میں عربی و فارسی کے یورپین اساتذہ کی مخالفت، عثمانیہ یونیورسٹی مسلم یونیورسٹی کے پہلے جلسہ تقسیم اسناد میں شرکت، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے جلسہ تقسیم اسناد میں شرکت، مسلمانوں کی قومی مجالس کے مقاصد اور معاملات میں تعلیم کی ضرورت اور مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی ذمہ داری، صاحب زادہ آفتاب احمد خاں کے خطبہ صدارت پر تبصرہ اور بعض تعلیمی مشورے، دارالعلوم ندوۃ العلماء کی معتمدی اور اس کی اصلاح و ترقی، ندوۃ العلماء کا سالانہ اجلاس لکھنؤ میں، مدراس میں سیرت النبی پر خطبات، انبالہ کا اجلاس، اجلاس کان پور و دوسرے تعلیمی کام، ندوہ کی اصلاحی تحریک کی کامیابی، سرکاری عربی تعلیم کے نتائج اور اس کی اصلاح کی ضرورت، عربی زبان کی خدمت میں ہندوستانی علماء اور عربی درس گاہوں کی ذمہ داری، مسلم یونیورسٹی کی پچاس سالہ جوبلی میں شرکت، مسلم کانفرنس کے اجلاس میں شرکت، مسلم یونیورسٹی میں شعبۂ علوم مشرقیہ کی تشکیل اور اس کے نصاب کی ترتیب میں شرکت، مسلم یونیورسٹی کورٹ اور ایجوکیشنل کانفرنس کے تعلیمی بورڈ کی ممبری، سیرت النبیؐ جلد دوم سوم اور سیرت عائشہؓ کی اشاعت، اس دور کے دوسرے علمی کام، مغل سلاطین کے متعلق غلط واقعات کی تردید، محبت الٰہی اور اسلام، واقدی اور اس کی کتاب المغازی کی تحقیق، آنحضرتؐ کے متعلق مرہٹی انسائیکلوپیڈیا کی گستاخانہ تحریر کے خلاف احتجاج اور اس کی تصحیح، اردو انسائیکلوپیڈیا کی ضرورت، کیا

مسلمان ارسطو کے مقلد دوسرے فلاسفہ سے ناواقف تھے جیسے عنوانات قائم کر کے سید صاحب کے کارناموں کا ذکر مفصل انداز میں کیا ہے۔

حیات سلیمان کا پانچواں باب سید صاحب کے ۱۹۲۷ء سے ۱۹۲۴ء کے دوران کے کارناموں پر مشتمل ہے۔ اس باب میں سید صاحب کی قومی وملی خدمات کے تحت شاہ صاحب لکھتے ہیں:

> ''۱۹۲۶ء کے بعد اگر چہ سیاسی اور ملی ہنگاموں سے فرصت مل گئی تھی لیکن اب سید صاحب کی شخصیت اتنی اہم اور مشہور ہوگئی تھی کہ مسلمانوں کے تمام اجتماعی کام ان کی شرکت کے بغیر نامکمل سمجھے جاتے تھے اور ہندوستان کے ہر گوشہ سے ان کی طلب بڑھ گئی تھی۔ اس لئے ۱۹۲۶ء کے بعد کا زمانہ ان کی شہرت کے شباب کے ساتھ ان کی انتہائی مشغولیت کا دور ہے اور اس دور میں انھوں نے گوناگوں کام انجام دیئے۔''[۱]

اس بارے میں شاہ صاحب نے سید صاحب کے انجمن حمایت اسلام کے جلسہ میں شرکت، جامعہ ملیہ دہلی کو مفید مشورے، جامعہ اور دوسری ملی و مذہبی درسگاہوں کے بارے میں قوم کے فرائض، ندوۃ العلماء کے لئے مالی اعانت کی اپیل، عربی تعلیم اور عربی مدارس کو حکومت کے دام میں لانے کی کوشش اور ان کے نتائج، عربی مدارس کی زبوں حالی کا ماتم، مجلس العلماء ترچناپلی کے جلسہ کی صدارت، مجلس العلماء کے خطبہ صدارت میں مسلمانوں کے تعلیمی مسائل، اس سفر کے بعض دلچسپ حالات اور مفید معلومات، حیدرآباد کا سفر، جامعہ عثمانیہ کا معائنہ اور اس کے بارے میں تاثرات، نکاح اخیار بلوغ، خلع اور طلاق وغیرہ میں عورتوں کے حقوق کی حمایت، ساردا بل کی مخالفت، نکاح کے وقت حضرت عائشہ کی عمر کی بحث، نابالغی کے نکاح کے بارے میں سید صاحب کا مسلک، مسلمانوں کے مذہبی نظام کی ضرورت، عرب و ہند کے تعلقات، ڈاکٹر ٹرٹین کی کتاب پر تبصرہ، عربوں کی جہازرانی پر خطبات، مسلمان مورخوں کو ایک مفید

۱۔ حیات سلیمان، شاہ معین الدین احمد ندوی، ص ۲۶۴

مشورہ، علمی کانفرنسوں میں شرکت، نجات اخروی کے لئے ایمان ضروری ہے یا حسن عمل کافی ہے، اسلام اور اسلامی تاریخ سے متعلق، غیر مسلموں کی غلط بیانیوں کی تصحیح کا صحیح طریقہ، سیرت نبویؐ کے متعلق مسلمانوں کو ایک صحیح مشورہ، صلاح الدین خدا بخش کا ایک قابل اعتراض مضمون، تاریخ ہند کی تجویز اور اس کا خاکہ، سیرت النبیؐ حصہ چہارم کی اشاعت، ندوہ سے عربی رسالہ ''الضیاء''، پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ مشرقی علوم اور اورینٹل کالج کی اصلاح، انجمن اردوئے معلیٰ مسلم یونیورسٹی میں ہندوستانی زبان پر خطبہ، آفتاب ہوسٹل اور طبیہ کالج علی گڑھ میں تقریر، جامعہ ملیہ دہلی میں تعلیمی خطبہ، ادارہ معارف اسلامیہ لاہور میں ایک فاضلانہ خطبہ، اردو کی تاریخ پر ایک مقالہ، لاہور کا ایک فلکی آلات ساز خاندان، بڑودہ کا سفر، خیام کی اشاعت، جامعہ ملیہ اسلامیہ کے توسیعی لکچر کی صدارت، افغانستان کا علمی و تعلیمی سفر، نادر شاہ بادشاہ افغانستان سے ملاقات، وزیر جنگ کے یہاں چائے کی دعوت اور تعلیمی مسائل پر گفتگو، انجمن ادبی کابل میں ارکان وفد کا عشائیہ، کابل کے اسکولوں اور مدرسوں کا معائنہ، پریس، اخبارات و رسائل، بہار اور اڑیسہ کے سرکاری مدارس کے نصاب کی ترتیب پر سید صاحب کے کارناموں اور تحریروں کا احاطہ کیا ہے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کو مفید مشورے کے تحت شاہ صاحب سید صاحب کے خیالات کو اس طرح رقم کرتے ہیں:

> ''ہندوستان کی آزاد قومی درس گاہوں میں جامعہ ملیہ دہلی ایک ایسی درسگاہ ہے جس کا نصب العین ایسے اشخاص کا پیدا کرنا ہے جو مذہبی واقفیت کے ساتھ ساتھ انگریزی زبان اور ضروری جدید علوم کی تعلیم سے بہرہ ور ہوں اور اپنے دل میں ملک و ملت اور قوم و مذہب کا درد رکھتے ہوں اور اس کی خدمت اپنا مشغلہ زندگی بنالیں۔ اسی کے ساتھ اپنے ہاتھ سے اپنی روزی کا سامان پیدا کرسکیں۔''[۱]

شاہ صاحب نے حیات سلیمان کے چھٹے باب میں سید صاحب کی قومی و ملی خدمات پر روشنی ڈالی

۱۔ حیات سلیمان، شاہ معین الدین احمد ندوی، ص ۲۶۸

ہے۔اس باب میں شاہ صاحب نے تاریخ ہند کا خاکہ، انجمن حمایت اسلام لاہور کے مجوزہ زمانہ کالج کے خاکہ کی ترتیب، اردو اور ہندی کا مسئلہ، بھوپال اور حیدرآباد کا سفر، عربوں کی جہاز رانی کی اشاعت، سیرت النبی جلد پنجم کی اشاعت، علالت، مندر شکن عالم گیر کی مہنت نوازی، ہندی اتھوا ہندوستانی، آل انڈیا اردو کانفرنس علی گڑھ میں شرکت، فلسطین کانفرنس دہلی کی صدارت، سید سلیمان کی قرآنی غلطیاں، ایران میں خیام کی قدردانی، ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کی اردو کانفرنس منعقدہ لکھنؤ کی صدارت، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کی طلائی جوبلی کے شعبہ علوم وفنون اسلامی کی صدارت، اسلامیہ اسکول اٹاوہ کا معائنہ، راجندر عبدالحق پیکٹ، ہندوستانی یا آسان اردو لکھنے کی ترغیب، ہندوستان کے مسلمان مورخین کی ایک غلطی اوراس کی تلافی کی صورت، جامعہ دارالسلام عمرآباد مدراس کے جلسہ تقسیم اسناد کی صدارت، خطبہ، حیدرآباد کا سفر، نظام حیدرآباد سے ملاقات اور سید صاحب کا وظیفہ، ابتدائی جبری تعلیم کی اسکیم اور مسلمان بچوں کی تعلیم کا مسئلہ، صوبہ متحدہ کی پہلی کانگریسی حکومت اور عبدالحق، راجندر پیکٹ کی مخالفت، سیرت النبیؐ جلد ششم کی اشاعت، مصر میں سیرت نبوی کے عربی ترجمہ کا منصوبہ، انگریزی ترجمہ کا ارادہ، نقوش سلیمانی کی اشاعت، مسلم ایجوکیشنل کانفرنس کے سالانہ اجلاس منعقدہ کلکتہ کے شعبہ اردو کی صدارت، مدح صحابہ اور تبرا ایجی ٹیشن، دکن کا سفر اوراس کے علمی اور تعلیمی اداروں میں تقریریں، پشاور اور بھاول پور کے تعلیمی سفر، نیاز فتح پوری کا ایک نیا فتنہ اوراس کا جواب، رحمت عالم کی تالیف واشاعت، بہار کے مسلمانوں کا قتل عام، ہندوستان میں کاشت کاروں کے حقوق کا مسئلہ، ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کو ہندی اکیڈمی بنانے کی کوشش، سید صاحب کی علمی خدمات کا اعتراف اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری، عیسائی اور یہودی مصنفین کی ایک خطرناک طریقہ پر تنبیہ، صحیح اسلامی تحریک اوراس کا طریقہ، تبلیغی جماعت کے متعلق تاثر اوراس کے اجتماع میں تقریر، حیات شبلی کی اشاعت، جنوبی ہند کا سفر اور دو صدارتیں، نیاز فتح پوری کا ایک نیا شگوفہ اوراس کا جواب، راندیر کا سفر، بمبئی میں دینی درس گاہ کے قیام کی تحریک اوراس کا افتتاح، شدید علالت، ان تمام ذیلی عنوانات کے تحت ۱۹۳۴ء سے ۱۹۴۷ء کے درمیان سید صاحب کے زریں خیالات وکمالات کا احاطہ کیا ہے۔

ساتویں باب میں بھوپال کے قیام وحالات کا ذکر ہے۔ یہ باب ۱۹۴۶ء سے ۱۹۵۰ء کے ادوار پر مشتمل ہے۔ شاہ صاحب اس عنوان سے متعلق لکھتے ہیں:

''ریاست بھوپال کو دین داری اور دینی تعلیم میں ایک خاص امتیاز حاصل تھا .....نواب صدیق حسن خاں کے زمانہ میں اس میں اور اضافہ ہوا..... ان کی دین داری اور علما نوازی سے اس زمانہ میں بھوپال علما اور اہل کمال کا مرکز بن گیا تھا۔ اور عرب تک کے علما کھنچ کر بھوپال میں جمع ہو گئے تھے۔ نواب صاحب نے دینی تعلیم کا ایک مستقل شعبہ قائم کیا تھا جس کے ماتحت بہت سے مدارس تھے لیکن رفتہ رفتہ اس کی حالت بہت گر گئی۔ نواب حمید اللہ خاں بڑے بیدار مغز حکمراں تھے۔ انھوں نے عربی مدارس کی اصلاح و تنظیم کی طرف توجہ کی اور اس کام کے لئے ان کی نگاہ حضرت سید صاحب پر پڑی اور انھوں نے سید صاحب کی صدارت میں علما کی ایک کمیٹی مقرر کی۔ اس نے ان مدارس کا نیا نصاب مرتب کیا اور اس کی اصلاح و تنظیم کے ضوابط بنائے۔ ان کو عمل میں لانے کے لئے امیر جامعہ کا عہدہ سید صاحب کے سامنے پیش کیا۔ اس سے پہلے عہدہ افتا کی پیش کش بھی کر چکے تھے۔ لیکن سید صاحب دارالمصنفین کو چھوڑ کر کوئی عہدہ قبول کرنا پسند نہ کرتے تھے۔ چنانچہ وہ مختلف زمانوں میں مسلم یونیورسٹی، عثمانیہ یونیورسٹی اور پنجاب یونیورسٹی کے بڑے بڑے تعلیمی عہدوں سے انکار کر چکے تھے مگر نواب صاحب کا اصرار برابر جاری رہا۔''[۱]

مذکورہ باب کے ذیلی عنوان کے تحت امیر جامعہ قاضی القضاۃ بھوپال، بھوپال میں دارالمصنفین کی فکر اور اس کے متعلق ہدایات، حج، حج سے واپسی اور بھوپال سے علیحدگی، بھوپال کا علمی گروہ، ہندوستان

۱۔ حیات سلیمان، شاہ معین الدین احمد ندوی، ص ۴۱۱۔۴۱۲

سے بددلی اور اس کے اسباب، پاکستان کی تحریک پر ایک نظر، سید صاحب کا طرز عمل، مسلمانوں کا تصور آزادی، سیاسی خودمختاری کے عناصر، آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیم کا مسئلہ، قومی تعلیم کے اصول و شرائط، مسلمانوں کے حقوق کی ضمانت، متحدہ قومیت اور متحدہ کلچر کا نعرہ، ان تمام عنوانات پر خاصا مواد فراہم کردیا ہے۔

باب ہشتم ہجرت اور قیام پاکستان کے عنوان پر مشتمل ہے۔ اس باب میں ۱۹۵۰ء سے ۱۹۵۳ء کے دوران پیش آنے والے واقعات و حالات کا ذکر ہے۔ اس ضمن میں ہجرت کے اسباب و علل کا بھی تجزیہ کیا گیا ہے۔ شاہ صاحب نے اس باب کے ذیلی عنوانات میں مختلف مقامات سے طلب اور عہدوں کی پیش کش، کراچی کا اتفاقی اور عارضی سفر، جمعیۃ علمائے اسلام کی طرف سے خیر مقدم، مستقل قیام، انجمن ترقی اردو پاکستان میں اعزازی جلسہ، اسلامی دستور کے خاکہ کی ترتیب، جمعیۃ علمائے اسلام سہلٹ کے جلسہ کی صدارت، اسلامی ملکوں کے علماء کی کانفرنس، ابن سینا کی ہزار سالہ یادگار میں شرکت کی دعوت، آل پاکستان ہسٹاریکل سوسائٹی کی رکنیت اور اس کے جلسہ کی صدارت، مختلف علمی و تعلیمی مشغولیتیں، کراچی یونیورسٹی سینٹ کی ممبری، اسلامی بورڈ کی صدارت، جمعیۃ علمائے اسلام کی صدارت، ڈھاکہ کا سفر، فتح پور میں وارد اور لکھنؤ میں تشریف آوری اور ندوہ میں پر اثر جلسہ، علمی منصوبے، دارالمصنفین سے قلمی وابستگی اور اس کے فلاح کی فکر، دارالمصنفین کا نیا نظام، صحت کی خرابی، وفات، ہندوستان و پاکستان میں ماتم، ان تمام عنوانات پر اظہار خیال فرمایا ہے۔

نویں باب میں سید صاحب کے ذاتی حالات اور اخلاق و عادات کا ذکر ہے۔ جس میں سید صاحب کی آل اولاد، لباس، سادگی، نفاست، فضائل اخلاق، اختلاف و کشمکش سے گریز، اعتماد و حسن ظن، اہل و عیال سے محبت، وطن سے محبت، دولت دنیا سے استغنیٰ، ذوق مطالعہ، نادر کتابوں کی تلاش، معلومات کی وسعت اور تلاش و تحقیق، درس و تدریس کا ذوق، رفقاء کی تصنیفی تربیت، معمولات، بزم رفتہ کی یاد، معاصرین اور احباب، علماء و اصحاب علم، غیر مسلم احباب، بزرگ معاصرین، ملکی و سیاسی رہنما،

احباب خاص، مذہبی عقائد، خیالات روحانی، انقلاب، رجوع واعتراف، قدیم وجدید کی جامعیت، کے عنوان پر مختصراً روشنی ڈالی ہے۔

حیات سلیمان کے آخر میں سید صاحب کی وفات پر لکھی جانے والی نظمیں اور تاریخی قطعات درج ہیں۔ ضمیمہ میں بعض اہم شذرات، معارف کے اقتباسات سے ان کے قومی وملی احساسات پیش کئے ہیں۔

چونکہ سید صاحب ہر قسم کے مسائل پر شذرات میں اظہار خیال کرتے تھے۔ ان میں وہ شذرات بڑے حکیمانہ اور اہم ہیں جو مسلمانوں کے مذہبی وملی زندگی کے اجزا وعناصر پر لکھے ہیں۔ ان میں ان کی ترقی وتنزل اور بقا واستحکام کا پورا فلسفہ بیان کردیا ہے۔ آخر میں چند اہم شذرات نقل کردیئے گئے ہیں۔ اس طرح یہ سید صاحب کی سوانح عمری کے ساتھ ساتھ عہد سلیمانی کی تاریخ بھی ہوگئی ہے۔

اس کتاب کو تحریر کرنے میں شاہ صاحب نے زیادہ تر مواد معارف کے سلیمان نمبر میں شائع مقالے سے لئے ہیں۔ اس کے علاوہ ان خطوط سے بھی مدد لی ہے جو سید صاحب نے ان کے نام تحریر کئے تھے۔ حیات سلیمان لکھنے کے لئے شاہ صاحب کو زیادہ کدوکاوش کی ضرورت نہیں پڑی۔ اس کتاب کا سوانحی ادب میں کیا مقام ہے اس سلسلے میں ڈاکٹر شباب الدین صاحب اس طرح رقم طراز ہیں:

> ''یہ دیکھ کر انتہائی تعجب ہوتا ہے کہ وہ سوانح نگاری کے اس معیار کو بھی قائم نہیں رکھ سکے جو حیات شبلی میں ملتا ہے۔ سید صاحب نے شبلی کی جو مرقع کشی کی ہے اس سے کسی کو خواہ کتنا ہی اختلاف کیوں نہ ہو مگر اس بات کا اعتراف سب ہی لوگ کریں گے کہ حیات شبلی میں سید صاحب نے جو تاریخی معلومات فراہم کی ہیں وہ استناد کا درجہ رکھتی ہیں اور ان کی مدد سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہوجاتی ہے کہ شبلی کے معاشرہ کے مسائل کیا تھے۔ اس زمانے کی قدریں کیا تھیں؟ سیاسی وقوعات کیا تھے؟ اور ان سب نے مل کر شبلی کی شخصیت کی تشکیل کس انداز سے کی۔ شاہ صاحب نے حیات شبلی کی طرح نہ تو سید صاحب

کے معاشرہ کے حالات سے کوئی خاص بحث کی ہے نہ ان کے مولد علمی روایات
کو کدوکاوش اور مورخانہ بصیرت کے ساتھ مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔
انھوں نے سہل نگاری سے کام لیتے ہوئے معارف کے مطبوعہ مضامین سے
لمبے لمبے اقتباسات نقل کر کے سید صاحب کے معاشرہ اور اس زمانے کی تعلیمی
روایات کو اجاگر کر دینا ہی کافی سمجھا۔ سید صاحب کی سیرت کی تشکیل کے عوامل
کیا رہے ہیں شاہ صاحب اس سے بھی یکسر صرف نظر کر گئے ہیں۔ اس طرح
اس کتاب کو اردو کے سوانحی ادب میں کوئی اعلیٰ مقام دینا مشکل ہے۔ زیادہ
سے زیادہ اس کو اوسط درجے کی سوانحی کتاب کہا جا سکتا ہے۔'' [1]

شاہ صاحب کی اس کتاب میں ایک کمی یہ بھی محسوس ہوتی ہے کہ انھوں نے سید صاحب کو جامع کمالات ثابت کرنے میں اپنا سارا زور قلم صرف کر دیا ہے مگر ان کے اصل و حقیقی کارنامے کو جس طرح اجاگر کرنا چاہئے تھا اس طرح نہیں کر سکے۔

شاہ صاحب نے اس کتاب کے مقدمہ میں اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ سوانح کی ترتیب سنہ وار ہے۔ اس کی وجہ سے صاحب سوانح کی تصویر کشی قدرے دھندلی ہوگئی ہے۔ بعض ابواب کافی طویل ہو گئے ہیں۔ جزوی واقعات کی تفصیل اور اقتباسات کی کثرت اس طوالت کا سبب ہیں۔

اس تصنیف کی خصوصیات سید صاحب کی نجی زندگی واقعات و افراد کے حوالے سے ان کے تاثرات و جذبات کی ترجمان ہیں جسے شخصی رابطے کی بنا پر مصنف موثر طریقے سے پیش کرنے میں کامیاب ہوئے ہیں۔ سید صاحب کی نجی زندگی کے بارے میں ان کا کہنا ہے:

''مہر و محبت ان کے خمیر میں داخل تھا جس سے ہر تعلق رکھنے والا بقدر استحقاق فیض یاب ہوتا تھا۔ ان کی گھریلو زندگی مہر و محبت کا نمونہ تھی۔ دارالمصنفین میں کام کے اوقات کے علاوہ ان کا سارا وقت بال بچوں

۱۔ دارالمصنفین کی ادبی تصانیف ۱۹۸۰ء تک، ڈاکٹر شباب الدین، ص ۱۲۹۔۱۳۰

کی دلچسپیوں میں گزرتا تھا۔ سب سے چھوٹی اولاد پر نگاہ مہر زیادہ رہتی تھی۔ اس کو گود میں لے کر اور اگر چلنے کے قابل ہو تو انگلی پکڑ کر دارالمصنفین کی سڑک پر ٹہلایا کرتے تھے۔

سید صاحب کی زندگی کے آخری ایام میں ان پر تصوف کا رنگ غالب آ گیا تھا۔ اس روحانی انقلاب پر بڑی چہ مگوئیاں ہوئیں۔ لیکن ان تنقیدوں کا ان پر کوئی اثر نہیں ہوا اور انھوں نے حضرت اشرف علی تھانوی کے آستانہ پر سر تسلیم خم کر دیا۔ سید صاحب کو ہر طبقہ میں کافی مقبولیت حاصل تھی۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت قدیم و جدید کی جامعیت تھی۔ اگر چہ وہ قدیم تعلیم کے نمائندہ تھے، ان کی تعلیم و تربیت زیادہ تر پرانے ماحول میں ہوئی تھی لیکن وہ جدید خیالات و رجحانات اور اس کے طور طریقوں سے پوری طرح واقف تھے۔ اس طرح وہ قدیم و جدید کے سنگم تھے اور انھوں نے اپنے کو ان دونوں سے ایسا مانوس کر لیا تھا کہ کہیں اجنبی نہ معلوم ہوتے تھے۔

حیات سلیمان پر تبصرہ کرتے ہوئے سعید احمد اکبر آبادی اس طرح تحریر کرتے ہیں:

''اس بنا پر شاہ صاحب نے اپنے استاد علامہ کی زندگی کی داستان زیادہ تر خود استاد کی زبان سے سنائی ہے۔ اس حیثیت سے اس کتاب کو صاحب سوانح کی خودنوشت سوانح حیات بھی کہا جا سکتا ہے۔ لیکن شاہ صاحب نے اس پوری داستان کو محنت شاقہ اور عرق ریزی کے بعد اس چابکدستی اور ہنرمندی سے مرتب کیا اور اس میں جگہ جگہ اپنی معلومات و مشاہدات کا رنگ اس خوبی سے بھرا ہے کہ پوری کتاب مجموعہ لالہ و گل ہو گئی ہے..... انداز نگاری ایسی بے ساختہ برجستہ اور شگفتہ ہے کہ کتاب کو شروع کرنے کے بعد اسے ختم کئے بغیر ہاتھ سے رکھ دینے کو جی نہیں چاہتا۔''[۱]

ڈاکٹر خورشید نعمانی حیات سلیمان سے متعلق اپنے خیالات اس انداز میں بیان کرتے ہیں:

۱۔ برہان دہلی، سعید احمد اکبر آبادی، اپریل ۱۹۷۴ء، ص ۲۸۴

''اس میں شک نہیں کہ ''حیات سلیمان'' شاہ صاحب کی تصنیفی زندگی کی اہم ترین کڑی ہے اور جامع ہے۔ لیکن اگر شاہ صاحب اس کتاب میں سلیمانی دولت علم اور اس کی اتھاہ گہرائیوں پر تبصرہ کرتے اور میدان تحقیق میں سید صاحب کی نادر تاریخی تحقیقات، لغوی ولسانی تحقیقات، شرعی مسائل میں ان کا نقطہ اجتہاد، سیاسی معاملات میں ان کا بصیرت افروز کردار، محاصرانہ چشمکوں میں ان کی رعنائی، رفتار وگفتار، طنز ومزاح کے تیر ونشتر، لطائف وظرائف میں ان کی شوخی طبع ان سب موضوعات پر لکھتے تو اہل نقد ونظر کے لئے کافی فکر انگیز خیال آفریں اور ذہنی جلا کے باعث ہوسکتے تھے۔ شاہ صاحب نے سید صاحب کی تصنیفات کا ضمناً ذکر کیا ہے۔ بہتر ہوتا کہ ان کی ہر تصنیف پر ناقدانہ رائے دی جاتی اور اس کا تجزیہ کیا جاتا۔'' [۱]

شاہ صاحب کی تنقید نگاری پر ڈاکٹر شباب الدین صاحب نے اس طرح تنقیدی نگاہ ڈالی ہے:

''شاہ صاحب کی طبیعت میں اختراع ونقد کا مادہ نہ ہونے کے برابر تھا۔ اس لئے وہ نقل اور ترجمہ کا کام تو بڑا اچھا انجام دیتے تھے۔ ان کی زبان چونکہ شستہ اور پرلطف تھی اس لئے ان کی تحریروں کو پڑھنے میں لطف بھی آتا ہے مگر ان کی تمام کتابیں اختراع ونقد کے وصف سے عاری ہیں۔ حیات سلیمان بھی ان کی اسی روش کی غماز ہے جس میں نقد واختراع کی پرچھائیاں تک نظر نہیں آتی۔'' [۲]

اس کے علاوہ شاہ صاحب کو یہ بھی بتانا چاہئے تھا کہ مولوی مسعود علی ندوی مرحوم اور سید صاحب کے تعلقات کس طرح کے تھے۔ لیکن شاہ صاحب نے اس کے ذکر میں محتاط انداز بیان اختیار کیا ہے۔

۱۔ دارالمصنفین کی ادبی تصانیف، ڈاکٹر خورشید نعمانی ردولی، ص ۲۰۲

۲۔ دارالمصنفین کی ادبی تصانیف ۱۹۸۰ء تک، ڈاکٹر شباب الدین، ص ۱۳۰

چونکہ عمر کے آخری ایام میں دارالمصنفین کے سلسلہ میں سید صاحب اور مسعود علی ندوی صاحب سے اختلافات ہوگئے تھے جس کا سید صاحب کو ہمیشہ رنج رہا۔ اس اختلافی مسئلہ پر شاہ صاحب نے روشنی نہیں ڈالی۔ غالباً اس کی وجہ فریقین کی کمزوریوں کو ظاہر نہ کرنے کا خیال تھا۔ اس کے علاوہ شاہ صاحب خود ایک مرنجان مرنج متین اور سنجیدہ مزاج شخص تھے۔ انھوں نے چاہا کہ اختلافی اور نزاعی امور کا ذکر کر کے ایسا باب نہ کھولا جائے جس سے بحث و مباحثہ اور رد و قدح کا سلسلہ شروع ہو جائے۔ چنانچہ مصنف نے مصلحت سے کام لیا ہے۔ جب کہ یہ چیز فن سوانح نگاری سے انحراف کے زمرہ میں آئے گی۔ شاہ صاحب، سید صاحب اور مسعود علی ندوی کے درمیان اختلافات سے متعلق یہ کہہ کر گزر گئے ہیں کہ:

> ''وہ دونوں اس دنیا میں نہیں ہیں اس لئے اس کا قلم انداز کرنا ہی بہتر ہے۔ موجودہ دور میں سوانح نگاری کا معیار یہی سمجھا جاتا ہے کہ کسی خوبی یا خامی سے صرف نظر نہ کیا جائے اس نقطہ نظر سے مصنف کے رجحان پر حرف گیری کی جاسکتی ہے۔

لیکن مصنف نے اس کتاب کے مقدمہ میں اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ

> ''یہ ملحوظ رہے کہ یہ ایک جلیل القدر شخصیت اور ایک شفیق استاد کی سوانح عمری ایک ادنیٰ شاگرد کے قلم سے ہے۔ اس لئے کہیں جذباتی عقیدت کا پرتو نظر آئے تو اس کو معذور سمجھا جائے۔'' [۱]

مذکورہ خامیوں کے باوجود ''حیات سلیمان'' شبلی اسکول کی ایک اہم تصنیف ہے۔ یہ کتاب انشا اور زبان و بیان کے لحاظ سے بھی بہت اہم اور قابل قدر ہے۔ یہ کتاب اردو کے سوانحی ادب میں ایک بہترین اضافہ ہے اور اہل علم اور اصحاب ذوق دونوں کے لئے ایک گراں قدر تحفہ ہے۔ جس طرح سید صاحب نے اپنے استاد کی سوانح عمری لکھنے کا حق انصاف اور حقیقت پسندی سے ادا کیا تھا اسی طرح ان کے شاگرد شاہ

۱۔ حیات سلیمان، شاہ معین الدین احمد ندوی، ص ۵

معین الدین احمد ندوی نے اپنے استاد کی سوانح عمری تحریر کرنے کا فرض ادا کیا ہے۔ ان کی تحریروں میں وہی شان اور وقار ہے جو علامہ شبلی اور مولانا سید سلیمان ندوی کے قلم میں تھی۔ انھوں نے بھی سوانح عمری میں تخلیقی شان پیدا کردی ہے۔

مقالات سلیمان جلد اول سید صباح الدین عبدالرحمٰن

علامہ سید سلیمان ندوی نے مختلف موضوعات پر سیکڑوں علمی و ادبی تاریخی و مذہبی، تعلیمی و سوانحی مقالات تحریر کئے جو کافی مقبول ہوئے۔ علم و ادب کا مشکل سے کوئی گوشہ ایسا ہوگا جو سید صاحب کی متلاشی نگاہوں سے دور اور تشنہ تحقیق رہا ہو۔ انھوں نے اسلامی علوم وفنون کے بہت سے پوشیدہ گوشے بے نقاب کئے۔ اسلامی علوم و ادب کی ہر شاخ اور ہر پہلو پر معلومات کا ایک دفتر جمع کردیا۔ جس موضوع پر بھی قلم اٹھایا اس کو اس تحقیق و جامعیت کے ساتھ لکھا کہ پھر اس میں اضافہ کی گنجائش کم ہی باقی رہی۔ ان کے بعض تاریخی مقالات آج بھی اپنے موضوع پر حرف آخر کا درجہ رکھتے ہیں۔ مثلاً تاج محل اور لال قلعہ کے معمار اور لاہور کا ایک فلکی آلات ساز خاندان۔

سید صاحب نے چالیس سال تک معارف کی ادارت کی۔ اس زمانے میں شاید ہی ایسا ہوا ہوگا کہ معارف کا کوئی شمارہ ان کی تحریروں سے خالی رہا ہو۔ سید صاحب کی وفات کے بعد شاہ معین الدین احمد ندوی اور سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب مرحوم نے ان کے تاریخی، علمی و مذہبی مقالات کو تین جلدوں میں مرتب کرکے دارالمصنفین سے شائع کیا۔ پہلی جلد ہندوستان کی تاریخ سے متعلق ہے، دوسری جلد علمی اور تیسری جلد مذہبی بلکہ قرآنی مقالات کا مجموعہ ہے۔

مقالات سلیمان جلد اول صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے مرتب کرکے ایک مبسوط مقدمہ کے ساتھ ۱۹۶۶ء میں دارالمصنفین سے شائع کیا۔ اس جلد کا پہلا مقالہ ''ہندوستان کے مسلمان حکمرانوں کے عہد میں ہندوؤں کی تعلیمی و علمی ترقی'' ہے۔ اس مقالہ کے عنوان سے ہی پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں کے عہد

حکمرانی میں ہندوؤں نے کس طرح علمی و تعلیمی ترقی کی اور ان کی علمی ترقی میں مسلمانوں کا کس قدر حصہ ہے۔ ان سوالوں کا جواب اس میں کافی محققانہ انداز میں دیا گیا ہے کہ جس دن سے ہندوستان سے مسلمانوں کا تعلق قائم ہوا اور وہ جب تک ہندوستان میں حکمراں رہے انھوں نے ہندوؤں کی تعلیم میں فیاضانہ حصہ لیا اور ان کے دور حکومت میں چھوٹی ذات کو بھی حصول علم کے لئے ویسا ہی موقع فراہم ہوا جیسا کہ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں کو حاصل تھا۔ مسلمانوں کے دور حکومت میں تعلیم و تربیت کے جو مقامات و مراکز تھے ان میں مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کی تعلیم و تربیت کا بھی انتظام تھا۔ یہاں تک کہ رؤسا و بادشاہ کے درباروں میں بھی اسی قسم کا نظم ہوا کرتا تھا۔ مسلم حکومت کے خاتمہ کے بعد مسلم ریاستوں میں بھی یہ سلسلہ تعلیم جاری اور قائم رہا۔

مسلمانوں کے اس تعلیمی احسان کا ذکر سید صاحب اپنے اس مقالہ میں اس طرح کرتے ہیں:

> ''ہندوؤں پر مسلمانوں کا سب سے بڑا تعلیمی احسان یہ ہے کہ مسلمانوں سے پہلے ہندو دھرم کے مطابق تعلیم ہندوؤں کے ایک مخصوص طبقہ تک محدود تھی.....لیکن مسلمانوں نے ہندوستان آکر تعلیم کو ہندوؤں کے ہر طبقہ تک عام کر دیا۔
>
> ہندوؤں پر مسلمانوں کا تیسرا سب سے بڑا تعلیمی احسان یہ ہے کہ ان کے تعلیمی علوم و فنون میں وسعت پیدا کی۔ قدیم ہندوستان کے شیشہ وقار کو صدمہ پہنچائے بغیر یہ کہا جا سکتا ہے کہ مسلمانوں کے عہد سے پہلے ہندوستان میں جن علوم کی تعلیم رائج تھی ان کی فہرست نہایت مختصر تھی۔ نصاب تاریخ سے یہاں کے مدارس بیشتر خالی رہے۔ جغرافیہ کا وجود یہاں برائے نام تھا۔ فلسفہ حکمت، اقلیدس، ہیئت، طب، شاعری، موسیقی وغیرہ علوم ہندوستان میں پہلے سے موجود تھے لیکن ان کی تعلیم اولاً تو مخصوص لوگوں کو ہوتی تھی۔ دوسرے یہ کہ ان علوم کے

متعلق دنیا کی دوسری قوموں کی جو تحقیقات تھی اس سے یہاں سرتا پا واقفیت
تھی۔ مسلمان علما نے ان کے نصاب تعلیم کو ان فروگزاشتوں سے پاک کیا۔'' [۱]

اس مقالے کی ابتدا میں ہندوستان سے مسلمانوں کے تعلق اور ان کی آمد کا ذکر ان عرب جغرافیہ نویسوں اور سیاحوں کے حوالہ سے کیا گیا ہے جنھوں نے اپنی کتابوں اور رودادوں میں ہندوستان کے کوائف واحوال کا ذکر کیا ہے۔ اس کے بعد مسلمانوں کی علمی وعملی فیاضیوں کے ذکر میں ہندو مورخین، ہندو فارسی شعرا، ہندو ادبائے فارسی، ہندو لغت نویس، مترجمین، علوم عقلیہ کے ہندو علما، انتظامات مالی نجوم طب اور دیگر علوم متفرقہ، ہندو اطباء، اخلاق وتصوف، موسیقی، مصوری اور آخیر زمانہ کے چند ہندو طبیب، ان سب پر ہندوؤں کے علوم وفنون اور ان کی نمایاں کتابوں کا ذکر مختصر تعارف کے ساتھ پیش کر کے یہ ثابت کیا ہے کہ یہ تمام غیر مسلم اہل کمال مسلمانوں کے دور حکومت کی رہین منت تھے اور ان سب کی اس علمی کامیابی میں مسلمانوں کا نظام وتربیت ہی کارفرما تھی۔ چنانچہ ہندو ہر شعبہ میں پیش پیش تھے۔ وہ مسلمانوں سے کسی طرح کم نہ تھے۔

دوسرا مقالہ **سلطان ٹیپو کی چند باتیں**۔ کچھ چشم دید مشاہدات اور کچھ تاریخی حقائق کے عنوان سے ہے۔ ۱۹۱۹ء میں سید صاحب نے ایجوکیشنل کانفرنس میں شرکت کی غرض سے بنگلور کا سفر کیا تو اسی سفر کے دوران کانفرنس سے فرصت پا کر میسور سرنگا پٹم، گڑھ آمبور کی سیر کی اور سید صاحب کے الفاظ میں ''ان تمام مقامات کو جہاں بڑے بڑے سیاسی انقلابات رونما ہوئے تھے عبرت کی آنکھوں سے دیکھا۔''

سید صاحب نے اس مقالہ میں اسی سفر کے مشاہدات اور کچھ تاریخی حقائق پیش کئے ہیں۔ سید صاحب نے اس سفر کی روداد کچھ اس طرح بیان کی ہے:

''میں نے دوران سیر اس ندی کو بھی عبور کیا جو دکن اور میسور کی حد فاصل تھی۔
مجھے وہ سلسلہ کوہ بھی نظر آیا جس کے دامن میں ٹیپو کی فوج پناہ گیر تھی.....

۱۔ مقالات سلیمان، جلد اول، صباح الدین عبدالرحمٰن، ص ۳۱۔۳۲

میں ایک پہاڑ پر بھی چڑھا جو گڑھ آمبور کے قریب تھا اور جس پر ٹیپو کے جنگی استحکامات کے نشانات تھے۔ پتھر کی وہ عظیم الشان چٹانیں بھی دیکھیں جن کو بجائے خود پہاڑ کہنا چاہئے اور وہ اس طرح آ کر ایک دوسرے سے مل گئی تھیں کہ ایک قلعہ سا بن گیا تھا۔'' [۱]

سرنگا پٹم سے متعلق لکھتے ہیں:

''سرنگا پٹم کا قلعہ عجیب موقع پر تعمیر ہوا ہے۔ کاوری ندی میں ایک جگہ دو شاخیں ہوگئی ہیں کچھ دور کے بعد یہ شاخیں مل کر پھر ایک ہوگئی ہیں۔ اس طرح بیچ میں ایک جزیرہ سا ہوگیا ہے۔ اسی جزیرہ پر سرنگا پٹم کا قلعہ بنایا گیا ہے۔ چاروں طرف سے دریا سے گھرا ہوا ہے۔ سلطان ٹیپو کی زندگی کا آخری کھیل یہیں ہوا۔ وہ کمپنی کی فوج کے مقابلہ میں اسی قلعہ میں محصور ہوگیا تھا۔ فوج کی گولہ اندازی سے قلعہ کی ایک طرف کی دیوار میں رخنہ پڑ گیا ہے۔ سلطان کے نوکروں نے غداری کی اور دشمن کو پوشیدہ طور پر اس کی اطلاع دے دی۔ بیچارہ سلطان اسی معرکہ میں ۱۷۹۹ء میں کام آ گیا۔'' [۲]

غرض یہ کہ میسور سرنگا پٹم اور آمبور کے سیاسی انقلابات کو اس مقالہ میں ایسے موثر انداز میں بیان کیا گیا ہے جس سے اس پورے علاقہ کی تاریخ کی ایک جھلک سامنے آجاتی ہے۔ ساتھ ہی سلطان شہید کے انگریز مورخوں کی غلط بیانیوں ''کہ وہ ہندوؤں کو زبردستی مسلمان بنالیتا تھا'' کی تردید کی ہے۔

تیسرا مقالہ **خلافت اور ہندوستان** ہے۔ مسئلہ خلافت سید صاحب کا خاص موضوع ہے۔ اس مضمون میں سید صاحب نے یہ دکھایا ہے کہ خلافت اسلامیہ سے ہندوستان کا تعلق کس قدر گہرا اور پرانا ہے

۱۔ مقالات سلیمان، جلد اوّل، صباح الدین عبدالرحمٰن، ص ۱۰۷

۲۔ ایضاً، ص ۱۰۷

اور ہمیشہ سے اس کو آستانہ خلافت سے کس درجہ عقیدت مندی اور ارادت رہی ہے اور سلاطین ہند خلفائے اسلام کو کس عظمت دینی اور وقعت مذہبی کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور انھیں خلافت اسلامیہ سے کس درجہ مذہبی، سیاسی اور جذباتی لگاؤ تھا۔ اس سلسلے میں سید صاحب نے مسلم سلاطین ہند کی خلفائے اسلام سے عقیدت وارادت مندی کا تجزیہ بڑے اچھے ڈھنگ سے کیا ہے اور بہت سی تاریخی معلومات بھی بہم پہنچائی ہیں۔ اس مضمون کے ذیلی عنوانات میں خلافت راشدہ، عہد خلافت عباسیہ، سلاطین ہند کے سکوں کے کتبے، خلافت آل عثمان کا ذکر بھی تفصیل سے کیا ہے۔

ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کیوں کر ہوئی۔ یہ معارف میں سید صاحب کا سلسلہ وار مضمون تھا۔ لیکن یہ پایہ تکمیل کو نہ پہنچ سکا۔ اس مضمون میں ہندوستان میں اسلام کی نشر واشاعت اور ترویج وترقی کی تاریخ میں کافی مدلل انداز میں اس غلط فہمی کو دور کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ ''اسلام ہندوستان میں بہ زور شمشیر پھیلا بلکہ اس کی ترقی ان ہی طریقوں سے ہوئی جیسے دنیا کے اور مذاہب میں ہوئی ہے، ہوتی ہے اور ہوگی۔ سید صاحب کے اس مقالہ کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس سلسلے میں ان کے مقالے کا یہ اقتباس درج ہے:

> ''اس سے پہلے کہ محمود غزنوی کی تلوار ہندوستان کی فضا میں غیض وغضب کی بجلی بن کر گرے، ہندوستان کے متعدد گوشے اسلام کے نور سے روشن ہو چکے تھے اور اسلامی تمدن، اسلامی مذاہب، اسلامی طور طریقے پھیل چکے تھے۔ یہاں تک کہ ان میں فرقہ بندیاں شروع ہوگئی تھیں اور اسلام یہاں کے معتبر اور مستند مذاہب میں شمار ہونے لگا تھا اور مسلمانوں کی تعداد کسی قدر کم سہی مگر اس کا سلسلہ دریائے سندھ سے لے کر ایک طرف قنوج تک اور دوسری طرف ملتان کشمیر اور قصدار تک پھیل چکا تھا اور یہاں تک کہ راجاؤں میں اس کی طرف خاصہ میلان پیدا ہوگیا تھا۔'' [۱]

۱۔ مقالات سلیمان، جلد اوّل، صباح الدین عبدالرحمٰن، ص ۲۲۱

بدنصیب کشمیر اور عدل شاہ جہانی کا نقش سنگی : سید صاحب نے اس مقالہ میں کشمیر کی موجودہ صورت حال یعنی مسلمانان کشمیر کی مظلومی کی داستان بیان کی ہے۔ کشمیر تیموریوں کے عہد میں دنیا کی جنت بن گیا تھا لیکن آج یہ جنت دوزخ بن گئی ہے۔ تیموریوں کے عہد میں اس خطہ پر جن صوبے داروں نے حکومتیں کیں، ان میں سب سے مشہور اور نامور ظفر خاں تھا۔ ظفر خاں سے قبل کشمیر میں جو صوبے دار تھا اس نے بہت سی بدعتیں رائج کر دی تھیں۔ ظفر خاں نے بہ حکم شاہ جہانی تمام بدعتوں کا ازالہ کیا۔ ظفر خاں کی انسانی خدمات کے سلسلے میں سید صاحب رقم طراز ہیں:

> ''یہاں صرف اس کے ان انسانی جذبات کا تذکرہ مقصود ہے جو اس نے اہل کشمیر پر اپنے عہد صوبہ داری میں کئے۔ اس نے شاہ جہاں سے ایک فرمان حاصل کیا جس کی رو سے اس کو جدید اصلاحات کا پورا اختیار حاصل ہو گیا۔ پھر اس غرض سے کہ یہ فرد اصلاحات اگر کاغذی صورت میں سرکاری دفاتر میں رہی تو ممکن ہے کہ آئندہ صوبہ دار اس کو کام میں نہ لائیں اور رعایا اس سے ناواقف ہو کر اس سے اجرا اور بحالی کا کوئی مطالبہ نہ کر سکے۔ بنابریں ظفر خاں نے اس فرمان شاہی کو سری نگر کشمیر کی جامع مسجد کے جنوبی دروازہ پر باہر کی طرف ایک سیاہ پتھر پر کھدوا کر نصب کرا دیا تا کہ ہر آیند و روند کی اس پر بے تامل نظر پڑ سکے۔''[1]

ہندوکش عالم گیر کے عہد کی دو عجیب کتابیں : سید صاحب جامعہ ملیہ کی دعوت پر جامعہ تشریف لے گئے۔ وہاں آپ نے اس کتب خانے کی بھی سیر کی جس میں دو عجیب کتابیں نظر آئیں۔ یہ دونوں کتابیں اورنگ زیب عالم گیر کے عہد کی تصنیف ہیں۔ ان میں سے ایک کتاب کا نام مت اچھرا، اور دوسرے کا ردّ الکفر ہے۔ یہ دونوں کتابیں اپنے عہد کے دو مخالف اور متضاد منظروں کو پیش کرتی ہیں۔ اس

۱۔ مقالات سلیمان، جلد اوّل، صباح الدین عبدالرحمٰن، ص ۲۲۴

کتاب سے متعلق سید صاحب لکھتے ہیں:

''ان دونوں کتابوں کی ندرت اور قدر کا سبب یہ ہے کہ یہ دونوں کتابیں اس اورنگ زیب عالم گیر کے عہد کی تصنیف ہیں جس کو اس کے دشمن اور مخالف ہندو کش، ہندو علوم وفنون کو برباد کرنے والا ہندو مذہب کو تباہ کرنے والا، ہندوؤں کو زبردستی مسلمان بنانے والا، مشہور کرتے رہے ہیں۔ لیکن دوسری شہادتوں اور دلیلوں کے ساتھ آج یہ دو مردہ کتابیں زندہ اور گویا شاہد ہیں جو علی الاعلان یہ گواہی دیتی ہیں کہ اس مرحوم بادشاہ پر یہ تمام الزامات تہمت ہیں۔'' [۱]

لاہور کا ایک فلکی آلات ساز خاندان: اس مضمون میں اصطرلاب اور اس کے ہندوستانی صناعوں کی تفصیلات ہیں۔ یہ دراصل جرمنی کے ایک فاضل ڈاکٹر فان کلیوبر کے استفسار کے جواب میں سید صاحب نے لکھا تھا۔ برلن کے عجائب خانہ میں ہندوستانی اصطرلابی ضیاء الدین محمد کا بنایا ہوا ایک کرہ تھا جس پر اس کا نام تاریخ اور مقام کندہ تھا۔ مگر اس کے علاوہ اس کا کچھ حال معلوم نہ تھا۔ چنانچہ ڈاکٹر فان کلیوبر نے سید صاحب سے ضیاء الدین محمد کے وطن وعہد اور اس کے فن وشہرت کے بارے میں استفسار کیا جس کے جواب میں سید صاحب نے یہ گراں قدر مقالہ تحریر کیا جو معارف میں اگست ۱۹۳۳ء میں شائع ہوا۔ [۲]

نالندہ کی سیر: یہ مقالہ فروری ۱۹۳۵ء میں شائع ہوا۔ اس میں نالندہ کی تاریخ پر روشنی ڈالی گئی ہے اور بدھوں کے زمانہ کے تمام بقیہ آثار جس میں نالندہ کا رقبہ اور دفتر، عجائب خانہ، بڑا گاؤں، نالندہ کی تلاش کھدائی، نالندہ کا زمانہ، نالندہ کے بانی، نالندہ کے مشائخ، نالندہ کے موجودہ آثار سب سے بڑا اسٹوپا، خانقاہ، سنگی مندر، نالندہ کا آخیر دور، رصد خانہ کا نشان نہیں، بعض تعمیری خصوصیات، ان تمام ذیلی عنوانات سے متعلق مفید معلومات فراہم کی ہیں اور اس الزام کی تردید کی ہے کہ نالندہ کی خانقاہ مسلمانوں

۱۔ مقالات سلیمان، جلد اوّل، صباح الدین عبدالرحمٰن، ص ۲۲۸

۲۔ ایضاً، ص ۳۲۵

کے زمانہ میں ان کے ہاتھوں سے تباہ و برباد ہوئی۔

تاج محل اور لال قلعہ کے معمار : اس مضمون میں پوری سند کے ساتھ یہ بتایا گیا ہے کہ تاج محل اور لال قلعہ کے اصل معمار نادر العصر استاد احمد لاہوری تھا۔ بعض مغربی مورخین نے یہ افسانہ بھی وضع کر رکھا تھا کہ تاج محل اور لال قلعہ کا معمار ایک اطالوی ماہر تھا۔ سید صاحب نے نہایت تحقیق و تدقیق سے ثابت کیا کہ تاج محل اور لال قلعہ کا معمار حقیقی استاد احمد لاہوری تھا۔ اس مقالہ میں استاد احمد لاہوری کے خاندان اور اس کے ڈیڑھ سو برس کے علمی کارناموں کی سرگزشت بڑی تلاش و جستجو کے بعد پیش کی گئی ہے اور بقول شاہ معین الدین احمد ندوی:

> ''تاریخ میں پہلی مرتبہ اس خاندان کے مورث اعلیٰ نادر العصر استاذ احمد، معمار شاہجہانی لاہوری کے حالات اور اس کے بیٹے لطف اللہ مہندس کی معاصرانہ شہادت سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ تاج محل کا معمار درحقیقت یہی استاذ احمد معمار شاہجہانی لاہوری ہے۔ استاذ احمد ہندسہ، ہیئت اور ریاضیات کا بڑا عالم تھا۔ ان تحقیقات سے وہ تمام افواہیں جو تاج محل کے معماروں کے متعلق مشہور تھیں بے سروپا ہو گئیں۔''[۱]

استاذ احمد معمار کے خاندان کی ایک اور یادگار : (زینب النساء بیگم کے دربار کی ایک اور تصنیف) اس مضمون میں سید صاحب نے اورنگ زیب عالم گیر کی بیٹی زینب النساء بیگم کے علمی دربار کی جو یادگاریں اب تک معلوم تھیں، ان میں سے ایک اور تصنیف کا اضافہ کیا ہے۔ یہ استاد احمد معمار کے پوتے ہیئت کے مشہور درسی کتاب تصریح شرح، تشریح الافلاک کے مصنف ملا امام الدین ریاضی بن لطف اللہ مہندس لاہوری کا معانی و بیان میں ایک رسالہ ہے جس کا نام بیانیہ ہے۔ ملا خیر اللہ مہندس کے چند نئے رسائل میں جس میں رسالہ السبع الثوابت، رسالہ القدسیہ فی مذہب الصرفیہ الحقیقۃ اور رسالہ مدخل کا تعارف کرایا ہے۔ مضمون کے آخر میں امام الدین کا تتمہ لکھا ہے۔

قنوج : اس مقالہ میں سید صاحب نے دکھایا ہے کہ بعض عرب سیاحوں اور جغرافیہ نویسوں نے

۱۔ مقالات سلیمان، جلد اوّل، صباح الدین عبدالرحمٰن، ص ۳۹۹

سندھ کے علاقہ میں ایک شہر کا نام قنوج بتایا ہے۔ایک خیال تو یہ ہے کہ قنوج ایک ہی ہے جو اودھ میں موجودہ کان پور کے پاس موجودہ فرخ آباد ضلع میں واقع ہے۔اس کے علاوہ سندھ میں کوئی دوسرا قنوج نہ تھا۔

سند معافی جزیہ: اس مقالہ میں صباح الدین صاحب نے ذکر کیا ہے کہ:

''جامعہ ملیہ دہلی کے کتب خانہ میں سید صاحب کو ایک قلمی کتاب ملی جس کا نام نگار نامہ ہے اور جس کے مصنف کا نام منشی لال ہے گو تاریخ نہیں معلوم مگر قرینہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ عالم گیر کے زمانہ یا اس کے چند دنوں کے بعد کی تصنیف ہے۔اس کتاب کی تالیف کی غرض، دفاتر کے منشیوں کو سرکاری فرامین کی تحریر کے نمونوں کی تعلیم ہے۔اس میں ایک تحریر کاشت کاروں کے معافی جزیہ کی سند کی نقل ہے۔''[۱]

خطبۂ صدارت شعبۂ تاریخ ہند ازمنۂ وسطیٰ : یہ مقالہ دراصل سید صاحب کا وہ خطبہ صدارت ہے جو انھوں نے آل انڈیا ہسٹری کانگریس منعقدہ مدراس دسمبر ۱۹۱۲ء میں ازمنہ وسطیٰ کی تاریخ کے بارے میں دیا تھا۔اس خطبہ میں سید صاحب نے ہندوستان کی عمومی تاریخ کے ایک خاص نقطہ نظر سے اپنے خیالات پیش کئے ہیں۔اس خطبہ میں انھوں نے ازمنہ وسطیٰ کی تاریخ ہند کے ماخذ و مراجع پر تفصیل سے روشنی ڈالی ہے۔اور مورخوں کو یہ صلاح دی ہے کہ ہمیں ہندوستان کی تاریخ کی ایسی تدوین کرنی چاہئے جس سے ہندوؤں اور مسلمانوں میں آپسی تعلقات قائم ہوں اور اتحاد و اتفاق، محبت و یگانگت کی فضا ہموار ہو اور ایسی تاریخ لکھنے سے پرہیز کیا جائے جس سے اتحاد و یکجہتی ریزہ ریزہ ہو جائے۔سید صاحب نے ان سب پر ناقدانہ تبصرہ کیا ہے اور کانگریس کو خطاب کرتے ہوئے آخر میں مورخین کو یہ مفید اور قیمتی مشورہ دیتے ہیں۔ سید صاحب خطبہ کے اختتام پر فرماتے ہیں:

''ہندوستان کی جو تاریخ لکھی جائے اس کا مقصد ہندوستان کے متفرق اجزا کو باہم جوڑنا ہو توڑنا نہ ہو۔حال کو ماضی کی ناگواری کی تلخی کو بڑھا کر کیوں برباد کیا جائے اور کیوں مستقبل کے لئے یہ کوشش جاری رہے کہ وہ کبھی خوش آئند نہ

۱۔ مقالات سلیمان، جلد اوّل، صباح الدین عبدالرحمٰن، ص ۳۳۱

ہو سکے۔

ہندوستان کے مورخو! تم ہندوستان کی صرف تاریخ نہ لکھو بلکہ اپنے کارناموں سے ہندوستان کی نئی تاریخ بھی بناؤ، نیک ارادہ سے اٹھو خدا تمھاری مدد کرے گا۔''[۱]

ہندی الاصل اور ہندی النسل مسلمان سلاطین: اس مقالہ میں سید صاحب نے دہلی، سندھ، ملتان، کشمیر، گجرات اور دکن کے ان سلاطین اور فرمانرواؤں کا ذکر کیا ہے جو اپنی اصل ونسل کے لحاظ سے ہندی یا ہندوی تھے اور دکھایا ہے کہ ان سلاطین نے دوسرے سلاطین کے مقابلہ میں ہندوستان کی کم خدمت نہیں کی۔ سید صاحب اس موضوع کے متعلق لکھتے ہیں:

''تقریر کے موضوع بحث یعنی ''ہندی الاصل اور ہندی النسل سلاطین'' سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ ہندوستان کے مسلمان شاہی خاندان سب کے سب غیر ملکی نہ تھے بلکہ ہر صوبہ میں ایسے مسلمان بادشاہ اور ان کے خاندان گزرے ہیں جو اپنی اصل ونسل کے لحاظ سے ہندی یا ہندوی تھے۔ اس لئے تمام مسلمان شاہی خاندانوں کو غیر ملکی سمجھنا کسی طرح صحیح نہیں۔ دوسری بات یہ ثابت ہوتی ہے کہ اسلام نے اپنی سیاست میں وہ راستہ اختیار نہیں کیا جس پر دوسری قومیں گامزن ہیں۔ جنھوں نے اصل ونسل اور قومیت کو حاکمیت اور محکومیت کا معیار قرار دے دیا ہے۔ اسلام کی نظر میں قومیت اور وطنیت کو کوئی اہمیت حاصل نہیں ہے۔ اور اس کا منتہائے نظر زندگی کا ظاہری اور باطنی اسلوب وہ ہے جس کو اصطلاح میں ''دین'' کہتے ہیں۔ جب کبھی کسی غیر مسلم نے معتقدات اسلام اور قانون اسلام کی زندگی کو قبول کیا ہے تو اس کے لئے

۱۔ مقالات سلیمان، جلد اوّل، صباح الدین عبدالرحمٰن، ص ۳۵۲۔۳۵۳

ترقی کی غیر محدود وسعتیں پیدا ہوگئی ہیں۔ یہاں تک کہ باطنی حیثیت سے ایک نومسلم کبھی علم اور دین کی امامت اور پیشوائی کے درجہ کو پہنچ گیا ہے تو دوسری طرف سلطنت اور حکومت کے تخت اس کے لئے بار بار بچھائے گئے ہیں۔'' [۱]

یہ تاریخی مضامین سید صاحب کے ان تمام تاریخی مقالات کا مجموعہ ہیں جو انھوں نے ہندوستان کی تاریخ کے مختلف پہلوؤں پر لکھے ہیں۔

مقالات سلیمان جلد دوم (شاہ معین الدین احمد ندوی)

یہ مجموعہ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کا مرتب کردہ ہے جو ۱۹۶۸ء میں دارالمصنفین سے شائع ہوا۔ یہ جلد علمی مقالات پر مشتمل ہے لیکن اس میں تاریخ سے بھی براہ راست تعلق قائم ہے۔ اس میں درج ذیل مقالات کا ذکر کیا گیا ہے۔

ہندوستان میں علم حدیث: اس میں ہندوستان میں علم حدیث کی ابتدائی تاریخ اور وہ ہندوستان میں کس طرح پھیلا؟ کس طرح عہد بہ عہد ترقی کی؟ ان سب کا مختصر ذکر کیا ہے۔ سید صاحب لکھتے ہیں:

''اہل تاریخ پر روشن ہے کہ ہندوستان میں اسلام دو راستوں سے داخل ہوا۔ خشکی سے اور تری سے۔ خشکی کا راستہ درّہ خیبر کا تھا جہاں سے ترکوں، پٹھانوں اور مغلوں نے چوتھی صدی کے آخر اور پانچویں صدی کے آغاز سے داخل ہونا شروع کیا۔ لیکن ان سے صدیوں پہلے عرب تاجر اور سوداگر کی حیثیت میں سندھ اور ملیبار سے لے کر گجرات تک بحر ہند کے پورے سواحل پر پھیل چکے تھے۔ وہ اپنے ساتھ اپنا دین، اپنا قرآن اور اپنے علوم بھی لائے تھے اور اس سے سالہا سال پہلے کہ اسلام کا کوئی تیغ زن سپاہی اس سرزمین پر قدم رکھے۔

۱۔ مقالات سلیمان، جلد اوّل، صباح الدین عبدالرحمٰن، ص ۳۵۵

یہاں مسلمان عربوں اور عراقیوں کی نو آبادیاں قائم تھیں اور مسجدیں تعمیر اور نو آباد تھیں۔ یہی مسجدیں اسلام کی ابتدائی درسگاہیں تھیں جس میں وہ بیٹھ کر قال اللہ اور قال الرسول کا آوازہ بلند کرتے تھے۔'' [۱]

اس مقالہ کے ذیلی عناوین میں صحابہ اور ہندوستان، ہندوستان میں پہلا محدث، ہندوستان میں ایک تابعی، ہندوستان کے ایک تاجر تبع تابعی، دونو مسلم سندھی محدث، درۂ خیبر کے راستہ سے پہلا محدث، دوسرا محدث صنغانی، علم دانائی اور دانش مندی اور حدیث سے بے توجہی، بہمنیہ اور علم حدیث، سلاطین گجرات اور علم حدیث، ایران میں صفویوں کے تعصب کا اثر، ہندوستان میں علم حدیث کا آغاز، حافظ مسجاوی کے تلامذہ، دہلی کے مرکز میں پہلا محدث، پہلا شارح بخاری، حافظ ابن حجر کے تلامذہ، عہد اکبری، محدث سرہندی، ابوالحسن بکری کے تلامذہ، شیخ علی متقی، عبدالوہاب متقی، محمد طاہر فتنی، متقی کے تلامذہ، شیخ بہلول لودی، شیخ عبدالنبی گنگوہی، ملا قاری اور ان کے استاد، درس بخاری لاہور میں، شیخ عبدالحق محدث دہلوی، جوہر ناتھ کشمیری، شیخ محمد قاسم، شیخ عبدالحق دہلوی کا سلسلہ۔ ان تمام عنوانات پر مختصراً سبھی محدثین کے حالات زندگی اور درس وتدریس کا ذکر کیا ہے۔

استدراک واضافہ کے عنوان کے تحت شیخ بہاء الدین زکریا ملتانی سہروردی کا ذکر کیا ہے جو مضمون کے پہلے حصہ میں نظر انداز ہو گیا تھا۔ اس کے علاوہ مولانا برہان الدین محمود، مولانا کمال الدین زاہد دہلوی، حضرت نظام الدین سلطان الاولیاء کا ذکر بھی تفصیل سے کیا ہے۔

نصیر الدین محمود چراغ دہلوی، مولانا شمس الدین یحیٰ اودھی، مولانا فخر الدین زرادی جو حضرت نظام الدین سلطان الاولیاء کے مریدوں میں تھے اور بڑے محدثین تھے ان کا ذکر کیا ہے۔

شیخ شرف الدین یحیٰ منیری بہاری بھی احادیث نبوی کے کسی مجموعہ سے مشرف تھے۔

شیخ بھکھاری کاکوری: یہ شیخ عبدالرزاق کے مرید تھے اور اپنے وقت کے بڑے محدث تھے۔

۱۔ مقالات سلیمان جلد دوم، شاہ معین الدین احمد ندوی، ص ۳

اصول حدیث میں منہج نام کی ایک کتاب بھی ان کی تصنیف ہے۔

اس کے علاوہ کشمیر میں سلسلۂ حق، صوبہ بہار میں علم حدیث اور سلسلۂ حق کے عنوان پر بحث کرتے ہوئے شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی، سلسلہ مجددیہ، عبداللہ لاہوری، ابوالحسن سندھی، حاجی عبدالولی طرخانی کشمیری، شیخ محمد حیات سندھی، علامہ غلام علی آزاد بلگرامی، شاہ محمد فاخرالہ آبادی نے مدراس میں علم حدیث، شیخ نورالدین احمد آبادی گجراتی، شاہ ولی اللہ صاحب دہلوی، شاہ صاحب کی اولاد امجاد شاہ عبدالعزیز صاحب، شاہ رفیع الدین، شاہ عبدالقادر، شاہ ولی اللہ کے تلامذہ، شاہ عبدالعزیز شاہ رفیع الدین کے تلامذہ، دلی کے دو چراغ، مرزا حسن علی محدث لکھنوی، مولانا حسین احمد ملیح آبادی، شاہ محمد اسحاق، شاہ عبدالغنی صاحب مجددی، شاہ عبدالغنی صاحب کے تلامذہ، مولانا عبدالحیٔ بدھانوی اور مولانا اسمٰعیل شہید کے تلامذہ، مولانا سخاوت علی صاحب جونپوری کے مختصر حالات درس وتدریس اور شاگردوں کا ذکر کیا ہے۔

فرنگی محل اور علم حدیث کے عنوان کے تحت سید صاحب لکھتے ہیں:

> ''لکھنؤ میں فرنگی محل کا علمی مرکز عالمگیر کے عہد میں قائم ہوا۔ ملا قطب الدین اور ملا نظام الدین رحیم اللہ کے عہد سے لے کر مولانا عبدالحلیم تک اس خانوادۂ فضل وکمال کی علمی کوششوں کی جولانگاہ، منطق اور اصول کی کتابیں ہیں اور تعجب ہے کہ اس قدر طویل زمانہ تک ہندوستان کی یہ مشرقی درسگاہ حدیث کے ترانۂ قدس سے ناآشنا رہی۔''[1]

اس مقالہ میں جن محدثین کا نام اور درس وتصنیف کا ذکر ہوا ہے اس میں ملا نظام الدین، مولانا بحرالعلوم، ملا مبین، ملا حیدر، مولانا عبدالرزاق، مولانا عبدالحلیم، مولانا محمد نعیم صاحب، مولانا عبدالحیٔ، مولانا عبدالباری صاحب مرحوم کا نام خصوصیت کا حامل ہے۔

۱۔ مقالات سلیمان جلد دوم، شاہ معین الدین احمد ندوی، ص ۴۸۔۴۹

ہندوستان میں علم حدیث کی تاریخ کے چند گم شدہ اوراق : اس سلسلے میں سید صاحب لکھتے ہیں:

''ہندوستان میں علم حدیث کی ابتدائی تاریخ کے سراغ لگانے میں جو کوششیں آغاز مضمون میں کی گئی تھیں مزید تلاش سے اس کے چند نئے اوراق بھی ہاتھ آئے ..... اس سلسلہ میں یہ خصوصیت کے ساتھ دکھایا گیا ہے کہ اہل عرب کو علم حدیث اور اس کی اشاعت کے ساتھ خاص شغف رہا ہے۔ اس لئے جہاں ان کے فتوحات کا قدم پہنچا وہیں قرآن پاک کے بعد علم حدیث کی درسگاہ بھی قائم ہوگئی۔ ہندوستان کا سب سے پہلا حصہ جو عرب فتوحات کے دائرہ میں داخل ہوا وہ سندھ تھا۔ جس کا ۹۶ھ سے تقریباً ۱۵۰ھ تک براہ راست دمشق و بغداد کی خلافت سے تعلق قائم رہا۔ پھر وہاں کے دو شہروں منصورہ اور دیبل میں دو مقامی اسلامی ریاستیں قائم ہوئیں۔ منصورہ کی اسلامی ریاست محمود غزنوی کے حملہ سندھ تک ۴۱۶ھ تک قائم رہی اور اس کے بعد دیبل کی اسلامی ریاست ۷۵۲ھ تک یعنی فیروز شاہ خلجی کے زمانہ تک باقی رہی۔ گو اس کے بعد بھی ۹۲۷ھ تک قائم رہی مگر خود مختار نہ رہی۔ بہر حال اس سے اندازہ ہوگا کہ پہلی صدی ہجری کے آخر سے اس وقت تک جب تک درہ خیبر سے آنے والی قوموں نے آکر ان کو بے دخل نہیں کر دیا۔ وہ اس سرزمین میں اسلام اور اسلامی علوم کے حافظ و محافظ رہیں ..... ہندوستان کے شہروں میں سے سندھ، منصورہ، دیبل اور لاہور کے نام اس میں ملتے ہیں۔ دہلی کا نام اس لئے نظر نہیں آتا کہ اس زمانہ تک ۵۶۲ھ میں دہلی اسلام کے دائرہ حکومت میں نہیں آئی تھی۔''[۱]

ہندوستان میں کتب حدیث کی نایابی کے بعض واقعات : اس مقالے میں سید صاحب لکھتے ہیں کہ:

> ''سلاطین تیموریہ کے کتب خانے اپنی کتابوں کی تعداد، ندرت اور جامعیت کے لحاظ سے عجائب روزگار تھے۔ ان کی تباہی کے بعد ان کی کتابیں ہندوستان اور یورپ میں منتشر اور پراگندہ ہوگئیں۔ اور آج بھی کثرت کے ساتھ یہ

۱۔ مقالات سلیمان جلد دوم، شاہ معین الدین احمد ندوی، ص ۵۸

کتابیں کتب خانوں میں اور کتب فروشوں کے پاس ملتی ہیں ان میں تفسیر، فقہ، اصول، تصوف، کلام، فلسفہ، ریاضیات، ادب، دواوین، تاریخ، ہر فن کی کتابیں ملتی ہیں۔ مگر حدیث کا کوئی نسخہ ان میں سے برآمد نہیں ہوا۔ میں نے اس نظر سے خاص طور پر یورپ اور ہندوستان کی مطبوعہ فہرستیں دیکھی ہیں۔'' [۱]

لیکن ایک عجیب بات یہ ہے کہ دہلی کے حدود وسلطنت سے باہر جو مستقل اسلامی حکومتیں اطراف ہند میں قائم تھیں ان میں جن کا تعلق عرب سے تھا وہاں کچھ نہ کچھ سراغ کتب حدیث کا ملتا ہے۔ اس سلسلہ میں صحیح بخاری کا وہ نسخہ ہے جو بنگال کی سلطنت سادات کی تنہا یادگار ہے۔ دسویں صدی ہجری کے شروع میں بنگال میں عرب سادات کی حکومت قائم تھی جس کا ایک سربراہ علاء الدین شاہ حسین بن سید اشرف الحسینی تھا۔ اس کا زمانہ ۹۰۵ھ سے ۹۲۷ھ تک ہے۔ محمد بن یزدان بخشی معروف بہ خواجگی شیروانی ایک عالم تھے۔ انھوں نے اپنے ہاتھ سے صحیح بخاری کا ایک نہایت عمدہ نسخہ تین جلدوں میں تیار کیا تھا اور سلطان مذکور کی خدمت میں پیش کیا تھا۔ یہ مکمل نسخہ مانکی پور پٹنہ کے مشرقی کتب خانہ میں موجود ہے۔

رباعی: اس مقالہ میں سید صاحب نے صنف رباعی پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس میں رباعی کی وجہ تسمیہ، رباعی کے دوسرے نام، رباعی کی ایجاد، رباعی کی تاریخ، حکماء اور صوفیہ نے رباعی کیوں اختیار کیا۔ ان سب پر سیر حاصل بحث کی ہے جس سے صنف رباعی کی پوری تاریخ سامنے آتی ہے۔

محمد بن عمر الواقدی اور سیرت میں علمائے مستشرقین کی ایک نئی غلطی۔

محمد بن عمر الواقدی کا شمار ابتدائی مصنفین سیرت میں ہوتا ہے۔ سیرت میں اس کی ایک کتاب کتاب المغازی ہے جس میں عہد نبوت کی لڑائیوں کا حال درج ہے۔ واقدی نے دوسرے مصنفین کی بہ نسبت ایک نیا طرز اختیار کیا کہ پورے واقعہ پورے غزوہ کا نام شروع میں گنا کر ایک دلچسپ مسلسل داستان کی صورت میں پورے واقعہ یا پورے غزوہ کو بیان کر دیا ہے جس سے اس کی کتاب کو بہت پسند کیا

۱۔ مقالات سلیمان جلد دوم، شاہ معین الدین احمد ندوی، ص ۵۷۔۵۸

گیا اور خلفائے عباسیہ اور دیگر امرائے برامکہ کی نگاہ میں اس نے بڑا رتبہ پیدا کیا۔ لیکن امراء وسلاطین کے یہاں اس کو جتنی عزت ملی اسی قدر علمائے زمانہ، ائمہ حدیث اور معتبر بزرگوں کی مسند اعتبار سے اس کو دوری حاصل ہوتی گئی۔ تمہید بیان کرنے کے بعد سید صاحب اس کے اصل مقصد کی طرف رجوع کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ:

''مانچسٹر گارجین اخبار (انگلستان) میں ایک مضمون نکلا ہے جس میں مضمون نگار نے ایسے فقرے لکھے ہیں جن سے حضور انورؐ کی شان میں گستاخی ہوتی ہے۔ من جملہ ان کا ایک فقرہ یہ ہے کہ ''آپؐ ایسے بزدل ڈرپوک تھے کہ بدر میں جب خون بہتے دیکھا تو آپؐ کو غش آ گیا۔''[1]

ایک مسلمان مضمون نگار سے اس واقعہ کا حوالہ دریافت کیا تو اس نے مارگولیوتھ کی کتاب کا حوالہ دیا۔ مارگولیوتھ نے اس واقعہ کو اپنی کتاب ص ۲۵۹ میں بے حوالہ نقل کیا ہے۔ اس لئے مارگولیوتھ صاحب سے اس کا ماخذ دریافت کیا گیا تو انھوں نے واقدی کے جرمن ترجمہ دلہاؤسن کا حوالہ دیا۔ اس پر واقدی کے معتبر اور غیر معتبر ہونے کی بحث چھڑ گئی۔ جناب خواجہ کمال الدین صاحب نے پچھلی ڈاک سے یہ پوری خط و کتابت میرے پاس بھیج دی ہے۔ اس کو پڑھ کر یورپین مستشرقین کے علمی تبحر اور فضل وکمال کی ایک اور عمدہ مثال ہاتھ آ گئی۔

اس مقالہ میں واقدی کی حیثیت، واقدی کی کتاب کی حیثیت، واقعہ کی اصلیت کے ذیلی عنوان پر بحث کی ہے۔ اس مضمون سے متاثر ہو کر پروفیسر گولیم نے ان اصولوں سے واقفیت حاصل کرنے کی کوشش کی جن کی بنیاد پر کسی مصنف یا راوی کے متعلق فیصلہ کیا جاتا ہے یا اس کی روایت کو رد یا قبول کیا جاتا ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں سید صاحب نے جنوری ۱۹۲۷ء میں ''پھر واقدی'' کے عنوان سے دوسرا مضمون قلم بند کیا جس میں پروفیسر گولیم (درہم یونیورسٹی) انگلینڈ کے سوالات کا مفصل جواب دیا ہے۔

۱۔ مقالات سلیمان جلد دوم، شاہ معین الدین احمد ندوی، ص ۶۴۔۶۵

سنت : اس مقالہ کے تحت سید صاحب نے رسالہ نگار کے ایڈیٹر نیاز فتح پوری کے ایک مضمون کو نشانہ تنقید بنایا ہے۔ انھوں نے سید صاحب کو اسلامی احکام کی ایک طویل فہرست دی تھی جو قرآن پاک میں مذکور نہیں اور ان کا ماخذ صرف حدیث ہے۔ مجھے تو ان میں سے اکثر احکام قرآن پاک میں نظر آتے ہیں۔ اس سلسلے میں سید صاحب نے اصول فہم قرآن، تفاوت ذہن، احادیث سے چارہ نہ تھا، روایت سے چارہ نہیں، اسلام کی تاریخ برباد ہو جائے گی، احادیث کا کتنا حصہ قابل بحث ہو سکتا ہے، احادیث قرآن سے ماخوذ ہیں، حدیث و سنت میں فرق، عملی روایت میں اختلاف، سنت کی حقیقت، کتاب و سنت، سنت اور بدعت، کیا سنت عبرانی لفظ ہے، سنت اور بدعت کا معیار کے ذیلی عنوان پر اپنے خیالات قلم بند کئے ہیں۔

پھر بحث سنت (کچھ اور اختراعات والزامات) : اس مقالہ میں سید صاحب نے لکھا ہے کہ مذکورہ مضمون سنت کے چھپنے کے بعد مدعی مذکور نے پہلے خط و کتابت کے ذریعہ سوال و جواب کیا اور اس کے بعد ایک طویل مضمون اپنے مدعا کے اثبات اور میری تردید میں چھپوایا..... لیکن موصوف کے مضمون کے لب ولہجہ اور طنز و انداز کے جواب کی توقع کم از کم معارف میں نہ رکھنی چاہئے۔

مجھے یہ ظاہر کرنے میں خوشی ہے کہ معارف کے اس مضمون سنت کو اللہ تعالیٰ نے توقع سے زیادہ کامیابی بخشی۔ موافقین کے علاوہ بعض مذبذب دوستوں کے شکوک بھی اس سے دور ہوئے۔ مگر افسوس ہے کہ اصل مخاطب کو اس سے تشفی نہیں ہوئی بلکہ اپنی غلطی یا غلط فہمی پر ان کا اصرار بڑھ گیا۔ موصوف کو میرے انگریزی نہ جاننے پر تاسف ہے۔ یہ تاسف مجھے خود بھی ہے مگر ان کی تسلی کے لئے بطور اظہار واقعہ یہ امر ان پر ظاہر کر دیتا ہے کہ ان کی آرزو کے مطابق کم از کم اتنی انگریزی جانتا ہوں کہ انسائیکلو پیڈیا کے تاریخی، مذہبی مضامین پڑھ کر سمجھ سکوں۔ انہیں اس کا اطمینان رکھنا چاہئے۔

مضمون زیر بحث میں دو قسم کی بحثیں ہیں۔ ایک لفظی اور دوسری معنوی۔ اس سلسلے میں سید صاحب نے مسنات اور سنت، مشنا توراۃ، مشنا، مسنا اور سنت، مثناۃ کے عنوان سے مفصل بحث کی ہے۔ آخیر میں خاتمہ میں رقم طراز ہیں:

''بہر حال اس سخت گیری کی پالیسی سے ہم اپنے حریف کو دق کرنا نہیں چاہتے بلکہ یہ عرض کرتے ہیں کہ خواہ آپ توراۃ کی پانچویں کتاب مراد لیجئے یا تلمود کی کتاب دونوں کا ماخذ عبرانی لفظ مشنا اور رشنہ ہے جس کے معنی بدلنے، دہرانے یا دوسرا ہونے یا دوبارہ ہونے کے ہیں یا سیکھنے کے ہیں۔ اور سوائے آخیر معنی کے الفاظ مثنہ، مثنی، تثنیہ اور مثنی اس کے مرادف ہیں اور عربی لفظ سنت کو جس کے لغوی معنی راستہ اور طریق کے اور اصطلاحی معنی طریق محمدی کے ہیں اس سے ادنیٰ سا بھی تعلق نہیں ..... آخیر میں ایک اور بات عرض کردوں کہ مثنا زبانی روایات کو بھی نہیں کہتے بلکہ اس کتاب کا نام ہے جس میں یہود نے اپنی زبانی روایات کو جمع کیا ہے۔'' [۱]

عرب وامریکہ: یہ مضمون سید صاحب نے ضمیمہ کے طور پر لکھا ہے۔ یہ دراصل اسی کتاب کا حصہ تھا جو طباعت کے وقت بعض تحقیقات کے تشنہ رہ جانے کی وجہ سے شائع نہ ہوسکا تھا۔ اس میں امریکہ کی دریافت اور عربوں سے اس کے روابط پر بحث کی گئی ہے۔ عام طور سے یہ مشہور ہے کہ امریکہ کو ۱۳۹۸ء میں کولمبس نے دریافت کر کے پرانی دنیا کو نئی دنیا سے متعارف کرایا۔ مگر یہ صحیح نہیں ہے کہ کولمبس سے پہلے اس نئی دنیا پر پرانی دنیا کے کسی شخص کے قدم نہیں پہنچے تھے۔ سید صاحب نے قدیم وجدید تحقیقات اور بعض سیاحوں کے بیانات اور جدید مورخین کے آراء وخیالات کی روشنی میں ثابت کیا ہے کہ کولمبس سے پہلے افریقی عرب وہاں پہنچ چکے تھے اور آج بھی وہاں ان کی آبادیاں موجود ہیں جن کا علم خود امریکہ کو بھی بہت بعد میں ہوا۔

اس مضمون کے عنوان کے تحت سید صاحب نے رائج ربع مسکوں، غانہ، شمالی روس اور بحر بیرنگ، انتہائی آبادی، زمین گول ہے اور جذب وکشش سے قائم ہے، زمین فوقانی اور تحتانی حصے اور رات اور دن

۱۔ مقالات سلیمان جلد دوم، شاہ معین الدین احمد ندوی، ص ۱۵۷

کرۂ ارض کے دوسری جانب آبادی، ماورائے بحر ظلمات، نئی تحقیقات، پرانے عربوں کی امریکہ میں آبادی، ان تمام عنوانات پر مفصل روشنی ڈالی ہے۔

اسلامی رصد خانے : سید صاحب کا یہ مقالہ ۱۹۰۹ء میں ماہنامہ الندوہ میں شائع ہوا جس میں اسلامی عہد کے رصد خانوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ اس مضمون میں سید صاحب نے سب سے قدیم رصد خانہ جس کا تاریخ میں ذکر ہے، متون کا رصد خانہ ہے۔ اسی رصد خانہ میں سب سے پہلے مدار صیفی کی تعین کی گئی ہے اور اس آلہ کا استعمال ہوا جس کو قائمہ (ہیلو میٹر) کہتے ہیں۔ اس کے بعد تیمور، خارس، منالاؤس، ایرخس نے رصد خانے قائم کئے لیکن مسلمانوں سے پہلے سب سے مشہور رصد خانہ اسکندریہ کا وہ رصد خانہ ہے جس کا مہتمم بطلیموس تھا۔ بطلیموس پہلا شخص ہے جس نے ایک منتظم رصد خانے کی بنیاد ڈالی۔ رصد کے بعض ضروری آلات ایجاد کئے اور اور فیثا غورث کے خلاف زمین کو کائنات کا مرکز قرار دیا۔

مسلمانوں نے آلات رصد کا بنانا صابیوں سے سیکھا : دور عباسی میں علوم وفنون کے ساتھ آلات سازی کو بھی ترقی ملی اور اس کی کافی اشاعت ہوئی۔ چوتھی صدی کے بعد سب سے بڑا ماہر آلات خازن مزنی المتوفی ۴۳۰ھ ہے۔ تیرہویں صدی عیسوی میں ابن راجل بھی ایک مشہور آلات ساز گزرا ہے اور اس کی تصنیف بھی آلات سازی سے متعلق ہے۔ سید صاحب نے آلات رصد کا بھی تذکرہ کیا ہے جن کو خاص مسلمانوں نے ایجاد کیا ہے۔ سید صاحب نے اس قسم کے آلات کا حال بھی بیان کیا ہے جو درج ذیل ہیں۔

لنبہ، ذات الاوتار، ذات السمت، والارتفاع، مشبہ بالمناطق، ربع تام، سدس فخری، عصایا اسطرلاب خطی، ان سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں نے آلات رصد کے بنانے میں کس حد تک کوشش کی اور اس کی بڑی دلیل ان عظیم الشان رصد خانوں سے ملتی ہے جو اسلامی ملکوں میں وقتاً فوقتاً قائم ہوتے رہے۔ پہلے اسلامی رصد خانہ، رصد مامونی بغداد، رصد مامونی دمشق، رصد دینوری، رصد بتانی، رصد بوزجانی، رصد ابن اعلم، رصد شرف الدولہ، رصد حاکمی، رصد ملک شاہی، رصد بیرونی، رصد علاء الدولہ، رصد کوشیار،

رصد ابن زرقال، رصد مامونی مصر، رصد مسترشد باللہ، رصد فہاد شروانی، رصد مراغہ، رصد ابن الحماد، رصد شاطر، رصد تقی الدین، رصد شمس الدین، رصد الغ بیگ، رصد فیروز شاہی، رصد شاہ جہانی، رصد محمد شاہی، ان تمام رصد خانوں کا ذکر ہے۔

کتب خانہ اسکندریہ : کتب خانہ اسکندریہ پر یورپ کے اعتراضات کی تردید سب سے پہلے علامہ شبلی نے اپنے مقالہ میں کی تھی جس کو کافی مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس کے بعد بعض مغربی اور ان کے ہم نوا مورخین نے اس پر بھی چند اعتراض وارد کئے جس پر سید صاحب نے اپنے اس مقالہ کتب خانہ اسکندریہ کے ذریعہ ان مورخین کی بھرپور تردید علامہ شبلی کے حوالے سے کی ہے۔

کتب خانہ اسکندریہ کی جو داستان تصنیف ہوئی ہے اس کے ہیرو کا نام یحییٰ نحوی ہے۔ یحییٰ نحوی ہی حضرت عمر بن العاص کی خدمت میں آتا ہے وہی ان سے کتب خانہ کی تاریخ بیان کرتا ہے۔ مسٹر بٹلر نے اپنی تصنیف ''فتح مصر'' میں جہاں اسکندریہ کا ذکر کیا ہے وہاں کتب خانہ اسکندریہ کے متعلق ثابت کیا ہے کہ عربوں کی فتح سے پہلے یہ کتب خانہ برباد ہو چکا تھا اور سب سے بڑی دلیل یہ قائم کی کہ اس روایت (جس میں عربوں کے ہاتھ سے کتب خانہ کا برباد ہونا بیان کیا گیا ہے) وصفی اور جعلی ہونے کی سب سے زیادہ قطعی شہادت یہ ہے کہ اس روایت کا ہیرو یعنی یحییٰ نحوی کا اس عہد میں وجود تاریخی اسناد کے بالکل مخالف ہے۔

مسٹر بٹلر نے اپنی تصنیف ''فتح مصر'' میں اس بحث کے متعلق ایک خاص باب قایم کیا ہے۔ جس میں واضح دلائل سے حسب ذیل نتائج اخذ کئے ہیں۔ سید صاحب کتب خانہ اسکندریہ کی بربادی سے متعلق لکھتے ہیں:

> ''کتب خانہ اسکندریہ کی بربادی کے واقعہ کے سلسلے میں جن موافق اور مخالف اشخاص نے قلم اٹھایا انھوں نے ایک استدلال کی طرف توجہ نہیں کی۔ ہم اوپر لکھ آئے ہیں جن عربی مورخین مثلاً قفطی، ابوالفرج ملطی وغیرہ نے اس واقعہ کا ذکر کیا ہے وہ سب کے سب آخری چھٹی صدی یا ابتدائی ساتویں صدی کے

مورخین ہیں۔ بغدادی اور قفطی صلاح الدین کے دربار سے متعلق تھے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ اس زمانہ میں اس واقعہ کو بڑی شہرت حاصل تھی اور یہ وہ زمانہ ہے جب تمام دنیا کے مسیحی صلیبی جنگ کے جوش سے بھرے ہوئے مسلمانوں کے خلاف سیکڑوں افترأت مشہور کر رکھے تھے۔ ہوسکتا ہے کہ ان ہی بازاری گپّوں کو ایک دو مورخین نے اپنی کتابوں میں بھی جگہ دے دی ہو۔'' [۱]

اسلامی ہندوستان کا عہد آخر اور علوم جدیدہ: اس مضمون میں سید صاحب نے ہندوستان کے عہد اسلامی کے آخری زمانہ میں نئے علوم کے آغاز اور ارتقاء کی تفصیل قلم بند کی ہے۔ فرماتے ہیں:

''اس سلسلہ میں سب سے پہلا کام ۱۲۷ھجری میں دلی میں جدید طرز پر ایک رصد خانہ کا قیام ہے۔ محمد شاہ کا حکم اور راجہ سوائی سنگھ والی جے پور کے اہتمام سے یہ رصد خانہ قائم ہوا تھا۔ اس رصد خانہ کی تعمیر پر بیس لاکھ صرف ہوئے تھے۔ مرزا خیر اللہ مہندس اور دیگر علمائے ہند و ایران کے علاوہ متعدد یورپین ماہرین علم ہیئت اس کی تعمیر و تنظیم میں شریک تھے۔ بہت سے آلات اس میں یورپ سے منگوا کر نصب کئے گئے تھے۔

دلی جب تباہ ہوئی تو اس خمیر سے دو اور گھروندے تیار ہوئے۔ لکھنؤ اور حیدر آباد۔ ان کے علاوہ انگریزوں کی نوخیز حکومت کا مرکز کلکتہ تھا۔ اس مضمون میں سید صاحب نے ان تینوں مقام کا ذکر بھی کیا ہے۔

رومن کیتھولک تاریخ کی چند من گھڑت کہانیاں : اس مضمون سے متعلق سید صاحب لکھتے ہیں:

''کلکتہ کے ایک مشنری کالج میں (سینٹ زویر کالج) کے ہائی اسکول سکشن میں ایک کتاب (کیتھولک چرچ ہسٹری) طالب علموں کو پڑھائی جاتی تھی جس میں ایک باب اسلام کے سخت خلاف ہے..... یہ ایک ایسی کتاب ہے جو مذہبی رواداری ہی کے خلاف نہیں بلکہ علم اور واقفیت کے بھی خلاف ہے۔ عیسائیوں نے ہمیشہ مسلمانوں کو یہ طعنہ دیا ہے کہ انھوں نے تلوار کے زور سے

۱۔ مقالات سلیمان جلد دوم، شاہ معین الدین احمد ندوی، ص ۲۲۰

اپنے مذہب کو پھیلایا ہے۔ یہ واقعہ صحیح ہو یا غلط، بہر حال انھوں نے جھوٹ اور فریب سے اپنے مذہب کو کبھی نہ پھیلایا جیسا کہ اس زمانہ کی مشنریوں کی تبلیغی کوششوں میں نظر آتا ہے۔ اس کتاب کے اس باب کا حاصل بھی یہی ہے کہ مسلمانوں نے اسلام کو بہ زور شمشیر پھیلایا ہے۔ ممکن ہے کہ بعض صورتوں میں یہ واقعہ صحیح ہے کہ وہاں عیسائیت تلوار کی نوک سے پھیلائی گئی ہے۔ اس باب میں پیغمبر اسلام علیہ السلام اور خلفاء کے بھی مختصر واقعات ہیں۔'' [۱]

اس مقالے میں سید صاحب دوسری جگہ رقم طراز ہیں:

''رومن کیتھولک چرچ کی تاریخ میں یہ بھی لکھا تھا کہ رومن کیتھولک چرچ نے انسانوں کو پوپوں کا معتقد بنایا۔ محمد ﷺ سے پہلے یہودیوں نے حضرت مریمؑ پر جو اخلاقی تہمت اور حضرت عیسیٰؑ پر جو الزامات لگائے تھے، اسلام ہی ہے جس نے ان معصوموں کی عصمت کی گواہی دے کر کروڑوں بندگان خدا کے دلوں میں ان کی سچائی اور صداقت کا سکہ بٹھایا اور عیسائیوں نے ان کو انسانوں کے بجائے جو دیوتا کی شکل عطا کی تھی اس کو مٹا کر مقدس انسانوں اور محبوب بندگان الٰہی کی صورت میں جلوہ گر کیا۔'' [۲]

مرزا بیدل کیا عظیم آبادی نہ تھے : یہ مقالہ سید صاحب نے اگست ۱۹۴۶ء میں معارف میں لکھا تھا۔ مرزا بیدل کو طاہر نصر آبادی نے اپنے تذکرہ میں لاہوری بتایا ہے۔ خوش گو نے اپنے سفینہ میں اس کی تردید کی ہے۔ لیکن خود خوش گو کا یہ بیان ہے کہ بیدل اکبر آبادی الوطن تھے۔ سید صاحب اس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

۱۔ مقالات سلیمان جلد دوم، شاہ معین الدین احمد ندوی، ص ۲۴۲

۲۔ ایضاً، ص ۲۴۸

''ہمارے نزدیک صحیح یہ ہے کہ بیدل کا مولد منشا صوبہ بہار تھا جس کا دارالحکومت عظیم آباد پٹنہ تھا اور ہے۔ اس دعویٰ کی شہادت میں اولاً غلام علی آزاد جیسے محقق کا بیان ہے جس نے تین تین جگہ اس کی تصریح کی ہے۔ ثانیاً خود بیدل کے اشارات ہیں جن سے قیاس میں یہی آتا ہے کہ ان کا مولد اور منشا یا کم از کم ان کی طفولیت اور آغاز شباب کا زمانہ بہار ہی میں گزرا..... عبدالوہاب افتخار نے بھی اپنے تذکرہ بے نظیر میں اپنے استاذ آزاد کی تقلید میں ان کو عظیم آبادی کہا ہے۔'' [۱]

حکیم سنائی کی سنین عمر : سید صاحب اس مقالے میں رقم طراز ہیں کہ:

شیخ ابوالمجد، مجدد دین آدم سنائی کے متعلق اتنا بالاتفاق ثابت ہے کہ انھوں نے سلطان بہرام شاہ غزنوی (۵۱۲۔۵۴۷) اور سلطان سنجر سلجوقی (۵۱۱۔۵۵۲) کا زمانہ پایا ہے لیکن ان کی عمر کے سنین میں بے حد اختلاف ہے۔

حکیم موصوف کی سال وفات میں بھی اختلاف ہے..... ان مشکلات کے حل کی صورت یہ ہے کہ پہلے سنائی کی مشہور مثنوی حدیقہ کی تصنیف کی تاریخ متعین کی جائے۔

اس کے بعد سید صاحب نے حدیقہ کا سال تصنیف، تاریخ ولادت، اور تاریخ وفات کا عنوان قائم کر کے اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

حجاز کے کتب خانے : اس مقالے میں سید صاحب نے حجاز کے کچھ کتب خانوں کی تاریخ قلم بند کی ہے اور ان کی بعض کتابوں اور ان کے انداز و ترتیب کی بھی تفصیلات بیان کی ہیں۔ سید صاحب حجاز سے متعلق لکھتے ہیں:

''حجاز اسلام کا مرکز ہے اس لئے یہ توقع بے جا نہیں کہ وہ علوم اسلامیہ کا بھی

۱۔ مقالات سلیمان جلد دوم، شاہ معین الدین احمد ندوی، ص ۲۵۳

مرکز ہوگا۔ اسلام کی دو ابتدائی صدیاں اس توقع کے عین مطابق تھیں۔ یہی سرزمین ہے جہاں اسلام کی پہلی کتاب (قرآن مجید) انہی دست ترتیب سے مرتب ہوئی۔ یہیں احادیث کا پہلا مجموعہ عمرو بن حزم کے ہاتھ سے مرتب ہوا۔ یہیں مدینۃ النبیؐ کے احکام و قضایا امام مالک نے فراہم کئے۔ یہیں فقہ اور اصول فقہ اور احکام القرآن کی پہلی کتابیں امام شافعی نے تالیف کیں۔ یہیں حدیث کی پہلی صحیح کتاب امام بخاری نے مدینہ منورہ میں بیٹھ کر لکھی۔ اس عہد میں حجاز کا گوشہ گوشہ قال اللہ قال الرسول کے ترانوں سے گونج رہا تھا۔'' [۱]

ان ہی یادگاروں کے ضمن میں کتب خانے بھی داخل ہیں۔ ہر عہد میں ملوک و سلاطین اور علما و فضلاء نے اس میں سیکڑوں کتب خانے قائم کئے۔ مگر باد صرصر کے جھونکے ان کے اوراق کو یکے بعد دیگرے منتشر و پریشان کرتے رہے۔ اس وقت حجاز کی سرزمین میں جو کچھ یادگاریں ہیں وہ قسطنطنیہ کی مرحوم ٹرکی کے آثار مشکور ہیں اور خدا جانے اب کسمپرسی کے عالم میں ان کی زندگی کب تک ہے۔ سید صاحب نے اس مضمون میں شیخ الاسلام عارف حکمت کے کتب خانے کا ذکر کیا ہے۔

''مدینہ منورہ میں وسعت انتظام، صفائی، باقاعدگی، حفاظت اور مختلف فنون کی کتابوں کی حیثیت سے شیخ الاسلام عارف حکمت کتب خانہ بے نظیر ہے۔ یہ کتب خانہ مسجد نبوی سے متصل باب جبرئیل کے قریب قبلہ کی سمت میں واقع ہے۔ کتب خانہ کی عمارت جس زمین پر بنائی گئی ہے وہ مکان حضرت جعفر صادقؓ کا ہے۔ اسی سے متصل یعنی اس کے اور مسجد نبویؐ کے بیچ میں ایک مکان ہے جو اب سبیل ہے۔ اس پر دیار عشرہ مبشرہ لکھا ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حضرات عشرہ مبشرہ کے گھر تھے۔ مگر صحیح نہیں۔ یہ درحقیقت وہ مجلس تھی

۱۔ مقالات سلیمان جلد دوم، شاہ معین الدین احمد ندوی، ص ۲۷۰

جہاں حضرت عمرؓ صحابہ کو بلا کر مشورے کیا کرتے تھے۔ اسی کتب خانے کے بالمقابل حضرت ایوب انصاری کا وہ گھر ہے جس میں آنحضرت ﷺ ہجرت کے موقع پر مہمان اترے تھے۔'' [۱]

کتب خانہ کی کتابوں سے متعلق لکھتے ہیں ''کتب خانہ میں عربی، فارسی، ترکی کی کتابیں ہیں، زیادہ تر حصہ عربی کتابوں کا ہے، جلدوں کی تعداد مجھے ستّر ہزار بتائی گئی ہے۔ ہر کتاب عمدہ جلد میں بندھی ہوئی صاف ستھری اور خوش خط ہے۔ اکثر کتابیں غیر مطبوعہ اور قلمی ہیں اور مختلف علوم وفنون سے متعلق ہیں۔ اکثر کتابوں کی زیارت کی اور پوری فہرست استیعاب کے ساتھ دیکھی، ہر علم وفن میں مجھ کو نایاب کتابیں معلوم ہوئیں، ان کے نام لکھ لئے۔

۱۔ علوم القران، کتب حدیث، توحید وعقائد، کتب مغازی وسیر، اصول حدیث ورجال ومتعلقات حدیث، تاریخ واحبار، کتب ادب ودواوین کا ذکر کیا ہے

سید صاحب نے اس مضمون میں کتب خانہ محمودیہ کی نادر کتابوں کا ذکر کیا ہے۔

۱۔ تفسیر، متعلقات تفسیر، احادیث، اصول، حدیث ورجال، تاریخ وسیر کا ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ کتب خانہ سیدنا عثمان اور کتب خانہ عارف حکمت کا ذکر بھی کیا ہے۔

سفر گجرات کی چند یادگاریں : یہ مقالہ سید صاحب نے ۱۹۳۶ء میں معارف میں لکھا تھا جس میں سید صاحب نے گجرات کی کچھ یادوں کا ذکر کیا ہے۔ ان میں بھڑوچ، بھڑوچ کا ایک پرانا خاندان، اس خاندان کے چند نوادر کتب، ہندوستان کی سب سے پرانی مسجدیں، انکلیشور کا ایک خاندان، اس خاندان کے چند نوادر کتب، حقہ کی تاریخ، بنائے سورت کی تاریخ، راندھیر کی پرانی مسجد، لغت عربی ہندی، داستان حضرت ماہ رمضان، داستان قیامت، فقہ مبین، مثنوی کت خدائی، وفات نامہ حضرت نبیؐ، آغاز قصہ بانو، قصہ سوداگر عجم، خالق باری ان تمام عنوانات پر سفر گجرات کے بارے میں اپنے خیالات قلم

۱۔ مقالات سلیمان جلد دوم، شاہ معین الدین احمد ندوی، ص ۲۷۹

بند کئے ہیں۔

انڈیا آفس لائبریری میں اردو کا خزانہ: سید صاحب کا وفد جب انگلستان گیا تھا تو وہاں سیکڑوں حقیقی و مجازی زیارت گاہوں میں ایک زیارت گاہ کا نام انڈیا آفس لائبریری تھا۔ سید صاحب اس لائبریری میں اردو کے خزانے کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''اس وقت سرسری طور سے کتب خانہ کی اردو کتابوں کے ذخیرہ کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔ انڈیا آفس لائبریری تقریباً اسی وقت سے قائم ہے جب سے اردو نے اپنی ترقی کا آغاز کیا ہے۔ اور اگلے انگریزوں کو چونکہ اپنی نئی حکومت کی تازہ ترین زبان سے غیر معمولی دلچسپی تھی۔ اس لئے اس لائبریری کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ اردو کی قدیم ترین کتابیں جو ہندوستان میں ناپید ہیں وہ یہاں موجود ہیں۔ اس کی اردو کی مطبوعہ کتابوں کی فہرست چھپی ہے جو ایک جلد میں ۳۳۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس فہرست کو بلوم ہارٹ (Blum Hart J-II) نے مرتب کیا ہے۔ یہ اردو کے فاضل ہیں اور کسی زمانہ میں ہندوستان میں بھی رہ چکے ہیں۔ قلمی کتابوں کی فہرست بھی ان کے زیر تحریر ہے..... بہر حال مطبوعہ اردو کتابوں کی اہمیت بھی یہاں میری نگاہ میں کچھ کم نظر نہ آئی اور تھوڑی دیر کے لئے مجھے مغرور ہونا پڑا کہ اللہ اللہ ہماری زبان بھی اتنی ترقی کر چکی ہے کہ تین سو صفحوں میں اس کی فہرست تمام ہوئی ہے..... اس فہرست کو دیکھ کر یہ تعجب ہوا کہ اردو زبان غدر کے پہلے ہی سے ایک علمی زبان بن گئی تھی۔ دوسری بات یہ نظر آئی کہ اس زبان کو علمی بنانے میں مسلمان اور ہندو دونوں اہل قلم کا برابر کا ساجھا ہے۔[۱]

۱۔ مقالات سلیمان، جلد دوم، ص ۳۱۶۔۳۱۷

بہر حال اردو کتابوں کی یہ فہرست جو صرف مطبوعہ کتابوں پر مشتمل ہے جن عنوانوں پر مبنی ہے وہ یہ ہیں: علوم وفنون، تاریخ وجغرافیہ، ادبیات، کتب تعلیمی، الٰہیات، متفرقات، ہر ایک عنوان کے تحت مزید تقسیمات کا بھی ذکر ہے۔ یہاں سید صاحب نے صرف علمی کتابوں کا ذکر کیا ہے جن کو دیکھنے کے بعد احساس ہوتا ہے کہ علوم جدیدہ کی مختلف شاخوں میں کس تیزی سے اردو اس وقت ترقی کر رہی تھی۔ جب تک کہ وہ سارے ملک کی متحد زبان تھی اور نفاق قومی سے نا آشنا تھی۔

اس سلسلے میں سید صاحب نے فن زراعت، سائنٹفک کتابیں، نجوم ہیئت، جغرافیہ، طبیعیات، معاشیات، پولٹیکل اکادمی، علم معاشرت، منطق کا ذکر کیا ہے۔

کتب خانہ حمیدیہ بھوپال : سید صاحب لکھتے ہیں کہ ایک زمانہ میں بھوپال مشرقی علوم وفنون کا مرکز تھا۔ دنیائے اسلام سے ہر روز نادر اور قلمی کتابوں کے تحفے بھوپال میں پہنچتے تھے۔ اگر اس وقت ریاست کا کوئی پبلک کتاب خانہ ہوتا تو اس وقت وہ رام پور ٹونک اور حیدرآباد کی برابری کرتا۔ ریاست بھوپال میں اصلاحات کا دوسرا دور سرکار عالیہ نواب سلطان جہاں بیگم مرحومہ کے عہد سے شروع ہوا۔ انہی میں سے ایک پبلک کتب خانہ کا قیام ہے جو سرکار مرحومہ کے سب سے چھوٹے صاحبزادہ اور والی بھوپال حمید اللہ خاں بہادر کی طرف منسوب ہو کر حمیدیہ کہلاتا ہے۔ اس کی عمارت شاہ جہاں آباد کے خاتمہ پر ایک نہایت عمدہ پر فضا موقع پر ہے۔ عمارت وسیع بلند اور شاندار ہے۔ مقام بھی پر سکون اور مطالعہ کے لئے موزوں ہے۔

اس مقالے میں سید صاحب نے بابر کے فرمان، نور جہاں کے نوشتہ اور زیب النساء کے نوشتہ کا ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ کتابوں میں استاد عبداللہ بن سالم بصری، العلل المتناهية فی الاحاديث الواهية، تفسیر وجیز واحدی، تیسیر البیان فی تفسیر احکام القرآن، صحیح بخاری، الدیباج علی مسلم بن الحجاج سیوطی، التنقیح علی الجامع الصحیح، الکواکب الدراری علی صحیح البخاری، ابن ابی شیبہ، طبقات الفقہا ابن کمال پاشا، فتاوی واقعات المفتیین، فتاوی اکبر شاہی، ارشاد، عجائب البلدان، تاریخ افغانی، تاریخ ناصر شاہی، رقعات عالم گیری، کلیات انوری کا ذکر کیا ہے۔

مقالات سلیمان جلد سوم (شاہ معین الدین احمد ندوی)

مقالات سلیمان جلد سوم سید صاحب کے قرآنی مقالات کا مجموعہ ہے۔ سید صاحب کا علمی ذوق بڑا متنوع اور مطالعہ نہایت وسیع تھا۔ اسلامی علوم میں انہیں خاص دستگاہ تھی۔ لیکن انہیں سب سے زیادہ دلچسپی قرآن مجید سے تھی۔ جلد سوم کا پہلا مقالہ علوم القرآن کے عنوان سے ہے جو ۱۹۱۴ء میں الہلال میں تین قسطوں میں چھپا تھا۔ اس مضمون میں سید صاحب لکھتے ہیں:

''مسلمانوں نے قرآن مجید کے ساتھ جو اعتنا کیا اور اس کے متعلق جو خدمتیں دیں ان کی ہم حسب ذیل جلی تقسیم کر سکتے ہیں۔

(۱) تشریح مسائل عامہ، متعلقہ قرآن مثلاً کیفیت، نزول کتاب قرآن، قرأت، تجوید قرآن۔

(۲) تدوین علوم متعلقہ، قرآن مثلاً علم الامثال، علم الاعراب، علم المجاز۔

(۳) تفسیر معانی والفاظ قرآن، مثلاً کتب، تفاسیر عامہ۔

اس کے بعد سید صاحب نے چند اور امور کا ذکر کیا ہے۔

۱۔ مسائل متعلقہ قرآن، علوم متعلقہ قرآن، جوامع علوم القرآن، رسوم القرآن، تجوید القرآن، قرأت القرآن، علل القرآن، معرفتہ الوقف والابتداء، الفاظ قرآن، مفردات القرآن، غریب القرآن، مصادر القرآن، الواحد التثنیہ والجمع فی القرآن، معربات القرآن، الوجوہ والنظائر فی القرآن، اعراب القرآن، علوم القرآن، معانی بدیع قرآن، معانی القرآن، اعجاز القرآن، مجاز القرآن، تشبیہ القرآن، امثال القرآن، امثلۃ القرآن، بدیع القرآن، ھجاء القرآن، النقط والشکل فی القرآن، اجزاء القرآن، مقطوع القرآن، موصولہ، عدد آی القرآن، مکہ معظمہ، مدینہ مبارکہ، کوفہ، بصرہ، شام، احکام القرآن ان تمام عنوانات پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے

اسماء القرآن: سید صاحب کا یہ مضمون الندوہ اگست ۱۹۱۱ء میں شائع ہوا تھا۔ اس مقالہ کے ذیلی عنوانات ہیں نام کی ضرورت، نام کا تناسب، دیگر صحف انبیا کے نام، الہامی کتابوں کے نام بھی الہامی

ہونے چاہئیں، کثرت اسمائے قرآن مجید، قرآن مجید کے عام نام، قرآن مجید کے مخصوص نام۔

قرآن مجید کے مخصوص نام کے عنوان کے تحت سید صاحب لکھتے ہیں:

قرآن مجید کے مخصوص نام سے وہ نام مراد ہیں جن کا اطلاق استعمال میں قرآن مجید کے سوا کسی اور پر نہیں ہوتا۔ اس قسم کے تین نام ہیں۔ فرقان، مصحف اور قرآن۔ فرقان قرآن کا مشہور نام ہے۔ اس سے زیادہ مصحف اور ان دونوں سے مشہور تر قرآن ہے۔ فرقان سے متعلق سید صاحب لکھتے ہیں ''قرآن مجید نے دو جگہ اپنے کو فرقان کے لفظ سے یاد کیا ہے۔ ایک آیت سورہ فرقان میں ہے اور دوسری آل عمران میں۔''

مصحف : قرآن مجید کو مصحف بھی کہتے ہیں لیکن یہ نام قرآن مجید میں نہیں آیا ہے۔ اس لئے یہ قرآن کا الہامی نام نہیں ہے۔

قرآن : قرآن کا مشہور تر اور حقیقی نام قرآن ہے اور خود قرآن کہتا ہے کہ میں قرآن ہوں۔ اس طرح قرآن مجید میں ساٹھ مرتبہ قرآن کا بلفظہٖ ذکر آیا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ قرآن مجید کا اصلی نام قرآن ہے۔ قرآن سے متعلق سید صاحب لکھتے ہیں:

> ''حقیقت یہ ہے کہ قرآن کا قرآن یعنی جامع سے بہتر نام نہیں ہوسکتا۔ مذہب اسلام دنیا کا کامل مذہب ہے۔ اس لئے اس کی کتاب کو جامع ہونا چاہئے۔ توراۃ قانون ہے، انجیل اخلاق ہے، اور زبور حمد وثنا اور مناجات ہے۔ لیکن قرآن قانون بھی ہے اور قرآن اخلاق بھی ہے۔ قرآن ادعیہ ومناجات بھی ہے قرآن تمام دنیا کی صحیح مذہبی کتابوں کا خلاصہ ہے۔ قرآن تمام صحف آسمانی کی روح ہے۔ قرآن انسان کی ہر قسم کی حاجتوں کا سامان ہے۔ قرآن ہر قسم کی ضروریات کا کفیل ہے۔ قرآن دین ودنیا کی ہر راہ کا مشعل ہے۔ قرآن عقائد، عبادات، معاملات، روحانیت، اخلاق، قانون، تمدن، معاشرت، سیاست، غرض ہر قسم اور ہر نوع کی تعلیمات اور اس کے اصول وفروغ کا جامع ہے۔

لیکن اس جامعیت میں دنیا کی کوئی مذہبی کتاب اس کا مقابلہ کرسکتی ہے اور اگر نہیں کرسکتی تو ایسی حالت میں قرآن کا قرآن سے بڑھ کر کوئی جامع نام دوسرا نہیں ہوسکتا۔'' [۱]

مکررات القرآن : یعنی قرآن مجید میں مکرر آیتیں کیوں ہیں؟ سید صاحب کا یہ مضمون الندوہ میں ۱۹۰۹ء میں شائع ہوا تھا۔ سید صاحب اس مضمون میں لکھتے ہیں ''مخالفین اسلام کا قرآن مجید کے اسلوب بلاغت پر ایک اعتراض یہ ہے کہ قرآن مجید میں ایک ہی قصہ مکرر سہ کرر بیان ہوتا ہے۔ ایک ہی آیت بار بار آتی ہے ایک ہی بات سوسو دفعہ دہرائی جاتی ہے۔ اس بار بار کی تکرار سے کیا حاصل؟ اس سے کلام کا لطف جاتا رہتا ہے اور کلام بدمزہ ہوجاتا ہے..... لیکن یہ اعتراض کوئی نیا اعتراض نہیں۔ علمائے اسلام نے اس کے متعدد وجوہات بیان کئے ہیں۔ علامہ کرمانی المتوفی ۷۸۶ھ نے ایک مستقل رسالہ اسی باب میں لکھا ہے جس میں انھوں نے اپنا نظریہ قرار دیا ہے کہ قرآن میں کوئی مکرر بات نہیں۔ جہاں جہاں قرآن مجید میں بظاہر ایک ہی معنی مکرر معلوم ہوتے ہیں وہاں یہ ثابت کیا ہے کہ ہر جگہ مختلف معنیٰ مراد ہیں۔ اس لئے یہ اعتراض ہی غلط ہے کہ قرآن مجید میں ایک ہی بات بار بار آئی ہے۔

قرآن مجید کو غور سے (اوّل تا آخر) پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں دو قسم کی تکرار ہے لفظی تکرار اور معنوی تکرار۔

۱۔ معنوی تکرار سے یہ مقصود ہے کہ ایک ہی معنی کو خاص الفاظ و پابندی کے بغیر بار بار کہنا۔

۲۔ لفظی تکرار سے مراد یہ ہے کہ ایک ہی مفہوم کو کسی خاص عبارت اور الفاظ کے ساتھ بار بار ادا کرنا۔ مثلاً سورہ رحمٰن میں فبایِ الاء ربکما تکذبان کی تکرار۔

اس کے علاوہ تکرار قصص، فرائض وعقائد کی تکرار کا ذکر بھی مفصل کیا ہے۔

ارض حرم اور اس کے احکام و مصالح (قرآن مجید کی نظر میں) : سید صاحب کا یہ مقالہ نومبر

۱۔ مقالات سلیمان، جلد سوم، شاہ معین الدین احمد ندوی، ص ۴۴

۱۹۲۳ء میں معارف میں شائع ہوا۔

سید صاحب کہتے ہیں کہ جزیرہ عرب کے متعلق اسلام کے جو احکام ہیں ان کا مآخذ قرآن مجید کی وہ چند آیتیں ہیں جو سورہ توبہ میں آئی ہیں۔ چونکہ خلافت فاروقی کے بعد سارا عرب اور عراق وشام اسلامی علم کے نیچے آچکا تھا اور غیر مسلم قومیں اس سرزمین اقدس سے معدوم ہو چکی تھیں، اسلام پر کوئی ایسا وقت نہیں آیا جب جزیرہ عرب اور ارض حرم کے تقدس اور حرمت کے خلاف اس پر کسی غیر مسلم سلطنت کے استیلا کا خطرہ بھی کسی مسلمان کے دل میں گزرا ہو اس لئے ان آیات پاک کی تفسیر کبھی اس نقطہ نگاہ سے نہیں ہوئی.....قدیم مفسرین کے خواب وخیال میں بھی یہ بات نہیں تھی کہ سرزمین حرم کی کبھی وہی حالت عود کر آئے گی جو ظہور اسلام سے پہلے تھی۔ جب عرب کا شیرازہ منتشر تھا ملک کا کوئی متحدہ نظام نہ تھا گوشے گوشے میں قبائل اور شیوخ کی فرماں روائیاں تھیں کفر وشرک کا استیلا تھا یمن سے لے کر عراق وشام تک مجوسیوں اور رومی عیسائیوں کی حکمرانی تھی ٹھیک آج کی طرح اس عہد میں بھی یمن، حضرموت، بحرین اور عمان پر ایران کے مجوسی شام میں امیر عبداللہ کے بجائے آل غسان رومیوں کے زیر حمایت تھے اور شام کے بقیہ حصوں پر رومی عیسائیوں کی براہ راست حکومت تھی۔ یہ حالات تھے جب سورہ توبہ کی آیات ۲۸، ۲۹ نازل ہوئیں۔ ان آیتوں میں تین باتیں بیان کی گئی ہیں۔

۱۔ اہل شرک مسجد حرام کے قریب نہ ہونے پائیں۔

۲۔ اگر تم کو فقر وفاقہ کا خوف ہے، تو خدا تم کو اپنے فضل وکرم سے غنی کر دے گا۔

۳۔ ان اہل کتاب سے جو دین حق کے پیرو نہیں، اس وقت تک لڑو جب تک کہ وہ جزیہ دے کر اطاعت قبول نہ کرلیں۔'' [۱]

اس مقالے میں سید صاحب نے مندرجہ ذیل امور پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔

۱۔ سرزمین حرم صرف خدا کے عبادت گزاروں کا مسکن ہے۔

۱۔ مقالات سلیمان، جلد سوم، شاہ معین الدین احمد ندوی، ص ۸۵۔۸۹

۲۔ وہ تمام مسلمانوں کی ملکیت ہے، وہ دارالامن ہے۔

۳۔ یہاں ظالم سزایاب ہوگا۔

۴۔ سرزمین حرم سلطنت نہیں بن سکتی۔

پیغام امن یعنی محبت الٰہی اور مذہب اسلام : سید صاحب کا یہ مضمون جولائی ۱۹۲۳ء میں معارف میں شائع ہوا۔ اس مقالے میں سید صاحب نے اسلام کو صلح و امن اور عدل کا بہترین نمونہ کہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''اسلام دنیا میں خدا کا آخری پیغام ہے۔ وہ دنیا میں مذہب کی تکمیل ہے۔ وہ اپنے پیغمبر کے الفاظ میں دین الٰہی کی عمارت کا آخری پتھر ہے۔ وہ فطرت ہے اور فطرت کے مطابق ہے۔ وہ دنیا میں اس وقت صلح و امن کا جھنڈا اڑاتا آیا جب دنیا خاک وخون میں لتھڑی ہوئی تھی۔ وہ اس خدا کا منادی ہے جو رحم مجسم، نیکی محض، خیر کل اور امن و امان ہے۔ وہ ظلم وستم، بے اطمینانی اور اضطراب، شک وشبہ کے طوفانوں سے بھاگ کر مامن و ماوی کے طلب گاروں کو ایک ہی پناہ کی جگہ بتاتا ہے۔ ففرّو اِلیٰ اللّٰہ (۵۱:۵۱) ہر طرف سے بھاگ کر اللہ کی طرف جاؤ''۔[۱]

اس مقالہ میں سید صاحب نے مخالفین کی نکتہ چینی کے ذیلی عنوان پر مفصل انداز میں روشنی ڈالی ہے۔

القرآن والفلسفہ الجدیدۃ : سید صاحب کا یہ مقالہ ۱۹۰۶ء میں الندوہ میں شائع ہوا تھا۔ اس میں سید صاحب لکھتے ہیں کہ:

> ''اسلام سے پہلے تمام اہل مذاہب کا یہ مسلمہ اصول تھا کہ مذہب میں عقل کو کیا دخل..... اسلام دنیا میں پہلا مذہب ہے جس نے اپنے مسائل کی بنیاد عقل

۱۔ مقالات سلیمان، جلد سوم، شاہ معین الدین احمد ندوی، ص ۸۰

پر رکھی۔ قرآن مجید کی طرز تعلیم دیکھو کہ اس نے اپنے پیروؤں کو جہاں کسی مسئلہ کی تلقین کرنی چاہی ہے اس کے ساتھ اس کی دلیل بھی بیان کردی ہے۔ تتبع سے ایسی بہت سی حدیثیں اور آیتیں مل سکتی ہیں جن میں یہ صاف کہا گیا ہے کہ مذہب کو عقل سے ماننا چاہئے۔'' [۱]

سید صاحب لکھتے ہیں کہ ''جب سے دنیا میں علوم جدیدہ کا زور ہے، مسلمانوں میں غلغلہ برپا ہے کہ قرآن کو سائنس کے حملہ سے بچایا جائے۔ سائنس نے مذہب کے ارکان متزلزل کردیئے۔ اس کا جواب حضرت الاستاذ مولانا شبلی نعمانی نے اپنی بیش بہا تالیف ''الکلام'' میں دیا ہے۔'' [۲]

سید صاحب نے الکلام کا اقتباس بھی اس مقالہ میں نقل کیا ہے۔ اس کے علاوہ سید صاحب نے قرآن اور فلسفہ جدیدہ پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''دنیا کی بہت سی چیزیں انسان کے قبضہ قدرت سے باہر ہیں۔ مگر تحقیق جدید نے دنیا کے بہت سے راز فاش کردیئے اور بتایا کہ ہم کیوں کر خدا کے خلیفہ بن کر ان کو مسخر کرسکتے ہیں، اس نے ہوا کو تھاما، بجلی کو پکڑا، بے جان چیزوں سے وہ کام لیا جو جاندار نہیں کرسکتے۔ یہ دھوپ جس کی نسبت ہم خیال کرتے ہیں، کہ یہ جز اس کے کہ اشیاء میں نشو ونما کی قوت پیدا کرے اور موسم سرما میں غربا کے لئے آتش دان بنے یا ہماری آنکھوں میں دیکھنے کی طاقت پیدا کرے۔ ہمارے اور کس کام آسکتی ہے؟ مگر امریکہ میں دھوپ کی حرارت کو مجتمع کرکے وہ کام نکالے جاتے ہیں، جو کوئلے یا گیس سے نکل سکتے ہیں، اور اس کے بل پر ان پیش نظر انجنوں کی طرح، دھوپ کے انجن چلائے جاتے ہیں۔

۱۔ مقالات سلیمان، جلد سوم، ص ۱۰۱

۲۔ ایضاً، ص ۱۰۳

اگر انسان کی انتھک کوششیں یوں ہی جاری رہیں تو قریب ہے کہ انسان فطرت کے بہت سے اور پوشیدہ اسرار جان لے اور اسے معلوم ہو جائے گا کہ اسلام کی آسمانی کتاب صحیفہ فطرت کے کہاں تک مطابق ہے۔'' [۱]

مسئلہ ارتقا اور قرآن مجید : سید صاحب اس مقالہ میں مسئلہ ارتقا اور قرآن مجید، ایمان بالغیب، قرآن مجید پر تاریخی اعتراضات، آزر اساطیر الاولین، تذکار نزول القرآن، حقیقت صوم روزہ، ایام صیام پر نظر ثانی، لفظ صلوٰۃ قرآن شریف میں خلیل اللہ کی بشریت، ذبح عظیم، قربانی کا اقتصادی پہلو، سودا اور صحف انبیا، قیامت، تحریم شراب، حاکم حقیقی صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ آیت استخلاف، قرآن پاک کا تاریخی اعجاز، اسلام دونوں جہاں کی بادشاہی، جبر وقدر، ان تمام موضوعات پر تفصیل کے ساتھ اپنے خیالات کو قلم بند کیا ہے۔

سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے سید صاحب کے مقالات کے بارے میں اپنے جن خیالات کا اظہار کیا ہے ان سے سید صاحب کی تحریروں کی قدر و قیمت کا بخوبی اندازہ ہو جاتا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''وہ اپنے اصل موضوع سے ہٹ کر جب کبھی ادب و تاریخ کے کسی پہلو پر قلم اٹھاتے تو ان کی فکر و نظر کے جلوے اس میں بھی دکھائی دیتے۔ ان کے ادبی مضامین کا مجموعہ ''نقوش سلیمانی'' ہے جو بہت مقبول ہوا۔ ان کی کتاب ''خیام'' ان کی ادبی تحقیقات کا ایک شاہکار ہے۔ اسی طرح ''عرب و ہند کے تعلقات'' ان کی تاریخی تحقیقات کا ایک ایسا مایہ ناز سرمایہ ہے جس پر خود فن تحقیق کو ناز ہو سکتا ہے۔ وہ جب کسی موضوع پر قلم اٹھاتے تو ایسا معلوم ہوتا کہ وہ اس عالم رنگ و بو سے ہٹ کر کسی اور عالم میں پہنچ گئے ہیں، جہاں ہر طرف صرف تلاش و تجسس، تحقیق و تدقیق اور محنت و ریاضت ہی کی نیرنگیاں کارفرما ہیں۔ اور ان ہی کی بہار آفریں قوس و قزح میں گم ہو کر اپنی تحریر کو قلم بند فرما

۱۔ مقالات سلیمان، جلد سوم، ص ۱۱۱

رہے ہیں۔ان کی ہر تصنیف اور ان کا ہر مقالہ اس کی کھلی شہادت ہے۔ان کا سنجیدہ اور تحقیقاتی رنگ ان کا اصلی اسلوب بیان ہے، جس سے اردو زبان کو بڑا وزن اور وقار حاصل ہوا ہے۔'' [۱]

سید صاحب کے مقالات کے بارے میں شاہ معین الدین احمد ندوی اپنے تاثرات ان الفاظ میں ظاہر کرتے ہیں:

''سید صاحب جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتے تھے اس کا کوئی گوشہ تشنہ نہ چھوڑتے تھے اور تلاش و تحقیق کا کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے جس موضوع پر بھی لکھا ہے نامعلوم ماخذوں کے لحاظ سے اس میں اضافہ کی بہت کم گنجایش چھوڑی ہے اور بعض چیزوں میں تو ان کو اولیت کا درجہ حاصل ہے، اور انھوں نے آئندہ لکھنے والوں کے لئے راہ کھول دی ہے۔'' [۲]

مقالات عبدالسلام (شاہ معین الدین احمد ندوی)

یہ مولانا عبدالسلام ندوی صاحب کے ان مضامین کا مجموعہ ہے جو انھوں نے وقتاً فوقتاً معارف میں لکھے تھے۔ بعد میں دارالمصنفین نے ان مضامین کو کتابی شکل میں شائع کر دیا۔ یہ کتاب عبدالسلام صاحب کے ۲۷ مقالات پر مشتمل ہے۔ اس کتاب کے شروع میں شاہ معین الدین احمد ندوی کا تحریر کردہ دیباچہ ہے جس میں عبدالسلام صاحب کی تصنیفی زندگی سے متعلق لکھتے ہیں کہ:

''مولانا عبدالسلام ندوی مرحوم کی تصنیفی زندگی کی مدت نصف صدی کے قریب ہے۔ اس مدت میں انھوں نے مستقل تصانیف کے علاوہ مختلف موضوعوں پر

۱۔ مقالات سلیمان جلد اول، صباح الدین عبدالرحمٰن، ص ۱۔۲

۲۔ مقالات سلیمان، جلد دوم، ص ۱

بکثرت مضامین لکھے، مگران کا خاص موضوع شعروادب تھا۔اس کے وہ نکتہ سنج ناقد بھی تھے اور مورخ بھی۔ انھوں نے اس کے مختلف پہلوؤں پر بڑے مبصرانہ مضامین لکھے۔'' [۱]

شاہ معین الدین احمد ندوی عبدالسلام صاحب کی تنقیدی تصنیف شعرالہند کے بارے میں ذکر کرتے ہوئے اس کی اہمیت پر اس طرح روشنی ڈالتے ہیں:

''جس زمانہ میں شعرالہند لکھی گئی ہے اس وقت اردو میں آب حیات کے علاوہ اردو شاعری کی کوئی تنقیدی تاریخ نہ تھی۔شعرالہند ان کتابوں میں ہے جنھوں نے شعروادب کا مذاق بنایا ہے۔اب نئے رجحانات نے شعروادب کے دامن میں بڑی وسعت اور بڑی جدتیں پیدا کردی ہیں.....لیکن بعض اوقات جدت طرازی اہمال کی حد تک پہنچ جاتی ہے۔'' [۲]

اس سلسلہ میں شاہ صاحب کے ان خیالات سے اتفاق کیا جاسکتا ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''شعروادب کی اس ترقی کے باوجود اس کے قدیم بنیادی عناصر کی اہمیت اپنی جگہ قائم ہے۔ان ہی کی بنیاد پر نئے ادب کی عمارت تعمیر ہوئی ہے اور جہاں ان بنیادوں کو نظر انداز کردیا گیا ہے وہاں صرف جدت رہ گئی ہے۔ادب رخصت ہوگیا ہے بلکہ معنی ومفہوم بھی غائب ہوگئے ہیں اور جہاں دونوں کو سمویا گیا ہے وہاں شعروادب کی زمین آسمان بن گئی ہے۔'' [۳]

مقالات عبدالسلام کا پہلا مضمون ''دیوان حسرت'' کے عنوان سے معنون ہے۔ یہ مضمون

۱۔ دیباچہ مقالات عبدالسلام، شاہ معین الدین احمد ندوی، ص ۱

۲۔ ایضاً، ص ۱

۳۔ ایضاً، ص ۲

مارچ۔اپریل ۱۹۱۷ء میں معارف میں شائع ہوا۔اس میں مولانا عبدالسلام صاحب ندوی نے حسرت کی شاعری کا ابتدائی دور ۱۸۹۴ء بتایا ہے۔

عبدالسلام صاحب نے اس مضمون میں حسرت کے دیوان کے بارے میں لکھا ہے:

''دلی اور لکھنؤ کے اسکول میں جو اختلاف مذاق ہے وہ ہر جگہ موجود ہے۔آج سے چند سال پہلے تک لکھنؤ کی شوخی نے دلی کی متانت کو شکست فاش دے دی تھی۔لیکن جدید تعلیم کی اعانت سے دلی کی شاعری اپنے گزشتہ وقار کا پھر اعادہ کر رہی ہے۔اور بے شبہ اس نئی فوج کا علم بردار حسرت کا نکتہ پرداز قلم ہے۔'' [۱]

عبدالسلام صاحب کے مطابق حسرت موہانی کے کلام میں فارسی محاورے اور ترکیبوں کا استعمال کثرت سے ہوا ہے۔ اس کے علاوہ شعر کو باوقار بنانے کے لئے دسیوں جدید ترکیبوں کا استعمال کیا ہے۔انھوں نے شعرائے دہلی کی زبان سے اخذ کرتے ہوئے شعرائے لکھنؤ کی طرح کسی قدر برجستہ صاف اور رواں زبان کو اپنے کلام میں استعمال کیا ہے۔

حسرت کے کلام میں سلاست زبان نے متوازن فقروں کا انبار لگا دیا ہے۔حسرت کے کلام میں ترتیب الفاظ بھی بہت سادہ، فطری اور زوردار ہے۔ چنانچہ انھوں نے بہت سی ایسی غزلیں بھی لکھی ہیں جو ردیف سے مبرا ہیں۔مولانا عبدالسلام ندوی حسرت کے حسن کلام سے متعلق لکھتے ہیں:

''یہ ایک دریا ہے جس کی لہروں کو گنا نہیں جا سکتا۔محاسن کلام کے غیر محدود طرق ہیں اور ان سب کے لئے عنوانات کا قائم کرنا ازبس مشکل ہے۔'' [۲]

لیکن عبدالسلام صاحب نے اس مضمون میں کلام حسرت کی خوبیوں کے ساتھ ساتھ اس کی خامیوں کا بھی ذکر کیا ہے۔

۱۔ دیباچہ مقالات عبدالسلام، شاہ معین الدین احمد ندوی، ص ۴

۲۔ ایضاً، ص ۱۱

مثنوی خواب وخیال (از میر اثر دہلوی)

اس مضمون میں عبدالسلام صاحب نے میر اثر کی مثنوی ''خواب وخیال'' کی فنی خوبیوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔اور دوسری مثنویوں کے مقابلہ میں اس کی افضلیت کو نمایاں کیا ہے۔ چنانچہ اس کی بعض خوبیوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے عبدالسلام صاحب لکھتے ہیں کہ یہ مثنوی عام مثنویوں کی روش مثلاً تاریخی واقعہ، قصہ اور اخلاق وتصوف جیسی عام طرز سے ہٹ کر ہے لیکن اہل دلی کی طرح ان کی مثنوی میں متانت وسنجیدگی نہیں بلکہ لکھنؤ والوں کی طرح شوخی وظرافت ہے۔ ان کی مثنوی میں برجستگی، روانی اور صفائی پائی جاتی ہے۔ سادگی وصفائی کی وجہ سے تشبیہات واستعارات بہت کم ہیں۔ انھوں نے جگہ جگہ ہندی تشبیہات سے بھی کام لیا ہے۔ خیالات میں بھی سادگی ہے۔ لفظی رعایت کا استعمال اگر چہ بہت کم ہوا ہے اور جہاں کہیں ہوا بھی ہے تو بہت عامیانہ اور مبتذل ہے۔

اشرف علی خاں فغاں : عبدالسلام صاحب کا یہ مضمون اپریل ۱۹۲۳ء میں معارف میں شائع ہوا۔ عبدالسلام صاحب لکھتے ہیں اشرف علی فغاں صاحب دیوان ہیں۔ وہ احمد شاہ نادر شاہ کے کوکہ تھے اور نہایت بذلہ سنج طبیعت کے مالک تھے۔ اس لئے ان کو ظرف الملک کوکہ کا خطاب ملا تھا۔ عبدالسلام صاحب نے ان کے اردو کلام کی خصوصیات کو نمایاں کیا ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ اشرف علی فغاں نے اپنے کلام کو رعایت لفظی اور ضلع جگت سے پاک رکھا۔ ان کے انداز کلام سے پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے اپنے دور کے تمام اساتذہ سے زیادہ اس صنعت سے احتراز کیا ہے۔ ان کے کلام میں کہیں بھی غیر مہذب الفاظ اور پست مضامین نہیں ملتے۔ فغان کا کلام پست اشعار سے محفوظ ہے۔ انھوں نے نہایت شگفتہ طرحوں میں غزلیں کہی ہیں۔ فغاں کے دیوان میں شروع سے آخر تک ہمواری نظر آتی ہے۔ فغاں کے کلام میں سلاست اور روانی کی وجہ سے موسیقیت پیدا ہوگئی ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے پرلطف قطعہ بھی کثرت سے لکھے ہیں۔

اکبر کا سنجیدہ کلام : عبدالسلام صاحب اس مضمون میں اکبر کے دیوان سے متعلق لکھتے ہیں:

''اکبر کا دیوان دو قسم کے کلام پر مشتمل ہے۔ سنجیدہ وظریفانہ۔ اگر چہ ظریفانہ حیثیت سے بھی انھوں نے بعض تمسخر آمیز نقالی نہیں کی ہے بلکہ قوم کو تمدن جدید اور تعلیم نو کے خطرات سے بچانے کی کوشش کی ہے۔ تاہم قوم نے ان کے کلام کے اس حصہ کو کبھی اس حیثیت سے نہیں پڑھا کہ وہ ایک قابل عمل حقیقت ہے بلکہ سب نے صرف چاٹ سے اس کی تلاوت کی ہے کہ وہ ایک مہذب ظرافت ہے۔ لیکن ان کے ان تیز فقروں نے بزم ادب میں وہ آتش بازیاں چھوڑیں کہ ان کی روشنی نے اہل محفل کی نگاہ کو بالکل خیرہ کر دیا۔ اور ان کے سنجیدہ کلام کے رموز واسرار اور حقائق ومعارف کسی کو بھی نظر نہیں آئے۔'' [۱]

اس مضمون میں عبدالسلام صاحب نے اکبر کے سنجیدہ کلام پر ناقدانہ نظر ڈالی ہے تا کہ تصویر کے دونوں رخ سامنے آجائیں۔ رنگ کلام کے ذیلی عنوان کے تحت اکبر کی جامعیت اس طرح اجاگر کرتے ہیں:

''شعرائے دہلی اور لکھنؤ کے کلام کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان دونوں کالجوں کی خصوصیات ایک دوسرے سے بالکل الگ تھیں۔ اکبر کی ہمہ گیر طبیعت نے اس کلیہ کو بالکل باطل کر دیا ہے۔ انھوں نے سنجیدگی وظرافت کو اس حیثیت سے نبھایا ہے کہ ان کا قالب میر وانشا دونوں کی روح کا جلوہ گاہ بن گیا ہے۔ بلکہ سنجیدہ کلام میں بھی اس قدر بوقلمونی نظر آتی ہے کہ گویا داغؔ امیرؔ دونوں ایک ہی بزم میں مترنم زیر نظر آتے ہیں، اور دہلی لکھنؤ دونوں کالجوں کے پروفیسر گویا ایک ہی ہال میں درس دے رہے ہیں۔'' [۲]

۱۔ مقالات عبدالسلام، شاہ معین الدین احمد ندوی، ص ۴۱

۲۔ ایضاً، ص ۴۲

عبدالسلام صاحب کے مطابق اکبر نے بہت سی ایسی اچھوتی اور نادر تشبیہات پیدا کی ہیں جن کی طرف شعرائے متقدمین ومتاخرین کا ذہن منتقل نہیں ہوا تھا۔ اکبر کے فلسفہ وتصوف اور مذہب پر بھی عبدالسلام صاحب نے طویل بحث کی ہے۔

تذکرہ مصحفی قلمی : عبدالسلام صاحب لکھتے ہیں کہ شعرالہند کی تدوین وتالیف کے ابتدائی زمانہ میں ان دونوں تذکروں (میر حسن اور مصحفی کا تذکرہ) کو دیکھا تھا اور ان سے ضروری معلومات حاصل کی تھی.....عبدالسلام صاحب لکھتے ہیں کہ:

> ''مصحفی کے تذکرے کو ہم نے بار بار پڑھا تا کہ اگر کچھ بھی معلومات مل جائیں تو شعرالہند میں ان کو شامل کیا جائے لیکن اس سلسلے میں خود اس تذکرے کی تقریظ وتنقید کے متعلق بہت سی معلومات ہاتھ آئیں جن کو اگر مرتب کر دیا جائے تو اس تذکرے کی طبع واشاعت کی تحریک بہت کچھ مدلل ہو سکتی ہے۔'' [۱]

آسی : حضرت مولانا شاہ عبدالحلیم صاحب آسی ایک صوفی منش بزرگ تھے اور زیادہ تر صوفیانہ رنگ کے اشعار کہتے تھے۔ ان کا دیوان سترہویں صدی میں گورکھپور سے شائع ہو چکا ہے۔ مولوی سید یامین صاحب ہاشمی ایم اے ایل ایل بی وکیل غازی پور نے ان کی نظموں کا ایک جدید مجموعہ نئے طرز پر مرتب کر کے شائع کیا ہے جس کا نام آسی ہے۔ وہ خود معترف ہیں کہ وہ ایڈیشن میں آسی کی سوانح پر روشنی نہ ڈال سکے اس لئے اگر آسی کے بجائے اس کا نام ''نظم آسی'' ہوتا تو غالباً زیادہ موزوں تھا.....اس مجموعہ میں سب سے پہلے ایک طویل مقدمہ لکھا ہے، جس میں مختلف عنوانات میں ان کی شاعری پر بحث کی ہے۔ لیکن ان عنوانات میں کسی قسم کا تصنیفی تناسب نہیں پایا جاتا کیونکہ بعض موقعوں پر نہایت اختصار سے اور بعض موقعوں پر غیر ضروری اطناب سے کام لیا ہے۔ اس کے علاوہ اس مقالہ میں تلمیحات، موسیقی، فطری شاعری، حضرت آسی اور تعلیم قرآن، فلسفہ وتصوف، صوفیانہ شاعری، اخلاقی شاعری ان تمام عنوانات پر عبدالسلام

۱۔ مقالات عبدالسلام، شاہ معین الدین احمد ندوی، ص ۵۷۔۵۸

صاحب نے تنقیدی نظر ڈالی ہے۔اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

''بہر حال شعر العجم حصہ پنجم کو سامنے رکھ کر انھوں نے آسی کے کلام پر نظر ڈالی ہے لیکن وہ یہ نہ سمجھے کہ وہ اردو شاعری کی تاریخ نہیں لکھتے بلکہ کلام آسی پر ریویو لکھتے ہیں اس لئے اس قسم کی تاریخی مباحث اس مقدمہ میں غیر ضروری بلکہ متجاوز عن الحد تھے۔''[۱]

تاریخ ادب اردو سکسینہ (ترجمہ جناب مرزا محمد عسکری صاحب بی۔اے)

اس تاریخ کو جناب رام بابو سکسینہ ایم۔اے۔ایل۔ایل۔بی، ڈپٹی کلکٹر یوپی نے انگریزی زبان میں ''ہسٹری آف اردو لٹریچر'' کے نام سے لکھا تھا اور غالباً انگریزی داں طبقہ میں اس نے نہایت شہرت اور مقبولیت حاصل کر لی تھی لیکن خالص اردو داں طبقہ اس کے مطالعہ سے محروم تھا۔اس لئے جناب مرزا محمد عسکری صاحب بی۔اے، سابق ہڈ ٹرانسلیٹر گورنمنٹ آف انڈیا نے اس کو اردو زبان میں منتقل کر کے اس طبقہ پر ناقابل فراموش علمی احسان کیا ہے.....عبدالسلام صاحب کے مطابق اس کتاب کی تصنیف کا مقصد لوگوں کے دلوں میں ایسا ادب اردو کا ذوق پیدا کرنا ہے تاکہ اس کے ذریعہ ہندو مسلم اتحاد میں ترقی ہو اور یہ مقصد نہایت شریفانہ ہے۔کتاب میں جو خامیاں ہیں مصنف نے فراخ دلی سے اس کو بیان کر دیا ہے۔

بعض واقعات اصل کتاب میں اجمالاً بیان ہوئے تھے لیکن اردو ترجمہ میں ان کی تفصیل کر دی گئی ہے۔ترجمہ نہایت صاف اور شستہ عبارت میں کیا گیا ہے اور آخر میں ایک انڈکس بھی شامل ہے جس سے کتاب کی دلچسپی اور فائدہ میں اضافہ ہو گیا۔

اس مضمون میں عبدالسلام صاحب نے تاریخ ادب اردو سکسینہ کی تعریف کی ہے اور اس کے مترجم

۱۔ مقالات عبدالسلام، شاہ معین الدین احمد ندوی، ص ۸۲

کا بہترین ترجمہ نگار پر شکریہ ادا کرتے ہوئے لکھا ہے:

''چونکہ تمام مباحث کو اختصار کے ساتھ سمیٹنے کی کوشش کی گئی ہے اس لئے یہ کہنا صحیح ہے کہ کتاب میں سب کچھ ہے لیکن مکمل طور پر نہیں ہے۔ اگرچہ مترجم نے اپنے حواشی وتعلیقات سے یہ کمی بھی بڑی حد تک پوری کردی ہے۔'' [۱]

جام صہبائی : اس مضمون میں عبدالسلام صاحب نے رباعی کی طرف توجہ مبذول کرائی ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ رباعی کو کسی خاص شخص نے اپنا مظہر خیال نہیں بنایا۔ لیکن موجودہ دور کے شعرا میں امجد حیدرآبادی اور جناب عبدالسمیع پال اثر صہبائی نے اس کمی کی طرف توجہ کی ہے اور اس صنف سخن میں غیر معمولی کامیابی حاصل کی ہے جس سے ہماری زبان میں ایک بڑی کمی پوری ہوئی ہے۔ جناب اثر نے اپنے قطعات و رباعیات کا ایک چھوٹا سا حصہ مجموعہ جام صہبائی کے نام شائع کیا ہے۔

اس مجموعہ کے شروع میں خیام کی شان میں چند عقیدت مندانہ اشعار لکھے ہیں اور ان کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ رباعیاں خیام ہی کے رنگ میں لکھی گئی ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے مضامین پر ڈاکٹر اقبال کی مثنوی اسرار خودی اور پیام مشرق کا بھی اثر ہے.....ان اثرات سے یہ تمام رباعیاں رندانہ، صوفیانہ، حکیمانہ غرض مختلف خیالات کا مجموعہ بن گئی ہیں۔

کلیات عزیز : یہ خواجہ عزیز الدین صاحب عزیز مرحوم کے کلام کا مجموعہ ہے۔ جس کو ان کے حلف الرشید جناب خواجہ وصی الدین صاحب ریٹائرڈ ڈپٹی کلکٹر نے تمام کلام کا مکمل مجموعہ کافی کدوکاوش کے بعد چھپوا کر شائع کیا ہے۔ اس کتاب کی ضخامت پانچ سو صفحات سے زیادہ ہے۔ اس کلیات کی شروعات غزلوں سے ہوتی ہے۔ اس کے بعد قصائد، قطعات، مخمس اور ہفت بند سب ایک سلسلہ میں درج کئے گئے ہیں۔ پھر مثنویاں شروع ہوتی ہیں اور ان ہی کے سلسلہ میں الگ صفحات پر ان کی تشریحات بھی درج ہیں۔ اس کے بعد تاریخی قطعات اور رباعیوں کا سلسلہ ہے۔ پھر تقریبات کے مختلف رقعات درج ہیں اس کے بعد خواجہ صاحب مرحوم کی ابتدائے مشق کی غزلیں سامنے آتی ہیں۔ پھر متفرق نظموں کی باری آتی ہے۔ جن میں

۱۔ مقالات عبدالسلام، شاہ معین الدین احمد ندوی، ص ۸۸

مخمس، نعتیہ غزلیں، قطعات، تاریخ، نعتیہ قصیدے، مسدس، مرثیے، رقعے سب کچھ شامل ہیں۔ پھر ابتدائی کلام کا بقیہ حصہ شامل کیا گیا ہے۔ اس کے بعد مثنوی گلگشت کشمیر کا نمبر آتا ہے اور اسی سلسلہ میں اس کی تشریحات بھی داخل ہیں۔ ان سب کے بعد نثر کا حصہ ہے جو زیادہ تر مکتوبات پر مشتمل ہے۔ آخر میں وہ تاریخی قطعات درج ہیں جو خواجہ صاحب مرحوم کی وفات پر مختلف شعرا نے لکھے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ یہ ترتیب قابل اطمینان نہیں ہے۔ اس مضمون میں غزل، قصیدہ، مثنوی، نثر ان سب پر تفصیلاً روشنی ڈالی گئی ہے۔

ایک قدیم دکھنی شعر : اس مقالہ کی ابتداء عبدالسلام صاحب نے ایک قدیم دکنی زبان میں اردو کے ایک شعر سے کی ہے۔

کن دھر کہوں کان جاون میں، مجھ دل پہ بہل بچھرات ہے

ایک بات کئے ہوں گے سجن یہاں جیو بارہ مات ہے

یہ شعر شعر الہند حصہ اول کے صفحہ ۲۴ میں ان ہی الفاظ کے ساتھ نقل ہوا ہے۔ لیکن کس تذکرے کا ہے اس کے بارے میں عبدالسلام صاحب یقین سے کچھ نہیں کہہ رہے ہیں۔ تذکرہ گلشن ہند میں یہ شعر غیر یقینی طور پر میر ابوالحسن تانا شاہ کی طرف منسوب کیا گیا لیکن قائم نے اس شعر کو تھوڑی سی تبدیلی کے ساتھ عبداللہ قطب شاہ کی طرف منسوب کیا ہے۔ عبدالسلام صاحب اس شعر کے متعلق لکھتے ہیں کہ:

> ''شعر کسی کا ہو، اور کتنے ہی مختلف الفاظ میں نقل کیا گیا ہو اس کے نقل کرنے سے ان تذکرہ نویسوں کو صرف ابتدائی زبان اردو اور ابتدائی رنگ تغزل کا نمونہ دکھانا مقصود تھا اس لئے کسی نے اس کے الفاظ و معنی کی تحقیق نہیں کی۔ شعر الہند میں بھی یہ شعر اسی حیثیت سے نقل کر دیا گیا..... جہاں تک میں نے غور کیا ہے شعر الہند میں یہ شعر جس تذکرے سے نقل کیا گیا ہے وہ بالکل غلط ہے۔'' [۱]

۱۔ مقالات عبدالسلام، شاہ معین الدین احمد ندوی، ص ۱۱۲

اس کے علاوہ تذکرہ گلشن ہند اور میر حسن کے نسخہ میں تھوڑی غلطیاں ہیں۔ البتہ قائم نے جو شعر نقل کیا ہے وہ بالکل صحیح ہے اور اس کا مطلب بھی صحیح ہے۔

نغمۂ دل : یعنی مجموعہ کلام جناب حکیم ضمیر حسن خاں صاحب دل شاہجہاں پور۔

اس مضمون میں عبدالسلام صاحب نے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ دلی اور لکھنؤ اسکول نے کس کس علاقے پر اپنے کیا تاثرات ڈالے چنانچہ ذیل میں لکھتے ہیں کہ روہیل کھنڈ کے پٹھانوں کی ٹھوس طبیعت جب شاعری کی طرف متوجہ ہوئی تو اس نے سنجیدگی کے قالب میں ظہور کیا اور اساتذہ دلی کا رنگ کلام اختیار کیا۔ اس مجموعہ کلام کی جو خصوصیت عبدالسلام صاحب کے ذوق سلیم پر اثر انداز ہوتی ہے وہ متانت اور سنجیدگی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''ان کے کلام میں کوئی غیر مہذب، غیر سنجیدہ، مبتذل اور رکیک لفظ عریاں مضمون نہیں مل سکتا۔ یہاں تک کہ وصل اور قید کے الفاظ جن کے سبب غزل میں لطیف وخوش گوار مضامین کے ساتھ بہت سے مبتذل وسوقیانہ مضامین بھی شامل ہوگئے ہیں۔ ان کے کلام میں سرے سے موجود ہی نہیں ہیں۔ شاید یہ .....موجودہ دور کی شاعرانہ اصلاحات کا اثر ہے۔ لیکن انھوں نے اپنی غزلوں کو خود قدیم وجدید دو حصوں میں تقسیم کردیا ہے۔ لیکن قدیم غزلوں میں بھی اس قسم کے الفاظ ومضامین نہیں ملتے۔ اس لئے حضرت نیاز فتح پوری کے نزدیک ان کے قدیم وجدید کلام میں امتیاز پیدا کرنا سخت مشکل ہے۔ لیکن ہمارے (عبدالسلام) کے نزدیک لکھنؤ کی صرف یہی خصوصیت نہیں ہے کہ وہاں کی شاعری میں متانت وسنجیدگی کم پائی جاتی ہے، بلکہ اس کی خصوصیت اس کا وہ شاعرانہ استدلال بھی ہے جو جذبات کی آمیزش سے بالکل خالی ہوتا ہے۔ اس لئے اس کو صرف ایک خشک شاعرانہ منطق کہہ سکتے ہیں اور اس کی

مثالیں بعض جگہ ان کی قدیم غزلوں میں نظر آ جاتی ہیں۔'' [۱]

مشاعرہ : مشرقی ممالک میں مشاعرہ اردو شعر و ادب کی ترقی اور شعراء کے مسابقہ و مقابلہ کا ایک بڑا ذریعہ سمجھا جاتا رہا۔ زمانۂ جاہلیت میں بھی مشاعرہ کا رواج تھا شعرا مختلف موسمی بازاروں مثلاً عکاظ وغیرہ میں جمع ہوتے ہیں اور اپنے کلام سے سامعین و حاضرین کو محظوظ کرتے تھے۔ فارسی اور اردو شاعری کا دوسرا دور شروع ہوا تو مشاعرے کا رواج اور زیادہ بڑھ گیا۔ عبدالسلام صاحب نے ایران اور ہندوستان میں بھی مشاعرے کی تاریخی حیثیت پر بحث کی ہے۔ دور جدید میں مشاعرے کی اصلاح و ترقی سے متعلق لکھتے ہیں:

> دور جدید میں اگرچہ مشاعرے کی قدیم شکل بھی قائم رہی۔ تاہم اس دور میں اردو شاعری کی اصلاح کے ساتھ مشاعروں کی بھی اصلاح ہوئی۔ اور سب سے پہلے کرنل ہالرائڈ ڈائرکٹر سررشتہ تعلیم نے جب اردو شاعری کی اصلاح کی طرف توجہ کی تو اس سلسلے میں انھوں نے ایک بزم مشاعرہ بھی قائم کی جس میں مصرع طرح کے بجائے کوئی خاص مضمون دیا جاتا تھا تاکہ عاشقانہ مضامین کی جگہ مناظر قدرت اور جذبات انسانی پر شعرا طبع آزمائی کر سکیں..... اسی مشاعرے کے ذریعہ سے جدید شاعری کا آغاز ہوا۔ اگرچہ عام طور پر اس قسم کے مشاعروں کا رواج نہ ہو سکا۔ تاہم اب بھی کبھی کبھی اس قسم کے مشاعرے ہوتے رہتے ہیں، جن میں غزل کے بجائے مختلف موضوع پر نظمیں پڑھی جاتی ہیں۔ اس لئے ان کے ذریعہ سے ایک نوع کی شاعری کے بجائے مختلف نوع کی شاعری کو ترقی ہوتی ہے۔'' [۲]

جہاں آرزو : یہ مقالہ فروری ۱۹۳۷ء میں معارف میں شائع ہوا۔ یہ جناب سید انور حسین صاحب آرزو

۱۔ مقالات عبدالسلام، شاہ معین الدین احمد ندوی، ص ۱۱۴۔۱۱۵

۲۔ ایضاً، ص ۱۲۹۔۱۳۰

لکھنو کے کلام کا مجموعہ ہے۔ سید انور حسین آرزو کا شمار دور جدید کے شعرا میں ہوتا ہے۔ یہ سید ضامن علی جلال لکھنوی کے شاگردوں میں سے تھے اور انھوں نے ان کی قائم کردہ روش کو کافی ترقی دی۔ جہاں آرزو ان کے جدید رنگ کی شاعری کا دوسرا دیوان ہے ان کے کلام کی خصوصیت یہ ہے کہ آرزو صاحب بہت سی غزلوں میں نامانوس قافیے استعمال کرتے ہیں جن کی تعداد محدود ہوئی ہے۔ اور اس وجہ سے شعرا اپنی غزلوں میں ان قافیوں کو کم استعمال کرتے ہیں۔ ان کی بعض غزلیں ایسی ہیں جن کا مضمون بجائے ایک شعر کے دو شعروں میں تمام ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی اکثر مثالیں حسن تغزل سے معرا ہیں۔ ان کے اشعار پڑھتے چلے جایئے مگر یہ معلوم ہی نہیں ہوگا کہ ہم غزل کے اشعار پڑھ رہے ہیں۔

ان کے کلام میں اغلاق وابہام نہیں ہوتا۔ مصنوعی فارسی ترکیبیں تصنیف وفلسفہ کے پیچیدہ مسائل بھی ان کے کلام میں نہیں ہوتے پھر بھی ان کا دیوان بدمزہ اشعار سے بھرا ہوا ہے۔ کہیں کہیں کچھ اشعار معیار تغزل کے مطابق ان کے قلم سے ٹپک پڑے ہیں اور یہی اس دیوان کا حاصل ہے۔

بہارستان : یہ مولانا ظفر علی کے کلام کا مجموعہ ہے

اس ریویو میں مولانا عبدالسلام صاحب ندوی نے اپنی بے لاگ رائے کا اظہار کیا ہے۔ مولانا ندوی نے مولانا ظفر علی خاں کے کلام کو دور جدید کی پیداوار بتایا ہے۔ دور جدید میں قدیم شاعری پر سب سے بڑا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ وہ مضمون اور اسلوب بیان دونوں حیثیتوں سے ایک محدود چیز ہے۔ لیکن دور جدید کا کوئی بھی شاعر اپنے آپ کو پرانے قیود وحدود سے بالکل آزاد نہیں کر سکا۔

لیکن جس شخص نے اردو زبان کی شاعری میں وسعت پیدا کی ہے اور اس کو غیر محدود مضامین کا مجموعہ بنا دیا وہ مولانا ظفر علی خاں ہیں۔ غزل کی ضرورت صرف اس لئے تسلیم کی گئی ہے کہ انسان کے دل میں ہر وقت سیکڑوں مفرد اور بسیط خیالات پیدا ہوتے رہتے ہیں جو طویل نظموں میں ادا نہیں ہو سکتے۔ وہ صرف غزل کے مفرد اشعار میں ادا ہو سکتے ہیں۔ واقعات کے تنوع اور مضامین کی بوقلمونی کے ساتھ ساتھ مولانا ظفر علی خاں نے شاعرانہ حیثیت سے بھی اردو شاعری میں بہت زیادہ وسعت اور رنگینی پیدا کی

ہے۔عبدالسلام صاحب ان کی شاعری پر اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

''مولانا کی شاعری گو دور جدید کی پیداوار ہے تاہم یہ بلا مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ اصول فن کا سر رشتہ ان کے ہاتھ سے کہیں نہیں چھوٹا۔ پنجاب کے اکثر شعرا پر حرف گیری بھی کی گئی ہے۔ مگر ظفر علی خاں کا چمنستان اس خاور خس سے تمام تر پاک ہے۔ ان میں استادانہ قادر الکلامی ہے اور خصوصیت کے ساتھ ''ہجو ملیح'' اور طنز ان کی شاعری کا اصلی میدان ہے.....غرض مختلف حیثیتوں سے یہ مجموعہ ہر مذاق کے لوگوں کی دلچسپی کا سامان مہیا کر سکتا ہے۔''[۱]

خطبۂ صدارت : (انجمن جامعہ ادبیہ کان پور) یہ خطبہ انتہائی پر مغز ہے اور مولانا عبدالسلام صاحب کے وسعت معلومات پر دلالت کرتا ہے۔ اس میں عبدالسلام صاحب نے نثر کو ادبی حیثیت کے ساتھ افادی حیثیت سے بھی نظم پر ترجیح دی ہے۔ نثر زیادہ تر اخلاقی، معاشرتی، تمدنی، سیاسی اور مذہبی مضامین پر مشتمل ہے۔ اس خطبہ میں نثر سے متعلق مولانا نے چند نکات پیش کئے ہیں۔

۱۔نثر کا ایک اہم موضوع تصوف و اخلاق ہے ۲۔نثر کا دوسرا اہم مظہر تاریخ و سیر کی کتابیں ہیں۔۳۔نثر کا ایک پر جوش مظہر سیاست ہے۔۴۔عام تذکروں، سطحی تاریخوں اور خیالی مضامین میں بھی نثر کی شگفتگی ظاہر ہو سکتی ہے۔ ۵۔تنقیدی لٹریچر بھی نثر کا ایک بڑا میدان ہے۔ ۶۔مذہبی، اخلاقی، اصلاحی اور تعلیمی لٹریچر بھی نثر کے لئے بہت زیادہ موزوں ہے۔ ۷۔جدید فلسفہ میں نفسیاتی اور اجتماعی مباحث میں بھی نثاری و انشا پردازی کے جوہر دکھائے جا سکتے ہیں۔ ۸۔ناول اور افسانے سب سے زیادہ نثر کے لئے موزوں ہے۔ ۹۔نثر کا دلچسپ مظہر ادیبانہ یا ظریفانہ خط و کتابت ہے۔ ۱۰۔نثر کا ایک بڑا وسیع میدان خطبہ اور تقریریں ہیں۔

۱۔ مقالات عبدالسلام، شاہ معین الدین احمد ندوی، ص ۱۴۳

خطبۂ صدارت مشاعرہ نمایش اعظم گڑھ (منعقدہ فروری ۱۹۴۲ء)

اس خطبہ صدارت میں عبدالسلام ندوی صاحب نے صنف غزل پر تفصیل سے بحث کی ہے۔

شفق : یہ شفیق جونپوری کے کلام کا مجموعہ ہے۔ مولانا عبدالسلام صاحب ندوی اس مجموعہ کو دیکھنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں:

> ''اصولاً وہ شعرا کے اس گروہ میں داخل ہیں جو شاعری کے قدیم و جدید دونوں اسکولوں کی آمیزش سے ایک ایسی طرز پیدا کرنا چاہتا ہے، جس میں قدیم و جدید دونوں زندگیوں کی جھلک نظر آئے۔'' [۱]

یہی خیال ہے جس کو انھوں نے شاعرانہ ابہام کے ساتھ اپنی غزل کے ایک شعر میں بھی ظاہر کیا ہے۔

تغیر کی ضرورت ہے مگر ہو انقلاب ایسا　　جو ماضی کے بھی کچھ آثار مستقبل میں رہنے دے

اور ان کا تمام کلام اس کی شہادت دیتا ہے کہ انھوں نے اس اصول کی پورے طور پر پابندی کی ہے اور اس کی پابندی نے ان کے کلام کو قدیم و جدید دونوں دور کے شعرا سے ممتاز کر دیا ہے۔

عبدالسلام صاحب ندوی شفیق جونپوری کے مجموعہ کلام ''شفق'' کے اشعار اور نظموں سے کافی متاثر اور ان کی ذات کے قدردان نظر آتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''ممکن ہے کہ اس دور میں ان سے بہتر شاعر موجود ہوں لیکن یہ یقین ہے کہ اس دور کے شعرا میں شفیق سے زیادہ پاکیزہ خو کوئی شاعر نہیں ..... شفیق کے اشعار میں جو ثقاہت اور پاکیزگی پائی جاتی ہے وہ تمام قرآن کے ذاتی محاسن اخلاق کا عکس ہے کہ الاناء یترشح بما فیہ۔ اس لئے ہمارے نزدیک اس پاکباز شاعر کے پاکیزہ اشعار کے ساتھ اس کے محاسن اخلاق کی بھی داد ملنی چاہئے۔'' [۲]

یہ مقالہ مئی ۱۹۴۶ء میں معارف میں شائع ہوا۔

۱۔ مقالات عبدالسلام، شاہ معین الدین احمد ندوی، ص ۱۷۸

۲۔ ایضاً، ص ۱۹۵

مرأۃ الشعر (جلد دوم) (مولفہ مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا)

یہ مضمون اپریل ۱۹۵۱ء میں معارف میں شائع ہوا۔ یہ مقالہ مولوی محمد یحییٰ صاحب تنہا جنھوں نے انگریزی زبان سے بہت سی کتابوں کا ترجمہ کیا ہے اور اس سلسلے کو وسعت دی ہے اور اردو زبان کے ادباء اور شعراء کے حالات میں مبسوط کتابیں لکھیں جس میں ان کی پہلی کتاب سیر المصنفین ہے جو اردو زبان کے مشہور مصنفین کے حالات وتنقید پر مبنی ہے۔ دوسری کتاب مرأۃ الشعر ہے جس کی پہلی جلد میں انھوں نے شعرائے قدیم کے حالات لکھے ہیں۔ ان کے کلام پر تنقید کی ہے اور ان کے منتخب اشعار درج کئے ہیں۔ دوسری جلد میں انھوں نے زیادہ تر شعرائے جدید کے حالات لکھے ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ انھوں نے امیرؔ، داغؔ، جلال ریاضؔ اور جلیلؔ کے حالات بھی شامل کر لئے ہیں۔ جو اگر چہ قدیم رنگ کے متبع اور پیرو ہیں۔

اس تذکرے سے متعلق عبدالسلام صاحب یہ نتائج اخذ کرتے ہیں:

> ''غرض جہاں تک انتخاب کا تعلق ہے اس لحاظ سے یہ تذکرہ نہایت ناقص و نامکمل ہے۔ جتنے اشعار انھوں نے انتخاب کئے ہیں ان کی نسبت یہ نہیں کہا جاسکتا وہ قابل انتخاب ہیں یا جتنے اشعار انھوں نے چھوڑ دیئے ہیں وہ قابل انتخاب نہیں ہیں۔
>
> اگر چہ اس تذکرہ میں انھوں نے صرف شعراء کی مدح سرائی نہیں کی ہے بلکہ ان پر تنقید کی ہے لیکن ان تنقیدوں میں بھی کوئی خاص جدت و ندرت نہیں پائی جاتی۔''[۱]

گلبانگ : عبدالسلام صاحب کا یہ مضمون فروری ۱۹۵۳ء میں معارف میں شائع ہوا۔ جناب حافظ شمس الدین صاحب ایم۔اے، سابق لکچرر اردو فارسی پٹنہ کالج کا مجموعہ کلام گلبانگ کے نام سے شائع ہوا۔ اس مجموعہ میں انھوں نے بہار کے ادیبوں اور شاعروں کے ادبی وشعری ذوق کی تربیت ونشو ونما میں کافی حصہ

۱۔ مقالات عبدالسلام، شاہ معین الدین احمد ندوی، ص ۲۰۵

لیا ہے۔اس مجموعہ کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کسی خاص شاعر کے متبع ومقلد نہیں۔

عبدالسلام صاحب کے نزدیک ان کے اشعار میں الفاظ ومحاورات کی غلطیاں ہیں۔بعض اشعار تو متانت وثقاہت کے بالکل خلاف ہیں لیکن کمیوں کے ساتھ کچھ خوبیاں بھی بتائی ہیں۔

۱۔ ایک تو یہ کہ مولانا حالی نے لکھا ہے کہ غزل میں موسمی کیفیات کا سماں بھی دکھایا جاسکتا ہے اور شمس نے جابجا موسمی سماں نہایت خوبی سے دکھایا ہے۔

۲۔ کلام میں روانی، برجستگی اور صفائی کے ساتھ جابجا لطف زبان پایا جاتا ہے۔

۳۔ بعض فلسفیانہ اشعار بھی پائے جاتے ہیں۔

۴۔ ان کے کلام کا عام رنگ تو سادہ اور ہموار ہے لیکن جابجا عمدہ رنگین اور بلند اشعار بھی مل جاتے ہیں۔

ان خصوصیات کی وجہ سے اس مجموعہ کا مطالعہ لطف ولذت سے خالی نہیں۔

شاعری بطور پیشے کے : یہ مولانا عبدالسلام صاحب ندوی کا ایک طویل مضمون ہے جس میں انھوں نے فارسی اور اردو کے ان شعراء کا جائزہ لیا ہے جو شاعری کو پیشہ بنا کر اس سے کمائی کرتے تھے۔شروع میں شاعری بطور پیشے کے پسند نہیں کی جاتی تھی بلکہ جو بھی اس پیشے کو اپناتا تھا وہ ذلیل وخوار سمجھا جاتا تھا۔شعراء تفریح اور احسان کا شکریہ ادا کرنے کی خاطر شعر کہتے تھے۔لیکن بعد میں یہ بدعت شروع ہوئی کہ شاعری حصول زر کا ذریعہ بنائی گئی۔عرب میں سب سے پہلے یہ روش نابغہ ذبیانی نے اختیار کی۔اس نے بادشاہ کی مدح میں قصائد کہے اور صلے قبول کئے۔رفتہ رفتہ عربی شاعری کی یہ حالت ہوگئی کہ بجائے جوش طبع کے اس کا تمام تر دارومدار صلہ پر رہ گیا۔

فارسی شاعری کی ابتدا اس زمانہ میں ہوئی جب عربی شاعری کا دارومدار صرف مدح گوئی اور صلہ طلبی پر رہ گیا تھا۔فارسی میں صلہ طلبی کی یہ بدعت عباس مروزی نے خلیفہ مامون رشید کی مدح میں ایک قصیدہ لکھ کر شروع کی۔اردو شاعری میں بھی دربار مغلیہ اور نوابان اودھ وغیرہ کے یہاں شاعری کے ذریعہ صلہ طلبی کی بدعت شروع ہوئی جس کا سلسلہ آج تک کثرت سے جاری ہے۔

شاعری کی پیشہ وارانہ تاریخ کے سلسلے میں ہمارے لئے یہ بات قابل مسرت ہے کہ اردو شعرا کو

قصائد پیش کرنے اور صلہ وانعامات کے حاصل کرنے میں وہ زحمتیں اور مصیبتیں پیش نہیں آئیں جو شعرائے فارسی کو پیش آئی تھیں۔لیکن دور جدید میں اردو شاعروں کی حالت ناگفتہ بہ ہوگئی۔اب نہ امراو سلاطین کے دربار رہے اور نہ قصیدہ گوئی اور نہ صلہ وانعام کا رواج رہا۔اس لئے ایک مدت تک دور جدید کے شعرا کسمپرسی کی حالت میں رہے۔لیکن کچھ دنوں سے پبلک مشاعروں کا عام رواج ہوا تو شعرا کو بخششانہ خرچ دے کر بلوایا جاتا ہے۔یہ شعراء مشاعرے میں آکر اپنی غزل ترنم ریز لہجے میں سنا کر پبلک سے داد وتحسین حاصل کرتے ہیں اور اپنا طے شدہ بخششانہ خرچ لے کر واپس جاتے ہیں۔

لیکن اس پیشہ وارانہ شاعری کو اچھی نظر سے کبھی نہیں دیکھا گیا کیونکہ اس سے جو ادب پیدا ہوتا ہے اس کی بنیاد خوشامد پر ہوتی ہے۔

اردو شاعری میں انقلاب کیوں کر پیدا ہوا: ؟ (انقلاب کی عام تاریخ):

یہ مضمون عبدالسلام صاحب ندوی نے جون تا اگست تک قسط وار معارف میں ۱۹۵۳ء میں شائع کروایا تھا۔یہ مضمون کافی مبسوط ہے۔اس میں عبدالسلام صاحب نے تاریخ کی روشنی میں یہ بات ثابت کرنے کی سعی کی ہے کہ جب غالب قوم مغلوب قوم کے کلچر کو فنا کرنا چاہتی ہے تو سب سے پہلے اس کی نظر اس کی زبان اور شاعری پر پڑتی ہے جس کو وہ فنا کر دینا چاہتی ہے۔مولانا ندوی اس سے متعلق اس انداز میں روشنی ڈالتے ہیں:

''کسی قوم کے اجزاء میں اس کی زبان اور شاعری کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔اگر کسی قوم کی زبان اور شاعری کو مٹا دیا جائے یا اس میں ایسی تبدیلیاں پیدا کر دی جائیں کہ اس زبان اور اس زبان کی شاعری کی صورت ہی مسخ ہو جائے تو اس قوم کی قومی روح فنا ہو جائے گی۔کیونکہ کسی قوم کی زبان اور شاعری کو اس کی قومی روح سے خاص مناسبت ہوتی ہے۔اس لئے جب یہ مناسبت باقی نہ رہے گی جو ایک زندہ قوم میں حرکت پیدا کرتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ جب کسی قوم کو کسی قوم پر غلبہ حاصل ہوتا ہے تو سب سے پہلے وہ اس کی زبان اور اس کی شاعری کے فنا کرنے یا اس میں تبدیلی پیدا کرنے کی کوشش کرتی ہے۔لیکن غالب قوم

میں اگر سیاسی مہارت نہیں ہوتی تو وہ نہایت سرعت کے ساتھ مغلوب قوم کی زبان اور شاعری پر جارحانہ حملہ کر کے جلد سے جلد اس کو فنا کرنا چاہتی ہے.....لیکن جن قوموں کو مدت دراز تک حکومت کرنے کا موقع ملتا ہے ان میں لازمی طور پر سیاسی مہارت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ کسی قوم کی زبان اور شاعری کو بجبر نہیں مٹاتی۔ بلکہ اس میں ایسے خوبصورت تغیرات پیدا کرتی ہے کہ خود اس قوم کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ اس کا جو کلچر زبان اور شاعری کی صورت میں زندہ اور محفوظ تھا، فنا کیا جا رہا ہے۔ بلکہ وہ خود اپنی زبان اور شاعری کی ان خوبصورت تبدیلیوں پر فریفتہ ہو کر ان کی تقلید کرنے لگتی ہے اور اس قسم کی خوبصورت تبدیلی کی سب سے پہلی مثال ہمارے سامنے ایرانی قوم کی سیاسی مہارت نے پیش کی ہے جس کے ذریعہ سے اس نے عربی شاعری کی روح کو فنا کر دیا ہے۔''[1]

اس مضمون میں مولانا ندوی نے عربی شاعری اور اس کے زوال کا ذکر کافی تفصیل سے کیا ہے۔

عربی شاعری کے زوال کے بعد فارسی شاعری کا دور شروع ہوا اور اس حیثیت سے وہ عربی شاعری سے ممتاز تھی۔ اور اس میں جو تغیر و انقلابات تھے وہ ایران کے تمدنی اور مذہبی انقلابات کی پیداوار تھے۔ شروع میں فارسی شاعری نے عربی شاعری کا اثر قبول کیا لیکن بعد میں اس کا ڈھانچہ بالکل بدل گیا۔ شیراز میں خواجہ حافظ نے غزل کو رندی، سرمستی، صوفیانہ اور فلسفیانہ عقائد و خیالات سے لبریز کر دیا۔ چنانچہ غزل میں ایک عظیم الشان انقلاب پیدا ہو گیا۔ اور غزل ہر قسم کے مضامین کا مجموعہ بن گئی۔ خواجہ حافظ کے بعد فغانی کا دور شروع ہوا تو اس دور میں غزل، تصوف، اخلاق اور فلسفہ و منطق کا مجموعہ بن گئی۔

فارسی شاعری کے اسی دور انحطاط پر اردو شاعری وجود میں آئی۔ جس کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ اس کی ابتدا دکن سے شروع ہوئی اور ولی دکنی کو اردو کا سب سے پہلا شاعر قرار دیا گیا۔ لیکن عبدالسلام صاحب اس بات سے منکر ہیں۔ اس سلسلے میں وہ لکھتے ہیں:

''یہ دونوں باتیں غلط ہیں۔ اردو شاعری کی ابتداء نہ دکن سے ہوئی اور نہ اردو

۱۔ مقالات عبدالسلام، شاہ معین الدین احمد ندوی، ص ۲۳۶۔۲۳۷

کے سب سے پہلے شاعر ولی تھے۔ بلکہ دکن میں اردو اور ہندی دونوں زبانوں سے مختلف ایک خاص زبان بولی جاتی تھی۔ جس کو دکنی کہتے تھے۔ اس لئے وہاں کے شعرا اسی زبان میں شعر کہتے تھے.....ان شعرا کے اشعار کو جو دکنی زبان میں کہے گئے تھے اردو شاعری کی بنیاد قرار دینا سخت غلطی ہے..... اردو زبان چونکہ ایک مخلوط زبان ہے اس لئے دکنی زبان کے ساتھ ساتھ دکن میں وہ بھی موجود تھی۔ اور بعض شعرا اس زبان میں شعر کہنے کی کوشش کرتے تھے۔ لیکن چونکہ اب تک اردو زبان کا مستقل وجود نہیں ہوا تھا اس لئے ان میں اکثر الفاظ سنسکرت اور بھاکا کے پائے جاتے ہیں''۔[۱]

دنیا کی کوئی بھی مصنوعی چیز بغیر نمونہ و مثال کے نہیں بن سکتی۔ چنانچہ ہر قوم کی شاعری کے لئے ایک نمونہ و مثال کی ضرورت ہے۔ فارسی شاعری کے لئے عربی شاعری اور دکنی زبان کی شاعری کے لئے بھاکا زبان کی شاعری اور دوسرا فارسی شاعری کا نمونہ سامنے تھا۔ چنانچہ دکنی زبان کی شاعری نے ان دونوں کی تقلید کی۔

اس مضمون میں عبدالسلام ندوی نے قدماء کے پہلے دور سے لے کر دور جدید تک کے سبھی شعرا کا تذکرہ تفصیل سے کیا ہے۔ اور اردو شاعری میں جو تغیرات و انقلابات رونما ہوئے ان سب کی اجمالی تاریخ پیش نظر رکھتے ہوئے جو نتائج ان کے سامنے آئے ان کو انھوں نے ان نکات میں پیش کئے ہیں۔

۱۔ سب سے پہلے ایرانی قوم نے عربی شاعری کے طریقۂ تشبیب میں انقلاباً تغیر و انقلاب پیدا کرنا چاہا اور خلفاء عباسیہ کی روک ٹوک کے باوجود اس میں کامیاب بھی ہو گئے۔

۲۔ لیکن اس کامیابی کے بعد انھوں نے جو طریقہ تشبیب اختیار کیا وہ اہل عرب کے طریقہ تشبیب سے زیادہ وسیع، تمدن سے زیادہ قریب اور اس تمدنی دور کے شاعرانہ مذاق کے لئے زیادہ دلفریب تھا۔

۱۔ مقالات عبدالسلام، شاہ معین الدین احمد ندوی، ص ۲۴۹۔۲۵۰

۳۔ لیکن ایرانیوں نے اپنی دست درازیوں کو صرف عربی شاعری ہی تک محدود رکھا۔ خود عربی زبان پر انھوں نے دست تطاول دراز نہیں کیا۔

۴۔ اس کے بعد فارسی شاعری میں جو تغیرات وانقلابات پیدا ہوئے وہ کسی قوم کے بغض وعداوت یا جذبۂ انتقام کا نتیجہ نہ تھے بلکہ مذہبی تغیرات، علمی اثرات اور اخلاقی انحطاط نے ان کو پیدا کیا تھا۔ اس لئے وہ مختلف مذاہب، مختلف علوم اور مختلف بداخلاقیوں سے متاثر ہوئی ہے۔ اور اسی سلسلہ میں اس پر ہندو مذہب کا بھی اثر پڑا اور زناز، برہمن، ناقوس اور بت کدہ وغیرہ اس کا جزو لاینفک ہو گئے ہیں اور اردو شاعری نے بھی تقلیداً ان مضامین کو اپنے اندر جذب کر لیا ہے۔

۵۔ ان سب کے بعد انگریزی دور حکومت شروع ہوا تو انگریزوں نے بھی اپنے تمدنی اور علمی اثرات کی توسیع کے لئے اردو شاعری میں انقلاب پیدا کرنا چاہا۔ جس کی عملی کوشش کا ظہور کرنل ہالرائڈ کے غیر طرحی مشاعروں اور مجالس شعر وسخن کی صورت میں ہوا اور اس نے غزل کے علاوہ اردو شاعری میں مختلف اصناف کا اضافہ کر دیا اور گوناگوں موضوعات پر یورپین طرز کی نظمیں لکھی گئیں۔ اگرچہ غزل جیسی مقبول اور متداول صنف کا استیصال کلی اس دور انقلاب میں بھی نہ ہو سکا۔ تاہم مولانا حالی کی اصلاحی کوششوں کا جو میر و مصحفی کی تقلید کو چھوڑ کر مغربی رنگ کلام کو اختیار کر چکے تھے غیر معمولی اثر ہوا۔ اور اردو غزل گوئی نے ایک نیا قالب اختیار کر لیا۔ جو اگرچہ مختلف حیثیتوں سے قابل تنقید ہے تاہم اس کی جدت اور پاکیزگی میں کوئی شبہ نہیں۔

۶۔ ان تمام تغیرات کے بعد کانگریس گورنمنٹ برسر اقتدار آئی جو اگرچہ اپنے آپ کو ایک غیر جانب دار جمہوری حکومت کہتی ہے، لیکن اس حکومت کے اجزائے ترکیبی کچھ تو اکثریت کے ممتاز لیکن زیادہ تر اس اکثریت کے غیر ممتاز اشخاص ہیں۔ اگرچہ یہ لوگ اردو شاعری میں کسی قسم کا انقلاب پیدا نہیں کر سکتے تھے تاہم انھوں نے شاعری کے حدود سے باہر قدم رکھ کر خود اردو زبان کو فنا کرنا چاہا ہے جو اردو شاعری کی ماں ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ماں کے مرجانے کے بعد بچے کو دودھ نہیں مل سکتا۔ اس لئے وہ خود بخود مر جائے گا۔

اردو زبان کی موت کا یہ پیغام ہندو قوم کے بڑے طبقہ کی زبان پر ہے۔اس لئے اردو کے حامیوں کو یا تو اس پیغام کو صبر وسکون کے ساتھ قبول کر لینا چاہئے یا استقلال واستقامت کے ساتھ اس کا مقابلہ کرنا چاہئے۔ کیونکہ اس سے پہلے عربی شاعری اور اردو شاعری پر جو حملے ہوئے تھے وہ ادبی اور علمی تھے۔لیکن یہ ان پر ایک متعصّبانہ اور وحشیانہ حملہ ہے جس کا مقصد ہی اردو زبان کو مٹا دینا ہے۔

اردو غزل : یہ ڈاکٹر یوسف حسین خاں صاحب کے مضامین کا مجموعہ ہے۔

مارچ ۱۹۵۴ء میں مولانا عبدالسلام صاحب ندوی نے اس مجموعہ پر تبصرہ لکھ کر معارف میں شائع کروایا ہے۔اس مقالے میں مولانا ندوی لکھتے ہیں:

''موجودہ دور میں شاعری کے تمام صنفوں میں غزل کی سب سے زیادہ مخالفت کی گئی ہے۔اس کے کچھ اسباب بھی درج کئے گئے ہیں۔

۱۔ غزل زندگی کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتی۔

۲۔ غزل حسن وعشق کے معاملات کی شاعری ہے اور عشق عقل اور اخلاق دونوں کو خراب کر دینے والی چیز ہے۔

۳۔ غزل میں اکثر نہایت فحش، عریاں اور رکیک مضامین بیان کئے جاتے ہیں۔

۴۔ غزل میں وزن اور قافیہ کی پابندی کے ساتھ ردیف کی پابندی بھی ایک لازمی چیز ہے۔

۵۔ غزل میں وہ تفصیل نہیں پائی جاتی جس سے قومی ترقی واصلاح کے خیالات وضاحت کے ساتھ بیان کئے جائیں۔گو نظم کا کہنا بہ نسبت غزل کے زیادہ آسان ہے۔لیکن درحقیقت اعلیٰ درجہ کی غزل کا لکھنا سخت مشکل ہے۔

اس پس منظر میں زیر نظر مضمون پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا ندوی لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر صاحب تو عموماً فلسفیانہ طرز ادا میں لکھنے کے عادی ہیں اس لئے اس کتاب کے بہت سے مباحث عام لوگوں کی فہم سے بالاتر ہیں..... یہ کتاب غزل کی حمایت میں لکھی گئی ہے اور دور جدید میں جدید تعلیم یافتہ گروہ

غزل پر جن جن حیثیتوں سے اعتراض کرتا ہے ان کو غزل کے حامی بھی تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن اسی کے ساتھ غزل کا ایک حصہ ایسا بھی ہے جو ان اعتراضات کی زد سے محفوظ ہے اس لئے مختلف عنوانات قائم کر کے غزل کی انہی خوبیوں کو نمایاں کرنا چاہئے تھا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے ایسا نہیں کیا ہے بلکہ صرف دور قدیم اور دور جدید کے چند شعرا کے کلام پر تبصرہ کیا ہے۔''[۱]

عبدالسلام صاحب کے مطابق یوسف صاحب نے غزل پر جو تبصرہ کیا ہے اس کو سامنے رکھ کر غزل کے الفاظ و معانی پر غور کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ صرف نظم زندگی کے تمام حقائق کو بے نقاب نہیں کر سکتی۔ خارجی عالم کے علاوہ ایک باطنی دنیا بھی ہے جس کے اسرار کی عقدہ کشائی صرف غزل سے ہو سکتی ہے۔ اور ان اسرار کے اظہار کے لئے بہت سے خارجی محرکات کی ضرورت ہوتی ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے غزل پر اسی حیثیت سے تبصرہ کیا ہے اور ساتھ ساتھ شعرا کے کلام پر تنقید بھی کرتے گئے ہیں۔

اس کتاب میں ڈاکٹر صاحب نے جن اشعار کا انتخاب کیا ہے وہ عموماً متوسط درجہ کے ہیں۔ ان اشعار سے متعلق مولانا ندوی لکھتے ہیں:

''اس کتاب کے موضوع کے لحاظ سے ایسے اشعار انتخاب کرنے چاہئے تھے جن سے غزل کی حمایت ہو اور جو اعتراضات دور جدید میں غزل پر کئے جاتے ہیں وہ اٹھ جائیں۔ لیکن یہ انتخاب اس مقصد کو پورا نہیں کر سکتا۔ اس وقت اردو شاعری میں ایک عمدہ اور جامع انتخاب کی ضرورت ہے..... باوجود اس طویل کتاب کے اردو زبان میں اب تک ایک جامع کتاب بلکہ متعدد کتابوں کی ضرورت ہے۔ جن میں اردو شاعری کی ہر صنف پر مفصل تبصرہ ہو۔ عمدہ اشعار کا انتخاب کیا جائے اور جدید و قدیم شاعری کا موازنہ کیا جائے تا کہ یہ

۱۔ مقالات عبدالسلام، شاہ معین الدین احمد ندوی، ص ۲۸۲

معلوم ہو سکے کہ دور جدید میں اردو شاعری نے ترقی کی ہے یا تنزل کی طرف جارہی ہے۔'' [۱]

مواد شعر یعنی موضوع شاعری : اس مضمون میں مولانا نے ادب برائے زندگی اور ادب برائے ادب میں حد فاصل قائم کرتے ہوئے یہ دکھایا ہے کہ ادب برائے زندگی میں بھی ادب کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑنا چاہئے۔ ادب برائے ادب کا یہ نظریہ ہے کہ شاعری صرف جذبات کا نام ہے۔ اس تعلق سے مولانا عبدالسلام صاحب ندوی اس مضمون میں لکھتے ہیں:

''اس میں شبہ نہیں کی شاعری کا تعلق صرف جذبات سے ہے۔ اگر شاعری کی کوئی صنف مہیج جذبات نہ ہو تو وہ شاعری نہیں ہے۔ لیکن یہ کہنا بھی صحیح نہیں ہے کہ شاعری صرف جذبات کا نام ہے اور جو خارجی چیزیں محرک جذبات ہیں وہ شاعری کا موضوع نہیں ہوسکتیں۔ جذبات تو صرف دل و دماغ سے تعلق رکھتے ہیں لیکن بہت سی خارجی چیزیں ایسی ہیں جن کو جذبہ تو نہیں کہا جاسکتا لیکن محرک جذبات ضرور ہیں۔ اس لئے وہ بھی موضوع شاعری بن سکتی ہیں اور عربی فارسی اور اردو کے اکابر شعراء نے ان کو موضوع شاعری بنایا ہے۔'' [۲]

عبدالسلام صاحب نے اس سے متعلق چند نکات پیش کئے ہیں۔

۱۔ ہر وہ حسین چیز جس کو دیکھنے سے انسان کو مسرت حاصل ہوتی ہے..... اگر ان کی تصویر ایسے الفاظ میں کھینچی جائے جن کو سن کر انسان کو محسوس ہو کہ وہ بعینہٖ ان چیزوں کو دیکھتا ہے تو وہ شعر کا بہترین مواد ہیں اور اس قسم کی شاعری کو اعلیٰ درجہ کی شاعری کہا جاسکتا ہے۔ حالانکہ ان میں کوئی چیز جذبہ نہیں ہے صرف محرک جذبات ہے۔

۱۔ مقالات عبدالسلام، شاہ معین الدین احمد ندوی، ص ۲۸۷۔۲۸۸

۲۔ ایضاً، ص ۲۸۹۔۲۹۰

۲۔ شعر کا ایک بڑا موضوع انسان، انسان کے اوصاف اور اس کے لطیف جذبات ہیں۔ انسان سے جو چیزیں تعلق رکھتی ہیں اور شعر کا مواد بن سکتی ہیں ان میں غزل اور تشبیب بھی داخل ہے۔

۳۔ متناسب چیزوں کو ایک جگہ جمع کرنا بھی شعر کا بہترین مواد ہے۔

دلی اور لکھنؤ کی شاعری اور ایک کا اثر دوسرے پر : یہ مقالہ عبدالسلام ندوی نے سلسلہ وار جون، جولائی، اگست اور ستمبر ۱۹۵۶ء کے معارف میں لکھا تھا۔

قدماء کی شاعری کا دور ختم ہونے کے بعد شعرائے متوسطین کا پہلا دور شروع ہوا جس کی بنیاد ناسخ اور آتش نے لکھنؤ میں، مومن، غالب اور ذوق نے دلی میں ڈالی۔ لیکن شیخ ناسخ نے شعرائے دور قدیم کی سادہ روش کو پوری طرح بدل کر ایک نئی شاعرانہ روش قائم کی..... انھوں نے اردو زبان کی اس قدر مکمل اصلاح بھی کی کہ کسی جدید اصلاح کی گنجائش نہیں رہی۔ اردو زبان کا اصلاحی دور شاہ حاتم کے زمانہ سے شروع ہوا اور میر و مرزا، مصحفی و انشاء سب کے زمانے میں اصلاحی کام جاری رہا۔ لیکن شیخ امام بخش ناسخ نے جب شاعری کے میدان میں قدم رکھا تو انہیں محسوس ہوا کہ دور جدید کی بنیاد قائم کرنے کے لئے شاعری کے ساتھ اصلاح زبان کی بھی ضرورت ہے۔ چنانچہ انھوں نے ہر دور کے قابل اصلاح الفاظ کی اصلاح کی اور ان پر شدت سے عمل بھی کیا اور اپنے تلامذہ سے بھی کرایا۔ جب کہ موجودہ دور میں ان پر کچھ اعتراضات بھی وارد ہوئے۔

لیکن اردو زبان اور اردو شاعری پر شیخ امام بخش ناسخ کے یہ وہ احسانات ہیں جن پر لکھنؤ قیامت تک فخر کرے گا۔ لیکن مولانا عبدالسلام صاحب نے اس سلسلے میں یہ اعتراض کیا ہے کہ:

''زبان شعر اور شاعری الگ الگ تین لفظ ہیں اور تینوں کے معنی جدا جدا ہیں۔ ہم فراخ دلی کے ساتھ شیخ ناسخ کے اس احسان کا اعتراف کرتے ہیں کہ انھوں نے اردو زبان کی مکمل اصلاح کی اور شعر کو ایک موزوں قالب میں ڈھال دیا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ انھوں نے اس اصلاح یافتہ زبان میں جو شعر کہے ان میں شاعری بھی پائی جاتی ہے یا نہیں؟ یہی سوال ہے جس کے جواب میں ان کا دیوان غزل گوئی کا

ایک ایسا بدترین نمونہ پیش نظر کر دیتا ہے جو ہر حیثیت سے قابل اعتراض ہے۔ایک تو یہ ہے کہ

۱۔ غزل اور قصیدے کے حدود بالکل الگ الگ ہیں اور شیخ ناسخ سے پہلے قدما نے اس حدود سے آگے قدم نہیں رکھا تھا۔یعنی شوکت الفاظ اور مضمون آفرینی کو قصیدہ کے لئے اور سادہ خیالات اور صاف وشستہ زبان کو غزل کے لئے مخصوص کر دیا تھا.....اور شیخ ناسخ کا جرم بھی یہی ہے کہ انھوں نے قدما کی سادہ روش کو چھوڑ کر معنی ہائے تازہ کی طرف توجہ کی۔جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی اکثر نازک خیالیاں کوہ کندن اور کاہ برآوردن کا مصداق ہوگئیں اور کلام بے کیف اور بے اثر ہو کر رہ گیا۔

۲۔ غزل کا حقیقی عنصر صرف چند روحانی جذبات واحساسات ہیں اور قدما کی شاعری انہیں جذبات و احساسات سے لبریز تھی۔

۳۔ قدماء کے دور تک غزل عشق ومحبت کے جذبات تک محدود تھی۔فلسفہ اور اخلاق وغیرہ کے مضامین غزل میں بہت کم شامل کئے گئے تھے۔لیکن شیخ ناسخ نے عاشقانہ طرز کو کم کر کے ہر قسم کے مضامین کو غزل میں شامل کر لیا.....اور ایک ایسی شاعری پیدا ہوگئی جو کسی صنف سخن میں داخل نہیں ہوسکتی۔

۴۔ مثلاً رعایت یا ضلع جگت جو قدماء کے دور اول کی ایک یادگار تھی اور جس کی اصلاح مرزا مظہر جان جاناں اور سودا وغیرہ نے کی تھی۔اس کو شیخ ناسخ نے اپنے زمانے میں دوبارہ زندہ کیا۔

۵۔ یا مثلاً مسلسل گوئی جس کی ابتدا جرأت نے کی تھی۔اس نے شیخ ناسخ کے زمانے میں اس قدر ترقی کی کہ غزل گویا قصیدہ بن گئی۔

یہ تمام خصوصیتیں اگرچہ اس دور کے تمام شعرائے لکھنؤ کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔تاہم شیخ ناسخ اور تلامذہ ناسخ کا دامن ان کانٹوں میں بہت زیادہ الجھا ہوا تھا.....اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ناسخ اور ان کے تلامذہ کے ان مبتذل مکروہ،خشک بے کیف اور بے اثر مضامین نے لکھنؤ کی شاعرانہ فضا کو اس قدر تیرہ وتار بنا دیا کہ اگر آتش کدہ آتش کی چند اڑتی ہوئی چنگاریوں نے اس میں کسی قدر روشنی نہ پیدا کر دی ہوتی تو یہ خوشنما شہر قیامت تک اسی اندھیرے میں بھٹکتا پھرتا۔

لیکن خواجہ آتش کا کلام بھی ان معائب سے پوری طرح محفوظ نہیں ہے.....تاہم ان کے کلام میں چند خوبیاں ایسی ضرور ہیں جن کی وجہ سے ان میں تاثیر اور دلآویزی پیدا ہوگئی ہے۔

۱۔ ایک تو یہ کہ زبان نہایت صاف وشستہ ہے اور اشعار رواں اور بندشیں چست ہیں۔

۲۔ دوسرے یہ کہ رندانہ مضامین کو وہ اس جوش وسرمستی سے ادا کرتے ہیں کہ خواجہ حافظ کے لب ولہجہ کا دھوکا ہوتا ہے۔

۳۔ تیسرے یہ کہ ان کے کلام میں ایک فقیرانہ اور آزادانہ شان پائی جاتی ہے اور توکل وقناعت، استغنا، بے نیازی اور فقیرہ فاتحہ کے مضامین کو اس جوش کے ساتھ ادا کرتے ہیں کہ دل پر ان کا خاص اثر پڑتا ہے۔

۴۔ چوتھے یہ کہ لکھنؤ کی شاعری اگرچہ خواجہ صاحب کے زمانہ میں زلف وکاکل کے پھندے میں الجھ کر رہ گئی تھی.....تاہم جب وہ زلف وکاکل کے حلقہ سے نکل کر جذبات کی دنیا میں قدم رکھتے ہیں تو ان کی شاعری عشق ومحبت کے رموز واسرار کا آئینہ بن جاتی ہے۔

۵۔ پانچویں یہ کہ خارجی مضامین یعنی خال وخط اور زلف وکاکل وغیرہ کے مضامین سے اگرچہ شیخ ناسخ کی طرح ان کا دیوان بھی بھرا ہوا ہے تاہم وہ اپنے طرز ادا سے ان مضامین میں بہت کچھ دلچسپی اور لطافت پیدا کردیتے ہیں۔

۶۔ چھٹے یہ کہ ان کی تشبیہات نہایت سادہ مگر اسی کے ساتھ نہایت لطیف ہوتی ہیں۔

خواجہ آتش کی خصوصیات کے مقابلے میں ناسخ کی خصوصیات بھی درج کی گئی ہیں۔ اس کے بعد شعرائے دلی کا ذکر ہوا ہے کہ شعرائے دلی نے بھی وہی آتش وناسخ کا رنگ اختیار کیا تھا۔ چنانچہ دلی کے اساتذہ میں شاہ نصیر کا کلام تو نہایت واضح طور پر ناسخ ہی کی آواز بازگشت ہے۔ اس لئے ان کے کلام میں شیخ ناسخ کی تمام خصوصیات موجود ہیں۔ مومن خاں کے کلام میں بھی ناسخ کی طرز کے بکثرت اشعار ملتے ہیں۔

جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ابتداً انھوں نے ناسخ کا اثر قبول کیا تھا۔ لیکن یہ رنگ ان کی افتاد طبع کے خلاف تھا۔ اس لئے انھوں نے جرأت کے رنگ یعنی معاملہ بندی کی طرف توجہ کی۔ عبدالسلام

صاحب لکھتے ہیں:

''اصل یہ ہے کہ اس دور میں لکھنؤ کا پلہ مختلف وجوہ سے دلی سے بھاری تھا۔ اولاً تو ناسخ نے زبان کی اصلاح اس قدر مکمل طور پر کردی تھی کہ اہل دلی بھی ان کا لوہا مان گئے تھے۔ دوسرے یہ منطق وفلسفہ کی تعلیم وتعلم کا دور شباب تھا۔ اس لئے لوگ خواہ مخواہ دقیق وپیچیدہ مضمون آفرینی کی طرف مائل تھے جس میں ناسخ کو ید طولیٰ حاصل تھا۔''[1]

اس مضمون میں عبدالسلام صاحب نے قدمائے اہل ایران کی غزلوں کے جذبات وخیالات، متاخرین شعرائے ایران کی خصوصیات کا ذکر کیا ہے۔ مومن خاں مومن کے قصائد اور غالب کے قصائد کا بھی ذکر ہے۔ متوسطین کے دور سے متعلق عبدالسلام صاحب لکھتے ہیں:

متوسطین کے پہلے دور میں دلی نے لکھنؤ کے شاعرانہ اقتدار کے سامنے سر تسلیم خم کردیا تھا اور شیخ ابراہیم ذوق، شاہ نصیر اور ایک حد تک مومن بھی ناسخ کے پیرو ہوکر ان کے رنگ میں کہنے لگے تھے لیکن شعرائے دلی نے اس دور میں خواجہ آتش کے طرز کلام کی مطلق تقلید نہیں کی۔ اس لئے اس رنگ نے آتش اور تلامذہ آتش کے محدود دائرے سے باہر قدم نہیں نکالا۔ لیکن متوسطین کے دوسرے دور میں ناسخ کے اقتدار کا بالکل خاتمہ ہوگیا اور اب دلی میں آتش اور تلامذہ آتش کے طرز کلام کی تقلید کی جانے لگی کیونکہ جس طرح ناسخ نے اپنے دور میں مختلف قسم کی اصلاحیں کرکے دلی پر اپنا اثر قائم کرلیا تھا بعینہٖ اسی طرح اس دوسرے دور میں تلامذہ آتش نے بہت سی اصلاحیں کرکے دلی پر اپنا اثر قائم کرلیا۔

آتش کے تلامذہ کی روانی اور برجستگی کی خصوصیات نے مومن اور غالب کے تلامذہ کے کلام کو بھی متاثر کیا اور اب اس اثر سے مومن اور غالب کی پیچیدہ گوئی کا خاتمہ ہوگیا۔ اور طرز بیان میں سادگی اور زبان میں روانی پیدا ہوگئی۔ اس طرح مومن اور غالب کے تلامذہ بھی آتش کے تلامذہ سے متاثر ہوکر ان ہی

۱۔ مقالات عبدالسلام، شاہ معین الدین احمد ندوی، ص ۳۱۴

کا انداز اختیار کرنے لگے۔

تلامذہ آتش کے اثر سے جو برجستہ گوئی پیدا ہوئی تھی ترقی کر کے دلی نے نواب مرزا داغ جیسا شاعر پیدا کیا جن کی ذات پر اردو شاعری کے آخری دور میں دلی کو ناز تھا.....اس بنا پر اس دور میں بھی تلامذہ آتش کی بدولت لکھنؤ کی شاعری کا بول بالا رہا۔ اور شعرائے دلی نے ان کے خرمن فیض سے خوشہ چینی کی۔ اس کے علاوہ اس دور میں جتنے شاعرانہ تغیرات ہوئے ان سب کو شعرائے لکھنؤ ہی نے پیدا کیا۔ لیکن متوسطین کے دوسرے دور کے بعد کے زمانہ نے لکھنؤ کی شاعری کا ورق بالکل الٹ دیا اور تلامذہ آتش نے جو خوشنما گلدستہ تیار کیا تھا اس کی ایک ایک پنکھڑی نذر خزاں ہوگئی۔

اس مقالے میں عبدالسلام صاحب نے دلی اور لکھنؤ کی شاعری اور ایک نے دوسرے کا جو اثر قبول کیا اس پر کافی تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی ہے۔ اور اس دور کے تمام شعرا اور ان کے تلامذہ سے متعلق جنھوں نے اس دور میں رونما ہونے والے شعری اثرات کو قبول کیا۔ ان سے متعلق اپنے خیالات کو اس مضمون میں قلم بند کیا ہے اور شعرائے لکھنؤ اور شعرائے دلی کے کلام کا ایک نہایت اجمالی موازنہ پیش کیا ہے۔ مضمون کے آخر میں عبدالسلام صاحب لکھتے ہیں:

> ''آخیر میں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ اگر چہ ہم داغ، امیر اور جلال سب کے تلامذہ کو اچھی نگاہ سے دیکھتے ہیں لیکن ہمارے نزدیک جس طرح جلال کو داغ اور امیر پر ترجیح ہے اسی طرح جلال کے تلامذہ کو بھی ہم داغ اور امیر کے تلامذہ سے بہتر سمجھتے ہیں کیونکہ ان کے الفاظ و معانی دونوں میں متغزلانہ شان پائی جاتی ہے اور یہ بات داغ اور امیر کے تلامذہ کو میسر نہیں۔
>
> اس دور میں غزل کے علاوہ شاعری کی کسی صنف نے ترقی نہیں کی بلکہ ان میں انحطاط آ گیا۔ اس تاریخی نکتہ کو اس لئے پیش نظر رکھنا چاہئے کہ شعرائے جدید کا زمانہ اسی دور میں آیا ہے۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ انھوں نے اس تنزل کو

اور بھی ترقی دی ہے اور شاعری کے تمام اصناف یعنی قصیدہ، مثنوی اور مرثیہ
وغیرہ کو چھوڑ کر نہایت محدود قسم کی شاعری پر اپنا زور طبع صرف کیا ہے۔'' [۱]

اردو شاعری میں فن تنقید : مولانا ندوی اردو شاعری اور فن تنقید سے متعلق لکھتے ہیں:

''ہماری اردو زبان میں فن تنقید کا جو ذخیرہ ہے وہ عربی اور فارسی زبان میں بھی نہیں ہے۔ لیکن اس زبان میں اس فن نے بتدریج ترقی کی۔ فارسی شاعری کے ابتدائی دور ترقی میں عربی زبان میں فن تنقید کا کافی ذخیرہ فراہم ہو چکا تھا اور چونکہ ایران میں شاعری کی ابتداء تعلیم و تعلم سے ہوئی۔ یعنی جو لوگ عربی زبان کے ماہر تھے اور عرب کے شعر و شاعری ان کے پیش نظر تھی انھوں نے اپنی زبان کی ترقی کے لئے زیادہ تر مداحی اور زر طلبی کے لئے شاعری شروع کی۔ جو شخص شاعر ہونا چاہتا تھا کتابوں کے ذریعہ سے اس کی تعلیم حاصل کرتا تھا۔ فارسی زبان میں بھی فن تنقید کا ذخیرہ قدماہی کے دور میں نہایت آسانی کے ساتھ فراہم ہو گیا۔ اس کے بعد متوسطین اور متاخرین کے زمانہ میں اگر چہ فارسی شاعری نے بے انتہا ترقی کی لیکن شعرا کے لئے صاحب علم ہونا ضروری نہیں رہ گیا۔ اس لئے اس زمانہ میں فن تنقید پر کوئی کتاب نہیں لکھی گئی اور شعر و ادب دونوں الگ الگ ہو گئے۔ پہلے شعرا شاعر ہونے کے ساتھ ادیب بھی ہوتے تھے لیکن متوسطین اور متاخرین کے زمانے میں صرف شاعر ہی شاعر رہ گئے، ادیبوں کا گروہ مفقود ہو گیا۔'' [۲]

چنانچہ اردو شاعری کی ابتداء اسی قسم کے کم مایہ لوگوں نے کی جن کے کلام سے تنقید کے اصول تو کیا قائم ہو سکتے تھے بلکہ ان کی شاعری ہی نا قابل اعتبار قرار پائی۔ اس لئے اس دور میں شاعری کی ترقی اور اس کی اصلاح کی صرف تین صورتیں تھیں۔

۱۔ سنسکرت و بھاشا کے طرز و خیالات کو چھوڑ کر فارسی شاعری کے مضامین اردو شاعری میں داخل کئے جائیں۔

۱۔ مقالات عبدالسلام، شاہ معین الدین احمد ندوی، ص ۳۶۲

۲۔ ایضاً، ص ۳۶۳۔۳۶۴

۲۔ دکنی زبان کو چھوڑ کر دلی کی فصیح زبان ومحاورے میں شعر کہے جائیں۔

۳۔ ان لفظی غلطیوں سے اجتناب کیا جائے جو آبرو اور ان کے معاصرین کے کلام میں پائی جاتی تھیں۔

اس کے علاوہ قدماء کے کلام میں جو لفظی غلطیاں پائی جاتی تھیں ان پر خصوصیت کے ساتھ اعتراضات کئے گئے۔ عبدالسلام ندوی قدماء کے دوسرے دور سے متعلق لکھتے ہیں:

> ''اس میں شبہ نہیں کہ قدما کے دوسرے دور کا رواج اس قدر زیادہ ہو گیا تھا کہ بعض اشخاص نے اس کو اپنا خاص مشغلہ بنالیا تھا۔ عام قاعدہ یہ ہے کہ جس زمانے میں کسی چیز سے لوگوں کو خاص دلچسپی پیدا ہو جاتی ہے بعض لوگ اس کو اپنا مخصوص فن یا مخصوص پیشہ بنالیتے ہیں۔ چنانچہ عربی شاعری کے دور ترقی میں تنقید کی طرف خاص توجہ مبذول ہوئی تو بعض اشخاص نے اس میں اس قدر مہارت پیدا کر لی کہ ہر شاعر کے کلام پر برجستہ نکتہ چینی کر سکتے ..... اردو شاعری کے دور ترقی میں بھی اس قسم کے بعض اشخاص پیدا ہو گئے تھے جن کا خاص مشغلہ شعرا پر نکتہ چینی کرنا تھا۔'' [۱]

آہستہ آہستہ فن تنقید نے ترقی کرتے ہوئے ایک مستقل فن کی حیثیت اختیار کر لی اور لوگوں نے اس موضوع پر ایک مستقل رسالے لکھنے شروع کر دیئے۔ چنانچہ عبدالغفور خاں نساخ نے میر انیس و مرزا دبیر کے اغلاط پر ایک مستقل رسالہ لکھا اور ان کے شاگرد مولوی عصمت اللہ نے ایک مستقل رسالے میں لکھنؤ کے تمام مشہور اساتذہ پر کثرت سے اعتراضات کئے ہیں۔

مولوی عصمت اللہ کی تنقیدوں سے معلوم ہوتا ہے کہ متوسطین کے دور تنقید میں زیادہ وسعت اور دقت نظری پیدا ہو گئی تھی۔ لیکن بہت سے شاعرانہ عیوب ایسے ہوتے ہیں جو کسی خاص دور یا کسی خاص مقام کی شاعری کے ساتھ مخصوص ہوتے ہیں اور متوسطین کے زمانے میں فن تنقید نے زیادہ وسعت اور ترقی

۱۔ مقالات عبدالسلام، شاہ معین الدین احمد ندوی، ص ۳۶۸

حاصل کی تو نقادانِ فن نے اس قسم کے عیوب کا بھی اظہار کیا ہے۔

عبدالسلام صاحب اس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

''قدماء کے زمانے سے لے کر متوسطین کے زمانے تک اردو شعرا کے کلام پر جو تنقیدیں کی گئیں ان کی نمایاں خصوصیتیں یہ ہیں کہ

۱۔ زیادہ تر لفظی تنقیدیں کی گئی ہیں۔ معانی و مطالب کو بہت کم پیش نظر رکھا گیا ہے۔

۲۔ معانی و مطالب کے ساتھ اصناف سخن کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا ہے۔

۳۔ تنقید میں صرف معائب کو پیش نظر رکھا گیا ہے اور محاسن بالکل نظر انداز کر دیئے گئے ہیں۔''

متاخرین کے زمانے میں مولانا حالی اور مولانا شبلی نے جو اعلیٰ درجہ شاعر ہونے کے ساتھ نہایت دقیق النظر اور وسیع المعلومات ادیب بھی تھے اس کمی کو پورا کر دیا اور سب سے پہلے مولانا حالی نے جدید تنقیدی خیالات سے متاثر ہو کر جدید فن تنقید کی بنیاد ڈالی اور مقدمہ شعر و شاعری میں اس کے اصول بیان کئے۔ ان کے زمانے تک اردو زبان میں فن تنقید کا جو سرمایہ موجود تھا، اس سے صرف یہ معلوم ہو سکتا تھا کہ کون شعر صحیح اور کون سا شعر غلط ہے۔ لیکن مولانا حالی نے اس سرسری مباحث کو چھوڑ کر یہ بتایا کہ ایک شعر باوجود صحیح ہونے کے کبھی اصلاحی نقطۂ نظر سے غلط ہو سکتا ہے۔ اس لئے ان کے اس تنقیدی کارنامے کو تنقید کے بجائے اصلاحی کارنامہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا۔

مولانا حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں جو اصلاحی اصول پیش کئے ہیں ان کے ذریعہ سے درحقیقت اسی اصلاحی تحریک اور اصلاحی دور کی تکمیل کی ہے اور قطرہ کو سمندر بنا دیا ہے۔ لیکن مقدمہ کے تمام مباحث اصلاحی اور تنقیدی حیثیت نہیں رکھتے بلکہ اس میں ضمناً و تبعاً بہت سی باتیں ایسی بھی آ گئی ہیں جن کو براہ راست اصلاح و تنقید سے کوئی تعلق نہیں۔

مولانا حالی کے نزدیک شاعر بننے کے لئے صرف موزوں طبع ہونا کافی تھا۔ باقی مضامین میں تشبیہات و استعارات کا ذخیرہ تو پہلے ہی سے موجود تھا۔ جس کو متعدد صدیوں سے لوگ دہراتے چلے آئے

تھے۔ایسی حالت میں اردو شاعری کی اصلاح کے لئے شعر کی حقیقت اور شعر کے تمام اجزا پر غور کرنا چاہئے اور اس حیثیت سے مولانا حالی نے سب سے پہلے اجزائے شعر میں وزن و قافیہ پر بحث کی ہے۔مولانا عبدالسلام صاحب نے اس مضمون میں مولانا حالی کے خیالات کی وضاحت کی ہے۔اردو شاعری میں خیالات کی آزادی کے مقابلہ میں وزن قافیہ اور ردیف کا لحاظ رکھنا ضروری ہے۔مولانا حالی کے نزدیک شعر کا یہ ضروری فرض ہے کہ جہاں تک ممکن ہو نئے اسلوب کم اختیار کریں اور زیادہ تر کلام کی بنیاد قدیم اسلوبوں اور معمول بہ الفاظ و محاورات پر رکھیں۔ان کے نزدیک شعر کے حسن و قبح کا ایک بڑا معیار تنقید روزمرہ اور محاورہ کا صحیح اور غلط استعمال ہے۔

مولانا حالی کے نزدیک قصیدہ شعر کی ایک نہایت ضروری صنف ہے۔مرثیہ کو مولانا حالی مدحیہ قصائد کی ایک صنف مانتے ہیں۔ان کا ماننا ہے کہ اخلاقی حیثیت سے بھی مرثیہ کا پایہ نہایت بلند ہے اور ایثار و قربانی، حق پرستی، حق گوئی اور صبر و تحمل کی جو اخلاقی مثالیں مرثیوں میں ملتی ہیں وہ اخلاقی کتابوں میں بھی بہ مشکل مل سکتی ہیں۔لیکن مولانا ان تمام خوبیوں کے باوجود نئے دھن کے شاعروں کو یہ صلاح نہیں دیتے کہ مرثیہ گوئی میں مرثیہ گویوں کی اتباع کریں۔

مثنوی مولانا حالی کے نزدیک شاعری کی ایک اہم صنف ہے اور اس میں ہر قسم کے مسلسل مضامین جو غزل، قصیدہ، مسدس، ترکیب بند اور ترجیع بند میں ادا نہیں کئے جاسکتے مگر اس میں نہایت خوبی کے ساتھ ادا کئے جاسکتے ہیں۔مولانا حالی وہ پہلے تنقید نگار ہیں جنھوں نے مثنوی کے کچھ اصول بتائے اور ان اصولوں کے مطابق اردو کی چند مشہور مثنویوں پر تنقید کی ہے۔

۱۔ سب سے مقدم ربط کلام ہے جو مثنوی اور ہر مسلسل نظم کی جان ہے.....مثنوی کے..... ہر بیت کو دوسری بیت سے ایسا تعلق ہونا چاہئے جو زنجیر کی ہر کڑی کو دوسری کڑی سے ہوتا ہے۔

۲۔ دوسرا اصول یہ ہے کہ جو قصہ مثنوی میں بیان کیا جائے اس کی بنیاد ناممکن اور مافوق العادۃ باتوں پر نہ رکھی جائے۔

۳۔ تیسرا اصول یہ ہے کہ مبالغہ سے احتراز کیا جائے۔

۴۔ چوتھا اصول یہ ہے کہ قصے کے بیان کرنے میں بلاغت کا سررشتہ ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے اور کوئی بات مقتضائے حال کے خلاف نہ کہی جائے۔

۵۔ پانچواں اصول یہ ہے کہ جو حالت کسی شخص یا کسی چیز یا کسی مکان وغیرہ کی بیان کی جائے وہ لفظاً و معناً نیچرل اور عادات کے موافق ایسی ہونی چاہئے جیسے کہ فی الواقع ہوا کرتی ہے۔

۶۔ قصہ میں اس بات کا لحاظ رکھنا ضروری ہے کہ ایک بیان دوسرے بیان کی تکذیب نہ کرے۔

۷۔ اس بات کا خیال رکھنا ضروری ہے کہ قصہ کے ضمن میں کوئی بات ایسی بیان نہ کی جائے جو تجربہ اور مشاہدہ کے خلاف ہو۔

اردو زبان کے ابتدائی فن تنقید سے متعلق عبدالسلام ندوی رقم طراز ہیں:

''اردو زبان میں فن تنقید کا جو ابتدائی ذخیرہ ہے وہ نہایت ناقص پراگندہ اور نامکمل ہے اس کی وضاحت یہ ہے کہ اردو زبان میں شاعر تو نہایت کثرت سے پیدا ہوئے لیکن ادیب بالکل نہیں پیدا ہوئے۔ عربی شاعری کی دور ترقی میں شعرا کے ساتھ اہل ادب کا ایک گروہ پیدا ہو گیا تھا۔ جو سخن گو تو نہ تھا لیکن سخن فہم تھا۔ یہ گروہ شعرا کے کلام کا نہایت تفصیل کے ساتھ مطالعہ کرتا تھا۔ اور ان میں جو محاسن و معائب نظر آتے تھے ان کا ایک نام رکھ لیتا تھا۔ عربی زبان میں فن تنقید کا جو ذخیرہ موجود ہے وہ ان ہی ادیبوں کے وسعت مطالعہ کا نتیجہ ہے اس بنا پر فن تنقید کوئی جامد اور غیر سیال چیز نہیں بلکہ غور و فکر اور وسعت مطالعہ کو جس قدر ترقی دی جائے اسی قدر اس فن میں اضافہ ہو سکتا ہے۔''[۱]

۱۔ مقالات عبدالسلام، شاہ معین الدین احمد ندوی، ص ۳۷۷

غالب مدح وقدح کی روشنی میں (اوّل دوم) سید صباح الدین عبدالرحمٰن

سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کا نام تحقیق وتخلیق اور علم وادب کی دنیا میں محتاج تعارف نہیں۔ علمی وادبی اور تحقیقی وتخلیقی کارناموں کے سلسلے میں دارالمصنفین اعظم گڑھ کی یہ روایت علامہ شبلی نعمانی سے ورثے میں ملی۔ شبلی کے بعد یہ روایت سید سلیمان ندوی اور شاہ معین الدین احمد ندوی سے ہوتی ہوئی سید صباح الدین عبدالرحمٰن تک پہنچی۔ سید صاحب نے اپنی تحقیقی خدمات سے اس روایت کو احسن ڈھنگ سے برقرار رکھنے کی حتی الامکان کوشش کی۔ انھوں نے مختلف عالمانہ ومحققانہ موضوعات پر قلم اٹھانے کے ساتھ ساتھ غالب اور خسرو پر بھی طبع آزمائی کی۔ زیر تبصرہ کتاب سید صاحب کی ادبی، تحقیقی وتنقیدی صلاحیت کا ایک دلچسپ وحسین خاکہ ہے جس کو ان کی ادبی صلاحیت کا آئینہ دار کہا جاسکتا ہے۔ صباح الدین صاحب کی یہ کتاب اردو کے تنقیدی ادب میں کافی اہمیت کی حامل ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے سید صباح الدین کے تنقیدی اسلوب کا امتیازی پہلو منظر عام پر آتا ہے۔ ''غالب مدح وقدح کی روشنی میں'' دو ضخیم جلدوں میں یکے بعد دیگرے ہمارے سامنے ہیں۔ پہلی جلد ۳۶۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ جس میں مرزا غالب کی زندگی سے لے کر ۱۹۲۸ء تک ان کی حمایت ومخالفت میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس پر ناقدانہ تبصرہ کیا ہے۔ دوسری جلد ۳۰۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس میں ۱۹۲۹ء سے لے کر ۱۹۶۹ء تک غالب کی شاعری کی حمایت ومخالفت میں جو کچھ تحریر کیا گیا ہے اس پر ناقدانہ تبصرہ کیا گیا ہے۔ بنیادی طور پر یہ کام تالیفی نوعیت کا ہے۔ کسی بھی تصنیف کا محرک وسبب کچھ نہ کچھ ضرور ہوتا ہے۔ یہ تصنیف اپنے موضوع پر سب سے منفرد اور غالباً سب سے پہلی تصنیف ہے۔ اس کی وجہ تالیف سے متعلق مصنف نے لکھا ہے کہ:

''اس کے اصل محرک سیماب اکبرآبادی کے صاحبزادے اور ''شاعر'' کے ایڈیٹر جناب اعجاز صدیقی صاحب ہیں۔ انھوں نے ممبئی میں دوران ملاقات گفتگو میں کہا کہ ہم ''شاعر'' کا غالب نمبر نکال رہے ہیں اس لئے آپ غالب پر ایک اچھا مضمون تحریر فرمادیں۔ مصنف نے ان سے عنوان تجویز کرنے کے لئے کہا جس پر انھوں نے کہا کہ غالب پر جو کچھ لکھا جاچکا ہے اس پر ناقدانہ تبصرہ کیا جائے۔ اسی زمانہ

میں اتر پردیش کے گورنر جناب بی گوپالا ریڈی دارالمصنفین تشریف لائے۔ انھیں بھی غالب سے کافی دلچسپی تھی۔ چنانچہ انھوں نے سید صاحب کو غالب پر لکھنے کے لئے مزید مہمیز کیا اور اس کو جاری رکھنے پر زور دیا۔ ان کا ماننا تھا کہ اس کتاب کی تکمیل میں غالب کو سمجھنے میں کافی مدد ملے گی۔ چنانچہ صباح الدین صاحب نے ''غالب مدح وقدح کی روشنی میں'' کے عنوان سے ایک مضمون لکھنا شروع کیا تو سلسلہ اس قدر دراز ہوگیا کہ اس کا کچھ حصہ معارف میں شائع ہوا تو دارالمصنفین کے بڑے قدرداں اور اردو زبان کے صاحب طرز ادیب اور نقاد جناب رشید احمد صدیقی صاحب نے نہ صرف خوشی کا اظہار کیا بلکہ سلسلہ جاری رکھنے پر مزید زور دیا۔

شبلی پوسٹ گریجویٹ کالج سے ریٹائر ہونے کے بعد صباح الدین صاحب کو یونیورسٹی گرانٹ کمیشن نے مذکورہ بالا موضوع پر کام کرنے کے لئے وظیفہ دیا اور اس موضوع کی باقاعدہ منظوری عمل میں آئی۔ سید صاحب نے اس موضوع پر از سر نو محنت شروع کی اور انتہائی مبارک گھڑی میں اس کی ابتدا کی اور پوری لگن کے ساتھ سید صاحب کا قلم چلا تو یہ موضوع اتنا پھیل گیا کہ ''غالب مدح وقدح'' کی دو ضخیم جلدیں تیار ہوگئیں۔

اسی درمیان سید صاحب علی گڑھ تشریف لائے اور رشید صاحب کی خدمت میں حاضر ہوئے تو زیادہ تر اس تصنیف کے بارے میں ہی باتیں ہوتی رہیں۔ یہاں تک کہ سید صاحب نے ان سے اس پر مقدمہ لکھنے کی فرمائش کر ڈالی۔ لیکن افسوس کتاب کی تکمیل سے پہلے ہی رشید صاحب اس دار فانی سے کوچ کر گئے اور یہ کتاب اپنے اصلی قدردان کے مقدمہ سے محروم ہوگئی۔ تاہم رشید صاحب نے اس کتاب پر اپنا اطمینان اور پسندیدگی ظاہر کردی تھی اور اس کی مقبولیت کی نوید سنا دی تھی۔ اس کتاب پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈاکٹر خورشید رضوی لکھتے ہیں:

> ''بنیادی طور پر یہ کام اگرچہ تالیفی نوعیت کا تھا جس میں بہت سی پرانی تحریروں کو یکجا کرنا تھا۔ تاہم خود سید صباح الدین صاحب کے بقول پرانی شراب کو

نئے مینا و ساغر میں انڈیلنا بھی ایک بڑا فن ہے۔ اکثر پرانی تحریریں نگاہوں سے یوں اوجھل اور حافظوں سے یوں محو ہو جاتی ہیں کہ ان کی بازیافت نظارہ اولین سے کم سرور آگیں نہیں ہوتی۔ چنانچہ مرزا صاحب کے معاصرین میں سے میر محمد خاں سرور، مصطفیٰ خاں شیفتہ، نواب ضیاء الدین نیر، مولوی کریم الدین، سرسید احمد خاں، امام بخش صہبائی، غلام غوث بے خبر، مولانا فضل حق، غلام علی وحشت، سید غوث علی قلندر، نواب جادرہ، غوث محمد خاں بہادر، امجد سندیلوی، عزیز لکھنوی وغیرہ نے غالب کے بارے میں جو کچھ کہا وہ ریکارڈ پر یقیناً موجود ہے، لیکن بہت سے قارئین پر یہ سارا مواد پہلی بار سید صباح الدین عبدالرحمٰن ہی کی محنت سے منکشف ہوا۔ بلکہ جو اہل نظر اس مواد کی لخت لخت تفصیلات سے واقف بھی تھے ان کے لئے بھی اس کا یوں مرتب صورت میں یکجا سامنے آنا بصیرت افروزی سے خالی نہ تھا۔ کیونکہ اس سے موضوع کے تناظر میں ایک نیا عمق پیدا ہوا۔ یہ منتشر معلومات الگ الگ بھی آئینوں کی طرح لو دیتی تھیں۔ لیکن آئینہ خانے میں عکس در عکس جو طلسم پیدا ہوتا ہے الگ الگ آئینوں میں اس کا ظہور ممکن نہیں۔ کسی نے درست ہی کہا ہے کہ کل اپنے اجزاء کے مجموعے سے کچھ زیادہ ہوتا ہے۔'' [۱]

اس میں کوئی شک نہیں کہ غالب کے بارے میں عنفوان شباب ہی سے اردو ادب میں جس قدر اہل علم محققین نے تحقیق کی، اور ان کی ادبی شخصیات کے بارے میں جتنے پہلو ہو سکتے تھے ہر پہلو پر طبع آزمائی کی اور ہر صنف سخن کے بارے میں مستقل و ضخیم کتابیں معرض وجود میں آئیں۔ ان پر جس قدر تحریریں اور مواد منظر عام پر آئے شاید ہی کوئی غالب کا حریف و مدمقابل ہو۔ اس قدر اوصاف کی حامل

۱۔ فکر و نظر پاکستان، سید صباح الدین عبدالرحمٰن نمبر، ص ۷۲۔۷۳

ہستی کی شعری وادبی شخصیت کے بارے میں کوئی نئی بات کہنا نئی چیز پیش کرنا ایسا ہی ہے جیسے علم کے دریا میں ڈوب کر موتی دستیاب کرنا۔ صباح الدین صاحب اس تصنیف میں پیش آنے والی مشکلات سے اچھی طرح آگاہ تھے کہ غالب کی شخصیت پر لکھنا سہل بھی ہے اور مشکل بھی۔ دیباچہ کا پہلا اقتباس ان کے اس خیال کی غمازی کر رہا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''غالب پر کچھ لکھنا آسان بھی ہے اور مشکل بھی۔ آسان اس لئے کہ غالب پر اتنا کچھ لکھا جا چکا ہے کہ جو چاہے اسی کے انبار میں سے کوئی چیز نکال کر کچھ نہ کچھ پیش کر سکتا ہے۔ مگر غالب سے متعلق کوئی نئی چیز پیش کرنا آسان نہیں بلکہ بہت مشکل ہے۔'' [۱]

لیکن سید صاحب نے ''غالب مدح وقدح کی روشنی میں'' کو ایک نئے انداز میں غالب کے متعلق اپنی تحریروں کو نئی تحقیق وجستجو سے صفحہ قرطاس پر منتقل کیا۔ سید صاحب سے پہلے غالب پر اس نقطۂ نظر سے کوئی کام نہیں ہوا تھا۔ اس کتاب سے غالبیات کو سمجھنے میں پوری مدد ملتی ہے۔ یہ کتاب تحقیق وتنقید کے سلسلہ میں ایک بلند پایہ کتاب ہے۔ صباح الدین صاحب اس کے دیباچہ میں اس طرح رقم طراز ہیں:

''غالب سے متعلق کچھ تحقیق کرنے یا ان کے شاعرانہ کمالات کے سلسلہ میں کسی رائے کے اظہار کرنے میں یہ مشکل پیش آتی ہے کہ اس کی تحقیق اور اس کی رائے کے بارے میں ہر شخص کا متفق ہو جانا ممکن نہیں۔ غالب اور ان کے کلام کی رنگارنگی کی بڑی خوبی یہ ہے کہ جو بات شدت کے ساتھ ان کی حمایت میں کہی جا سکتی ہے وہی ان کی مخالفت میں بھی استعمال ہو سکتی ہے۔ اور جس بات کو اچھال کر اس کی تنقیض کی جا سکتی ہے وہی ان کے لئے تقریظ بن سکتی ہے۔ پوری کتاب میں یہ جھولا مجھ کو جھولنا پڑا ہے۔ تنقیدوں پر تنقید اور تبصروں

۱۔ غالب مدح وقدح کی روشنی میں، جلد اوّل، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ص ا

پر تبصرہ کرنا آسان نہیں۔ اس میں میری تنقیدیں اور تبصرے جابجا نظر آئیں گئے۔[۱]

''غالب مدح وقدح کی روشنی میں'' سید صاحب نے غالب کے ہم عصر میر محمد سرور سے لے کر ڈاکٹر عبادت بریلوی تک ۷۵ شخصیات کے نقد وتبصرے زیر بحث لائے ہیں۔ حقیقت میں اس کتاب کی تالیف کر کے سید صاحب نے تحقیق وتنقید کا حق ادا کر دیا ہے۔ اس میں مصنف نے تحقیق کو تنقید سے گلے ملایا ہے۔ سید صاحب میر محمد خاں سرور اور غالب سے متعلق لکھتے ہیں کہ سرور نے اپنے تذکرہ منتخبہ میں غالب کا ذکر بہت اچھے الفاظ میں کیا ہے۔ سرور نے اس میں غالب کے ۱۴۵ اشعار نقل کئے ہیں اور ان کے ابتدائی دور کے اشعار سے متاثر ہو کر ان کو موجد طرز کہہ دیا تھا۔

شیفتہ اور غالب کے بارے میں لکھتے ہیں کہ شیفتہ نے اپنے اردو شعراء کے تذکرہ گلشن بے خار میں غالب کے بارے میں لکھا ہے کہ:

> ''وہ غیرت افزائے صفہان وشیراز، طوطی بلند پرواز، چمن معانی، بلبل نغمہ پروا گلشن شیوہ بیانی'' ہیں۔ ان کے خیال کی بلندی کے آگے اوج فلک پستی زمین ہے۔ ان کے فکر کا شاہیں عنقا کے شکار سوا کسی اور کا نہیں کرتا ہے اور ان کا اشہب طبع عرصۂ فلک کے سوا اور کہیں نہیں دوڑتا ہے وغیرہ وغیرہ۔[۲]

غالب اور نیر سے متعلق لکھتے ہیں کہ نواب ضیاء الدین نیر غالب کے بڑے معتقد اور قدردان تھے۔ انھوں نے غالب کو وہ موحد کی کیش صافی، منش ستودہ خوی فروہیدہ کیش بزرگ نہاد پاکیزہ گوہر، فرشتہ سرشت وغیرہ کہا ہے۔ اس میں سید صاحب نے غالب سے متعلق مدح سرائی میں ان کی غیر معمولی عقیدت کا دخل بھی بتایا ہے۔

۱۔ غالب مدح وقدح کی روشنی میں، جلد اوّل، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ص ۳

۲۔ ایضاً، ص ۷

مولوی کریم الدین اور غالب سے متعلق لکھتے ہیں: یہ غالب کے ہم عصر تھے۔ غالب کی زندگی ہی میں ان کا شعراء کا ایک تذکرہ گلدستہ نازنیناں کے نام سے شائع ہوا جس میں اس زمانے کے رواج کے مطابق انھوں نے غالب کی تعریف وتوصیف کی ہے اور غالب کے سو سے زیادہ اشعار نقل کئے ہیں۔

سرسید احمد خاں اور غالب سے متعلق لکھتے ہیں: سرسید احمد خاں اپنے تمام معاصرین میں غالب کے سب سے زیادہ قدردان اور معترف تھے۔ انھوں نے آثار الصنادید میں غالب کی مدح سرائی کچھ اس انداز میں کی ہے جو سو سال کے اندر کسی اور سے نہ ہوسکی جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سرسید کو غالب سے کس قدر شیفتگی اور وارفتگی تھی۔ لیکن سید صاحب نے ان کی مدح سرائی پر کچھ اس طرح اپنا خیال ظاہر کیا ہے:

> ''سرسید نے غالب کی جو مدح کی ہے اس سے موجودہ دور میں غالب کا سب سے بڑا پرستار بھی شاید اتفاق نہ کرے گا اور وہ غالب کو انوریؔ، عنصریؔ اور خاقانیؔ، سعدیؔ، حافظؔ، خسروؔ وغیرہ جیسے تمام اساتذہ سے برتر تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ ہوگا۔''[۱]

امام بخش صہبائی بھی غالب کے معاصرین میں سے تھے۔ انھوں نے بھی غالب کی ویسی ہی مدح سرائی کی ہے جیسی آثار الصنادید میں ہے۔

غلام غوث بے خبر اور غالب: خان بہادر ذوالقدر غلام غوث بے خبر غالب کے معاصروں اور دوستوں میں سے تھے۔ ان کو غالب سے کافی محبت تھی۔ عود ہندی کی ترتیب میں بھی ان کی مدد شامل تھی۔ وہ غالب کی شاعری اور ان کے خطوط کی نثر نگاری کے بڑے قدرداں تھے۔

ذوق اور غالب سے متعلق لکھتے ہیں کہ غالب اور ذوق کی چشمک مشہور ہے۔ جتنی تھی اس سے زیادہ اہل قلم نے ہوا دے دی۔ بظاہر اس چشمک کی ابتداء ذوق کی طرف سے ہوئی۔ انھوں نے غالب کے مختصر دیوان پر چوٹ کی اور اپنی پرگوئی پر فخر کا اظہار کیا تھا جس پر غالب نے ذوق کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ ان

۱۔ غالب مدح وقدح کی روشنی میں، جلد اوّل، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ص ۱۴

کا دیوان دو جز کا سہی لیکن وہ اپنے ریختہ کو اپنے فرہنگ کے نخلستان کا وژم برگ سمجھتے ہیں۔ پھر اپنی فارسی شاعری پر ناز کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

اس میں نقش ہائے رنگ ہیں۔ وہ اپنے مجموعہ اردو کو تو اپنے لئے بے رنگ سمجھتے ہیں لیکن اپنی فارسی شاعری کو مانی وارژنگ کی مصوری کے برابر سمجھتے ہیں۔ سید صاحب نے دونوں کے کچھ حریفانہ اشعار بھی نقل کئے ہیں۔

غالب اور مومن، مولانا فضل حق اور غالب، غلام علی وحشت اور غالب ان تمام شخصیات کے پہلو بہ پہلو غالب کے مطالعہ کے بعد صباح الدین صاحب نے غالب کے مداح معاصرین کا ایک باب تجویز کیا ہے جس میں سید غوث علی قلندر کا ذکر کیا ہے۔ سید غوث صاحب مرزا غالب سے بہت متاثر تھے جس کا اظہار انھوں نے اپنے تذکرہ غوثیہ میں کیا ہے۔ سید غوث صاحب نے اپنے تذکرہ میں جگہ جگہ غالب کے اشعار بھی نقل کئے ہیں۔ اس کے علاوہ غالب کی ایک پوری غزل نقل کی ہے جس کا مطلع یہ ہے۔

عشق مجھ کو نہیں وحشت ہی سہی　　میری وحشت تیری شہرت ہی سہی

نواب جادرہ اور غالب، امجد سندیلوی اور غالب، عزیز لکھنوی اور غالب کا ذکر بھی کیا ہے۔ ''اپنی تعریف آپ'' کا عنوان قائم کیا ہے جس میں غالب نے اپنے نسب پر فخر کرتے ہوئے اپنی تعریف آپ کی ہے۔ اس کے بعد ''اپنی مذمت'' کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں کہ غالب نے اپنے نسب پر فخر کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی مذمت بھی کی ہے جس کا اظہار انھوں نے علاء الدین احمد خاں، میر قربان علی بیگ کے نام خطوط میں کیا ہے۔

اپنی نحوست پر نوحہ خوانی اور اپنے کو مربی کش اور محسن سوز بھی کہتے رہے

فارسی شاعری پر غرور : سید صباح الدین صاحب لکھتے ہیں کہ غالب کو فارسی زبان کے استادانہ کمال پر بڑا ناز رہا جس کا اظہار انھوں نے اپنی غزلوں اور قصیدوں میں کیا ہے۔

اردو شاعری پر ناز : غالب کو فارسی شاعری پر ناز تھا اور اردو کو اپنا رنگ قرار نہیں دیتے تھے بلکہ اپنے

نخلستان فرہنگ کا وژم برگے قرار دیتے تھے۔صباح الدین صاحب کے مطابق انھوں نے یہ دعویٰ ۱۸۳۸ء کے بعد اور ۱۸۴۷ء سے پہلے کیا۔

ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب　　کہتے ہیں اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

شاعری سے بیزاری: سے متعلق صباح الدین صاحب لکھتے ہیں کہ ان کی عشقیہ شاعری کی دھوم تھی۔لیکن غالب نے اپنے دوستوں کے خطوط میں شاعری سے بیزاری ظاہر کی ہے۔ پھر بھی ان کے معاصرین اور تلامذہ ان کے آخر وقت تک بڑے مداح اور قدرداں رہے۔ان کے بعد غالب کے عقیدت مند شاگرد کا بھی ایک باب تجویز کیا ہے۔جس میں سید صاحب نے غالب کو ہندو مسلم شاگردوں کی تعداد کا ذکر کرتے ہوئے ان کی استاد سے عقیدت و احترام کا ذکر کیا ہے۔ غالب کے ہندو شاگردوں میں مرزا ہرگوپال تفتہ جو بڑے پرگو شاعر تھے جنھوں نے ایک منظوم کتاب تضمین گلستاں کو غالب اور ان کے متبنیٰ باقر علی خاں کے نام معنون کیا ہے۔غالب کے دوسرے ہندو شاگرد گوپال مکند بے صبر تھے جو صاحب کلیات بھی تھے۔صفیر بلگرامی بھی غالب کے شاگرد تھے۔انھوں نے اپنی کتاب جلوۂ حضر میں غالب کی شاعری پر مدحیہ تبصرہ کیا ہے۔اور ان کے فارسی کلام کی تعریف کی ہے۔اس کے بعد غالب کی موت پر اظہار غم کا عنوان قائم کیا ہے۔جس میں غالب کی وفات پر لکھے گئے مرثیوں کا ذکر ہے اس میں حالی کا مرثیہ بہت مشہور ہے۔اس کے علاوہ مجروح اور سالک نے بھی مرثیہ لکھ کر استاد کو نذرانۂ عقیدت پیش کیا ہے۔

غالب کے ناقد معاصرین سے متعلق لکھتے ہیں کہ غالب کے ہم عصروں میں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنھیں ان کی مشکل گوئی پر اعتراض تھا اور ان کو چھیڑا کرتے تھے۔آزاد اور حالی کے مطابق اس سے غالب کو فائدہ ہوا اور آخری عمر میں انھوں نے نازک خیالی کے طریقہ کو بالکل چھوڑ دیا۔

غالب اور محمد حسین آزاد: صباح الدین صاحب کے مطابق غالب کی شاعری اور ان کی شخصیت کے روشن پہلوؤں کو باضابطہ طور پر تحریر میں لانے کی اولیت آزاد ہی کو حاصل ہے۔آزاد نے غالب کو اقلیم سخن کا بادشاہ اور مضامین و معانی کے بیشہ کا شیر کہہ کر شاعری پر جو تبصرہ کیا ہے اور ان کی نثر نگاری پر جو کچھ لکھا ہے اس کو

پڑھ کر یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ انھوں نے غالب کے کمالات دکھانے میں بخل سے کام لیا ہے۔

حالی اور غالب سے متعلق رقم طراز ہیں کہ حالی کو اپنے استاد سے غیر معمولی محبت و شیفتگی تھی۔ اس بات کا بخوبی اندازہ حالی کی تصنیف یادگار حالی اور مرثیہ غالب سے ہوتا ہے۔ جس میں انھوں نے غالب کی تعریف اور ان کے شاعرانہ کمالات کی توصیف کی ہے اور اپنے تاثرات کا اظہار کیا ہے۔ سید صباح الدین صاحب مرثیہ غالب پر تبصرہ کرتے ہوئے حالی سے اختلاف کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''اس میں کہیں کہیں اتنا جوش عقیدت آ گیا ہے کہ بعض باتیں محل نظر ہو گئی ہیں۔ مثلاً وہ غالب کو پاک ذات، پاک دل اور پاک صفات کہتے ہیں۔ ان کے پاک دل ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں غالب کا ایک مصرع ہے ولی پوشیدہ رہے اور کافر کھلا، پاک دل ہونے کی وجہ سے تو ''ولی پوشیدہ'' رہے لیکن ''کافر کھلا'' سے ظاہر ہے کہ ان کی تمام صفات پاک نہ تھیں.....اسی مرثیہ میں ان کو رند اور مست خرام کہا گیا ہے جس سے ان کے پاک صفات ہونے کی تردید ہو جاتی ہے۔ اسی طرح اس مرثیہ میں ہے کہ ''بے صلہ مدح و شعر بے تحسیں'' یہ کہنا بھی صحیح نہیں۔ انگریزوں اور والیان ریاست وغیرہ کی شان میں قصیدے کہہ کر خلعت اور وظائف پاتے رہے۔''[1]

سید صاحب حالی کے مرثیہ اور آب حیات میں محمد حسین آزاد کے قلم سے استاد ذوق کی مدح و توصیف کا موازنہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

''حالی اور آزاد نے اپنے اپنے استاد کی مدح میں جو کچھ لکھا ہے ان دونوں میں مبالغہ کا رنگ ضرور آ گیا ہے۔ لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ آزاد نے اپنی نثر میں شاعری کی ہے اور حالی نے شاعری میں شاعری کی ہے۔ شاعری میں مبالغہ تو

۱۔ غالب مدح و قدح کی روشنی میں، جلد اوّل، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ص ۵۸

بعض اوقات حسن اور زیور بن جاتا ہے لیکن یہ بات کسی نثر کے لئے نہیں کہی جاسکتی۔'' [۱]

حالی کے مرثیہ غالب کے ایجاز کا اطناب ان کی یادگار غالب ہے جو اپنی نوعیت کے لحاظ سے ایک بے مثال تصنیف ہے۔ غالب کو صحیح معنوں میں سمجھنے کے لئے اس کتاب کا مطالعہ ناگزیر ہوگا جب تک غالب کا نام زندہ ہے اس وقت تک یہ کتاب بھی زندہ رہے گی۔

غالب کی زندگی میں کچھ نمایاں کمزوریاں بھی تھیں جن کا ذکر حالی نے یادگار غالب میں اجمالی طور پر کیا ہے لیکن تفصیلاً اس کا ذکر نہیں کیا ہے جس پر یہ اعتراض کیا گیا کہ انھوں نے اپنے استاد کی کمزوریوں اور برائیوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن یہ سچ نہیں ہے کیوں کہ غالب نے خود اپنے اشعار و مکاتیب میں اپنی برائیوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ سید صاحب اس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

''حالؔی یادگار غالب میں اپنے استاد کی تمام برائیوں کو نظر انداز کر دیتے تو الزام کے لائق نہ تھے کیوں کہ مشرقی تہذیب میں بزرگوں کی خطاؤں کی گرفت خود خطا ہے۔ فن سوانح نگاری کا اعلیٰ معیار تو ضرور ہے کہ جس کے حالات زندگی لکھے جائیں اس میں خوبیاں ہیں تو ان کو اچھی طرح روشن کیا جائے۔ لیکن اگر اس کی کمزوریاں ہیں تو اس پر پردہ ڈالنے کی کوشش نہ کی جائے۔ حالی اس معیار سے ناواقف نہ تھے انھوں نے اس کا اعتراف اپنی تصنیف حیات سعدی کے دیباچہ میں کیا ہے۔'' [۲]

سید صاحب نے حالی کے فکر و فن پر تبصرہ کرتے ہوئے ادبی تنقید کا دلآویز نمونہ اس طرح پیش کیا ہے۔

۱۔ غالب مدح وقدح کی روشنی میں، جلد اوّل، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ص ۶۱

۲۔ ایضاً، ص ۶۵

''انھوں نے اپنے قلم کے آرٹ سے غالب کی کمزوریوں کی طرف پڑھنے والے کا ذہن تو ضرور متوجہ کردیا لیکن ان کی کمزوریوں سے متاثر ہونے نہیں دیا۔ حالی اس حیثیت سے یادگار غالب میں بڑے آرٹسٹ نظر آتے ہیں۔ اسی کے ساتھ انھوں نے غالب کے شاعرانہ کمالات اور ذاتی اوصاف کے طرح طرح کے محاسن کو اچھال کر لوگوں کے ذہن کو ان کی عظمت کا ایسا سکہ جمایا ہے کہ ان کی ساری کمزوریاں ان کی اور دوسری خوبیوں کے سامنے ماند پڑ جاتی ہے۔''[1]

امداد امام اثر اور غالب : امداد امام اثر نقاد کی حیثیت سے مشہور تھے۔ انھوں نے کاشف الحقائق کے نام سے دو جلدیں تصنیف کیں جس میں فارسی اور اردو شاعری کی مختلف اصناف پر بڑا اچھا تبصرہ ہے۔ اس میں مصنف نے غالب کی فارسی اور اردو شاعری دونوں پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ وہ غالب کی فارسی شاعری کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے۔ دوسری طرف ان کی نگاہ ان کی اردو شاعری کے معائب و محاسن دونوں کی طرف اٹھتی ہے۔ ان کے معائب کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ غالب کی غزل سرائی میں میر کی جھلک نمایاں ہے تو دوسری طرف غالب کے دیوان کا جدید انتخاب کرنے کا مشورہ دیتے ہیں، لیکن بعد میں آپ نے معائب کے بعد محاسن بیان کرنے میں اپنے قلم کو رواں کردیا ہے۔ غالب کے محاسن بیان کرنے کے باوجود بھی غزل سرائی میں امداد صاحب غالب کو میر اور درد سے بہتر نہیں سمجھتے۔ وہ دونوں کے بعد ہی غالب کو درجہ دیتے ہیں۔

غالب اور اقبال : اقبال نے اپنے ابتدائی دور میں غالب کو خراج عقیدت پیش کیا۔ اقبال اپنے دور عروج اور کمال شہرت کے زمانہ میں اس میں کوئی ترمیم کرنا پسند نہ کرتے تھے۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ اسلام کا یہ مفکر اور اسرار خودی کا یہ علمبردار بھی ان کی عظمت کے سامنے جھکا رہا۔ اقبال نے غالب کی شاعری کو ایران

۱۔ غالب مدح وقدح کی روشنی میں، جلد اوّل، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ص ۶۶

کی شاعری سے بہتر قرار دیا۔ یورپ کے شاعروں میں ان کو جرمنی کے شاعر گیٹے کے مدمقابل ٹھہرایا۔

غالب اور حیدر طباطبائی : علی حیدر طباطبائی نے اپنی شرح میں غالب کی مدح وقدح دونوں کے نمونے پیش کئے ہیں۔ یوں تو مدحیہ اشعار کافی رقم کئے ہیں جس میں سے چند ملاحظہ ہوں۔ مثلاً

قفس میں مجھ سے روداد چمن کہتے نہ ڈر ہمدم　　گری تھی جس پہ کل بجلی وہ میرا آشیاں کیوں ہو

آگے آتی تھی حال دل پہ ہنسی　　اب کسی بات پر نہیں آتی

ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پہ دم نکلے　　بہت نکلے میرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

مدحیہ اشعار کے بعد قدحیہ اشعار بھی ملاحظہ ہوں:

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا　　کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

حسن غمزہ کی کشاکش سے چھٹا میرے بعد　　بارے آرام سے ہیں اہل جفا میرے بعد

''طباطبائی نے غالب کے بہت سے اشعار پر اعتراضات کئے ہیں جس پر غالب کے بہت سے پرستار اور مداح چیں بہ جبیں ہوئے لیکن مولانا حسرت موہانی کے نزدیک طباطبائی نے جو غلطیاں دکھائی ہیں ان کا کچھ جواب نہیں ہوسکتا۔''[۱]

غالب اور حسرت موہانی سے متعلق لکھتے ہیں کہ طباطبائی کی شرح کے بعد حسرت موہانی کی شرح شائع ہوئی۔ اس کے مقدمہ میں حسرت موہانی نے غالب کی سوانح کے ساتھ ان کی شاعری پر بھی تبصرہ کیا ہے۔ انھوں نے غالب کے ابتدائی دور کے اشعار کی مذمت کی ہے لیکن درمیانی دور کے اشعار میں ان کے فارسی الفاظ اور ترکیبوں کو اردو کے ساتھ بندوبست اور ہنر کے ساتھ ملانے کی داد دی ہے ان کا ماننا ہے کہ جذبات انسانی کی جیسی سچی تصویر غالب نے اپنے اشعار میں پیش کی ہے اس کا جواب میر کے بعد کسی دوسرے شاعر کے کلام میں ملنا مشکل ہے۔

۱۔　غالب مدح وقدح کی روشنی میں، جلد اوّل، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ص ۱۰۹

مولانا شبلی اور غالب : مولانا شبلی غالب کی نثر اور شاعری دونوں کے معترف رہے۔ غالب کے بارے میں سب سے پہلے علامہ شبلی ہی نے کہا تھا کہ ''وہ جس طرف متوجہ ہوتے ہیں اپنا کوچہ الگ نکال دیتے ہیں'' یہ جامع تعریف علامہ شبلی کے مطالعہ غالب پر روشنی ڈالتی ہے، اور پتہ چلتا ہے کہ انھوں نے غالب کا کس قدر گہرائی سے مطالعہ کیا تھا۔ شبلی نے موازنہ انیس و دبیر میں غالب کی شاعری پر مجمل تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''فلسفہ اور شاعری برابر درجہ کی چیزیں ہیں لیکن قوم کی بدمذاقی سے جس قسم کی شاعری نے ملک میں قبول عام حاصل کرلیا ہے اس نے لوگوں کو یقین دلایا ہے کہ اردو شاعری میں زلف و خال و خط یا جھوٹی خوشامد اور مداحی کے سوا کچھ نہیں۔ میر تقی کی غزلیت، درد کا تصوف، غالب کا فلسفہ شاعری کی جان ہیں۔ لیکن ان بیش بہا خزانوں میں سے بھی عام لوگوں کی نگاہ صرف خزف ریزوں پر پڑتی ہے۔''[1]

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا شبلی غالب کی شاعری کے فلسفہ کو اردو شاعری کی جان اور ایک بیش بہا خزانہ سمجھتے تھے۔ لیکن شاعری میں فلسفہ سے ان کی جو مراد ہے وہ آج کل فلسفہ کی اصطلاح سے بالکل مختلف ہے۔ وہ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ:

> ''عالم میں جو کچھ موجود ہے بلکہ کاروبار زندگی کی روزمرہ باتیں بھی اگر نگاہ حقیقت سے دیکھی جائیں تو یہ سب فلسفہ ہیں۔ اگر کوئی شاعر اپنی شاعری میں موثر انداز سے یہ پیش کرتا ہے کہ مذہبی جھگڑے کی اصل دنیوی اغراض ہوتے ہیں۔ خودغرضی نامقبولیت کا سبب ہے۔ انسان کو جو چیز حاصل نہیں ہوتی اس پر وہ حسد کرتا ہے۔ اخلاق رذیلہ کی موجودگی ہی میں انسان کی بقا اور ترقی ہے۔

۱۔ غالب مدح وقدح کی روشنی میں، جلد اوّل، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ص ۱۳۱

عوام کے لئے آزادی مفید نہیں۔ ایک کا فائدہ دوسرے کا نقصان ہے۔ انسان کو خدا نے اختیار دیا ہے کہ وہ متناقص کاموں میں سے جس کام کو چاہے اختیار کرلے۔ الخ تو یہ سب مولانا شبلی کے خیال کے مطابق شاعری میں فلسفہ بن جاتے ہیں۔ اس لحاظ سے غالب کی شاعری واقعی فلسفہ ہے اور اردو شاعری کی جان ہے۔'' [۱]

مولانا ابوالکلام آزاد اور غالب : مولانا ابوالکلام آزاد خود نابغہ عصر تھے اس لئے اردو شاعری کے عبقری غالب کی طرف ان کا مائل ہونا فطری ہے۔ وہ اپنی تقریروں اور تحریروں کی زینت غالب کے اشعار سے بڑھاتے تھے۔ مولانا آزاد نے غالب کے غیر مطبوعہ کلام کو اپنے رسالہ ''الہلال''، ''البلاغ'' میں شائع کیا۔

مولانا آزاد نے غالب کے بارے میں جو تجزیہ کیا ہے، سید صباح الدین صاحب اس سے متعلق رقم طراز ہیں:

''مولانا ابوالکلام آزاد نے غالب کا بڑا اچھا نفسیاتی تجزیہ کیا ہے۔ ۱۸۵۷ء میں دہلی کی غارت گری، بربادی، خونریزی سے ان کے دل وجگر کے ضرور ٹکڑے ٹکڑے ہوکر رہ گئے تھے۔ ان کی غیرت وحمیت نے گوارا نہ کیا کہ فتح دہلی کے بعد حکام کی خدمت میں حاضر ہوں۔ لیکن انگریزی حکومت ایک حقیقت بن گئی تو ان کو اپنی ضرورت واحتیاج کی خاطر مصلحت کوشی اور عاقبت اندیشی سے بھی کام لینا پڑا۔ ان کے روزنامچہ دستنبو میں ان ہی ملی جلی کیفیات کا اظہار ہے۔'' [۲]

انگریزوں کی خوشامدی کا طعنہ جو غالب پر عائد کیا جاتا ہے اس کے جواب میں سید صاحب کا یہ

۱۔ غالب مدح وقدح کی روشنی میں، جلد اوّل، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ص ۱۳۱

۲۔ ایضاً، ص ۱۴۰

تبصرہ حقیقت پسندی سے خالی نہیں:

''اور پھر غالب کیا پورا ہندوستان انگریزوں کی سیاسی چوگاں کا گیند بن گیا۔ انگریزوں کے دربار کے ایک گیند بننے کی شکایت غالب سے ہے تو پورے ہندوستان سے بھی ہونی چاہئے اور اگر ہندوستان سے نہیں ہے تو پھر خستہ جان، پریشان حال، مقروض، آشفتہ نوا، ستم ہائے روزگار کو برداشت کرنے والے اور زمانے کے مارے ہوئے اسد اللہ خاں غالب سے بھی نہیں ہونا چاہئے۔ اس وقت کا ہندوستان اپنی زبان حال سے غالب کے لئے یہی کہہ رہا تھا ؎

غالب کو برا کیوں کہو اچھا مرے آگے [1]

غالب اور مولانا عبدالحیٔ : حکیم سید عبدالحیٔ نے اپنی کتاب گل رعنا میں غالب کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے کلام غالب کی تین خصوصیات درج کی ہیں۔ ایک تو یہ ہے کہ وہ عام اور مبتذل تشبیہیں جو عموماً شعرا کے کلام میں پائی جاتی ہیں ان سے جہاں تک ہوسکتا ہے بچتے ہیں اور نئی نئی تشبیہیں پیدا کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ متانت اور سنجیدگی کو شوخی اور ظرافت سے ایسا پیوست کرتے ہیں کہ دونوں مل کر شعر میں تڑپ پیدا کردیتے ہیں۔ تیسرے یہ کہ ان کے پہلودار کلام کی وجہ سے ان کا شعر ایک نیا لطف دیتا ہے۔

دیوان غالب کا نسخہ حمیدیہ : دیوان غالب جدید المعروف نسخہ حمیدیہ کی اشاعت غالباً ۱۹۲۱ء میں ہوئی۔ اس میں سرنامہ نواب احمد خاں والی بھوپال کا ہے۔ جس میں انھوں نے غالب کو شہنشاہ اقلیم سخن کہا ہے۔ پھر مفتی انوارالحق صاحب ڈائرکٹر تعلیمات ریاست بھوپال کی تمہید ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر عبدالرحمٰن بیرسٹرایٹ لا کا مشہور مقدمہ ہے۔ مفتی انوارالحق غالب کی شاعری کو ادب اردو کا بہترین سرمایہ اور عروس نظم کا بیش بہا پیرایہ قرار دیتے ہیں۔

نسخہ حمیدیہ کی اشاعت کی افادیت : نسخہ حمیدیہ شائع ہونے پر غالبیات سے شغف رکھنے والوں کو ایک گوہر

۱۔ غالب مدح وقدح کی روشنی میں، جلد اوّل، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ص ۱۴۴

نایاب دستیاب ہوا۔ اس کے ذریعہ انھوں نے غالب کی شاعری کو خود بھی سمجھا اور دوسروں کو بھی سمجھایا اور غالب شناسی کے لئے اس سے بھرپور استفادہ کیا۔

نسخہ حمیدیہ پر اعتراضات : نسخہ حمیدیہ پر جہاں تعریف وتوصیف کے پھول برسائے گئے وہیں اس پر تنقید کی چنگاریاں بھی گریں۔ مثلاً مولانا غلام رسول مہر نے اپنی کتاب غالب میں لکھا ہے کہ ''نسخہ حمیدیہ کبھی غالب کے پاس نہیں گیا اور اس کے لئے انھوں نے دلائل بھی پیش کئے ہیں۔ اس کے علاوہ غالب کے ایک بڑے ناقد ڈاکٹر عبداللطیف نے اس نسخہ حمیدیہ کو غالب کے اصل خطوط سے مقابلہ کر کے بتایا ہے کہ ان اصلاحوں اور اضافوں کو اصل خطوط سے کوئی مناسبت نہیں۔ اس کے علاوہ جگہ جگہ املا کی غلطیاں بھی دکھائی ہیں اور یہ اغلاط غالب جیسے محتاط مصنف سے کسی طرح منسوب نہیں کی جاسکتی۔''

اس کے علاوہ پروفیسر حمید احمد خاں نے انوارالحق کے نسخہ پر بھی یہ اعتراض کیا ہے کہ ان کا مطبوعہ نسخہ قلمی نسخہ کی صحیح نقل نہیں ہے۔ سید صاحب اس سلسلے میں لکھتے ہیں کہ

> ''پروفیسر صاحب نے مفتی صاحب کے ترتیب دیئے ہوئے نسخے کو سخت الفاظ میں مجروح کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن یہ اتنے سخت الفاظ کا مستحق نہیں۔'' [۱]

اس کے برعکس مفتی انوارالحق کے مطبوعہ نسخہ سے متعلق مالک رام صاحب کا ماننا ہے کہ:

> ''اس میں متن اور حاشیے کا کلام کچھ ایسا گڈمڈ ہوگیا ہے کہ یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ کون سا کلام ۱۸۲۱ء سے پہلے کا ہے اور کون سا بعد کا، دوسرے یہ کہ نہ صرف رسم الخط میں ترمیم کر کے اسے جدید بنادیا گیا ہے بلکہ اس میں کتابت کی تصحیح پر بھی کماحقہ توجہ نہیں دی گئی جس سے یہ نسخہ بے حد غلط چھپنے کے باعث ساقط الاعتبار ہوگیا۔'' [۲]

۱۔ غالب مدح وقدح کی روشنی میں، جلد اوّل، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ص ۱۶۲

۲۔ ایضاً، ص ۱۶۴

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری : دیوان غالب جدید یعنی نسخہ حمیدیہ میں مفتی انوارالحق کے بعد کلام غالب پر ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری بیرسٹرایٹ لا کی وہ تقریظ بھی ہے جو اب غالب کے محاسن کلام کے نام سے مشہور ہے۔ بجنوری صاحب غالب کے بہت مداح اور معتقد تھے۔ رشید احمد صدیقی صاحب بجنوری مرحوم کے مداح تھے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''یہ صحیح ہے کہ غالب کی تنقید میں بجنوری مرحوم نے کہیں کہیں مبالغہ سے کام لیا ہے۔ جہاں تہاں اشعار کے مفہوم سے بھی دور جا پڑے ہیں۔ لیکن اس سے ان کے خلوص اور ان کی ذہنی جامعیت پر آنچ نہیں آتی۔ مجتہد یا امام کے لئے یہ مراحل ناگزیر ہے۔'' [۱]

سید صباح الدین صاحب کا ماننا ہے کہ عبدالرحمٰن بجنوری نے اپنی تحریروں میں جو طرز بیان اختیار کیا ہے اس سے ان کی پوری تحریر شاندار ہوگئی ہے۔ جس سے ان کی تحریر کو پڑھتے وقت لذت کا احساس ہوتا ہے اور پڑھنے والے کو یہ غور کرنے کا موقع نہیں ملتا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں بلکہ وہ اسی میں کھویا رہتا ہے کہ وہ جو کچھ کہہ رہے ہیں کس شان وشکوہ سے کہہ رہے ہیں۔ لیکن جب وہ ٹھہر کر غور کرتا ہے تو پھر ان کی پرشکوہ تحریروں کے بار سے ہلکا ہو کر یہ کہنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ ان کی بعض باتوں میں حقیقت سے زیادہ عقیدت کو دخل ہے۔

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری سے متعلق سید صباح الدین عبدالرحمٰن لکھتے ہیں:

> ''ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کو اس لحاظ سے اولیت حاصل ہے کہ ان ہی سے غالب کے تصوف اور فلسفہ پر باضابطہ بحث کی ابتداء ہوئی ہے۔ حالی نے غالب کے تصوف اور فلسفہ پر کوئی لمبی بحث نہیں کی ہے۔ طباطبائی نے غالب کے اشعار کی شرح میں جابجا ان کے صوفیانہ اور فلسفیانہ خیالات کی وضاحت

۱۔ غالب مدح وقدح کی روشنی میں، جلد اوّل، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ص ۱۶۷

ضرور کردی ہے۔ لیکن ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے پہلی دفعہ بڑے آب وتاب کے ساتھ غالب کے تصوف اور فلسفہ کو پیش کرنے کی کوشش کی جس کے بعد یہ بحث چل پڑی کہ غالب صرف ایک بلند پایہ شاعر ہی نہ تھے بلکہ ایک رمز شناس فلسفی اور حقیقت آگاہ حکیم بھی تھے۔ یہ اور بات ہے کہ اس رائے سے کچھ لوگوں نے اختلاف کر کے یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ فلسفی تھے اور نہ حکیم بلکہ فلسفیانہ اور عارفانہ افکار سے لذت حاصل کرتے اور اپنے حسن بیان سے دوسروں کو لذت بخشتے۔'' [۱]

نظامی بدایونی اور غالب : نظامی بدایونی نے غالب کے دیوان کا ایک اڈیشن شائع کیا ہے جس کا اعتراف انھیں خود ہے کہ ان کی شرحیں طباطبائی اور حسرت کی شرحوں کی آواز بازگشت ہیں لیکن کہیں کہیں طباطبائی سے اختلاف بھی کیا ہے۔ مثلاً طباطبائی نے غالب کے حسب ذیل پہلے ہی شعر کو بے معنی قرار دیا ہے

نقش فریادی ہے کس کی شوخی تحریر کا　　کاغذی ہے پیرہن ہر پیکر تصویر کا

نظامی بدایونی اس رائے سے اختلاف کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''مولانا طباطبائی کے نزدیک شعر ادائے مطلب سے قاصر ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ شوخی تحریر کا لفظ معنیٰ خیز نہیں ہے۔ مطلع بنانے کے لئے لایا گیا ہے۔ اس کی ہستی یا اعتبار ہستی پر ملال وغیرہ کی ضرورت تھی تا کہ وجہ ملال اور باعث فریاد کا اظہار ہو جاتا ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ شوخی کا لفظ نہایت پر مغز ہے اور ان سب معانی پر حاوی ہے۔ مولانا طباطبائی کا کہنا کہ ہستی کے بدلے شوخی کا لفظ لانے سے قرینہ ہستی کے حدود پر پیدا نہیں ہوا، صحیح نہیں ہے کیونکہ خود پیکر کے لفظ سے جو تصویر کے ساتھ سامنے لایا گیا ہے۔ ہستی یعنی روح کا حذف ظاہر ہے اور شعر

۱۔ غالب مدح وقدح کی روشنی میں، جلد اوّل، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ص ۱۸۲

میں جو استفہام ہے وہ ایک اشارہ ہے۔ اس لئے اس شعر کو مہمل قرار دینا ظلم ہے۔ اس کے علاوہ غالب کے متحد المضامین اشعار کی نشاندہی کر کے بدایونی نے اپنی رائے کا بھی اظہار کیا ہے۔''[۱]

ڈاکٹر سید محمود اور غالب : نظامی بدایونی کی شرح کلام غالب کے پانچویں اڈیشن میں ڈاکٹر محمود مارایٹ کا ایک مقدمہ بھی منسلک کر دیا گیا۔ ڈاکٹر سید محمود بھی عبدالرحمٰن بجنوری کی طرح غالب کے پرستار تھے۔ اسی پرستاری میں انھوں نے ایک مقالہ لکھا، جس کو نظامی بدایونی نے اپنی شرح کلام غالب کے ساتھ بڑی ممنونیت سے غالب کی حب الوطنی پر بحث کی ہے۔ سید محمود نے اس مقدمہ میں ایک ایسی نئی بات کہی جو ان سے پہلے کسی نے نہیں کہی تھی۔ اس کا خلاصہ یہ ہے۔

۱۸۵۷ء سے پہلے ہندوستانیوں کی زندگی کا خاتمہ ایک قوم کی حیثیت سے ہو چکا تھا۔ سیادت دانوں نے بھی غالب کی طرح اپنے گہرے احساس سے اس کو محسوس کیا اور پیرایہ در پیرایہ میں اس کا اظہار بھی کیا۔

کیوں گردش مدام سے گھبرا نہ جائے دل　　انسان ہوں پیالہ و ساغر نہیں ہوں میں

۱۸۵۷ء کے بعد انگریزوں نے ہندوستان کی تہذیب جس طرح مٹائی اس کا اثر غالب کے دل پر بھی ہوا اور انھوں نے پوشیدہ طور پر اس کا دردناک مرثیہ بھی لکھا جو حقیقتاً دل کو دہلا دینے والا ہے۔

سید محمود کا ماننا ہے کہ غالب کے اندر حب الوطنی کا جذبہ کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا اور وطن کی تباہی و بربادی پر ان کا دل خون کے آنسو رویا۔ لیکن غالب کے مخالفین یگانہ اور عبداللطیف نے سید محمود صاحب کے ان خیالات کی تردید کی ہے۔ غالب کے ایک اور پرستار اکرام احمد بھی سید محمود کی بات سے متفق نہیں ہیں۔

غالب نے بہادر شاہ ظفر کا مرثیہ کیوں نہیں لکھا: غالب پر یہ الزام ضرور عائد ہوتا ہے کہ جس کے غلام اور مداح تھے اس کی مصیبت اور زوال پر اور موت پر ان کا قلم خاموش رہا۔ انھوں نے عارف کا جس انداز میں

۱۔ غالب مدح و قدح کی روشنی میں، جلد اوّل، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ص ۱۸۳

مرثیہ لکھا اسی طرح بہادر شاہ ظفر کا بھی لکھ سکتے تھے۔ محض اس کی وجہ سے انگریزی حکومت کے عتاب کا شکار بھی نہ ہوتے اور ایک اہم فرض بھی ادا ہو جاتا۔ لیکن وقت کی مصلحت کی وجہ سے ایسا نہ کر سکے۔ سید صباح الدین صاحب ان کی حب الوطنی سے متعلق لکھتے ہیں:

''یہ صحیح ہے کہ ان کی حب الوطنی میں وطنیت کا وہ معیار نہیں جو آج کل کے سیاست دانوں اور صحافت نگاروں نے قائم کر رکھا ہے لیکن اس میں شک نہیں کہ ان کے زمانہ میں جو حب الوطنی کا معیار تھا وہ ان میں موجود تھا۔ اس زمانہ کا معیار تھا کہ مولد اور مسکن کے ساتھ ملک کے دوسرے شہروں اور وہاں کی چیزوں سے شیفتگی ہو۔ وہاں کے لوگوں سے اخلاص و محبت ہو ان کے دکھ درد سے دل تڑپ اٹھتا ہو۔ یا وہاں کے باشندوں میں جو جو خوبیاں ہوں ان کی قدر و منزلت دلوں میں ہو وغیرہ وغیرہ۔ اس معیار پر غالب کی حب الوطنی پوری اترتی ہے۔''[1]

اس کے علاوہ اپنے مولد سے غالب کی محبت، بنارس کی تعریف، کلکتہ کی تعریف، دہلی سے محبت، دہلی کی تباہی کا نوحہ، لکھنؤ کی تباہی، ہندوؤں سے محبت، ان تمام عنوانات پر بھی صباح الدین صاحب نے مختصراً روشنی ڈالی ہے۔

بے خود موہانی اور غالب : بے خود موہانی غالب کے پرستاروں کے صف اولین میں جگہ پانے کے مستحق ہیں۔ بے خود موہانی غالب کے کلام کی کسی قسم کی تنقیص گوارا نہیں کرتے اس لئے اس زمانہ تک جتنی شرحیں لکھی گئیں ہیں ان میں سے وہ کسی کو پسند نہیں کرتے تھے۔

طباطبائی کی شرح کی تنقیص : بے خود موہانی کی سب سے زیادہ غضبناکی اور خشمناکی طباطبائی کی شرح پر ظاہر ہوئی لیکن سید صاحب کا ماننا ہے کہ:

''غالب کے کلام پر طباطبائی کی جابجا تنقیصوں کے باوجود ان کی پوری شرح کا

۱۔ غالب مدح و قدح کی روشنی میں، جلد اوّل، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ص ۱۹۵

مطالعہ کیا جائے تو پتہ چلے گا کہ وہ مجموعی حیثیت سے غالب کے کمالات کے فن کے سامنے جھکے نظر آتے ہیں۔ بے خود موہانی کو اعتراف ہے کہ وہ یعنی طباطبائی جہاں برس پڑنے میں طوفان ہیں وہاں تعریف کرنے میں آندھی ہیں۔'' [1]

غالب اور سہا : مولانا ممتاز حسین سہا کی کتاب مطالب الغالب ۱۹۲۳ء میں لاہور سے شائع ہوئی۔ اس طرح کلام غالب کی شرحوں میں ایک اور شرح کا اضافہ ہو گیا۔

سید صباح الدین صاحب کے تجزیہ کے مطابق غالب کی مدلل مداحی میں فاضل شارح کا قلم کہیں کہیں حد اعتدال سے تجاوز کر گیا ہے اور اس میں جا بجا وہی ادعائی شان پیدا ہو گئی ہے جو ڈاکٹر عبدالرحمٰن کی تحریروں میں ہے۔

سہا کی نظر میں غالب کی امتیازی خصوصیات : سہا کی نظر میں غالب کی جو امتیازی خصوصیات تھیں۔ ان کا ذکر کرتے ہوئے صباح الدین صاحب رقم طراز ہیں:

''سہا عبدالرحمٰن بجنوری کی طرح غالب کی عقیدت میں سرشار ہو کر لکھ گئے ہیں کہ غالب کے خیالات تو کرۂ ارض کے تمام دفاتر ادب کے لئے سرمایہ نازش ہو سکتے ہیں۔ لیکن اگر غالب کی غزلوں کے ترجمے دوسری زبان میں کئے جائیں تو پھر مولانا سہا غالب کی جس ندرت تخیل، جدت اسلوب و ادا نزہت، تشبیہات و استعارات اور شوکت تراکیب و الفاظ پر جھومتے ہیں وہ دوسری زبان میں منتقل ہو کر ایک بے کیف بے جان اور بے مزہ نظر آئے گی اور یہاں یہ کہنا پڑتا ہے کہ غالب فلسفی شاعر کے بجائے صرف ایک بے مثال غزل گو شاعر تھے۔ ورنہ ان کی شاعری کا فلسفہ دوسری زبان میں منتقل ہو سکتا تھا۔ غالب کی اس حیثیت کو مان لینے کے بعد مولانا سہا کی پیشین گوئی کو بھی تسلیم کرنا

۱۔ غالب مدح و قدح کی روشنی میں، جلد اوّل، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ص ۲۲۱

ہوگا کہ اردو کا ذوق شعری جس قدر بلند ہوتا جائے گا غالب کی شاعری کے
محاسن زیادہ نمایاں اور محسوس ہوتے جائیں گے۔'' [۱]

غالب کی عقیدت مندانہ وکالت : سہا صاحب جوش عقیدت میں غالب کو میر، سودا، خواجہ میر درد سے بلند مرتبہ شاعر قرار دیتے ہیں۔ ان کی اس وکالت پر صباح الدین صاحب لکھتے ہیں:

''غالب کی یہ وکالت شعر و ادب کی بالغ نظری پر مبنی نہیں، غالب کی عظمت دکھانے میں ضروری نہیں کہ ان کا موازنہ تمام اساتذہ فن سے کر کے ان کو تو اونچا اور دوسروں کو نیچا دکھایا جائے

ہے رنگ لالہ و گل و نسرین جدا جدا

میر، سودا اور درد کا شمار ان اکابر شعرا میں ہے جنھوں نے بقول انشاء ریختہ کے باغ کو عیبوں کے کانٹوں اور کوڑا کرکٹ سے صاف کیا۔ اگر ان اساتذہ کی شاعری غالب کے سامنے نہ ہوتی تو ارتقائی طور پر ان کا کلام اس منزل تک نہ پہنچتا جس پر اردو شعرا کو ناز ہے۔'' [۲]

مولانا عبدالسلام ندوی اور غالب : مولانا عبدالسلام بھی غالب کے مداحوں میں سے تھے۔ ان کا قلم غالب کی تنقیص میں اگر چلا بھی ہے تو بہت مدھم ہو کر چلا ہے۔ وہ ہر جگہ غالب کی مدح میں رطب اللسان ہیں۔ وہ ان کے فلسفیانہ اور صوفیانہ خیالات سے متاثر نہیں بلکہ ان کے شاعرانہ کمالات کے معترف ہیں۔ جس کے ثبوت میں کثرت سے اشعار نقل کئے ہیں۔ غالب کے شاعرانہ کمالات کا ذکر کرتے ہوئے صباح الدین صاحب نے عبدالسلام صاحب کے غالب کی قصیدہ نگاری، غالب کی اخلاقی شاعری، غالب کے خمریات، عارف کا مرثیہ، غالب کا سہرا درج کیا ہے۔ اس کے علاوہ عبدالسلام صاحب نے غالب پر جو

۱۔ غالب مدح و قدح کی روشنی میں، جلد اوّل، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ص ۲۲۵

۲۔ ایضاً، ص ۲۲۷

تنقید کی اس کو بھی رقم کیا ہے۔

یگانہ چنگیزی اور غالب : غالب کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے جھنجھلا اٹھنے والوں میں مرزا واحد حسین یگانہ کا نام بہت نمایاں ہے۔ غالب کے خلاف ان کا پہلا مضمون ۱۹۱۵ء میں ہاپوڑ کے ایک رسالہ ''خیال'' میں شائع ہوا جس میں انھوں نے آتش اور غالب کا موازنہ کر کے آتش کی برتری ثابت کی ہے۔

لیکن صباح الدین صاحب کے مطابق یہ مضمون ان کی نظر سے نہیں گزرا۔ ۶۰۔۱۹۵۹ء اور ۶۱۔۱۹۶۰ء کے علی گڑھ میگزین میں یگانہ کی خودنوشتہ سوانح عمری کا جو حصہ شائع ہوا تھا اس پر انھوں نے غالب کے ایک شعر پر بہت ہی فاضلانہ تنقید کر کے آخر میں آتش کو اونچا دکھایا ہے۔ اس کے علاوہ انھوں نے غالب پر سرقہ کا الزام بھی لگایا ہے جس کا ذکر صباح الدین صاحب نے اس عنوان کے تحت کیا ہے۔

کیا سرقہ کا الزام صحیح ہے : اس عنوان کے تحت صباح الدین صاحب لکھتے ہیں کہ غالب کے بیانات اور اعتراضات کے بعد ان پر یہ کہاں الزام آتا ہے کہ وہ اساتذہ فن کے اشعار کے چور تھے۔ وہ تو خود کہتے ہیں کہ وہ ان سے استفادہ کر کے ان کے رنگ میں اشعار کہتے رہے۔ اور شاعرانہ بے راہ روی، آوارگی اور مطلق العنانی کے بجائے ان ہی کی بدولت گیرائی اور خاص روش پیدا کی۔ لیکن مرزا یگانہ غالب کے اس اعتراف کو یہ رنگ دیتے ہیں کہ وہ اپنی تلون مزاجی، شاعرانہ بوالہوسی اور سرگشتگی میں کبھی نظیری اور کبھی بیدل کا پیالہ چاٹتے اور کبھی صائب کا۔ جس کو یگانہ غالب کی تلون مزاجی، شاعرانہ بوالہوسی، حیرانی اور سرگشتگی پر محمول کرتے ہیں وہ دراصل ایک بے قرار ذہن ایک مضطرب شاعرانہ عبقریت کی حیرانی اور سرگشتگی تھی جس کی بدولت انھوں نے یگانہ سے نہ سہی لیکن اوروں سے یہ داد حاصل کر لی کہ انھوں نے اپنی طراحی فکر سے کاغذ کو ارژنگ اور رنگینی معنی سے صفحہ کو گلرنگ بنا دیا اور انھوں نے اپنے ابتدائی دور میں نہ صرف بیدل، حزیں، نظیری، ظہوری بلکہ طالب آملی، صائب، شوکت بخاری، اسیر غنی، ناصر علی اور ناسخ کے اثرات قبول کئے اور میر سودا اور درد کی زمینوں پر بھی غزلیں کہیں۔ یہ ان کی نقالی یا چوری سمجھی جائے لیکن اساتذہ کے رنگ میں رنگنے کے بعد انھوں نے اپنا جو انفرادی رنگ پیدا کیا وہ اردو شاعری کے لئے بیش

قیمت سرمایہ بن گیا۔

مرزا یگانہ اسی مضمون میں اس بات کا اعتراف بھی کرتے ہیں کہ چوری یا نقالی کے الزام سے کوئی شاعر بچ نہیں سکتا کیونکہ چراغ سے چراغ جلتا ہے۔ متاخرین ہمیشہ متقدمین سے استفادہ کرتے ہیں۔ چنانچہ صباح الدین صاحب اس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

> ''مرزا یگانہ غالب کو اس حق سے محروم اس لئے کرنا چاہتے ہیں کہ ان کا کلام الہامی اور بخیل بتایا جاتا ہے۔ ان کا سارا غصہ اگر کلام غالب کو الہامی کہنے والوں پر اترتا ہے تو صحیح تھا لیکن غالب کو چور گونگا، ٹھونس ٹھانس کرنے والا، بے سرا جھوٹا، دہقانی، بے ڈھنگا وغیرہ کہنا کہاں تک ادبی فرض اور خدمت انجام دینے کے مترادف ہے اور پھر حسب ذیل عبارت لکھنا کہاں تک ادبی تہذیب میں داخل ہے۔'' [۱]

آسی لکھنوی : جناب عبدالباری آسی نے بھی اپنی کتاب مکمل شرح ''دیوان غالب'' میں غالب اور فارسی شعراء کے متحد المضامین اشعار کی نشاندہی کی، جن میں سید صاحب نے کچھ اشعار نقل کئے ہیں۔ ان میں سے کچھ اشعار تو وہی ہیں جو یگانہ کی غالب شکن میں ہیں۔ آسی نے اپنی شرح میں جگہ جگہ یگانہ پر تنقید کیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یگانہ نے غالب پر سرقہ کا جو الزام رکھا تھا اس سے آسی باخبر تھے۔ صباح الدین صاحب کے نزدیک یگانہ اور آسی میں فرق یہ ہے کہ یگانہ کی تنقیدوں کا لب و لہجہ غیر متین اور ناشائستہ ہے لیکن آسی کے تبصرہ میں متانت و شائستگی ہے۔ آسی اپنی تصنیفات کے آخر میں غالب کی شاعری پر اپنے تحسین آمیز تاثرات مختصر طریقہ پر قلم بند کرتے ہیں۔ ان میں کوئی ادعائی شان نہیں اور نہ موجودہ دور کی تنقید نگاری کے مطابق ہے بلکہ غالب کی تمام شرحوں کے بعد وہ جس نتیجہ پر پہنچتے ہیں اس کو بے تکلفانہ طور سے سیدھے سادے الفاظ میں درج کیا ہے۔

۱۔ غالب مدح وقدح کی روشنی میں، جلد اوّل، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ص ۲۸۴

آسی کی شرح طباطبائی اور حسرت موہانی اور سہا کی شرحوں سے نسبتاً زیادہ ضخیم ہے۔ صباح الدین صاحب کے نزدیک تمام شرحوں میں طباطبائی کے بعد آسی ہی کی شرح زیادہ قابل قدر اور لائق مطالعہ ہے۔

اس کے علاوہ آسی کی شرح کا دوسرا ایڈیشن ۱۹۳۰ء میں شائع ہوا جس کے مقدمہ میں غالب کی شاعری پر انھوں نے اپنی تفصیلی رائے لکھی ہے۔ سید صاحب نے اس کتاب میں اس رائے کو مختصراً پیش کیا ہے۔

آسی اور غالب کی شوخیاں: اس سے متعلق صباح الدین صاحب لکھتے ہیں کہ غالب کے ادبی کارناموں سے آسی کی دلچسپی میں بڑی رنگارنگی ہے۔ انھوں نے ''مرزا غالب کی شوخیاں اور شوخ نگاریاں'' کے عنوان سے ایک طویل مفید اور دلچسپ مقالہ لکھا جو جنوری ۱۹۳۲ء کے ''نگار'' کے مستقل شمارہ میں شائع ہوا۔

محمد حسین آزاد اور حالی دونوں نے مرزا غالب کے بہت سے لطائف وظرائف نقل کئے ہیں لیکن آزاد اور حالی کے ایجاز کے لئے اطناب کی ضرورت تھی جو آسی نے نگار کے ۱۵۲ صفحے کے مقالے میں پورا کیا۔ انھوں نے مرزا کی شوخیاں اور شوخ نگاریاں ان کی اردو اور فارسی نثر اور مضمون سب ہی سے دکھائی دیتی ہیں جن کے نمونے بھی کثرت سے دیئے گئے ہیں۔ انھوں نے غالب کے خطوط کا بہت ہی جامع ،مبسوط، مفصل اور سیر حاصل استقصا پیش کیا ہے۔ جس کو صباح الدین صاحب نے نمبروار بطور خلاصہ پیش کیا ہے جس میں غالب کی سیرت کے روشن، قابل قدر اور باعظمت پہلو بھی غالب کے پرستاروں کے سامنے آگئے ہیں۔

نیاز فتح پوری اور غالب: صباح الدین صاحب لکھتے ہیں کہ آسی نے اپنے طویل مقالہ میں جو دلچسپ اور پر از معلومات باتیں لکھی ہیں ان کو پڑھ کر حظ حاصل ہوتا ہے۔ لیکن نگار کے اسی شمارے میں نیاز فتح پوری نے اس مقالہ پر جو تبصرہ کیا ہے اس کو پڑھ کر طبیعت بدحظ ہو جاتی ہے۔ نیاز صاحب نے غالب کی رندانہ شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''دین و مذہب دو بالکل علیحدہ چیزیں ہیں۔ اول الذکر کا تعلق ایک شخص کے ذاتی اعتقادات سے ہے اور دوسرے کا سوسائٹی سے۔ اس لئے غالب مذہب

کے لحاظ سے جو کچھ بھی رہے ہوں لیکن دین کے لحاظ سے ان میں ابن الراوندی ابوالعلا المعری یا کم از کم علامہ ابن تیمیہ کی روح ضرور کام کر رہی تھی۔'' ۱

سید صباح الدین صاحب نے نیاز صاحب کی اس رائے کی تردید کرتے ہوئے ان سے نہ صرف اختلاف کیا ہے بلکہ صحیح اسلامی فکر کی ترجمانی بھی کی ہے۔ سید صاحب لکھتے ہیں:

''نیاز صاحب.....اپنی طبیعت کے مقتضا سے مجبور تھے.....اس لئے ادبی رنگ میں ان کی نیش زنی جاری رہی۔ چنانچہ غالب کے کلام پر اظہار رائے کرتے ہوئے دین و مذہب کو دو علیحدہ چیزیں قرار دیں۔ مذہب اور شریعت میں تفریق کرتے تو صحیح ہوتا۔ لیکن دین اور مذہب کی تفریق کر کے ان کی جو تعریف بیان کی ہے وہ ان کی ذاتی اپج ہے۔ پھر ابن الراوندی، ابوالعلا المعری اور ابن تیمیہ کو ایک صف میں لا کر کھڑا کرنے کے معنی ہیں کہ وہ ان تینوں میں سے کسی سے بھی واقف نہیں۔ ابن الراوندی کھلا ہوا ملحد تھا اور ابوالعلا المعری آزاد مشرب تھا اور ابن تیمیہ نہ صرف اسلام کے بہت بڑے علم بردار بلکہ اس کے مجدد تھے۔ ابن الراوندی اور ابن تیمیہ کو ایک صف میں کھڑا کرنا ایسا ہی ہے جیسے اکبر اور حضرت مجدد الف ثانی کو ایک ساتھ کھڑا کیا جائے۔'' ۲

آرگس یا آسی : غالب کے کلام سے متعلق آسی نے اپنی شرح کے آخر میں جن تحسین آمیز تاثرات کا ظہار کیا ہے اس کا مطالعہ کرنے کے بعد انتہائی حیرت اس وقت ہوئی جب یہ معلوم ہوا کہ فروری ۱۹۲۸ء میں نیاز فتح پوری کے نگار میں ''غالب بے نقاب'' کے عنوان سے غالب پر سرقہ کا جو الزام لگایا ہے اس کے لکھنے والے آسی لکھنوی ہی تھے۔ اکرام نے اپنی کتاب غالب نامہ میں لکھا ہے:

۱۔ غالب مدح وقدح کی روشنی میں، جلد اوّل، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ص ۳۲۹

۲۔ ایضاً، ص ۳۳۰

''مرزا یاس اور مولانا آرگس (مولانا عبدالباری آسی ہی نے محنت و تفتیش سے اساتذہ قدیم کے کلام سے کئی شعر ایسے نکالے ہیں جن کے مضامین غالب سے ملتے جلتے ہیں۔ اور پھر جناب مالک رام صاحب نے بھی مجھ کو بتایا کہ نیاز فتح پوری نے ان سے صاف طور پر کہا تھا کہ آرگس دراصل آسی لکھنوی ہی ہیں۔ اگر آرگس واقعی آسی لکھنوی ہیں تو انھوں نے اپنی مکمل شرح کلام غالب میں غالب کے متعلق جو کچھ لکھا ہے اس کو تسلیم کیا جائے یا ''غالب بے نقاب'' میں جو کچھ تحریر کیا ہے اس کو صحیح سمجھا جائے۔''[۱]

عبدالرحمٰن چغتائی اور غالب : ۱۹۲۸ء میں پنجاب کے مشہور مصور عبدالرحمٰن چغتائی نے دیوان غالب کا ایک مصور نسخہ شائع کر کے غالب سے اپنی عقیدت کا اظہار کیا ہے۔

رام بابو سکسینہ اور غالب : صباح الدین صاحب لکھتے ہیں کہ یگانہ چنگیزی نے اپنی چنگیزیت سے غالب کی شخصیت و مقبولیت پر جو داغ لگایا تھا اس کا اثر علمی حلقہ پر نہیں ہوا۔ ان کی کتاب کی اشاعت کے بعد ہی ۱۹۲۷ء میں ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کی ہسٹری آف اردو لٹریچر انگریزی زبان میں نکلی جس کا اردو ترجمہ کر کے مرزا محمد عسکری نے ۱۹۲۹ء میں تاریخ ادب اردو کے نام سے شائع کیا۔ اس میں رام بابو سکسینہ نے کافی جامعیت و رغبت کے ساتھ غالب کی ذات اور شاعری کا مطالعہ کیا۔ انھوں نے مرزا کی شاعری کو اردو شاعری کا بہترین خزانہ اور اردو شاعری کا گراں قدر سرمایہ قرار دیا ہے۔ اور اس کے تین دور مرتب کئے جس کا ذکر مصنف نے کیا ہے۔ انھوں نے غالب کی شاعری کی مختلف خصوصیتوں کا ذکر بھی والہانہ انداز میں کیا ہے جن کا خلاصہ درج ہے۔ مصنف نے رام بابو سکسینہ کی مدح سرائی اور غالب شناسی سے متعلق اس طرح تحریر کیا ہے:

''غالب کی خوبیوں کی تعریف انھوں نے جھوم جھوم کر لکھی ہے..... وہ

۱۔ غالب مدح و قدح کی روشنی میں، جلد اوّل، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ص ۳۳۱

غالب کا مقابلہ یورپین شعرا سے بھی کرتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ ان کو صوفی براوننگ کہنا بجا ہے۔ ہر چند کہ براوننگ کے کھرے پن اور اکھڑ پن سے ان کا کلام پاک ہے۔ پھر رقم طراز ہیں کہ مضامین حسن و یاس میں ان کا مقابلہ جرمنی کے شاعر ہین سے خوب ہوسکتا ہے اور آخر میں لکھتے ہیں فی الحقیقت اگر کوئی فلسفی شاعر ان کا مدمقابل یورپ میں گزرا ہے تو وہ جرمنی کا مشہور و معروف گیٹے ہے۔ غالب میں ان تین چیزوں کا اجتماع ہوگیا ہے یعنی فلسفی کی عقل و ادراک، صوفی کی نگاہ دوربیں، چابک دست مصور کا نازک ہاتھ، ان کی صفت پرکاری اور پرکاری صفت ہے اور حسن حق ہے اور حق حسن ہے۔'' [1]

عبداللطیف اور غالب :اس عنوان کے تحت صباح الدین صاحب لکھتے ہیں کہ غالب کی اس قسم کی تعریف و توصیف کو ڈاکٹر عبداللطیف ظنیات اور غیر معتدل مدح سرائی قرار دیتے ہیں۔ انھوں نے جامعہ عثمانیہ کی پروفیسری کے زمانے میں ۱۹۲۸ء میں غالب پر ایک انگریزی کتاب لکھی جس کا اردو ترجمہ معین الدین قریشی ایم۔اے نے کیا۔ جن کے بارے میں خود مصنف کا بیان ہے کہ اردو داں طبقہ میں ایک سنسنی پیدا ہوگئی مصنف کو یہ حسن ظن پیدا ہوگیا تھا کہ غالب پر ان کی یہ تنقید غالب کی غیر معتدل مدح سرائی کے خلاف ایک حق بجانب صدائے احتجاج ہے۔ سید صباح الدین صاحب کے مطابق:

''ڈاکٹر صاحب اپنی اس کتاب کی اشاعت سے خوش تو ضرور ہوئے کہ اس سے اردو داں طبقہ میں ایک سنسنی پیدا ہوگئی۔ لیکن انھیں اپنی زندگی ہی میں اندازہ ہوگیا ہوگا کہ انھوں نے غالب کی غیر معتدل مدحت سرائی کے خلاف جو صدائے احتجاج بلند کی وہ حق بجانب ثابت ہوئی۔ یا صدا بصحرا بن کر رہ گئی۔ کیونکہ ان کی کتاب کی اشاعت سے تادم تحریر غالب کی مدح سرائی کا ایک انبار

۱۔ غالب مدح وقدح کی روشنی میں، جلد اوّل، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ص ۳۴۷

ہی نہیں لگ گیا بلکہ ایک دریا بہہ گیا۔ ان مدحت طرازیوں سے کسی کو اتفاق ہو
نہ ہو لیکن یہ امر واقعہ ہے کہ شرحوں، کتابوں، مقالوں اور رسالوں کے خاص
نمبروں حتیٰ کہ قلمی دستاویزوں کے پشتاروں کی کوئی حد نہیں۔'' ۱

ڈاکٹر عبداللطیف کی انگریزی کتاب کا حجم بہت زیادہ نہیں۔ اس کا اردو ترجمہ ۱۳۸ صفحات پر مشتمل ہے ان کی سنسنی خیز تنقید تحسین سے بہت ہٹ کر ان کی تحقیق و تلاش کی کسوٹی پر پرکھی گئی تو تحقیقی معیار پوری نہیں اتری۔ اس میں کافی غلطیاں پائی گئیں جن کی طرف غالب نامہ میں خاص طور سے توجہ کی گئی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''جس قدر ڈاکٹر صاحب کو تنقید اور ریسرچ کے اصولوں سے واقفیت ہے اتنی
غالب کی تصنیفات سے نہیں۔ اپنی کتابوں میں انھوں نے کئی باتیں ایسی لکھی ہیں
جو غلط ہیں اور جس نے ان کی کتاب کی علمی وقعت کو بہت صدمہ پہنچایا ہے۔'' ۲

سید صباح الدین صاحب نے جہاں ڈاکٹر عبداللطیف کی غالب شکن آرا کا تجزیہ کرتے ہوئے ان پر تنقید کی ہے وہیں غالبیات کے میدان میں ان کی ایک خاص عطا کا ذکر بھی ضروری سمجھا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''ڈاکٹر عبداللطیف نے اپنی کتاب میں دو ایسی باتوں کی طرف متوجہ کیا، جن کی
طرف غالب کے سوانح نگاروں اور نقادوں کا ذہن منتقل نہیں ہوا تھا۔ ایک تو یہ
کہ ان کی زندگی کے واقعات تاریخ وار اور ترقی وار بیان کئے ہیں۔ دوسری یہ
کہ ان کے کلام کی ترتیب بھی سنین وار دی جائے تا کہ ان کے ذہن و کمال کی
نشو و نما اور ارتقاء پر روشنی پڑے اور یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ ڈاکٹر صاحب کی
دونوں باتیں غالبیات کے حلقہ میں سنی گئیں۔'' ۳

۱۔ غالب مدح و قدح کی روشنی میں، جلد اوّل، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ص ۳۵۵۔۳۵۶

۲۔ ایضاً، ص ۳۵۷

۳۔ ایضاً، ص ۳۵۸

غالب مدح وقدح کی روشنی میں (جلد دوم)

غالب مدح وقدح کی روشنی میں جلد دوم کا انداز اور اسلوب تحریر بھی پہلے ہی جلد کی طرح ہے۔ البتہ اس میں ۱۹۲۹ء سے ۱۹۶۹ء تک مرزا غالب کی شاعری کی حمایت ومخالفت میں جو کچھ لکھا گیا ہے اس پر ناقدانہ تبصرہ ہے۔ اس جلد کا تعلق دور جدید کی شخصیتوں اور تحریروں سے بھی ہے۔ اس میں صباح الدین صاحب نے مرزا محمد عسکری اور غالب کے عنوان کے تحت لکھا ہے کہ انھوں نے ڈاکٹر رام بابو سکسینہ کی انگریزی کتاب ہسٹری آف اردو لٹریچر کا اردو ترجمہ کر کے کافی شہرت حاصل کر لی تھی۔ انھوں نے غالب کی خطوط نویسی اور مکتوب نگاری پر تبصرہ کیا ہے۔

غالب اور بیخود دہلوی : سید وحید الدین صاحب بے خود دہلوی جانشین حضرت داغ کی ایک شرح مرأۃ الغالب کے نام سے شائع ہوئی، جس کی وجہ تالیف جناب آغا طاہر صاحب نبیرۂ آزاد یہ نے دیباچہ میں تحریر کیا ہے۔ اس سلسلے میں صباح الدین صاحب لکھتے ہیں:

> ''آغا طاہر صاحب کا بیان ہے کہ شرح زیادہ تر اس خیال سے چھپوائی گئی ہے کہ شاعرانہ ترکیبیں زبان کے نکتے دلی والوں کا خاص طرز ادا عشقیہ جذبات سب عام فہم ہو جائیں۔ اس میں غالب کے کلام کے صرف معانی ومطالب بتا دیئے گئے ہیں۔ ان پر طباطبائی اور آسی کی طرح کوئی ادبی بحث نہیں چھیڑی گئی ہے نہ مدح وقدح کا کہیں اظہار اور نہ پہلے کے شارحین سے کہیں اختلاف کیا گیا ہے۔ بے خود دہلوی صاحب نے اشعار کے جو مطالب خود سمجھے ہیں وہ دیانت داری سے بتا دیئے ہیں۔''[۱]

مہر اور غالب : انقلاب کے اڈیٹر مولانا غلام رسول مہر صاحب کا نام غالب کے پرستاروں میں لیا جاتا ہے۔ انھوں نے ۱۹۳۶ء میں اپنی مشہور کتاب غالب لکھی جس میں کہیں سے صحافتی رنگ نہیں جھلکتا بلکہ

۱۔ غالب مدح وقدح کی روشنی میں، جلد دوم، ص ۱۲

شروع سے آخر تک علمی چھان بین اور دیدہ ریزی کا رنگ گہرا ہے۔ سید صاحب لکھتے ہیں کہ اس میں شبہ نہیں کہ مولانا نے تحقیق و تلاش کے پورے معیار کو سامنے رکھ کر یہ کتاب لکھی ہے۔ یادگار غالب میں جو بات اختصار سے لکھی گئی تھی وہ مہر صاحب کی کتاب میں تفصیل سے لکھی گئی ہے۔ لیکن یادگار غالب پڑھنے کے بعد جو دلآویز رعنا شخصیت ابھری ہے وہ مولانا مہر کی غالب میں نظر نہیں آتی۔

مولانا مہر نے اپنی کتاب کے دوسرے اڈیشن میں مولانا ابوالکلام آزاد کی ان تحریروں کا اضافہ کر دیا ہے جو انھوں نے ان کی کتاب کو پڑھ کر بطور استدراک لکھا تھا۔ غلام رسول مہر غالب کے پرستار ہونے کے ساتھ ساتھ مولانا ابوالکلام آزاد کے معتقد اور مداح تھے۔ انھوں نے مولانا آزاد کے استدراک کو بے حد شکریہ کے ساتھ اپنی کتاب میں جا بجا نقل کر دیا ہے۔ لیکن مولانا آزاد کی یہ تحریریں غالب شکنی کے لٹریچر میں مزید اضافہ کرتی ہیں۔ اس کے بعد مولانا مہر نے غالب کی تحریر بھی رقم کی ہے۔

صباح الدین صاحب کے خیالات کے مطابق مولانا ابوالکلام آزاد کی تحریروں سے غالب کی جو بری تصویر سامنے آتی ہے مہر صاحب کی کتاب کے تیرہویں باب، اخلاق و عادات کی مرقع آرائی میں دھندلی ہو کر رہ جاتی ہے۔ لیکن یہ بھی کہنا پڑتا ہے کہ حالی نے اپنے موئے قلم سے غالب کی شخصیت کی مصوری کرنے میں جو دلآویز، دلچسپ اور پر کیف پیرایہ اختیار کیا ہے وہ مہر صاحب کے مذکورہ بالا باب میں نہیں۔ خود مہر صاحب کو یہ اعتراف ہے کہ غالب کو ہندوستان میں جو ہر دلعزیزی حاصل ہے اس کے پیدا کرنے میں یادگار غالب کا بہت بڑا حصہ ہے۔

اسی کے ساتھ مہر صاحب اپنی کتاب کے پہلے ایڈیشن میں یہ بھی لکھ گئے تھے کہ یادگار غالب اپنی تمام خوبیوں کے باوجود غالب کی صحیح مفصل اور مستند سرگزشت نہیں۔ ان کا یہ بیان کسی طرح قابل قبول نہیں۔ یہ مفصل نہ ہو لیکن صحیح اور مستند ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

اس کے علاوہ شیخ محمد اکرام نے اپنی کتاب غالب نامہ میں مولانا مہر کی کتاب پر اسی قسم کا الزام عائد کیا جیسا انھوں نے مولانا حالی کی یادگار غالب پر کیا تھا۔

خطوط غالب اور مہر سے متعلق : سید صاحب لکھتے ہیں کہ مولانا مہر نے ۱۹۱۵ء میں خطوط غالب کو مرتب کر کے ان کو دو حصوں میں شائع کیا۔ اس کے شروع میں ۴۹ صفحے کا ایک مقدمہ ہے۔ اس سے پہلے ایک مختصر تعارف ہے جس میں مولانا نے بتایا ہے کہ ان دونوں جلدوں میں خطوط تاریخی ترتیب کے ساتھ مرتب کئے گئے ہیں۔ مولانا کا یہ دعویٰ ہے کہ مرزا کے اردو مکاتیب کو درسی طور پر پڑھانے سے اردو زبان کا صحیح ذوق جس پیمانے پر پیدا کیا جا سکتا ہے وہ کسی دوسری کتاب سے نہیں ہو سکتا۔ مولانا کا خیال ہے کہ اردوئے معلیٰ اور عود ہندی کی ترتیب میں وہ اہتمام نہیں کیا گیا جس سے اس کی افادی حیثیت واضح ہوتی۔ مولانا نے اپنے مجموعوں میں اس کمی کو پورا کرنے کی کوشش کی ہے۔

شیخ اکرام اور غالب : اس عنوان کے تحت سید صباح الدین صاحب نے اپنے طویل تبصرہ میں یہ ثابت کیا ہے کہ غالبیات کے موضوع پر شیخ اکرام کی تحریر ان کے نزدیک سب سے اہم ہے۔ سید صاحب نے شیخ اکرام کی ہر بات کا تجزیہ کرنے اور جواب دینے کے لئے بہت کدوکاوش کی ہے۔

شیخ اکرام کی تصنیف ''غالب نامہ'' کا پہلا ایڈیشن ۱۹۳۶ء میں شائع ہوا جو بقول شیخ اکرام کے سات آٹھ سال کی تلاش و تحقیق کا نتیجہ تھا۔ اس ایڈیشن سے شیخ اکرام کی کافی شہرت ہوئی۔ اس کے دیباچہ میں وہ لکھتے ہیں:

> ''میں نے محسوس کیا کہ غالب کے متعلق ایک ایسی کتاب لکھی جائے جو ڈاکٹر عبداللطیف کے کڑے معیار پر بھی پوری اترے اور جس میں مولانا حالی کی میانہ روی اور ان کے مقدمہ دیوان کے بالغ نظری کی پیروی بھی ہو۔ یادگار غالب مجھے بہت پسند تھی لیکن یہ تسلیم کئے بغیر کوئی چارہ نہیں تھا کہ اس میں سوانحی تسلسل قریباً مفقود تھا اور شاعر کے کئی اہم واقعات زندگی کے متعلق مصنف کا بیان نہایت سرسری اور سنہ وقوع یا اس طرح کی ضروری تفصیلات سے عاری تھا۔'' [۱]

۱۔ غالب مدح و قدح کی روشنی میں، جلد دوم، ص ۳۸

حالی پر اعتراضات سے متعلق سید صاحب لکھتے ہیں کہ:

''حالی پر اس اعتراض کے ساتھ وہ اپنی کتاب کے اندر یہ بھی لکھ گئے ہیں کہ جہاں تک سوانحی حالات کا تعلق ہے ابھی تک حالی سے آگے کوئی نہیں بڑھا۔'' [۱]

سید صباح الدین صاحب نے غالب نامہ کے تمام ابواب وعناوین کا مختصراً ذکر اس طرح کیا ہے۔

''اکرام صاحب نے غالب نامہ میں غالب کا مذہب، حب وطن، معاصرین، حلیہ، اخلاق و عادات کا ذکر ان کے شاعری کے تبصرہ کے سلسلہ میں کیا ہے۔ جو ظاہر ہے کہ غالب کے تذکرہ میں ہونا چاہئے تھا۔ اس تقدیم وتاخیر سے ان سے وہی شکایت پیدا ہوگئی ہے جو ان کو حالی سے تھی کہ اس میں سوانحی تسلسل نہیں۔ اکرام صاحب نے حالی کے اخلاق وعادات کے متعلق جو کچھ لکھا ہے ان کے متعلق ان ہی کے الفاظ میں کہا جا سکتا ہے کہ وہ نہایت سرسری اور ضروری تفصیلات سے عاری ہے۔ اور اس عنوان سے حالی کی تفصیلات سے غالب کی جو دلکش اور دلآویز تصویر سامنے آتی ہے وہ غالب نامہ کے پورے مطالعہ سے نہیں آتی ہے۔''

سید صاحب نے اکرام صاحب کی تصنیف غالب نامہ کو اپنی اس کتاب میں کافی تفصیل کے ساتھ تبصرہ کیا ہے۔ جس میں جگہ جگہ سید صاحب نے اپنی تحقیق وتدقیق سے ان کی تحریر کو تسامحات اور فروگزاشت پر نظری وعملی تنقیدی اور ناقدانہ ژرف نگاہی اور نکتہ آفرینی کے جوہر دکھائے ہیں۔ لیکن جہاں سید صاحب نے ان کے اسلوب تنقید اور انداز تحریر پر کھل کر داد دی ہے وہیں ان کے بڑے کارناموں کو بھی منظر عام پر لانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ ان کے افکار ونظریات شدید اختلاف کے باوجود انھوں نے ترتیب دیوان غالب کو پسند کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

''البتہ اکرام صاحب کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے غالب کے دیوان کی ترتیب سنہ وار کی ہے۔ جس سے غالب کے ارتقائی ذہن کو سمجھنے میں بڑی مدد ملتی

۱۔ غالب مدح وقدح کی روشنی میں، جلد دوم، ص ۳۰۔۳۱

ہے۔ غالب نامہ کے پہلے ایڈیشن میں تو صرف اردو کا کلام تھا لیکن ارمغان غالب میں اردو کلام کے ساتھ ساتھ فارسی کلام سنہ وار ترتیب کے ساتھ درج ہے۔ اس ترتیب میں اکرام صاحب نے جو محنت تلاش و تحقیق کی ہے وہ ہر طرح تعریف و تحسین کی مستحق ہے۔'' [۱]

عرشی اور غالب : غالب کی لیلائے شعر و ادب کے مجنوں مولانا عرشی رام پوری ہیں۔ ان کو غالب کے ہر شعر اور ان کی نثر کی ہر سطر سے بڑی وارفتگی اور شیفتگی ہے۔ انھوں نے جناب بشیر حسن زیدی کی ایما پر جو اس وقت رام پور ریاست کے وزیر اعلیٰ تھے۔ ۱۹۳۷ء میں مکاتیب غالب شائع کی۔ یہ غالب کے ان خطوط کا مجموعہ ہے جو انھوں نے نوابان رام پور کو لکھے تھے۔ اور وہاں کی ریاست کے دارالاشاعت کے کاغذوں کے انبار میں دبے پڑے تھے۔ لیکن مولانا عرشی نے ان کو وہاں سے نکال کر بڑی محنت سے مرتب کیا۔

اس کے علاوہ عرشی صاحب نے غالب کے منتخب کلام کا ایڈیشن جو ۱۹۴۲ء میں ''انتخاب کلام غالب'' کے نام سے شائع کیا اس کی اہمیت اس لئے زیادہ ہے کہ یہ انتخاب خود غالب کا کیا ہوا ہے۔ غالب نے اپنا یہ انتخاب اپنی وفات کے تین سال پہلے کیا۔

مولانا عرشی نے ۱۹۵۸ء میں دیوان غالب اردو کے نام سے ایک ضخیم کتاب شائع کی۔ یہ دراصل غالب کے ان تمام اشعار کا مجموعہ ہے جو ان کے نام سے شائع ہوئے یا جو مولانا عرشی کے دوستوں کے لطف کرم سے ان کو حاصل ہوئے۔ مولانا عرشی نے ان کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔

(۱) گنجینۂ معنی (۲) نوائے سروش (۳) یادگار نالۂ

مہیش پرشاد اور غالب : ۱۹۴۱ء میں ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد نے ہندو یونیورسٹی بنارس کے پروفیسر مہیش پرشاد کے خطوط غالب کی پہلی جلد شائع کی۔ اس پر ڈاکٹر عبدالستار صدیقی نے نظر ثانی کر کے ایک مقدمہ بھی لکھا۔ پروفیسر مہیش پرشاد نے اپنا مجموعہ اس خیال سے ترتیب دینے کی کوشش کی تھی کہ اس میں اردوئے

۱۔ غالب مدح و قدح کی روشنی میں، جلد دوم، ص ۹۹

معلیٰ اور عود ہندی کی طرح طباعت کی غلطیاں نہ ہوں۔ لیکن مولانا غلام رسول مہر نے اپنے مجموعے خطوط غالب میں لکھا ہے کہ یہ بھی غلطیوں سے پاک نہیں۔

یحییٰ تنہا اور غالب: سید صاحب اس سے متعلق لکھتے ہیں کہ سیر المصنفین کے مصنف یحییٰ تنہا صاحب نے مرأۃ الشعر لکھ کر اپنی تذکرہ نویسی اور شعر و شاعری پر اپنی تنقید نگاری کے ذوق کا ثبوت دیا ہے۔ ان کی دونوں کتاب مرأۃ الشعر اور سیر المصنفین شوق سے پڑھی جاتی ہیں۔ مرأۃ الشعر میں اور شعراء کے ساتھ غالب کا تذکرہ ہے۔ ان کی شاعری پر فاضل مصنف نے جو تبصرہ کیا ہے اس میں ان کی ذاتی پسندیدگی کے رجحانات زیادہ نمایاں ہیں۔ وہ غالب کو ذوق اور میر دونوں سے زیادہ پسند کرتے ہیں۔

مالک رام اور غالب: غالب کی ذات کے گرویدہ اور ان کی شاعری کی شمع کے پروانے جناب مالک رام ہیں۔ ۱۹۳۸ء میں مالک رام نے ذکر غالب کے عنوان سے ایک سوانح عمری لکھی جو بقول ڈاکٹر سید عابد حسین ان تمام تحقیقات کا نچوڑ ہے جو اب تک غالب کی سیرت کے متعلق ہو چکی ہیں۔ اس کے علاوہ اس میں مالک رام صاحب نے نئے ماخذوں کو کھنگال کر نئی معلومات بھی فراہم کی ہیں جو کہیں اور نہیں ملتیں۔ سید صاحب اس عنوان کے تحت طویل تبصرہ کرتے ہوئے رقم طراز ہیں:

> ''مالک رام صاحب نے غالبیات کے سلسلہ میں جس محنت و کاوش سے ان کے بعض پہلوؤں کو ظاہر کیا تو اس کی داد ان کو ہر طرف سے ملنے لگی۔ اور پھر رسالہ آج کل دہلی میں پروفیسر مسعود حسن رضوی، قاضی عبدالودود، مولانا عرشی رام پوری کے ساتھ ان کی تصویر چھاپ کر ان کو اردو ادب کی تحقیق کے چار ستونوں میں شامل کیا گیا۔ مگر حال ہی میں ان کے ناقدین کی ایک جماعت پیدا ہوگئی ہے جس نے مختلف مضامین کا ایک مجموعہ شامل کر کے ان کی تحقیقی کاوشوں پر ضرب کاری لگانے کی کوشش کی ہے۔ بڑے سے بڑے صاحب ادعا محقق کی بھی غلطیاں نکال کر دکھائی جاسکتی ہیں۔ اگر غلطیوں کے مقابلہ میں

اس کی مجموعی علمی و تحقیقی کاوشوں سے لوگ مستفید ہوتے رہتے ہیں تو اس کے رتبہ میں کوئی فرق نہیں آتا۔ مالک رام صاحب اس لحاظ سے بہت قابل قدر ہیں کہ اردو ادب میں پیارے لال آشوب سے جو ادبی و علمی نسل چلی تھی اس کی روایات کو بہت اونچا اور بلند کیا اور کیا عجب کہ آئندہ پھر کوئی مالک رام نہ پیدا ہو۔'' [۱]

آل احمد سرور نے ان کے متعلق لکھا ہے۔

''اردو کے محققوں میں مالک رام کئی حیثیتوں سے امتیاز رکھتے ہیں۔ وہ جس موضوع پر قلم اٹھاتے ہیں اس کے ہر پہلو کا غائر مطالعہ کرتے ہیں۔ تمام ضروری مواد مہیا کرتے ہیں اور نہایت سلجھے ہوئے اور شگفتہ انداز میں مواد پیش کر دیتے ہیں۔ ان کے یہاں جذباتیت سرے سے نہیں بلکہ ہمدردی..... کے باوجود ایک معروضی نظر کی کوشش ہے۔ دوسرے انھوں نے غالب پر جو تحقیق کی ہے اس کی وجہ سے غالبیات میں ان کا نہایت بلند مقام ہے۔ ذکر غالب اور تلامذہ غالب کے علاوہ دیوان غالب کا وہ ایڈیشن جو آزاد کتاب گھر سے شائع ہوا ان کی نظر کی گہرائی اور ذوق سلیم دونوں کا غیر فانی نقش ہیں۔ ان کی تیسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ اپنے ہم عصروں کے کام کا مناسب اعتراف کرتے ہیں اور ان کی مدد کے لئے ہمیشہ تیار رہتے ہیں۔'' [۲]

آل احمد سرور کی اس رائے سے زیادہ سے زیادہ ارباب ذوق کو اتفاق ہوگا۔

آل احمد سرور اور غالب: آل احمد سرور غالب کی عظمت و اہمیت سے متاثر رہے ہیں۔ ان کے اسلوب تنقید پر تبصرہ علمی تنقید کا شاندار نمونہ ہے۔ آل احمد سرور نے غالب پر اپنا پہلا مضمون لکھا جو نئے اور پرانے

۱۔ غالب مدح و قدح کی روشنی میں، جلد دوم، ص ۱۳۶

۲۔ ایضاً، ص ۱۳۷

چراغوں میں درج ہے۔ اس مضمون میں انھوں نے غالب اور ان کے کلام کے متعلق اپنے جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ الگ الگ ٹکڑوں میں سید صاحب نے درج کیا ہے جس سے غالب کی مدح کے ساتھ قدح کے بھی کچھ پہلو نکلتے ہیں۔ سید صاحب کا ماننا ہے کہ سرور صاحب نے اپنی تنقید نگاری کے طرز وادا سے اردو کے نوجوان نقادوں کو متاثر کیا ہے۔ وہ ان کے ایجاز واختصار کے حسین وجمیل فقروں کو پسند کرتے ہیں۔ سرور صاحب نے غالب پر ایک دوسرا مضمون ۱۹۴۹ء میں لکھا جس پر انھوں نے ۵ مارچ ۱۹۵۲ء میں نظر ثانی کی۔ اس میں بھی ان کے تاثراتی انداز کے شاعرانہ رنگ کے ترشے ہوئے اور چونکا دینے والے بہت سے فقرے ملیں گے جو ادھر ادھر سے ایک ساتھ جمع کر دیئے جائیں تو ان میں ایجاز، اختصار، ایمائیت اور اشاریت کا وہی لطف ملے گا جو کسی اچھی غزل میں ملتا ہے۔

سرور صاحب نے غالب پر ایک مضمون ''غالب کا ذہنی ارتقا'' کے عنوان سے لکھا جو لکھنؤ میں یوم غالب کے موقع پر پڑھا گیا۔ پھر ان کی کتاب ''ادب اور نظریہ'' میں ۱۹۵۴ء میں شائع ہوا۔ سید صاحب نے اس مضمون کے دلچسپ اور دلکش فقرے کو اس کتاب میں رقم کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''سرور صاحب کے مضمون کے ان مختلف ٹکڑوں کو جمع کر کے مطالعہ کرنے کے بعد کبھی توازن میں ادب لطیف اور کبھی ایک نئی گیتان جلی کا لطف ملتا ہے۔ اور کبھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کوئی افسانہ نگار اپنے ہیرو کے کمالات دکھا کر اپنے ناظرین کو متاثر کرنا چاہتا ہے۔ اور کبھی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ کوئی غزل گو اپنی غزل کے جذبہ فکر اور تخیل کے بجائے اپنے ترنم اور نغمہ سے مسحور کر رہا ہے۔ ممکن ہے کہ سرور صاحب نے اپنی ان تحریروں سے تنقید نگاری میں لطیف چاندنی پھیلا کر اس فن کو ایک اعتبار سے ترفع سکھانے کی کوشش کی ہو اور ممکن ہے کہ ان کی تنقید نگاری کی لے میں آنے والے دور کی تنقید نگاری کی آوازیں سنائی دیتی ہوں اگر ایسا ہے تو ان کے جملوں اور فقروں پر تو ضرور وجد کیا جا سکتا ہے مگر ان

کے معنی خیز تجربات اور نکات کو سمجھ کر ادبی بصیرت حاصل کرنا ہر کس و ناکس کے بس کی بات نہیں۔'' [۱]

سید احتشام حسین اور غالب: سید احتشام حسین کے تنقیدی مضامین کا تیسرا مجموعہ ۱۹۴۸ء میں ادب اور سماج کے نام سے شائع ہوا جس میں غالب کی بت شکنی کے نام سے ان کا ایک مضمون ہے۔ ان کے مضامین کا چوتھا مجموعہ ۱۹۵۲ء میں ''تنقید اور عملی تنقید'' کے نام سے شائع ہوا جس میں ''غالب کا تفکر'' ایک مضمون ہے۔ سید صاحب کے نزدیک دونوں مضامین میں انھوں نے غالب کو ان کے خیالات کی روشنی میں دیکھنے کے بجائے اپنے مخصوص نظریوں کے پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ سید صاحب کی تنقید کے اقتباسات ملاحظہ ہوں:

> ''معلوم نہیں غالب کی شاعری کی یہ کرامت ہے یا ان کے نقادوں کا یہ کمال ہے کہ ان کو فلسفی بھی ثابت کیا جا سکتا ہے ولی بھی، بادہ خوار بھی، رند بھی، شاہد باز بھی، فقیروں کا بھیس بدل کر اہل کرم کا تماشہ دیکھنے والا بھی، کسی کو لب بام پر ڈھونڈھنے والا بھی.....دشنام کھا کر دربان کو دعائیں دینے والا بھی اور پھر ان کے نقاد چاہیں تو نہ صرف وجود ہستی حیات کائنات، حسن، عشق اور فلسفہ تفاول ان کی شاعری سے ڈھونڈ نکالیں، بلکہ ان میں مغلیہ دور کی ساری سماجی اور تہذیبی روایات کے ساتھ اس زمانہ کے جدلیاتی اور نامیاتی تصورات، طبقاتی کشمکش اور معاشی مسائل بھی تلاش کر سکتے ہیں۔ سید احتشام حسین اپنی فکری سلاست روی، غیر معمولی شرافت طبع، بلندی اخلاق اور بصیرت علم کے ساتھ مارکسی نظریے کے حامی اور علم بردار کی حیثیت سے مشہور تھے۔ اس لئے انھوں نے غالب کے کلام کا اسی نقطہ نظر سے مطالعہ کیا ہے۔'' [۲]

۱۔ غالب مدح و قدح کی روشنی میں، جلد دوم، ص ۱۴۸

۲۔ ایضاً، ص ۱۵۱

شوکت سبزواری اور غالب : پروفیسر شوکت سبزواری کی ایک کتاب فلسفہ کلام غالب کے نام سے ۱۹۵۶ء میں شائع ہوئی جس میں انھوں نے غالب کو ایک باکمال فنکار اور فلسفی کی حیثیت سے ثابت کیا ہے۔ انھوں نے غالب کو جس طرح فلسفی بنا کر پیش کرنے کی کوشش کی اس پر بڑے اعتراضات بھی ہوئے۔ اس سلسلے میں سید صباح الدین صاحب رقم طراز ہیں:

> ''اس بات کو تسلیم کرنے میں کسی کو عذر نہیں کہ غالب کے کلام کا حسن بیک وقت دو حرارتوں کا جامع ہے۔ ایک حرارت دل دوسرے حرارت اندیشہ۔ لیکن کوئی یہ کہے کہ غالب نے غزل گوئی کی راہ سے ہٹ کر اپنے کلام کو فلسفیانہ نظر و فکر اور شاعرانہ سوز و ساز کا رنگ دیا۔ اور یہ کہہ کر وہ یہ دعویٰ کرے کہ غالب سے پہلے کسی شاعر کے یہاں ان کی غزلوں کی فلسفیانہ نظر و فکر نہیں تو یہیں سے اختلاف پیدا ہو جاتا ہے اور وہ یہ بھی پرزور طریقہ سے کہے کہ غالب نے جو فلسفیانہ خیالات پیش کئے ہیں وہ ان کی اپنی نظر و فکر کے نتائج ہیں تو یہ بھی محل نظر ہے لیکن ان میں کسی کو اختلاف کرنے کی گنجائش نہیں کہ ان کے مخصوص طرز ادا کی وجہ سے پرانے فلسفیانہ خیالات کو نئے انداز میں پیش کیا۔ مگر اس کے یہ معنیٰ نہیں کہ ان کے مخصوص طرز ادا کی وجہ سے پرانے فلسفیانہ خیالات کو ان کے اوریجنل خیالات سمجھ کر ان سے منسوب کر دیا جائے اور ان کو فلسفی تسلیم کرایا جائے'' [۱]

ڈاکٹر یوسف حسین اور غالب : یوسف صاحب کی معروف و مقبول کتاب اردو غزل ۱۹۵۲ء میں شائع ہوئی۔ اس میں یوسف صاحب نے غالب کے کلام پر ایک پرمغز اور عمدہ تبصرہ کیا ہے جس سے اس بات کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ غالب کے کلام میں کسی طرح کی کمیاں دیکھنے کے لئے تیار نہیں۔ یوسف صاحب کے تنقید کی خوبی یہ بھی ہے کہ وہ اپنی نظر و فکر سے ناظرین کو مرعوب نہیں کرتے بلکہ ان کو غالب کے کلام میں جو

۱۔ غالب مدح و قدح کی روشنی میں، جلد دوم، ص ۱۷۰

خوبیاں واقعی نظر آتی ہیں ان کو انشا پردازانہ انداز میں نہیں بلکہ صاف اور واضح انداز میں بیان کر دیا ہے۔

ڈاکٹر یوسف حسین نے ''غالب اور آہنگ غالب'' کے نام سے غالب پر ایک مستقل کتاب بھی لکھی ہے جو ۱۹۶۸ء میں غالب اکیڈمی دہلی سے شائع ہوئی۔ اردو غزل میں انھوں نے جو بات مختصراً لکھی ہے اسی بات کو اس میں پھیلا کر قلم بند کیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے غالب کے شاعرانہ کمال کی جو خصوصیات بیان کی ہیں، سید صاحب نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے اپنے خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے۔

> ''ڈاکٹر صاحب نے غالب کے کلام کی جو یہ خصوصیات بتائی ہیں اس سے ان کی کاوش کاہش، رچے ہوئے ادبی ذوق کا اندازہ ہوتا ہے اور یہ تبصرے ایسے ہیں جن سے اختلاف کرنے کے بجائے لطف لیا جاسکتا ہے۔ کہیں کہیں اختلاف تو ہوسکتا ہے کیونکہ خود غالب کی شاعرانہ اضداد کا مجموعہ ہے مگر ڈاکٹر صاحب کا جو اپروچ ہے اس کی روشنی میں غالب کے کلام کو سمجھا جائے تو اردو کی تنقید نگاری بے راہ روی بلکہ قلمی تہمتنی سے بڑی حد تک محفوظ ہو جائے۔''[۱]

اثر لکھنوی اور غالب : جناب جعفر علی خاں اثر لکھنوی نے اپنی کتاب مطالعہ غالب ۱۹۵۳ء میں شائع کی تو اس میں بھی میر و غالب کا موازنہ جابجا کیا ہے۔ ایک جگہ لکھتے ہیں کہ میر رومانی شاعر تھا، غالب کلاسسٹ۔ میر کی شاعری میں شخصیت جھلکتی ہے، غالب کی شاعری کردار کی آئینہ دار ہے۔ غالب کی شاعری وہ ہے جس کو ڈرائڈن Poetry or wit Writing imaginative سے تعبیر کرتا ہے جس میں جذبات کا تناؤ نہیں بلکہ غور و فکر سے وجود میں آتی ہے۔ خود غالب کو اس کا اعتراف ہے۔ شاید اثر صاحب ہی کے میر و غالب کے موازنہ کو سامنے رکھ کر اکرام نے لکھا ہے کہ اگر پاکیزگی زبان اور سوز و گداز کو کمال شاعری سمجھا جائے تو میر کو غالب پر ضرور فوقیت ہے..... میر کے کلام میں ایک بڑا عیب یہ ہے

۱۔ غالب مدح و قدح کی روشنی میں، جلد دوم، ص ۱۸۶

کہ یہ انتہائی ناہموار ہے.....غالب بڑی حد تک اس نقص سے بری ہے۔سوائے ان اشعار کے جو اس نے بیس تیس برس کی عمر تک لکھے۔مطالعہ غالب سے متعلق سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب لکھتے ہیں:

''کتاب کے آخر میں غالب کے اشعار کا انتخاب دیا ہے جو ان کو خاص طور پر پسند ہوئے۔اس سے وہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ وہ معتقد میر سہی لیکن غالب کی عظمت سے بے بہرہ بھی نہیں۔وہ اس داد کے مستحق ضرور ہیں کہ وہ غالب کی عظمت اپنی نظری وفکری تنقید کا ایک مخصوص معیار قائم کر کے نہیں دکھاتے ہیں بلکہ غالب کی نظر وفکر کی شرح ان ہی کے اشعار سے کرتے ہیں جن سے نہ صرف غالب بلکہ ان کی تنقید نگاری کے ماہرانہ فن کی عظمت غیر شعوری طور پر محسوس ہوتی ہے۔لیکن اثر صاحب کہتے ہیں کہ وہ غالب کی منقصت نہیں چاہتے مگر میر کے مقابلہ میں غالب کی مذمت کے پہلو جابجا ان کے مضامین سے ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔جس کے بعد یہ کہا جاسکتا ہے کہ وہ غالب کی شاعرانہ عظمت کے قائل تو ہیں مگر زیادہ نہیں خواہ وہ اپنے اندرونی خیالات پر کتنا ہی خوشنما پردہ ڈالیں۔'' [۱]

پروفیسر کلیم الدین اور غالب: پروفیسر کلیم الدین اپنی کتاب ''اردو شاعری پر ایک نظر'' میں غالب اور سودا کا موازنہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ غالب وسودا کے دماغ میں تخیل میں ہم رنگی ہے۔غالب نے حسن الفاظ تو سودا سے نہیں سیکھا لیکن اس کے تخیل اور خیالات کی بلندی کی اتباع ضرور کی۔کلیم الدین غالب اور سودا کے موازنہ کے بعد غالب کے کلام کی خوبیاں یہ لکھ کر بیان کرتے ہیں کہ ان کا مطمح نظر تنگ ومحدود نہ تھا۔اس لئے وہ مروجہ مضامین غزل پر قناعت نہیں کرتے۔اکثر اعلیٰ فلسفیانہ خیالات جامۂ شاعری سے آراستہ کرنا چاہتے ہیں۔کلیم الدین احمد غالب کی خوبیوں کے ساتھ ان کی خامیاں بھی بیان کرتے ہیں۔وہ لکھتے

۱۔ غالب مدح وقدح کی روشنی میں، جلد دوم، ص ۱۹۳۔۱۹۴

ہیں کہ غالب میں چند مخصوص نقائص بھی ہیں۔ ایک تو ان کے کلام کی مخصوص ناہمواری، میر درد کی طرح ان کا کوئی خاص انداز بیان نہیں، کلیم الدین صاحب کی ان تنقیدوں کے مدنظر صباح الدین صاحب لکھتے ہیں:

''کلیم الدین صاحب کی اور ناہموار تنقیدوں کے مقابلہ میں غالب پر مذکورہ بالا تنقیدیں نسبتاً ہموار ہیں۔ انھوں نے اب تک جتنی تنقیدیں لکھی ہیں ان کی ناہمواری کو دیکھ کر دل و دماغ اکثر منغض ہو جاتے ہیں، اور پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ ان کی فریاد کی کون سی لے ہے۔ اور ان کا نالہ کس لے کا پابند ہے۔ انھوں نے اردو غزل، اردو تنقید نگاری اور داستان گوئی، پھر حالی، شبلی، آزاد اور دوسرے ادیبوں اور شاعروں پر جو تنقیدیں لکھی ہیں ان میں ان کو یہ لذت ملی ہے کہ وہ اپنے قلم کے ناوک سے زمانہ کے کسی صید کو نہ چھوڑیں اور شعر و ادب کے ہر مرغ قبلہ نما کو اس کے آشیانے سے ضرور تڑپائیں۔ سرور صاحب پر ان کا اعتراض ہے کہ وہ پڑھنے والے کو تھوڑ دیر کے لئے چونکا دیتے ہیں۔ یہی اعتراض تو ان پر بھی ہوتا ہے خود سرور صاحب نے ان کے متعلق صحیح لکھا ہے کہ کلیم الدین احمد نے بت شکنی کا فرض ادا کیا ہے۔ اگرچہ ان کی تیشہ زنی نے ایک قصر کو کھنڈر کر دیا ہے۔'' [۱]

احوال غالب مرتب مختار الدین احمد آرزو: پروفیسر مختار الدین احمد صاحب (مسلم یونیورسٹی علی گڑھ) بھی غالب کے بڑے پرستاروں میں ہیں۔ انھوں نے ۱۹۴۹ء میں علی گڑھ اردو میگزین کا ایک غالب نمبر نکالا۔ اس کے مضامین عام طور پر پسند کئے گئے۔ اس لئے انھوں نے اس میں کچھ اور مقالات کا اضافہ کر کے کتاب کی صورت میں ''احوال غالب'' کے نام سے مرتب کر دیا ہے جس کو انجمن ترقی اردو (ہند) نے ۱۹۵۳ء میں شائع کیا۔ اس میں مختلف عنوانات سے مفید مضامین ہیں لیکن ان میں سب سے زیادہ دلچسپ

۱۔ غالب مدح و قدح کی روشنی میں، جلد دوم، ص ۱۹۸

مضمون ''سر غالب در حدیث دیگراں'' ہے جس کو مختار الدین احمد صاحب نے مرتب کیا ہے۔

خلیفہ عبدالحکیم اور غالب: خلیفہ عبدالحکیم نے اپنی کتاب ''افکار غالب'' میں غالب کے ہر شعر کی شرح کے بجائے ان کی اردو اور فارسی کے منتخب حکیمانہ اشعار کی شرح کی ہے۔ وہ غالب کے ہر شعر کی شرح کے قائل نہیں ہیں اور نہ ہی ان کے ہر شعر کو اچھا سمجھتے ہیں۔ اسی لئے کہتے ہیں کہ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے غالب کے کلام ریختہ کو وحی والہام قرار دیا لیکن اس کلام میں رحمانی وحی کے ساتھ شیطانی وحی کو بھی اچھا خاصا دخل ہے۔ خلیفہ عبدالحکیم کی اس کتاب کے متعلق سید صاحب رقم طراز ہیں:

''خلیفہ عبدالحکیم نے اس کتاب میں غالب کے اشعار کی شرح بھی لکھی ہے لیکن غالب کے ہر شعر کی شرح نہیں کی ہے کیونکہ وہ غالب کے ان پرستاروں میں نہیں ہیں جو ان کے ہر شعر پر جھوم اٹھیں اور اس میں کوئی نہ کوئی نکتہ ضرور پیدا کریں۔ وہ غالب کے بعض اشعار کو لغو مبتذل، اور بازاری بھی سمجھتے ہیں اور انھوں نے غالب کے اردو فارسی کے منتخب اشعار کی شرح لکھی ہے۔ لیکن عام شارحوں کی طرح صرف معانی و مطالب لکھنے میں اکتفا نہیں کیا بلکہ ان کی پوری بحث کی ہے جس میں جا بجا مغرب کے اساطین حکما کے اقوال رومی اور اقبال کے اشعار بھی نقل کئے ہیں۔ وہ خود بھی فلسفی تھے اس لئے ان کی شرح فلسفیانہ اور حکیمانہ انداز میں لکھی ہے جس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ وہ غالب کو فلسفی سمجھتے تھے۔ بلکہ غالب نے اپنے زمانہ کے فلسفیانہ اور حکیمانہ خیالات کی جس طرح تعبیر کی تھی اس کی تشریح انھوں نے فاضلانہ انداز میں کر دی ہے۔

خواجہ احمد فاروقی اور غالب: اس سے متعلق سید صباح الدین صاحب لکھتے ہیں:

> ''خواجہ صاحب کے مضامین میں غالب شناسی اور غالب شکنی دونوں کے اجزاء ہیں۔ انھوں نے ''غالب کی عظمت'' کے عنوان سے ایک مقالہ آل انڈیا ریڈیو دہلی میں پڑھا تھا جو ۱۹۵۳ء میں ان کے مضامین کا مجموعہ کلاسیکی ادب میں بھی شائع ہوا۔'' [۱]

۱۔ غالب مدح وقدح کی روشنی میں، جلد دوم، ص ۲۰۸

اختر اور ینوی اور غالب: پروفیسر اختر اور ینوی کے مقالات کا ایک مجموعہ ''قدر و نظر'' کے نام سے شائع ہوا جس میں ان کا ایک مضمون ''اردو شاعری اور غالب ایک مطالعہ'' شامل ہے۔ انھوں نے اس مقالہ میں غالب پر اپنے عہد کے ماحول کے اثرات سے متعلق بہت مفید باتوں کے ساتھ ایسے خیالات بھی ظاہر کئے ہیں جن کی جزئیات سے سید صاحب کو اتفاق نہیں۔ سید صاحب اختر اور ینوی کے اس مضمون کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''اختر اور ینوی صاحب اپنے مختصر مضمون میں غالب کے ذہن کا تجزیہ کر کے ایک رائے پر پہنچتے ہیں لیکن اس رائے کو غالب کے جس شعر سے مستحکم کرنا چاہتے ہیں وہ کہیں کہیں برمحل استعمال نہیں ہوا ہے۔ مثلاً وہ یہ کہتے ہیں کہ غالب زندگی سے مجموعی طور پر ناخوش ہے۔ اصل یہ ہے کہ وہ جس طرح کی زندگی کو سمجھنا چاہتا تھا سمجھ نہ سکا۔ اس لئے وہ بے زار اور بے یقین ہے لیکن اس بیزاری اور بے یقینی کو ظاہر کرنے کے لئے جو حسب ذیل تین اشعار پیش کرتے ہیں وہ انتخاب کے لحاظ سے بالکل صحیح نہیں

نہ تھا کچھ تو خدا تھا کچھ نہ ہوتا تو خدا ہوتا ڈبویا مجھ کو ہونے نے نہ ہوتا میں تو کیا ہوتا

ہستی کے مت فریب میں جائیو اسد عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن دل کو بہلانے کا غالب یہ خیال اچھا ہے

ایک اور موقع پر اختر صاحب لکھتے ہیں ''غالب اپنے زمانے سے آگے دیکھتا ہے۔ اس رائے کی تائید میں اختر صاحب نے جو اشعار نقل کئے ہیں وہ بھی سید صاحب کے بیان کے مطابق عاجلانہ طور پر نقل کئے ہیں۔ ان کو دیوان غالب میں بہت سے اشعار مل سکتے تھے۔ اس سلسلے میں درج ذیل شعر منقول ہے

کوہکن گرسنہ مزدور طرب گاہ رقیب بے ستون آئینہ خوب گراں شیریں

کس نے دیکھا نفس اہل وفا آتش خیز کس نے پایا اثر نالۂ دل ہائے حزیں

سید صاحب کے نزدیک ان اشعار کو غالب نے اپنی بیہودہ گوئی اور ہرزہ سرائی میں شمار کیا ہے..... اس میں غالب مستقبل کی کون سی چیزوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں وہ بظاہر سمجھ میں نہیں آتا

اور نہ کلام غالب کے کسی شارح کو اس میں مستقبل کارفرما ہوتا ہوا دکھائی دیا ہے۔[۱]

نقد غالب : اس کتاب میں سید احتشام حسین، ڈاکٹر سید عبداللہ، حمید احمد خاں، آل احمد سرور، عبادت بریلوی، وحید قریشی، ممتاز حسین، اختر اورینوی، اسلوب احمد انصاری، خلیل الرحمٰن اعظمی، شیخ محمد اکرام، رشید احمد صدیقی، آفتاب احمد اور قاضی عبدالودود صاحبان کے مضامین کا ذکر ہے۔ یہ غالب کے متعلق موجودہ تحقیق وتنقید کا معیار متعین کرنے میں مدد دے سکتے ہیں۔

رشید احمد صدیقی اور غالب : رشید احمد صدیقی ایک ادیب طناز بھی ہیں اور مزاح نگار بھی۔ اس لئے ادبی تنقیدوں میں بھی کبھی کبھی طنز ومزاح سے کام لیتے ہیں۔ سید صاحب کو رشید صاحب سے کافی عقیدت تھی۔ رشید صاحب کی تحریروں کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہوئے رشید صاحب کے مضمون کا یہ اقتباس نقل کیا ہے۔

> ''غزل میں زندگی اور زمانے کے واقعات و حادثات براہ راست دخل نہیں پاتے جیسا کہ نظموں، تاریخ کی کتابوں یا اخبارات میں راہ پاتے رہتے ہیں۔ یہ بڑی دیر اور بڑی دور سے خاص رنگ وآہنگ میں غزل میں جلوہ گر ہوئے یہی سبب ہے کہ اردو میں غزل کا ایک خاص مقام ہے۔''[۲]

سید صاحب کا ماننا ہے کہ اب غزل کے اس مقام کو نہ سمجھ کر اس میں سیاسی، اقتصادی، عمرانی اور سماجی مسائل کو تلاش کرنا تنقید اور خصوصاً کلام غالب کی تنقید کی یقیناً بڑی محرومی ہے۔ رشید صاحب کے یہ جملے بہت مقبول ہوئے ہیں کہ

> ''مجھ سے اگر پوچھا جائے کہ ہندوستان کو مغلیہ سلطنت نے کیا دیا تو میں بے تکلف یہ تین نام لوں گا، غالب، اردو اور تاج محل۔''[۳]

رشید صاحب کے اس مشہور ڈائیلاگ پر تبصرہ کرتے ہوئے سید صباح الدین عبدالرحمٰن لکھتے ہیں:

۱۔ غالب مدح وقدح کی روشنی میں، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، جلد دوم، ص ۲۱۴

۱۔ ایضاً، ص ۲۱۷

۳۔ ایضاً، ص ۲۱۷

''آخری فقرہ لکھنے میں ترتیب اس طرح ہوتی تاج محل، اردو اور غالب تو ترتیب زمانی کے لحاظ سے زیادہ مناسب ہوتی اگر اس میں تھوڑی ترمیم کردی جائے۔ مغلیہ سلطنت نے اپنے عروج کے دور میں تاج محل دیا تو مرتے مرتے بھی اردو اور غالب دے گئی۔'' [۱]

اس طرح سید صاحب نے اس جملہ کی خوبصورت اور مناسب ترمیم بھی کردی ہے اور خالص ادب کے موضوع میں تاریخ کا عنصر شامل کر کے دلکش امتزاج پیدا کرنے کی کوشش کی ہے تا کہ ایک ہی جملہ سے قاری موضوعات کا لطف اٹھائے اور یہ ترمیم سید صاحب کے ادبی شعور کے ساتھ ساتھ ان کی تاریخ نگاری کی غماز بھی ہے۔ اس ترمیم کے بعد اس جملہ میں مغلیہ سلطنت کے کمال اور زوال دونوں کے کارنامے سامنے آجاتے ہیں۔

سید صاحب کے تجزیہ کے مطابق رشید صاحب نے اس مضمون میں اپنی کچھ ایسی رائیں بھی ظاہر کی ہیں جس سے ان کے کیف ونشاط سے بھری ہوئی تحریروں کے بعض مداحوں کو اتفاق کرنے میں تامل ہوگا۔ مثلاً ایک جگہ غالب کی اولیت سے متعلق لکھتے ہیں:

''اردو شاعری میں غالب پہلے شخص ہیں جنھوں نے اپنے طنز میں خدا کو مخاطب کیا ہے۔'' [۲]

سید صاحب اس پر اختلاف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''معلوم نہیں رشید صاحب نے یہ کیسے لکھ دیا۔ اردو شاعری میں غالب سے پہلے کے شعرا کے یہاں حرم، کعبہ، زاہد، واعظ، شیخ اور ناصح پر طنزیہ اشعار بہت ملیں گے ان پر طنز تو خدا ہی پر طنز ہے۔'' [۳]

۱۔ غالب مدح وقدح کی روشنی میں، جلد دوم، ص ۲۱۷

۲۔ ایضاً، ص ۲۱۹

۳۔ ایضاً، ص ۲۱۹

ایک دوسری جگہ رشید صاحب فرماتے ہیں:

''یہ غالب ہی کا کارنامہ تھا جس نے غزل کو ہمارا کلچر اور ہمارے کلچر کو غزل بنادیا۔'' [۱]

سید صاحب کے مطابق رشید صاحب نے جو کچھ لکھا ہے وہ غور وفکر کے بعد ہی لکھا ہوگا۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ غالب نے غزل کو ہمارا کون سا کلچر دیا ہے۔

رشید صاحب اپنے اسی مضمون میں لکھتے ہیں:

''غالب طنز وظرافت کا وار معمولی یا روایتی ادارہ یا شخصیتوں پر کرنے کے اتنے شائق نہ تھے وہ اس کو اپنا ہدف نہیں بناتے جو خود زندگی اور زمانہ کا ہدف ہوتا بلکہ براہ راست اور بڑے اعتماد سے اس کو مخاطب کرتے تھے جس کا ہدف خود زندگی اور زمانہ ہوتا۔ یعنی خالق ارض وسما۔'' [۲]

سید صاحب نے اس سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کیا خالق ارض وسما کو طنز وظرافت کا ہدف بنانا ہمارا کلچر ہے۔ [۳]

اس کے علاوہ نقد غالب میں خلیل الرحمٰن اعظمی صاحب کا بھی ایک مضمون ''غالب اور عصر جدید'' کے عنوان سے ہے جس میں وہ لکھتے ہیں کہ ان کے (یعنی غالب) یہاں تلخی، شکست خوردگی، طنز، تشکیک، تنہائی کا احساس، انانیت اور مردم بیزاری پیدا ہوگئی ہے۔ سماج کے مروجہ قوانین اور رسوم سے وہ بے زار تھے ہی ناکامیوں اور ناامیدیوں نے انھیں خدا کے متعلق بھی شبہے میں ڈال دیا.....اور خدا ہی کیا وہ خدا کی بنائی ہوئی جنت، اس کے فرشتوں، اس کے دیر وحرم، اور اس کی پیدا کی ہوئی دنیا کی ہر شئے سے بیزار

۱۔ غالب مدح وقدح کی روشنی میں، جلد دوم، ص ۲۱۹

۲۔ ایضاً، ص ۲۲۰

۳۔ ایضاً، ص ۲۲۰

ہوئے تھے۔ان سے لڑتے تھے،ان پر استہزا کرتے تھے۔

سید صاحب اس پر اختلاف کرتے ہیں کہ کیا تلخی، شکست خوردگی، طنز، تشکیک، انانیت، مردم بیزاری، خدا اور خدا کی بنائی ہوئی تمام چیزوں پر استہزا کرنا ہی ہمارا کلچر ہے۔

نقد غالب میں عبادت بریلوی صاحب کا بھی ایک مقالہ ''غالب کی عشقیہ شاعری'' ہے جس کا وہ بہت ہی گہرا اور مفصل تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ ''غالب میں حسن پرستی کا احساس بڑا شدید تھا.....وہ حسینوں کو صرف دیکھنے کے قائل نہیں تھے بلکہ وہ ان کی محفلوں میں باریاب ہونے کی خواہش رکھتے تھے.....ان کے وصل کو وہ زندگی کی معراج سمجھتے تھے.....ان کے اشعار نہ صرف یہ بتاتے ہیں کہ انھوں نے عشق کیا تھا بلکہ ان سے اس بات کا بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ رند شاہد باز تھے.....ان کی یہ شاہد بازی ان کا یہ جنون عشق یہ رہین عشق ہونا اور شعلۂ عشق کو اپنا سروسامان سمجھنا ان تمام چیزوں کی بنیادیں ان کی لذت پرستی پر قائم ہیں.....ان کی شاعری کا بیشتر حصہ اسی طرح کے خارجی حالات کے بیان اور داخلی کیفیات کی ترجمانی پر مشتمل ہے۔''

سید صاحب کے مطابق غالب نے اپنی شاعری میں یہ سب کچھ بیان کیا ہے کیا یہی ہمارا کلچر ہے۔

ڈاکٹر سید عبداللہ اور غالب : اس سے متعلق سید صباح الدین صاحب لکھتے ہیں کہ ''ڈاکٹر سید عبداللہ کے مقالہ ''غالب معتقد میر'' میں بڑی محنت اور دیدہ وری نظر آتی ہے۔انھوں نے جو کچھ بھی لکھا ہے اس میں بڑی سنجیدگی اور متانت بھی ہے۔محض الفاظ سے کھیل کر اپنی بات منوانے کے بجائے ایک گہرے تجزیہ سے اپنے ناظرین کو متاثر کرنے کی کوشش کی ہے۔اس سے انھوں نے میر اور غالب کا موازنہ بھی کیا ہے۔ انھوں نے اپنے مضمون میں غالب کی غزلوں کی طرف اشارہ بھی کیا ہے جو میر کے رنگ میں ہے۔آخر میں لکھتے ہیں کہ غالب میر کے محض رسمی معتقد نہ تھے بلکہ انھیں اپنی ذہنی ارتقا کے سفر میں فیض ہدایت کا سرچشمہ قرار دیتے تھے۔ان کا یہ شعر اسی حقیقت کا اعلان کرتا ہے۔

ریختے کے تمہیں استاد نہیں ہو غالب　　کہتے ہیں کہ اگلے زمانے میں کوئی میر بھی تھا

نقد غالب میں آفتاب احمد صاحب کا ایک مضمون ''اردو شاعری میں غالب کی اہمیت'' کے عنوان سے ہے۔ جس میں انھوں نے غالب کو سب سے زندہ شاعر قرار دیا ہے۔ **اسلوب احمد انصاری اور غالب :** ''غالب کی شاعری کے چند بنیادی عناصر'' کے عنوان سے اسلوب احمد انصاری کا ایک مضمون ''نقد غالب'' میں شائع ہوا۔ سید صاحب اس مضمون سے متعلق لکھتے ہیں کہ فاضل مضمون نگار نے غالب کو اردو شاعری کا ایک نادر مظہر بتا کر ان کی انفرادیت اور عظمت کے متضاد پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ انھوں نے اس مضمون میں غالب کی شاعری کا جس طرح تجزیہ کیا ہے، سید صاحب نے ان کو علاحدہ علاحدہ نمبروار پیش کیا ہے۔

نقد غالب میں آفتاب احمد صاحب کا ایک مضمون ''اردو شاعری میں غالب کی اہمیت'' کے عنوان سے ہے۔ جس میں انھوں نے غالب کو سب سے زندہ شاعر قرار دیا ہے۔ **اسلوب احمد انصاری اور غالب :** ''غالب کی شاعری کے چند بنیادی عناصر'' کے عنوان سے اسلوب احمد انصاری کا ایک مضمون ''نقد غالب'' میں شائع ہوا۔ سید صاحب اس مضمون سے متعلق لکھتے ہیں کہ فاضل مضمون نگار نے غالب کو اردو شاعری کا ایک نادر مظہر بتا کر ان کی انفرادیت اور عظمت کے متضاد پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ انھوں نے اس مضمون میں غالب کی شاعری کا جس طرح تجزیہ کیا ہے، سید صاحب نے ان کو علاحدہ علاحدہ نمبروار پیش کیا ہے۔

خلیل الرحمٰن اعظمی اور غالب : خلیل الرحمٰن اعظمی کا ایک مضمون ''غالب اور عصر جدید'' کے عنوان سے ''نقد غالب'' میں شائع ہوا جس میں انھوں نے غالب کر بڑا گھاگھ شاعر قرار دیا ہے اور ان پر اپنی رائے کا اظہار کرتے وقت ان کی شاعری میں اندرونی کشمکش، تصادم، تلخی، شکست خوردگی، طنز، تشکیک، تنہائی کا احساس، انانیت، مردم بیزاری، ناکامی، ناامیدی، خدا کی بنائی ہر چیز پر استہزا پایا ہے۔ سید صاحب ان کی تنقید پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''خلیل الرحمٰن اعظمی صاحب کی قدآورانہ تنقیدوں میں تو قوت متخیلہ ہی کو زیادہ دخل ہے۔ شاید اس لئے کہ جس عمر میں انھوں نے یہ مضمون لکھا اس میں ان کا ذہن ایک ٹیڑھی لکیر تھا اور اپنی جوانی کے جوش میں تحریر کا گلال وعبیر اڑا کر اپنے ابلتے ہوئے خون سے اپنی تنقیدوں کے جیب ودامن کو گلنار بنانا چاہا۔ واضح ہے کہ یہ تمام الفاظ ان ہی کے ہیں جب ان میں عمر کی پختگی آتی تو غالب کی طرح وہ بھی قوت ممیّزہ

سے کام لے کر اپنی بہت سی رویوں کو نظری قرار دینے پر مجبور ہوئے۔'' ۱

قاضی عبدالودود اور غالب : اردو زبان کے زبردست محقق قاضی عبدالودود صاحب نے ''غالب بحیثیت محقق'' کے عنوان سے ایک اہم ترین مضمون مجموعہ ''نقد غالب'' میں لکھا ہے۔ ۲۲۷ صفحات پر مشتمل یہ مضمون نہیں بلکہ مستقل ایک کتاب ہے۔ اس مضمون میں غالب کی لغوی، تحقیقی، علمی اور ادبی لیاقت کا جائزہ لیا گیا ہے۔ قاضی صاحب نے اس مضمون میں دکھایا ہے کہ زردشتوں کے مذہبی عقائد کے متعلق غالب بڑی غلط فہمیوں میں مبتلا تھے۔ اور اس کا سبب دساتیر کی زردشتوں کی کتاب کو مقدس سمجھنا تھا۔ دساتیر کوئی پرانی کتاب نہیں لیکن اس کی قدامت کے قائل تھے۔ غالب کا دعویٰ تھا کہ برہان قاطع مہملات کا ایک مجموعہ ہے اور پھر غالب نے برہان قاطع کی تنقید میں جو اصولی باتیں لکھی ہیں ان میں گہرائی نہیں۔ قاضی صاحب نے مثالیں دے کر غالب کی سطحیت کو ظاہر کیا ہے۔ اس کے علاوہ غالب کو اپنی فارسی پر بڑا ناز تھا لیکن قاضی صاحب نے ایک سو مثالیں دے کر غالب کے اس ناز پر ضرب کاری لگانے کی کوشش کی ہے۔

سید صباح الدین صاحب قاضی عبدالودود صاحب کی غالب شکنی سے متعلق لکھتے ہیں:

> ''یگانہ چنگیزی، ڈاکٹر عبداللطیف اور آرگس کے بعد غالب شکنی کے سلسلہ میں قاضی عبدالودود صاحب کا یہ مضمون بڑا زبردست حملہ ہے۔ یگانہ نے تو مضحکہ خیز انداز اختیار کیا۔ ڈاکٹر عبداللطیف کی تحریروں میں جھلاہٹ تھی، آرگس کا مضمون محض تفریحی تھا لیکن قاضی عبدالودود صاحب کا مضمون بڑا فاضلانہ اور محققانہ ہے۔ انھوں نے جو کہا اس کے لئے بہت ہی ٹھوس علمی اور تحقیقی دلائل پیش کئے ہیں۔ لیکن اس کو کیا کیجئے کہ غالب کی مقبولیت کچھ ایسی ہے کہ بقول رشید احمد صدیقی صاحب کے کچھ ایسی باتیں بھی معلوم ہوں گی جن سے غالب کی شخصیت جہاں تہاں سے دھندلی اور داغ دار نظر آئے گی۔ لیکن ان کے باوجود غالب غالب ہی رہے۔ یعنی عہد بھی عہد آفریں بھی، غالب کی تمام کمزوریاں صحیح مان لی جائیں جب بھی ان کی اہمیت وعظمت میں فرق نہیں آتا۔'' ۲

۱۔ غالب مدح وقدح کی روشنی میں، جلد دوم، ص ۲۳۵

۲۔ ایضاً، ص ۲۳۸

پروفیسر سلیم چشتی اور غالب : پروفیسر سلیم چشتی کی ''شرح دیوان غالب'' ۹۵۲ صفحات پر مشتمل ضخیم کتاب ہے۔ شارح نے اس شرح کی جو خصوصیات بیان کی ہیں سید صاحب نے اس کو ترتیب وار اس کتاب میں ذکر کیا ہے۔ پروفیسر صاحب نے اس میں کافی مبسوط مقدمہ لکھا ہے۔ جو اس سے پہلے کسی شارح نے نہیں لکھا۔ لیکن غالب پر پہلے جو کچھ لکھا گیا ہے اسی کا نچوڑ انھوں نے اس میں پیش کر دیا ہے جو اس لحاظ سے ضرور مفید ہے کہ اس سے غالب سے متعلق ساری باتیں ایک ساتھ نظروں کے سامنے آجاتی ہیں۔ اس کے مطالعہ سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ شارح نے غالب اور ان کے کلام کو بہت صحیح طور پر اور بڑی محنت اور مختلف زاویے سے سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ اور سمجھ کر ناظرین کو بھی صاف اور واضح انداز بیان میں اچھی طرح سمجھایا ہے۔ مدح وقدح میں توازن برقرار ہے۔

خورشید الاسلام صاحب اور غالب : ۱۹۶۰ء میں انجمن ترقی اردو ہند کی جانب سے خورشید الاسلام صاحب کی کتاب ''غالب'' شائع ہوئی۔ خورشید الاسلام صاحب نے اپنی کتاب میں ایک مستقل باب ''غالب کا اپنا کارنامہ'' رکھا ہے۔ اس باب میں انھوں نے یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ غالب کی شاعری یا محبت کن منزلوں سے گزری۔ اس کے دکھانے میں خود مصنف کا جو ذہنی پس منظر کام کر رہا تھا وہ بھی اسی طرح تجزیہ کرنے کے لائق ہے جس طرح کسی شاعر کی شاعری کا جائزہ لیتے وقت اس کی ذہنی سمت کا پہلے سے مطالعہ کیا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں تجزیہ سے متعلق سید صاحب لکھتے ہیں:

> ''اس تجزیہ سے متعلق صرف اتنا کہا جا سکتا ہے کہ مصنف اپنی ذہنی سمت کی بدولت پہلے نتیجہ پر پہنچ گئے ہیں اس کے بعد کبریٰ اور صغریٰ خوب ڈھونڈھ نکالا ہے۔ اگر ان ہی کے الفاظ میں اس ناقدانہ تجزیہ سے متعلق یہ کہا جائے کہ ان کی تنقیدی منطق ان کے چند مفروضوں سے چلتی ہے جن کی بنیاد ان کے مخصوص عقیدوں پر ہے۔ وہ لوگ جو ان عقیدوں کو نہیں مانتے ان کے لئے ان کی موشگافیاں ڈھکوسلے کی حقیقت رکھتی ہیں تو پتہ نہیں اس سے وہ اتفاق کریں گے کہ نہیں۔ مصنف نے کتاب کے آخر میں وہ الفاظ اور تلازمے بھی جمع کر دیئے ہیں جو غالب کی ابتدائی شاعری میں بار بار استعمال ہوئے ہیں۔ ان

کو جمع کرنے میں انھوں نے پوری محنت کی ہے۔'' [۱]

اس کے علاوہ اردو معلیٰ کا غالب نمبر پروفیسر سید حسن اور غالب، ڈاکٹر یان ماریک اور غالب، ڈاکٹر محمد اشرف اور غالب پر مختصراً تبصرہ کیا گیا ہے۔

نیاز فتح پوری اور غالب : ۱۹۶۱ء میں نیاز فتح پوری نے اپنے رسالہ نگار کا ایک غالب نمبر شائع کیا جو ۱۳۳ صفحات پر مشتمل ہے۔ ان مضامین کے عنوانات حسب ذیل ہیں۔

غالب کا طرز شاعری، غالب کی شاعرانہ خصوصیات، غالب ولی بادہ خوار، غالب کا نہانخانہ ازل، غالب کی مثنوی نگاری، غالب کا آہنگ ولہجہ، آخر میں غالب کے فارسی اور اردو کلام کے انتخابات پر مختصراً تجزیہ کیا گیا ہے۔

آئینہ غالب : دہلی کے رسالہ آج کل میں غالب پر کچھ نہ کچھ مضامین برابر شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ان میں سے کچھ منتخب مضامین کا ایک مجموعہ آئینہ غالب کے نام سے ۱۹۶۴ء میں شائع ہوا۔ اس میں مختلف قسم کے بائیس مضامین کا ذکر ہے جن میں سے کچھ خاص مضامین کا مختصراً جائزہ لیا ہے۔

ظ۔ انصاری اور غالب : ظ۔ انصاری کی ایک کتاب ''غالب شناسی'' کے نام سے ۱۹۶۵ء میں بمبئی سے شائع ہوئی۔ اس میں غالب کا مطالعہ، غالب کی زندگی اور فن کی رفتار اور غالب کے ورثہ کے عنوان سے غالب اور غالب کے کلام پر ان کے تاثرات ہیں۔

ڈاکٹر عبادت بریلوی کا شمار غالبیات کے ماہروں میں ہوتا ہے۔ ان کی ایک کتاب غالب کا فن کے نام سے ۱۹۶۸ء میں شائع ہوئی اور اسی کے بعد غالب کے صد سالہ جشن کے موقع پر ۱۹۶۹ء میں رائیٹرز اکیڈمی لاہور کی طرف سے ان کی ایک اور کتاب ''غالب اور مطالعہ غالب'' کے نام سے منظر عام پر آئی۔ ان دونوں کتابوں کا مطالعہ کرنے کے بعد اندازہ ہوتا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کو غالب پر اپنے خیالات کے اظہار کرنے پر ایسی قدرت ہے کہ وہ ایک ہی بات کو طرح طرح سے پیش کر سکتے ہیں۔ سید صباح الدین صاحب اس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

> ''ڈاکٹر صاحب کی کتاب غالب کا فن پڑھنے سے بظاہر اندازہ ہوتا ہے کہ غالب سے متعلق جو کچھ وہ لکھ سکتے تھے اس میں لکھ گئے لیکن ان کا قلم غالب اور

۱۔ غالب مدح وقدح کی روشنی میں، جلد دوم، ص ۲۵۶

مطالعہ غالب میں بھی رواں دواں ہوا ہے۔ اور ان کی تحریر کا زور اس کتاب کے چار سو پچاس صفحہ پر جا کر ختم ہوا ہے۔ اس میں غالب کی زندگی اور ان کی شاعری دونوں پر علیحدہ علیحدہ ابواب اور مباحث ہیں۔ وہ غالب کی لکھی جانے والی سوانح عمریوں سے خواہ حالی کی ''یادگار غالب'' ہو یا مولانا غلام رسول مہر کی ''غالب'' یا شیخ محمد اکرام کی ''آثار غالب'' یا مالک رام کی ''ذکر غالب'' بہت زیادہ مطمئن نہیں کیونکہ ان کی رائے کے مطابق ان میں سے کسی ایک کو بھی غالب کی باقاعدہ سوانح عمری نہیں کہا جا سکتا۔'' [۱]

ڈاکٹر صاحب کے ان خیالات پر سید صاحب نے اپنی ناقدانہ نگاہ ڈالتے ہوئے تحریر کیا ہے:

''ڈاکٹر صاحب کی ان ساری باتوں سے ان کے پیش رو سوانح نگار غالباً اتفاق نہیں کریں گے۔ وہ یہی کہیں گے کہ جو کچھ دستیاب ہو سکا وہ سب کچھ قلم بند ہو چکا ہے۔ زیادہ ممکن نہیں لیکن ڈاکٹر صاحب جو کمی محسوس کرتے ہیں ان ہی سے توقع تھی کہ اپنی اس کتاب میں فراہم کر دیں گے لیکن اس سے وہ گریز کر گئے اور تعجب کی بات تو یہ ہے کہ انھوں نے اپنی کتاب باب ''غالب کے حالات زندگی اور شخصیت'' میں جو کچھ لکھا ہے اس کا مآخذ زیادہ تر حالی، اکرام، مہر اور مالک رام ہی کی کتابیں ہیں جن سے وہ زیادہ مطمئن نہیں۔'' [۲]

غالب کی صد سالہ یادگار سمینار : غالب کی مقبولیت کی انتہا اس وقت ہوئی جب ۱۹۶۹ء میں ان پر ایک بین الاقوامی سمینار ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں میں منعقد کیا گیا۔ جس میں اندرون ملک اور بیرون ملک سے غالب کے پرستاروں کو مدعو کر کے جمع کیا گیا۔ اس جشن کا خطبہ افتتاحیہ مشہور محقق قاضی عبدالودود نے پڑھا۔ سید صاحب اس سلسلے میں لکھتے ہیں کہ ان کے خطبے کا لب لباب یہ تھا کہ غالب کے یہاں باتیں خلاف حقیقت بھی ہوا کرتی ہیں ..... ان کے بیانات غلط فہمی پر مبنی ہوتے تھے۔ ان باتوں کو ثابت کرنے میں قاضی صاحب نے بکثرت مثالیں دی ہیں جو غالب شکنی کے لٹریچر میں مزید اضافہ ہے۔ قاضی

۱۔ غالب مدح وقدح کی روشنی میں، جلد دوم، ص ۲۸۵

۲۔ ایضاً، ص ۲۸۷

صاحب کی غالب شکن تحریروں کا پہلے بھی ذکر آیا ہے۔ غالب شناسی کے ساتھ غالب شکنی کی مہم بھی جاری رہی، لیکن غالب پر ہر قسم کے اعتراض کے باوجود غالب غالب ہی رہے..... وہ اقلیم سخن کے بادشاہ ہی سمجھے گئے اور ان باتوں کے باوجود ۱۵ر جنوری ۱۹۶۹ء میں ان کی صد سالہ تقریب منائی گئی..... ان کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے دنیا کے مختلف گوشوں سے اہل نظر جمع ہوئے۔ مقالات پڑھے گئے اسی سال اخباروں اور رسالوں کے خدا جانے کتنے خصوصی نمبر نکلے اور ان کی زندگی اور شاعری کی مختلف پہلوؤں پر نہ معلوم کتنی کتابیں بھی شائع کی گئیں۔ غالب شناسی کے سیلاب میں غالب شکنی ایسے بہہ گئی کہ غالب شکن تحریروں کی طرف کوئی توجہ نہیں کی گئی۔ اس صد سالہ سمینار میں غالب کی ذات اور شاعری سے متعلق جو مقالات پڑھے گئے ان کی کچھ جھلکیاں یہ ہیں۔

ایران کے نمائندہ نے اپنا ایک مقالہ ''نکتہ ای چند در بارۂ اشعار فارسی اسد اللہ خاں غالب'' میں غالب کی شاعری کو سبک ہندی قرار دیا ہے۔ پروفیسر یوسف حسین خاں نے غالب کے کلام میں حرکی تصورات، پروفیسر عبدالقادر سروری نے غالب کے اردو کلام کی شرحیں۔ پروفیسر نظیر احمد نے غالب اور محمد حسین تبریزی، ڈاکٹر مسعود حسین نے غالب کے اردو کلام کا صوتی آہنگ، پروفیسر احتشام حسین نے غالب کا شعور فن، ظ۔ انصاری نے غالب کی فارسی کے اہم نکتے، سید اختر حسن نے غالب کا فلسفہ خرد، جناب مالک رام نے غالب اور مقام انسانیت، پروفیسر آل احمد سرور نے غالب اور جدید ذہن کے عنوانات پر اپنے خیالات قلم بند کئے ہیں۔

دوسری جلد کے آخر میں سید صاحب نے تتمہ لکھا ہے جس میں پوری کتاب کے مباحث کی ایک مختصر بازگشت پیش کی گئی ہے۔ اس میں ادب وانشا کی دلکش شیرینی بھی ہے۔ صحت مندانہ اور ہوش مندانہ تنقید کا اعلیٰ معیار و مذاق بھی اور نکتہ رسی بھی نکتہ آفرینی بھی تتمہ کے جستہ جستہ ٹکڑے پیش کئے ہیں۔

غالب کی شخصیت اور شاعری سے متعلق سید صاحب لکھتے ہیں:

> ''آخر میں یہ کہنا کہ غالب کی شخصیت اور شاعری دونوں متنازع فیہ ہے مگر دونوں ہماری ادبی وراثت کی متاع عزیز ہیں جس کے کسی پہلو پر بحث کرتے وقت جوش بیان سے زیادہ ہوش، ذہن اور عقیدت کے غلو کے بجائے حقیقت

کے پہلو کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ غالب کی شخصیت اگر بہت دلآویز اور رعنا ہے
تو بعض حیثیتوں سے مجروح بھی رہی..... ان کی کمزوریاں اور خوبیاں
دونوں کا مطالعہ کیا جائے تو ان کی خوبیوں کا پلہ بھاری رہے گا۔'' [۱]

سید صاحب ان کی شاعری سے متعلق لکھتے ہیں کہ:

''وہ اس مدح کے مستحق نہیں جو سر سید احمد خاں نے ان کے لئے لکھی ہے اور نہ
وہ اس قدح کے سزاوار ہیں جو باطن، یگانہ، چنگیزی، ڈاکٹر عبداللطیف اور
آرگس وغیرہ نے لکھی ہے۔ یہ کہنا بھی صحیح نہیں کہ ہندوستان کی الہامی کتابیں دو
ہیں۔ مقدس وید اور دیوان غالب، ایسی ہی تعریف و تحسین سے چڑھ کر بعض
نقاد کہہ اٹھے کہ اس ربانی کلام میں شیطانی وحی کا اچھا خاصا دخل ہے۔ یہ سب
ہوش مندانہ اور صحت مندانہ تنقیدیں نہیں ہیں۔'' [۲]

غالب کی شاعری پر تنقیدی تبصرہ میں مدح و تحسین کے پھول بھی برسائے گئے ہیں اور تنقیص و تنقید کی چنگاریاں بھی بکھیری ہیں:

''اگر ان کی شاعری کے معائب پر نظر ڈالی جائے تو ان کی بعض غزلیں اغلاق،
اشکال، غرابت، تعقید اور نامانوس تراکیب سے بہت ہی بے کیف ہوگئی
ہیں..... مگر یہ سب معائب ایسے ہیں جو ان کی غزل گوئی کے محاسن کے
پھولوں کے انبار کے نیچے دب کر رہ جاتے ہیں۔'' [۳]

اس کے علاوہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے غالب کی قصیدہ نگاری، اردو مکتوب نگاری، فارسی

۱۔ غالب مدح و قدح کی روشنی میں، جلد دوم، ص ۲۹۶

۲۔ ایضاً، ص ۲۹۷

۳۔ ایضاً، ص ۲۹۸

شاعری، فارسی مثنوی پر خیالات کا اظہار کرتے ہوئے ان پر کی گئی تنقیدوں کے بارے میں رقم طراز ہیں:

''اب تک غالب پر جتنی تنقیدیں لکھی گئی ہیں ان میں بعض تو کھانڈ کے بنے ہوئے ان کھلونوں کی طرح ہیں جو دیوالی کے موقع پر بکا کرتے ہیں۔ بعض ایسی ہیں جو حقیقت سے زیادہ عقیدت پر مبنی ہیں۔ بعض ایسی ہیں جو مغربی نقادوں کے اصولوں کو سامنے رکھ کر لکھی گئی ہیں۔ جو اگر غالب کی زندگی میں ان کی نظر سے گزرتیں تو وہ ان سے ابا کرتے۔ بعض ایسی ہیں جن میں نقادوں نے تنقید نگاری کے آرٹ کے بجائے اپنی انشا پردازی کی نقش گری اور اپنی گرمی فکر کا فن دکھایا ہے۔ بعض ایسی ہیں کہ غالب کے دو چار اشعار کو سامنے رکھ کر ان کا کوئی خاص مسلک یا فلسفہ مرتب کر لیا گیا ہے۔ بعض ایسی ہیں جن سے ان کے طرح طرح کے نظریے قائم کر لئے گئے ہیں۔ گو ان کے اشعار ہی سے ان کے نظریوں کی تردید بھی آسانی سے ہو سکتی ہے۔

بعض تنقیدوں میں اعتدال پسندی اور میانہ روی ضروری ہے۔ مولانا حالی نے اپنی طبیعت کی سنجیدگی، نظر کی ژرف بینی، فکر کی گہرائی اور تنقید نگاری کی نکتہ پروری سے غالب کی شاعری کو سمجھنے اور سمجھانے میں جو اعتدال پسندی اور میانہ روی اختیار کی ہے وہی غالب کی شاعری کے تنقیدی لٹریچر کا راس المال ہے۔ ان کے بعد جو کچھ لکھا گیا اس میں کچھ تو واقعی مفید اور قابل مطالعہ ہیں مگر بہت کچھ یا تو تفریحی ہیں یا تنقید نگاری کی ذہنی مشق اور ورزش ہیں۔ غالب کے صد سالہ بین الاقوامی سمینار کے موقع پر ایک دل جلے نمائندہ نے کہا تھا کہ رتن ناتھ سرشار نے لکھنؤ کے نواب صاحب کے بٹیر کی جو مرقع آرائی کی ہے وہی اب غالب کی ہو رہی ہے۔ ہمارے آئندہ نقادوں کو یہ خیال رکھنا ضروری ہے کہ غالب ہمارے نوابوں، بانکوں کی مجلسوں کے محض ذریعہ تماشا و تفریح بن کر نہ رہ جائیں۔

غالب مدح و قدح کی روشنی میں سید صباح الدین صاحب کی از حد کوششوں کا نتیجہ ہے۔ یہ کتاب خالص ادبی تنقید کا بہترین نمونہ معلوم ہوتی ہے۔ لیکن جب غالب کی وفات، تعلیم، اساتذہ، تلامذہ، شاہی درباروں سے وابستگی، عادات و اطوار، سیرت و کردار، غالب کی حب الوطنی، جذبہ خیر شگالی، علمی فضائل و

شاعرانہ کمالات کی تفصیل نظروں کے سامنے سے گزرتی ہے تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہ کتاب تنقید نگارانہ تحقیق اور محققانہ تنقید نگاری کا شاہکار ہے۔اس کی تنقید نگاری کبھی تحقیق ہو جاتی ہے اور اس کی تحقیقی کاوش کبھی تنقید نگاری کے آرٹ میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

اس کتاب میں جہاں تک زبان و بیان کا تعلق ہے وہ کافی دیدہ زیب اور جاذب نظر ہے۔ساتھ ہی پوری کتاب زبان کی سنجیدگی، متانت، وزن اور وقار، خوبصورت الفاظ، حسین جملوں سے مزین ہے۔اس کتاب کے متعلق ڈاکٹر خورشید عالم اس طرح رقم طراز ہیں:

> ''اس تنقید نگارانہ تحقیق کے ذریعہ سے غالب کی جو سوانح عمری مرتب ہوگئی ہے وہ سوانح نگاری کے فن میں غیر معمولی اضافہ ہے۔اس میں غالب کے مداح و مخالف معاصرین اور عہد حاضر کے مداحوں اور نقادوں کے خیالات وتنقیدات کا محاکمہ کرتے ہوئے مولف نے جو عرق ریزی اور دیدہ ریزی دکھائی ہے اور جو اعتدال پسندی اور میانہ روی اختیار کی ہے وہ آج کل کے سہل نگار اور نرگسیت کے شکار نقادوں کے لئے پیام عبرت ونصیحت ہے۔اس اعلیٰ و معیاری تنقیدی کتاب میں غلطیاں اور خامیاں ضرور ہیں، مولف کی بعض باتیں محل نظر ہیں ان سے اختلاف ممکن ہے۔مگر وہ ایسی نہیں کہ اس سے کتاب کا تنقیدی پایہ گر جائے۔''[1]

سید صاحب نے اس کتاب میں غالب پر لکھے جانے والے لٹریچر پر اجمالی تبصرہ وتجزیہ کا مطالعہ کرنے سے نہ صرف سید صاحب کی تنقیدی بصیرت کا پتہ چلتا ہے بلکہ اس بات کی بھی وضاحت ہو جاتی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو سکا انھوں نے غالبیات کے ہر پہلو کا گہرائی سے مطالعہ کیا اور اس کی روح کو تلاش کرنے کی کوشش کی ہے۔غرض یہ کہ اس کتاب میں جن چیزوں سے سرسری طور پر بحث کی گئی ہے وہ بھی

۱۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن۔حیات اور کارنامے، ص ۳۰۲، خورشید عالم

خاصی جامع ہے۔

غالب سے متعلق مختلف موضوعات پر بہت سی طویل کتابوں کا نچوڑ جابجا نہایت اختصار کے ساتھ جمع کر دیا گیا ہے اور ساتھ ساتھ صفحات کے حوالے بھی قوسین میں مہیا کر دیے گئے ہیں۔ جو مولف کی عرق ریزی کا پتہ دیتی ہیں۔ بعض مضامین کے سلسلے میں غالب کے حوالے سے دیگر اساتذہ کے کلام کا ایک انتخاب جابجا پیش کیا گیا ہے جو متفرق دواوین کے بالاستیعاب مطالعے کے بغیر ممکن نہ تھا۔

سید صاحب کی ایک قابل ذکر رائے جس کا اظہار انھوں نے اس کتاب میں بار بار کیا ہے کہ غالب کی عظمت ان کے منتخب مطبوعہ کلام ہی پر قائم ہے ان کا غیر مطبوعہ کلام ڈھونڈھ ڈھانڈ کر شائع کرنا ان کے نزدیک ایک نامناسب رویہ ہے۔

مجموعی طور پر غالبیات کے سلسلے میں سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کی یہ علمی کاوش اردو زبان وادب میں ایک قابل قدر اضافے کی حیثیت، نوعیت اور اہمیت کی متحمل ہے۔ اس کتاب میں غالب کی ابتدائی زندگی سے لے کر ۱۹۶۹ء تک کے طویل وقفے تک غالب اور کلام غالب سے متعلق جو تحریریں اور تصنیفیں منظر عام پر آئی ہیں ان سب کو جمع کرنا خود اپنے آپ میں ایک اہم علمی کام کے برابر ہے۔ پھر ان سب پر تبصرہ کرنا اس طرح ان کا تنقیدی جائزہ لینا کہ غالب کے شعری اسلوب کے ساتھ ساتھ اس کے تنقید نگاروں کے تنقیدی اسالیب کے مختلف پہلو بھی سامنے آتے جائیں کوئی آسان کام نہیں تھا لیکن صباح الدین صاحب کی اس کوشش نے اس کی اہمیت وافادیت کو مزید نمایاں کر دیا ہے۔ ڈاکٹر خورشید رضوی اس سلسلے میں رقم طراز ہیں:

> ''پھر صباح الدین صاحب کی یہ کوشش (غالب مدح وقدح کی روشنی میں) تالیف محض بھی نہیں۔ انھوں نے غالب شناسی اور غالب شکنی کی منتشر دستاویزات کی بہم آوری اور تحقیق وترتیب ہی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ جابجا ذاتی محاکمہ شامل کر کے تنقیدوں پر تنقید اور تبصروں پر تبصرہ فرمایا ہے۔ اس تبصرہ و

محاکمہ سے اختلاف رائے تو ممکن ہے لیکن اس کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ بلکہ نگاہ غور سے دیکھیں تو یہ کتاب اختلاف رائے ہی کا احترام سکھاتی ہے۔ سید صاحب نے غالب کی مدح وقدح دونوں کو پہلو بہ پہلو جگہ دے کر بین السطور میں اس احترام کا سبق دیا ہے جو اختلاف علمی کی آب وہوا کو معتدل رکھنے کے لئے ضروری ہے اور اختلاف ذاتی سے بالاتر ہے۔'' ۱

سید صباح الدین کی اس تصانیف سے متعلق ڈاکٹر شہریار رقم طراز ہیں:

''غالب کی حمایت اور مخالفت کی ان تمام تحریروں کو یکجا کرنے کے لئے بڑی وسیع النظری اور افادیت ہمیشہ محسوس کی جائے گی۔ پھر غالب کے حامیوں اور مخالفوں کے خیالات اور تاثرات پر متانت وسنجیدگی کے ساتھ تنقید وتبصرہ کرنا اور بھی مشکل تھا۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن کی حیرت انگیز ناقدانہ معروضیت شعاری نے اس امر محال کو ایک کار سہل بنا دیا ہے۔ کمال تحریر یہ ہے کہ خود وہ نہ غالب کے مخالف نظر آتے ہیں اور نہ حامی دکھلائی دیتے ہیں۔ حسن ناقدانہ صبر و تحمل کی انھوں نے مثال پیش کی ہے اس سے تنقید نگاری کی صحت مند اور غیر جانبدار روایت کی توسیع وترقی بھی ہوئی ہے۔'' ۲

ڈاکٹر شباب الدین اس کتاب سے متعلق لکھتے ہیں:

''صباح الدین صاحب نے غالب سے متعلق اہم کتاب کا بڑی غائر نظروں سے مطالعہ کیا پھر ان کے خاص خاص نکات نکال کر ان پر اظہار خیال کرتے ہوئے انھوں نے قاری کو کتاب یا مقالہ کے بارے میں مکمل معلومات فراہم

۱۔ فکر ونظر پاکستان، صباح الدین عبدالرحمان نمبر، ص ۷۳

۲۔ صباح الدین عبدالرحمٰن حیات وخدمات، ڈاکٹر شہریار، ص ۱۹۹

کردی ہیں۔ اور جہاں جہاں انھوں نے ضروری سمجھا ہے مصنف کے اقتباسات بھی اپنی بات کی تائید وتوثیق میں پیش کرتے چلے گئے ہیں۔ اس کتاب سے ان کی حیثیت صرف ایک جامع کی نہیں بلکہ بعض بعض مقامات پر انھوں نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے مصنف سے اتفاق یا اختلاف کیا ہے جس کی وجہ سے اس کتاب میں تنقیدی عناصر کی ہلکی پھلکی جھلک بھی دکھائی دیتی ہے۔ ہزاروں بلکہ لاکھوں صفحات کا دیدہ ریزی سے پڑھنا، ان کا خلاصہ کرنا اور اس کو مرتب انداز سے پیش کرنا ہی کچھ کم نہ تھا۔ مگر انھوں نے اپنے خیالات کا اس میں اضافہ کر کے اس کتاب کو دوآتشہ بنادیا ہے۔ صرف اسی ایک کتاب کے مطالعے سے ایک عام قاری کو اس بات کا علم ہو جاتا ہے کہ غالب کی تحسین اور تنقیص میں کیسی کیسی تحریریں معرض وجود میں آچکی ہیں اور ان تحریروں کے مصنفین کون کون حضرات تھے اور ان کا تعلق کس عہد سے تھا۔ ان تمام چیزوں کو مدنظر رکھتے ہوئے قاری اس بات کا بخوبی اندازہ لگا سکتا ہے کہ غالب کی ستائش کس زمانے میں زیادہ ہوئی، اور اس کے اسباب کیا تھے؟ اس طرح وہ یہ بھی جان سکتا ہے کہ کن کن حضرات کے ذریعے ان کی شخصیت اور کارناموں پر تنقید کی چنگاریاں برسائی گئیں اور اس کے پیچھے کون کون سے عوامل کارفرما تھے۔''[1]

اس کے علاوہ سید صاحب نے اپنی تنقیدوں اور تبصروں کے دوران نقطۂ نظر کے فرق و امتیاز کو سامنے رکھا ہے اور بہت غور وفکر اور خوبصورتی و معروضیت کے ساتھ غالبیات کا تنقیدی جائزہ قلم بند کیا

۱۔ دارالمصنفین کی ادبی خدمات ۱۹۸۰ء تک، ڈاکٹر شباب الدین، ص ۱۴۰

ہے۔سید صاحب کی محنت و دیدہ ریزی قابل تحسین ہے جن کی وجہ سے اردو ادب میں ایک ایسی گراں قدر تصنیف ہاتھ آئی ہے جس میں غالب مخالف اور غالب موافق تحریروں کا ایک طویل ذخیرہ موجود ہے۔ یہ کتاب غالبیات کے کتب خانے میں ایک گراں قدر اضافہ ہے۔

یہ کتاب اپنے حجم سے زیادہ مختلف النوع معلومات کا ذخیرہ ہے۔سید صاحب نے اس میں غالب کے حوالے سے ڈاکٹر بجنوری جیسے پر جوش حامی و مداح اور یگانہ اور ڈاکٹر عبداللطیف جیسے غالب شکن ناقدین کا تجزیہ کرتے ہوئے جہاں ان کی تنقید کی ہے وہاں غالبیات کے میدان میں ان کی عطائے خاص کا ذکر بھی ضروری سمجھا ہے۔

مولانا ضیاء الدین اصلاحی اس کتاب کے متعلق رقم طراز ہیں:

> ''غالب پر بہت کچھ لکھا گیا ہے۔مصنف نے اس سارے ذخیرے کو کھنگال ڈالا ہے اور اس پر اچھی بحث و تنقیح اور دلچسپ تبصرہ کیا ہے۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ غالب پر لکھی جانے والی تحریروں اور تنقیدوں میں خس و خاشاک کیا ہے اور آب دار موتی کہاں ہیں۔یہ کتاب غالب پر لکھی جانے والی اکثر کتابوں سے مستغنی کر دیتی ہے۔غالب فہمی کے لئے اس کا مطالعہ ناگزیر ہے۔''[1]

''غالب مدح و قدح کی روشنی میں'' کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ سید صاحب نے تحریر کی دلکشی اور رعنائی کو ہر حال میں برقرار رکھا ہے۔پوری کتاب میں اسلوب بیان کی خوبصورتی و شگفتگی اور انداز بیان کی شان نمایاں ہے۔یہ کتاب سید صاحب کی ادبی تحقیق و تجزیہ نگاری کا بہترین نمونہ اور غالبیات میں اہم اضافہ ہے۔

یہ غالبیات کے سلسلے میں اپنی نوعیت کی اولین اور اہم ترین کتاب ہے جو عام قارئین کے علاوہ غالبیات کے محققوں اور طالب علموں کو غالبیات کے دوسرے ماخذوں سے بے نیاز کر دیتی ہے۔

۱۔ نیا دور، لکھنؤ، مارچ۔ستمبر ۱۹۸۸ء، مضمون سید صباح الدین عبدالرحمٰن کی تصانیف ایک اجمالی جائزہ، مولانا ضیاء الدین اصلاحی، ص ۱۲۵

سید سلیمان ندوی کی تصانیف: ایک مطالعہ صباح الدین عبدالرحمٰن

علامہ شبلی نے تحقیقات علمی کے وسیع وعریض میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیئے اور اپنے بعد سید سلیمان ندوی جیسی مفکر، محقق اور فعال شخصیت کو زندہ یادگار کی شکل میں چھوڑا جو ان کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ یہی وجہ تھی کہ مولانا شبلیؒ کے ناتمام علمی کاموں کی تکمیل بھی سید صاحب کے حصے میں آئی اور انھوں نے مشفق استاد کے علمی وتحقیقی مشن کو نہ صرف باقی رکھا بلکہ اس کو تقاضائے وقت کے مطابق پروان چڑھانے میں تاعمر کوشاں رہے۔ انھوں نے اپنی تصنیفات میں محنت، جستجو، تلاش وتحقیق اور علمی بصیرت و دیدہ وری کا جو اعلیٰ معیار قائم کیا اس سے ان کی تروتازگی مدتوں باقی رہے گی اور محققین واہل علم برابر ان سے فیض یاب ہوتے رہیں گے۔

سید صاحب کی جامع صفات شخصیت پر کئی کتاب منظر عام پر آئی لیکن ابھی تک ان کی دینی، علمی اور محققانہ تصانیف کا تعارف نہیں ہوسکا تھا۔ صباح الدین صاحب نے زیر تبصرہ کتاب کے ذریعہ یہ کمی پوری کی، یہ کتاب ۱۹۸۸ء میں منظر عام پر آئی۔ اس کے صفحات کی تعداد ۳۴۸ ہے۔ اس کتاب کے سبب تالیف کے سلسلہ میں مولانا ضیاء الدین صاحب مرحوم دیباچہ میں رقمطراز ہیں:

> ''ان کی (سید صاحب) صد سالہ سالگرہ کی تقریبات اس برصغیر میں مختلف جگہ منائی گئیں۔ جن کا سلسلہ ہنوز جاری ہے۔ جناب صباح الدین عبدالرحمٰن مرحوم ان تقریبات میں مدعو ہوتے تھے اور اکثر میں انھوں نے بڑی دلچسپی اور سرگرمی سے حصہ بھی لیا۔ وہ سید صاحب کی وفات کے بعد ہی ان پر مضامین لکھتے رہے ہیں۔ ان تقریبات کی وجہ سے اس کا مزید موقع ملا۔ اسی سلسلہ میں انھیں ان کی تصنیفات پر مبسوط تبصرہ لکھنے کا خیال بھی ہوا۔ اس غرض سے انھوں نے سید صاحب کی تمام تصنیفات کا غور وخوض سے از سر نو مطالعہ کیا اور بڑی محنت اور جانفشانی اور عرق ریزی سے یہ کتاب لکھی جس سے سید صاحب کی

تصنیفات کی خصوصیات وخوبیاں پوری طرح نمایاں ہوگئی ہیں۔ ان کو حضرت سید صاحب کی ذات سے جو والہانہ عقیدت، شیفتگی اور گہری واقفیت تھی اس کی بنا پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس کام کو اس قدر شوق ومحنت اور اتنے بہتر طور پر کوئی اور نہیں کر سکتا تھا۔'' [۱]

صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کا علمی دنیا پر بہت بڑا احسان ہے کہ انھوں نے سید صاحب کی تصنیفات پر ایسا جامع تبصرہ پیش کیا جو قاری کو نہ صرف تمام مضامین کی مکمل سیر کرا دیتا ہے بلکہ ان کی جزئیات تک پوری تشریح وبساط کے ساتھ اس کے سامنے پیش کرتا ہے۔ سید صاحب کی علمی ودینی خدمات کا دائرہ بہت وسیع اور گوناگوں تھا۔ اس لئے ان کی تصنیفات پر تعارف وتبصرہ بھی طویل ہوگیا جس کی وجہ سے اس کتاب کو دو حصوں میں منقسم کرنا پڑا۔ یہ پہلا جز ہے جو مصنف کی زندگی میں کتابت وطباعت کے مراحل سے گزر چکا تھا۔ صرف دیباچہ باقی رہ گیا تھا کہ انھوں نے داعی اجل کو لبیک کہا۔ یہ کتاب ۱۹۸۸ء میں منظر عام پر آئی۔

اس کتاب کے شروع میں سید صاحب کے حالات وکمالات کا مختصر مگر جامع مرقع پیش کیا گیا ہے۔ اور ان کے حسب ذیل پندرہ تصانیف پر تعارف وتبصرہ کیا گیا ہے۔ صباح الدین صاحب کو سید صاحب سے کافی عقیدت تھی جس کا اظہار انھوں نے اس کتاب کی ابتداء میں کافی فراخ دلی کے ساتھ کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اس خاکسار سے اگر کوئی یہ پوچھے کہ تم نے اپنی زندگی میں اپنی آنکھوں سے کس انسان کو سب سے بہتر دیکھا اور کس کو سب سے اچھا ماہر قرآنیات، سب سے اچھا ماہر حدیث، سب سے اچھا متکلم، سب سے اچھا مورخ، سب سے

۱۔ سید سلیمان ندوی کی تصانیف ایک مطالعہ اوّل، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، دیباچہ، الف ب، ضیاءالدین اصلاحی۔

اچھا سیرت نگار اور سب سے اچھا انشاء پرداز پایا تو میں یہی عرض کروں گا کہ
حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کو۔'' [۱]

تبصرہ نگار نے اس کتاب میں ایک ایک تصنیف پر اس طرح روشنی ڈالی ہے اور اس کے محاسن کو اس طرح بیان کیا ہے کہ پڑھنے والوں پر بہت دیرپا اور گہرے اثرات مرتب کرتا ہے۔ اور تبصرہ نگار کی تعبیر و بیان پر مکمل گرفت، وسعت معلومات اور ادب و انشاء کی حلاوت و شیرینی کا ایک نادر مرقع پیش کرتا ہے۔ مولف نے تعارف و تبصرہ کے ذریعہ سید صاحب کی تصنیفات کا آئینہ لا کے رکھ دیا ہے۔

سید صاحب کی تصنیف حیات امام مالک کے عنوان کے تحت صباح الدین صاحب نے پہلے اس کتاب کی مقصد تالیف بیان کیا ہے۔ اس کے بعد اس کے ماخذ کا ذکر کرتے ہوئے خاندان امام مالک، اساتذہ امام مالک، امام مالک کی مجلس، امام مالک کے مستفیدین، امام مالک کی فقہی تربیت، خلفاء سے تعلقات، اخلاق و عادات، موطا پر بحث، سید صاحب کا مسلک ان سب ذیلی عنوان کے تحت بحث کی ہے۔

دروس الادب: جب سید صاحب ستمبر ۱۹۰۸ء میں ندوہ میں علم کلام اور عربی انشاء کے معلم مقرر ہوئے تو آپ سے عربی کی دو ریڈریں لکھوائی گئیں جو شائع ہونے کے بعد کافی مقبول ہوئیں۔ یہ ریڈریں شروع سے آخر تک آسان شگفتہ انداز میں مرتب کی گئیں۔

بہادر خواتین اسلام: سید صاحب نے یہ مضمون ''الندوہ'' میں مسلمان عورتوں کی بہادری کے عنوان سے لکھنا شروع کیا تھا۔ دارالمصنفین کے ابتدائی دور میں یہ رسالہ کی صورت میں شائع کیا گیا تو بہت مقبول ہوا۔ سید صاحب نے اس کے سارے واقعات مستند ماخذ سے قلم بند کئے ہیں۔ کتاب کا خلاصہ کرتے ہوئے صباح الدین صاحب رقم طراز ہیں کہ عہد رسالت ہی سے عورتیں جنگ میں شریک ہوئیں اور اپنی استطاعت کے حساب سے کام کیا۔ سید صاحب لکھتے ہیں کہ اسلام کے تاریخی محاسن کے ذکر میں عموماً ہندوستان کا نام نہیں آتا۔ لیکن سید صاحب نے اپنے وطن کی بہت سی مسلمان عورتوں کا ذکر بھی احسن

۱۔ سید سلیمان ندوی کی تصانیف ایک مطالعہ، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ص ۱

ڈھنگ سے کیا ہے اور اس کا آغاز رضیہ سلطان سے کیا ہے۔

مسلمان عورتوں سے متعلق سید صاحب نے اپنا نقطہ نگاہ ظاہر کیا ہے اور مسلمان عورتوں کے روشن کارناموں کو اجاگر کرنے میں بڑی فراخ دلی سے کام لیا۔ اس سلسلے میں سیرت عائشہؓ لکھی۔

لغات جدیدہ : ۱۹۱۰ء کے ندوہ کے سالانہ اجلاس دہلی میں طے ہوا کہ عربی کے جدید الفاظ کی ایک ڈکشنری ترتیب دی جائے۔ چنانچہ یہ کام سید صاحب کے سپرد ہوا اور انھوں نے دو سال میں پورا کر کے ۱۹۱۲ء میں ندوہ کے اجلاس لکھنؤ میں پیش کیا اور یہ ڈکشنری لغات جدیدہ کے نام سے شائع ہوئی۔ یہ اردو میں جدید عربی الفاظ کی پہلی ڈکشنری تھی۔ اس مضمون میں زبان کی قسمیں، عربی زبان کی قوت، عربی الفاظ کی قسمیں، کن زبانوں کے الفاظ زیادہ دخیل ہیں، عربی دخیل الفاظ، تعریب کے لئے حروف کی تبدیلی، بیرونی الفاظ کے ضمیمے وغیرہ کا بھی مختصراً ذکر کیا ہے۔

تاریخ ارض القرآن : اس کتاب سے متعلق صباح الدین صاحب لکھتے ہیں کہ یہ ندوی صاحب کی پہلی باضابطہ تصنیف ہے جو دارالمصنفین سے ۱۹۱۵ء میں شائع ہوئی۔ صباح الدین صاحب کا ماننا ہے کہ اس میں جو کچھ بھی رقم ہے وہ حقیقت میں مولانا شبلی کی شہرہ آفاق کتاب سیرۃ النبیؐ کے دیباچہ کے لئے لکھا گیا تھا لیکن طوالت کی وجہ سے اس کی دو جلدیں بن گئیں۔ صباح الدین صاحب اس کتاب کی سبب تالیف بیان کرتے ہوئے کتاب کے ماخذ، ارض القران کے اقوام کی تفصیلات، امم سامیہ، قوم عاد، قوم ثمود، متفرق قبائل، سبا کا تفصیلی ذکر، سبا، حمیر، تبع، آل ابراہیم۔ بنوقطورا مدین، اصحاب الایکہ اودم، بنو ہاجرہ، اصحاب الحجر، آل غسان، اوس وخزرج، قیدار، قریش، عربوں کی تجارت، عربوں کی مختلف زبانیں، عربوں کے مذاہب، قرآن مجید میں عربوں کے مذاہب کا ذکر، عربوں کے بت وغیرہ کا مختصراً ذکر کیا ہے۔ پھر صباح الدین صاحب نے ارض القرآن کی اہمیت وافادیت پر ایک نظر ڈالی ہے۔ مستشرقین سے ٹکر، الفاظ کی لغوی تحقیق کے ذیلی عنوان سے بحث کی گئی ہے۔ آخر میں تتمہ کے زیر عنوان لکھتے ہیں کہ علامہ شبلی نے اپنے شاگرد کو جو نصیحت کی تھی کہ معلومات اور مواد کا ہر کونہ اور ہر گوشہ اس محنت سے ڈھونڈو کہ پھر کوئی کونہ خالی نہ

رہ جائے۔ تاریخ ارض القرآن اس پر ہر طرح سے پوری اترتی ہے۔ تاریخ ارض القرآن کی اہمیت و افادیت پر نظر ڈالتے ہوئے صباح الدین صاحب لکھتے ہیں:

''یہ سید صاحب کی پہلی تصنیف ہے لیکن اس کے عرض ہنر میں اب تک ان کا کوئی حریف نہ ہوسکا۔ جس محنت اور ریاضت سے یہ لکھی گئی ہے اردو زبان کیا بلکہ دنیا کی دوسری زبانوں میں بھی ایسی کتاب کم لکھی گئی ہوگی۔'' [۱]

رسالہ اہل سنت والجماعت : اس مضمون میں صباح الدین صاحب رسالہ لکھنے کی ضرورت کے تحت رقم طراز ہیں کہ مئی یا جون ۱۹۱۷ء میں امرتسر کے ایک بزرگ نے سید صاحب کے پاس اہل سنت والجماعت کا صحیح مفہوم و اطلاق کی نسبت ایک استفسار نامہ بھیجا تھا۔ سید صاحب نے صحیح مسلم وغیرہ کے حوالہ سے ان کو جواب تو دے دیا لیکن ان کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ اس لفظ کے صحیح مفہوم اور اس کے متعلق ذرا پوری وضاحت کے ساتھ خیالات پیش کئے جائیں تا کہ تاریکیوں کا پردہ چاک ہو اور مدتوں کی غلط فہمیاں دور ہوجائیں۔ چنانچہ اس عنوان کے تحت انھوں نے معارف میں مضمون لکھنا شروع کیا۔ بعد میں اسی مضمون کو رسالے کی صورت میں شائع کروایا جو باون صفحات پر مشتمل ہے۔ اس مضمون میں صباح الدین صاحب نے اہل سنت والجماعت کی مقبولیت، اہل سنت والجماعت کا مفہوم، بدعت، اسلام کی عمومی برادری، جماعت شکنی، سنت و جماعت اختلافات، مرجیہ، معتزلہ، مسئلہ جبر، اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات پر تحقیق، عقل انسانی کے حدود، عقل ونقل کی تطبیق کی کوشش، اہل السنّت کی شاخیں، قدمائے اہل السنۃ کے اصول، مسئلہ جبر وقدر، کلام الٰہی کی نوعیت، قرآن وسنت عین عقل کے مطابق ہیں وغیرہ کے ذیلی عنوان کے تحت بحث کی گئی ہے۔

سیرت عائشہ : اس کتاب سے متعلق صباح الدین صاحب کا ماننا ہے کہ یہ سید سلیمان ندوی کی بڑی مشہور تصنیف ہے جو ۱۹۲۰ء میں شائع ہوئی۔ یہ سوانح حیات کا درجہ رکھتی ہے۔ صباح الدین صاحب اس کے ماخذ سے متعلق رقم طراز ہیں کہ اس سوانح عمری کو قلم بند کرنے میں تاریخی کتابوں کا سہارا نہیں لیا گیا۔

۱۔ سید سلیمان ندوی کی تصانیف ایک مطالعہ، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ص ۹۹

سیرت عائشہ میں فن سوانح نگاری، واقعۂ افک اور مستشرقین، جنگ جمل، حضرت عائشہ، فضل وکمال، فہم و ذکاوت، استنباط، علم، اسرار دین، فضل وکمال کا موضوع، فصیح البیانی، اشاعت تعلیم، مستفیدین، استفتاء، الرشاد، دارد گیر، جنس نسوانی پر احسانات، سیرت عائشہ کی خوبیاں، کردار نگاری، اسلوب وغیرہ کے ذیلی عنوان کے تحت سید صاحب کی تحریروں کو رقم کیا ہے۔

اس کتاب کی تصنیف کا مقصد اصلاح وتربیت ہے۔ اس میں حضرت عائشہؓ کے واقعات زندگی، ان کے اخلاق وعادات، کردار کی پاکیزگی اور ان کی علمی وعملی حیثیت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یہ احادیث کی روشنی میں ترتیب دی ہوئی ایک علمی وعملی تاریخ ہے۔ سید صاحب نے مسلم عورتوں کی اصلاح اور مسلمانوں کو انحطاط سے بچانے کے لئے حضرت عائشہ کی سوانح لکھی جس میں ایک عورت کو اپنی زندگی کو بہتر بنانے کے تمام نمونے موجود ہیں۔

برید فرنگ : یہ مولانا سید سلیمان ندوی کی کوئی علمی تصنیف نہیں ہے بلکہ یہ ان کے سیاسی خطوط کا مجموعہ ہے۔ یہ اس زمانے کی تصنیف ہے جب وہ ۱۹۲۰ء میں وفد خلافت کے ساتھ لندن گئے۔ وہ خالصتاً علمی آدمی تھے۔ سیاست میں خود نہیں آئے بلکہ معاصرین کے اصرار پر سیاست میں داخل ہوئے۔ اس میں صباح الدین صاحب نے وفد خلافت کا پس منظر، وفد کی ترتیب، وفد کی روانگی، حالات سفر، پیرس کا سفر، لندن کو واپسی، پیرس میں پھر قیام، لندن کی واپسی، دیشی میں سید صاحب کا قیام، پوپ سے مولانا محمد علی کی ملاقات، معاہدہ پر دستخط، فرانس کے وزیر اعظم سے ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے ان کے خطوط میں بعض اہم باتوں کی کمی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ساتھ ہی وفد کی کامیابی وناکامی پر ایک تبصرہ کرتے ہوئے یورپ کی سیاست کا مطالعہ، لندن کا معاشرہ، پیرس کا معاشرہ، قلمی سرگرمیاں، مستشرقین سے ملاقاتیں، کتابوں کی خریداری کا جائزہ لیا ہے۔ ساتھ ہی دارالمصنفین اور معارف کی فکر کا ذکر بھی ان خطوط میں ہے جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ سیاسی مشغولیتوں کے باوجود بھی خالص علمی بنے رہے۔ ان کا ذہن کبھی علمی مسائل پر غور وفکر کرنے سے خالی نہیں رہا۔ یہ علمی نکتہ وری، تحقیقی انجام بینی اور ادبی نکتہ سنجی کا برابر دارالعمل بنا رہا۔

اس مضمون کے آخر میں صباح الدین صاحب کی مکتوب نگاری کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''سید صاحب کے ان سیاسی مکتوبات کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انھوں نے مکتوب کو مکالمہ بنادیا..... یہ بظاہر ایک سیاسی سفرنامہ ہے مگر سچ پوچھئے تو اس زمانہ کے مضطرب القلب دنیائے اسلام کے جذبات کا ترجمان ہے۔ یورپ اور خصوصاً انگریزوں کی سامراجیت کے خلاف ایک احتجاج ہے۔ رجوع الی الاسلام کی منزل کی نشان دہی ہے۔ ان تمام خیالات کو سید صاحب نے جس متانت اور سنجیدگی کے ساتھ قلم بند کیا ہے ان کے انداز تحریر اور اسلوب کا وہی رنگ ہے جو ان کے قلمی اور تصنیفی زندگی میں نمایاں رہا۔'' [۱]

خلافت اور ہندوستان : صباح الدین صاحب تحریر کرتے ہیں کہ سید صاحب نے جون ۱۹۲۱ء میں معارف میں ''خلافت اسلامیہ اور ہندوستان'' کے عنوان سے ایک سلسلۂ مضمون شروع کیا تھا جو بعد میں مطبع معارف اعظم گڑھ سے مجلس خلافت رنگون کی خواہش اور فرمائش پر خلافت اور ہندوستان کے نام سے شائع ہوا۔ اس میں خلافت راشدہ، بنوامیہ، بنوعباس اور دولت عثمانیہ کے زمانہ میں ہندوستان کے مسلمان فرماں رواؤں سے جو تعلقات رہے ان پر گہری تاریخی نظر ڈالی گئی ہے۔ اس کے بعد صباح الدین صاحب نے خلفاء سے عقیدت، خلفاء کے نام کے سکے، تیموریوں کی عقیدت، خلفاء کے نام کے خطبے کے ذیلی عنوان کے تحت سید صاحب کے مضمون کو قلم بند کیا ہے۔ آخر میں اس رسالہ کے مقاصد بیان کرتے ہیں۔

''اس رسالہ کے لکھنے کا مقصد یہ تھا کہ ہندوستان کے مسلمان کو یہ بتایا جائے کہ ہندوستان میں خلافت کی کیا اہمیت رہی اور اس سے یہاں کے حکمرانوں اور مسلمانوں کو کیسا مذہبی، سیاسی اور جذباتی لگاؤ رہا۔ اپنے اسی لگاؤ کی بنا پر ہندوستان میں جب تحریک خلافت شروع ہوئی تو اس میں شرکت کر کے اپنے

۱۔ سید سلیمان ندوی کی تصانیف ایک مطالعہ، ص ۲۲۶

جان و مال سر اور دھڑ کی بازی لگادی۔ سید صاحب اپنی مختلف تحریروں کے ذریعہ اس مہم میں جان پیدا کرتے رہے۔''[۱]

خلافت عثمانیہ اور دنیائے اسلام : رسالہ معارف میں سید صاحب نے نومبر ۱۹۲۱ء سے اپریل ۱۹۲۲ء تک ''خلافت عثمانیہ اور دنیائے اسلام'' کے عنوان سے ایک مضمون کا سلسلہ شروع کیا جو بعد میں ایک رسالہ کی صورت میں شائع ہوا۔ یہ رسالہ ۱۲۶ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس کے مطالعہ سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ سید صاحب کے مورخانہ ژرف نگاہی اور بصیرت کا ایک اعلیٰ نمونہ ہے۔ یہ ایک ایسا تاریخی مواد ہے جو ہر زمانہ میں مسلمانوں کے لئے درس عبرت کا سامان فراہم کرسکتا ہے۔ اس مضمون میں صباح الدین صاحب نے متحدہ نشانی انتشار، یورپ کی عیاری، سلطان سلیم کا کارنامہ کے عنوان سے بحث کی ہے۔

خطبات مدراس : کتاب کی نوعیت سے متعلق صباح الدین صاحب رقم طراز ہیں کہ یہ کتاب سید صاحب کے آٹھ خطبات کا مجموعہ ہے جو ۱۹۴۰ء میں شائع ہوا ہے۔ اس کتاب کے زیر عنوان انسانیت کی تکمیل پر بحث، آئیڈیل سیرت کا نمونہ، رسولؐ کی سیرت کا ماخذ، رسولؐ کی کاملیت، رسولؐ کی جامعیت، رسولؐ اور ان کی عملیت، رسولؐ کا دائمی پیام، توحید کی اصلی تعلیم، مذہب اور سیاست کی تفریق، ایمان و عمل، اسلامی زندگی کی اصلیت، دلنشین اسلوب، ان سب عنوانات پر سید صاحب کی تحریروں کو اپنے خیالات کے ساتھ منتقل کیا ہے۔ اس کتاب سے متعلق صباح الدین صاحب رقم طراز ہیں:

''یہ کہنے میں تامل نہیں کہ انداز بیان کے معیار کے لحاظ سے دنیا کی بہترین کتابوں کی کوئی فہرست تیار کی جائے تو اس میں یہ کتاب ضرور شامل کی جائے گی۔ یہ سیرت النبی کے سلسلہ ہی کی ایک تصنیف ہے۔ لیکن جس ادیبانہ اور انشا پردازانہ خوبیوں کے ساتھ یہ لکھی گئی ہے یہ اس کا امتیازی وصف ہے۔ اس کو پڑھتے وقت بڑے سے بڑا انشاء پرداز بھی محسوس کرے گا کہ اس میں کہیں

۱۔ سید سلیمان ندوی کی تصانیف ایک مطالعہ، ص ۲۳۴

انشاء پردازی کی قوس قزح نظر آرہی ہے کہیں اس کی مہ تابی چھٹکی ہوئی ہے۔ کہیں اس کی کوثر و تسنیم بہہ رہی ہے کہیں زبان قلم کو چوم رہی ہے۔ کہیں خود قلم طرز ادا پر نچھاور ہو رہا ہے کہیں زور بیان صاحبقرانی دکھا رہا ہے۔ ان خوبیوں کی بدولت پوری کتاب میں نبوت کا چمنستان آباد ہو گیا ہے جس میں رسالت کے پھولوں کی روش لگی ہوئی ہے اور روح محمدی معطر معطر ہو کر مشام جان ہو رہی ہے۔''[1]

عرب و ہند کے تعلقات : یہ تصنیف سید صاحب کے چوبیس برس کی مسلسل محنت و تحقیق کے بعد لکھی گئی جو اس بات کی دلیل ہے کہ وہ تحقیق و جستجو میں عرق ریزی اور جانکاہی کے قائل تھے۔ وہ تن آسانی و عجلت کو پسند نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے تاریخ نویسی میں سید صاحب کا زاویہ نگاہ، کتاب کا مآخذ، کتاب کی نوعیت، ہندوستان کی محبت کے اظہار میں فراخ دلی، نئی تحقیقات، تحقیقی تنقیدیں، زبان و اسلوب، کتاب کے عربی ترجمے، کتاب کی افادیت وغیرہ پر اپنے خیالات کو قاری کے سامنے پیش کیا ہے۔ ۱۹۲۹ء میں ہندوستان اکیڈمی کی دعوت پر جا کر عرب و ہند کے تعلقات پر لکچرز دیئے ہیں جن میں ہندو مسلمان دونوں کو وہ زریں عہد یاد دلایا جو دونوں کو بین الاقوامی اور دوسرے گوناگوں تعلقات کے رشتہ میں جکڑے ہوئے تھا۔ اس میں یہ دکھایا گیا ہے کہ ہندوستان اور عرب کے درمیان تجارتی تعلقات کا دجلہ علمی تعلقات کا فرات اور مذہبی تعلقات کی گنگا جمنا کس طرح بہتی تھی۔ یہ کتاب ہندو مسلمان کے خوشگوار تعلقات پیدا کرنے کا ایک موثر ذریعہ ہے۔ اس کتاب کے مداح نواب حبیب الرحمٰن خاں شیروانی نے اس پر ایک لمبی تقریظ لکھی اس کا ایک اقتباس ملاحظہ ہو:

''جب عرب و ہند کے تعلقات کا تصور کیا جاتا ہے، خیبر کے سر بفلک پہاڑ سنگ انسان نظر آتے ہیں جس سے کبھی سر چکنا چور ہوتے ہیں کبھی ہاتھ پاؤں

۱۔ سید سلیمان ندوی کی تصانیف ایک مطالعہ، ص ۲۴۶

پاش پاش۔ضرورت تھی کہ گہری نگاہیں گوہر مقصود کا پتہ لگائیں۔خس وخاشاک کو دور کر کے اصلیت کی تہہ تک پہنچیں اور آج جب کہ دل مل جانے کی سب سے زیادہ ضرورت ہے دکھائیں کہ کبھی اس سرزمین پر محبت و ہمدردی کا ابر رحمت بھی برستا تھا۔اس کے تصنع کی حاجت نہ تھی واقعات کو بگاڑنے اور بنانے کی ضرورت نہ تھی۔صرف چہرہ حقیقت کو بے نقاب کر دینا کافی تھا۔مگر شاہد مقصود تک باریابی ہر ایک قسمت میں نہیں آتی ہے۔کارکنان قضا وقدر نے یہ فتح یابی سلیمان وقت کے لئے محفوظ ومخصوص کر دی تھی۔

یہ رتبۂ بلند ملا جس کو مل گیا ہر مدعی کے واسطے گور وکفن کہاں'' ۱؎

خیام : یہ سید سلیمان صاحب کی معرکۃ الآرا تصنیف ہے۔اس کتاب نے ہندوستان کے محققین کے علاوہ ایران وافغانستان کے فضلا اور یورپ کے خاورشناس سے بھی داد تحسین حاصل کی۔اس میں اس کی سوانح زندگی اور تصنیفات کے علاوہ اس کے فلسفہ پر عالمانہ تبصرہ ہے۔سید صاحب نے اس میں رباعیات عمر خیام سے متعلق مفصل بحث کی ہے اور اس کو بڑھا کر ایک مستقل کتاب کی شکل دے دی ہے۔اس میں مشہور حکیم صوفی اور فلسفی عمر خیام کے حالات وکارناموں کا بہت محققانہ جائزہ پیش کیا گیا ہے۔عمر خیام کو بدنام کرنے کی کوشش کے زیر عنوان تحریر کرتے ہیں کہ عمر خیام کو مشرق سے زیادہ مغرب میں مقبولیت حاصل ہوئی۔ان کی زبان کا جرمن، فرانسیسی اور روسی زبانوں میں بھی ترجمہ ہوا۔خیام کے بارے میں مغربی اہل قلم نے بہت سی غلط فہمیاں پیدا کیں اور اس کی شخصیت کو اس قدر مبہم اور داغدار بنا کر پیش کیا کہ اس کی اصل شخصیت پر پردہ پڑ گیا۔

صباح الدین صاحب مولانا شبلی اور خیام کے ذیلی عنوان کے تحت لکھتے ہیں کہ ان تمام خامیوں کو علامہ شبلی نے شعر العجم اول میں اور سید سلیمان ندوی نے اپنی زیر نظر کتاب خیام میں دور کیا۔اس کے علاوہ

۱۔ سید سلیمان ندوی کی تصانیف ایک مطالعہ، ص ۳۲۳

مولانا شبلی پر اعتراضات، سید صاحب کی کتاب کی نوعیت، سید صاحب کی نئی تحقیقات، خیام کا اصلی مرتبہ، خیام کی علمی سرگرمیاں، خیام کے معاصرین، خیام کے شاگرد، خیام کی تصانیف پر سید صاحب کا تبصرہ، شاعر خیام، رباعی گوئی کی تاریخ، رباعیات، خیام پر تبصرہ، خیام کا مذہب، خیام کی شراب، جعلی خیام، مستند رباعیات سے بحث کرتے ہوئے سید صاحب کی کتاب کا تفصیلی جائزہ لیتے ہوئے رقمطراز ہیں:

''اصلی خیام کو سمجھنے کے لئے اس سے بہتر کوئی اور کتاب نہیں ملے گی۔ پھر تحقیق و تدقیق اور باوقار انداز بیان کے جس معیار کے ساتھ یہ کتاب جانچی جائے گی یہ دنیا کے اعلیٰ پایہ کی کتابوں میں شمار کئے جانے کے لائق سمجھی جائے گی۔ ہاں اگر نرگسیت کا نام تنقید نگاری ہے اور عیب جوئی کا نام علمی کارگزاری ہے تو اس کتاب پر بہت کچھ نرگسیت، تنقید نگاری ہے۔''[1]

حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کی علمی و دینی خدمات پر ایک نظر

(سید صباح الدین عبدالرحمٰن)

یہ کتاب سید صباح الدین عبدالرحمٰن کا مرتب کردہ تین مقالات کا مجموعہ ہے۔ یہ کتاب ۵۹ صفحات پر مشتمل ہے۔ مولانا حافظ محمد عمران خاں ندوی ازہری نے اپنے استاد سید سلیمان ندوی کو اپنا نذرانہ عقیدت پیش کرنے کی غرض سے دارالعلوم تاج المساجد بھوپال کی بزم سلیمانی کے زیر اہتمام ایک شاندار اجتماع کا انعقاد کیا۔ یہ اجتماع ۴۔۵۔۶ دسمبر ۱۹۸۵ء کو عمران صاحب کی سرکردگی میں منعقد ہوا جس میں یہ تینوں مقالات پڑھے گئے۔

سید صباح الدین صاحب نے یہ تینوں خطبے مولانا عمران خاں ندوی کی اجازت سے علاحدہ شکل میں دارالمصنفین سے شائع کر دیا۔ ان مضامین کے عنوانات درج ذیل ہیں۔

۱۔ سید سلیمان ندوی کی تصانیف ایک مطالعہ، ص ۳۴۶

کتاب کی ابتدا صباح الدین صاحب کے تحریر کردہ پیش لفظ سے ہوتی ہے۔ خطبہ صدارت مولانا ابوالحسن علی ندوی نے اپنے خطبہ ''مولانا سید سلیمان ندوی اپنی تصنیفات اور علمی و دینی خدمات کی روشنی میں'' پیش کیا۔ اس خطبے میں مولانا ندوی نے سید صاحب کی مجموعی زندگی کا مختصر خاکہ اور ان کی تصانیف کے بارے میں اختصار سے ذکر کیا ہے۔ مولانا ندوی نے سید سلیمان ندوی کو تاریخ اسلام کا ممتاز ترین سیرت نگار تسلیم کیا ہے۔ ساتھ ہی انھوں نے ایک ایسے علم کلام کی داغ بیل ڈالی جو تاریخی واقعات و حقائق پر مبنی ہونے، عملی زندگی سے تعلق رکھنے، فطرت انسانی کو اپیل کرنے اور عقل کے ساتھ قلب کو بھی متاثر کرنے کی بنا پر اس علم کلام سے زیادہ موثر، عام فہم اور مفید بن گیا ہے۔ جس کے قابل قدر نمونے اپنے اپنے وقت میں پیش کئے گئے۔ بیشک انھوں نے اپنے اپنے زمانے میں اسلام کی عظیم الشان خدمات انجام دیں۔

اس مقالے میں مولانا ندوی نے سید صاحب کے خطبات مدراس کے بارے میں تحریر کیا ہے کہ کسی اسلامی زبان میں سیرت پر اتنی طاقتور، دلآویز، دل پذیر اور ایمان آفریں کتاب دیکھنے میں نہیں آئی۔ مولانا ندوی نے سید صاحب کو ایک عظیم مورخ و محقق میں شمار کیا ہے۔ اور ان کی کتاب خیام عرب و ہند کے تعلقات، عربوں کی جہاز رانی، علمی تحقیق، وسعت مطالعہ، دقت نظر، قوت محاکمہ، تقابلی مطالعہ اور علمی تلاش میں صبر و تحمل کا اعلیٰ نمونہ قرار دیا ہے۔ مولانا ابوالحسن علی ندوی سید صاحب کی جامعیت کے بارے میں خطبے میں اس طرح فرماتے ہیں:

> ''مولانا سید سلیمان ندوی کی زندگی کا سب سے نمایاں اور ممتاز پہلو طبقۂ علما میں ان کی جامعیت اور ان کے علوم و مضامین کا تنوع ہے۔ ان کی ذات اور ان کی علمی زندگی میں قدیم و جدید واقفیت، علمی تبحر اور ادبی ذوق، نقاد و مورخ کی حقیقت پسندی اور سنجیدگی، ادباء اور انشا پردازوں کی شگفتگی اور حلاوت، فکر و نظر کا لوچ اور مطالعہ کی وسعت اس طرح جمع ہوگئی تھیں جو شاذ و نادر جمع ہوتی ہے۔'' [1]

۱۔ سید سلیمان ندوی کی دینی و علمی خدمات پر ایک نظر، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ص ۱۵

مولانا ابوالحسن ندوی صاحب مرحوم نے اپنا یہ خطبہ مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی کے ایک شذرہ پر ختم کیا ہے۔ جس میں انھوں نے دبستان سلیمانی کا اچھا تعارف کرایا ہے۔ وہ مقالات سلیمانی کے حصہ دوم کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

''ان مضامین میں اگر چہ بڑا تنوع ہے لیکن ان کا مرکزی نقطہ اسلامی علوم وفنون اور اسلامی تاریخ وتہذیب کی مرقع کشی اور اس کی تحقیق وتنقید ہے۔ اس لئے ان میں کثرت کے باوجود ایک طرح کی وحدت ہے۔ اردو میں اس کے معلم اوّل مولانا شبلی تھے۔ سید صاحب نے اس کو کمال تک پہنچا دیا اور ان دونوں تصانیف اور طریقہ تحقیق نے ایک مستقل مکتب فکر قائم کر دیا اور اس موضوع پر لکھنے والوں نے ان ہی کے نقش قدم کی تقلید کی۔ اگر تنہا ان ہی کی تصانیف اور مضامین پڑھ لئے جائیں تو مذہب اسلام اسلامی علوم وفنون اور اسلامی تاریخ و تہذیب کے تمام اہم پہلو سامنے آجائیں۔''[1]

اس کتاب کا دوسرا مقالہ سید صباح الدین صاحب کا پیش کردہ ''حضرت الاستاذ مولانا سید سلیمان ندوی'' کے عنوان سے ہی معنون ہے۔ اس خطبے میں صباح الدین صاحب نے سید صاحب کے سوانح حیات اور ان کی تصنیفات کا ذکر مختصراً کیا ہے۔ صباح الدین صاحب ان تصانیف سے متعلق اپنے خیالات کو ان الفاظ کا جامہ پہناتے ہیں:

''ان کی انشا پردازی کا جوہر ان کی اور تصانیف میں بھی چمکتا نظر آئے گا۔ تاریخ ارض القران کے خشک موضوع کو اردو کے جس پیرایہ بیان کا متحمل بنایا ہے یا سیرت عائشہؓ میں وزن اور وقار جس طرح ان کے قلم کو چومتے دکھائی دیتے ہیں یا خطبات مدراس میں ادب وانشا کا جو سنبلستان دیدہ زیب بن گیا

۱۔ سید سلیمان ندوی کی دینی وعلمی خدمات پر ایک نظر، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ص ۷

ہے یا عرب و ہند کے تعلقات میں عمیق تحقیق کے ساتھ زبان و بیان جو ہم رکاب ہے یا خیام میں نقد وتبصرہ کے ساتھ جو باتحمل اور پرشکوہ انداز تحریر ہے یا رحمت عالم میں جو بچوں کے لئے سلیس اور آسان زبان اختیار کی گئی ہے یا حیات شبلی میں فن سوانح نگاری کے ماتحت جو اسلوب ہے یا ان کے متفرق مضامین اور معارف کے شذرات میں قلم کی جو بوقلمونی ہے ان تمام تحریروں، کارناموں کا تجزیہ ادب وانشاء کے فن کے لحاظ سے کیا جائے تو ان کے قلم کی سکندری اور صاحب قرآنی کا صحیح اندازہ ہوگا۔ ان کے ادب وانشاء کو محض ان کی نقوش سلیمانی یا یادرفتگان میں محبوس اور مقید نہ کردیا جائے۔'' [1]

اس کتاب کا تیسرا مقالہ پروفیسر خلیق احمد نظامی کی پیش کردہ مقالہ ''مولانا سید سلیمان ندوی کے علمی کارناموں پر ایک نظر'' کے عنوان کے تحت پیش کیا ہے جس میں انھوں نے سید صاحب کی مجموعی زندگی کا خاکہ اختصار کے ساتھ پیش کیا ہے۔ نظامی صاحب لکھتے ہیں کہ ''سید سلیمان ندوی کی ذات مجسم علم تھی۔ ایسا علم جو پاکی عقل وخرد کا امین، عفت اور قلب و نگاہ کا پاسبان ہوتا ہے۔ انھوں نے اپنے شاگردوں اور رفقاء کی ایک ایسی جماعت تیار کردی جس نے خدمت علم کے جذبہ سے سرشار ہوکر اپنی زندگیاں اس کام میں صرف کردیں اور ان کے دامن کمال میں بعض بہترین دماغوں نے پرورش پائی۔ ہندوستان میں علوم اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ میں ان کے شاگردوں کا کام کوئی دیانت دار مورخ بھلا نہ سکے گا۔'' [2]

۱۔ سید سلیمان ندوی کی دینی وعلمی خدمات پر ایک نظر، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، ص ۳۶

۲۔ ایضاً، ص ۴۳

نظامی صاحب لکھتے ہیں کہ سید صاحب کا احاطہ علم اور دائرہ معلومات بہت وسیع تھا۔ وہ ایک زندہ دائرۃ المعارف تھے جس سے علم وعرفان کی شعاعیں پھوٹتی تھیں۔ ان کے ادبی ذوق اور شعروسخن سے متعلق کچھ کہنا لا حاصل ہے۔ انھوں نے ہندوستان میں ہندوستانی اور الفاظ کی تمہید پر جو پرمغز مضامین لکھے وہ تحقیق کی نئی راہ دکھاتے ہیں۔ نقوش سلیمانی میں اردو زبان وادب سے متعلق ان کے خطبات و مقالات معلومات کا گنجینہ ہیں۔ سید سلیمان ندوی کا مزاج محققانہ تھا۔ شاعرانہ تھا۔ ان کی علمی خدمات کا صحیح اندازہ لگانے کے لئے نظر ان کی تصانیف تک محدود نہیں رہنی چاہئے۔ معارف میں ان کے مقالات، شذرات، اخبار علمیہ ان کے انداز فکر اور وسیع معلومات کے آئینہ دار ہیں۔ خود معارف نے جو مقام پیدا کیا وہ مولانا سید سلیمان ندوی کی مساعی کا رہین منت ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے ایک بار کہا تھا بحمد للہ مولانا شبلی کی تمنائیں رائیگاں نہ گئیں۔

ان تینوں مقالات میں سید سلیمان ندوی کی تمام کتابوں پر بحیثیت مجموعی علمی و ناقدانہ تبصرہ کیا گیا ہے اور مذہبی خدمات کا ذکر بھی کیا ہے۔ یہ کتابچہ سید صاحب کو ایک نگاہ میں سمجھنے کے لئے ممد و معاون ثابت ہوسکتا ہے۔

مرزا مظہر جان جاناں اور ان کا کلام　　عبدالرزاق قریشی

یہ کتاب عبدالرزاق صاحب قریشی کی تحقیقی کاوشوں کا نتیجہ ہے۔ رزاق صاحب کسی اسکول یا مدرسے سے تعلیم یافتہ نہیں تھے لیکن پڑھنے لکھنے کا شوق ان کے اندر موجزن تھا۔ تشنگی علم کے لئے وہ مختلف چشموں تک گئے۔ پہلے آپ نے بمبئی کی اردو صحافت کی دنیا میں دشت نوردی کی۔ پھر اس کے بعد یکے بعد دیگرے کئی اسکولوں میں مدرسی کے فرائض انجام دیئے۔ آپ درس وتدریس کے علاوہ طلبہ میں تحریر وتقریر اور مختلف سرگرمیوں کے ذریعہ ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو بروئے کار لانے کا کام بڑی خوش اسلوبی کے ساتھ انجام دیئے۔ رفتہ رفتہ آپ کی تخلیقی صلاحیتوں کا معیار بلند ہوتا گیا۔ اکتساب علم میں آپ نے کافی محنت و

شوق سے کام کیا جو اپنے آپ میں ایک نادر مثال ہے۔ آپ نے کسی کالج یا یونیورسٹی میں تعلیم نہیں حاصل کی لیکن مغربی طریقۂ تحقیق کا نہایت گہرا مطالعہ کر کے اس پر عمل پیرا ہوئے۔ آپ کی مختصر سی کتاب ''مبادیات تحقیق'' ریسرچ کرنے والوں کے لئے نہایت مفید گائیڈ بک ہے اور اردو زبان و ادب میں اپنے طرز کی شاید پہلی کتاب ہے۔ اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں آپ ریسرچ اسسٹنٹ کی حیثیت سے شریک ہوئے اور اپنے خاص موضوع پر تحقیق کرنے کے علاوہ ادارے کے سہ ماہی رسالہ ''نوائے ادب'' کی ادارت بھی سنبھالی۔ آپ نے بڑی تعداد میں ادبی، تنقیدی اور تحقیقی مضامین لکھے اور ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں سب سے پہلے آپ نے ''مرزا مظہر جان جاناں اور ان کا کلام'' کو تحقیق کا موضوع بنایا۔ جب یہ کتاب کی صورت میں ان کے عالمانہ مقدمہ کے ساتھ شائع ہوئی تو اردو کے ایک بڑے بلند پایہ محقق اور نقاد نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ یہ کتاب ہندوستان کی کسی بھی یونیورسٹی میں ڈاکٹریٹ کی تھیسس کی حیثیت سے پیش کر دی جاتی تو پی ایچ۔ ڈی کی ڈگری مل جاتی۔ اس کتاب کے شروع میں صباح الدین صاحب کا تحریر کردہ پیش لفظ ہے۔ اس کے بعد سید شہاب الدین دسنوی صاحب نے عبدالرزاق قریشی صاحب کے مجموعی حالات زندگی کا مختصر خاکہ پیش کیا ہے۔ اس کے بعد ایک بڑا فاضلانہ مقدمہ تحریر کیا ہے جس میں مرزا مظہر جان جاناں کے عہد کو سیاسی، معاشرتی لحاظ سے ہندوستان کی تاریخ کا پر آشوب دور بتایا ہے۔ اس دور میں مغلیہ سلطنت پوری طرح زوال پذیر ہو چکی تھی۔ یہ زمانہ فسادات سے بھرا ہوا تھا۔ امن و سکون ختم ہو چکا تھا۔ عوام الناس کے جان و مال اور عزت و آبرو کے تحفظ کا کوئی انتظام نہ تھا۔ لوگوں کے اخلاق حد سے زیادہ خراب ہو چکے تھے۔ سیاسی زوال کے ساتھ لوگ معاشی، مذہبی، اخلاقی و روحانی زوال کا شکار ہو رہے تھے۔ مقدمہ میں مغلیہ سلطنت کی پوری تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی شاعری کا پس منظر پیش کیا ہے۔ اس کے بعد حالات زندگی میں ولادت، نام و نسب، وطن، تعلیم و تربیت، تربیت باطنی، ارشاد و ہدایت، شعر و شاعری، تلمذ، تخلص، شہادت، سال وفات، مرزا صاحب کی شہادت ایک سیاسی واقعہ، اعزہ و متعلقین، متاہلانہ زندگی، خلفا و تلامذہ کے ذیلی عنوان سے بحث کی گئی ہے۔ نام و نسب کے ذیلی عنوان

کے تحت ذکر کیا ہے کہ آپ کا نام جان جاناں، مظہر تخلص، شمس الدین حبیب اللہ لقب، علوی نسب، حنفی مذہب ہے جو اٹھائیس واسطوں سے محمد بن حنیفہ کے توسط سے حضرت علی کرم اللہ وجہہ تک پہنچتا ہے۔ آپ کے والد کا نام میرزا جان ہے۔ مولوی نعیم اللہ کے بیان کے مطابق وہ خوبان روزگار میں سے تھے۔ آپ کو شعر و شاعری سے بھی لگاؤ تھا اور جانی تخلص کرتے تھے۔ لیکن ان کا کلام کسی کتاب یا تذکرے میں نہیں مل سکا۔ آپ شاہ عبدالرحمٰن قادری کے مرید تھے۔ آپ اپنے عہدے سے مستعفی ہو کر اپنے علائق کے ساتھ دکن سے آگرہ جا رہے تھے تو مرزا مظہر کالا باغ میں جو حدود مالوہ میں واقع ہے ۱۱ر رمضان المبارک کو جمعہ کی رات میں پیدا ہوئے۔ آپ کی تاریخ پیدائش سے متعلق اختلاف بھی درج ہے۔ آپ کے والد چونکہ شاہی ملازمین میں سے تھے اس لئے جب یہ خبر اورنگ زیب کے پاس بھیجی گئی تو انھوں نے آپ کا نام جانجاں تجویز کیا جس کو لوگوں نے بڑھا کر جانجاناں بنا دیا۔ ان کے اس نام سے متعلق بھی کچھ اختلاف درج ہیں۔ لیکن قریشی صاحب نے اس کو صحیح مانا ہے جو صاحب معمولات مظہریہ نے بیان کی ہے تبارک علی نقش بندی آپ کی تاریخ پیدائش سے متعلق رقمطراز ہیں:

> ''جناب عبدالرزاق صاحب قریشی نے ۱۱۱۳ ھجری پر زیادہ زور دیا ہے۔ جب کہ خلیق انجم نے ۱۱۱۰ ھجری ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ میری رائے سے ۱۱۱۱ ھجری زیادہ قرین صحت معلوم ہوتا ہے کیونکہ اس سن سے متعلق زیادہ ثبوت اور معلومات فراہم ہیں۔'' [۱]

مرزا مظہر کے والد شہر آگرہ سے تھے۔ مرزا صاحب کی نشو و نما اور تعلیم و تربیت اکبر آباد ہی میں ہوئی لیکن مرزا صاحب نے دلی کو اپنا مسکن بنایا اور یہیں ان کی تربیت باطنی ہوئی۔ مرزا صاحب ابھی بہت چھوٹے ہی تھے کہ ان کے عالم و علم دوست والد نے آپ کی تعلیم کا اہتمام کیا۔ آپ کے والد ہمیشہ تاکید کرتے کہ عمر اور وقت کا کوئی نعم البدل نہیں اس لئے انہیں برباد نہیں کرنا چاہئے۔ مرزا صاحب کے والد

۱۔ مرزا مظہر جانجاناں کا عہد اور ان کی اردو شاعری، ڈاکٹر سید تبارک علی نقشبندی، ص ۲۴

انہیں نصیحت کرتے کہ قرآن وحدیث کو سمجھنے کے لئے محاورات عرب سے واقفیت لازمی ہے۔ مرزا صاحب کے والد نے وقت مرگ یہ وصیت کی تھی کہ اپنے وقت کو کسب کمالات میں صرف کرنا اور اپنی زندگی کو غیر ضروری کاموں میں ضائع نہ کرنا۔

درسی اور متداول علوم کے علاوہ اداب بادشاہی، فن سپہ گری اور دوسرے متداول فنون کی بھی مرزا صاحب کو تعلیم دی گئی تھی۔ مرزا صاحب نے ہر ہنر میں وہ کمال پیدا کیا تھا کہ لوگ ان سے اپنے ہنر کی داد مانگتے اور ان کو اپنا استاد تسلیم کرتے۔ استعمال اسلحہ میں بھی آپ کو مہارت تھی۔ اپنے اس فن کی وجہ سے آپ ہمیشہ نقصان سے محفوظ رہے۔ علم موسیقی میں بھی مہارت رکھتے تھے۔

تربیت باطنی کے ذیلی عنوان کے تحت قریشی صاحب نے مرزا صاحب کا قول نقل کیا ہے کہ ان کے والد کی وفات کے بعد ان کے خیر خواہوں کی خواہش تھی کہ دربار میں ان کا موروثی منصب ان کو مل جائے۔ چنانچہ سفارش کی غرض سے لوگ انہیں فرخ سیر کے پاس لے گئے۔ اتفاق سے بادشاہ کو زکام ہوگیا۔ وہ اس دن دربار میں حاضر نہ ہوسکے۔ اس لئے مایوس ہوکر لوٹنا پڑا۔ اسی رات مرزا صاحب نے خواب میں دیکھا کہ ایک بزرگ کے مزار پر گیا ہوں۔ صاحب مزار قبر سے باہر آگئے اور اپنی ٹوپی میرے سر پر رکھ دی۔ وہ بزرگ حضرت خواجہ قطب الدین تھے۔ اس خواب کے بعد مرزا صاحب کے دل سے منصب وجاہ کی رغبت ختم ہوگئی اور درویشوں کی زیارت کا سودا سر میں سمایا۔ جہاں کہیں بھی صاحب کمال کی خبر ملتی فوراً ان کی خدمت میں حاضر ہوتے۔ اس زمانے میں دہلی میں سید نور محمد مداؤنی صوفیا کا فیض کرم جاری تھا۔ دوستوں سے ان کے اوصاف حمیدہ سننے کے بعد ان کی خدمت میں مرزا صاحب مرید ہونے کی غرض سے حاضر ہوئے۔ سید صاحب کا اصول تھا کہ وہ استخارہ مسنونہ کے بعد کسی کو مرید بناتے تھے لیکن مرزا صاحب کو انہوں نے اسی وقت ذکر طریقہ عالیہ بتایا۔ مرزا صاحب کے والد نے بچپن ہی سے ان کے تربیت باطنی کا خیال رکھا تھا۔ عشق ایزدی ان کے خمیر میں موجود تھا۔ خاندانی روایات، باپ کی تربیت اور عملی نمونے نے ان کی زمین طینت کو زرخیز بنادیا تھا۔ صرف چند چھینٹوں کی ضرورت تھی۔ اس کا بھی غیب

سے سامان پیدا ہوگیا۔ مختصر یہ کہ اٹھارہ سال کی عمر میں مرزا صاحب حضرت سید نور محمد مداوٗنی کے حلقہ مریدین میں داخل ہوئے اور طریقہ نقش بندیہ پر عمل کرنے لگے۔ اس کے بعد قریشی صاحب نے مرزا صاحب کا شعرہ طریقت درج کیا اس کے بعد ان کے مرشد کی وفات کا ذکر ہے۔

ارشاد و ہدایت کے ذیلی عنوان کے تحت قریشی صاحب نے تحریر کیا ہے کہ تقریباً تیس سال تک مشائخ نقش بندیہ و مجددیہ سے کسب فیض حاصل کرنے کے بعد مرزا صاحب خود صاحب کمال ہوگئے تو مسند ارشاد و ہدایت پر بیٹھے اور اپنا سارا وقت طالبان حق کی رہنمائی کے لئے وقف کر دیا۔ ان کے طریقے کو ان کے نام سے رعایت سے طریقہ، شمسیہ مظہریہ کہتے ہیں۔ قریشی صاحب کا بیان ہے کہ:

> ''مرزا صاحب کے آفتاب رشد و ہدایت کی روشنی صرف دہلی کے مطلع تک محدود نہ تھی بلکہ اس کی شعاعیں دہلی سے باہر دوسرے علاقوں کو بھی منور کر رہی تھیں۔ وہ ضعف پیری کے باوجود دہلی سے باہر دوسرے علاقوں روہیل کھنڈ اکثر جایا کرتے تھے۔'' [1]

آخری عمر میں مرزا صاحب کی صحت خراب اور قوا کمزور ہوگئے تھے لیکن پھر بھی وہ اپنے کام میں برابر لگے رہے اور مریدوں کو فیوض باطنی پہنچاتے رہے۔ مریدوں کی تربیت باطنی کے علاوہ مرزا صاحب ان کے دنیاوی امور میں بھی کوشش و سفارش سے دریغ نہ کرتے لیکن یہ سفارشیں اپنے مریدوں، نیازمندوں اور دوستوں سے ہی کرتے۔

شعر و شاعری سے متعلق قریشی صاحب رقمطراز ہیں کہ مرزا مظہر جوانی کے دنوں ہی سے دنیا سے کنارہ کش ہوگئے تھے اور سید نور محمد بدایونی کے رشد و ہدایت کی روشنی میں سلوک کی منزلیں طے کرنے لگے۔ لیکن ذوق عرفان کے ساتھ قدرت نے انھیں مذاق سخن بھی عطا فرمایا تھا۔ خود ان کے قول کے مطابق شاعری و پریشان فطری ان کے خمیر میں تھی۔ میر تقی میرؔ مرزا صاحب کے ہم عصروں میں سے تھے۔ ان کی

۱۔ مرزا مظہر جانجاناں اور ان کا کلام، عبدالرزاق قریشی، ص ۴۱

خدمت میں انہیں نیاز حاصل تھا۔فرح علی گرویزی بھی مرزا صاحب کے ہم عصر تھے۔ان کے ہم مشرب و مداح تھے۔ان کا بھی کہنا ہے کہ مرزا صاحب اس مشغلے شعر و شاعری کو مایۂ افتخار نہیں سمجھتے تھے لیکن چونکہ عشق و سخن ان کے آب و گل میں داخل ہے اس لئے جب کبھی انھیں خانقاہ و مستفیدان خدا کی صحبت سے فرصت ملتی ہے وہ اس شغل بے حاصل کی طرف متوجہ ہوتے ہیں لیکن بعض بیان و تحریر سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ آگے چل کر شعر و شاعری سے ان کی دلچسپی بہت کم ہوگئی تھی۔

سیاسی حالات سے متاثر ہونا کے ذیلی عنوان کے تحت قریشی صاحب تحریر کرتے ہیں کہ مرزا مظہر اگر چہ تارک الدنیا تھے لیکن دنیاے سے باہر نہ تھے۔انہیں سیاسی یا ملکی معاملات سے دلچسپی، سیاسی یا دنیاوی منفعت کی خاطر نہ تھی بلکہ خلق خدا سے محبت اور ہمدردی کی بنا پر تھی۔ان کے مکاتیب میں ایسے اشارے کافی تعداد میں ملتے ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنے عہد کے سیاسی حالات سے پوری طرح واقفیت رکھتے تھے اور ان کا اثر بھی قبول کرتے تھے۔

آپ کی شہادت سے متعلق قریشی صاحب رقمطراز ہیں کہ آپ کا سن اسی سال سے تجاوز کر گیا تو آپ اکثر ذکر رحلت و طلب دعائی خیر خاتمہ و انتظار ملاء اعلیٰ و اظہار تمنای درجہ اعلامی شہادت و کلمات متضمن وصایا و موعظت و وداع رخصت فرمایا کرتے۔وظائف و عبادات میں اضافہ ہوگیا۔اکثر مریدوں اور معتقدوں کو خطوط میں بھی اپنے وقت آخر سے متعلق اشارہ کرتے ہیں۔قریشی صاحب لکھتے ہیں کہ مرزا صاحب کو ان ارواح طیبات سے ملنے کا بہت اشتیاق تھا۔ جناب رسالت مآب حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت امام حسنؓ، حضرت جنید بغدادیؒ، حضرت خواجہ بہاء الدین محمد نقشبندؒ اور حضرت مجدد الف ثانیؒ وغیرہ۔صاحب معمولات لکھتے ہیں کہ مرزا صاحب اکثر فرمایا کرتے تھے جب امیر المومنین حضرت علی کرم اللہ وجہہ پر قاتلانہ حملہ ہوا اور وہ زخمی ہوئے تو امام حسنؓ کو وصیت کی کہ اگر میں سلامت رہا تو مجرم سے مواخذہ کرنا میرا کام ہے ورنہ بصورت دیگر قاتل سے قصاص نہ لیا جائے۔اگر خدا تعالیٰ نے مجھے شہادت بخشا تو میں چاہتا ہوں کہ میرے خون کا بھی بدلہ نہ لیا جائے۔پھر بڑی حسرت سے فرماتے ہیں کہ جوانی میں

جب شہادت حاصل کرنے کا موقع تھا تو حاصل نہ کر سکا، اب بڑھاپے میں یہ شہادت کہاں نصیب ہو سکتی ہے۔ لیکن پھر بھی وہ مایوس نہیں ہوتے اور خدا نے بھی انہیں مایوس نہیں کیا۔ اس طرح ۷ رمحرم الحرام ۱۱۹۵ھ کو تھوڑی رات گزرنے پر کچھ لوگوں نے ان کے دروازے پر دستک دی اور بتایا کہ وہ زیارت کی غرض سے آئے ہیں۔ مرزا صاحب نے انہیں اندر بلایا اور اپنے کمرے سے باہر نکل کر ان کے پاس آئے۔ ان میں ایک ایرانی نژاد مغل تھا۔ انھوں نے آپ کا تعارف حاصل کیا۔ اثبات میں جواب ملنے پر انھوں نے طمنچہ سے وار کیا اور بھاگ گئے۔ گولی بائیں طرف دل کے پاس لگی۔ زخم کاری ہونے کے باوجود بھی مرزا صاحب استقلال طبیعت سے اپنے کو کوٹھے کے اوپر پہنچایا۔ ان کے گولی لگنے کے بیان کے سلسلے میں کچھ لوگ الگ الگ باتیں بیان کرتے ہیں۔ تقریباً گھنٹے بھر بعد کچھ سکون ہوا تو فرمایا کہ الحمدللہ جد بزرگوار کی ایک سنت پوری ہوئی لیکن دوسری باقی ہے۔ میری دیرینہ خواہش ہے خدا اپنے فضل سے اسے بھی پورا کرے اور حضرت علی کرم اللہ کی طرح زخم لگنے کے تین دن بعد انھوں نے بھی وفات پائی۔ شاہ عالم بادشاہ نے آپ کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ سراغ بتائیں تا کہ ان مفسدوں کو تلاش کر کے سزا دی جائے۔ آپ نے جواب میں کہلایا کہ فقرا تو شہید راہ خدا ہیں مرے ہوؤں کو مارنے کا قصاص کیسا اور اگر اتفاق سے مجرم ہاتھ آجائیں تو انہیں میرے پاس بھیج دو تا کہ دستور طریقت کے مطابق ان سے بدلہ لیا جائے یعنی مرزا صاحب انھیں معاف کر دیں۔

سال وفات کے ذیلی عنوان کے تحت قریشی صاحب لکھتے ہیں کہ بعض تذکرہ نویسوں نے آپ کا سال وفات ۱۱۹۴ھ لکھا ہے اور کچھ نے ۱۱۹۲ھ لکھا ہے۔ قریشی صاحب کے مطابق مرزا صاحب نے ۱۱۹۵ھ کے بالکل شروع میں وفات پائی اس لئے ۱۱۹۴ھ تو قرین قیاس ہو سکتا ہے۔ لیکن ۱۱۹۲ھ کسی طرح صحیح نہیں کہا جا سکتا۔ مرزا صاحب کی شہادت پر ان کے متعدد ہم عصروں، شاگردوں اور مریدوں نے تاریخیں کہی تھیں۔ ان تمام تاریخوں میں ۱۱۹۵ھ اور چند سے ۱۱۹۴ھ نکلتا ہے۔ مرزا صاحب کی شہادت ایک سیاسی واقعہ تھی۔ اس سے متعلق قریشی صاحب نے حافظ محمود شیرانی کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ:

''یہ ایک سیاسی واقعہ معلوم ہوتا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اورنگ زیب کی وفات کے بعد ملک میں شیعیت کا زور بڑھنے لگا۔ بہادر شاہ اول کے بعد شیعوں کا اقتدار یہاں تک بڑھا کہ دو بھائی سید عبداللہ اور سید حسین سلطنت کے مالک کل بن گئے اور ''بادشاہ گر'' کے لقب سے مشہور ہوئے۔ بالآخر محمد شاہ کے عہد میں وہ قتل ہوئے۔ لیکن محمد شاہ ہی کے زمانے میں جب تورانی پارٹی کا زور ٹوٹا اور ایرانی پارٹی برسر اقتدار آئی تو شیعیت نے پھر زور پکڑا۔ شاہ عالم نے انگریزوں کی سفارش پر نجف خاں کو میر بخشی بنایا۔ نجف خاں کے دہلی آنے پر شیعیت نے بے انتہا زور پکڑا اور سنیوں پر ہر قسم کے مظالم ڈھائے جانے لگے۔ مرزا مظہر ایک مکتوب میں لکھتے ہیں کہ

''حال مردم ایں شہر از روز یکہ نجف خاں آمدہ است، از شاہ تا گدا تباہ است۔''[1]

اعزہ و متعلقین کے زیر عنوان کے تحت قریشی صاحب نے صرف آپ کی اہلیہ اور ایک بہن کا ذکر کیا ہے۔

متاہلانہ زندگی سے متعلق ذکر کرتے ہیں کہ مرزا صاحب کی متاہلانہ زندگی کچھ خوش گوار نہ تھی۔ مولوی نعیم اللہ بہرائچی کے مطابق آپ نے آخری عمر میں شادی کی تھی۔ آپ کی بیوی بہت بدمزاج تھی پھر بھی آپ اس کے ساتھ حسن سلوک کرتے تھے اور اپنی استطاعت کے مطابق اس کا حق بھی ادا کرتے۔ اس کے بعد قریشی صاحب نے مرزا صاحب کے خلفاء کا ذکر کیا ہے جس میں قاضی ثناء اللہ، عثمان پانی پتی، شاہ غلام علی، مولوی نعیم اللہ بہرائچی، مولوی غلام یحییٰ وغیرہ کے مختصر حالات زندگی کے بارے میں بھی قریشی صاحب نے ذکر کیا ہے۔

۱۔ مرزا مظہر جانجاناں اور ان کا کلام، عبدالرزاق قریشی، ۶۷

چونکہ مرزا صاحب ایک بلند مرتبہ صوفی اور عمدہ شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک دقیقہ رس سخن سنج و نکتہ شناس استاد بھی تھے جس سے ایک طرف روحانی تربیت کا سامان تھا تو دوسری طرف ذوق سخن کی تربیت ہوئی۔ آپ کے تلامذہ میں انعام اللہ خاں یقین، خواجہ احسن اللہ بیاں، محمد باقر حزیں، قلی خاں حسرت، شاہ قدرت اللہ قدرت، محمد فقیر صاحب دردمند، غلام احمد منشی، شاہ قلندر، میر ناصر سامان، سنگم لال عزت، محمد خاں ظاہر، کشن چند مجروح، حمید بیگ اظہر، بساون رائے بیداد، منعم، ملال۔ ان شعرا میں بہت سے صاحب دیوان ہیں اور کچھ ایسے ہیں جن کے نام اور چند اشعار تذکروں میں محفوظ رہ گئے ہیں۔ اس کے بعد قریشی صاحب نے صاحب دیوان تلامذہ کی حالات زندگی بھی تحریر کیا ہے۔

اخلاق و عادات سے متعلق قریشی صاحب رقمطراز ہیں کہ آپ میں سنجیدگی و متانت تھی۔ نفاست و پاکیزگی کے ساتھ اسلامی طریق معاشرت اور آداب مجلس کا بہت خیال رکھتے تھے۔ میرزا صاحب کے اخلاق و عادات سے متعلق قریشی صاحب نے مولوی نعیم اللہ بہرائچی کا قول نقل کیا ہے:

> ''حقیقت یہ ہے کہ مرزا صاحب بہت کریم الاخلاق تھے۔ ہر شخص کو محبت و شفقت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ہر شخص سے کشادہ پیشانی اور خندہ روی سے ملتے۔ بات نرمی سے کرتے۔ کسی پر اعتراض نہ کرتے، معذرت چاہنے والوں کو معاف کر دیتے۔ لوگوں کے مزخرفات کو بھی تحمل کے ساتھ سن لیتے۔ مرے ہوؤں کو نیکی سے یاد کرتے۔ کبھی کسی کی غیبت نہ کرتے اور نہ غیبت کرنے والوں کو اچھی نگاہ سے دیکھتے۔ بہت سخی و فیاض تھے۔ مزارات متبرکہ کی زیارت اور بیماروں کی عیادت کو ضرور جاتے۔ جو ان کے عیوب ان پر ظاہر کرتا اس سے ناراض نہ ہوتے بلکہ اس کا شکریہ ادا کرتے۔''[1]

ملفوظات سے متعلق قریشی صاحب رقمطراز ہیں کہ دوسرے صوفیاء کرام کے مریدوں کی طرح

۱۔ معمولات مظہریہ، مولوی نعیم اللہ بہرائچی، حوالہ مرزا مظہر جانجاناں اور ان کا کلام، عبدالرزاق قریشی، ص ۹۵

مرزا مظہر جانجاناں کے مریدوں نے بھی ان کے بعض اقوال وآراء کو ملفوظات کی شکل میں اکٹھا کرلیا ہے۔ یہ ملفوظات ان کے مکاتیب کے ساتھ کلمات طیبات میں شائع ہو چکے ہیں۔ مرزا صاحب کے رجحانات و میلانات، تعلیمات و ہدایات اور اعتقادات وخیالات کو بہتر طور پر سمجھنے کے لئے قریشی صاحب نے چند اقوال نقل کئے ہیں۔

قریشی صاحب نے مرزا صاحب کی تصانیف کا ذکر بھی تفصیلاً کیا ہے۔ ان تصانیف میں (۱) دیوان مظہر، (۲) خریطۂ جواہر، (۳) رقعات کرامت سعادت، (۴) کلمات طیبات، (۵) مکاتیب مرزا مظہر، (۶) اردو اشعار وغیرہ کا ذکر تفصیلاً کیا ہے۔

نظم کے حصے میں فارسی کلام سے متعلق قریشی صاحب رقمطراز ہیں کہ مرزا مظہر کے وقت کا زیادہ حصہ ذکر ومراقبہ اور مریدوں کی ہدایت وتربیت میں صرف ہوتا تھا اور شعر گوئی کی طرف سے ان کی توجہ بہت کم ہوگئی تھی۔ انھوں نے جو کچھ کہا تھا اس کے تحفظ کا بھی انہیں کچھ زیادہ خیال نہ تھا پھر بھی ان کے کلام کا کچھ حصہ ۱۱۵۰ ھجری میں ان کے ایک مرید کی کوشش سے جمع وترتیب پایا تھا اور اس پر خود مرزا صاحب نے دیباچہ لکھا تھا۔

مرزا مظہر نے اردو اشعار کہے ہیں۔ یہ اشعار کمیت کے لحاظ سے اہمیت نہ رکھتے ہوں لیکن کیفیت کے لحاظ سے اہم ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اردو شاعری کی تاریخ میں مرزا صاحب کا نام عزت سے لیا جاتا ہے۔ لیکن حقیقت میں مرزا صاحب اصلاً فارسی کے شاعر تھے۔ کیفیت سے قطع نظر ان کے اشعار کی تعداد بیس اشعار بھی ان کے فارسی گو شاعر ہونے کی ایک بڑی دلیل ہے۔

مرزا صاحب کے فارسی کلام کی توصیف ان کے ہم عصروں نے بھی کی ہے اور بعد کے نقادوں نے بھی کی ہے۔ مشہور ادیب ونقاد نیاز فتح پوری کی رائے میں ہندوستان نے پانچ ایسے شاعر پیدا کئے جنہیں ایران کے مسلم الثبوت اساتذہ کے مقابلہ میں پیش کیا جاسکتا ہے۔ وہ درج ذیل ہیں

(۱) امیر خسرو، (۲) ابوالفیض فیض، (۳) مرزا عبدالقادر بیدل، (۴) مرزا مظہر، (۵) مرزا غالب

ہر بڑے شاعر کی طرح مرزا صاحب کو خود بھی اپنے کلام کی عظمت کا احساس تھا۔ انھوں نے اپنے بعض اشعار میں اس کی طرف اشارہ بھی کیا ہے۔ قریشی صاحب اس سے متعلق اس کتاب میں تحریر کرتے ہیں کہ:

''مرزا مظہر بادۂ تصوف کے لذت سے آشنا تھے اس لئے عشق کی کیفیات اور حسن کی اداؤں کو خوب سمجھتے تھے، حسن کی ہر ادا ان کے لئے زندگی کا ایک نیا پیام تھی اور عشق کا ہر چرکا ان کے لئے لذت و کیفیت کا باعث تھا۔ حسن کی پرستش کی وجہ سے ان کے یہاں جذبۂ فدائیت ہے۔ ان کے نزدیک عاشقی فن شریف ہے۔ عشق کی بدولت اپنے اشک خون آلود کے ہر قطرہ کو گلبرگ سے زیادہ رنگین پاتے ہیں۔ ان کی آہ درد اندوہ دنیا کا بہترین نغمہ بلکہ مقصود عاشقی ہے۔ وہ اپنے آپ کو خلیل عشق کے لقب سے یاد کرتے ہیں اس لئے ہر غم ان کا مہمان ہوتا ہے۔ ان کے یہاں وصل کی تمنا اور ہجر کی بے قراری ضرور ہے لیکن محرومی و مایوسی نہیں تڑپ اور فریاد ہے مگر نالہ وشیون صدائے ماتم نہیں۔ ان کی فغاں، فغاں خاموش ہے۔ ہمسایہ کی نیند حرام کر دینے والی نہیں..... مختصر یہ کہ ان کا کلام کیفیات عشق میں ڈوبا ہے اور یہی ان کے کلام کی سب سے نمایاں خصوصیت ہے۔ اس خصوصیت نے ان کے کلام میں شیرینی و تازگی اور رعنائی و برنائی پیدا کر دی ہے۔''[1]

قریشی صاحب لکھتے ہیں کہ مرزا صاحب اردو شاعری کے اس دور سے تعلق رکھتے ہیں جو اصلاح کا دور کہلاتا ہے۔ یہ وہ زمانہ ہے جب اردو شاعری میں صنعت ابہام کا رواج بہت زیادہ ہو گیا تھا اور شاعری لفظوں کا کھیل بن گئی تھی۔ مرزا صاحب وہ پہلے شاعر تھے جنہیں اردو شاعری کی اصلاح کا خیال

۱۔ مرزا مظہر جانجاناں اور ان کا کلام، عبدالرزاق قریشی، ص ۱۳۱۔۱۳۲

ہوا۔ انھوں نے اردو شاعری سے ابہام کی صنعت کو ترک کیا اور دوبارہ اس میں لطافت خیال اور سادگی بیان پیدا کی۔

قریشی صاحب کا ماننا ہے کہ مرزا صاحب کا اردو کلام کمیت کے لحاظ سے بہت کم ہے لیکن کیفیت کے اعتبار سے اس کی اہمیت مسلم ہے اور اسے ہمیشہ قبولیت عام حاصل رہی۔

اس کے علاوہ قریشی صاحب نے خریطۂ جواہر، نثر مکاتیب، رقعات کرامت سعادت کلمات طیبات وغیرہ کا ذکر بھی تفصیلاً کیا ہے۔ قریشی صاحب مرزا صاحب کے دور کے متعلق رقمطراز ہیں کہ:

> ''مرزا مظہر کا زمانہ سیاسی و اقتصادی حیثیت سے بڑا پر آشوب زمانہ تھا۔ جب انھوں نے ہوش کی آنکھیں کھولیں تو وسیع و عظیم مغلیہ سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو رہی تھی۔ مرکز کے کمزور ہو جانے کی وجہ سے ملک میں مختلف باغیانہ طاقتیں ابھر آئیں۔ دکن میں شورش برپا ہوئی۔ جاٹوں نے اودھم مچائی، سکھوں نے فساد کیا، روہیلوں نے بغاوت کی، مرہٹوں نے لشکر کشی کی۔ غرض سارے ملک میں اقتصادی بدحالی اور سیاسی بے چینی تھی۔ مرزا صاحب ے بعض مکتوبات میں ان ہنگامہ آرائیوں کی طرف بھی اشارے ملتے ہیں۔''[1]

قریشی صاحب نے اس بات کے اختتام پر مرزا صاحب کے طرز تحریر اور اسلوب بیان کے بارے میں ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ قریشی صاحب نے مرزا صاحب کے مکاتیب کے علاوہ ان کی بعض دوسری نثری تحریروں کا بھی ذکر کیا ہے۔

خاتمہ سخن کے عنوان کے تحت قریشی صاحب رقم طراز ہیں کہ مرزا مظہر جانجاناں کی اہمیت تین حیثیتوں سے ہے۔ وہ صوفی تھے فارسی اور اردو کے شاعر تھے۔ اردو زبان اور شاعری کے مصلح تھے۔ ایک

۱۔ مرزا مظہر جانجاناں اور ان کا کلام، عبدالرزاق قریشی، ص ۱۹۵

صوفی کی حیثیت سے انھوں نے سیکڑوں، ہزاروں انسانوں کی زندگی بنائی۔ ان کے یہاں پیری مریدی بیعت شجرہ کلاہ کے لئے نہ تھی بلکہ ان کا مقصد تعلیم ذکر قلبی، حصول جمعیت اور توجہ الی اللہ تھا۔ انھوں نے اپنی کوششوں کو اپنی خانقاہ کی چہار دیواری تک محدود نہیں رکھا بلکہ عام مسلمانوں کی بگڑی ہوئی مذہبی و معاشرتی حالت کی اصلاح کی سعی فرمائی۔

مرزا صاحب سے کرامات بھی ظاہر ہوئیں لیکن وہ خود خوارق کو علوئے کمالات کی شرط قرار نہیں دیتے۔ ان کی رائے میں علوئے کمالات کی پہلی و آخری شرط کتاب وسنت کی کامل پیروی ہے۔ یہی ان کی زندگی کا مقصد تھا، یہی ان کی تعلیم و ہدایت کا ماحصل تھا۔

انھوں نے اپنی کوششوں سے ہزاروں مسلمانوں کو مسلمان بنایا اور یہی وجہ ہے کہ وہ ہماری زبان کے مشہور محقق حافظ محمود شیرانی کے الفاظ میں:

> ''بارہویں صدی ہجری کے ان مشاہرین میں سے ہیں جو آفتاب سے زیادہ مشہور و معروف ہیں۔''[1]

مجموعی حیثیت سے مرزا صاحب کے فارسی کلام کے متعلق کہا جاسکتا ہے کہ وہ پاکیزہ اور لطیف خیالات کا حامل ہے۔ ان کے یہاں واردات قلبی اور کیفیات عشق کی صحیح اور عمدہ عکاسی ملتی ہے۔ ان کے یہاں کیفیات عشق کی مصوری ہے لیکن تصوف کے زیر اثر ان کا کلام بوس و کنار سے پاک ہے۔ ان کے کلام کی پاکیزگی، خیالات کی لطافت اور اسلوب کی شگفتگی میں ان کے تنقیدی شعور کو بڑا دخل ہے۔ اسی تنقیدی شعور نے انہیں بیدل، ناصر علی وغیرہ کی نکتہ آفرینی سے محفوظ رکھا اور اسی کی بدولت ان کے کلام میں رفعت و رعنائی پیدا ہوئی جو ان کی عظمت کا باعث ہوئی اور فارسی شاعری کی تاریخ میں ان کا نام باقی رکھے گی۔

مرزا صاحب کے اردو کلام بھی فارسی کلام کی طرح ممتاز رہے۔ وہ فارسی کے کلام کے ساتھ ساتھ

۱۔ اورینٹل کالج میگزین لاہور، نومبر ۱۹۴۰ء، بحوالہ مرزا مظہر جانجاناں اور ان کا کلام، عبدالرزاق قریشی، ص ۲۰۲

اردو سے غافل نہیں تھے۔ اگر چہ انھوں نے اردو میں کم اشعار کہے لیکن اس کی تلافی متعدد شاگردوں اور دوستوں کی تربیت کر کے کی۔ وہ اردو کے پہلے مصلح ہیں۔ انھوں نے یہ اصلاح لفظی و معنوی دونوں حیثیتوں سے کی ہے۔ مرزا صاحب سے متعلق نیاز فتح پوری کی یہ رائے صحیح ہے کہ:

''ان کی خدمات نہ صرف اس لئے وزنی ہے کہ انھوں نے اردو زبان کی تہذیب وشائستگی میں حصہ لیا بلکہ حقیقی رنگ تغزل کے معیار کو بہت بلند کر کے دنیا کے سامنے پیش کیا۔'' [۱]

انھیں کی کوششوں سے برج بھاشا اور دکنی الفاظ کا استعمال بہت کم ہوگیا اور بہت سے الفاظ متروک قرار پائے۔ عربی و فارسی کے الفاظ جو اردو میں صوتی لحاظ سے لکھے جاتے تھے اب اپنی اصلی شکل میں لکھے جانے لگے۔ ان کے تمام معاصرین نے ان کا اثر قبول کیا۔

ان کے اصلاحی کاموں کو اردو شاعری کا مورخ کبھی نظر انداز نہیں کر سکتا۔ مشہور محقق نقاد محمود خاں شیرانی نے یہ فیصلہ کیا کہ ''ان کا پایہ میر و مرزا سے بلند ہے۔'' [۲]

باقیات مظہر میں قریشی صاحب نے ان کے مختلف مطبوعہ اور قلمی تذکروں اور بیاضوں سے مظہر صاحب کے اردو اشعار کو جمع کیا ہے اور حاشیہ میں ہر شعر کا مآخذ بیان کیا ہے۔ اس کے بعد اشاریہ ہے۔ اس کتاب کے متعلق خورشید نعمانی صاحب کا یہ قول منقول ہے:

''مرزا مظہر جانجاناں کا نام بحیثیت ایک صاحب سلوک و معرفت اور شاعر کے عوام و خواص میں متعارف ہے اور آپ کی نازک مزاجی کے کچھ واقعات بھی مشہور ہیں۔ اس کتاب میں غالباً پہلی مرتبہ حضرت مرزا کے ذاتی حالات و

۱۔ انتقادیات جلد۲، ص ۱۷۶، بحوالہ مرزا مظہر جانجاناں اور ان کا کلام، عبدالرزاق قریشی، ص ۲۰۳

۲۔ اورینٹل کالج میگزین لاہور، نومبر ۱۹۴۰ء، بحوالہ مرزا مظہر جانجاناں اور ان کا کلام، عبدالرزاق قریشی، ص ۲۰۴

سوانح اور عارفانہ اور شاعرانہ کاموں کا مفصل اور محققانہ جائزہ لیا گیا ہے جس میں بعض تذکرہ نویسوں کے بیانات پر تبصرہ وتنقید بھی ہے اور مختلف فیہ واقعات کی تصحیح اور ان پر کلام کر کے اس واقعہ کی اصل صورت کو متعین کر دیا گیا ہے۔ اور ان کے ملفوظات فارسی کلام اردو مکتوبات پر بصیرت افروز تبصرہ ہے۔'' [۱]

اس کتاب کے شروع میں سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کا پیش لفظ ہے جس میں وہ لکھتے ہیں:

''ناظرین کو اس کتاب میں مرزا مظہر جان جاناں کے حالات و کمالات کی بڑی اچھی تصویر ملے گی۔ ان کی محفل انوار الٰہی سے معمور رہتی جس میں فیض مصطفوی کا بھی پورا عکس ہوتا۔ ان کا تعلق نقشبندیہ، قادریہ، چشتیہ،، احمدیہ، یعنی مجددیہ سلسلے سے بھی رہا ہے۔ اس لئے ان کے یہاں نسبت نقشبندیہ کے استغراق ومحویت قادریہ کے لمعان و صفائے حالات، چشتیہ کے اذواق و اشواق اور احمدیہ کی لطافت و نضارت دکھائی دیتی۔ پھر ان کے یہاں بڑی مذہبی رواداری بھی ملتی ہے۔ ان کی تعلیم تھی کہ گزرے ہوئے لوگوں پر بغیر اس کے شرع سے کفر ثابت ہو کفر کا حکم لگانا جائز نہیں۔ ان کا خیال تھا کہ ہندوؤں میں بھی بشیر و نذیر گزرے ہوں گے۔ ایسی صورت میں رام اور کرشن ممکن ہے کہ ولی یا نبی رہے ہوں۔ مرزا صاحب کے یہاں جہاں حدیث وتفسیر کی باتیں ہوتیں، وہاں شعر وسخن سے بھی ذوق کی تازگی ہوتی رہتی۔ پھر وہ سپہ گیری میں بھی مہارت رکھتے تھے۔ تیروں کی بارش اور نیزوں کے وار میں بھی ایک غزل کہہ گئے۔ علم موسیقی سے بھی واقف تھے۔ ماہرین فن ان کی خدمت میں اصلاح کی غرض سے حاضر ہوتے تھے۔ کھانا پکانا بھی خوب جانتے تھے۔

۱۔ دارالمصنفین کی تاریخی وعلمی خدمات، جلد دوم، خورشید نعمانی، ص ۲۰۸۔۲۰۹

کپڑے قطع کرنے بیٹھتے تو شلوار کو پچاس طریقوں سے قطع کرتے۔ اس کتاب میں ان کی دلآویز شخصیت کی رعنائیوں کی جو مرقع آرائی کی گئی ہے اس سے ناظرین ضرور محظوظ ہوں گے۔ ان کی فارسی شاعری میں جذبہ رضا، وحدت شہود، جبر و قدر، فنا، وسعت، مشرب، حیات انسانی کی ناپائیداری، واردات عشق کے جوش بیان اور اسلوب کی شگفتگی اور دلکشی کا بھی بڑا اچھا تجزیہ اس کتاب میں ملے گا۔ انھوں نے اردو کلام میں ایہام کی صنعت، برج بھاشا اور دکنی الفاظ کو ترک کر کے اور ہندی الفاظ کے استعمال میں جو توازن پیدا کیا۔ پھر عربی اور فارسی الفاظ کو اردو میں صوتی لحاظ سے لکھے جانے کے بجائے اصلی شکل میں لکھ کر اردو زبان میں جو صفائی اور شستگی پیدا کی اس پر بھی اچھی بحث ہے۔'' [۱]

اس طرح یہ کتاب مرزا صاحب کے حالات و کمالات اور ان کے کلام کو سمجھنے میں معاون ثابت ہو سکتی ہے۔ اس کتاب کے پیش نظر قریشی صاحب اردو ادب کی تاریخ میں زندہ جاوید رہیں گے۔

اردو زبان کی تمدنی اہمیت (عبدالرزاق قریشی)

اردو زبان کی تمدنی اہمیت عبدالرزاق قریشی صاحب کی کاوشوں کا ثمرہ ہے۔ اس کتاب میں اردو زبان میں ہندوستان کی تمدنی زندگی کے تمام شعبوں یعنی امور مملکت، زراعت، تجارت، باغبانی، آداب معاشرت، خورد و نوش، لباس، زیور، مکان، رسم و رواج، فنون حرب اور کھیل تماشا وغیرہ، فنون لطیفہ اور ان کے الفاظ و محاورات اور اردو زبان کی چند مزید خصوصیات کا بیان کیا ہے۔

چونکہ یہ کتاب قریشی صاحب کے انتقال کے بعد شائع ہوئی اس لئے یہ کتاب اپنے اصل خیر خواہ کے دیباچہ و مقدمہ سے محروم رہ گئی۔ اس کتاب کا پہلا باب ''امور مملکت'' کے نام سے معنون ہے۔ اس

۱۔ پیش لفظ، مرزا مظہر جان جاناں اور ان کا کلام، عبدالرزاق قریشی، ص ۳۰۲

سلسلے میں قریشی صاحب لکھتے ہیں:

''مسلمان ہندوستان میں وارد ہوئے تو اپنے ساتھ ایک بلند تمدن اور اعلیٰ درجہ کی تہذیب سے جسے عرب کی سادگی اور عجم کی نفاست کا مجموعہ کہا جاسکتا ہے لے کر آئے۔ لیکن اس ملک میں بس جانے کے بعد انھوں نے ہندوستانی تہذیب وتمدن کا اثر قبول کیا۔ مسلمانوں کے ہندوستان میں آباد ہوجانے اور اہل ہند سے ان کا میل جول ہونے کے بعد ایک نئی تہذیب وجود میں آئی جسے ہندوستانی تہذیب کہنا غلط نہ ہوگا۔ اس تہذیب کو مسلمانوں نے اس حد تک اپنایا کہ زندگی کا کوئی شعبہ اس سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔'' [1]

اس باب میں حسب ذیل ذیلی عنوانات پر قریشی صاحب نے ہر شعبہ میں تمدنی اہمیت کو پیش کیا ہے۔ اس میں نظام حکومت، دربار، طرز نظامت، دفتر، خطابات، عدالت اور قانون، شہری نظام، جنگ اور سامان جنگ ان تمام عنوان پر مختصراً روشنی ڈالی ہے۔

دوسرا باب زراعت وتجارت کے عنوان پر منحصر ہے۔ قریشی صاحب زراعت سے متعلق لکھتے ہیں:

''ہندوستان ایک زراعتی ملک ہے اور دہقان اور دہقانیت کا نظام تمدن سے گہرا تعلق ہے۔ مغل بادشاہوں کے عہد میں اس سلسلے کے بہت سے الفاظ وجود میں آئے۔ ان کا استعمال اردو میں بھی ہونے لگا۔ انگریزی حکومت کے قیام کے بعد بہت سے نئے الفاظ عربی وفارسی کی مدد سے بنائے گئے، وہ بھی اردو میں مستعمل ہیں۔'' [2]

اس سلسلے میں قریشی صاحب نے چند مثالیں بھی پیش کی ہیں اور زمین کی قسمیں، آلات زراعت،

۱۔ اردو زبان کی تمدنی اہمیت، عبدالرزاق قریشی، ص ۱

۲۔ ایضاً، ص ۱۶

آبپاشی، فصلیں اور پیداوار، فصل خریف کی پیداوار، فصل ربیع کی پیداوار، فصل زائد میں پیدا ہونے والی چیزیں، سبزی اور ترکاری، مویشی، چرند، پرند، درند پر مختصراً بحث کی ہے۔ تجارت سے متعلق لکھتے ہیں:

''ایوان تمدن کا ایک اہم ستون تجارت بھی ہے۔ اس کے فروغ سے زندگی کے مختلف شعبے ترقی پاتے ہیں۔ اس کی بدولت شہروں کی رونق ہے۔ اس کے ذریعہ ملک میں تعلیم کا چرچا ہے۔ اسی کے زور سے علم وفن کی ترقی ہوتی ہے۔ ہندوستان میں قدیم زمانے سے تجارت کا چلن تھا۔ اس لئے ایسے الفاظ خود بخود وجود میں آنے لگے جو تجارتی معاملات کو سمجھا سکیں۔ اردو نے ان میں سے اکثر کو اپنا لیا۔'' [۱]

اس مضمون میں ہندوستان میں جتنے سکّے رائج تھے ان کا ذکر ہے۔ اس کے علاوہ تجارت سے متعلق اپنے عہد کی تمام معلومات اس مضمون میں فراہم کی گئی ہیں۔

باغبانی : باغبانی بالعموم لوگ دلچسپی کے لئے کرتے ہیں۔ مگر اس سے فائدہ بھی حاصل ہوتا ہے۔ باغبانی کے زمرے میں پھل پھول اور کئی طرح کے شجر بھی آتے ہیں۔ جس چیز کا باغ ہوتا ہے اسی حساب سے اس کا نام بھی لیا جاتا ہے۔

پھول: تمدنی زندگی میں پھول کی اہمیت مسلم ہے۔ اس کا استعمال کئی طریقے سے ہوتا ہے۔ ہندوستان میں پھول کی کثرت اور زیادہ تر رنگ اور خوشبو ہر دونوں لحاظ سے بہت اچھے تسلیم کئے جاتے ہیں۔ قریشی صاحب پھولوں سے متعلق لکھتے ہیں:

''پھولوں کی چونکہ تمدنی زندگی میں اہمیت ہے اور عوام وخواص دونوں میں انھیں مقبولیت حاصل ہے اس لئے ادب میں بھی ان کا دخل ہے۔ اور ان کی وجہ سے شعر وسخن کی محفل میں رنگینی اور لطافت پیدا ہوئی۔ ان کے ذکر اور اوصاف سے

۱۔ اردو زبان کی تمدنی اہمیت، عبدالرزاق قریشی، ص ۲۵

دنیا کا کوئی ادیب خالی نہیں۔ اردو میں بھی مختلف عنوان بنا کر بڑی تعداد میں نظمیں لکھی گئی ہیں اور آج بھی لکھی جاتی ہیں۔ اور جب تک پھولوں میں خوشبو، رنگت اور شگفتگی ہے یہ سلسلہ جاری رہے گا۔'' [۱]

اس مضمون میں پھل اور خشک میوے، باغ، سبزہ وغیرہ پر بھی قریشی صاحب نے روشنی ڈالی ہے۔

آداب معاشرت : ہندوستانی معاشرت میں بڑی تیرنگی ہے اور اس میں بہت اتار چڑھاؤ آئے ہیں۔ اجمالی طور پر اس کی پانچ قسمیں کی جاسکتی ہیں۔

۱۔ ہندوانہ معاشرت ۲۔ مسلم معاشرت ۳۔ ہندو اتحاد کے بعد کی معاشرت ۴۔ انگریزی تہذیب سے متاثر معاشرت ۵۔ انگریزی معاشرت۔ ان پانچوں معاشرتوں کا عکس اردو زبان میں دیکھے جاسکتے ہیں۔

اس سلسلے میں سلام و دعا اور آداب گفتگو پر تفصیل کے ساتھ روشنی ڈالی گئی ہے۔

خورد و نوش : قریشی صاحب اس سے متعلق رقم طراز ہیں:

''انسانی زندگی کی سب سے پہلی اور سب سے اہم چیز کھانا ہے۔ اسی ضرورت نے انسان کو محنت و مشقت اور جدوجہد پر آمادہ کیا۔ ابتداً کھانا صرف پیٹ بھرنے کے لئے تھا، لیکن معاشرے کی ترقی کے ساتھ ساتھ یہ کام و دہن کی لذت کا بھی سامان بن گیا اور انسانی ذہن اور شوق نے اس میں ایسی جدتیں اور اختراعات کیں کی باید و شاید مسلمان ہندوستان میں آئے تو اپنا کھانا اپنے ساتھ لائے، جو ہندوستان کے کھانے سے قطعی مختلف تھا۔ یہاں آباد ہو جانے پر انھوں نے ہندوستانی کھانوں کا بھی اثر قبول کیا۔ امتداد وقت کے ساتھ ان کے کھانوں میں غیر معمولی تنوع پیدا ہو گیا۔ اس تنوع کا بڑا سبب یہ تھا کہ ہندوستان میں باہر سے جو مسلمان آئے وہ کسی ایک جگہ کے نہ تھے بلکہ مختلف

۱۔ اردو زبان کی تمدنی اہمیت، عبدالرزاق قریشی، ص ۳۳

ممالک، افغانستان، خراساں، تاتار، بخارا، دشیرہ سے آئے تھے۔ ان مختلف ممالک کے رہنے والوں کے مختلف ذوق کی آمیزش نے طرح طرح کے کھانوں کی ایجاد کی۔ ہندوستانی گرم مسالوں اور سبز اور سرخ مرچوں کے استعمال نے ان کے کھانوں میں ایک نئی لذت پیدا کی جسے چٹخارہ پن کہا جاسکتا ہے۔''[1]

اس مضمون میں قریشی صاحب نے چاول، روٹی، گوشت، مچھلی، انڈا، سبزی، ترکاری، دال، میٹھے کھانے، انگریزی کھانے، ہلکی پھلکی غذا، اچار، چٹنی، مربہ، شربت، مٹھائی، چائے، کافی، قہوہ، کھانا پکانے کی جگہ اور دوسرے لوازم، کھانا پکانے، کھانے اور پانی پینے کے برتن، کھانا کھانے کے آداب اور تکلفات، کھانے کے اوقات، کھانا کھانے کے بعد کے تکلفات، پان، حقہ، اوزاروں کے مختلف نام، کھانے کے مختلف پکوان اور ان کی قسموں کو کافی سلیس اور دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے اور ساتھ ہی شعراء نے کن کن چیزوں کو اپنی شاعری میں شامل کیا ہے ان کا ذکر کرتے ہوئے ان اشعار کو بھی درج کئے ہیں جن میں ان کا ذکر ہے۔

لباس : ہندوستان میں قدیم زمانے سے ہی بہت سادہ لباس پہنا جاتا تھا۔ یہ ستر پوشی کے ساتھ ساتھ راحت و زیبائش اور زیب و زینت کے لئے ہوتا تھا۔ اس مضمون میں قریشی صاحب نے ہر زمانے کے لباس سے بحث کی ہے۔ لباس کے ساتھ ٹوپی، پگڑی، جوتا، کپڑا، شال کا ذکر کیا ہے اور ان کی مختلف اقسام کے بارے میں اپنی معلومات قلم بند کی ہیں۔

لباس کے ساتھ ساتھ اس مضمون میں قریشی صاحب نے عام زیور، مردوں کے زیور، جواہرات، موتی وغیرہ سنار، چوڑیاں، بناؤ سنگھار کی دیگر چیزوں کا بھی اس مضمون میں تفصیل سے ذکر کیا ہے اور ہر زمانے میں اس کے چلن اور رسم و رواج پر روشنی ڈالی ہے۔

مکان : انسان کی بنیادی ضرورت کے ساتھ ساتھ راحت و آسائش اور اظہار شان و شوکت کا ایک ذریعہ

۱۔ اردو زبان کی تمدنی اہمیت، عبدالرزاق قریشی، ص ۵۸

مکان ہے۔اس کی تعمیر میں بتدریج ترقی ہوئی ہے۔ پرانے زمانے میں بسر اوقات کے لئے گھاس پھوس کی ٹٹیاں، جھونپڑیاں بنائی گئیں۔ پھر مٹی کے گھروندے بنے اس کے بعد انسان کی عقل نے ترقی کی اور اینٹ چونے اور گارے کے مکانات تعمیر ہونے لگے۔ عقل نے اور ترقی کی تو پتھر کے ٹھوس شاندار اور نفیس مکانات، حویلیاں اور محلات بننے لگے۔ اور ان میں نقش ونگار اور طرح طرح کے آرائش وزیبائش ہونے لگی۔ ہندوستان میں پہلے صرف ہندوستانی طرز تعمیر کے مکان اور محل ہوتے تھے۔ جب مسلمان اس ملک میں آباد ہوئے تو وسط ایشیائی انداز کی عمارتیں بننے لگیں۔ لیکن وہ ہندوستانی طرز تعمیر سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ وہ ہندوستان کی عمارتوں کی زینت وآرائش، منبت کاری، نقش ونگار وغیرہ سے خصوصاً متاثر ہوئے۔ انگریزوں کی حکومت قائم ہونے کے بعد ملک میں یورپی انداز کی عمارتیں بھی بننے لگیں۔ مگر عمارتوں اور ان کے مختلف حصوں کے نام جو اردو زبان میں داخل ہوئے اور کثرت سے مستعمل ہیں، زیادہ تر فارسی میں یا فارسی کی مدد سے بنائے گئے ہیں۔ ان عمارتوں کے نام اور ان کے متعلقات کے نام درج ہیں۔

اس کے علاوہ قریشی صاحب مکان کی مختلف قسمیں نقش ونگار اور آرائش وزیبائش، اینٹ اور پتھر، معمار، محلوں، حویلیوں وغیرہ کے نام، کتبہ، خانہ باغ، نوکر اور نوکرانیاں وغیرہ بھشتی، حلال خور، خیمے اور شامیانے وغیرہ سے متعلق اپنی معلومات کو تفصیلی انداز میں پیش کیا ہے۔

سواریاں : سواری انسان کی ضروریات زندگی میں داخل ہے۔ اس کے علاوہ شان وشوکت کے اظہار کا ایک ذریعہ بھی ہے۔ مکان کی طرح سواری میں بھی انسان نے زمانہ قدیم سے زمانہ جدید تک میں کافی تبدیلیاں پیدا کیں۔ پہلے انسان جانور کی پشت پر سواری کرتا تھا۔ پھر ترقی کرتے ہوئے گاڑی بنائی جس کو جانور کھینچتے تھے۔ سائنس نے ترقی کی تو بائیسکل، موٹر بائسکل، ریل، موٹر، ہوائی جہاز وغیرہ ایجاد کئے۔ ان سواریوں کے ذریعہ اردو زبان کے ذخیرہ میں نئے نئے الفاظ اور ترکیبوں کا اضافہ ہوا۔ سواریوں کے ضمن میں گھوڑا، ہاتھی، اونٹ، بہل، دوسری سواریوں کے ضمن میں پالکی، نالکی، دینس (فینس) تام، جھام، چنڈول (چوڈولی)، چوپہلا، سکھ پال، ڈولا، ڈولی، مہاڈول، سنگھاسن ہوادار، تخت رواں وغیرہ کا ذکر

ہے۔اس کے علاوہ وہ کشتی اور جدید سواریوں کا بھی ذکر ہے۔

مشاعرے : ہندوستانی تمدن کا ایک اہم نمائندہ مشاعرہ ہے۔اس پر قریشی صاحب نے نظر ڈالی ہے۔ چنانچہ اس پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''مشاعرے ہندوستان کی تمدنی زندگی میں خاص اہمیت کے حامل رہ چکے ہیں۔کسی زمانے میں ہر امیر کا دیوان خانہ علم وادب کی محفل ہوتا تھا۔معاصرانہ چشمکیں، حاضر جوابی، بدیہہ گوئی، مجلس کی رونق کو بڑھانے کا سامان تھیں۔ پہلے اسے مراحیہ یا مجلس ریختہ کہا کرتے تھے۔''[۱]

مشاعرے کی اہمیت سے متعلق مولوی عبدالحق کے خیالات کو بھی اس مضمون میں بیان کیا گیا ہے۔

رسم ورواج : ا۔ولادت بچپن وغیرہ کی رسمیں۔رسم ورواج سے متعلق قریشی صاحب لکھتے ہیں کہ ہر قوم کی معاشرتی زندگی کی ایک اہم اور نمایاں خصوصیت اس کی رسمیں ہیں متوسط اور نچلے طبقے میں خصوصاً انہیں زیادہ اہمیت حاصل ہے۔اہل ہند کے یہاں بھی بیسیوں رسمیں ہیں۔مسلمان اس ملک میں وارد ہوئے تو اپنے ساتھ اسلام کا سیدھا سادہ طریق زندگی لے کر آئے۔لیکن یہاں آباد ہو جانے کے بعد انھوں نے بھی آہستہ آہستہ برادران وطن کی بہت سی رسموں کو اپنا لیا۔بہت سی رسمیں ان کی اصل شکل میں لیں اور بہت سے رسموں میں ردوبدل یا اضافے کئے۔

رسم ورواج کے سلسلے میں قریشی صاحب نے نوماسا، مریم کا پنجلہ، کالا دانہ، کلاوہ، آنول پال، جاپ، قصابہ، اذان، تھالی، گھٹی، جچا گیری، زچہ گیری، گیت، بدھاوا، چھٹی، عقیقہ، تاوے دکھانا، مرگ مارنا، چوبہ چکھانا، رت جگا، بگیر بچہ، چھوچھک، چلہ، چھوچھک، پانوں بچھرے جانا، کھیر چٹائی، سال گرہ، دودھ بڑھائی، ختنہ، ناک کان چھدوانا، بسم اللہ خوانی، ہدیہ، روزہ کشائی، موچھوں کا کونڈا وغیرہ سے متعلق اپنی معلومات قلم بند کئے ہیں۔

ا۔ اردو زبان کی تمدنی اہمیت، عبدالرزاق قریشی، ص ۱۶۵

اس مضمون کا دوسرا حصہ شادی بیاہ کی رسمیں

شادی بیاہ میں بیسیوں رسمیں ادا کی جاتی ہیں۔ ہندو مسلمان دونوں ان رسموں کو ادا کرتے ہیں۔ اور یہ ان کی معاشرتی زندگی کا ایک لازمی جز بن گئی ہیں۔ ان رسموں کی بدولت اردو زبان کے خزانے میں کافی اضافہ ہوا۔ جس کا ذکر قریشی صاحب نے تفصیل سے کیا ہے۔ جس میں پیٹوں کا پنج، ٹھیکرے کی مانگ، ہات یا بیاہ مانگنا، بر دکھائی (دکھوا)، منگنی، لگن دھرنا، دہلیز کدوانا، مانجھے بیٹھانا (بیٹھنا)، بالوں بیٹھانا (بیٹھنا)، سہاگ گھوڑیاں، ابٹنا کھیلنا، بری یا ساچق ریت کا جوڑا، سہاگ پرا، مہندی، شاہانہ، بندھوار، تھاپا، کلاوہ، آچمن، تیل چڑھانا، تیل بان، برات، گھڑ چڑھی، آتش بازی، ٹٹیاں، رقص و سرور، نکاح، شب گشت، پھیرے، آنچل گانٹھ، انگ ملائی، پٹیا پھیرنا، سہرا، سلامی، جہیز، وار پھیر، بکھیر، ریت و رسم، جلوہ، آرسی، مصحف، اکیس پان کا بیرا، سمدھنوں کی ہنسی مذاق، رخصتی، باڑ رکائی، منھ دکھائی، ست کورے کی کھیر، سہاگ کی رات، دعوت ولیمہ، کندوری، پکی، تقسیم پان، چوتھی، پھولوں کی چھڑی، سیٹھیں، دولھن کا نام، چکٹ اتروائی، چالا، گونا، چنداور رسمیں، عیدی، جڑاول، ساونی، اگہنی، بدھاوا وغیرہ رسموں کا ذکر بڑے دلچسپ انداز میں مفصل طریقے سے کیا گیا ہے۔

تیسرا حصہ میت کی رسموں سے متعلق ہے جس پر قریشی صاحب نے تفصیلی انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ چوتھا حصہ توہمات کی بنیاد پر رسموں سے متعلق ہے جس میں تعویذ اور گنڈا، ارواح خبیثہ، جادو یا سحر، نچھاور اتارنا، بلائیں لینا، ماتھے پر ٹیکا لگانا، چھینکنا، چیچک پاتراب، چاب وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔

تہوار جشن وغیرہ : آدمی کو سماجی جانور کہا گیا ہے۔ وہ تنہا زیادہ دیر تک نہیں رہ سکتا۔ وہ خود بولنا چاہتا ہے اور دوسروں کی باتیں سننا پسند کرتا ہے۔ دوسروں سے ملنے جلنے اور ہنسنے بولنے سے آدمی کی تفریح ہوتی ہے۔ یہ تفریح کبھی اس کی خوشی کا باعث ہوتی ہے اور کبھی اس کے غم کو دور کرنے کا سبب بنتی ہے۔ وہ جب کام سے فارغ ہوتا ہے تو خصوصاً دوست احباب میں بیٹھ کر خوش طبعی کرنا پسند کرتا ہے۔ اس کی یہ تفریح انفرادی سے بڑھ کر اجتماعی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ دنیا کی ترقی کے ساتھ ساتھ اس کی تفریح اور اس کے

ذرائع میں اضافہ اور تنوع ہوتا گیا۔ کبھی اس نے اپنے کسی بزرگ کی پیدائش کے دن خوشی منائی کبھی اپنے کسی پرکھے کی فتح کا جشن منایا۔ کبھی کسی مقدس موقع پر نماز دوگانہ ادا کی، کبھی موسم کی خوشگوار تبدیلی پر رقص وسرور کی محفل گرم کی۔ رفتہ رفتہ یہ خوشیاں یہ جلوس آدمی کی معاشرتی زندگی کا ایک اہم جز بن گئے، اور میلے اور تہوار کے نام سے موسوم ہوئے۔ قریشی صاحب نے ان تہواروں کے نام کثرت سے درج کئے ہیں جو اردو میں عام طور سے استعمال ہوتے ہیں جس میں چیت نومی، رکھشا بندھن، ہر پال، تیج، درگا پوجا، جنم اشٹمی، کنھیا جی کی راس، دسہرہ، دیوالی، رام نومی، رام لیلا، سیوراتری، کھچڑی، بلدیو جی کا میلہ، کمبھ کا میلہ، ہولی، آٹھوں کا میلہ وغیرہ۔

مسلمانوں کی تقریبات زیادہ تر دینی ہیں جن میں عیدین (عید الفطر اور عید الاضحیٰ) مسلمانوں کی سب سے اہم تقریب ہیں۔ ان کے علاوہ عید ملاد النبی، عید عذیر، محرم، امام باڑہ، شب برات، نوروز، پھول والوں کی سیر، جشن تولد پسر، جشن سالگرہ، جشن غسل صحت، عرس کا ذکر ہے۔

فنون حرب کھیل تماشا وغیرہ : آدمی طبعاً تفریح پسند ہے۔ اس لئے روزانہ کے کاروبار سے فرصت پانے کے بعد وہ تفریح کا سامان تلاش کرتا ہے۔ شجاع قوموں کی تفریحات بھی شجاعانہ ہوتی ہیں۔ اس کی بزم بھی بزم کی شان سے خالی نہیں ہوتی۔ میدان جنگ میں وہ جو اسلحے استعمال کرتا ہے ان میں سے بعض دلچسپ مشغلے کے طور پر بھی استعمال کرتا ہے۔ اس طرح تفریح کے لمحات میں بھی اس نے رزمیہ فنون کو برقرار رکھا۔ ہندوستان میں جن رزمیہ فنون کا رواج تھا وہ حسب ذیل کا ذکر کیا گیا ہے۔

لکڑی، پٹا، بانا، بنوٹ، بینٹھی، بانک، جل بانک، برچھا، بلم، کٹا، تیراندازی، بکینتی، سیف اندازی اور کشتی وغیرہ۔ تیراکی، گھوڑ دوڑ، شکار، درندوں اور چڑیوں کی لڑائی، پرندوں کی لڑائی، پتنگ بازی، آتش بازی، جھولا یا ہینڈولا، روزانہ کے کھیل میں گلی ڈنڈا، کبڈی، داؤ بازی، کرکٹ، ہاکی، فٹ بال، والی بال، باسکٹ بال، ٹینس وغیرہ کا ذکر کیا ہے۔

فنون لطیفہ : اس مضمون میں قریشی صاحب لکھتے ہیں:

''اولاً آدم میں کم لوگ ملیں گے جو فنون لطیفہ سے دلچسپی نہ رکھتے ہوں۔ تعلیم یافتہ طبقے سے لے کر ان پڑھ دیہاتی تک کسی نہ کسی درجے میں ان سے دلچسپی رکھتا ہے اور لطف اندوز ہوتا ہے۔ فنون لطیفہ کی کئی قسمیں ہیں۔ مثلاً موسیقی، مصوری، رقص وسرور وغیرہ۔ اپنی اپنی افتادِ طبع کے مطابق ان میں سے کسی ایک سے یا دو سے یا دو سے زائد سے وہ دلچسپی لیتا ہے۔ چونکہ فنون باقاعدہ فن کی حیثیت اختیار کر چکے ہیں اس لئے ان کی اپنی اپنی اصطلاحات ہیں جو زبان کو مالدار بناتی ہیں۔ اردو زبان کا خزانہ بھی ان فنون کی اصطلاحات کے جواہر سے خالی نہیں۔'' [۱]

اردو زبان کی چند مزید خصوصیات: اس سلسلے میں قریشی صاحب لکھتے ہیں: اردو زبان کا مکمل ڈھانچا اس وقت بنا جب ملک کی تہذیب پر ایرانی تہذیب کے اثرات نمایاں اثر ڈال چکے تھے۔ اردو نے بھی یہ اثر قبول کیا۔ اس کے علاوہ علمی طبقے میں عربی اور فارسی کا اثر زیادہ رہا۔ رفتہ رفتہ عوام نے بھی اس اثر کو قبول کیا جس میں درج ذیل دعائیہ کلمات کا استعمال اب عام ہے مثلاً زندوں کے لئے اور مردوں کے لئے کیسے کلمات استعمال کئے جائیں ان سب کا ذکر ہے۔ اس کے علاوہ عام الفاظ کا شستہ استعمال، لطافت زبان، تاریخی الفاظ، مقامات کے تاریخی نام، ضلعوں اور شہروں کے نام، قصبوں اور دیہاتوں، راستوں اور محلوں کے نام، معرض اشیا کے نام ان کے موجد کا نام، آدمیوں کے نام، ہندو مردوں کے نام، مسلمان عورتوں کے نام، ہندو عورتوں کے نام، القاب، سیدوں کے القاب، شیخ کے القاب، مغل، پٹھان، انگریزی اثر سے لقب کا استعمال، صنعتوں اور اہل حرفہ کے نام، اردو میں انگریزی کے الفاظ، یونانی الاصل الفاظ، لاطینی الاصل الفاظ، یونانی الاصل لاطینی الفاظ، انگریزی اصل کے الفاظ، ڈچ اصل کے الفاظ، جرمن اصل کے الفاظ، اطالوی اصل کے الفاظ، اسپینی اصل کے الفاظ چند مزید الفاظ، ان تمام عنوانات پر مختصراً بحث کی ہے۔

۱۔ اردو زبان کی تمدنی اہمیت، عبدالرزاق قریشی، ص ۲۳۴

قریشی صاحب کی اس کتاب سے متعلق پیش لفظ میں سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب لکھتے ہیں:

''جناب شاہ معین الدین احمد ندوی مرحوم سابق ناظم دارالمصنفین کے ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد کی ایک کانفرنس میں اردو زبان کی لسانی علمی اور تمدنی اہمیت کے عنوان سے ایک مقالہ پڑھا تھا جو کمیت کے لحاظ سے زیادہ طویل نہ تھا۔ لیکن اپنی کیفیت کے بنا پر مقبول ہوا۔ اور شوق سے سنا گیا۔ جناب عبدالرزاق قریشی صاحب نے اس مقالہ سے پوری دلچسپی لی اور انجمن اسلام بمبئی کی ملازمت کے زمانہ میں اس سے متاثر ہوکر علیحدہ علیحدہ ابواب قائم کر کے انجمن کے رسالہ نوائے ادب میں مضامین لکھنا شروع کیا۔ کچھ غیر مطبوعہ مسودہ ان کے پاس رہ گیا۔ اس کے کچھ ابواب لکھنا چاہتے تھے مگر لکھ نہ سکے۔''

انجمن اسلام کی ملازمت سے سبکدوش ہونے کے بعد دارالمصنفین میں رفیق کی حیثیت سے آنے کے لئے تیار ہوگئے تھے۔ یکا یک جولائی ۱۹۷۷ء میں اللہ کو پیارے ہوگئے۔ مگر وصیت کر گئے کہ ان کے اور مسودوں کے ساتھ زیر نظر کتاب کا مسودہ بھی دارالمصنفین پہنچا دیا جائے۔ جو نامکمل سہی لیکن یہ چھپ کر ناظرین کے ہاتھوں میں ہے۔ مصنف مرحوم کی پوری زندگی بمبئی میں گزری لیکن ہاتھ میں قلم پکڑ لیتے تو معلوم ہوتا کہ دارالمصنفین میں بیٹھ کر سب کچھ قلم بند کر رہے ہیں۔ ان کا طرز تحریر بالکل دبستان شبلی ہی کے رنگ کا ہے۔ اس لئے امید کرتا ہوں کہ یہ کتاب دلچسپی سے پڑھی جائے گی۔ جس طرح ان کی کتاب مرزا مظہر جان جاناں اور ان کا کلام پڑھی گئی۔''[۱]

قریشی صاحب کی یہ کتاب فہرست و مضامین کے اعتبار سے طویل ہے جو مصنف کی جانفشانی،

۱۔ پیش لفظ، اردو زبان کی تمدنی اہمیت، عبدالرزاق قریشی، ص ا

وسعت مطالعہ اور تحقیق و جستجو اور لگن کا پتہ دیتی ہے۔ اس کتاب کے مطالعہ سے اردو بولنے والوں خصوصاً مسلمانوں کی تمدنی اور تہذیبی زندگی کا نقشہ سامنے آجاتا ہے۔ بعض الفاظ جن کو ہم اب روزانہ استعمال کرتے ہیں ان کی صلاحیت معلوم کر کے حیرت ہوگی۔ مثلاً لفظ گھٹیا کا استعمال عام ہے۔ اس کتاب سے معلوم ہوا کہ گھٹیا سور کا بچہ کہلاتا ہے۔ اسی طرح مالن کے لئے سہاگن، نہایت کامیاب کے لئے بختاور، قمار خانہ کے لئے پنڈت خانہ، ولدالزنا کے لئے ثالث بالخیر، چورگرہ کٹ کے لئے صبح خیزی، طوائف اور ارباب نشاط کے لئے گل ولالہ، آموں کے بڑے باغ کے لئے امریا، اور خربوز کے بڑے کھیت کے لئے فالیز کے اصطلاحات ہیں۔ مگر ان کے حوالے نہیں دیئے گئے ہیں۔ کسی زمانہ میں مستعمل رہی ہوں گی مگر اب غالباً استعمال میں نہیں ہیں۔

اس کتاب کا انتساب قریشی صاحب مرحوم کی وصیت کے مطابق شاہ معین الدین ندوی کے نام سے کیا گیا ہے۔ اس کتاب کے ماخذ و مراجع میں ۲۴ کتابوں سے استفادہ کیا گیا ہے۔

اردو غزل۔ یوسف حسین خاں

غزل اردو کی تمام اصناف شاعری میں فنی و جمالیاتی خصوصیات کے ساتھ تاریخی اعتبار سے بھی امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ دکن میں ولؔی اور ان کے ہمعصروں کے بعد شمالی ہند میں اٹھارہویں اور انیسویں صدی کے دوران غزل کے فن کو کافی ترقی حاصل ہوئی۔ اور بیسویں صدی میں افسانوی اور نثری ادب کی ترقی کے باوجود غزل گو شعرا نے صوری و معنوی طرز پر فن سخن گوئی کے نئے نئے جوہر دکھائے۔ گزشتہ تین صدیوں کے دوران نہ صرف اردو غزل کے موضوعات میں وسعت و معنویت پیدا ہوئی بلکہ روح سے مطابقت کے پہلو بھی نمایاں ہوئے۔

غزل کے حق میں تاثراتی تنقید کا ردعمل جوش ملیح آبادی، عندلیب شادانی اور عظمت اللہ خاں کی تنقیدوں میں واضح طور پر نمایاں ہے۔ مخالفت کا یہ انداز کلیم الدین احمد کے یہاں زیادہ شدت سے نظر آتا ہے۔ لیکن دوسری طرف غزل کے پرجوش حامیوں میں رشید احمد صدیقی، آل احمد سرور، ڈاکٹر یوسف حسین

خاں، اختر انصاری، ڈاکٹر محمد احسن اور وزیر آغا نے غزل کی اہمیت اور اس کے شعری وفنی وسعتوں کا احساس دلایا ہے۔

ڈاکٹر یوسف حسین خاں کا تعلق حیدر آباد، علی گڑھ اور دہلی جیسے اردو مرکز سے رہا ہے۔ آپ ایک اچھے ادیب، بلند مرتبہ مورخ اور نامور قاری تھے۔ آپ کا انداز فکر عالمانہ اور اسلوب تنقید تجزیاتی ہے۔ آپ کی تحریروں میں ادب بھرپور ہے۔ آپ کی مشہور تصنیف ''اردو غزل'' سب سے پہلے ۱۹۴۹ء میں حیدر آباد سے شائع ہوئی۔ دوسرا ایڈیشن ۱۹۵۲ء میں مکتبہ جامعہ دہلی نے شائع کیا اور تیسرا ایڈیشن ۱۹۵۷ء میں انجمن ترقی اردو (ہند) نے شائع کیا۔

یوسف حسین خاں مرنجان مرنج شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ادب میں انتہا پسندی یا افراط وتفریط کے قائل نہ تھے۔ عام طور پر وہ غزل کے حامیوں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ غزل کے مخالفوں کو آپ نے دلائل سے قائل کرنے کی سعی بھی کی ہے۔ تحسین غزل اور تفہیم غزل میں آپ کا کارنامہ قابل قدر ہے۔ آپ نے گزرے دنوں میں صنف غزل کے ممکنات کی طرف جو اشارے کئے تھے وہ پورے ہوتے نظر آرہے ہیں۔ اس لحاظ سے یہ دعویٰ کیا جاسکتا ہے کہ پچھلے دنوں غزل کو جو احیاء نصیب ہوا اس میں یوسف حسین خاں کی کتاب کا بھی حصہ ہے۔

اردو غزل اپنی نوعیت کی پہلی جامع اور مبسوط کتاب ہے جس میں غزل کی تاریخ وارتقاء سے بحث کے بجائے اس کی ماہیئت، فنی امکانات، بنیادی وثانوی موضوعات پر سیر حاصل تبصرہ ہے۔ مصنف نے غزل کو عالمی عشقیہ شاعری کے پس منظر میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ غزل کے سماجی محرکات اور اس فن کے مستقبل پر آپ کے تنقیدی خیالات آپ کی روشن خیالی کی دلیل ہے۔ یہ کتاب ۶۵۰ صفحات پر مشتمل ایک مبسوط تاریخی وتنقیدی جائزہ ہے۔ اس میں غزل کے لامحدود احسانات، اس کے جمالیاتی محرکات، موضوع اور ہیئت اور اس کے حسن مطالب پر نہایت بلند پایہ بحث کی گئی ہے۔ اس کتاب میں ولی اورنگ آبادی سے لے کر جدید غزل گو شعرا بشیر بدر تک کے کلام کا عمدہ انتخاب بھی دیا گیا ہے اور ایسی منفرد غزلیں پیش کی ہیں

جن سے ان کی انفرادیت ظاہر ہوتی ہے۔

اردو غزل میں غزل اور نظم کے عنوان کے تحت ریویو کرتے ہوئے یوسف حسین خاں نے یہ دعویٰ کیا ہے کہ گزشتہ دو برس میں میر صاحب کے زمانہ سے لے کر حسرت اور جگر کے موجودہ دور تک اردو غزل کے اسلوب میں برابر تبدیلیاں ہوتی رہی ہیں۔ لیکن اس کی بنیادی حقیقت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ جس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ یہ صنف سخن اپنی اصلی حیثیت کو برقرار رکھتے ہوئے مختلف حالات سے مطابقت کی صلاحیت رکھتی ہے جو اس کے جاندار ہونے کا ثبوت ہے۔

یوسف صاحب کے مطابق غزل ہمارے ادبی مزاج میں اس قدر داخل ہو چکی ہے کہ اس سے قطعی طور پر بے تعلق ہو جانا ممکن نہیں لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ غزل زندگی کے تقاضوں کا ساتھ دے۔ آج غزل کے احساس و تاثر کو جس دنیا سے واسطہ ہے وہ دو سو برس کی دنیا سے بالکل بدلی ہوئی ہے۔ علم حکمت نے انسانی زندگی اور کائنات کی توجیہ میں انقلاب برپا کر دیا ہے جس سے شاعر کی جذباتی زندگی اور اس کے خیالات متاثر ہوں گے اور یہ شاعر کا منصب ہے کہ علم و حکمت کو اپنے جذبے اور تخیل سے وابستہ کر کے امتزاجی بصیرت عطا کرے۔ اس سلسلے میں یوسف صاحب رقمطراز ہیں:

> ''شاعری نے دنیا میں ہر جگہ لوگوں کے بدلتے ہوئے شعور و احساس کا ساتھ دیا ہے تا کہ وہ ذہنی زندگی سے بے تعلق نہ ہو جائے۔ غزل کا آرٹ بھی سکونی آرٹ نہیں جہاں تھا وہیں رہے۔ زندگی کی طرح وہ حرکت اور نمو میں رچا ہوا ہے۔ اسی واسطے اس کی معنیٰ آفرینیوں کی کوئی حد نہیں۔ علم و حکمت کی ترقی کے ساتھ ساتھ جوں جوں ذہن کی جلا بڑھے گی اس کا اثر ضرور ہے کہ ہمارے احساس و تخیل پر بھی پڑے۔ جب احساس و تخیل متاثر ہوں گے تو غزل کے محرک بھی بدلیں گے اور اس کے رموز اور علامتوں کی توجیہ بھی بدلے گی اور اس طرح نئے نئے خیال اور جذباتی حقیقتوں کی باز آفرینی کا سلسلہ جاری رہے گا۔'' [۱]

۱۔ اردو غزل، یوسف حسین خاں، ص ۱۶

یوسف صاحب کے نظریات کے پیش نظر غزل گو شعرا کی چال نظم گو شعراء کی رفتار سے کچھ الگ ضرور رہتی ہے۔ نظم لکھنے والوں کی رفتار اس کی باتوں کی طرح سیدھی سادی ہوگی اور غزل گو ہمیشہ ڈگمگاتا ہوا مستانہ وار چال چلے گا۔ اس کے قدم سیدھے اٹھ ہی نہیں سکتے۔ اس کے قدم کی ہر لغزش اس کے دل کی دھڑکن کی آئینہ دار ہوگی۔ چونکہ دل زندگی کا مرکزی نقطہ ہے اس لئے اس کی نغمہ سرائی چاہے بظاہر زندگی سے بے تعلق سی معلوم ہو لیکن حقیقت میں اصل حیات سے ہم آہنگ ہوگی۔ وہ جذبے کی طرح مبہم رہے گی مگر اس کی تاثیر بے پناہ ہوگی۔ ان کے نظریہ کے مطابق یہ بات غلط ہے کہ ہمارے ادب میں غزل کو ترجیح دی جانی چاہئے یا نظم کو۔ دراصل دونوں کا اپنا اپنا مقام ہے اور اپنا حق ہے جس سے انھیں محروم نہیں کرنا چاہئے۔

مولانا حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں غزل پر جو تنقید کی ہے وہ اصلاحی محرک کے تحت تھی نہ کہ ادبی مقاصد کے تحت، انہیں غزل پر سب سے بڑا اعتراض یہ تھا کہ یہ حسن و عشق کے معاملات کی شاعری ہے۔ ان کے نزدیک عشق بے کاری کا مشغلہ ہے لیکن یہ نقطہ نظر سطحی تھا۔ مولانا حالؔی کی نیک نیتی اور اخلاص میں شبہ نہیں۔ لیکن اس ضمن میں ان کا مشورہ قابل قبول نہ تھا۔ یہ بات ہمارے ادبی مزاج کی صحت پر دلالت کرتی ہے کہ مولانا حالؔی کے مشورے کو قبول نہیں کیا گیا۔ اگر قبول کیا جاتا تو ہماری زبان حسرت اور جگر، فانی اور اصغر کی زمزمہ سنجی سے محروم رہ جاتی اور یہ ایک ناقابل تلافی نقصان ہوتا۔

مولانا حالی نے اردو زبان و ادب اور عام طور پر مسلمانوں کی قومی زندگی کی اصلاح اور اخلاق کو سدھارنے کے لئے صاف اور عام فہم نظمیں لکھیں۔ مولانا کی رائے کو آج دلیل کے طور پر پیش کرنا درست نہیں۔ وہ صرف عارضی اور ہنگامی حالات کا نتیجہ تھی۔ انھوں نے غزل کے جو نقائص بتائے ہیں ان میں سے تو بہت سے نقائص کو غزل کے حامیوں نے تسلیم کیا ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ اس صنف میں طبع آزمائی کرنے والے کی غزل اعلیٰ درجے کی ہونی چاہئے۔ نظم اوسط درجے کی گوارا کی جاسکتی ہے لیکن غزل نہیں۔

مولانا حالی نے ادبی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اور نظم کو اظہار خیال کا ذریعہ بنایا۔ حالؔی کے بعد اقبال نے اسے اعلیٰ مقام پر پہنچایا لیکن اس زمانے میں غزل بھی بیٹھی نہیں رہی۔ غالبؔ کے بعد داغؔ، امیرؔ، شادؔ،

حسرتؔ، فانیؔ، اصغرؔ اور جگرؔ نے اپنے اپنے انداز میں اسے سنوارا اور نکھارا اور اسے بلند مقام عطا کیا۔

ترقی پسند تحریک کے زیر اثر غزل کے مقابلے میں نظم کو فوقیت حاصل ہوئی۔ یوسف حسین کے مطابق اس دور میں ترقی پسند نوجوانوں کو غزل کے مقابلے میں نظم اس لئے پسند ہے کہ اس کا لکھنا نسبتاً آسان ہے۔ وہ غزل کی محنت سے بچنا چاہتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ آزاد نظم اور عاری نظم کو اردو میں رائج کرنا چاہتے تھے تاکہ وزن اور قافیے سے بے نیازی برتی جا سکے۔ لیکن غزل بہت جلد آزمائشی دور سے باہر نکل گئی۔ نئی نسل کے اچھے غزل گو شعراء پیدا ہونے لگے اور اس کا مستقبل اس کے امکانوں کی وجہ سے روشن نظر آنے لگا اور غزل ہر حلقے میں مقبولیت حاصل کرنے لگی۔ غزل اور نظم کے آپسی تنازعہ کے سلسلے میں یوسف حسین نے ایک خاص نقطۂ نظر کی طرف اشارہ کیا ہے۔

> ''ایک لحاظ سے دیکھا جائے تو پچھلے پچیس تیس برس میں غزل نے نظم پر اور نظم نے غزل پر اپنا اثر ڈالا ہے۔ غزل کی ریزہ کاری اگرچہ حقیقت میں کوئی عیب نہیں لیکن پھر بھی تسلیم کرنا پڑے گا کہ جدید زمانے کی زندگی کا رجحان کلام میں تسلسل کا متوقع رہتا ہے۔ کچھ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ غزل میں ایک قسم کا تسلسل پیدا کیا جائے گا۔ اور منفرد شعروں کے پس منظر میں وحدت احساس کی کارفرمائیاں بڑھتی جائیں گی۔ اور اس کے ساتھ ساتھ نظم بھی اپنے اندر رمز و کنایہ اور موسیقیت کے ذریعہ تغزل کی صفات پیدا کرنے کی کوشش کرے گی اور اس طرح دونوں اصناف ایک دوسرے کے قریب آجائیں گے۔''[1]

وضاحت کے طور پر موصوف نے اقبال اور حسرت کی شاعری سے مثالیں دی ہیں۔ ان کے بقول اقبال کی نظم میں تغزل کی خوبی اور حسرت کی غزل میں نظم کا معنوی تسلسل صاف طور پر نظر آتا ہے۔

درون بینی اور رمزیت کے عنوان کے تحت اردو غزل پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

۱۔ اردو غزل، یوسف حسین خاں، ص ۲۴

''غزل کی ایک خاص خصوصیت یہ ہے کہ اس میں حد درجے کی درون بینی پائی جاتی ہے۔غزل گو جو کچھ کہتا ہے اپنے آپ میں ڈوب کر کہتا ہے۔اس کا حیات وکائنات کا نقطۂ نظر داخلی ہوتا ہے۔وہ اپنے دل کی دنیا کی سیر میں ایسا منہمک ہوتا ہے کہ اسے اوپر نظر اٹھانے اور خارجی عالم کا مشاہدہ کرنے کی فرصت اور ضرورت نہیں رہتی۔ وہ اپنی ذات میں سب کچھ پالیتا ہے.....غزل گو شاعر کے نزدیک تخیل ہی اصل حقیقت ہے جس کی مدد سے اس کے دل کی دنیا میں ہمیشہ رونق اور چہل پہل رہتی ہے۔ اور اس کے اندرونی تجربوں میں بصیرت پیدا ہوتی ہے.....شاعر اپنے اندرونی تجربے کو لفظوں کے ذریعہ ظاہر کرتا ہے جو بس ایک حد تک اس کا ساتھ دیتے ہیں۔ان کی منطقی ترتیب جذبے کے اظہار کی راہ میں بڑی رکاوٹ بن جاتی ہے۔ ہماری زبان چاہے کتنی ہی منجھی ہوئی اور ترقی یافتہ کیوں نہ ہو اس میں یہ صلاحیت کبھی نہیں آسکتی کہ ان نغموں کو ظاہر کرے جو دل کی وادیوں میں گونجتے ہیں۔غزل گو شاعر رمزی علامتوں کی مدد سے اس کوتاہی کو دور کرنے کی کوشش کرتا ہے۔''[1]

یوسف حسین صاحب نے غزل کی کیفیات کی تشریح علم نفسیات کی روشنی میں کرنے کی کوشش کی ہے۔ان کے نزدیک غزل کا شعر اندرونی تجربے کا اظہار ہوتا ہے۔چنانچہ وہ تحریر کرتے ہیں:

''تخلیقی تخیل کی بدولت غزل کے شعر میں زندگی کے تجربے کے کسی خاص لمحے کا اظہار ضروری ہے جو شعور اور تحت شعور کے تانے بانے کی ملاوٹ سے بنتا ہے۔زندگی کے اندرونی تجربوں اور ان کی متعلقہ کیفیتوں کو موسیقی میں سمو کر تاثر انگیز انداز میں بیان کرنا غزل کے شعر کا مقصد ہونا چاہئے۔ دل کے

۱۔ اردو غزل، یوسف حسین خاں، ص ۲۷۔۲۸

اندرونی تجربوں میں تخیل اور جذبے کی ایسی آمیزش ہوتی ہے کہ وجدان ہی
اس کیفیت سے عہدہ برآ ہوسکتا ہے اور اسی کا اظہار غزل میں ہوتا ہے۔ ایسا
معلوم ہوتا ہے کہ شاعر کو دائمی طور پر زندگی کے طلسماتی عنصر کی تلاش رہتی ہے۔
فطرت کے طلسم دل کے طلسم کے آگے ہیچ ہیں۔'' [۱]

چنانچہ غزل گو شاعر اپنے میٹھے نغموں سے انسانی دل کے طلسماتی پیکروں کو لفظوں میں ڈھال کر ہمارے سامنے پیش کرتا ہے۔ اسی واسطے غزل گو شاعر کے تجربوں میں تخیل اور جذبہ آغوش در آغوش نظر آتے ہیں۔ اور اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ غزل اردو تو کیا دنیائے اردو کی تمام عشقیہ شاعری میں اپنی شدید داخلیت کی وجہ سے مخصوص انفرادیت رکھتی ہے۔

غزل گو شاعر کی درون بینی کے اصل عناصر تخیل اور جذبہ ہیں۔ تخیل میں یہ قوت ہے کہ وہ طلسمی یا غیر مرئی حقائق کو.....جیتی جاگتی شکل میں ہماری نظر کے سامنے لے آئے۔ تخیل ایک نہایت ہی لطیف، نازک اور پیچیدہ حقیقت ہے اور وہ ایسے اسباب پر منحصر ہوتا ہے جن پر عقل کو قابو نہیں ہوتا۔ اس کی تخلیقی اور اختراعی قوت معمولی اور ظاہری واقعات میں ایسے ایسے نکتے اور باریکیاں تلاش کر لیتی ہے کہ انسان کی عقل حیران و پریشان ہو جاتی ہے۔ غزل گو شاعر کا طرز استدلال منطقی استدلال سے جدا ہوتا ہے۔ وہ جذباتی طور پر فکر کرتا ہے نہ کہ منطقی طور پر۔ وہ جو رمزی کیفیت پیدا کرتا ہے اس کے باطنی تخیل کا نتیجہ ہے، نہ کہ حسی تجربے کا۔

یوسف صاحب کا ماننا ہے کہ وہ حقائق جن کا تعلق جذباتی یا روحانی لطائف سے ہے ان حقائق کی روح کو صرف علامتوں سے ظاہر کرنا ممکن ہے۔ یہ علامتیں کبھی رنگ وخطوط کی شکل اختیار کرتی ہیں کبھی لے اور آہنگ کی۔ اس کے علاوہ تخیل کا حافظے سے بھی گہرا تعلق ہوتا ہے۔ جذبہ اور تخیل دونوں غنائی شاعری میں اہمیت رکھتے ہیں۔ تخیل انسان کے جذبات کا اندرونی ابھار ہے۔ ایک قادرالکلام شاعر کے یہاں

۱۔ اردو غزل، یوسف حسین خاں، ص ۲۹

جذبہ وتخیل مل کر ایک ہو جاتے ہیں۔ اور وہ اپنے طلسمی اعجاز سے تخیل کو جذبات زدہ ہونے سے بچالیتا ہے۔ تغزل میں جذبہ اور تخیل کے علاوہ حسی تجربے کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ بعض شاعروں نے اس کو بطور قدر پیش کیا ہے۔ وہ اپنے حسی تجربے میں کسی دوسرے عنصر کی آمیزش کرنا چاہتے ہیں۔ اردو شاعروں میں جرأت اور داغ میں یہ رجحان صاف نظر آتا ہے۔ انھوں نے حسی تجربے کو اجاگر کرنے میں تخیل سے مدد لی۔ میر، غالب، مومن اور حسرت کے یہاں حسی تجربے جذبے میں تحلیل ہو گئے ہیں جو تحت شعور کا راز داں ہوتا ہے۔

یوسف حسین نے غزل کی ماہیئت سے بحث کرتے ہوئے فطرت انسانی کی وضاحت انسانی وجود سے علاحدہ ایک قسم کا رومانی خیال قرار دیا ہے جو خارجی حقیقت میں کمال پیدا کرنا چاہتا ہے۔ یوسف حسین کے بقول:

> ''غزل میں فطرت کبھی موضوع نہیں بن سکتی۔ موضوع کا پس منظر ہو سکتی ہے.....فطرت کے مناظر دراصل نظم کا موضوع ہیں جو بیانیہ شاعری ہے۔ غزل انسانی دل کے لطیف جذبات و کیفیات کے لئے مخصوص ہے۔ ان کے اظہار میں تخیل کی باطنی توجیہ وتعبیر درکار ہے، تخیل ہی جذبے کا راز دار ہے۔''[۱]

اس سلسلے میں ڈاکٹر شاہدہ بیگم اس طرح رقمطراز ہیں:

> ''یہ صحیح ہے کہ اردو شاعری میں فطرت نگاری نظم کا موضوع ہے اور اس کا انداز بیانیہ ہوتا ہے۔ لیکن انگریزی میں رومانی شاعری جس میں فطرت نگاری بھی شامل ہے خالص بیانیہ نہیں کہی جا سکتی۔ ورڈسورتھ اور شیلی کے یہاں فطرت تصوف اور افلاطونیت کے رنگ میں رنگی ہوئی ہے۔ اردو میں اقبال اور فیض جیسے شاعروں کے یہاں فطری شاعری بیانیہ شاعری نہیں رہ جاتی۔ اس میں

۱۔ اردو غزل، یوسف حسین خاں، ص ۴۳

کلام نہیں کہ صنف لطیف انسانی جذبات و کیفیات کے اظہار کے لئے زیادہ موزوں ہے لیکن اردو غزل کی تاریخ میں ایسے دور بھی آئے ہیں جب خارجیت نے داخلیت پر غلبہ حاصل کرلیا اور شاعر درون بینی سے زیادہ خارجی عالم کی رنگا رنگی سے متاثر ہوئے۔ بہرحال غزل دوسرے اصناف کے مقابلے میں داخلی حیثیت ہی رکھتی ہے۔'' ۱

تخیل کے اندرونی اور خارجی عالم کے زیر بحث یوسف صاحب کا ماننا ہے کہ 'غزل گو شاعر کی درون میں زبردست تخلیقی قوت پوشیدہ ہوتی ہے۔ اسے اپنے اندر جو عالم نظر آتے ہیں وہ خارجی عالم کی رنگا رنگی سے جسے وہ چمن اور گلستاں کے علامتی لفظوں اور استعاروں سے یاد کرتا ہے۔''

گل و گلشن کے رمزی استعارے کے زیر بحث ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''غزل گو شاعر کے درون بینی انسانی جذبات کے طلسم کو فطرت پر طاری کرنے کی کوشش کرتی ہے اور کائنات مدرکہ میں اس کو بس وہی نظر آتا ہے جس کو اس کا اندرونی احساس دیکھنے کا متمنی ہوتا ہے۔ جذبہ ہمارے شعور کو طلسمی دنیا میں لے جاتا ہے جہاں خود اس میں اور شعور میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔'' ۲

کلیم الدین احمد نے اردو غزل کے خلاف عدم تسلسل اور پراگندگی کا فرد جرم عائد کیا ہے اور اپنی مخصوص رائے پیش کرنے سے پہلے نظم طباطبائی اور عظمت اللہ خاں کی رایوں کو ظاہر کیا ہے۔ نظم طباطبائی نے غزل کو قافیہ و ردیف سے مضمون پیدا کرنے کی مشق سے تعبیر کیا ہے اور عظمت اللہ خاں نے کہا تھا کہ غزل کی دنیا میں تسلسل ایک طرح کا جرم ہے۔ ان اوسط درجہ نظم گو شاعروں کی غزل سے متعلق رائے بہت حد تک تعصب پر مبنی ہے۔ اس لئے کلیم الدین احمد نے نکلسن کی رائے کا بھی سہارا لیا ہے۔ جس نے کہا تھا

۱۔ اردو غزل کی تنقید، شاہدہ بیگم، ص ۲۳۲

۲۔ اردو غزل، یوسف حسین خاں، ص ۶۶

کہ غزل میں ربط، اتفاق اور تکمیل کی کمی ہے۔ انہیں اسباب کی بنا پر انھوں نے یہ فیصلہ صادر کیا کہ غزل نیم وحشی صنف شاعری ہے۔ اس خیال کا اظہار انھوں نے نگار لکھنؤ میں اپنے مضمون بزم نگار میں کیا ہے۔

دوسری طرف نیاز فتح پوری نے غزل کو اردو شاعری کی آبرو قرار دیا ہے۔ غزل نوازی کی یہ لے فراق گورکھپوری کے چند مضامین میں اس حد تک بڑھی کہ جدید نظم کی مقبولیت کے باوجود غزل کو ہی افضل ترین صنف سخن قرار دیا گیا۔ وہیں مجنوں گورکھپوری نے غزل کو داخلی شاعری کا منتہائے کمال قرار دیا ہے۔ یوسف حسین خاں نے اس سلسلے میں جو نکتہ پیش کیا ہے وہ بھی لائق توجہ ہے:

> ''جہاں بھی شدت احساس کی کارفرمائی ہوگی وہاں کلام میں عدم تسلسل پیدا ہونا لازمی ہے۔ یہ سامع کے تخیل کا فرض ہے کہ وہ عبارت کے خلا کو اپنی ذہنی کاوش سے پُر کرے، دنیا کے اکثر الہامی کتابوں میں آپ یہی خصوصیت پائیں گے۔ منطقی تسلسل، خارجی واقعات اور حقائق کو بیان کرنے کے لئے ضروری ہے کہ منطقی عقل کی زبان، تخلیقی وجدان کی زبان رمز و کنایہ ہے جو منطقی استدلال و تسلسل سے بے نیاز ہے اور اسی وجہ سے اس کے جذب و تاثر کی کوئی انتہا نہیں۔''[1]

یوسف صاحب کا ماننا ہے کہ جذبے کا رمزی بیان صرف غزل کے لئے مخصوص نہیں کہیں کہیں اعلیٰ نظم میں بھی یہ ممکن ہے لیکن بہت کم ہی ایسا ملتا ہے ابہام اور اجمال نظم کے لئے سازگار نہیں۔ یہ دونوں چیزیں غزل کے لئے جان ہوتی ہیں۔ قلبی وارداتیں ہمیشہ ابہام اور اجمال کی مقتضی ہوتی ہیں۔ غزل کے شعر کا مطلب ایسا معنی خیز ہونا چاہئے کہ تحریک ذہنی اس کے اندر مختلف جذباتی اور تخیلی کیفیات پوشیدہ دیکھے۔ غزل گو شاعر رمز و کنایہ کی ایمانی قوت سے لفظوں میں وہ تاثیر اور رچاؤ پیدا کرنا چاہتا ہے جو موسیقی میں بولوں سے پیدا کیا جاتا ہے۔ غزل گو شاعر کے اشاروں اور رمزی علامتوں میں تاکید اور اثبات سے کہیں زیادہ تاثیر اور بلاغت ہوتی ہے۔

۱۔ اردو غزل، یوسف حسین خاں، ص ۶۶۔۶۷

یوسف صاحب نے غالبؔ اور مومنؔ کی غزلوں میں رمز و کنایہ کی نزاکت اور لطف بیان پر ناز کرتے ہوئے لکھا ہے۔ ان کی غزلوں میں جو تسلسل ہے وہ رمز و استعارہ کا تسلسل ہے۔ اگر چہ ضمنی طور پر مضمون کا تسلسل بھی آ گیا ہے لیکن غزل کی اصلی خوبی مضمون کا تسلسل نہیں ہے۔ شاعر کو اختیار ہے اگر اسے باقی نہ رکھنا چاہے تو ہر شعر میں علاحدہ رمزی کیفیت پیش کرے۔

غزل کے شعر کے مطلب کی بے پایانی سے بحث کرتے ہوئے یوسف حسین نے لکھا ہے۔ انسانی شعور اور تحت شعور میں بہت کچھ ہے جسے لفظوں کی صراحت سے ظاہر نہیں کیا جا سکتا۔ انھوں نے دعویٰ کیا ہے کہ غزل کے ہر عمدہ شعر میں ایک عنصر ایسا ہوتا ہے جو معنیٰ سے تعلق نہیں رکھتا اور اس سے وہی مسرت حاصل ہوتی ہے جو نغمہ موسیقی سے حاصل ہوتی ہے۔ تغزل موسیقی سے بہت قریب اور اظہار کی خالص صورت ہے۔ موسیقی اور لفظوں کے امتزاج سے تغزل کی تخلیق ہوتی ہے۔ شعر صرف احساس و خیال کو منتقل کرنے کا نام نہیں بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ ہے۔ یوسف صاحب کے بقول:

> ''وہ لوگ جو شعر کے مقصد کو سمجھنے کی طرف زیادہ توجہ کرتے ہیں انہیں اس کا موقع نہیں ملتا کہ وہ یہ سمجھیں کہ خود شعر کیا ہے۔ اس قسم کے نقاد اکثر و بیشتر شعر کی موسیقیت کو محسوس نہیں کرتے تحلیل و تجزیہ شعروں کی روح کو مجروح کر دیتا ہے..... شعری رمز کے آگے نطق و بیان سر بگریباں نظر آتے ہیں ہاں تاثر و احساس اس سے پوری طرح لطف اندوز ہوتے ہیں اور اپنے دامن کو اس کے پھولوں سے بھر لیتے ہیں۔''[1]

غزل کا موضوع عشق مجازی ہے، کے زیر عنوان یوسف حسین خاں نے اس امر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے تحریر کیا ہے، ہر عہد کی تنقید میں شعرا اور غزل سے مختلف مطالبے کئے جائیں گے لیکن جو مطالبے کئے جائیں گے اس میں چند باتیں قدر مشترک کے طور پر ملیں گی کہ اس میں موسیقیت، لطیف

۱۔ اردو غزل، یوسف حسین خاں، ص ۷۶۔۷۷

جذبات، شعور میں نزاکت اور زندگی کے واقعات اور تجربوں کو رمز و کنایہ کی صورت میں ظاہر کرنا لازمی ہوگا۔ حکمت و اخلاق اور تصوف کے نکات بھی اور سیاسی نظریات بھی غزل کا موضوع رہے ہیں۔ لیکن غزل کا اصل موضوع عشق مجازی ہی رہا ہے۔ غزل گو شاعر کی رمز آفرینیاں اور استعارے خیالی زندگی کے طلسمی علائق کی تصویریں ہیں۔ وہ حیات و کائنات کے مظہروں کو اپنے جذبے کے ساتھ مربوط کر لیتا ہے۔ وہ اپنے جذب دروں سے زندگی کی تصویر میں رنگ آمیزی کرتا ہے۔ یوسف حسین خاں کے خیالات کے پیش نظر:

''غزل گو شاعر کی درون بینی اور تخیل نگاری کا مقصد حسن و عشق کی ابدی داستان کو ایمائی انداز سے بیان کرنا ہے..... عشق جذبات انسانی کا سرتاج ہے۔ وہ فطرت کی طرح لامحدود ہے۔ عالم کی رونق اور ہماہمی اس کی کرشمہ زائیوں کی رہین منت ہے زیست کا مزہ بغیر عشق کے ممکن نہیں۔''[1]

غزل لکھنے والے شاعروں کا عشق کا دعویٰ مصنوعی اور ان کی محبت کا معیار عامیانہ اور پست ہوتا ہے۔ وہ جب محبوب کے حسن و ادا کا ذکر کرتے ہیں تو عام طور پر ان کی مراد مجاز سے ہوتی ہے۔ صرف چند صوفیانہ رجحانات رکھنے والے شاعروں کے جو اس سے حقیقت مراد لیتے ہیں اور کچھ شاعروں کی غزل نگاری میں مجازی عشق کو کمال بینی کے انداز میں پیش کیا ہے اور جنسی محبت کی وارداتوں اور معاملوں کو لطیف بیان میں سمو کر دل پذیر بنایا گیا ہے۔ یوسف حسین کے خیال میں:

''غزل محبوب سے اور محبوب کی گفتگو ہے۔ اس کی خوبی اس میں ہے کہ کلام کا مقصد پورا ہو یعنی تاثیر انسان کی ہر بات کا مقصد یا تو اطلاع دینا ہے یا تاثیر پیدا کرنا۔ اول الذکر افادی پہلو رکھتا ہے جو نثر نے اپنے ذمے لے لیا ہے۔ شعر کا اور خاص طور پر غزل کے شعر کا سرمایہ اثر و تاثیر کے خمیر سے بنتا ہے۔ تغزل کی تاثیر کا راز اس میں ہے کہ عبارت، اشارت اور حسن ادا کے رنگ سے

۱۔ اردو غزل، یوسف حسین خاں، ص ۸۰

تخیل اور جذبے کی تصویر کی رنگ آمیزی کی جائے۔''[1]

غالبؔ نے سخن محبوب کو بلائے جان سے تعبیر کیا ہے اور حسرت نے غالبؔ کے خیال کی تائید کی ہے۔ ان دونوں نے محبوب کے سخن کا جو تجزیہ کیا ہے وہ غزل کی خارجی اور معنوی خوبیوں پر حاوی ہے اور اس کے محاسن کا معیار کہا جا سکتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غزل صرف شاعر کا کلام نہیں بلکہ عاشق کا کلام ہے۔ حسن اور عشق کا تعلق اور مقابلہ کے عنوان سے متعلق یوسف حسین رقم طراز ہیں:

حسن اور عشق کا تعلق اور ان کے رتبہ کو تمثیل کی شکل میں ظاہر کیا گیا ہے جیسے یہ دونوں حقائق ایک دوسرے کے مدمقابل ہوں۔ حسن و عشق غزل میں زندگی کی تمثیل بن جاتے ہیں اور شاعر ان کے ذریعے سے رموز حیات کو بے نقاب کرتا ہے۔ حسن غزل گو شاعر کو عزیز ہوتا ہے۔ عشق و حسن دونوں اپنی اپنی جگہ کائنات مدرکہ کے اہم مظاہر ہیں اور تغزل کا میلان ہر زمانے میں زیادہ تر عشق مجازی کی طرف رہا ہے۔ اگرچہ بعض شاعروں نے مجاز کی منزل سے آگے بڑھ کر حقیقت کے رموز و اسرار کا بھی پردہ فاش کیا ہے۔ غزل گو شاعروں نے مجازی عشق کے واقعات میں ایسی لطافت پیدا کی ہے کہ عشقیہ شاعری میں شاید ہی اس کی مثال دستیاب ہو۔

عشق و محبت کا مضمون ظاہر پامال اور فرسودہ نظر آتا ہے۔ لیکن حقیقت میں اس کی تازگی و لطافت میں کبھی کمی نہیں آتی۔ اس جذبے کی نمایاں خصوصیت اس کی وسعت ہے جسے تغزل کے میٹھے سروں میں ظاہر کیا گیا ہے۔ جو خود رفتگی اور دردمندی کے سبب تاثیر میں ڈوبے ہوتے ہیں۔ جس طرح انسانی خواہشوں اور تمناؤں کی تازگی میں کبھی کمی نہیں آسکتی، اسی طرح عشق و محبت کے لوازمات کی دلچسپیاں اور رنگینیاں انسانوں کو ہمیشہ اپنی طرف مائل کرتی رہیں گی۔

یوسف حسین خاں عشق اور موت کو شاعری کا دائمی موضوع سمجھتے ہیں۔ ان کے نزدیک اس سے بڑھ کر دنیا میں کوئی پراسرار حقیقت نہیں اور عاشقانہ شاعری کو آپ درد و الم کے خیالات سے الگ نہیں رکھ

۱۔ اردو غزل، یوسف حسین خاں، ص ۹۰

سکتے۔ عشق کا خاصہ جذب غم ہے۔ خوشی کے لمحات جلد فراموش ہوجاتے ہیں لیکن غم کے نقوش دل کی گہرائیوں میں پیوست ہوتے ہیں جس کو پر کرنے میں کافی تکلیفیں ہوتی ہیں اور کافی وقت بھی درکار ہوتا ہے۔ غزل میں جذب غم وہی حیثیت رکھتا ہے جو مغربی ادب میں ٹریجڈی (المیہ) کو حاصل ہے۔ غم آرٹ کی تخلیق کا زبردست محرک ہے اور اس طرح وہ ایک خاص لطف کا سرچشمہ بن جاتا ہے۔ یہ بات بہت حد تک صحیح معلوم ہوتی ہے کہ غم کی حالت میں انسان کو اپنے وجود کا شعوری احساس بڑی شدت سے ہوتا ہے اور اس آگہی کی شدت میں ایک قسم کا لطف ہوتا ہے۔ مسرت کے امکانات زندگی میں بہت محدود ہیں۔ جب کہ اس کے برخلاف اس کا غم زندگی کے تانے بانے میں سمویا ہوا معلوم ہوتا ہے۔

میر تقی کے کلام میں درد و غم ناکامی و مایوسی کی جھلکیاں سلیقگی کے ساتھ نظر آتی ہیں۔ ان کے سوز و گداز میں انفرادی رنگ ہے۔ جس کی تاثیر کی کوئی حد نہیں۔ ان کا کلام غم عشق کے سوز و گداز میں رچا ہوا ہے۔ اس لئے اس میں بے پناہ تاثیر ہے.....ان کا غم زندگی کی اساسی حقیقت ہے۔

عہد جدید کے شاعروں میں فانی نے غم کے مضمون کو ایسا اپنایا کہ گویا وہ اسی کا ہوگیا۔ فاضل نقاد نے میر کے غم اور فانی کے غم میں فرق محسوس کرتے ہوئے ذکر کیا ہے:

> ''میر کا غم ایک انفرادی تجربے کا بیان ہے۔ برخلاف اس کے فانی کے یہاں غم جمالیاتی قدر کا مرتبہ رکھتا ہے۔ ان کا سارا نظام تصورات غم کے محور پر قائم ہے۔ یہ ایک کسوٹی ہے جس پر کائنات کے حقائق کھرے کھوٹے کو پرکھا جاتا ہے۔''[1]

یوسف صاحب نے فانی کے کلام کا تنقیدی تجزیہ کرتے ہوئے ان کی شاعری اور فن کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے اور ان کے منتخب اشعار کی مدد سے ان کی انفرادیت اور یاس پسندی کو اپنے مخصوص انداز میں واضح کرنے کی کوشش کی ہے۔ میر اور فانی کے علاوہ غالب بھی غم پسندی کا اپنا مخصوص انداز رکھتے ہیں۔ انھوں نے حسن کے لئے سوز و گداز کو ضروری بتایا ہے۔ غالب نے غم کی حقیقت کو محسوس

۱۔ اردو غزل، یوسف حسین خاں، ص ۱۳

کیا اور اپنے کلام میں اسے بڑے وسیع معنوں میں استعمال کیا۔ غالب کا تصور غم فانی کے تصور غم سے الگ ہے۔ وہ بھی اس بات کے قائل ہیں کہ زندگی کی اساسی حقیقت غم ہے لیکن ان کے نزدیک اس عمارت کے در و دیوار پر ایسے نقش و نگار موجود ہیں جو پر مسرت اور جاذب نظر آتے ہیں۔ وہ غم و ناامیدی کی تاریکی میں بھی امید و نشاط کی کرن کو دیکھتے ہیں جس کا ذکر یوسف صاحب ان الفاظ میں کرتے ہیں:

> ''اس احساس نے غالب کو امید پرست بنا دیا جو باوجود غم عشق کی حقیقت کو ماننے کے زندگی کے خوش گوار و پر مسرت تجربوں کی بھی قدر کرتا ہے اور چاہتا ہے کہ دوسرے بھی قدر کریں۔ غم و مسرت کی دھوپ چھاؤں جس سے انسانی زندگی عبارت ہے کائنات ہستی کا ایک طلسمی رمز ہے۔ اگر غم و مسرت ایک دوسرے کے پہلو میں موجود نہ رہیں تو زندگی کی حقیقت سادہ اور ایک طرفہ ہو جائے۔ غالب کا زندگی اور آرٹ کا یہ نقطہ نظر حقیقت پر زیادہ حاوی اور صحت مند ہے۔ اس کو غم کی تاریکی میں بھی امید کی جھلکیاں صاف نظر آتی ہیں کہ یہی حاصل حیات ہیں۔''[۱]

یہ حقیقت ہے کہ غزل عشقیہ شاعری کی معراج ہے۔ اس میں عشق حقیقی پر عشق مجازی کو فوقیت حاصل ہے۔ اردو غزل کی تاریخ میں عشق حقیقی کہیں واضح اور کہیں مبہم انداز میں نظر آتا ہے۔ اہل نظر کو مجاز میں حقیقت کا پرتو نظر آتا ہے۔ ہنگامۂ ہستی کی کرشمہ سازیوں میں ارباب عرفان کے لئے تجلیات الٰہی کی جلوہ فرمائیاں نظر آتی ہیں۔

یوسف صاحب کے خیالات کے مطابق اردو غزل میں تصوف کچھ اس طرح سے ہم آہنگ ہے کہ ہر اعلیٰ درجے کے غزل گو کے کلام میں اس کی تھوڑی بہت چاشنی موجود ہے۔ تصوف کے مسائل کو اردو غزل میں شروع ہی سے برتا گیا ہے۔ یوسف صاحب کا ماننا ہے کہ غزل کی زبان اور اسلوب تصوف کے اسرار و

۱۔ اردو غزل، یوسف حسین خاں، ص ۱۴۴

رموز کو بیان کرنے کے لئے خاص طور پر موزوں تھے۔ مجازی عشق کے معاملوں کی طرح حقیقی عشق کی کیفیت بھی تفصیل، منطقی تسلسل اور صراحت کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ اسی وجہ سے غزل میں تصوف کے مضمون اچھی طرح مل گئے۔ تصوف کے سہارے فلسفہ اور حکمت نے بھی اردو غزل میں اپنی راہ ہموار کی۔

یوسف حسین خاں نے میر درد کے کلام کو عشق حقیقی کا ترجمان کہا ہے۔ ان کے کلام میں تصوف تغزل کے ساتھ پوری طرح ہم آہنگ ہے۔ ان کے نزدیک غالب کے کلام میں مجاز اور حقیقت دونوں کو بخوبی استعمال کیا گیا ہے۔ غالب کی شخصیت کی طرح اس کے کلام میں بڑی وسعت ہے۔ ان کے کلام کا زیادہ تر حصہ عشق مجازی کی کیفیت پر مشتمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہاں ہمیں تنوع نظر آتا ہے جو اس کی ہمہ گیر شخصیت کا عکس ہے۔ اس کے یہاں غم بھی ہے اور مسرت بھی، جوش جذبات بھی ہے اور حکیمانہ نکتہ رسی بھی، تخیل کے نقش و نگار بھی ہیں اور حقائق و تاثرات کی ترجمانی بھی۔

آرٹ اور فریب نظر کے زیر عنوان کے تحت غزل کی تعریف و توصیف کے لئے فن اصول پیش کئے گئے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ محبت کی طرح آرٹ کے آداب میں یہ شامل ہے کہ موہوم یا خیالی حقیقت کو اصلیت تصور کیا جائے شاعر یا آرٹسٹ کا تخیل جس میں خواہش اور جذبے کی آمیزش ہوتی ہے مبالغے کا رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ وہ الفاظ کے فنی استعمال سے ایک قسم کا فریب نظر پیدا کرتا ہے جس کی رمزی کیفیت سے ہم لطف اندوز ہوتے ہیں اور جس کی طلسمی خاصیت ہمیں حیرت میں ڈال دیتی ہے۔

غزل میں استعارے کی رمز آفرینی بھی قابل ذکر ہے۔ چونکہ شعر کی تاثیر کا انحصار لفظوں کے برجستہ اور موزوں استعمال پر منحصر ہے لیکن شعر کی روح چونکہ رمز و ابہام کے طلسم میں پوشیدہ ہوتی ہے اس لئے لفظوں کے معنی میں تشبیہ اور استعارے اور کنایے سے وسعت پیدا کی جاتی ہے۔ یوسف حسین خاں اس فنی نکتے کی وضاحت اس انداز میں کرتے ہیں:

> ''استعارے سے حقیقت کی تصویر کشی مقصود ہوتی ہے۔ بلکہ اس کی پیچیدگی کو ظاہر کرنا، عالم فطرت کی وسعت، کثرت، تنوع، اس کی بلندیاں اور پستیاں،

زمان و مکان کی کبھی ختم نہ ہونے والی تنہائیاں، ذہن کی شعوری اور تحت الشعوری کیفیتیں، دقیق اور الجھی ہوئی ہیں حقیقت خود اس کے دل کی دنیا اور جذباتی حقائق ہیں جنھیں حرف وصورت کی شکل میں وہ ظاہر کرنا چاہتا ہے۔''[۱]

غزل میں استعارے اور کنایے کو اہمیت حاصل ہے اور نظم میں تشبیہ کو۔ استعارہ معنی آفرینی اور جدت ادا کا ایک زبردست وسیلہ ہے جسے تغزل میں برتنا شاعرانہ کمال پر دلالت کرتا ہے۔ اس کے ذریعہ خیال کی بالیدگی اور رسائی میں اضافہ ہوتا ہے۔ کسی شاعر کی عظمت کا اندازہ اس کے استعاروں کی قوت تازگی اور بلندی سے کیا جاسکتا ہے۔ استعارہ رمز آفریں ہوتا ہے۔ غزل میں استعارے صرف لفظوں کے نہیں ہوتے بلکہ پورے شعر کے شعر استعارے کہے جاسکتے ہیں جن میں تخیل کی روح رچی بسی ہوتی ہے۔ غالب کے کلام میں یہ خصوصیت بہت زیادہ موجود ہے۔ لفظ اور معانی کے زیر عنوان یوسف صاحب تحریر کرتے ہیں:

''لفظوں کے موزوں استعمال سے غزل گو شاعر اپنے اندرونی جذبوں کو ظاہر کرنے میں کامیاب ہوتا ہے اور کبھی لفظوں کے لئے معانی ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے معانی سے لفظوں کی خارجی صورت متعین ہوتی ہے۔ شاعر کا تخیل زبان اور معانی دونوں میں قدر مشترک ہوتا ہے۔ لفظ اور معانی کے صحیح ربط سے حسن ادا کی جلوہ گری ہوتی ہے جس کے بغیر کلام میں تاثیر نہیں آسکتی۔ غنائی شاعری یا تغزل میں لفظوں کی حیثیت خالص علامتوں کی ہوتی ہے جن کے معنی میں قوس قزح کی سی رنگا رنگی پیدا ہوجاتی ہے۔ ہر لفظ ایک جوہری انفرادیت رکھتا ہے۔ چنانچہ کسی ایک لفظ سے جو خیالاتی متالازمات اور ذہنی متعلقات پیدا ہوتے ہیں وہ مترادف لفظوں سے کبھی نہیں ہوسکتے۔ یوسف حسین خاں نے مشاہیر کے منتخب کلام کے ذریعہ اپنے نکتے کی وضاحت کی ہے۔ یوسف صاحب کا ماننا ہے کہ کسی زبان کا کوئی لفظ کبھی پرانا اور فرسودہ نہیں ہوتا۔ ان سب رمزی علامتوں کو ہمارے شاعر دوسو برس سے برت رہے ہیں۔ لیکن آج بھی ہمیں عجیب وغریب لطف ملتا

۱۔ اردو غزل، یوسف حسین خاں، ص ۱۶۷

ہے۔غزل گوشاعر کے لئے لفظ محض علامتیں ہیں جو ذہن کو حقیقت کی طرف منتقل کرتی ہیں۔

رنگ و بو کے شعری محرکات کے زیر بحث یوسف حسین خاں تحریر کرتے ہیں کہ یہ طرز ادا معنوی خصوصیات سے عبارت ہوتا ہے۔لیکن اس کی تاثیر لفظی استعمال کے بعض محض طریقوں سے پیدا ہوتی ہے۔دراصل غزل ایک طرح کا طلسم ہے۔رنگ و بو کے حسی تجربے کے شعری محرک فارسی شاعروں کے یہاں بھی ملتے ہیں۔اس میں شبہ نہیں کہ اردو غزل میں خیال کی جو لطافت اور نزاکت نظر آتی ہے وہ فارسی شاعری کے اثر سے ہے۔

وہ لفظ جن سے رنگ و بو کے محرکات کی تخلیق ہوتی ہے وہ غزل میں خاص تاثیر پیدا کر لیتے ہیں۔ بعض وقت رنگ و بو جذباتی زندگی کا استعارہ بن جاتے ہیں۔رنگ اور بو دونوں میں بے پناہ ایمائی اور طلسمی خاصیت پائی جاتی ہے جو دراصل اندرونی کیف ونشاط کی آئینہ دار ہوتی ہے۔

حسن و ادا کی مختلف صورتوں سے متعلق لکھتے ہیں۔زبان و بیان اور استعارہ و کنایہ کے علاوہ شاعروں کے یہاں حسن وادا کی مختلف صورتیں نظر آتی ہیں۔یوسف صاحب نے اپنی کتاب میں حسرت کے علاوہ میرؔ،مومنؔ،نسیم دہلویؔ،شادؔ عظیم آبادی،جگرؔ مرادآبادی جیسے مشاہیر کے اقوال کی روشنی میں غزل گوئی میں حسن وادا کی تفصیل پیش کی ہے۔مختصراً یہ نکات حسب ذیل ہیں

۱۔ غزل میں حسن ادا کا انحصار لفظوں کے ایسے استعمال پر ہوتا ہے جن سے ذہن میں خیالی تصویریں اجاگر ہوں.....بعض اوقات واحد کے بجائے جمع کا صیغہ لانے سے حسن ادا کو چار چاند لگ جاتے ہیں۔مولانا حسرت موہانی نے اپنے رسالہ ''نکات سخن'' میں جمع کے استعمال کو محاسن سخن میں شمار کیا ہے۔

۲۔ نقل وقول کے حسن استعمال سے بھی کلام میں بجائے تعین کے رمز وابہام پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے۔حالانکہ نثر میں اس کے بالکل برخلاف ہے.....غزل میں اس سے رمزی کیفیت کو وسعت حاصل ہوتی ہے اور شعر کی بے تکلفی اور تازگی میں اضافہ ہوتا ہے۔حسرت نے نکات سخن میں نقل وقول کی تازگی کا ذکر کیا ہے۔

۳۔ شاعر بعض اوقات غیر ذی روح اشیاء اور مجرد کیفیتوں کو ذی روح فرض کر لیتا ہے۔ یا ان میں ایک طرح کا تشخص پیدا کر دیتا ہے جسے استعارے ہی کی ایک شان کہنا چاہئے۔ مادی النظر میں تشخص سے ایک طرح کا تعین لازم آتا ہے لیکن غزل گو شاعر کا مقصد اس کے بالکل برعکس ہوتا ہے۔ اکثر اوقات اس قسم کا تشخص استعارے کی ندرت کا کرشمہ ہوتا ہے۔

۴۔ غزل میں بعض اوقات استفہام سے بھی حسن کلام پیدا ہوتا ہے۔ اس سے کنایے کی کیفیت اجاگر کرنے میں مدد ملتی ہے جو اثبات و تاکید سے نہیں پیدا ہو سکتی۔ استفہام بالعموم انشائیہ جملوں کے ذریعہ ظاہر کیا جاتا ہے..... شاعر ایک طرح کا تجاہل عارفانہ برتتا ہے۔ درحقیقت وہ استفہام و استفسار سے کبھی اپنے اندرونی تحیر کو ظاہر کرتا ہے کبھی دیدہ و دانستہ اپنے تجربوں کی پیچیدگی اور الجھاؤ کو نمایاں کرتا ہے..... میرؔ کے دیوان میں کثرت سے اس قسم کے اشعار ہیں۔

۵۔ لفظوں کی تکرار بالعموم نثر اور شعر دونوں میں معیوب سمجھی جاتی ہے۔ لیکن اگر لفظوں کی تکرار اور الٹ پھیر ایک خاص سلیقے سے کی جائے اور وہ رمزی اور ایمائی اثر بڑھانے میں مدد دے تو کلام کی بلاغت اور حسن میں اضافہ ہوگا۔ غزل میں وزن اور بحر اور ردیف و قافیے کی تکرار بھی اسی مقصد کے لئے ہوتی ہے۔

۶۔ بیان کی تازگی اور مضمون کی ندرت کا بعض دفعہ یہ اقتضا ہوتا ہے کہ شعر کے چند لفظوں کو غیر مذکور رکھا جائے اور مطلب کو اس طرح بیان کیا جائے کہ سامع کا ذہن خود بخود اس کمی کو پورا کرے اور معمور ذہنی کو پالے۔

۷۔ بعض اوقات حذف کرنے کے بجائے مضمون کو دیدہ و دانستہ طول دیا جاتا ہے۔ جو مقصود بالذات نہیں ہوتا لیکن چونکہ اس سے ایمائی اثر حاصل ہوتا ہے اس لئے کلام کی تازگی اور حسن میں اضافہ ہوتا ہے۔

۸۔ رمزی اور ایمائی اثر آفرینی کے ضمن میں شاعر بعض وقت ایسا انداز بیان اختیار کرتا ہے کہ جس سے سامع کا ذہن کبھی تکلم سے غیبت کی طرف کبھی غیبت سے تکلم کی طرف اور کبھی خطاب سے

غیبت کی طرف خود بخود منتقل ہوتا ہے۔

۹۔ کبھی شاعر کے خطاب کا انداز ایسا ہوتا ہے جس سے ظاہر ہو کہ گویا متکلم اور مخاطب دو علاحدہ علاحدہ ہستیاں ہیں۔ اس طرح غزل گو شاعر اپنے آپ کو غیر تصور کرتا اور مضمون آفرینی کا ایک نیا پہلو پیدا کرتا ہے۔ اس ضمن میں ہمارے شاعروں نے تخلص سے پورا فائدہ اٹھایا ہے۔

غزل میں حسن و ادا سے متعلق یوسف حسن خاں رقمطراز ہیں کہ غزل میں حسن ادا کی خوبی کے لئے لازمی ایمائی اثر آفرینی ہونی چاہئے، لفظوں سے کوئی بلند یا گہرے معنی نہ نکلتے ہوں۔ طرز ادا کی اعلیٰ کسوٹی پر اردو غزل نگاروں میں غالب کا مرتبہ سب سے بلند ہے۔ ان کے شعر سے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے جذبہ خود فکر کر رہا ہو۔ وہ پست مضمون کو بھی ایمائی زور سے اوپر اٹھا کر آسمان پر پہنچا دیتا ہے۔ یوسف صاحب نے حسن و ادا کی توضیح و تشریح کے لئے اساتذہ کے کلام سے بہترین اشعار کا انتخاب پیش کیا ہے۔ لیکن ان نکات کی روشنی میں انھوں نے غالب کے کلام پر بھرپور تبصرہ کیا ہے۔ وہ غالبؔ کو اردو غزل میں جدت ادا کا امام سمجھتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ میرؔ اور مومنؔ بھی لفظوں پر قدرت رکھتے ہیں لیکن غالبؔ انہیں کامیاب طریقے سے برتتے ہیں۔ یوسف صاحب کے بقول طرز ادا کی اعلیٰ کسوٹی پر اردو غزل نگاروں میں غالبؔ کا مرتبہ سب سے بلند ہے۔ یوسف صاحب کا ماننا ہے کہ:

> ''مرزا کے نغموں میں جمالیاتی صداقت کا انکشاف پیرایوں میں ملتا ہے۔ اس کے کلام میں کہیں حسن و عشق کی واقعہ نگاری اور اس کے سارے لوازمات میں کہیں رندانہ جسارتوں کی بلند آہنگیاں اور شوخیاں ہیں اور کہیں رموز حیات کی حکیمانہ تعبیر و توجیہ۔ مرزا کے یہاں داخلیت اور خارجیت دونوں ایک دوسرے میں سموئی ہوئی نظر آتی ہیں..... مرزا غالب کی خارجیت جرأت، ناسخ اور لکھنؤ کے دوسرے شاعروں کی خارجیت سے بالکل مختلف ہے۔''[۱]

۱۔ اردو غزل، یوسف حسین خاں، ص ۲۶۱۔۲۶۲

چند توصیفی اور تزئینی کلمات کے زیر بحث یوسف حسین خاں نے ذکر کیا ہے کہ طرز ادا کی رمزی کیفیت کو اجاگر کرنے کے لئے غزل گو شاعر ایسے لفظ کا استعمال کرتا ہے جن سے عدم تعین مقصود ہوتا ہے تا کہ ایمائی اثر نکھر سکے۔ تصورات کے مقابلہ میں انھوں نے لکھا ہے کہ بعض اوقات شیوۂ نازک خیالی طرز ادا کی ندرت کو ظاہر اور لطف کو دوبالا کرنے کے لئے دو تمثیلی تصوروں یا خیالی پیکروں کو ایک دوسرے کے سامنے لا کر کھڑا کر دیتا ہے۔ گویا ان دونوں کا مقابلہ مقصود ہے۔

گنہ گاری اور رحمت خداوندی کے ذیلی عنوان کے تحت یوسف صاحب لکھتے ہیں کہ غزل گو شاعروں نے بعض اوقات اپنی گنہ گاری اور رحمت خداوندی کو ایک دوسرے کے مقابل کر دیا ہے اور اس سے حسن ادا کا ایک خاص پہلو نکلتا ہے۔ گویا کہ یہ دو تصورات ہیں جو محفل خیال میں ایک دوسرے سے گفتگو کر رہے ہیں۔ غزل گو شاعر کا مزاج اور افتاد طبع ادعا پسندی کی کبھی حریف نہیں ہو سکتی۔ ادعا پسندی کا علم بردار زندگی کے پیچیدہ حقائق کو من مانے طور پر سادہ تصور کر کے صرف اپنے نقطۂ نظر سے انہیں سمجھنا چاہتا ہے۔ ڈاکٹر شاہدہ بیگم اس سلسلے میں رقمطراز ہیں:

> ''ڈاکٹر یوسف حسین خاں کا غزل گو شعراء کا مطالعہ گہرا ہی نہیں وسیع بھی ہے۔ انھوں نے اپنی تنقید میں غزل شناسی کے کئی پہلو اجاگر کئے ہیں۔ بہت کم نقادوں نے گنہ گاری اور رحمت خداوندی کو ایک دوسرے کے مقابل کرنے کی کوشش کو حسن جدت قرار دیا ہے۔ زاہد سے چھیڑ چھاڑ یا اپنی گنہ گاری کا چرچا غزل گویوں نے ضرور کیا ہے اور ایک حد تک ان کے کلام میں گنہ گار سے ہمدردی بھی ملتی ہے لیکن خود گناہ کو حق بجانب ثابت کرنے کی کوشش نہیں کی جاتی۔''[1]

یوسف حسین خاں نے داخلیت اور خارجیت کے پہلو کو بھی بہت مخصوص نقطۂ نظر سے پیش کیا ہے۔ ڈاکٹر شاہدہ بیگم کے نظریے کے مطابق:

۱۔ اردو غزل کی تنقید، ڈاکٹر شاہدہ بیگم، ص ۲۴۴

''غزل کی تنقید میں غالباً سب سے پہلے ان اصطلاحوں کا استعمال امداد امام اثر نے اپنی تصنیف کاشف الحقائق میں کیا تھا اور وضاحت کے ساتھ میر تقی میر کی شاعری کو داخلیت کا نمونہ اور جرأت کی شاعری کو خارجیت کا نمونہ قرار دیا تھا۔ یہ تو کہنا صحیح نہیں کہ میرؔ کے کلام میں صرف داخلیت ہی ہے اور جرأت کی شاعری میں یہ عنصر ناپید ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ بیشتر شاعروں کے یہاں یہ دونوں عناصر ملے جلے ہوتے ہیں۔ کسی کے یہاں داخلی لے تیز ہوتی ہے تو کسی کے یہاں خارجی رنگ نمایاں ہوتا ہے۔ اعلیٰ غزل میں داخلیت و خارجیت کی ہم آہنگی ضروری ہے۔'' [۱]

یوسف صاحب کے خیالات کے مطابق:

''غزل کا شعر ایک خاص تجربے کا اظہار ہے۔ تغزل کے لئے زیادہ تر وہ تجربے قدر و قیمت رکھتے ہیں جو حسن و عشق کی طلسمی دنیا میں پیش آئیں۔ اس کے لئے یہی اہم اور ابدی حقائق ہیں۔ اندرونی تجربے کو تفصیل اور وضاحت سے بیان نہیں کیا جا سکتا اور نا ہی کرنا چاہئے۔ تغزل کی اثر آفرینی میں ابہام مقصود ہوتا ہے اس لئے رمز و ایما کا اسلوب برتا جاتا ہے..... بعض غزل گو شاعروں کے یہاں دوسروں کے مقابلے میں خارجیت کا عنصر زیادہ ملتا ہے..... خارجیت لازمی طور پر بیان کی صفائی، تفصیل اور منطقی تسلسل کی محتاج ہے۔ جو تغزل کے لئے سازگار نہیں جس کا خمیر رمز و ابہام سے ہوا ہے۔'' [۲]

اردو غزل کے متحرک جمالیات اس بات کا ثبوت ہے کہ اس صنف شاعری میں بے پناہ امکا

۱۔ اردو غزل کی تنقید، ڈاکٹر شاہدہ بیگم، ص ۲۴۵۔۲۴۶

۲۔ اردو غزل، یوسف حسین خاں، ص ۳۲۰

وسعتیں ہیں۔ یہ کام شاعر کا ہے اس سے محض تفنن طبع یا مشق سخن یا روایتی شاعری کا کام لے یا اسے زمانے کے بدلتے ہوئے حالات اور معاشرے کے میلانات کا ترجمان بنائے۔ اس نکتے کی وضاحت کرتے ہوئے یوسف حسین خاں رقمطراز ہیں:

> ''غزل کے رموز و مطالب کی باز آفرینی اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ اردو شاعری زندگی کے بدلتے ہوئے حالات کا جائزہ نہ لے اور انھیں اپنے اندر سمونے کی کوشش نہ کرے۔ کسی زمانے کا ادب یا فن یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ اب انسانوں کی خواہشوں اور خیالوں کی تکمیل ہوچکی ہے اور آخری بات کہی جاچکی ہے۔ جس طرح علم اور ادراک کی دنیا میں انسان نئے نئے تجربوں کی منزلوں سے گزر رہا ہے اور ہمیشہ گزرتا رہے گا اسی طرح جذبے کی دنیا میں بھی اس کا سفر کبھی ختم ہونے والا نہیں۔ جب وہ ایک منزل پر پہنچتا ہے تو آگے کی منزل اسے دور سے نظر آنے لگتی ہے۔ اسی طرح مرحلۂ شوق کبھی طے نہیں ہوتا لیکن قدروں کی بار آفرینی تخلیقی ہونی چاہئے تاکہ ماضی کو نت نئے تجربوں اور آگاہیوں سے مالا مال کیا جاسکے۔''[1]

یوسف حسین خاں نے غزل پر تنقید کرتے ہوئے تحلیل نفسی کی انقلابی فکر اور رومانیت کے مضمرات کو بھی زیر بحث لانے کی کوشش کی ہے۔ غزل میں داخلیت کے متعلق یہ بات کہی جاسکتی ہے کہ تحت الشعور اور لاشعور کی کیفیات کو براہ راست غزل میں داخل نہیں کیا جاسکتا۔ لیکن اس بات سے انکار بھی نہیں کیا جاسکتا کہ فکر اور احساس اور ارادے کے شعوری افعال کی تہ میں تحت الشعور اور لاشعوری دنیا میں جو قوتیں کارفرما ہیں انہیں نہ تو ابھی اچھی طرح سے سمجھا گیا اور نہ برتا گیا لیکن اس بات سے انکار ممکن نہیں کہ تحت شعور اور لاشعور کے نفسیاتی حقائق کو علمی طور پر جو مرتبہ حاصل ہے اس سے ان کو دور نہیں کیا جاسکتا۔

۱۔ اردو غزل، یوسف حسین خاں، ص ۳۲۲

یوسف حسین خاں غزل کے بارے میں ہمیشہ پرامید نظر رکھتے ہیں۔ چنانچہ ان کا یہ قول قابل ذکر ہے کہ اردو غزل تحت شعور اور لاشعور کی وسعتوں سے بھی کچھ گوہر نایاب نکال سکتی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''میرا خیال ہے کہ ہمارے ادب میں غزل ہی ایسی صنف ہے جو اتنی سکت رکھتی ہے کہ اس آنے والے انقلاب کو جھیل جائے اور اس کے اثرات سے اپنے رنگ و روپ میں تھوڑی بہت تبدیلی کر کے پھر اپنا مقام حاصل کر لے۔ تحت شعور اور لاشعور کی نئی نفسیات کے تقاضوں کو غزل اچھی طرح پورا کر سکتی ہے۔ شروع سے یہی نفسی محرک اس کی تخلیق کے ذمے دار رہے ہیں اور آئندہ بھی رہیں گے۔''[1]

فاضل نقاد اس بات کا دعویٰ کرتے ہیں کہ غزل کی بنیاد پہلے عربی ادب میں پڑی پھر عربی اثر سے فارسی میں اس کا رواج ہوا۔ پھر اس کی روایات فارسی، ترکی اور اردو میں داخل ہوئی۔ اس طرح دنیا کی چار بڑی اور اہم زبانوں میں غزل نے مقبولیت حاصل کی۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ غزل اس روحانی اور جذباتی زندگی کی علامت بن گئی جس کی پرورش اسلامی تہذیب کے دامن میں ہوئی۔ نقاد کی اس بات سے اتفاق ہو یا نہ ہو لیکن اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں کہ اسلامی اثر سے ہی ادب میں رومانوی خیالات کو جگہ ملی جس سے ادب میں ایک زبردست انقلاب پیدا ہوا۔ عربوں نے ادب میں جنسی جذبے کی کمال بینی پید کی جس کا اظہار غزل میں ہوا۔

یہ سچ ہے کہ محبت میں انتہائی درون بینی اور داخلیت پائی جاتی ہے لیکن اس کے ساتھ یہ ماننا پڑے کہ آرٹ کی تخلیق اس وقت تک ممکن نہیں جب تک کہ اس میں خارجی حقیقت کی جلوہ گری نہ ہو۔ اعلیٰ آرٹ میں داخلی اور خارجی امکانوں کی قوت پوشیدہ ہوتی ہے جس سے اس میں غیر معمولی وسعت و گہرائی احساس ہوتا ہے اور یہ داخلی اور خارجی عنصر غزل کے آرٹ میں پہلو بہ پہلو موجود رہتے ہیں۔

۱۔ اردو غزل، یوسف حسین خاں، ص ۳۲۴

یوسف حسین خاں عاشقانہ شاعری خاص طور سے غزل میں 'یادوں کی اہمیت' کو کافی حد تک محسوس کرتے ہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ یادیں عجیب عجیب انداز سے جذبے کا جادو جگاتی ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یاد تحت شعور کے دھندلکے میں خواہش اور تمناؤں کا لباس زیب تن کئے بیٹھی رہتی ہے۔ یادوں میں جمالیاتی خزانہ پوشیدہ رہتا ہے۔ یہ تخیل کا بے لوث عمل ہے۔ یاد بیتے ہوئے جذبوں کو ابھارتی ہے۔ یادیں ایک لطیف رشتہ ہوتی ہیں جو ہماری گزری ہوئی خودی کو موجودہ خودی سے مربوط کرتی ہیں۔ شاعر کو یہ اس لئے عزیز ہوتی ہیں کہ ان سے مستقبل کے فریب نظر کا تانا بانا بناتا ہے..... ہمارے غزل نگاروں نے ہر زمانے میں اس نفسیاتی حقیقت کو محسوس کیا۔ اردو کے ہر بڑے شاعر کے کلام میں اس کی مثالیں موجود ہیں۔ حسرتؔ اور غالبؔ کے بیشتر کلام یادوں کے اشعار پر مشتمل ہیں۔ ان کی غزلوں میں یادیں ایک خاص انداز میں اپنا جلوہ دکھاتی ہیں۔

جذبے کے اظہار کے زیر بحث یوسف صاحب رقم طراز ہیں کہ شاعر لفظوں کے موزوں استعمال سے سماجی مقاصد کی خدمت انجام دیتا ہے۔ یہ موزوں استعمال شعر میں رمزی یا علامتی نوعیت ہی رکھ سکتا ہے۔ علامت یا رمز تخیلی یا جذباتی عمل کی روح ہے۔ شاعر کو بعض وقت اس بات کا احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ علامتی طور پر فکر کر رہا ہے۔ اس واسطے کہ یہ علامتیں تحت شعور سے آتی ہیں۔ رمز و استعارہ کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ ان میں مختلف معنی ایک جگہ جمع ہو جاتے ہیں جس سے خیال کا بھی اظہار ہوتا ہے اور جذبے کا بھی۔

غزل کے سماجی محرک کے ذیلی عنوان کے تحت یوسف حسین خاں نے صنف غزل کے اس پہلو پر بھی اظہار خیال کیا ہے جو معاشرے اور خارجی عالم سے ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ:

اب تک ہمارے غزل نگاروں نے تخیلی اور جذباتی حقیقت پر زیادہ زور دیا لیکن ہر زمانے میں شاعر کو ہر صنف سے تاثرات قبول کرنے کی حاجت ہے۔ ادراک و علم کے حقائق بھی غزل کے مضمون میں سموئے جائیں تاکہ خارجی عالم کی بصیرتیں شاعرانہ طور پر ہماری زندگی سے ہم آہنگ ہو سکیں۔ اس زمانے کے شاعر کو چاہئے کہ وہ ہر سمت سے تاثرات قبول کرے۔ تہذیب و معاشرت، علم و حکمت، زمین و آسمان

اور شعور و لاشعور ان سب تاثروں کو اپنے جذبے میں سمو کر پیش کرے گا تو یہ بات صرف ایک خیال پرست کی بات نہ ہوگی بلکہ ایسے شخص کی جسے زندگی اور عالم کی بصیرت حاصل ہو۔ یوسف صاحب کا ماننا ہے کہ:

''غزل کی صنف کو اگر ہمارے ادب میں زندہ رکھنا ہے تو جدید زمانے کی زندگی سے اسے اور قریب لانا ہوگا۔ ایسا کرنے کے لئے اسلوب اور تکنیک دونوں میں تبدیلی کے لئے تیار رہنا چاہئے۔ یہ ضرور ہے کہ یہ تبدیلیاں سلیقے سے کی جائیں تاکہ غزل اپنے آپ کو برقرار رکھتے ہوئے موجودہ نسل کی ذہنی الجھنوں، خواہشوں اور مقصدوں کی آئینہ دار بن سکے۔''[۱]

یوسف صاحب کا ماننا ہے کہ ہر زمانے کی شاعری اس زمانے کے رسم و رواج، معاشرتی اور سماجی حالات اور تمدنی اور حکمیاتی وسائل سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ جدید تمدن کے تاثرات میں مشین کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ مشین جدید تمدن کا سب سے بڑا کارنامہ ہے۔ یہ ایسی حقیقت ہے جس سے فرار ممکن نہیں۔ آنے والے شاعر اس کو جذبے اور تخیل سے ہم آہنگ کریں گے۔ شاید مشینی دور میں غزل کا علامتی انداز بدلے گا۔ اردو کے غزل گو شاعروں میں غالبؔ کو اولیت حاصل ہے جن کے یہاں داخلیت اور خارجیت میں ہم آہنگی پائی جاتی ہے۔ یوسف صاحب کا ماننا ہے کہ:

''خارجی احوال کے علاوہ فن کار کی روحانی آزادی کو بھی ماننا چاہئے۔ اعلیٰ درجے کے آرٹ کی تخلیق کسی بندھے ٹکے اجتماعی پروگرام کے تحت عمل میں نہیں آتی جس میں انفرادیت کا جوہر موجود نہ ہو۔ جن قوموں میں عام لوگوں کی تعلیم کا معیار اچھا خاصا بلند ہے۔ ان میں بھی فن کار اپنے آرٹ کو عوام کی ذہنی اور جذباتی سطح پر نہیں لاتا بلکہ عوام کو اپنے بلند معیار تک لے جانے کی کوشش کرتا ہے۔ دنیا کے جتنے بھی بڑے فنکار یا شاعر ہوئے ہیں انھوں نے عوام سے اپنا

۱۔ اردو غزل، یوسف حسین خاں، ص ۳۵۰

رشتہ رکھتے ہوئے بھی اپنے معیار کو ان کی ذہنی سطح سے بلند رکھا ہے کہ بغیر اس
کے زندگی کی تخیلی ترجمانی ممکن نہیں۔ دانتے، شیکسپیئر، گوئٹے اور غالب اپنے
اپنے ماحول سے تعلق رکھتے ہوئے بھی اس سے کسی قدر بلند ہیں۔ گرد و پیش
کے اثر کے باوجود ان کے کلام میں کسی قدر عالم گیریت ہے۔'' [۱]

جدید زمانے کا انسان اور اس کا تجزیہ کے ذیلی عنوان کے زیر بحث یوسف صاحب نے اپنی کتاب اردو غزل میں جدید مغربی ادبی تحریکات اور شعری محرکات کا تنقیدی جائزہ لیا ہے اور غزل کے فن کو جانچنے کی سعی کی ہے۔ ان کا ماننا ہے کہ غدر سے پہلے پہلی جنگ عظیم سے پہلے ادب میں کلاسیکی ہیومن ازم انسان دوستی کے اثرات کام کر رہے تھے۔ لیکن جنگ کے بعد یورپ کی تہذیبی زندگی میں کافی تبدیلیاں رونما ہوئیں جس کی وجہ سے بہت سے فنکار منظر عام پر آئے۔ امپسٹ، سمبولسٹ اور سرریل اسٹ فنکار اب تک کوئی مکمل فلسفۂ حیات نہیں پیش کر سکے۔ سرریل ایسٹ فنکار تحت شعوری تلازموں کو شعور پر ترجیح دیتے ہیں۔ یوسف صاحب کا ماننا ہے کہ سرریل اسٹ فنکار کو ایسی تحت شعوری کیفیت محسوس کرنے کا حق ہے لیکن کیا اس سے زندگی کے مسائل حل ہو جائیں گے؟ سرریل ایسٹ شاعروں کی انفرادیت پسندی کے ڈانڈے تراج تراج سے جا کر مل جاتے ہیں۔

ان کے یہاں تحت شعور میں اس قدر غلو برتا گیا ہے کہ گویا عقل و فکر کو زندگی میں کچھ دخل ہی نہیں۔ ایسے فنکاروں کے یہاں نہ صرف اخلاقی بلکہ جمالیاتی قدریں بھی باقی نہیں۔ وہ لفظوں کی بھول بھلیوں میں ایسا گم ہوتا ہے کہ ان سے باہر نکلنے کا راستہ اسے نہیں ملتا۔ یہی حال سمبولسٹوں کا ہے۔ بودلیر، رمبو، ورلین، ملارمے اور اس طرز کے دوسرے شاعروں نے جو چیستانی ابہام کی بنیاد ڈالی کم و بیش یہی کیفیت امپسٹ شاعروں کی بھی ہے۔ ان کے یہاں بھی خیالی تلازموں کی زیادتی ہوتی ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ مغربی ادب کے ان مختلف طرزوں دبستانوں میں بعض باتیں ایسی ہیں جن سے ہمارا ادب فائدہ

۱۔ اردو غزل، یوسف حسین خاں، ص ۳۷۷

اٹھا سکتا ہے۔ لیکن ہم ان مختلف تحریکوں سے انتخاب تو کر سکتے ہیں لیکن پیروی کسی کی بھی نہیں کرنی چاہئے۔ یورپ کے جدید ادب میں بعض بنیادی صداقتیں ہیں۔ ان کو ہمارا ادب نظر انداز نہیں کر سکتا۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو ان صداقتوں کے اصلی عناصر غزل میں صدیوں سے موجود رہے ہیں۔ سمبولسٹ کی رمز و علامت، امجسٹ کی لفظی تصویر کشی اور سرریل اسٹ کی تحت شعوری الجھن یہ سب کسی نہ کسی شکل میں غزل میں موجود رہے ہیں۔ یوسف حسین کے بقول:

> ''شاعر چاہے کتنا ہی حقیقت پسندی کا دعویٰ کرے وہ اپنے شعر کے لئے جو اسلوب اور موضوع منتخب کرے گا اس میں اس کا ذاتی رجحان لازمی طور پر موجود رہے گا..... شاعر اور خاص طور پر غزل گو شاعر اپنے موضوع سے جذباتی تعلق رکھتا ہے۔ جب شاعر اپنے موضوع کو زبان و بیان کا جامہ زیب تن کراتا ہے تو غیر شعوری طور پر وہ اس کو اپنے جذباتی اور ذہنی نظام کا جز بنالیتا ہے۔ یہ جذباتی اور ذہنی نظام شعور اور تحت شعور دونوں پر حاوی ہوتا ہے۔''[1]

ہمارے ادب کے لئے وقت کا سب سے بڑا مسئلہ یہی ہے کہ اس میں خارجی مسائل کو کس طرح سمویا جائے تا کہ ان کی نسبت ہماری بصیرت میں اضافہ ہو سکے۔ لیکن جب یہ مضمون شعر میں ادا کئے جائیں تو اس میں فکری عنصر کو لازمی طور پر کرنا پڑے گا اور یہ فکر تخیلی فکر ہوگی۔ اس طرح جب علامتی تخیل میں تصور و فکر پیوست ہو جائیں گے تو وہ تجریدی حالت میں نہیں رہ سکتے۔ تخیلی فکر کی قوت اس کی گہرائی میں پوشیدہ ہے۔ یہ قوت صورت پذیری اور نظم آفرینی کے سارے انداز اپنے اندر پنہاں رکھتی ہے۔ وہ جب خارجی حقائق کو اپنے اندر جذب کرتی ہے تو موضوع و معروض کی دوئی باقی نہیں رہتی اس طرح عین اور حقیقت، فطرت اور آزادی، شعور اور لاشعور، انفرادیت اور اجتماعیت کے تضاد دور ہو جاتے ہیں اور شعر زندگی کی خوبصورتی کا ضامن بن جاتا ہے۔

۱۔ اردو غزل، یوسف حسین خاں، ص ۳۸۸۔۳۸۹

غزل گو شاعر جب زندگی کا ذکر کرے گا تو لازمی طور پر اس کے لامحدود امکانوں کی طرف اس کی نظر جائے گی۔ وہ کبھی اپنی خواہشوں کا رنگ اس پر چڑھائے گا اور کبھی ان کے اثر سے اپنی آرزوؤں کی صورت گری کرے گا۔ وہ حسن آفرینی بھی کرے گا اور قدر آفرینی بھی۔ لیکن یہ کام وہ تجرید اور منطقی مقدمات سے نہیں انجام دے سکتا جن کا لازمی نتیجہ کلام میں بے لطف یکسانیت اور سپاٹ پن ہوگا۔ شاعر کی فکر تخیلی اور وجدانی ہونی چاہئے جس میں اندرونی جذبے کا رس بھرا ہوا ہو۔ بغیر اس کے کلام میں تاثیر و دلکشی نہیں پیدا ہو سکتی۔

یوسف صاحب کی یہ کتاب غزل شناسی کے میدان میں کافی اہمیت کی حامل ہے۔ یوسف صاحب نہ تو ایک اعلیٰ پایہ کے نقاد ہیں اور نہ ہی اردو ادب کے استاد، لیکن وہ ایک سنجیدہ محقق، بلند پایہ مورخ اور باذوق ادیب کی حیثیت سے اپنی شناخت رکھتے ہیں۔ ان کی جامع تصنیف ''اردو غزل'' کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ یہ کتاب اردو کے سرمائے میں بہترین اضافہ ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد۔ مذہبی افکار، صحافت اور قومی جدوجہد

یہ مولانا ضیاء الدین اصلاحی کی تالیف ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد ایک نابعۂ روزگار اور عہد ساز شخصیت تھے۔ ان کی دینی، علمی، ادبی، سیاسی، قومی اور ملی خدمات نہایت متنوع اور گوناگوں ہیں۔ ان کے کارناموں کی گونج سے عرصۂ دراز تک گنبد مینا پر شور رہے گی۔ مولانا اپنے جن امتیازات، کمالات اور خصوصیات کی بدولت پورے ملک پر چھائے ہوئے تھے اور ان کی جن غیر معمولی ذہنی، دماغی قابلیتوں نے لوگوں کے قلب و نظر پر اپنے گہرے نقوش ثبت کئے تھے اور پورے عہد و ماحول کو متاثر کیا تھا ان میں ایک بہت نمایاں وصف ان کی صحافت بھی ہے۔ اسی سے ان کی علمی و ادبی زندگی کا آغاز ہوا۔ اس کے علاوہ مولانا کی قومی و سیاسی خدمات ملک کی آزادی میں حصہ، ہندوستانی قومیت کے استحکام اور فرقہ وارانہ اتحاد و ہم آہنگی کے لئے بھی جو کوششیں کی ہیں اور ملک و قوم خاص طور پر مسلمانوں کی ذہنی و سیاسی تربیت میں جو

کارنامے انجام دیئے ہیں اس کتاب میں ان سب کا ذکر ہے۔

اس کتاب کا شمار دارالمصنفین کی نئی کتابوں میں ہوتا ہے۔ اس کتاب کی تالیف کے اصل محرک جناب محمد امین مسعود صدیقی صاحب (ساکن لکھنؤ) تھے۔ مسعود صاحب کو مولانا آزاد سے کافی عقیدت تھی اور وہ ان کے شیدائی تھے۔ مولانا ضیاالدین صاحب مرحوم سے بھی مسعود صاحب کی کبھی کبھی خط و کتابت رہتی تھی۔ مولانا ضیاء الدین صاحب کی ملاقات مسعود صاحب سے لکھنؤ میں ہوئی۔ گفتگو سے مولانا ضیاء الدین صاحب مرحوم کو اس بات کا بخوبی اندازہ ہوگیا کہ مسعود صاحب مولانا آزاد سے غیر معمولی عقیدت رکھتے ہیں اور ان کے شیدائیوں میں سے ہیں۔ مولانا ضیاء الدین صاحب دیباچہ میں اس کتاب کی وجہ تالیف سے متعلق لکھتے ہیں:

> ''مسعود صاحب نے پہلی ہی ملاقات میں اس بات پر بڑا زور دیا کہ دارالمصنفین سے مولانا آزاد پر کوئی کتاب ضرور شائع ہونی چاہئے۔ میں اس کو ٹالتا رہا مگر وہ کہاں ماننے والے تھے۔ بالآخر مجھے سر تسلیم خم کر کے یہ کہنا پڑا بیاما سپر انداختیم۔ اس طرح اس کتاب کی اشاعت کے اصل محرک وہی ہیں۔ انہیں کی ترغیب و اصرار سے یہ پایہ تکمیل کو پہنچی اور انھوں نے اس کی طباعت کے لئے ''مولانا آزاد۔ مہاتما گاندھی اسٹڈی فورم'' سے رقم بھی فراہم کرانے کا وعدہ کیا ہے۔ ان سطور کی تحریر کے وقت کچھ جزوی رقم موصول بھی ہو چکی ہے۔ اس کے لئے میں خود اور کارکنان دارالمصنفین ان کے ممنون ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر دے۔'' [1]

اس کتاب کو تین حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔ پہلا حصہ مذہبی افکار، صفات الٰہی کے عنوان سے ہے جس کے عناوین میں ربوبیت، رحمت، عدالت، صفات الٰہی کا قرآنی تصور پر مولانا آزاد کے خیالات کو

۱۔ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ضیاء الدین اصلاحی، ص ۳

مجتمع کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ربوبیت کے عنوان کے تحت پہلے سورہ فاتحہ کی اہمیت و جامعیت، حمد کا مفہوم اور لفظ اللہ کی حقیقت اور اس کا مفہوم بیان کیا گیا ہے۔ سورہ فاتحہ میں بیان کردہ صفات الٰہی، ربوبیت، رحمت اور عدالت کے متعلق مولانا آزاد کے افکار و خیالات اور تصورات پر مفصل اور دل آویز بحث کی گئی ہے۔ صفت ربوبیت کی توضیح میں ربوبیت الٰہی کے مظاہر، رب و ربوبیت کی حقیقت، نظام ربوبیت، عناصر حیات، نظام پرورش، نظام ربوبیت کی وحدت کی کارفرمائیوں وغیرہ کے متعلق مولانا کے خیالات کی ترجمانی کی گئی ہے۔ ربوبیت معنوی سے متعلق مولانا لکھتے ہیں ''ربوبیت کا فیضان ہے کہ ہر مخلوق کی ظاہری و باطنی بناوٹ کی ہر قوت اس کے سامان پرورش کی نوعیت کے مطابق ہوتی ہے اور اسے زندہ رکھنے اور نشو و نما پانے میں معاون ہوتی ہے۔ اس کے جسم و قویٰ کی نوعیت اس کے حالات پرورش کے مقتضیات کے خلاف نہیں ہوتے۔ مولانا اس بارے میں مشاہدہ و تفکر سے نمایاں آنے والی دو باتوں کی طرف قرآن حکیم کے توجہ دلانے کا ذکر کرتے ہیں جس کے ذیلی عنوان میں تقدیر، ہدایت، وجدان کی ہدایت، حواس و ادراک کی ہدایت کا ذکر کیا ہے۔ اس کے علاوہ برہان ربوبیت کا ذکر کرتے ہوئے مولانا آزاد کے خیالات کو اس طرح رقم کرتے ہیں:

> ''مولانا کے نزدیک قرآن کے طریق استدلال کا اولین مبدأ تعقل و تفکر کی دعوت ہے جس سے اس کی کوئی سورہ اور سورہ کا کوئی حصہ خالی نہیں وہ فرماتے ہیں کہ کائنات خلقت میں تفکر کرنے سے انسان پر حقیقت شناسی کا دروازہ کھلے گا اور سب سے پہلے اس کے سامنے تخلیق بالحق کے عالمگیر اور بنیادی قانون کی حقیقت نمودار ہوگی۔ یعنی کائنات خلقت کی ہر چیز نظم و ترتیب کے ساتھ ایک خاص نظام و قانون میں منسلک ہے اور اس کی ہر بات حکمت و مصلحت کے ساتھ بندھی ہوئی ہے۔'' [۱]

۱۔ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ضیاء الدین اصلاحی، ص ۲۳

نظام ربوبیت سے توحید پر استدلال : توحید پر نظام ربوبیت سے قرآن مجید نے جابجا استدلال کیا ہے۔ مولانا اس کے متعلق فرماتے ہیں کہ جو رب العالمین تمام کائنات کی پرورش کر رہا ہے اور جس کی ربوبیت کا احساس انسان کے دل کے ایک ایک ریشہ میں ہے اسی کے آگے بندگی و نیاز کا سر جھک سکتا ہے۔ اس کو ثابت کرنے کے لئے مولانا نے قرآن مجید سے مثالیں بھی دی ہیں۔

نظام ربوبیت سے وحی و رسالت پر استدلال کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں ''جس رب العالمین نے پرورش کے لئے ربوبیت کا ایسا نظام قائم کیا ہے وہ روحانی فلاح و سعادت کے لئے کوئی نظام اور قاعدہ مقرر نہیں کرے گا۔ وہ کہتے ہیں کہ جسم کی طرح روح کی بھی ضرورتیں ہیں۔ یہ ناممکن ہے کہ جسم کی نشو و نما کے لئے تو اس کے پاس سب کچھ ہے لیکن روح کی نشو و نما کیلئے اس کے پاس کوئی پروردگاری نہ ہو۔ ان کے نزدیک یہ بات کسی قدر تعجب انگیز ہے کہ اس کی پروردگاری اجسام کی پرورش کے لئے آسمان سے پانی برسائے لیکن ارواح کی پرورش کے لئے اس کے پاس ایک قطرۂ فیض نہ ہو۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس کا قانون ہے کہ جس طرح زمین شادابی سے محروم ہو کر مردہ ہو جاتی ہے تو باران رحمت نمودار ہو کر زندگی کی برکتوں سے اس کے ذرے ذرے کو مالا مال کر دیتی ہے۔ اس طرح جب عالم انسانیت ہدایت و سعادت کی شادابیوں سے محروم ہو جاتا ہے تو اس کی باران رحمت نمودار ہو کر ایک ایک روح کو پیام زندگی پہنچا دیتی ہے۔''

نظام ربوبیت سے معاد پر استدلال : مولانا اصلاحی نے قرآن مجید کا طرز استدلال کے ذیلی عنوان پر بھی مولانا آزاد کے خیالات کی ترجمانی کی ہے۔

رحمت : سورہ فاتحہ میں اللہ تعالیٰ کی صفت ربوبیت کے بعد اس کی صفت رحمت کا تذکرہ ہوا ہے۔ مولانا آزاد نے اس کے وسیع و ہمہ گیر پہلوؤں پر بڑی دل آویزی موثر اور دل نشین بحث کی ہے۔ یہاں اس کے متعلق مولانا آزاد کے افکار و خیالات کی وضاحت پیش کی گئی ہے جس میں رحمت کا مفہوم، رحمان و رحیم کا فرق، رحمت کیا ہے؟ تعمیر و تحسین کائنات رحمت الٰہی کا نتیجہ، افادہ و فیضان فطرت، کائنات کی تخریب بھی تعمیر کے لئے ہے، جمال فطرت، فطرت کی حسن افروزی اور رحمت الٰہی کی بخشش، قدرتی سامان راحت

اور انسان کی ناشکری، معنوی جمال، بقائے انفع، تدریج وامہال۔ قرآنی اصطلاح میں اجل، تکویر، تاخیر اجل، زندگی کی محنتیں اور کاوشیں، مشغولیت وانہماک، حالات کے تفاوت کے باوجود سب کے لئے دل بستگی وسرگرمی، اشیا ومناظر کا اختلاف، رات ودن کی مختلف حالتیں، ہر چیز کا دور دور ہونا، نسب وصہر، ایام حیات کا تغیر وتنوع، رحمت سے خدا کی ہستی پر استدلال، موزونیت وتناسب، رحمت سے معاد پر استدلال، رحمت سے وحی وتنزیل کی ضرورت پر استدلال، انسانی اعمال کے معنوی قوانین پر رحمت سے استدلال، تدریج وامہال، تاجیل، استعجال بالعذاب، قضا بالحق اور اقوام وجماعت، انفرادی اور مجاز دینوی، معنوی قوانین کی مہلت بخشی اور توبہ وانابت، رحمت الٰہی اور مغفرت وبخشش کی وسعت وفراوانی، اسلامی عقائد کا دینی تصور رحمت پر مبنی ہے، خدا اور بندوں کا رشتہ محبت کا ہے، قرآن مجید سراسر رحمت کا پیام ہے، مقام انسانیت اور صفات الٰہی سے تشبہ وتخلق، احکام وشرائع، حضرت مسیحؑ کی تعلیم کے بارے میں غلط فہمی کا ازالہ، حضرت مسیح کی دعوت کی اصل نوعیت، مواعظ مسیحؑ کے مجازات کو تشریع وحقیقت سمجھنا غلطی ہے، اعمال انسانی میں اصل رحمت ومحبت ہے، عمل وعامل میں امتیاز، انجیل وقرآن کی تعلیم میں کوئی اختلاف نہیں، قرآن مجید کے زواجر وقوارع، کفر محض اور کفر جارحانہ، ان تمام ذیلی عنوانات پر مولانا ضیاء الدین صاحب نے مولانا آزاد کے خیالات کی ترجمانی کی ہے۔

''انجیل اور قرآن کی تعلیم میں کوئی اختلاف نہیں'' اس عنوان کے تحت مولانا ضیاء الدین صاحب نے مولانا آزاد کے خیالات کو الفاظ کا جامہ پہنایا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

''انجیل وقرآن مجید کی تعلیم میں اصلاً کوئی فرق نہیں ہے۔ فرق صرف محل بیان اور پیرایۂ بیان کا ہے۔ حضرت مسیحؑ نے صرف اخلاق اور تزکیۂ طب پر اس لئے زور دیا کہ شریعت موسوی موجود تھی جس کا ایک نقطہ بھی وہ بدلنا نہیں چاہتے تھے۔ رہا قرآن مجید تو مولانا کے نزدیک اس نے اخلاق وقانون دونوں کے احکام بیک وقت بیان کئے ہیں۔ اس لئے اس نے مجازات ومتشابہات کی جگہ احکام وقوانین کا صاف جچا تلا پیرایہ اختیار کیا۔ پہلے عفو ودرگزر پر زور دیا اور اسے نیکی وفضیلت کی اصل قرار دیا۔ مگر چونکہ بعض ناگزیر

حالتوں میں بدلہ لینے اور سزا دینے کے بغیر کوئی چارہ نہیں ہوتا اس لئے اس کا بھی دروازہ کھلا رکھا۔ مگر اس میں کسی طرح کی زیادتی اور ناانصافی سے قطعی اور صریح لفظوں میں روک بھی دیا۔ وہ دنیا کے تمام انبیاء و شرائع کے احکام کا ماحصل یہی تین اصول بتاتے ہیں۔

عدالت: سورہ فاتحہ میں ربوبیت ورحمت کے بعد خدا کی صفت عدالت کا ذکر ہے اور اس کے لئے مالک یوم الدین کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔ دین کو مولانا ابوالکلام آزاد نے سامی الاصل لفظ بتایا ہے اور لکھا ہے کہ سامی زبانوں میں یہ بدلہ اور مکافات کے معنوں میں بولا جاتا ہے۔ پھر آئین و قانون کے معنوں میں بھی بولا جانے لگا، عبرانی اور آرامی میں اس کے متعدد مشتقات ملتے ہیں۔ آرامی زبانوں ہی سے غالباً یہ لفظ قدیم ایران میں بھی پہنچا اور پہلوی میں ''دینیہ'' نے شریعت اور قانون کا مفہوم پیدا کرلیا اور زردشتیوں کی قدیم ادبیات میں انشاد کتابت کے آئین وقواعد کو بھی دین دبیرہ کے نام سے موسوم کیا ہے۔ ان کی ایک مذہبی کتاب کا نام بھی ''دین کارت'' ہے جو غالباً نویں صدی مسیحی میں عراق کے ایک موبد نے مرتب کی تھی۔

> ''دین کے لفظ کی اس وضاحت کے بعد مولانا نے عربی میں اس کے معنی اچھے یا برے بدلہ و مکافات بتائے ہیں اس لئے مالک یوم الدین کے معنی ان کے نزدیک یہ ہوئے کہ وہ جزا کے دن کا حکمراں ہے۔ یعنی روز قیامت کا۔'' ۱

دین سے جزا کی حقیقت کی وضاحت، مجازات عمل قانون فطرت کا ایک گوشہ ہے۔ مادیات کی طرح معنویات میں بھی خواص ونتائج ہیں، قرآنی اصطلاح کسب، **من عمل صالحا فلنفسه و من اساء فعليها**، دین کے معنی قانون ومذہب، مالک یوم الدین عدالت الٰہی کا اعلان ہے، تین معنوی عناصر، تعمیر وتحسین عدل وتوازن کا نتیجہ ہیں، وضع میزان، انسانی اعمال کا عدل وقسط پر مبنی ہونا عمل صالح ہے، بدعملی کے لئے قرآنی القسط، ان تمام عنوانات پر مولانا آزاد کے خیالات کی وضاحت وترجمانی کی ہے۔

صفات الٰہی کا قرآنی تصور سے متعلق مولانا اصلاحی نے مولانا آزاد کے بیانات کو اس طرح رقم کیا ہے۔

۱۔ مولانا ابوالکلام آزاد، ضیاء الدین اصلاحی، ص ۹۸

''قرآن مجید نے خدا کی صفات کا جو تصور قائم کیا ہے سورہ فاتحہ اس کی سب سے پہلی رونمائی ہے۔ اس مرقع میں ہم وہ شبیہ دیکھ سکتے ہیں جو قرآن نے نوع انسانی کے سامنے پیش کی ہے۔ یہ شبیہ ربوبیت، رحمت اور عدالت کی ہے۔ ان ہی تینوں صفتوں کے تفکر سے ہم اس کے تصور الٰہی کی معرفت حاصل کر سکتے ہیں۔

مولانا آزاد کے نزدیک خدا کا تصور ہمیشہ انسان کی روحانی و اخلاقی زندگی کا محور رہا ہے۔ کسی مذہب کے معنوی ونفسیاتی مزاج کی حقیقت اور اس کے پیروؤں پر اس کے اثرات کی کیفیت صرف اس طرح معلوم کی جاسکتی ہے کہ اس کے تصور الٰہی کی نوعیت کیا ہے، ترجمان القرآن میں تفسیر سورہ فاتحہ کے ضمن میں قرآن اور صفات الٰہی کے تصور کے بحث پر جو کچھ لکھا گیا ہے اسے سہولت کے خیال سے تین حصوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔

۱۔ توحید والوہیت کے بارے میں انسانی تصور کی ابتداء اور اس کی قدامت، کیوں کہ ارتقائی نظریہ سے خدا کی ہستی کے اعتقاد میں نہیں بلکہ اس کی صفات کے تصورات کے مطالعہ میں مدد ملتی ہے۔

۲۔ ظہور قرآن کے وقت صفات الٰہی کے متعلق دنیا کے تمام تصورات

۳۔ الوہیت اور صفات الٰہی کا قرآنی تصور

مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنی محنت ولگن اور تحقیق وجستجو سے جو نتائج پیش کئے ہیں اس سے ان کی دقت و وسعت نظر اور توحید وصفات الٰہی کے مسئلہ میں صحیح وصائب اور معتدل ومتوازن نقطۂ نظر کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں مولانا ضیاء الدین صاحب نے مولانا آزاد کے خیالات و بیانات کی ترجمانی ان ذیلی عنوانات کے تحت کی ہے۔

توحید والوہیت کے تصور کی قدامت: توحید والوہیت کے تصور کی قدامت، انیسویں صدی کے نظریے اور ارتقائی مذہب، بیسویں صدی کی تحقیقات، دجلہ وفرات کی وادیوں کی قدیم آبادیاں اور خدا کی ہستی کا توحیدی تصور، مہنجد ارو کا خدائے واحد ''اون'' اللہ کی یگانہ اور ان دیکھی ہستی کا قدیم سامی تصور، انسان کی

پہلی راہ ہدایت کی تھی گمراہی بعد کو آئی۔ دینی نوشتوں کی شہادت اور قرآن مجید کا اعلان، عقل انسان کی درماندگی اور صفات الٰہی کی صورت آرائی، ارتقائے تصور کے نقاط ثلاثہ، انسان کا تصور صفات قہریہ کے تاثر سے کیوں شروع ہوا؟ فطرت کے سلبی مظاہر کی قہرمانی اور ایجابی مظاہرہ کا حسن و جمال، نزول قرآن کے زمانے میں صفات الٰہی کے بارے میں دنیا کے عام تصور، لاؤ ٹزو اور کنگ فوزی کی تعلیم، ہندوستانی تصور، اوپنیشد کا توحیدی اور وحدۃ الوجودی تصور، (۱) شمنی (۲) یا بودھ مذہب کے تصورات، ایرانی مجوسی تصور، یہودی تصور، مسیحی تصور، فلسفہ یونان و اسکندریہ کا تصور، اسکندریہ کا مذہب اور افلاطون جدید۔ ان ذیلی عنوانات کے تحت مولانا آزاد کے خیالات کی ترجمانی کی ہے۔

قرآنی تصور: قرآن مجید کے ظہور کے وقت چھٹی صدی مسیح میں خدا کی ذات وصفات کے متعلق پائے جانے والے ان تصورات کا جائزہ لینے کے بعد حضرت مولانا قرآن مجید کے تصور الٰہی کو نمایاں کرتے ہیں اور اس کی پیش کردہ تصور کو سب سے جامع اور بلند قرار دیتے ہیں۔ اس سلسلے میں قابل غور سات امور بھی درج ہیں جن میں پہلے نمبر پر تنزیہہ کی تکمیل کا ذکر ہے۔ اس کے ذیلی عنوان میں آریائی اور سامی نقطۂ خیال کا اختلاف، محکمات ومتشابہات اور اوپنیشد کا مرتبہ اطلاق ومرتبہ تشخص کا ذکر مختصراً کیا ہے۔

دوسرے نمبر پر صفات رحمت و جمال کا ذکر ہے۔ تیسرے نمبر پر اشترا کی تصورات کا کلی انسداد کے عنوان کے تحت توحید فی الصفات، مقام نبوت کی حد بندی کا ذکر ہے۔ چوتھے نمبر پر عوام وخواص دونوں کے لئے ایک تصور کا عنوان قائم کیا ہے۔ پانچویں نمبر پر تصور الٰہی کی بنیاد انسان کا عالم گیر وجدانی احساس ہے۔ چھٹے نمبر پر اسلام میں فرق مراتب کی نوعیت اور ساتویں نمبر پر سورہ فاتحہ میں صفات الٰہی کی تربیت کے بیان کا ذکر ہے۔

سورہ فاتحہ میں صفات الٰہی کی ترتیب بیان سے متعلق مولانا آزاد کے خیالات کی ترجمانی مولانا ضیاء الدین صاحب نے اس طرح کی ہے:

''مولانا کے نزدیک ساتواں قابل غور پہلو سورہ فاتحہ میں مذکور خدا کی تینوں

صفتوں کے بیان کی ترتیب ہے۔ وہ ان کو فکر انسانی کی طلب و معرفت کی قدرتی منزلیں قرار دیتے ہیں۔ ان کے خیال میں ربوبیت کا ذکر پہلے اس لئے ہے کہ کائنات میں سب سے زیادہ ظاہر نمود اسی صفت کی ہے اور ہر وجود کو اس کی احتیاج زیادہ ہوتی ہے۔ ربوبیت کے مشاہدات کے بعد نظر آگے بڑھی تو رحمت کا جلوہ نمودار ہوا جس کی حقیقت ربوبیت کے مقابلہ میں مطالعہ و تفکر کی محتاج تھی۔ پھر عدالت کی صفت جلوہ افروز ہوئی۔ اس کی نمود ہر جگہ اس لئے موجود ہے کہ رحمت و ربوبیت کا مقتضا یہی ہے۔''[1]

صحافت : دوسرے حصہ میں مولانا آزاد کی صحافت کا تجزیہ کیا گیا ہے۔

مولانا آزاد کی صحافت کا مقصد اخلاص و بے لوثی کے ساتھ ملک و قوم کی خدمت کرنا تھا۔ وہ صحافت کو اپنے اعلیٰ اور برتر مشن کی تکمیل کا ذریعہ سمجھتے تھے۔ مولانا آزاد کے سامنے قوم کی بیداری اور اس کی اصلاح تھی اور وہ صحافت کو ملک و قوم میں زندگی کی روح پھونکنے اور انقلاب پیدا کرنے کا ایک موثر ذریعہ سمجھتے تھے۔

صحافت کو مولانا نے بڑی عظمت اور وقار عطا کیا۔ ان کے صحافت کی طرف متوجہ ہونے سے اردو صحافت میں چار چاند لگ گئے اور وہ دنیا کی ترقی یافتہ زبانوں کے ہم پایہ اور علم و ادب کی صف میں آ کھڑی ہوئی۔ مولانا صحافت کی تکنیک اور اس کے جدید اصول و رموز سے اچھی طرح واقف تھے اور انھوں نے اپنی صحافت کو جدید تر بنانے کی پوری کوشش کی اور اس میں کامیابی بھی حاصل کی۔ یہی وجہ ہے کہ آج بھی مولانا کی صحافت کی معنویت اور تازگی قائم ہے اور اس پر مدت گزرنے کے باوجود کسی طرح کی کہنگی اور فرسودگی کے آثار نظر نہیں آتے۔

مولانا آزاد ستائیس آٹھائیس سال تک صحافت سے وابستہ رہے لیکن آب و آتش اور برق و خرمن

۱۔ مولانا ابوالکلام آزاد، ضیاء الدین اصلاحی، ص ۱۶۰

کی یکجائی کیسے ممکن ہوتی۔ چنانچہ اپنی شدید خواہش کے باوجود صحافت سے وہ اپنا رشتہ برقرار نہیں رکھ سکے جس کی حسرت یقیناً ان کو بھی رہی ہوگی اور دنیا کو بھی اس کا اشتیاق باقی رہ گیا کہ وہ دوبارہ الہلال کی صدائے رعد اور البلاغ کی صدائے پرسوز سنتی۔ مولانا کی ادارت میں یوں تو بہت سے رسائل و جرائد نکلے اور بہت سے رسالوں میں شریک و معاون رہے اور اس زمانے کے اکثر علمی و ادبی رسالوں میں ان کے مضامین شائع ہوتے تھے جس میں نیرنگ عالم، المصباح، لسان الصدق، الندوہ، وکیل، دارالسلطنت، الہلال، البلاغ، اقدام، پیغام، الجامعہ، پیام، الہلال ثانی، ثقافۃ الہند، ریویو، البصائر، مرقع عالم، مخزن، عصر جدید، علی گڑھ منتھلی، معارف کا تفصیل سے جائزہ لیا گیا ہے۔ لسان الصدق، الہلال اور البلاغ کا ذکر کافی طوالت سے کیا گیا ہے۔ لسان الصدق مولانا کی ادارت میں نکلنے والا پہلا باقاعدہ رسالہ ہے۔ اسی سے اصلاً ان کی صحافت کا آغاز ہوا۔ لسان الصدق کی اہمیت و بلند پائیگی کے عنوان کے تحت مولانا ضیاء الدین صاحب لکھتے ہیں:

> ''لسان الصدق اپنے زمانے کے معتبر بلند پایہ اور صف اول کے رسالوں میں شمار کیا جاتا تھا۔ اس کا حسن ترتیب اس کی سنجیدہ پر مغز اور فکر انگیز تحریریں، وقتی مسائل سے دلچسپی، معاشرتی اصلاح کا جذبہ، سنجیدہ اور عالمانہ لب و لہجہ، معیاری تنقید، اڈیٹر کی بالغ نظری، دیدہ وری اور اس زمانے کے لحاظ سے اچھی کتابت وطباعت نے علمی و ادبی حلقوں میں اس کا وقار و اعتبار قائم کر دیا اور ہر طرف سے اس کی داد و ستود ہونے لگی۔ مولانا شبلی، مولانا حالی، مولوی وحید الدین سلیم جیسے یگانہ روزگار مشاہیر نے اس کو قدر و تحسین کی نگاہ سے دیکھا اور کم عمری کے باوجود اتنا معیاری، معتبر اور باوقار رسالہ نکالنے پر بہت متعجب ہوئے۔ حقیقت یہ ہے کہ فکر و نظر کی جن بلندیوں پر لوگ عرصۂ دراز کے بعد پہنچتے ہیں اور ان میں علم و قلم کی پختگی، ادبی و تنقیدی دیدہ وری اور قوم و ملک کی

والہانہ خدمت کا جو جذبہ طویل العمر ہو جانے کے بعد پیدا ہوتا ہے وہ مولانا میں سولہ برس کی عمر میں ہی پیدا ہو گیا تھا۔'' [۱]

اس رسالے میں بعض معاصرین کے تبصرے، مضمون نگار اور قلمی سرپرست، زمانہ اشاعت، جلدیں اور مطبع، اہم خصوصیت، مقاصد، اہم تغیرات، لسان الصدق کی اردو خدمات، علامہ شبلی اور مولانا آزاد، زیر تصنیف کتابوں کی خبریں، کتابوں کا اشتہار اور ایڈورٹائز، نئے رسائل کی اطلاع، نئے رسالوں کا اشتہار، اخبار علمیہ، سرسید تحریک کا اثر، اعزاز و خطاب، تعزیتی تحریر، نوک جھونک، ان سب پر قلم آزمائی کی ہے۔

الہلال: مولانا ابوالکلام آزاد نے علم و ادب، مذہب و سیاست اور خطابت و صحافت ہر میدان میں لازوال کارنامے انجام دیئے۔ مولانا نے ۱۹۱۲ء میں ''الہلال'' نکالا۔ اس شہرہ آفاق جریدہ کی بعض امتیازات و خصوصیات اس موضوع کے تحت بیان کئے گئے ہیں۔ (۱) تمام اخباروں میں فائق و ممتاز (۲) نئی آواز نئی دعوت اور نیا پیغام (۳) ادبی لطافت اور دلکش اسلوب تحریر (۴) قومی جدوجہد اور تحریک آزادی (۵) جلیل عزائم اور بلند مقاصد، مضمون نگار اور ادارہ تحریر، حسن صورت اور مضامین کا تنوع۔ ان تمام ذیلی عنوانات پر مولانا آزاد کے خیالات قلم بند کئے گئے ہیں۔

حقیقت میں الہلال اردو صحافت کی تاریخ میں ایک سنگ میل بن گیا اور اس کی نگارشات اور قلمی فتوحات صحافت نگاری کا زریں اور ناقابل فراموش باب بن گئیں۔

الہلال اصل میں اپنے ہم وطنوں کے لئے ایک نئی آواز، نئی دعوت اور نیا پیغام لے کر افق صحافت پر شروع ہوا تھا۔ الہلال میں مولانا نے قرآنی آیتوں اور عربی عبارتوں کو نگینہ کی طرح جڑ دیا ہے جس سے طرز ادا اور پیرایۂ بیان زوردار، موثر اور بلیغ ہو گیا ہے اور اس سے ایک خاص قسم کا جلال و جمال پیدا ہو گیا ہے۔ اس کے علاوہ الہلال کی تحریروں میں مولانا نے طنز و مزاح کی آمیزش سے بھی کیف و وجد کا سامان پیدا کر دیا ہے۔ غرض یہ کہ الہلال ادب و انشا کی مرصع کاری کا نمونہ تھا۔ مولانا کے قلم نے اس کو ادب و

۱۔ مولانا ابوالکلام آزاد، ضیاء الدین اصلاحی، ص ۲۱۱۔۲۱۲

انشاء کا ایک چمنستان بنا دیا تھا۔ الہلال خاص طور پر مسلمانوں کو آزادی وحریت کا سبق دینے کے لئے اور یہ بتانے کے لئے جاری کیا گیا تھا کہ آزادی کی جدوجہد اور اس کا حصول ان کا دینی وملی فریضہ ہے۔ الہلال نے یہ اچھی طرح واضح کر دیا تھا کہ انقلاب آزادی کا طوفان آ کر رہے گا۔ اس لئے اگر مسلمان لیڈر آزادی کے دیوانوں اور انقلاب پسندوں کے گروہ میں شامل نہیں ہوئے تو یہ ان کی بڑی بدبختی ہوگی۔ قومی جذبات کی بیداری اور آزادی کی جدوجہد میں الہلال کی گراں قدر خدمات ہیں۔ الہلال کی آتش نوائی حکومت کے لئے ناقابل برداشت تھی۔ اس کے اجرا کو تین سال بھی نہیں گزرے تھے کہ پہلے اس سے دو ہزار پھر دس ہزار ضمانت طلب کی گئی اور آخر میں پریس ضبط کر لیا گیا۔

البلاغ : البلاغ الہلال کا ہی مثنیٰ تھا۔ دونوں کے مقاصد تقریباً ایک ہی تھے۔ تاہم کسی قدر انداز بدلا ہوا تھا۔ البلاغ میں تذکیر وہدایت اور دعوت وتبلیغ کی جانب اصل توجہ کی گئی ہے۔ مولانا نے البلاغ کو دعوت اور قرآنی پیام کی اشاعت کا ترجمان بنایا۔ الہلال اور البلاغ کا بنیادی مقصد ایک ہونے کے باوجود دونوں کے اسلوب و انداز اور دونوں کی نوعیتوں میں قدرے فرق واختلاف کا ذکر بھی بعض لوگوں نے کیا ہے۔۔

جناب مظفر حسین برنی لکھتے ہیں:

> ''البلاغ میں جو روح کارفرما تھی وہ الہلال سے کسی طور مختلف نہیں تھی لیکن اس میں اسلام کے اخلاقی فلسفہ پر زیادہ زور دیا تھا۔'' [1]

البلاغ کے اجرا کے زمانے میں مولانا بہت مشغول رہتے تھے اور بعض اہم علمی، تعلیمی و تصنیفی کام چھیڑے ہوئے تھے جس کی وجہ سے اشاعت میں تاخیر ہو جاتی تھی۔ چونکہ الہلال کی طرح البلاغ کی اشاعت بھی ہفتہ وار تھی مگر اس کا التزام نہیں ہو سکا اور اکثر پرچہ تاخیر سے چھپتا تھا۔

البلاغ کا پہلا نمبر ۱۲ نومبر ۱۹۱۵ء کو نکلا تھا اور آخری نمبر جو تین اشاعتوں پر ۱۷۔۲۴۔۳۱ مارچ

۱۔ ابوالکلام آزاد ایک ہمہ گیر شخصیت، ص ۲۷۲، بحوالہ مولانا ابوالکلام آزاد صحافت افکار اور قومی جدوجہد، ص ۲۵۴

۱۹۱۶ء پر مشتمل تھا شائع ہوا۔

۲۸ر مارچ ۱۹۱۶ء کو گورنمنٹ بنگال کا حکم جاری ہوا کہ مولانا حدود بنگال سے باہر چلے جائیں۔ دہلی، پنجاب اور یوپی کی حکومتیں پہلے ہی اپنے صوبہ میں ان کا داخلہ ممنوع قرار دے چکی تھیں۔ صرف بہار رہ گیا تھا اس لئے رانچی تشریف لے گئے جہاں ۳۱ر دسمبر ۱۹۱۹ء تک نظر بند رہے۔ مولانا رانچی پہنچنے کے بعد بھی البلاغ جاری رکھنے کی فکر میں تھے۔ چنانچہ انھوں نے سید صاحب کو اسے جاری رکھنے کے لئے خط لکھا۔ لیکن ان کی یہ تمنا پوری نہ ہوئی اور البلاغ نہ تو ان کی نظر بندی کے زمانہ میں نکلا اور نہ اس کے بعد۔ پھر بھی البلاغ اور الہلال کی آواز سے آج بھی گنبد مینا پر شور ہے۔

قومی وسیاسی جدوجہد میں مولانا آزاد کا حصہ

اس میں مولانا کی قومی وسیاسی خدمات، ملک کی آزادی، ہندوستانی قومیت کے استحکام اور فرقہ وارانہ اتحاد وہم آہنگی کے لئے ان کی کوششوں کا مختصر جائزہ لیا گیا ہے۔ اس عنوان کے تحت مولانا ضیاء الدین صاحب لکھتے ہیں:

> ''یہ تحریریں مختلف وقتوں میں مختلف موقعوں کے لئے لکھی گئی تھیں۔ اس کے علاوہ وہ موضوع کی یکسانیت بھی ہے۔ اس لئے ان میں تکرار سے بچنا ناممکن تھا۔ امید ہے اس مجبوری کے پیش نظر قارئین بھی انہیں گوارا کریں گے۔'' [۱]

اس کے ذیلی عنوانات میں مولانا آزاد کی قومی تحریک، قومی تحریک اور جدوجہد آزادی میں مولانا کی اولیت، مسلمانوں کے شکوک وشبہات کا ازالہ، مولانا کی سیاسی بصیرت اور دوراندیشی، ہندو مسلم اتحاد، جدید ہندوستان کے پس منظر میں مسلمانوں کی رہنمائی کے ذیلی عنوانات کو بحث کا موضوع بنایا ہے۔ اس کے علاوہ فرقہ وارانہ اتحاد وہم آہنگی کے فروغ میں مولانا آزاد کا حصہ کے ذیلی عنوانات پر خیالات کا اظہار کیا ہے۔

۱۔ مولانا ابوالکلام آزاد، ضیاء الدین اصلاحی، ص ۲۷۱

ہندو مسلم اتحاد کی اہمیت، مصالحانہ کوشش، ہندو مسلم جھگڑے ختم کرانا، اشتعال انگیز بیان سے پرہیز، مولانا کے افکار کی معنویت ان سب پر تجزیاتی نگاہ ڈالی ہے۔

مولانا آزاد شروع سے ہی ہندوستان کی آزادی کے علم بردار رہے۔ ان کے سیاسی سفر کا آغاز ۱۹۱۲ء میں ہوا جب انھوں نے کلکتہ سے الہلال جاری کیا۔ اس کے ذریعہ انھوں نے مسلمانوں کو آزادی اور حریت کا درس دیا۔ وہ عزم واستقلال کا پہاڑ تھے۔

مولانا نے آزادی کا صور پھونک کر ہندوستان کے مسلمانوں کو غلبۂ حق کا یقین اور آزادی کے متوالوں کو فتح وکامرانی کی نوید سنائی۔ یہ ان کے الفاظ کا جادو اور تحریروں کا سحر ہی تھا جس نے طرابلس کے مسلمانوں کے لئے ہندوستان کے مسلمانوں کے دلوں میں تڑپ پیدا کردی۔ ترک شہیدوں کے لئے ان کی آنکھوں سے خون کے آنسو رواں کردیئے۔ کان پور مسجد کے انہدام پر مسلمانوں کے ہر ہر گھر کو ماتم کدہ بنادیا۔

مولانا نے جس زمانہ میں آزادی کا صور پھونکا اور تیز وتند تقریریں اور اشتعال انگیز تحریریں لکھیں اس زمانے میں کانگریس کا کوئی رہنما اور ہندو لیڈر ایسی جوش وخروش سے بھری باتیں کہنے کی جرأت نہیں کرسکتا تھا۔ تحریک آزادی میں مولانا کی اس سبقت اور پیش قدمی کا اعتراف اس زمانے کے لیڈروں نے بھی کیا۔ ملک کی آزادی سے زیادہ مولانا کو ہندو مسلم اتحاد اور قومی یکجہتی عزیز تھی اور اس کے لئے وہ ہمیشہ فکرمند رہتے تھے۔ وہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو اخوت ومحبت اور اتحاد واتفاق کے رشتے میں منسلک رہنے کی ہمیشہ تاکید کرتے تھے۔ ان کے دل ودماغ پر متحدہ قومیت اور ہندو مسلم اتحاد کا جذبہ اور تصور ایسا چھایا ہوا تھا کہ وہ اس کے مقابلے میں ملک کی آزادی کو بھی بے سود مانتے تھے۔

مولانا فرقہ وارانہ اتحاد قائم رکھنے کے لئے ہمیشہ ایسے بیانات دینے کو ناپسند کرتے تھے جن سے فرقہ وارانہ جذبات میں اشتعال وہیجان پیدا ہو اور ہندو مسلم اتحاد کو نقصان پہنچے۔ لیکن آج ملک کا معیار جس طرح پستی کی طرف جارہا ہے مسلمانوں کو جس طرح ذلیل وخوار کیا جارہا ہے اس کا تجزیہ کرتے ہوئے ضیاء الدین صاحب اصلاحی مرحوم رقم طراز ہیں:

''حقیقت یہ ہے کہ ہندو مسلم اتحاد اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے بارے میں مولانا کے احساسات و خیالات کی معنویت آج بھی نہ صرف پوری طرح قائم و باقی ہے بلکہ پہلے سے زیادہ اہم اور ضروری ہوگئی ہے۔ ملک میں اختلاف و انتشار کا ماحول بن رہا ہے اور فرقہ واریت جو بال و پر نکال رہی ہے وہ ہمیں تفریق اور غلامی کی طرف لے جارہی ہے۔ اس کو ختم کرنے کے لئے مولانا کے بتائے ہوئے اصول و خطوط کی روشنی میں ملک کی تعمیر و ترقی کا نیا نقشہ بنانے کی ضرورت ہے۔ ورنہ ملک تباہ ہوجائے گا اور اس کی سیاسی آزادی بھی باقی نہیں رہے گی۔ آزادی کی بقا و تحفظ اور اسے مفید و بامقصد بنانے کے لئے ضروری ہے کہ ہندو مسلمان کو شک و شبہ کی نظر سے نہ دیکھیں۔ ان پر اعتماد کریں کروڑوں انسانوں کو نہ فساد اور دنگے سے معدوم اور نیست و نابود کیا جاسکتا ہے اور نہ انھیں غیر مطمئن، پریشان اور پست و ذلیل رکھنے میں ملک و قوم کی بھلائی ہے۔ ہندوؤں کی فسطائی جماعتیں اور احیائی تحریکیں اپنی موجودہ روش کو بدلیں۔ مسلمانوں کو ان کے جائز و جمہوری حقوق سے محروم کرکے نہ ملک و قوم کا سر اونچا کیا جاسکتا ہے اور نہ آزادی کو باقی رکھا جاسکتا ہے.....

ہندوؤں اور مسلمانوں کو یہ بات ذہن نشین کرلینی چاہئے کہ ملک کی آزادی کی کامیابی کا انحصار ہندو مسلم اتحاد کی مضبوطی اور پائیداری پر ہے۔ ملک کی آزادی و سالمیت کی طرح یہ بھی مولانا کا ایک اہم مقصد تھا۔ وہ آزادی سے دست بردار ہوسکتے تھے مگر ہندو مسلم اتحاد اور ملک کی وحدت و سالمیت سے کسی قیمت پر نہ کبھی دستکش ہوئے اور نہ ہوسکتے تھے۔

افسوس اور سخت افسوس ہے کہ ملک کا معیار و مذاق پست ہوتا جارہا ہے۔ اخلاق و روحانیت کا تصور ہی مٹ گیا ہے۔ عوام میں سیاسی شعور، پختگی، بالغ نظری اور نفع و نقصان کی پہچان نہیں ہے اور سیاست دانوں اور لیڈروں کو لوٹ کھسوٹ کا چسکا لگ گیا ہے۔ وہ عہدے، اقتدار اور وزارتوں کی لالچ میں ہر بے اصولی و بدعنوانی کرنے پر آمادہ ہوجاتے ہیں۔ ان حالات میں خدا جانے آزاد ہندوستان کا وہ خواب کب شرمندہ تعبیر ہوگا جسے مولانا آزاد اور ان کے رفقائے کار نے دیکھا تھا۔'' [۱]

۱۔ مولانا ابوالکلام آزاد، ضیاء الدین اصلاحی، ص ۲۹۶۔۲۹۷

اس کتاب کو پڑھنے کے بعد اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مولانا ضیاء الدین صاحب نے مولانا آزاد کے تمام مذہبی افکار وخیالات، صحافتی امتیازات وکمالات، قومی وسیاسی جدوجہد کو حقیقتاً انھیں کی تحریروں اور قولوں کو بنیاد بنا کر لکھا ہے۔ مولانا آزاد پر تحقیق کرنے والوں کے لئے یہ کتاب کافی معاون و مددگار ثابت ہوسکتی ہے۔ علاوہ ازیں یہ اردو ادب کے خزانے میں ایک بیش بہا اضافہ ہے۔

باب۔ چہارم

معارف کے اہم ادبی مضامین ایک تنقیدی جائزہ

باب۔ چہارم

معارف کے اہم ادبی مضامین ایک تنقیدی جائزہ

دارالمصنفین اعظم گڑھ ۱۹۱۵ء کے اوائل میں وجود میں آیا۔ ۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء کو علامہ شبلی اپنے بہت سے علمی وادبی کاموں کی تکمیل کئے بنا اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ مولانا شبلی نے دارالمصنفین کا جو خاکہ بنایا تھا اس میں ایک علمی رسالہ جس کا نام علامہ نے خود معارف تجویز کیا تھا، کا اجرا شامل تھا۔ مولانا شبلی کے انتقال کے بعد ان کے تلامذہ خاص نے ''اخوان الصفا'' کے نام سے ایک جماعت بنائی جس میں مولانا حمید الدین فراہی (صدر مجلس)، مولانا سید سلیمان ندوی ناظم، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا مسعود علی ندوی، مولانا شبلی متکلم رکن منتخب ہوئے۔ ان لوگوں نے علامہ شبلی کے خواہشات کے مطابق اعظم گڑھ میں دارالمصنفین کی بنیاد رکھی۔ جب دارالمصنفین کا کام باقاعدہ طور پر انجام پا گیا تو اس کے علمی ترجمان کو شائع کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ لیکن چونکہ ابتداء میں دارالمصنفین کا اپنا پریس نہیں تھا اس لئے معارف فوراً جاری نہ ہوسکا۔ جون ۱۹۱۶ء میں ادارے کا اپنا پریس قائم ہوا تو رسالے کا اجرا بھی عمل میں آیا۔

معارف کا پہلا شمارہ ۱۹۱۶ء میں منظر عام پر آیا۔ اس دن سے آج تک یہ رسالہ باقاعدگی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ اردو زبان کا کوئی دوسرا رسالہ شاید ہی اس خصوصیت کا متحمل ہو۔

رسالے کے اغراض و مقاصد سے متعلق مدیر معارف مولانا سید سلیمان ندوی نے معارف کے پہلے شمارہ میں اس طرح تحریر فرمایا ہے:

> ''رسالہ کا پہلا نمبر ہم رمضان المبارک کے مقدس مہینے میں شروع کرتے ہیں کہ ہمارے علوم و معارف کی سب سے پہلی کتاب اس ماہ مقدس میں نازل ہوئی تھی، شهر رمضان الذی انزل فیه القرآن۔''

سید صاحب نے معارف کے جو مقاصد بیان کئے ہیں وہ معارف کے منزل مقصود پر اچھی روشنی ڈالتے ہیں:

''فلسفہ حال کے اصول اور اس کا معتد بہ حصہ پبلک میں لایا جائے۔ عقائد اسلام کو دلائل عقلی سے ثابت کیا جائے۔ علوم قدیمہ کو جدید طرز اور از سر نو ترتیب دیا جائے۔ علوم اسلام کی تاریخ لکھی جائے اور بتایا جائے کہ اصل حصہ کہاں تک تھا اور مسلمانوں نے اس پر کیا اضافہ کیا۔ علوم مذہبی کی تدوین اور اس کے عہد بہ عہد کی ترقیوں کی تاریخ ترتیب دی جائے۔ اکابر سلف کی سوانح عمریاں لکھی جائیں جن میں زیادہ تر ان کے مجتہدات اور ایجادات سے بحث ہو۔ عربی زبان کی نادر الفن اور کمیاب کتابوں پر ریویو لکھا جائے اور دیکھا جائے کہ ان خزانوں میں ہمارے اسلاف نے کیا کیا زر و جواہر امانت رکھے ہیں۔ اور سب سے آخر لیکن سب سے اول یہ ہے کہ قرآن مجید کے متعلق عقلی، ادبی، تاریخی، تمدنی اور اخلاقی مباحث جو پیدا ہو گئے ہیں ان پر محققانہ مضامین شائع کئے جائیں۔ اگر صرف ان ہی مقاصد پر قناعت کر لی جائے تو بھی ہمارے نزدیک بڑا کام ہے۔ لیکن چونکہ یہ مضامین عموماً روکھے پھیکے اور مذاق عام میں بے مزہ ہوں گے اس لئے ادبیات، مباحث حاضرہ، مطبوعات جدیدہ، انتقاد و تقریظ اور استفسارات علمیہ کے عنوانات سے ان کی تلخی و خشکی دور کرنے کی کوشش کی جائے۔''[1]

معارف کی اشاعت اس وقت ہوئی جب ملک و قوم کو ایک بلند پایہ رسالے کی شدید ضرورت تھی۔ چنانچہ اس کی اشاعت پر علم پرور طبقہ میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ اس کا پرتپاک خیر مقدم کیا گیا اور ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ اردو کے موجودہ تمام اخبارات و رسائل نے اس پر پر جوش تبصرہ کیا، اور حوصلہ افزائی کی، اور اس میں

۱۔ معارف شذرات، جولائی ۱۹۱۶ء

شائع ہونے والے مضامین کو اپنے صفحوں اور کالموں میں نقل کیا۔ چنانچہ سید صاحب جنوری ۱۹۱۷ء کے شذرات میں تحریر کرتے ہیں:

''معارف کی نسبت ملک کے کثیر وقیع اور مشہور اخبارات و رسائل نے جن مادحانہ اور قدردانہ الفاظ کا اظہار کیا ہے وہ ہمارے لئے نہایت حوصلہ افزا ہے۔ اکثر معاصرین اس کے مضامین کو اپنے اخبار و رسائل میں نقل کرنے کا شرف بخشتے ہیں۔ ملک کا تمام روشن خیال اور علم دوست طبقہ بحیثیت مجموعی اس کو وقعت دیتا ہے، اور عزیز رکھتا ہے۔ تاہم اپنے عیوب سے ہم بے خبر نہیں۔ اس لئے اپنے بعض دوستوں کے نیک مشوروں کو ہم نے خوشی سے سنا اور قبول کیا۔'' [۱]

مولانا سید سلیمان ندوی صاحب کے ادارت میں معارف اپنے قائم کردہ معیار پر قائم رہا۔ یہ معارف کی خوش قسمتی تھی اس کا ہر صاحب طرز ادیب اور شاعر اپنی تحریری صلاحیتوں سے اس کا تعاون کرتا رہا۔ اگر کوئی ادیب یا شاعر معارف کی مدد نہ بھی کرتا تو رفقائے دارالمصنفین اپنی صلاحیتوں سے پورا رسالہ مرتب کر سکتے تھے۔

سید سلیمان ندوی صاحب کے پاکستان منتقل ہو جانے کے بعد شاہ معین الدین احمد ندوی صاحب معارف کے ایڈیٹر اور دارالمصنفین کے ناظم علمی مقرر ہوئے۔ شاہ صاحب کی ادارت میں معارف کی زبان اپنی جگہ برقرار رہی، لیکن مضامین کا تنوع ختم ہونے لگا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ معارف کے پرانے مضمون نگار ایک ایک کر کے دار فانی سے کوچ کرتے جا رہے تھے۔ پھر بھی شاہ صاحب نے معارف کی زبان کو برقرار رکھا جو ان کا ایک کارنامہ ہے۔

شاہ صاحب کی وفات کے بعد معارف کی ادارت مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی اور سید صباح الدین عبدالرحمٰن کے ذمہ آئی۔ مولانا قدوائی صرف پانچ سال تک ہی دارالمصنفین کی خدمات انجام دے

۱۔ معارف شذرات، جولائی ۱۹۱۷ء

سکے اور دنیا سے کوچ کر گئے۔

مولانا عبدالسلام قدوائی کی وفات کے بعد سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب دارالمصنفین کے علمی و عملی ناظم اور معارف کے ایڈیٹر مقرر ہوئے، اور انھوں نے دسمبر ۱۹۷۴ء سے نومبر ۱۹۸۷ء تک معارف کی ادارت اور دارالمصنفین کی نظامت سنبھالی۔ ان کے انتقال کے بعد یہ ذمہ داری ضیاء الدین اصلاحی کے سپرد ہوئی۔ مولانا اصلاحی نے ۲۰۰۸ء تک اس ذمہ داری کو بحسن وخوبی انجام دیا۔ مولانا اصلاحی کے انتقال کے بعد دارالمصنفین کی نظامت اور معارف کے ادارت کی ذمہ داری پروفیسر اشتیاق احمد ظلی صاحب کے سپرد ہوئی۔ فی الحال پروفیسر ظلی صاحب اپنی اس ذمہ داری کو احسن ڈھنگ سے ادا کرنے اور معارف و دارالمصنفین کی روایات کو برقرار رکھنے کی سعی کر رہے ہیں۔

معارف نے اپنے ابتدائی دور میں جو مقالات شائع کئے وہ کافی اہمیت کے حامل تھے۔ ان مقالات میں قرآن وحدیث، تفسیر، اصول تفسیر، فقہ، فتاویٰ، سیر وسوانح، آثار صحابہ جیسے موضوعات کا احاطہ کرنے کے ساتھ ساتھ فلسفہ، منطق، ہیئت، طب جیسے عقلی علوم کا بھی احاطہ کیا ہے۔ اس کے لکھنے والے زیادہ تر اصحاب قلم تھے، جنہیں قدیم علوم پر عبوریت ہونے کے ساتھ ساتھ جدید علوم سے واقفیت حاصل تھی۔ اس کے علاوہ عربی، فارسی اور اردو ادبیات کے موضوعات پر بھی مستقل مقالے شائع ہوتے ہیں۔ رسالے کی نوعیت کو برقرار رکھنے کے لئے اخبار علمیہ اور آثار ادبیہ کے بھی مستقل کالم ہوتے ہیں۔

معارف بنیادی طور پر ایک علمی رسالہ ہے جس کے زیادہ تر مضامین علمی اور تحقیقی ہوتے ہیں۔ لیکن اس میں ادبی مضامین بھی بڑی تعداد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ یہ مضامین بلند معیار کے متحمل ہونے کے علاوہ اردو ادب کی مختلف شاخوں اور اصناف سے متعلق ہوتے ہیں اس لئے ان میں تنوع پایا جاتا ہے۔ یوں تو معارف نے ۱۹۱۶ء سے آج تک کافی ادبی مضامین شائع کئے ہیں۔ ان تمام ادبی مضامین کا تنقیدی جائزہ لینا کافی طویل کام ہے۔ چنانچہ طوالت کے خوف سے میں نے اپنے اس باب میں چند اہم ادبی مضامین کا تنقیدی جائزہ لینے کی کوشش کی ہے وہ درج ذیل ہیں۔

ارتقائے ادب اردو (ستمبر ۱۹۱۷ء)

یہ مضمون ایم مہدی حسن نے معارف کے ایڈیٹر سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں لکھا تھا جس میں انجمن ترقی اردو کی توجہ مبذول کی گئی ہے کہ وہ زبان کی ترقی کے لئے اردو، عربی و فارسی لغت وقواعد اور محاورات، عقلیات اور انسائیکلو پیڈیا وغیرہ مرتب کرے۔ مہدی صاحب لکھتے ہیں:

> ''ملک کی کسی تعلیم یافتہ جماعت نے کبھی اس پر غور نہیں کیا کہ ہر چیز نظام طبعی رکھتی ہے اور اردو زبان بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں۔ کانفرنس ہو یا انجمن ترقی اردو زبان کا مسئلہ کبھی اس حیثیت سے پیش نظر نہیں رہا۔ یہاں تک کہ ان لائق افراد نے (جن کے دل ودماغ کے نتائج آج اردو کا بہترین سرمایہ ادب ہیں) منفرداً یا متفقاً کبھی یہ جاننے کی کوشش نہیں کی کہ لٹریچر کی فطری ضروریات کے لحاظ سے کون کون سے کام ہیں جن پر ترتیباً سے پہلے توجہ ہونی چاہئے اور دراصل ترقی اردو کے نظام ترکیبی کا اقتضائے طبعی ہے۔''[۱]

ایم مہدی صاحب نے اردو زبان کی ترقی کے بارے میں پروفیسر براؤن کیمبرج کو لکھ کر دریافت کیا تھا جس پر انھوں نے اپنی رائے لکھی کہ کسی زبان کو سرمایہ دار اور بااصول کرنے اور اسے ترقی دینے کی یہ قدرتی ترتیب ہے کہ کثرت سے صالح لٹریچر کی اشاعت کی جائے۔ ضخیم لغات کی ترتیب کے بعد اردو، فارسی اور عربی کی لاکھوں جلدیں لغات المبتدی کی حیثیت سے مرتب کی جائیں۔

سید سلیمان ندوی پروفیسر براؤن کی رائے سے متفق نظر نہیں آتے۔ ان کا ماننا ہے کہ ہمارے نزدیک یہ اس وقت ناقابل عمل ہے، جب تک کہ ملک میں اس کی مانگ اور قدردانی کا جذبہ نہ پیدا ہو۔ اردو انسائیکلو پیڈیا کی تجویز کی بہت سے لوگوں نے مخالفت کی ہے۔

سید صاحب کو تعجب ہوتا ہے کہ ہندوستان کے ہر اردو اخبار اور رسالہ کی خریداری وہاں زیادہ نہیں ہے جہاں

۱۔ معارف ستمبر ۱۹۱۷ء، ص ۱۶

وہ زبان بولی جاتی ہے بلکہ وہاں زیادہ ہے جہاں لوگ ابھی اس کو سمجھ رہے ہیں۔

سید سلیمان ندوی پروفیسر براؤن کی صلاح سے متعلق اپنے خیالات پیش کرتے ہیں:

''پروفیسر براؤن نے ہماری زبان کی ترقی کے لئے جو خاکہ تیار کیا ہے اس میں لغات ومحاورات، اردو کی جگہ سب سے پہلے ہے۔ اولاً اسی پر غور کرو، ابتداً جب اہل یورپ ہندوستان آئے تو ان کو اردو سیکھنے کی ضرورت پیش آئی۔ اس لئے اردو کے قواعد ومحاورات پر بہت سی کتابیں پیدا ہوگئیں۔ گورنمنٹ نے ابتدائی درجوں میں اردو کو داخل کیا۔ اس کی بدولت ہر سال قواعد اردو کے متعدد رسالے پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ چنانچہ ان کثیر التعداد رسائل کو چھوڑ کر جو اہل یورپ نے اپنی ضروریات سے مختلف زبانوں میں لکھے نیز بیسیوں رسالوں سے قطع نظر کر کے جو اسکول کے بچوں کے لئے لکھی گئیں قواعد کی حسب ذیل کتابیں ہماری زبان میں موجود ہیں۔

(۱) صرف اردو شیدا ۱۸۰۱ء، (۲) دریائے لطافت سید انشا ۱۸۰۲ء، (۳) رسالہ صرف ونحو مولوی احمد علی دہلوی ۱۸۴۵ء، (۴) رسالہ صرف ونحو مولوی صہبائی دہلوی ۱۸۴۹ء، (۵) رسالہ مولوی احمد حسن الہ آبادی ۱۸۵۹ء، (۶) رسالہ سید احمد خان دہلوی، (۷) قواعد اردو مرزا نثار علی بیگ مدرس اول آگرہ کالج ۱۸۶۱ء

نواح دہلی کی اردو کی دو قدیم ترین کتابیں (جنوری ۱۹۴۴ء)

اس مضمون میں رشید الدین صاحب نے لکھا ہے کہ گلشن ہند اور آب حیات وغیرہ میں شاہ ولی اللہ دکنی اورنگ آبادی کو زبان اردو کا پہلا شاعر قرار دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ دکن میں اردو کے مصنف نے وجدی کی مثنوی تحفہ عاشقان کو ۱۰۱۵ء کی تصنیف قرار دے کر زبان اردو کا پہلا شاعر وجدی کو مانا ہے۔ جواہر سخن مطبوعہ ہندوستانی اکاڈمی الہ آباد کی جلد اوّل میں اردو کا پہلا شاعر وجہی دکنی کو لکھا گیا ہے۔ جب کہ ''تاریخ ادب اردو'' میں پہلا شاعر محمد قلی قطب شاہ متوفی کو قرار دیا گیا ہے۔ لیکن رشید الدین صاحب کے نزدیک اردو کی سب سے قدیم مثنوی ''واقعات امامیہ'' ہے۔ یہ مثنوی حضرت شاہ غلام رسول تجاوری برادر

حضرت شاہ حافظ منور بایزید ثانی معمر قریشی نے ہمایوں کے عہد ۹۳۸ھ میں اردو میں جس کو اس زمانہ میں ہندی کہتے تھے لکھی..... یہ مثنوی کتب خانہ مجیدی میں واقع خانقاہ شعیبی مملوکہ ومقبوضہ حضرت صاحب سجادہ نشین خانقاہ شعیبیہ تجارۃ آفتاب میوات میں موجود ہے۔ رشید صاحب نے اس مثنوی کے چند اشعار بطور نمونہ دیئے ہیں۔ اس کے علاوہ اس مثنوی میں اردو اور ہندی کے جو الفاظ استعمال ہوئے ہیں ان کا بھی ذکر ہے۔

اردو کی دو قدیم کتابیں اور ان کا زمانہ تصنیف (جنوری ۱۹۴۵ء)

جناب محمد خلیل صاحب تجاوری بی ایس سی علیگ

رسالہ معارف مارچ ۱۹۴۲ء میں جناب نصیر الدین صاحب ہاشمی نے دیوان منعم کے متعلق کچھ شبہات ظاہر کئے تھے جس کا مطالعہ کرنے کے بعد خلیل صاحب نے اس مضمون کے ذریعہ اپنی معلومات پیش کی ہیں۔

۱۔ تاریخ ادب اردو مطبوعہ نول کشور پریس کے صفحہ ۶۳ پر سلطان محمد قلی قطب شاہ ولد ابراہیم قطب شاہ کا سنہ وفات ۱۶۱۱ء لکھا ہے، اور سلطان محمد قطب شاہ کا سنہ وفات صفحہ ۶۷ پر ۱۶۲۵ء لکھا ہے۔ ہاشمی صاحب نے اس کتاب کے حوالہ سے سلطان محمد قلی قطب شاہ کا سنہ وفات ۱۶۲۵ء تحریر فرمایا ہے جس سے ہاشمی صاحب کو کتاب سب رس کے بارے میں شاید سہو ہو گیا کیونکہ تاریخ ادب اردو کے صفحہ ۷۰ پر سب رس کا سنہ تصنیف ۱۰۴۰ تا ۱۰۴۵ء تحریر ہے اور محمد قلی قطب شاہ کی وفات کا سنہ ہجری ہاشمی صاحب نے ۱۰۲۰ ہجری لکھا ہے جبکہ بہار مظہر میں ۱۰۲۲ھ ہے۔

۲۔ مثنوی واقعات امامیہ کے تصنیف رسولی ہونے کا ثبوت طلب کیا ہے جس پر اس مضمون میں خلیل صاحب لکھتے ہیں کہ:

''واضح ہو کہ مثنوی میں مصنف کا نام، وطن، بادشاہ وقت، ہمایوں، بادشاہ کا نام

اوراس کی تعریف موجود ہے جس سے زمانہ کا تعین ہوتا ہے اور ایک جگہ سنہ تحریر ہے۔ پھر کتاب مراۃ الانساب، مراۃ احمدی، نسب نامہ مفتیان ریواڑی، ارمغان ولی وغیرہ سے مصنف اوراس کے آباء واجداد کے حالات علم میں آتے ہیں۔'' ۱

ہاشمی صاحب دیوان منعم سے متعلق لکھتے ہیں کہ اس کو ۹۳۸ھ یا اس زمانہ کا دیوان قرار دینے کی کوئی وجہ نہیں معلوم ہوتی۔ ہاشمی صاحب کا ماننا ہے کہ وہ محمد اشرف منعم تخلص کرتے ہوں لیکن کسی اور شخص کا تخلص منعم ہونا خارج از قیاس نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ خلیل صاحب لکھتے ہیں:

''حضرت مولانا محمد اشرف حضرت شاہ غلام رسول..... کے برادر زادہ ہیں.....اور حضرت سجادہ نشین صاحب خانقاہ شعیبیہ تجارۃ آفتاب میوات کے بزرگان گزشتہ سے ہیں۔ یہاں کے سوا اور کہیں دیوان موجود نہیں۔'' ۲

اس سے متعلق خلیل صاحب نے اس مضمون میں عبدالحق صاحب کا گرامی نامہ بھی نقل کیا ہے۔

اردو شاعری اور سیاست (جنوری۔فروری ۱۹۵۵ء)

اس مضمون میں مضمون نگار نے اردو میں سیاسی شاعری کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ زیادہ تر ارباب ادب کے نزدیک اردو میں سیاسی شاعری کا وجود بیسویں صدی سے پایا جاتا ہے۔ اس سے پہلے بھی کہیں کہیں معمولی اشارے ملتے ہیں۔ اس سلسلے میں آزاد اور حالی کی نظموں کو اوّلین بنیاد مانا گیا ہے۔

۱۹۱۸ء کے بعد ہندوستان کی ہر سیاسی قابل قدر اور ہر دل عزیز تحریک سے اردو کا سیاسی رجحان متاثر ہوتا رہا ہے۔ اس سلسلے میں ڈاکٹر اعجاز حسین صاحب نے تمام مطالعات ومشاہدات کے بعد اس بات کی تردید کی ہے کہ ''ہمارے شعرا زندگی کی حقیقتوں سے بے خبر نہیں تھے۔ ان کی نظر میں سیاست کا دھندلا ہی

۱۔ معارف، جنوری ۱۹۴۵ء، ص ۱۵

۲۔ ایضاً، ص ۱۵

سہی لیکن خاکہ موجود تھا۔ شہنشاہیت اور جاگیرداری نظام کے خلاف جو آوازیں ہمیں تھوڑے دنوں سے سنائی دیتی ہیں، اردو ادب میں دو سو سال پہلے سے سنائی دے رہی تھیں۔ چنانچہ اردو شعرا نہ تو ملک کے حالات سے بے خبر تھے اور نہ ہی انھوں نے غزل کے فرسودہ مضامین کو اپنا موضوع سخن بنایا۔ اعجاز حسین صاحب نے ان شعرائے اردو کے کلام سے ایسے اشعار پیش کئے ہیں جس سے مذکورہ بات کی تردید ہوگئی۔

اس مضمون میں کلب علی صاحب نے اس بات کا دعویٰ کیا ہے کہ شعرائے متقدمین و متوسطین نے اپنے ماحول کی جو عکاسی کی ہے اس سے بہتر ممکن ہی نہیں ہے۔ ہندوستان اس زمانہ میں جس تاریخی دور سے گزر رہا تھا اس کا پورا پورا نقشہ ہماری نظروں کے سامنے اردو شعرا نے پیش کر دیا۔ اس مضمون میں کلب علی خاں صاحب نے قبل ۲۴ رجب ۱۱۴۶ھ مطابق دسمبر ۱۷۳۳ء کے عنوان میں شیخ نجم الدین عرف شاہ مبارک آبرو گوالیاری ثم الدہلوی اور ان کی شاعری کا ذکر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ان کی شاعری پر ایک بڑا اعتراض یہ ہے کہ ایہام اور رعایت لفظی کی بھول بھلیاں ہے لیکن غائر نظر سے دیکھنے کے بعد ان خزف ریزوں میں گوہر نایاب بھی ہاتھ آ ہی جاتے ہیں۔ چنانچہ وہ بھی بگڑے ہوئے حالات سے مطمئن نہ تھے۔ اقتصادی بدحالی کا نقشہ انھوں نے اپنی شاعری میں کھینچا ہے۔

اس کے علاوہ سید محمد شاکر ناجی نے دہلی کی تباہی و بربادی کو اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ انھوں نے اس ماحول و حالات کی سچی تصویر اپنے شہر آشوب میں کھینچی ہے۔ اس کے علاوہ سید عبدالحئی تاباںؔ دہلوی جو حاتم، سودا، اور محمد علی حشمت کے شاگرد تھے اور شاہی دور کے نوجوان شعرا میں سے تھے۔ ان کا بھی ذکر مختصراً ہے کہ جب نادر شاہ نے دلی پر حملہ کر کے دلی کو تباہ و برباد کیا اور تخت طاؤس کو تمام مال غنیمت کے ساتھ اٹھا لے گیا جو ہندوستان کی عزت پر حملہ تھا۔ تاباںؔ نے عوام کے اس درد کو محسوس کیا اور ہندوستان کی تباہی و بربادی کا ذمہ دار عیش پسند بادشاہ محمد شاہ اور اس کی رنگین مزاجی اور اس کے دوستوں کو قرار دیتا ہے۔ اس کا نقشہ تاباں نے اپنے اشعار میں کھینچا ہے۔ اس کے علاوہ دلی کی بربادی، سرمایہ داروں کو تنبیہ کرنا ان تمام حالات کا ذکر تاباں نے اپنی شاعری میں کیا ہے۔

مضمون نگار نے اس مضمون میں انعام اللہ خاں یقین جو مجددی پیرزادے اور مرزا مظہر جان جاناں کے خاص شاگرد تھے انھوں نے اپنی غزلوں میں اس وقت کے ماحول کا ذکر کیا ہے۔ مضمون نگار نے سودا کے خاص شاگرد ظہور الدین شاہ حاتم کا بھی ذکر کیا ہے۔ جس نے دیوان زادہ مرتب کر کے قدیم دیوان کو جدید دیوان میں شامل کیا۔ اس کے علاوہ ظہور الدین نے ایک شہر آشوب لکھا جس میں اپنے عہد کا نقشہ کھینچا ہے۔ دلی پر پے در پے حملے جس میں عوام وخواص فوجوں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہو رہے تھے حاتم نے اس طبقاتی کشمکش کو صحیح طور پر اپنے شہر آشوب میں پیش کیا ہے۔ مضمون نگار نے اس مضمون میں حاتم کے شہر آشوب کے کچھ بند بھی تحریر کئے ہیں۔ اس کے بعد مضمون نگار نے سوؔدا کا ذکر مختصر حالات کے ساتھ کرتے ہوئے تحریر کیا ہے۔

سوؔدا محمد شاہ کے آغاز عہد میں جوان تھے، مرہٹوں نے جب دلی پر پہلی بار حملہ کیا اور کالکا کے میلہ کو لوٹا تو شہر میں ہلچل مچ گئی۔ وزیر اعظم قمر الدین خاں اور امیر الامراء مرہٹوں کی سرکوبی کے لئے فوجیں لے کر دلی سے جا چکے تھے۔ ایسی حالت میں کچھ منچلے نوجوان بھی مقابلے کے لئے گئے لیکن ان میں جو دم خم چاہئے تھا وہ نہیں تھا۔ سودا نے یہ لڑائی دیکھی اس سلسلے میں انھوں نے قصیدہ تضحیک روزگار لکھا جس میں نظام حکومت پر تنقید کی ہے۔ مضمون نگار کے مطابق:

> ''اسی طرح شہر آشوب میں سودا نے بھی دلی کا مرثیہ نہیں لکھا بلکہ مغل حکومت کے دم توڑنے اور عوام وخواص کی تباہی و بربادی کا نقشہ بھی دکھایا ہے۔ ایسی صورت میں اگر یہ شہر آشوب قومی مرثیہ نہیں تو کیا ہے۔'' [۱]

مضمون نگار نے میر تقی میر کا ذکر بھی مختصراً سوانحی حالات کے ساتھ کیا ہے جس میں دلی کی تباہی کا نقشہ بھی کھینچا ہے۔ نادر شاہ اور احمد شاہ ابدالی کے پے در پے حملوں کو میؔر نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ اس کے بعد شاہ ابدالی اور مرہٹوں میں آویزش ہوئی اور کچھ دنوں تک دلی پر مرہٹوں کا قبضہ رہا۔ جنھوں نے

۱۔ معارف، جنوری ۱۹۵۵ء، ص ۵۳

اس قدر تباہی مچائی کہ دلی والوں کا سکون واطمینان ختم ہوگیا۔لیکن ۱۱۷۴ھ میں پانی پت میں مرہٹوں نے شکست کھائی۔شاہ ابدالی نے دوبارہ دہلی کا رخ کیا اور پہلے سے زیادہ تباہی مچائی۔غرض یہ کہ ایک قیامت صغریٰ بپا تھی۔میر اس تباہی سے پہلے ہی کمہیر چلے گئے اور دس سال کے بعد لوٹے۔ان کے اکثر اشعار دلی کی بربادی کا مرثیہ ہیں جو انھوں نے اپنے مخمس کے ذریعہ عوام کے سامنے پیش کیا ہے۔

اس کے علاوہ شاہ واقف دہلوی کا بھی مختصراً ذکر ہے۔انھوں نے ایک غزل میں شجاع الدولہ کے نظم حکومت پر تنقید کی ہے۔مضمون نگار نے قائم محمد قائم کا ذکر بھی مختصر حالات کے ساتھ کیا ہے۔قائم نے دلی کی تباہی و بربادی کا ذمہ دار شاہ عالم کو قرار دیا ہے اور اپنے شہر آشوب میں شاہ عالم اور اس کے پیش روؤں پر ایسی سخت کھلم کھلا تنقید کی ہے جس سے شاعر کے کردار کی بلندی ظاہر ہوتی ہے۔مضمون نگار نے قائم کا مخمس بھی درج کیا ہے۔اس کے علاوہ جھمن لالا کایستھ دہلوی کا ذکر ہے جس نے اپنے ایک قطعہ میں مختار کی مذمت کی ہے۔

مرزا جعفر علی حسرت کا بھی ذکر ہے جنھوں نے دہلی کی تباہی پر شہر آشوب لکھا ہے اور ہر گوشے پر گہری نگاہ ڈالی ہے۔مضمون نگار نے ان کے مخمس کے چند بند درج کئے ہیں۔اس کے علاوہ فدوی شاہ محسن، حسن، میر غلام حسن، میر غلام حسین ضاحک نے اپنے مشوروں کے ذریعہ تباہی کا ذکر کیا ہے۔

مضمون نگار نے قلندر بخش جرأت کا بھی ذکر کیا ہے جس نے اپنی رباعی اور قطعہ کے ذریعہ وزیر علی خاں کی حمایت اور سعادت علی خاں کی مخالفت کی ہے۔اس مضمون میں مضمون نگار نے ان کی رباعی اور قطعہ بھی درج کیا ہے۔

شاہ کمال الدین عرف شاہ محمد کمال کا ذکر بھی مختصر احوال کے ساتھ کیا ہے۔انھوں نے اپنے دلی جذبات کا ذکر مسدس میں کیا ہے۔شاہ عالم کی حیثیت ان کی نظر میں شاہ شطرنج سے زیادہ نہ تھی۔وہ مرہٹوں اور سکھوں کے مقامی حملوں کو ملک کے حق میں مضر سمجھتے ہیں جس کا اندازہ ان کی مسدس سے ہوتا ہے۔اس مضمون میں شاہ محمد کمال کے مخمس کے کچھ بند بھی درج ہیں۔اس کے علاوہ نواب وزیر علی خاں متبنائے

نواب آصف الدولہ کی اسیری کی یادگار ایک غزل میں درج ہے جو مرثیہ بھی ہے اور سیاسی مرقع بھی۔ اس مضمون میں مضمون نگار نے مذکورہ شعراء اور ان کی سیاسی شاعری کا ذکر کیا ہے جو انھوں نے دہلی کی تباہی و بربادی اور عیش پرست امراء وسلاطین سے متاثر ہو کر لکھی تھی۔ ان سب کا مختصراً ذکر اس مضمون میں کیا گیا ہے۔

کیا اردو ہماری قومی زبان ہو سکتی ہے؟ (اکتوبر ۱۹۳۴ء)

یہ مضمون ڈاکٹر ایس۔ این۔ اے۔ جعفری، ایل ایل ڈی مارلایت لا نے اکتوبر ۱۹۳۴ء میں معارف میں لکھا تھا۔ اس مضمون میں جعفری صاحب نے اردو زبان کو تین زبانوں کا مجموعہ بتایا ہے۔ بھاشا، فارسی اور عربی۔ جعفری صاحب کا ماننا ہے کہ مختلف تمدنوں کے اتحاد سے جو لطائف اور دل آویز بندشیں اردو زبان نے پیدا کی ہیں وہ ہماری روزمرہ کی زندگی میں ایک عجیب محبوب فضا پیدا کر دیتی ہیں۔ اور اگر ہم پوری طرح اس سے لطف اندوز ہونا سیکھ لیں تو وہ انتشار انگیز صورتیں جو آج پیدا ہیں دور ہو سکتی ہیں۔ ملک کی انتشاری حالت کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ جتنے منہ اتنی زبانیں اور جب تک کسی ملک کی زبان ایک نہ ہو وطنیت اور قومیت کا خیال محض خواب ہے۔

جعفری صاحب کے مطابق اگر ہم اردو سے صرف نظر کر لیں تو ہمارے ملک میں کوئی ایسی زبان نہیں جو ملک کی بڑی بڑی قوموں کے تمدنوں کی آئینہ دار ہو۔ ہندی کا یہ دعویٰ کرنا کہ وہ ہندوستان کی قومی زبان بن سکتی ہے بالکل بیکار ہے۔ اس زبان کو آج بھی بہی کھاتے کی زبان ماننا پڑے گا۔ اس کا تخیل محدود ہے اور اس میں متعدد تمدنوں کی لطافت اور شیرینی بھی شامل نہیں ہے۔

اس کے علاوہ انگریزی زبان بھی ہماری ملکی زبان نہیں ہو سکتی۔ ہم اس میں اپنا تخیل قائم نہیں کر سکتے۔ بڑے سے بڑا تعلیم یافتہ بھی اپنا غیر ارادی خیال اس زبان میں قائم کرتا ہے جس کے گہوارے میں وہ پلا ہے۔ چنانچہ مضمون نگار مذکورہ بالا خیالات کو مدنظر رکھتے ہوئے قومی زبان سے متعلق یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں:

''اگر ہم تعصّبات سے علیحدہ ہو کر صرف اپنے ملک اور اپنی قومیت کے ارتقا کا خیال کریں تو ہمیں ماننا پڑے گا کہ اردو زبان ہی ایک ایسی زبان ہے جو ہمارے ملک کی واحد زبان ہو سکتی ہے جو ہندوستانی زبان کہلانے کی مستحق ہے، اور جس کے ذریعہ ہم اپنے ملک میں سچی یکجہتی اور جذبۂ ملکی پیدا کر سکتے ہیں، اور مختلف قوموں کو شیر و شکر بنا کر ملک کو اعلیٰ مدارج تک پہنچانے میں ہم آہنگ بنا سکتے ہیں۔'' [۱]

معارف نے جعفری صاحب کے اس مضمون پر اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے:

''ہمارے فاضل دوست ڈاکٹر جعفری صاحب نے اردو زبان کی جس تمدنی جامعیت اور ارتقائی خصوصیت کی طرف اشارہ کیا ہے وہ حرف حرف صحیح ہے مگر واقعہ یہ ہے کہ ہندی کے طرفدار دلائل کے زور پر اپنے دعویٰ کی صحت کے قائل نہیں۔ ان کا ماننا ہے کہ ہندوستان ایک خالص ہندو ملک ہے، اس لئے یہاں تمدن، زبان، علوم و فنون، ادبیات اور مذہب ہر چیز کو ہندو پن پر مبنی ہونا چاہئے۔ اگر اس خیالات میں تھوڑی سی ترمیم کر لی جائے تو یہ مسئلہ آسان ہو جاتا ہے۔ ہندوستان تنہا ہندوؤں کا ملک نہیں ہے بلکہ ہندوستان دونوں کا ہے۔ اب یہاں جو تمدن قائم ہے اور جو زبان رائج ہے وہ نہ تنہا ہندو اور نہ تنہا مسلمان بلکہ دونوں سے مل کر..... اردو وہ ہندی زبان ہے جس میں مسلمانوں کے مذہبی اصطلاحات قومی خصوصیات اور تمدنی الفاظ مل گئے اور یہ عناصر جب تک مسلمان مسلمان ہیں اس زبان سے الگ نہیں کئے جا سکتے۔'' [۲]

۱۔ معارف، اکتوبر ۱۹۳۴ء، ص ۲۷۴

۲۔ ایضاً، ص ۲۷۴۔۲۷۵

اردو کے چند مظلوم ادیب (عبدالماجد دریابادی، اگست ۱۹۶۲ء)

اس مضمون میں مولانا دریابادی نے اردو کے چند ایسے ادیبوں کا ذکر کیا ہے جو کمال وفن کے اعتبار سے شہرت کے مستحق تو ہیں لیکن انھیں وہ شہرت و مرتبہ حاصل نہ ہوسکا جس کے وہ حق دار تھے۔ ان مظلوم ادیبوں میں مولانا ابوالکلام آزاد کا شمار پہلے نمبر پر ہے، جنھوں نے ملک وملت کے گوشہ گوشہ میں اپنا اثر ورسوخ ڈالا۔ پورا ہندوستان ان کے نام کی آواز سے گونج رہا تھا۔ ان کی تحریریں اردو ادب وانشا کے بہترین نمونوں کا کام دے سکتی ہیں۔

مولانا کے مخالف بھی ان کے کمال انشاء کے قائل ومعترف اور ان کے زور قلم سے متاثر رہے ہیں۔ پھر بھی انھیں وہ شہرت حاصل نہیں ہوئی جس کے وہ مستحق تھے۔ مولانا ابوالکلام کے ساتھ دہلی کے ایک دوسرے مظلوم ادیب خواجہ حسن نظامی ہیں۔ ان کے قلم میں آزاد کی عظمت و بلندی نہیں لیکن پھر بھی صاحب عوام تھے۔ دہلی کی مستند اور ٹکسالی زبان پر عبوریت میں بھی یہ اپنی نظیر آپ تھے۔

ایسے محسن اردو کو اس درجہ بھلا دیا گیا کہ کسی تاریخی ادب میں غریب کا نام تک بھی شاید نہیں آنے پایا۔ اس کے علاوہ سید سلیمان ندوی، محمد علی، راشد الخیری، رتن ناتھ سرشار، ریاض خیرآبادی، حسرت موہانی، اکبر الہ آبادی، منشی سجاد حسین، میر ناصر علی، فرحت اللہ بیگ اور قاضی عبدالغفار، عبدالمجید سالک، سید محفوظ بدایونی علیگ، مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی، مولانا محمد اسماعیل میرٹھی اور محمد علی رودولوی اور خواجہ عبدالرؤف عشرت کا نام اس مظلومیت کا متحمل ہے جو باوجود کمال فن کے اعتبار سے شہرت کے مستحق ہوتے ہوئے بھی وہ شہرت نصیب نہ ہوئی۔

اس کے علاوہ زندہ ادیبوں میں (جو اب وفات پا چکے ہیں) خواجہ محمد شفیع دہلوی ثم لاہوری، سید ہاشمی فرید آبادی ثم لاہوری اور ملا واحدی دہلوی ثم کراچوی اپنے اپنے طرز خاص کے مالک تھے۔ وہ جس ادبی شہرت کے مستحق تھے وہ ان کے حصے میں نہیں آئی۔ اس کے علاوہ آل انڈیا ریڈیو دہلی کے حضرت ''آوارہ'' سید آل عبا (مارہروی) اپنی ذات میں ایک انجمن ہونے کے باوجود گمنامی کے پردے میں پڑے ہیں جو طلبہ ادب کے لئے تاسف انگیز ہے۔

اس کے علاوہ مدیر معارف شاہ معین الدین احمد ندوی، ڈھاکہ یونیورسٹی کے ڈاکٹر آفتاب احمد رودولوی اور ڈاکٹر عابد حسین کو بھی وہ شہرت واستحقاق حاصل نہیں ہوئی جو ہونا چاہئے۔

علی گڑھ کے مظلوم ادیبوں کی فہرست میں مولوی مقتدیٰ خاں شروانی، اطال اللہ عمرہ اور سب سے آخر میں جوش ملیح آبادی ثم کراچوی کے نام کا ذکر کیا گیا ہے جن کی شاعری کی دھوم نے ان کے نثر نگاری کے چہرے پر گہرا نقاب ڈال رکھا ہے۔ جب کہ الفاظ کے صحیح اور بامحل استعمال پر قدرت اور زبان کے جن جن گوشوں پر ان کی نظر پہنچ چکی تھی کمتر ہی کسی اور کی پہنچی ہوگی۔

رسالہ معارف نے مولانا دریابادی کے اس مضمون پر تنقیدی خیالات کو پیش کیا ہے۔ مدیر معارف کے مطابق دریابادی صاحب نے اردو ادب اور اس کے تاریخ نگاروں کے جس فروگزاشت کی جانب توجہ دلائی ہے اس کے علاوہ بھی بہت سی باتیں قابل توجہ ہیں جن کا ذکر اس مضمون میں نہیں ہوا ہے۔ مدیر معارف نے اس کی جانب اشارہ کرتے ہوئے اپنے خیالات کو پیش کیا ہے۔ آخر میں اردو کے مظلوم ادیبوں کی مظلومیت کا سبب بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ''جو تنگ نظری ہمارے بعض قدیم شعرا اور ادیبوں میں تھی وہ اپنے دائرے سے ایک انچ بھی باہر قدم نکالنا پسند نہ کرتے تھے۔ ہر نئی چیز سے بھڑکتے تھے اور اس کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ وہی تنگ نظری ترقی پسند ادیبوں میں بھی ہے۔ انھوں نے بھی ادب کا دائرہ بہت تنگ کر دیا ہے اور اپنے حدود میں اپنے طائفہ کے علاوہ کسی کو گھسنے نہیں دیتے اور چونکہ نئی ادبی دنیا پر ان ہی کا قبضہ ہے اس لئے بہت سے ادیب اور اصحاب علم وقلم اپنے حق سے محروم رہ جاتے ہیں۔ یہ چیز اردو زبان وادب کے لئے مضر ہے۔ اس کی متوازن اور صحت مند ترقی دونوں کے اشتراک وتعاون، ایک دوسرے کی حق شناسی وقدردانی اور جدید و قدیم ادب کے اچھے عناصر کے معتدل امتزاج ہی سے ہوسکتی ہے۔'' [1]

۱۔ معارف، اگست ۱۹۶۲ء، ص ۱۵۰

اردو شاعری میں تخلص کی روایت (نومبر ۱۹۹۱ء)

یہ مضمون ڈاکٹر انیس ادیب صاحب نے معارف نومبر ۱۹۹۱ء میں لکھا تھا۔ اس مضمون میں ادیب صاحب نے اردو شاعری میں تخلص کی روایت پر روشنی ڈالی ہے۔ ادیب صاحب کے خیالات کے مطابق فارسی شاعری میں بہت سی امتیازی خصوصیات پائی جاتی ہیں۔ اس نے بہت سی اختراعات بھی کی ہیں جن میں تخلص کی روایت فارسی شاعری کی رہین منت ہے۔ فارسی کے سوا دنیا کی دوسری زبانوں میں تخلص کی روایت نہیں ملتی۔ خواہ وہ عربی ہو یا انگریزی یا ہندی۔ اگر چہ عصر حاضر میں ہندی کے کچھ شعرا فارسی اور اردو سے متاثر ہو کر تخلص اختیار کرنے لگے ہیں۔ فارسی کا پہلا بڑا شاعر جو اپنے تخلص کے ساتھ مشہور ہوا ابو عبداللہ جعفر بن محمد المتخلص بہ رودکی تھا۔ ادیب صاحب نے اس مضمون میں تخلص کے معنی، ضرورت، تخلص کا انتخاب اور موزونیت کا ذکر کیا ہے۔ ان کے مطابق تخلص کی کوئی نہ کوئی مناسبت اور رعایت ہوتی ہے۔ بیشتر تخلص ایسے ہوتے ہیں جن سے شاعر کی شخصیت منعکس ہوتی ہے..... جو شاعر کے رنگ شاعری کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ تخلص قومی یکجہتی کا ایک بہترین وسیلہ ہے۔

اردو کے بہت کم شعراء تخلص سے بے نیاز رہے۔ کچھ شعراء نے اپنے نام ہی کو تخلص بنایا۔ جیسے اکبر آبادی، فیض احمد فیض، محمد اقبال وغیرہ۔ اور بہت سے ایسے شعراء بھی ملیں گے جنھوں نے نام کو بھی تخلص نہیں بنایا اور الگ سے بھی کوئی تخلص اختیار نہیں کیا۔ مثلاً عظمت اللہ خاں اور خلیفہ عبدالحکیم وغیرہ۔

اردو شاعری پر تبصرہ (جنوری ۱۹۲۲ء) سیّد حکیم عبدالحئی

مولانا حکیم عبدالحئی صاحب نے اپنے تذکرہ شعرائے اردو کے مقدمہ میں اردو شاعری پر ایک مبسوط مقدمہ لکھا ہے۔ اصل کتاب تین حصوں میں منقسم ہے۔ پہلا حصہ متقدمین کے لئے مخصوص کیا ہے جس میں تین دور قائم کئے ہیں۔ اس طبقہ میں دور اول کے شعرا میں سے صرف ایک شاعر کا ذکر کیا ہے۔ دوسرے دور میں شعرائے دکن اور تیسرے دور میں شعرائے دہلی کا ذکر کیا ہے۔

دوسرا حصہ متوسطین سے مخصوص ہے۔ان میں بھی تین دور قائم کئے ہیں۔ پہلے دور میں میرؔ و مرزاؔ جس میں مرزا مظہر، مرزا رفیع، میر تقی میر، خواجہ میر درد، میر سوز، قائم، یقین، حزیں، ہدایت، قدرت، بیدار، ضیاء کا ذکر کیا ہے جو دور اوّل کے ممتاز شاعروں میں سے تھے۔ جنھوں نے زبان کی صحت وصفائی اور طرز بیان کی خوبی اور پاکیزگی میں نمایاں حصہ لیا۔ دوسرا دور جس میں میر اثر، بقا، حسرت، راسخ، میر حسن، جرأت، انشاء، مصحفی، رنگین اور فراق کا ذکر ہے جنھوں نے زبان کو پہلے سے زیادہ صاف کیا ہے اور طرز بیان میں بھی کسی کسی نے نیا انداز پیدا کیا ہے۔

تیسرے دور میں نصیر، ممنون، ذوق، ظفر، مومن، غالب، تسکین اور شیفتہ کا ذکر ہے جنھوں نے زبان کو زیادہ صاف ستھرا کر کے کلام کو گلہائے رنگا رنگ سے آراستہ کر دیا ہے اور لطف یہ ہے کہ صفائی اور سادگی کو بھی ایک حد تک قائم رکھا ہے۔

دور اوّل کے شعراء نے زبان کی صفائی اور صحت میں پوری کوشش کی اور بہت سے وہ الفاظ و روابط جنھیں ولیؔ اور اس کے ہم عصر بے تکلف کام میں لاتے تھے نکال ڈالے پھر بھی کچھ الفاظ ایسے رہ گئے جو ان کے زمانے میں فصیح سمجھے جاتے رہے ہوں لیکن آج ہم کو اجنبی اور نامانوس معلوم ہوتے ہیں۔ دوسرے دور کے شعراء نے زبان کی صحت اور صفائی میں ایک قدم آگے بڑھایا اور بہت سے نامانوس الفاظ جن کو دور اول کے شعرا نے قدما سے ترکہ میں پایا تھا نکال ڈالے اور وہ ایک حد تک صاف شستہ ہوگئی۔

تیسرے دور کے شعراء کا سب سے بڑا کارنامہ زبان کی اصلاح و درستی ہے۔ جو نامانوس الفاظ دور دوم تک باقی رہ گئے تھے ان کو انھوں نے دور کر کے روزمرہ اور محاوروں کے ساتھ فارسی ترکیبوں کی نہایت لطیف اور خوشنما ترکیبوں سے اردو میں اتنی شیرینی اور جاذبیت پیدا کر دی جو دیکھنے کے قابل ہے۔

خانقاہی نظام تعلیم اور اصلاح نسواں (جنوری ۱۹۹۵ء) اردو شاعری کے پس منظر میں

(ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط)

مضمون نگار نے اس مضمون میں عورتوں کی تربیت و اصلاح اور ان کی تعلیم کو اردو شاعری کے پس منظر میں بیان کیا ہے۔ مضمون نگار نے اس بات پر روشنی ڈالی ہے کہ حضور ﷺ نے درس گاہ حرا سے درس اقراء لے کر جاہل و وحشی اور بگڑے ہوئے ناتراشیدہ قبیلوں کی تربیت کی۔ مشکلات و سختیوں کے باوجود اس ذمہ داری کو پورا پورا نبھایا۔ آپ ﷺ کی کوشش خدا کے فضل سے ایسی بار آور ثابت ہوئی کہ صحابہ کرام کا ایک گروہ وجود میں آیا جنھوں نے ابنائے قوم کو تہذیب کا لباس فاخرہ پہنا کر اللہ کے محبوب بندوں کی صف میں لا کھڑا کر دیا۔ آپ ﷺ نے صرف مردوں کی ہی تربیت و اصلاح نہیں کی بلکہ طبقہ نسواں کا بھی اس سلسلے میں کافی خیال رکھا اور عورتوں کی ایسی تربیت یافتہ جماعت تیار کر لی تھی جو گھر تو گھر میدان کارزار میں عمل کا بہترین نمونہ بنیں۔

خیر القرون جیسے جیسے ماضی کے دھندلکوں میں بڑھتا گیا اصلاح و تربیت کی یہ روشنی بھی ماند پڑتی گئی۔ بالآخر مدارس و درس گاہوں سے ہٹ کر خانقاہوں میں مشائخ نے اس نظام کو چلایا۔ عوام کی اصلاح کے لئے مشائخ نے سب سے پہلے اس بات کی کوشش کی کہ ابنائے قوم کی مقامی زبان کو وسیلۂ اظہار بنائیں اور اپنی تعلیم کو مقامی رنگ و ثقافت میں پیش کریں۔ ہندوستان میں صوفیائے کرام نے یہاں کی عوامی زبان کو وسیلۂ اظہار بنا کر اپنی تعلیمات کو فروغ دیا۔ یہی وجہ ہے کہ اردو ادب و زبان کی نشو و نما میں خانقاہوں کی خدمات نظر انداز نہیں کی جا سکتی۔ اس کے علاوہ اردو شاعری کو بنانے سنوارنے اور اس کے صوری و معنوی حسن کو بڑھانے کے لئے خانقاہوں میں کوششیں کی گئیں۔ مضمون نگار اردو شاعری میں اصلاح نسواں سے متعلق لکھتے ہیں:

> ''بنت الادب شاعری کی تحسین و تہذیب کی طرح بنات قوم کی اصلاح و تربیت کی فکر خانقاہوں میں پروان چڑھی۔ مشائخ و صوفیہ نے تعلیم نسواں کے لئے ان

ہی کی زبان اور ان ہی کے مزاج و پسند کا خیال رکھا۔ انھوں نے پند و مواعظ
کے بوجھل اور غیر مؤثر و غیر جاذب طریقے سے بڑی حد تک ہٹ کر پُر اثر
طریقہ کو اپنایا اور کھیلوں اور گھریلو کام کاج کو وسیلۂ درس بنایا۔'' [۱]

اس کے علاوہ ہندوستانی تہواروں میں مذہبی یک رنگی اور مختلف روایات کا سنگم دکھائی دیتا ہے۔ صوفیائے کرام نے تہواروں خاص طور سے ہولی کو اپنی شاعری کا موضوع بنایا اور ان تہواروں کے سہارے اصلاح نسواں کی کوشش کی۔ نظموں کے علاوہ مثنویوں میں بھی ناصحانہ انداز اختیار کر کے اصلاح نسواں کی کوشش کی گئی ہے۔ بہر حال صوفیائے کرام نے خانقاہوں میں تجویز کردہ نصاب کے ذریعہ تربیت نسواں کے فرائض کو ادا کرنے کی پوری کوشش کی ہے اور یہ حقیقت ہے کہ اس غیر منظّم نصاب سے عورتوں کی اصلاح ہوئی۔

اردو ادب کی تاریخ کے لئے ایک نصب العین (اگست ۱۹۴۵ء)

ڈاکٹر م حفیظ سید ایم۔ اے، پی ایچ ڈی، ڈی لٹ الہ آباد

حفیظ صاحب نے اس مضمون میں اس بات پر روشنی ڈالی ہے کہ یونانیوں نے ہر علم کو فلسفے کی شان دے رکھا ہے۔ چنانچہ انسان اپنے ہر کام، ہر سوچ میں اسی فلسفے کے تحت کام کرتا نظر آتا ہے۔ وہ ہر علم و فن کے اصول میں ایک خاص قسم کے فلسفے کی جستجو میں لگا رہتا ہے، اور ان تمام فلسفے کی بنیاد میں انسان کی زبان کارفرما ہے۔ کیونکہ زبان ہی ایک ایسا ذریعہ ہے جس سے انسان اپنی سوچ و فکر اور اپنے عقائد کا اظہار کرتا ہے۔ زبان کا علم تمام علوم کا سرچشمہ ہے۔ انسان کے کیا اور کیوں کر بولنے کے سوال نے جو جوابات پیدا کئے ہیں ان میں سے ایک علم للسان ہے۔ اس کے بعد نظم اور پھر نثر ہے۔ اور ان دونوں کے امتزاج سے ادب پیدا ہوتا ہے اور ان کی تاریخ و احوال کے ضبط کا نام تاریخ ادب ہے جس پر ہر چیز کا ایک فلسفہ ہے۔ اسی طرح

۱۔ معارف، جنوری ۱۹۹۵ء، ص ۵۵

ہر چیز کی ایک تاریخ بھی ہے جو ہر چیز کی ہستی اس کی گزری ہوئی درجہ بدرجہ ترقی کو بتانے کے ساتھ ساتھ اس کے آئندہ بقاوحیات کے امکانات اور اس سے وابستہ امیدوں کا پتہ دیتا ہے جس سے کسی بھی زبان وادب کی تاریخ نویسی میں احتیاط سے کام لینے کی ضرورت ہے۔

ایک مورخ ادب کا کام یہ ہے کہ مختلف ادوار کی تحریک کا پتہ لگائے اور تاریخ انسانی کی ساخت میں جو شخصی اور غیر شخصی افکار ورجحانات کے باہمی تاثرات کارفرما رہے ہیں ان کی توضیح اور نشان دہی کرے کہ اردو ادب اور ہندوستانی زندگی اور ملکی ماحول کے مابین وہ کیا تعلقات تھے اور کیا آویزشیں تھیں جن کے سبب سے اردو ادب کے مختلف اور متفرق ادوار میں وہ خاص خاص رنگ پیدا ہو گئے تھے جن کے حامل اور نمائندے وہ سب مصنف تھے۔

یہ یاد رکھنا چاہئے کہ ادب یوں ہی خلا میں نہیں پیدا ہوتا بلکہ ادب الفاظ کے ذریعہ ان امور کو ظاہر کرتا ہے جو مصنف کے وقت میں زندگی کے لئے گہرے معنی اور اہمیت رکھتے تھے۔ ڈاکٹر حفیظ سید اردو ادب کی تاریخ کا نصب العین متعین کرتے ہیں کہ:

> ''تاریخ ادب کا ایک ضروری منصب یہ ہے کہ وہ اپنے مصنفوں کے بارے میں اس امر کی توضیح کرے کہ اس نے انسان کی تہذیب اور ثقافت میں اپنے خیال اور رائے کے اظہار سے کیا قابل قدر اضافہ کیا ہے۔ اور اس کی اہمیت کیا ہے؟ جب ہم تمام مصنفوں اور ان کی تصنیفوں کی صحیح قدر و قیمت اور اہمیت سے واقف ہو جائیں گے تو ہمیں ایک طرف تو اس ادب کے کردگاروں کی شخصیتوں کا پتہ چل جائے گا اور دوسری طرف ان کے دور کے اہل ملک کی ذہنیت اور روح ملی کا بھی صحیح اندازہ ہو جائے گا.....اس قسم کی تاریخ ادب ہی صحیح معنوں میں تاریخ ادب ہوگی، اور اردو زبان و ادب کی ایسی تاریخ ہمارے ملک و ہماری قوم کو بیرون ہند کی اقوام اور اہل ادب سے روشناس

کر کے ان پر یہ واضح کرے گی کہ اردو کے اہل ادب کا دنیا کی تہذیب وثقافت
کی ساخت اس کی نشو ونما میں کیا اور کس قدر اہم حصہ ہے۔''[۱]

مثنوی گلزار نسیم کے مآخذ (سید ظہور حسن صاحب رام پوری اگست ۱۹۴۶ء)

اس مضمون میں ظہور حسن صاحب نے مثنوی گلزار نسیم سے متعلق یہ انکشاف کیا ہے کہ مثنوی گلزار نسیم کا اصل ماخذ دو قلمی مثنویاں ہیں۔ ان میں سے ایک مثنوی اردو میں ہے جس کا تاریخی نام باغ و بہار ہے، اور اس کے مصنف ریحان الدین لکھنوی متخلص بہ ریحان کی لکھی ہوئی ہے۔ دوسری فارسی میں ہے جو رفعت لکھنوی کی تصنیف ہے لیکن اس کی بسیار مکمل نہیں ہے۔ لیکن جگہ جگہ تخلص سے اس کے مصنف کا پتہ چلتا ہے۔ ان تینوں مثنویوں کا تعلق ایک ہی قصہ، بحر، نام و مقام سے ہے۔

مضمون نگار نے مثنوی گلزار نسیم کا سن تصنیف ۱۲۵۴ھ نسیم کے مصرعہ کے مطابق بتایا ہے جبکہ باغ و بہار کا سال تصنیف ۱۲۱۱ھ ہے۔ رفعت لکھنوی کی مثنوی کا سنہ تالیف معلوم نہیں ہو سکا لیکن ان کے بہت سے مصرعوں اور شعروں کا ترجمہ گلزار نسیم میں پایا جاتا ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ رفعت لکھنوی نسیم سے پہلے گزرے ہیں

مضمون نگار کے خیال کے مطابق نسیم کی نظر سے پہلی یا دوسری یا دونوں مثنویاں ضرور گزری ہیں لیکن حیرت یہ ہے کہ خود نسیم نے اس کا ذکر نہیں کیا اور اپنی مثنوی کی اصل ایک نثری قصہ بتایا۔ اس مضمون میں مضمون نگار نے نسیم، رفعت اور ریحان کی مثنوی باغ و بہار کے ہم مضمون اشعار نقل کر کے ان کا مقابلہ کیا ہے کہ کس طرح گلزار نسیم کے اشعار باغ و بہار اور رفعت لکھنوی کی مثنویوں سے ملتے جلتے ہیں۔ تقابلی مطالعہ کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ گلزار نسیم ریحان لکھنوی اور رفعت لکھنوی کی مثنوی باغ و بہار کا عکس ہے۔

۱۔ معارف، اگست ۱۹۴۵ء، ص ۱۱۰

میر حسن کی ایک نادر مثنوی (محمد ابواللیث صدیقی بدایونی، اکتوبر ۱۹۴۳ء)

اس مضمون میں مضمون نگار نے میر حسن کی مثنوی سحر البیان اور دوسری گلزار ارم کے بارے میں ذکر کیا ہے۔ گلزار ارم ایک ہی بار طبع ہوئی جس کو بہت کم لوگ جانتے ہیں۔ میر حسن کے کلیات کی تلاش کافی دنوں تک لوگوں کو رہی لیکن دستیاب نہ ہو سکی۔ بعد میں مولانا حبیب الرحمٰن خان شیروانی کو ایک اچھا نسخہ ملا اور ایک دوسرے نسخہ کا پتہ پٹنہ میں چلا۔ پٹنہ والے نسخہ پر قاضی عبدالودود صاحب نے اپنے رسالہ میں ایک مضمون لکھا اور میر حسن کی ایک تیسری مثنوی ''قصہ جواہر'' کو قسط وار شائع کیا۔

مضمون نگار نے اپنے تحقیقی کام کے سلسلے میں کافی کاوشوں کے بعد میر حسن کی کلیات کے کئی نسخے فراہم کئے اور تین قلمی نسخوں کو پیش کیا ہے جس میں کلام کی ترتیب مختلف ہے لیکن تقسیم اس طرح کی گئی ہے۔

(۱) غزلیات، (۲) قصائد، (۳) مثنویات، (۴) مسدس، (۵) مثلثات، (۶) ہجویات، (۷) متفرق اصناف سخن، (۸) فردیات، (۹) رباعیات

ان میں غزلیات مثنویات کافی اہم ہیں۔ ان میں مثنوی کا ذکر کیا گیا ہے۔ کلیات میں چھوٹی بڑی گیارہ مثنویاں شامل ہیں جن میں سے چھ زیادہ اہم ہیں۔

(۱) مثنوی تہنیت عید (در تعریف جواہر خاں ناظر بہو بیگم)

(۲) قصر جواہر (در تعریف قصہ جواہر خاں

(۳) مثنوی شادی (بیان شادی آصف الدولہ

(۴) رموز العارفین (در معرفت) (۵) سحر البیان (۶) گلزار ارم

ان میں سے رموز العارفین کے انتخاب اور اس کے بعض اشارات درج ہیں۔ یہ مثنوی ضخامت میں غیر مطبوعہ مثنویوں میں سب سے بڑی سحر البیان کے برابر ہے اور میر حسن اپنی اس مثنوی کو سب سے بہتر سمجھتے ہیں۔

یہ اخلاقی مثنوی ہے جس میں معرفت کی تعلیم اور چھوٹے چھوٹے قصے نظم کر کے اخلاقی نتائج مرتب

کئے ہیں۔ابتداء حمد ونعت سے کی ہے جس کے بعض اشعار بھی درج ہیں۔اس مثنوی میں کئی خاص باتیں درج ہیں جس میں پہلا مسئلہ میر حسن کا عقیدہ اور دوسرا مسئلہ جو خاص طور پر قابل غور ہے وہ مثنوی کا موضوع ہے۔

اردو کیوں کر پیدا ہوئی (جولائی ۱۹۳۳ء)

یہ مضمون سید سلیمان ندوی نے ناگری پرچارنی سبھا بنارس کے لئے لکھا تھا جس میں آپ نے اردو کیوں کر وجود میں آئی سے متعلق اپنے خیالات رقم کئے ہیں۔آپ نے ایک اقتباس کے ذریعہ یہ بتایا ہے کہ ہندوستان کے سواحل میں بہت سی مختلف زبانیں تھیں اور وہ لوگ جن کی اصل زبان فارسی اور عربی تھی وہ یہاں کی زبانوں کو سیکھتے اور بولتے تھے۔چنانچہ ہر صوبہ کی مقامی بولیوں میں مسلمانوں کی زبان کے الفاظ کا میل ہو کر ایک نئی بولی پیدا ہونے لگی۔مسلمانوں اور ہندوؤں کا یہ میل جول.....سب سے پہلے ملتان سے لے کر ٹھٹھ تک سندھ میں اور پھر یہاں سے گجرات اور کاٹھیاواڑ تک ہوا ہوگا۔اس میل جول سے جو زبان بنی اس کا پہلا نمونہ ہم کو ۷۶۲ھ میں فیروز شاہ تغلق کے عہد میں سندھ میں ملتا ہے۔مذکورہ سنہ میں سلطان ٹھٹھ پر ناکام حملہ کر کے جب گجرات جاتا ہے تو ٹھٹھ والوں نے اس کو شیخ کرامت سمجھ کر کہا برکت شیخ تھیا۔اک موا اک تھا۔اس عبارت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ۷۶۲ھ میں عربی فارسی اور ہندوستانی بولیوں کا مجموعہ جس کو آج آپ اردو کہتے ہیں پیدا ہو چکا تھا۔ان واقعات سے یہ بھی معلوم ہوگا کہ اس زبان کی پیدائش کی وجہ مختلف قوموں کا کاروباری اور تجارتی اختلاط اور میل جول تھا اور اسی ضرورت نے اس نئی زبان کو وجود بخشا۔اس زبان کی پیدائش کی بقا اور ترقی کی وجہ اس سے بڑھ کر ناگزیر ایک اور ہے۔ مسلمان جب اس پورے ملک پر حکمراں ہوئے تو گو فارسی سرکاری زبان کی حیثیت سے ان کے ساتھ آئی تاہم ایک ایسی قوم کے لئے جس کا تعلق پورے ملک سے ہو اس ملک میں کوئی ایک متحدہ اور مشترکہ زبان موجود نہ تھی اور ایک ایسی زبان کی سخت ضرورت تھی جو پورے ملک کی بول چال آمد ورفت اور کاروبار میں کارآمد ہو۔

اردو نام سے متعلق سید صاحب اپنے خیالات اس طرح بیان کرتے ہیں:

''میرے نزدیک..... اردو زبان کی جو تاریخ بیان کی گئی ہے وہ اشخاص کے ناموں کو چھوڑ کر سرتاپا حقیقت ہے۔ آج کل بعض فاضلوں نے ''پنجاب میں اردو'' اور بعض اہل دکن نے ''دکن میں اردو'' اور بعض عزیزوں نے ''گجرات میں اردو'' کا نعرہ بلند کیا ہے۔ لیکن حقیقت یہ معلوم ہوتی ہے کہ ہر ممتاز صوبہ کی مقامی بولی میں مسلمانوں کی آمد و رفت اور میل جول سے جو تغیرات ہوئے ان سب کا نام اردو رکھا گیا ہے..... ہم جس کو آج اردو کہتے ہیں حقیقت میں وہ دہلی اور اطراف دہلی کی وہ پرانی بولی ہے جو وہاں پہلے سے بولی جارہی تھی جس میں زمانہ کے قاعدہ کے مطابق انقلاب، اتار چڑھاؤ اور خراد ہو ہو کر لفظوں کی مناسب صورت بن گئی۔''[1]

قائم چاند پوری اور ان کا کلام

(جناب محمد علی خاں اثر رام پوری اپریل تا جون ۱۹۵۲ء)

اس مضمون میں مضمون نگار نے قائم کے حالات اور ان کے کلام پر مختصر تبصرہ کیا ہے۔ اور ان کے غیر مطبوعہ اشعار کا انتخاب بھی کیا ہے تاکہ اس کے ذریعہ ایک قدیم استاد کے اشعار محفوظ ہو جائیں۔ اثر لکھتے ہیں کہ:

ان کے (قائم) کلام میں خدا جانے کیا سحر ہے جتنا زیادہ پرانا ہوتا جاتا ہے اتنا ہی دنیائے ادب کے مشاہیر کی توجہ کا مرکز بنتا جاتا ہے۔ قائم کے کلام کی شہرت تو ان کی زندگی میں ہی ہو چکی تھی، لیکن کلام طبع نہ ہونے کی وجہ سے ان کی شہرت عام نہ ہو سکی۔ اس سلسلہ میں حسرت موہانی کو اولیت حاصل ہے کہ انھوں

۱۔ معارف، جولائی ۱۹۳۳ء، ص ۱۴۔۱۵

نے اردوئے معلیٰ کے رسالہ جنوری ۱۹۸۴ء میں قائم کے کلام پر تبصرہ کیا اور دیوان قائم (عطیہ محمد شفیع الدین خان مرادآبادی) کی کل غزلوں کے ردیف دار منتخب اشعار ضمیمۂ اردوئے معلیٰ نمبر ۳، ۱۹۰۵ء میں شائع کئے جس کو دیکھ کر محققین ادب کو کلام کی جانچ اور اس پر رائے زنی کا موقع مل سکا اور آئندہ ملتا رہے گا۔

قائم کے کلام پر جہاں تک اختلافی امور کی تحقیقات کا تعلق ہے بلا شبہ ڈاکٹر عبدالحق صاحب کی خدمات قابل قدر ہیں۔ جنھوں نے قائم کے نام تاریخ وفات اور مثنویوں کے اختلاف پر روشنی ڈال کر اپنی ایک مستقل رائے قائم کی ہے۔

قائم کی زبان شاعری اور سوز و گداز میر اور درد سے ملتا جلتا ہے اور بلاغت و حکمت کے اعتبار سے ان کے زیادہ تر کلام ''انّ من الشعر الحکمہ'' کا مصداق ہے جس میں انھیں انفرادیت حاصل ہے۔ قائم نے حکایات لقمان کو پیش نظر رکھ کر جو کہانیاں لکھی ہیں اور جو اخلاقی مثنویاں لکھی ہیں وہ اخلاق و موعظت اور نادر تمثیلات و نتائج کے لحاظ سے ارباب بصیرت کے لئے نادر تحفے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

اثر صاحب نے اس مضمون میں قائم کے حالات سے متعلق بعض نئے انکشافات جس میں قائم کا مذہب سنّی ہونے کا ثبوت، قائم کے صحیح نام، سال وفات، مثنویاں، قائم کی حسن پرستی، قائم کی انفرادیت پر اپنی تحقیقات کو قلم بند کیا ہے۔ اثر صاحب نے رام پور کے کتب خانہ میں موجود کلیات قائم کا جو نسخہ فراہم کیا ہے اس میں سے ان کے اصناف سخن کی تفصیل درج کی ہے جس میں قائم کی غزلیں، رباعیاں، قصائد، مثنوی موسم سرما، مثنوی افسانۂ عشق مع حکایات، مثنوی نماز مع حکایات، مثنوی قضا و قدر، مثنوی درد قولنج، مثنوی مرد عیاز، مثنوی بندۂ درگاہ، مثنوی سکندر و ارسطو، مثنوی ہولی، مثنوی زن اوباش، مثنوی گرگ و گوسفند۔

اخلاقی کہانیاں : شاختراشی، مرد طریق، ہجو خارش، ہجو کوذی، ہجو حجام، ہجو کیچڑ بسولی، ہجو پتنگ باز، ہجو شیخ

متفرق میں قطعات، تاریخیں، مسدس و مخمس، ترجیع بند

اس کے علاوہ اثر صاحب نے قائم کے وہ اشعار بھی نقل کئے ہیں جو اپنے حسن قبول کی وجہ سے ضرب المثل بن گئے ہیں اور جن کی نقل میں مختلف لفظی تغیرات ہوئے ہیں۔ ان شعروں کا ذکر بھی اس

مضمون میں کیا ہے۔

آخر میں اثر صاحب نے قائم کے غیر مطبوعہ کلام کو بھی اس مضمون میں نقل کیا ہے: وہ لکھتے ہیں:

''میں نے حتی المقدور ان اشعار کا انتخاب کیا ہے جو میرے علم میں غیر مطبوعہ ہیں۔ اگر اس کے باوجود ان میں سے کچھ اشعار مطبوعہ نکل آئیں تو ان کو قند مکرر تصور کیا جائے۔'' [۱]

خواجہ میر درد اور آب حیات (از جناب حافظ مجیب اللہ ندوی جنوری ۱۹۶۳ء)

مولانا محمد حسین آزاد کی آب حیات ادب وتنقید کا مرقع ہے اور شعرا کا تذکرہ بھی۔ ادبی حیثیت سے اس کا شمار ادب عالیہ میں ہوتا ہے۔ جس سے وہ ہمیشہ زندہ وتابندہ رہے گی۔ لیکن تذکرہ وتحقیق کی حیثیت سے اس میں بہت سی ایسی خامیاں بھی ہیں جس کی وجہ سے اس کی تاریخی اور تحقیقی حیثیت ہمیشہ مجروح رہی۔ محمد حسین آزاد کے مزاج میں افتاد پایا جاتا ہے۔ وہ بہت سی جگہوں پر تضاد بیانی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ علامہ شبلی نے ان کی کتاب کو دیکھ کر کہا تھا:

''آزاد کی کتاب آئی جانتا تھا کہ وہ تحقیق کے میدان کا مرد نہیں ہے تاہم ادھر ادھر کی گپیں بھی ہانک دیتا ہے تو وحی معلوم ہونے لگتی ہے۔'' [۲]

مذکورہ مضمون میں مجیب اللہ صاحب ندوی نے خواجہ میر درد کا ذکر کیا ہے۔ جن کی شاعری اور فضل و کمال کے بارے میں کسی زمانے میں دو رائے نہیں ہوئی۔ آزاد صاحب نے ان کے بارے میں بہت سی بے سروپا باتیں بڑے وثوق کے ساتھ لکھ ڈالی ہیں اور ان کی شاعرانہ حیثیت کو بھی مجروح کرنے کی کوشش کی ہے۔ مولانا مجیب اللہ صاحب ندوی نے اس مضمون میں آزاد کی غلطیوں کی جو انھوں نے میر درد کے

۱۔ معارف جون ۱۹۵۲ء، ص ۳۷۵

۲۔ معارف، جنوری ۱۹۶۳ء، ص ۵۳

سوانح حیات اور شاعری کے بارے میں کی ہے تصحیح اور نشان دہی کرنے کی کوشش کی ہے۔ ساتھ ہی یہ دکھانے کی کوشش کی ہے کہ کیسے کیسے صاحب فضل وکمال آزاد کی ستم ظریفیوں کے زخم خوردہ ہیں۔ مضمون نگار نے خواجہ صاحب کی شاعری سے متعلق مولانا آزاد کا یہ اقتباس نقل کیا ہے کہ:

''باوجود اس کے سودا اور میر تقی میر کی غزلوں پر غزلیں لکھی ہیں، ہرگز ان سے کم نہیں''

میر صاحب ان کو آدھا شاعر کہتے تھے۔'' [۱]

اس عبارت پر مولانا ندوی نے اختلاف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''بظاہر خواجہ صاحب کی تعریف معلوم ہوتی ہے۔ مگر یہ ایسی تعریف ہے جس میں تحقیر کے بڑے ہی نازک نشتر چھپے ہوئے ہیں۔ یہ کہہ کر انھوں نے حقیقت میں خواجہ صاحب کی شاعرانہ عظمت اور استادانہ حیثیت کو مجروح کرنے کی کوشش کی ہے۔ باوجود اس کے ''کے'' الفاظ سے مترشح ہوتا ہے کہ میرؔ اور سوداؔ میدان شاعری میں خواجہ صاحب کے پیش رو اور ان سے ممتاز تھے۔ اور خواجہ صاحب نے حریف بن کر ان کی غزلوں پر غزلیں کہنے کی جرأت کر کے ایک زبردست خطرہ مول لے لیا تھا۔ مگر خیریت ہوئی کہ اتفاق سے کامیاب رہے۔ بے نیازی اور بلندی فکر ونظر اور دوسرے دلائل سے قطع نظر خواجہ صاحب کی بے ہمہ افتاد طبیعت سے یہ بات بعید ہے کہ وہ اپنے معاصرین کی غزلوں پر غزلیں کہنے کی کوشش کرتے۔ معاصرین کی غزلوں پر غزلیں کہنے کی کوشش وہ شخص کرتا ہے جس کے دل میں رشک وحسد کی آگ بھڑکتی ہے یا اسے شہرت وعزت کی خواہش بے چین رکھتی ہے۔ یا پیشۂ شاعری کو اس نے درویوزہ گروں کی صدا بنا

۱۔ معارف، جنوری ۱۹۶۳ء، ص ۵۷

رکھی ہو۔خواجہ صاحب ان سب سے بے نیاز اور صاف دل تھے۔'' ۱

اس کے علاوہ آزاد نے آب حیات میں اس فقرے کو کئی جگہ دہرایا ہے کہ ''میر صاحب خواجہ صاحب کو آدھا شاعر کہتے تھے۔مولانا ندوی نے اس کی تردید اس طرح کی ہے۔

''آزاد کے علاوہ کسی قدیم وجدید تذکرہ نگار نے میر کی یہ رائے نقل نہیں کی ہے اور یہ رائے ایسی نہیں تھی کہ تذکرہ نگار اسے نظر انداز کر جاتے۔خواجہ صاحب کے معاصرین میں قائم، میر حسن، مصحفی، گردیزی وغیرہ کے تذکرے اور اس کے بعد گلشن بے خار اور گلزار ابراہیم وغیرہ تذکرے ہمارے سامنے ہیں۔ان میں سے کسی نے بھی اس افسانے کا ذکر نہیں کیا ہے..... پورے ایک سو سال بعد آزاد کو معلوم نہیں کس معتبر راوی کے ذریعہ..... میرؔ کی یہ رائے پہنچ جاتی ہے۔میرؔ نے بہت سے شعرا پر تنقید کی ہے اور بے لاگ تنقیدیں کی ہیں..... لیکن خواجہ میر درد کو وہ آدھا شاعر کیا کہتے۔ان کے بارے میں ایک لفظ بھی ایسا نہیں لکھا جس سے ان کی شاعری یا ان کے علم وفضل اور اخلاق وکردار پر حرف آتا ہو۔'' ۲

اس کے علاوہ مضمون نگار نے مولانا آزاد کی ایک اور غلط بیانی مع اقتباس نقل کی ہے کہ خواجہ صاحب کے مکان پر مہینے میں دو بار مجلس سماع منعقد ہوتی تھی اور اس میں ہر طبقہ کے آدمی شریک ہوتے تھے۔یہ صحیح نہیں ہے۔اور یہ بھی غلط ہے کہ یہ تاریخیں ان کے کسی بزرگ کے انتقال کی ہیں۔یہ بھی غلط ہے کہ ۲ تاریخ کو ان کے یہاں مرثیہ خوانی ہوتی تھی۔ان باتوں کا نہ تو کسی تذکرہ نگار نے ذکر کیا ہے نہ خود خواجہ صاحب نے۔حالانکہ خواجہ صاحب نے اپنی کتابوں میں اپنی مجلس کے پند وعظ، سماع، معاشرت اور

۱۔ معارف، جنوری ۱۹۶۳ء، ص ۵۸

۲۔ ایضاً، ص ۵۹

اس طرح کی تمام باتوں کا ذکر کیا ہے مگر ان میں کہیں ان باتوں کا ذکر نہیں ملتا۔

غرض یہ کہ محمد حسین آزاد نے آب حیات میں خواجہ میر درد سے متعلق جن غلط بیانیوں سے کام لیا ہے مولانا مجیب اللہ ندوی نے اپنے اس مضمون میں دلائل وشواہد سے اس کی تردید کرتے ہوئے مولانا آزاد سے متعلق خیالات کا اظہار اس طرح کیا ہے:

''خواجہ صاحب کے بارے میں آزاد کی جتنی معلومات ہیں وہ سب سماعی معلوم ہوتی ہیں۔ ادھر ادھر سے جو کچھ سن لیا لکھ دیا۔ حتیٰ کہ انھوں نے خواجہ صاحب کا پورا دیوان بھی غالباً دیکھنے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ ان کی سماعی معلومات کا ایک نمونہ یہ ہے کہ خواجہ صاحب کی تصانیف میں ایک کتاب واقعات درد کا بھی ذکر کیا ہے جس کا کوئی وجود نہیں۔ دوسرے ان کے والد کی کتاب نالہ عندلیب کو ایک رسالہ لکھا ہے، جب کہ وہ دو جلدوں میں ایک ہزار صفحے سے زیادہ ضخیم کتاب ہے۔'' [۱]

مضمون نگار کے مطابق:

''آزاد کو خواجہ صاحب کے دامن فضل و کمال کو داغدار بنانے اور ان کی شاعرانہ عظمت کو مجروح کرنے کے لئے جو مواد بھی ہاتھ آیا اسے وہ داد و تحسین کے بڑے ہی خوبصورت پردوں میں چھپا کر پیش کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ اس سلسلہ میں ان کو بعض لایعنی باتوں کے ذکر کرنے میں باک نہیں ہوتا..... اس کے علاوہ آزاد سے خواجہ صاحب سے متعلق بہت سی چھوٹی چھوٹی غلطیاں ہوئی ہیں لیکن انھیں اس مضمون میں اس لئے نظر انداز کر دیا گیا ہے کہ اس سے خواجہ صاحب کی شخصیت یا شاعری پر کوئی حرف نہیں آتا۔'' [۲]

۱۔ معارف، جنوری ۱۹۶۳ء، ص ۶۶

۲۔ ایضاً، ص ۷۰

مسدس حالی اور شعریت (تاج پیامی، دارالادب، آرہ، بہار، جولائی ۱۹۸۸ء)

اس مضمون میں مضمون نگار نے مشہور نقاد کلیم الدین احمد کا قول نقل کیا ہے جنھوں نے مسدس حالی میں شعریت سے انکار کیا ہے۔ انھوں نے اپنی تصنیف میری۔ ایک بازدید کے صفحہ ۱۴ پر لکھا ہے کہ مسدس حالی مقبول نظم تھی لیکن میں نے کہا اس نظم میں شعریت نہیں اور اچھی نثر بھی نہیں اور کوئی سمجھ بوجھ بھی نہیں اس لئے لوگوں کے جذبات کو ٹھیس لگی۔

کلیم الدین صاحب نے اپنی کتاب ''اردو شاعری پر ایک نظر'' میں مسدس سے متعلق لکھا ہے کہ:

۱۔ خیالات ہیں اور بلند قسم کے ہیں لیکن ان کو احساسات کے سانچے میں نہیں ڈھالا گیا ہے اس لئے شعریت کا پتہ نہیں۔

۲۔ مسدس کے بندوں میں بھی شعریت نہیں اور اچھی نثر بھی نہیں

۳۔ اگر نثر میں وزن جوڑ دیں تو وہ شعر نہیں ہو جاتے۔ اگر ہم خیالات کو موزوں کرتے چلے جائیں تو نتیجہ شعر نہیں موزوں نثر ہو سکتا ہے۔ یہی حال مسدس حالی کے زیادہ سے زیادہ حصے کا ہے۔

۴۔ مسدس حالی ایک ریگستان ہے جس میں کبھی کوئی مختصر سی سرسبز و شاداب جگہ ملتی ہے جس سے لمحہ بھر کے لئے دماغی سکون و فرحت کا سامان ہو جاتا۔'' [۱]

کلیم الدین صاحب نے مسدس کا موازنہ انگریزی نظموں سے بھی کیا ہے۔ مصنوعی اور حقیقی شاعری کے سلسلہ میں انھوں نے ''اردو شاعری پر ایک نظر'' میں انگریزی زبان کے ایک شاعر کریب کی ایک نظم کا ترجمہ پیش کر کے یہ لکھا ہے کہ حالی کی غصہ بھری باتوں میں کوئی شاعرانہ حسن نہیں۔ کریب کو بات کرنے کا سلیقہ ہے اور اس کی باتوں سے ربط و تسلسل ہے جو سچائی ہے جو شان ہے جو زور ہے جو حسن ہے وہ حالی کو میسر نہیں۔

تاج صاحب نے کلیم الدین احمد کے ان خیالات سے اختلاف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

۱۔ معارف، جولائی ۱۹۸۸ء، ص ۳۸۔۳۹

''مولانا حالی میں وہ ساری خوبیاں ہیں جن کا شمار کلیم الدین صاحب نے اوپر کیا ہے مگر کریب کے یہاں وہ نہیں ملتے ہیں۔ مسدس کے ان بندوں میں جن میں برا شعر کہنے کی مذمت ہے مکمل شاعرانہ حسن ہے۔ کریب ایک معمولی درجہ کا شاعر تھا۔ اس کا انگریزی ادب و شاعری میں کوئی درجہ نہیں ..... کلیم الدین صاحب نے مسدس حالی کے سلسلہ میں گولڈ اسمتھ کی نظم Deserted Village اور گرے کی ایلجی (Elgy) کا بھی تذکرہ کیا ہے جس پر مضمون نگار نے اعتراض کیا ہے کہ

''مسدس جیسی طویل اور تاریخ ساز نظم سے موازنہ کرنا ہی غیر تنقیدی عمل ہے دوسری بات یہ ہے کہ مسدس کی بظاہر سادہ بات میں بھی جو کیفیت اور شعریت ہے اس سے یہ نظمیں معرا ہیں۔''[1]

مولانا حالی نے مسدس کی تصنیف اس مقصد سے کی تھی کہ مسلمان قوم جو آج پستی اور زوال کی طرف گامزن ہے کبھی آسمان کی بلندیوں پر تھی۔ اس تصنیف کے ذریعہ حالی نے قوم کو پستی سے ابھارنے کی کوشش کی ہے۔ انھیں زوال کی وجہ بتاتے ہوئے قومی ترقی و کامیابی کے لئے [illegible] ئے ہیں جس کے لئے یہ ضروری تھا کہ بات براہ راست کہی جائے جو آسانی سے دل میں اتر جا[illegible] دل نے شاعری کے لئے سادگی، اصلیت اور جوش کو لازمی قرار دیا ہے اور انہیں اپنی مسدس میں استعمال بھی کیا ہے۔ مضمون نگار کے الفاظ میں:

''مولانا نے شاعری کی بنیاد سادگی کی اس جامع تعریف پر رکھی ہے، خواہ غزل ہو یا نظم اسے سادگی کے زیور سے سنوارا۔ وہ شاعر بھی تھے اور بہت اچھے ناقد بھی۔ انھوں نے تنقیدی اصول خود وضع کئے، اور ان ہی کی روشنی میں اپنا کلام

۱۔ معارف، جولائی ۱۹۸۸ء، ص ۳۹

پیش کیا اور تنقیدیں بھی کیں۔ ان کی گراں قدر تصنیف مقدمہ شعر و شاعری اور یادگار غالب و حیات سعدی وغیرہ میں ان کے تنقیدی اصول پائے جاتے ہیں۔ مولانا حالی کلیم الدین احمد سے بہتر ناقد ہیں کیونکہ ان کی تنقید تعمیری ہے۔ جب کہ کلیم الدین صاحب کی تنقید تخریبی ہے۔ چاہے شعوری طور پر ہو چاہے غیر شعوری طور پر۔'' [۱]

مولانا حالی ایک دردمند دل لے کر پیدا ہوئے تھے۔ انھیں اپنی قوم کو اس کا بھولا ہوا سبق یاد دلانا تھا۔ انھوں نے بڑے خلوص اور شاعرانہ انداز میں ماضی کے واقعات کو نظم کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہ نظم شائع ہوتے ہی خاص و عام میں مقبول ہوگئی اور آج بھی اس کی مقبولیت میں کوئی فرق نہیں آیا۔ اس کی شعریت سے انکار ہدایت کا انکار ہے۔ یہ کتاب بہترین شاعری کا نمونہ اور شاہکار ہے۔

غالب کا مذہبی رجحان (ڈاکٹر ام ہانی، مارچ ۱۹۷۳ء)

ڈاکٹر ام ہانی نے اس مضمون میں غالب کے مذہبی رجحان اور آیات قرآنی پر غالب کے نظریہ کے پیش نظر ثبوت میں کچھ اشعار بھی پیش کئے ہیں..... موصوفہ کا ماننا ہے کہ ہندوستان و پاکستان میں شاید ہی کسی شاعر پر اتنی تحقیق و تنقید کی گئی ہو جتنی مرزا اسداللہ خاں غالب پر کی گئی ہے۔ پھر بھی ان کی زندگی کا ایک گوشہ ایسا بھی ہے جہاں اب تک محققین کی رسائی نہیں ہوئی۔ ان کے ذاتی حالات اور مذہبی رجحانات کے متعلق تمام نقاد اور محقق اس پر متفق ہیں کہ (توحید وجودی پر پختہ یقین رکھنے کے علاوہ) تمام عمر وہ مذہب سے بیگانہ ہی نہیں رہے بلکہ ان کے اعمال و اشغال و اقوال مذہب کے منافی تھے۔ یہاں تک کہ ان وجوہات سے ان کی خانگی زندگی بھی درہم برہم تھی۔ اس سلسلے میں ام ہانی نے مختلف اصحاب قلم کی رائے رقم کی ہے۔ مولانا حالی نے اپنی تصنیف یادگار غالب جو تحقیق و تنقید کے میدان میں سنگ بنیاد کا درجہ رکھتی ہے لکھتے ہیں:

۱۔ معارف، جولائی ۱۹۸۸ء، ص ۴۴

''مرزا کی بیوی جو الٰہی بخش خاں معروف کی بیٹی تھیں وہ نہایت متقی، پرہیز گار اور نماز روزے کی پابند تھیں۔'' [۱]

حالی نے ایک لطیفہ سے اس کی تائید بھی کر دی ہے۔

''پنڈت موتی لال میر منشی لفٹنٹی پنجاب مرزا سے ملنے آئے۔ کچھ پنشن کا ذکر چلا۔ مرزا صاحب نے کہا تمام عمر میں ایک دن شراب نہ پی ہو تو کافر اور ایک دفعہ نماز پڑھی ہو تو گنہ گار۔ پھر بھی میں نہیں جانتا کہ سرکار نے مجھے باغی مسلمانوں میں کیوں شمار کیا؟'' [۲]

ان اقتباس کے پیش نظر ڈاکٹر ام ہانی اپنے خیالات رقم کرتی ہیں:

''ان ہی بنیادوں پر مرزا کی مذہبی، بے مبالاتی کا عقیدہ اتنا راسخ ہو گیا کہ بعد کے لوگوں نے اس کے خلاف کوئی جستجو نہ کرتے ہوئے ان بنیادوں پر فلک شگاف عمارتیں تعمیر کر دیں'' [۳]

ڈاکٹر ام ہانی نے غالب کے مذہبی رجحان کے سلسلے میں کچھ نقادوں کے قول بھی نقل کئے ہیں جس میں حمید احمد خاں جنھوں نے غالب کے ایک قریبی رشتہ دار بکا بیگم کے حوالے سے ان کی مذہبی زندگی کا جائزہ لیا ہے۔ اس کے علاوہ مشہور محقق عرشی صاحب، پروفیسر آل احمد سرور، پروفیسر رشید احمد صدیقی، شیخ محمد اکرام، ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری کے خیالات بھی پیش کئے ہیں۔ عرشی صاحب نے غالب کے ''مکاتیب نامہ'' کے دیباچہ سے یہ الفاظ نقل کیا ہے ''اگر چہ فاسق و فاجر ہوں مگر وحدانیت خدا اور نبوت خاتم الانبیاء کا بدل معتقد اور بزبان معترف ہوں۔''

۱۔ یادگار غالب، الطاف حسین حالی، ص ۹۲، بحوالہ معارف، مارچ ۱۹۷۳ء، ص ۲۰۲

۲۔ ایضاً، ص ۲۰۲

۳۔ معارف، مارچ ۱۹۷۳ء، ص ۲۰۲

رشید احمد صدیقی نے انہیں عجمی قرار دیا ہے اور شیخ محمد اکرام نے انہیں دبستان مذاہب اور پارسیوں کی مذہبی کتاب دساتیر سے ان کی ذاتی واقفیت کا اظہار کیا ہے تو ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے انتہائی مبالغے سے کام لیتے ہوئے لکھا ہے کہ ''یہ سر راہ اللہ اکبر کے نعرے لگا رہے ہیں یہ سرمستی اور مدہوشی کم مایگی نہیں ہے بلکہ خمخانہ جاوید میں داخل ہو کر بے اندازہ پی گئے ہیں۔ یہ عشق الٰہی کے نشے میں غش ہیں۔ کون ایسا ہے جو اس کیفیت سے سرشار ہو کر ہوش مند رہ سکتا ہے۔ ڈاکٹر ام ہانی ان نقادوں کے خیالات پر اپنی رائے پیش کرتے ہوئے لکھتی ہیں:

> ''اس میں شبہ نہیں کہ غالب کی زندگی اب تک جو ہمارے سامنے آئی ہے وہ دنیا داری، عیش و امروز کا ایک طویل سلسلہ ہے۔ ان کی شراب خوری خواہ ''نشاط کی غرض سے ہو یا بیخودی کی غرض سے ہو یا بیخودی کی ضرورت'' سے مگر ان کی زندگی کا جزو لاینفک بن چکی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ قمار بازی، بازاری عورتوں پر گرویدگی یہ دلچسپیاں مذہب کے منافی ہیں لیکن جب ہم ان کے کلام پر نظر ڈالتے ہیں تو ہم معتد بہ اشعار ایسے ملتے ہیں جو ہم کو یہ سمجھنے پر مجبور کرتے ہیں کہ ان کے کردار کے سلسلے میں کچھ کڑیاں امتداد زمانہ میں کھو گئی ہیں اور جو کچھ معلوم ہوا اس میں مبالغہ زیادہ اور اصلیت کم ہے۔ اب رہ گیا خود ان کا بیان جو علماء نے ان کے کردار کے متعلق بطور سند پیش کیا ہے وہ مختلف وجوہ کی بنا پر مستند قرار نہیں دیا جا سکتا۔'' [1]

اسی مضمون میں ڈاکٹر ام ہانی غالب کے اردو اور فارسی دونوں کلام سے متعلق رقمطراز ہیں:

> ''اگر موازنہ کیا جائے تو غالب کے اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے کلام میں خدا، محمد، جنت، دوزخ، حور، رضوان، یوسف، آدم، ابراہیم، ادریس، سلیمان،

۱۔ معارف مارچ ۱۹۷۳ء، ص ۲۰۵

عیسیٰ، موسیٰ، ایوب، یعقوب اور امر ونواہی اور آیات قرآنی کے اقتباسات عجمی حوالوں سے کہیں زیادہ پائے جاتے ہیں۔ ساتھ ہی یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ غالب کے یہاں محض یہی نہیں کہ یہ حوالے دوسرے فارسی اور اردو شاعروں سے زیادہ ملتے ہیں بلکہ غالب کی تلمیحات قرآنی دوسرے شاعروں کی بہ نسبت متن قرآنی سے زیادہ قریب ہیں اور یہ کمال معمولی محنت سے نہیں حاصل ہوسکتا۔ یہ کاوش انھوں نے کس زمانے میں کی اس کا سراغ لگانا اب مشکل ہے کیونکہ ان کی وفات کو سو سال سے زیادہ گزر چکے ہیں۔ معاصرین میں کوئی موجود نہیں۔ قریب العہد سوانح نگاروں نے اس کی طرف توجہ نہیں کی۔ اور یہ بہت افسوس اور تعجب کی بات ہے اس لئے کہ کلام غالب کی یہ غیر معمولی خصوصیات جو شاید کسی اور شاعر کو نصیب نہیں ہوئی اس سے انکار نہیں ہوسکتا کہ غالب کا یہ کمال اپنے مذہب میں غیر معمولی دلچسپی کا نتیجہ ہے۔'' [۱]

ڈاکٹر ام ہانی نے غالب کے مذہبی رجحان کے سلسلے میں ان کے فارسی اشعار درج کئے ہیں جو تلمیحات متن قرآنی سے کافی قریب ہیں۔ مثلاً سورہ یوسف کی یہ آیت ان کے فارسی اشعار کے قریب معلوم ہوتی ہے۔

''فَلَمَّا رَأَيْنَهُ أَكْبَرْنَهُ وَقَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ وَقُلْنَ حَاشَ لِلَّهِ مَا هَـذَا بَشَراً إِنْ هَـذَا إِلَّا مَلَكٌ كَرِيمٌ''

قزاید بغوغائے یوسف دو پہر ترنج کف حردہ گیران شہر

(ترجمہ کا ذکر متن قرآنی سے خارج ہے)

اسی طرح جب یعقوبؑ کی آنکھیں یوسفؑ کی جدائی سے روتے روتے سفید ہوگئی تھیں

''قَالَ يَا أَسَفَى عَلَى يُوسُفَ وَابْيَضَّتْ عَيْنَاهُ مِنَ الْحُزْنِ'' (یوسف)

اس سفیدی کا غالب نے حوالہ دیا ہے۔

۱۔ معارف، مارچ ۱۹۷۳ء، ص ۲۰۷

نہ چھوڑی حضرت یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی　　سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر
قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر　　لیکن آنکھیں روزن دیوار زنداں ہو گئیں

اس کے علاوہ غالب نے قرآنی مطالب میں کچھ تحریف بھی کی ہے۔ ان میں سے بعض تو صرف مزاح کی خاطر ہیں جن کا ان کے مزاج میں غلبہ تھا۔ مثلاً

پکڑے جاتے ہیں فرشتوں کے لکھے پر ناحق　　آدمی کوئی ہمارا دم تحریر بھی تھا

ان لغزشوں کے باوجود بھی یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان کو قرآن سے خاص شغف تھا اور وہی ان کے شاعرانہ فکر و تخیل کا محور تھا۔ اور اس کو مذہب اسلام کی طرف رجحان کے سوا کسی اور چیز سے تعبیر نہیں کیا جا سکتا اور یہاں ''ای تو غائب زنظر مہر تو ایمان مسلت'' کی تصدیق ہوتی ہے۔'' [۱]

ڈاکٹر ام ہانی کے اس مضمون پر معارف نے اپنے نکات اس طرح پیش کئے ہیں۔

''مضمون نگار نے غالب کے مذہبی رجحان اور آیات قرآنی پر ان کی نظریے کے ثبوت میں جو اشعار پیش کئے ہیں وہ ان کے ساتھ مخصوص نہیں۔ آیات قرآنی سے متعلق اس قسم کی تلمیحات اس قدر عام ہیں کہ ان سے کم و بیش ہر پڑھا لکھا مسلمان واقف ہے اور ان سے کسی مسلمان شاعر کا کلام خالی نہیں نکل سکتا۔ اس لئے یہ مضمون غالب سے زیادہ آیات قرآنی پر خود مضمون نگار کی نظر کا ثبوت ہے اور اس حیثیت سے نئی چیز ہے کہ انھوں نے غالب کے کلام سے یہ اشارے ڈھونڈھ نکالے اور ان سے متعلقات آیات پیش کر دیں۔ اب تک کسی نے اس نقطۂ نظر سے کلام غالب کا مطالعہ نہیں کیا تھا۔ اس میں ان لوگوں کا بھی جواب ہے جو غالب کو مذہب سے بالکل بیگانہ اور محض ایک آزاد مشرب رند لاابالی کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں۔ [۲]

۱۔ معارف، اپریل ۱۹۷۳ء، ص ۲۰۱

۲۔ ایضاً، ص ۲۰۱

مولانا ابوالحسن علی ندوی کی نثر نگاری کی ایک جھلک

(ایک مجموعہ مکاتیب کے آئینہ میں، جناب سبط محمد نقوی، ستمبر ۲۰۰۰ء)

اس مضمون میں سبط صاحب (جو ہفت روزہ توحید میل کے ایڈیٹر ہیں) تحریر کرتے ہیں کہ ''ابھی حال میں ایک پروفیسر صاحب کو مولانا کے اردو نثر نگار ہونے میں تردد ہوا، موصوف کی رائے میں مولانا علی میاں ندوی عربی کے اہل قلم ہیں اور اردو نثر نگار کی حیثیت سے ان کا قلم اہم نہیں۔ اس کی وجہ ایک حد تک تو یہ ہے کہ مولانا کے مصنفات بہت بڑی تعداد میں اردو کے کتب خانے کی زینت ہیں۔ لیکن اصل میں ان میں مولانا کی اردو کی تحریریں کون کون سی ہیں اور عربی سے ترجمہ کون کون سے ہیں ان کا شمار کرنا پڑے گا۔ مولانا کے افادت کا خاصہ حصہ نظر قاصر سے گزرا ہے۔ بعض مضامین میں اردو مترجم کا نام بھی نظر نواز ہوا لیکن اصل اردو تحریروں کی شناخت اتنی پر صعوبت مہم نہیں ہے کہ جس سے خوفزدہ ہو کے مولانا کے اردو ادیب ہونے سے انکار کر دیا جائے۔

مضمون نگار نے مولانا کے مکاتیب کی طرف اس مضمون میں توجہ دلائی ہے۔ وہ لکھتے ہیں: فی الوقت ہمارے لئے جناب مولانا کی اردو نثر نگاری کا سیر حاصل تو کیا کار آمد مطالعہ بھی ممکن نہیں۔ یہ جز وقتی اہل قلم کے بس کی بات بھی نہیں۔ پیش نظر مجموعہ مکاتیب کا نام اتنا مطول ہے کہ جلی قلم سے سرورق کے پورے ایک صفحہ پر محیط ہے۔ میں مختصراً علی میاں کے خطوط کے مختصر نام سے اس کا تعارف کرا رہا ہوں۔ پیش نظر مقدمہ مولانا کے عین حیات ضبط تحریر میں آیا تھا اس لئے اس میں دعائیے اور تعظیمیے اس کے مطابق حال ہیں۔ اب آپ مکاتیب کے جمع و تدوین کے حوالے سے عالم مقدمہ نگار کا یہ اظہار خیال ملاحظہ فرمائیں:

''مکاتیب کے جمع کرنے اور ان سے فائدہ اٹھانے کا ذوق مسلمانوں میں ہمیشہ رہا ہے۔ مکتوبات امام ربانی مکتوبات حضرت مخدوم الملک شرف الدین یحیٰ منیری مشاہیر علماء میں شبلی نعمانی، سید سلیمان ندوی، مولانا ابوالکلام آزاد کے مکتوبات کے مجموعے نیز دیگر مشائخ کے مکتوبات اپنے اپنے حلقوں میں علمی، دینی اور ادبی سرمایہ کا حکم رکھتے ہیں۔ احادیث میں حضور انورؐ کے مکاتیب قیصر و کسریٰ کے نام محفوظ ہیں اور یہ ایک عجیب بات ہے کہ خود قرآن کریم میں بھی ایک مکتوب ہے۔ یہ اشارہ حضرت سلیمان کے اس خط کی

طرف ہے جو آپ نے ملکہ سبا بلقیس کے نام لکھا تھا۔

''إِنَّهُ مِن سُلَيْمَانَ وَإِنَّهُ بِسْمِ اللَّهِ الرَّحْمَنِ الرَّحِيمِ ٥ أَلَّا تَعْلُوا عَلَيَّ وَأْتُونِي مُسْلِمِينَ''

اس کے علاوہ بھی مضمون نگار نے مولانا علی میاں کے بہت سے مکاتیب اس مضمون میں نقل کئے ہیں جس میں مولانا عبدالکریم پارکھ صاحب کو ستائشی تعارف میں لکھا ہے جمشید پور کے قیامت خیز بلوے کے بعد کا ذکر بھی مکاتیب کے آئینے میں کیا ہے۔

ایک اور خط میں لرزہ خیز واقعات کا ذکر کرتے ہیں لیکن اس کی ذمہ داری آر ایس ایس پر ہے یا نہیں اس کے بارے میں کوئی سراغ موجود نہیں۔ متعلقہ حصہ ملاحظہ ہو:

> ''مولانا منت اللہ صاحب کے جو خطوط آئے ان میں ایسے لرزہ خیز واقعات اور حقائق درج ہیں جن کو پڑھنا مشکل ہے۔ آپ اس سلسلے میں جو تمہیدی کوشش کرسکیں وہ ضرور کریں۔ کہیں ایک جگہ ملاقات کا انتظام ہو اور اس میں کچھ اعلیٰ سطح کے لوگ اور بھی ہوں یہ کام جلد کرنے کا ہے اور اس کے سوا اور کوئی صورت ملک وملت دونوں کی حفاظت کی نہیں.....فرقہ پرست اور جارحانہ مقاصد والی تنظیموں کے قائدین سے بھی ربط رہنا چاہئے۔'' [1]

مولانا علی میاں ندوی کی تمام تر فکر مندی ہندی مسلمانوں اور ہندوستان تک ہی محدود نہیں تھی۔ پوری دنیا پر نظر رکھتے تھے اور علم انسانیت کے لئے ان کا دل دھڑکتا تھا۔ سبط صاحب ان کے انداز بیان سے متعلق لکھتے ہیں:

> ''مولانا علی میاں ندوی نے جو زبان اور انداز بیان اپنے مکاتیب میں اپنایا ہے آپ کی کتابیں اس سے مختلف انداز بیان میں ہیں۔ آپ کی کتابوں کی نثر بہت جاندار اور دل آویز ہے۔ مغلقات لغات سے بوجھل نہیں۔'' [2]

۱۔ معارف ستمبر ۲۰۰۰، ص ۲۲۰

۲۔ ایضاً، ص ۲۲۲

اردو صحافت کا ارتقاء (جناب سید ابو عاصم صاحب، اکتوبر ۱۹۴۲ء)

مضمون نگار نے اس مضمون میں ذکر کیا ہے کہ جیمس آگسٹس ہیکی (Games Augustus Hieky) نے ۲۹ رجنوری ۱۷۸۰ء میں بنگال گزٹ کے نام سے ایک اخبار نکالا۔ اسی کو ہندوستان کا پہلا اخبار کہا جا سکتا ہے۔ لیکن بعد میں اس کو بند کر دیا گیا۔ اٹھارہویں صدی کے آخر میں انگریزی کے بہت سے اخبار نکلنے لگے تھے مثلاً کلکتہ گزٹ اور مینٹل ایڈورٹائزر، لیکن ۱۷۸۰ء کے قبل کسی اخبار کا وجود ثابت نہیں۔ انڈین گزٹ ضرور ایک اخبار تھا جو بعد میں شائع ہوا۔

۱۸۰۰ء میں فورٹ ولیم کالج میں پریس قائم ہو گیا جہاں سے ڈاکٹر گلکرسٹ اور کالج کے منشیوں کی تصانیف شائع ہونے لگیں۔ اسی دور میں سرام پور کے پادریوں نے بھی ایک مطبع کھولا، جس میں مختلف ہندوستانی زبانوں میں کتابیں چھپتی تھیں۔ اس وقت ولزلی گورنر جنرل تھا، اور ہندو مسلم تعلقات بہت خوشگوار تھے۔ لباس اور طرز معاشرت میں بہت حد تک یکسانیت تھی۔ تعلیم یافتہ لوگوں کی زبان فارسی تھی، جس کو ہندو مسلم سیکھتے تھے۔ چنانچہ جب شاہ عالم نے کلایو کو بنگال کی دیوانی عطا کی تو یہ شرط رکھی تھی کہ سرکاری زبان فارسی رہے گی۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ جتنے اخبارات نکلے سب فارسی زبان میں۔ سب سے قدیم فارسی اخبار جام جہاں نما ہے، جو غالباً مئی ۱۸۲۲ء میں کلکتہ سے نکلا تھا۔ سرام پور سے ایک بنگالی اخبار سماچار درپن ۱۸۱۸ء میں پہلے ہی نکل چکا تھا۔ فارسی کا یہ پہلا اخبار تھا۔ ۱۸۲۳ء میں ایک اردو ضمیمہ بھی شائع کرنے لگا تھا لیکن یہ ضمیمہ مقبول نہ ہو سکا۔ اس کے بعد بہت سے فارسی اخبارات جاری ہوئے۔ آئینہ سکندر ۱۸۳۱ء، سلطان الاخبار ۱۸۳۵ء اس کے اڈیٹر اردو کے مشہور انشا پرداز رجب علی سرور تھے۔ سراج الاخبار ۱۸۴۱ء۔ یہ مغل دربار کا کورٹ گزٹ تھا اور بہادر شاہ کی زیر سرپرستی دلی سے نکلتا تھا۔

۱۸۳۵ء میں سید احمد بریلوی نے تجدید و اصلاح اور سکھوں کے خلاف جہاد کا علم بلند کیا۔ مولانا کرامت علی جونپوری کی تحریک مشرقی بنگال میں اردو کے ذریعہ اپنا کام کر رہی تھی۔ ان تحریکوں نے اردو کو ترقی دی لیکن اردو ٹائپ مقبول نہ ہو سکا اور دلی میں ۱۸۳۷ء میں لیتھو پریس قائم ہوا۔ ۱۸۳۵ء میں شمالی ہند

میں دفتر کی زبان فارسی سے اردو ہوئی اور پریس کو بھی آزادی ملی۔ ۱۸۳۶ء میں مولوی محمد باقر نے دہلی سے اردو اخبار نکالا۔ اردو صحافت میں اولیت کا فخر اسی کو حاصل ہے۔ ۱۸۵۸ء تک اس کی دھوم رہی۔ علمی نقطۂ نگاہ سے اردو اخبار اور اس کے مطبع کو اشاعت خیالات، ترتیب رائے عامہ، طباعت کتب میں اولیت کا امتیاز حاصل ہے..... مولوی باقر علی نے اردو کا ایک دوسرا اخبار مظہر حق نکالا۔ معلوم نہیں وہ کتنی مدت تک زندہ رہا۔

دوسرا اخبار سید الاخبار ہے جس کو سر سید احمد خاں کے بھائی سید محمد خاں نے ۱۸۳۸ء میں نکالا تھا۔ موصوف کا عین شباب میں انتقال ہو گیا تو کچھ دنوں تک سر سید نے اس کو چلایا۔

''فوائد الناظرین'' ماسٹر رام چند دلی سے نکالا کرتے تھے۔ ۱۸۴۵ء میں ایک اور اخبار ''قران السعدین'' پنڈت دھرم نرائن باکسر کی ادارت میں دلی سے نکلا۔ یہ بارہ سال تک جاری رہا۔ ۱۸۴۷ء میں قمر الدین پھلٹی بازار آگرہ سے ہفتہ وار اخبار ''اسعد الاخبار'' نکالا۔ احسن الاخبار مطبوعہ ۲۲ اکتوبر ۱۸۴۸ء میں لکھتا ہے کہ ''صادق الاخبار'' کے اڈیٹر صاحب نے رفتہ رفتہ اپنے اخبار کو اردو اخبار بنا دیا ہے۔ کریم الدین مصنف تذکرہ شعرا نے مطبع رفاہ عام قائم کیا اور ایک اخبار کریم الاخبار کے نام سے جاری کیا۔ ۱۸۴۹ء میں شیخ محمد ضیا اللہ نے ضیاء الاخبار نکالا۔

مضمون نگار نے اردو اخبارات کے تیزی سے بڑھنے کا ذکر کرتے ہوئے اس مضمون میں لکھا ہے کہ:

> ''۱۸۳۵ء سے لے کر ۱۸۵۷ء تک کا زمانہ اخباروں کی انتہائی آزادی کا زمانہ تھا۔ یہی وجہ ہے کہ اس زمانہ میں اردو اخبارات بڑی تیزی سے بڑھنے لگے اور ایشیاٹک جرنل کی زبان میں ''انگریزی نہیں بلکہ دیشی اخباروں نے ہندوستان میں معاشرتی، اخلاقی، مذہبی تعلیم اور مادی انقلاب پیدا کیا ہے۔ دیشی اخبار اپنے حقوق کے لئے لڑتے رہے اور یہ مطالبہ کرتے رہے کہ ہندوستانیوں کو اعلیٰ عہدوں پر فائز کیا جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ قوم کی بیداری میں ان اخباروں کا بڑا

حصہ ہے۔اسی وقت اردو صحافت نے اپنے ہونہار ہونے کا پورا ثبوت دے دیا تھا۔ یہ اخبارات اس وقت کی معاشرت اور مذاق کے آئینہ دار ہیں۔
کوہ نور کی اجرا سے اردو صحافت نے ترقی کی راہ میں ایک قدم اور آگے بڑھایا۔ یہ نہ صرف پنجاب بلکہ ہندوستان کا اپنی طرز کا پہلا اخبار تھا جسے ۱۸۵۰ء میں منشی ہرسکھ رائے نے لاہور سے نکالا۔ مولانا احسن مارہروی نے اس کا سنہ اجرا ۱۸۴۹ء بتلایا ہے۔ یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں کثرت سے اردو اخبار نکلتے تھے۔'' [۱]

شاعر کیا ہے؟ (جناب محمد اسد خاں صاحب بی اے ملتان، نومبر ۱۹۲۹ء)

یہ مضمون انگریزی زبان کے مشہور شاعر ورڈز ورتھ کے ایک مضمون کا ترجمہ ہے۔ اس مضمون میں مصنف نے شاعری اور سائنس کا مقابلہ خوب کیا ہے اور اس عام خیال کی تردید کی ہے کہ سائنس کی ترقی شاعری کے تنزل کا باعث ہوگا۔ اس مضمون میں اسد خاں صاحب نے مضمون کی عمومی حیثیت کے لحاظ سے سوال کیا ہے کہ شاعر کے معنیٰ کیا ہیں؟ شاعر کیا ہے؟ وہ کس سے مخاطب ہوتا ہے اور اس سے کیسی زبان کی توقع رکھی جاسکتی ہے؟

اسد صاحب خود اپنے مضمون میں ان سوالوں کا جواب دیتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

''شاعر ایک انسان ہے جو انسانوں سے ہم کلام ہوتا ہے۔ ایک ایسا انسان جسے زندہ احساس جوش اور لطافت، فطرت انسانی کا علم اور وسعت دل اس مقدار سے جو عام بنی نوع میں مشترک خیال کی جاتی ہے بدرجہا زیادہ بخشی گئی ہے۔ ایک ایسا انسان جو اپنے جذبات اور اپنی آرزوؤں سے مسرت حاصل کرتا ہے اور اپنی روح حیات سے اور لوگوں کی نسبت زیادہ لطف اٹھاتا ہے۔ وہ دنیا کے واقعات میں بھی اسی قسم کے

۱۔ اردو صحافت کا ارتقاء، سیّد ابو عاصم، اکتوبر ۱۹۴۲ء، ص ۲۹۸

جذبات اور تمناؤں کے ظہور کا تصور کر کے خوش ہوتا ہے اور جہاں انھیں موجود نہیں پاتا وہاں انھیں خود پیدا کرنے پر فطرتاً آمادہ ہو جاتا ہے۔ ان صفحات پر مستزاد وہ ایک ایسی طبیعت رکھتا ہے جو غائب سے عین اسی طرح متاثر ہوتی ہے جیسے کہ حاضر سے، وہ اپنے اندر ایسے تاثرات پیدا کر سکتا ہے جو البتہ اصل واقعات سے پیدا ہونے والے تاثرات کے بالکل ہم رنگ تو نہیں ہوتے لیکن پھر بھی (خصوصاً جہاں تک خوش آئند و مسرت آمیز احساسات کا تعلق ہے ان اثرات کے مقابلے میں جو اور لوگ محض اپنے دلوں کی تحریک سے اپنے اندر محسوس کرتے ہیں حقیقی تاثرات سے بدرجہا زیادہ مشابہت رکھتے ہیں۔ کچھ اس سے اور کچھ مشتق سے وہ اپنے خیالات و احساسات کے اظہار کی بھی غیر معمولی قوت پیدا کر لیتا ہے۔ خصوصاً ایسے خیالات و احساسات جو بالارادہ یا کسی ظاہری تحریک کے بغیر خود بخود اس کے دل میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔''

مضمون نگار نے شاعر اور سائنسداں کے علم کا باہمی موازنہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

''شاعر اور سائنسداں دونوں کا علم مسرت ہے لیکن ایک کا علم ہمارے اندر اس طرح جذب ہو جاتا ہے جیسے کہ ہمارے وجود کا ایک لازمہ ہو، اور ہم سے جدا نہ ہونے والا ایک فطری ورثہ، دوسرے کا علم ایک شخصی اور ذاتی اکتساب ہے جو بہت دیر سے حاصل ہوتا ہے۔ جو کسی فطری اور بلا واسطہ احساس سے ہم کو ابنائے جنس کے ساتھ منسلک نہیں کرتا۔ سائنسداں حقیقت کو ایک بعید اور نامعلوم فیض رساں سمجھ کر تلاش کرتا ہے اور اس کے ساتھ تنہائی میں محبت کرتا ہے لیکن شاعر ایسی نغمہ سرائی سے جس میں تمام بنی نوع انسان اس کے ساتھ ہوتے ہیں حقیقت کی موجودگی کا لطف اس طرح اٹھاتا ہے گویا وہ ایک حاضر دوست اور وقتی ہمدم ہے.....شاعری علوم کا سانس اور روح لطیف ہے۔ یہ ایک اظہار محبت ہے اور تمام علموں کا چہرہ شاعر کے متعلق ہم بقول شیکسپیئر نہایت وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ وہ آغاز و انجام پر نظر رکھتا ہے۔ وہ فطرت انسانی کے تحفظ کی چٹان ہے۔ وہ محبت و ارتباط کو برقرار رکھنے، محفوظ کرنے اور جابجا پھیلانے والا ہے، باوجود اختلاف آب و ہوا، زبان و زمین، قوانین و رسوم، باوجود دل سے خود بخود نکل جانے والے اور بالارادہ فنا کئے ہوئے خیالات کے، شاعر اپنے علم و جذبات کے زور سے نوع انسانی کی دائمی اور عالمگیر وسیع سلطنت

کو باہم پیوستہ کرتا ہے۔ شاعر کے خیالات کے اسباب ہر جگہ موجود ہیں۔ اگر چہ حواس خمسہ اس کے خاص رہنما ہیں لیکن جہاں کہیں اسے فضائے جذبات میں پر ہلانے کا موقع ملے گا وہ ادھر چلا جائے گا۔'' [۱]

اردو شاعری کے متعلق مصحفی کا ایک اہم بیان (جناب قاضی عبدالودود، دسمبر ۱۹۳۷ء)

قاضی صاحب نے اس مضمون میں مصحفی کے ایک اہم بیان پر روشنی ڈالی ہے۔ مصحفی کے دیوان پنجم کے آخر میں مصحفی کا اردو شاعری کے متعلق ایک اہم بیان درج ہے۔ صفیر بلگرامی مرحوم نے جلوۂ خضر جلد۲ کے صفحہ ۳۶۔۳۷ پر اسے نقل کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ یہ بیان دراصل دیوان ششم کا دیباچہ ہے۔ لیکن قاضی صاحب نے صفیر بلگرامی کے اس تحریر پر تردید کی ہے کہ دیوان ششم کا جو نقشہ ہماری نظر سے گزرا ہے اس میں یہ دیباچہ نہیں ہے۔ لیکن قاضی صاحب نے مصحفی کا ایک بیان جو اس مضمون میں رقم کیا ہے اس بیان سے پتہ چلتا ہے کہ اس کا تعلق دیوان ششم سے ہے۔ اس مضمون میں قاضی صاحب نے بیان بھی نقل کیا ہے اور مصحفی کے بعض غلط یا مشکوک بیانات کی طرف حواشی میں اشارہ کیا ہے۔

مرزا مظہر جان جاناں کی دو غزلیں (پروفیسر عطاء الرحمٰن کاکوروی)

اس مضمون میں مضمون نگار نے مرزا مظہر جان جاناں کی تاریخ پیدائش اور ان کی دو غزلوں پر تنقیدی انداز میں روشنی ڈالی ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ ''آزاد نے (آب حیات میں) مرزا مظہر جان جاناں کو دور سوم میں رکھا ہے اور حاتم کو دور دوم میں رکھا۔ اس سلسلے میں مضمون نگار کا ماننا ہے کہ دونوں کا زمانہ ایک ہے اور تاریخ پیدائش ۱۱۱۱ھ میں ہے۔ آزاد کی روایت کے مطابق حاتم کی وفات ۱۲۰۷ھ اور مصحفی کی روایت کے مطابق ۱۱۹۶ھ ہے۔ مضمون نگار کی تحقیق کے مطابق مظہر کا سال وفات ۱۲۰۵ھ ہے۔ مگر آزاد

۱۔ معارف، نومبر ۱۹۲۹ء، ص ۳۸۱

نے ۱۲۰۱ھ لکھا ہے۔ حالانکہ جو قطعہ تاریخ انھوں نے پیش کیا ہے اس سے بھی ۱۲۰۵ھ ہی نکلتا ہے۔ اسی طرح محمد یحییٰ تنہا نے بھی آزاد ہی کی طرح ۱۲۰۱ھ لکھا ہے۔

مظہر کی شاعرانہ صلاحیتوں میں کوئی شک نہیں۔ وہ ایک فارسی گو شاعر تھے اور ان کی آغوش تربیت میں بڑے بڑے فنکار شاعر پروان چڑھے۔ حسن دوستی اور ذوق تصوف نے ان کے افکار کو بھی حسین و جمیل بنا دیا تھا۔ لیکن کاکوروی صاحب کو اس بات پر افسوس ہے کہ مظہر کا اردو کلام بہت مختصر ان تک پہنچا جو کچھ ملا بھی وہ غیر محقق طور پر ہے۔ اور صرف مختصر تذکروں میں ان کے اشعار ملتے ہیں۔ ذیل میں ان کی دو غزلیں درج کی جاتی ہیں جو عام تذکروں میں بھی باختلاف الفاظ پائی جاتی ہیں۔ ان کے کچھ اشعار نئے بھی ہیں اور کئی اشعار دوسرے شعراء کے اشعار کے ساتھ خلط ملط ہو گئے ہیں۔ مندرجہ ذیل غزل رسالہ اردو جنوری ۱۹۲۷ء میں مظہر جان جاناں کی دو غزلیں تذکرہ تحفۃ الشعراء مولفہ افضل بیگ خاں اورنگ آبادی سے نقل کی گئی ہیں۔

۱۔ اس گل کو ن بھیجتا ہے مجھے خط صبا کے ہات　　اس واسطے بکا ہوں چمن میں ہوا کے ہات

۲۔ برگ حنا اوپر لکھوا حوال دل میرا　　شاید کبھی تو جا لگے دلربا کے ہاتھ

۳۔ جلتا ہوں میرزائی گل دیکھ ہر سحر　　سورج کے ہاتھ چوری و پنکھا صبا کے ہات

۴۔ آزاد ہو رہا ہوں دو عالم کی قید سوں　　مینا لگا ہے جب ستی مجھ بے نوا کے ہات

۵۔ مظہر چھپا کے رکھ دل نازک میرے تئیں　　یہ شیشہ بیچنا ہے کسی میرزا کے ہات

میر نے اپنے تذکرہ نکات الشعرا میں اس غزل کا صرف ایک شعر نمبر ۳ نقل کیا ہے اور جلتا ہوں کے بجائے مرتا ہوں اور چوری کی چونری درج ہے۔ کاکوروی صاحب کے نزدیک جلتا ہوں زیادہ موزوں ہے۔ شعر نمبر ۱ میں بکا ہوں کی جگہ مراۃ الشعرا اور گل رعنا میں لگا ہوں اور کون کے بجائے ''کو'' ہے

شعر نمبر ۲ میں دوسرا مصرعہ دونوں کے یہاں اس طرح ہے۔

شاید کہ جا لگے وہ کسی میرزا کے ہاتھ

کاکوروی صاحب کے مطابق میرزا کی جگہ دل ربا ہی درست ہے۔ مضمون کے لحاظ سے بھی اور اس لئے

بھی کہ میرزا کا قافیہ شعر نمبر ۵ میں موجود ہے۔

شعر نمبر ۴ گل رعنا میں دوسرا مصرعہ اس طرح ہے ۔

مینا لگا ہے جب سے مجھ بے نوا کے ہاتھ

کا کوروی صاحب کے مطابق یہ غیر موزوں ہو جاتا ہے۔ اس لئے اس عیب کو مٹانے کے لئے تنہا نے لفظ کہ کا اضافہ کر دیا ہے۔ کا کوروی صاحب کے خیال میں جب سے کی جگہ جب ستی ہی ہوگا کیوں کہ اس وقت کی یہی زبان تھی۔

شعر نمبر ۵ پہلا مصرعہ دونوں کے یہاں اس طرح ہے ۔

مظہر چھپا کے رکھ دل نازک کو اپنے تو

حالانکہ مظہر نے میرے تئیں ہی لکھا ہوگا۔ ان کی زبان سے یہی اچھا معلوم ہوتا ہے۔ ان کے کلام پر اصلاح دے کر ہم ان کو داغ کا معاصر کیوں بنا دیں۔ یہ ایک اصولی غلطی ہے جس سے اجتناب لازمی ہے۔ دوسری غزل اورنگ آبادی کے تذکرہ میں اس طرح ہے۔

ہمارے ہاتھ سے بھاگا ہے دل لے جان جان اپنا
ہم اس کو جانتے تھے دوست اپنا مہربان اپنا

یہ حسرت رہ گئی کس کس مزے سوں زندگی کرتے
اگر ہوتا گل اپنا گل بن اپنا باغبان اپنا

جنوں سوں اس قدر روئیں کہ رسوا ہو گئیں آخر
ڈبویا ہائے ان آنکھوں نے آخر خانماں اپنا

قفس کے بیچ کیا حسرت ستی بلبل یہ کہتی تھی
کہ پھر بھی دیکھنا قسمت ہوئے گا بوستاں اپنا

ارے شیریں خدا سوں ڈر خبر لے عاشق اپنے کی
کیا فرہاد نے شیشے سوں سر لوہو لہاں اپنا

یہ بلبل بے اجازت باغباں کے گل سین ملتی ہے
مجھے معلوم ہوتا ہے کہ جی دے گی ندھان اپنا

کہیں دینے سے جی کے وصل ہونا بات لگتا ہے
دیا برباد پروانے نے ناحق دودمان اپنا

مرا جلتا ہے دل اس بلبل بیکس کی غربت پر
کہ گل کے آسرے پر جن نے چھوڑا آشیاں اپنا

یہ کہہ کر باغ سے رخصت ہوئی بلبل کہ یا قسمت
لکھا یوں تھا کہ چھوڑی فصل گل میں آشیاں اپنا

کوئی آزردہ کرتا ہے سجن ایسے کون ہے ظالم
جو دولت خواہ اپنا مظہر اپنا جاں جان اپنا

اس غزل کا شعر نمبر ۲ آب حیات اور مراۃ الشعراء میں کس کس کے بجائے کیا کیا ہے اور گل رعنا میں کس کس ہی ہے۔ سوں بجائے سے دکنی انداز ہے اور غالباً کاتب کی اصلاح ہے مرزا مظہر کی زبان نہیں۔ دوسرا مصرعہ تینوں کے یہاں اسی طرح ہے۔

اگر ہوتا چمن اپنا گل اپنا باغباں اپنا

الم سے یاں تلک روئیں کہ آخر ہوگئیں رسوا ڈوبایا ہائے آنکھوں نے مژہ کا خاندان اپنا

صرف گل رعنا میں ''ڈبویا ہے''

شعر نمبر ۸ تینوں تذکروں میں مرا جی جلتا ہے کے بجائے مرا جلتا ہے دل

شعر نمبر ۴، ۵، ۶، ۷، ۹ چونکہ ان تذکروں میں نہیں ہیں اس لئے یہ نہیں کہا جا سکتا کہ مظہر کے ہیں یا نہیں، لیکن جب تک کوئی دوسرا ان کا دعویدار نہ ہو تب تک وہ مظہر کے ہی سمجھے جائیں گے۔ لیکن شعر نمبر ۵ مظہر کی ملکیت سے خارج ہونا چاہتا ہے کیونکہ امتیاز علی خاں عرشی کی تحقیق سے یہ شعر انندرام مخلص کا ہے۔

مضمون نگار نے شعر نمبر ۵ کے متعلق یقینی طور پر کہا ہے کہ وہ مخلص کا ہی ہے۔ اس زمین میں مخلص کی پوری غزل بھی پیش کی ہے۔

حضرت الاستاد مولانا سید سلیمان ندوی اپنی سیرۃ النبیؐ میں انشا پرداز کی حیثیت سے

(سید صباح الدین عبدالرحمٰن)، فروری ۱۹۸۵ء

سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب سید سلیمان ندوی کے شاگردوں میں سے تھے۔ سید صاحب نے اس مضمون میں سید سلیمان ندوی کی انشا پردازی سے متعلق کچھ باتیں بیان کی ہیں جو ان کی مایہ ناز تصنیف سیرۃ النبی میں پوری تابناکی کے ساتھ نظر آتی ہے۔

سید صاحب نے یہ مقالہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبۂ اردو کے اس سمینار میں پیش کیا تھا جو حضرت الاستاذ سید سلیمان ندوی پر منعقد کیا گیا تھا۔ اس مضمون میں سید صباح الدین صاحب نے تمہید

میں سید سلیمان ندوی کو طہارت وشرافت، تمکنت وعظمت، سنجیدگی وادب ووقار کا پیکر بتایا ہے۔

سیرۃ النبی کی پہلی اور دوسری جلد علامہ شبلی نعمانی نے تصنیف کی تھی۔ تیسری جلد سید سلیمان ندوی صاحب نے تصنیف کی۔ اگرچہ اس کے ۸۶۸ صفحوں میں ۸۳ صفحے مولانا عبدالباری ندوی کے لکھے ہوئے ہیں۔ اس کا موضوع معجزات ہے۔ یہ موضوع آسان نہیں تھا بلکہ خشک مشکل اور سنگلاخ تھا۔ لیکن ان کو پیش کرنے میں سید سلیمان ندوی نے کچھ ایسا انداز بیان اپنایا کہ جن چیزوں کے بارے میں کوئی معلومات تھیں وہ نئے طریقے سے معلوم ہوتی دکھائی دے رہی ہیں اور جن چیزوں کا علم نہیں تھا ان کو پڑھ کر خیال کے خارستان میں لالہ زار دکھائی دے رہا ہے اور ظنیات کے ریگستان میں ایک نئے قسم کا گلزار آباد ہو رہا ہے۔ مشکوک وشبہات کی تاریکی میں ایمان کی مہتابی پھیل رہی ہے۔ پوری کتاب ایک عاشق اسلام کے بے قرار دل ایک دیدہ ور متکلم کے مستحکم دلائل اور ایک رمز شناس عالم کی گہری نگاہ کے ساتھ لکھی گئی ہے.....اس کتاب کا مطالعہ کرتے وقت یہ بھی احساس ہوتا ہے کہ اردو زبان کو ایسا پیرایہ بیان مل رہا تھا جس سے اور دوسری ترقی یافتہ زبانوں کی طرح اس میں بھی غوامض اور دقایق شگفتہ اور شستہ طرز ادا میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس کتاب کی تمہید ہی پوری شان سے لکھی گئی ہے۔ جس کے کچھ ٹکڑے درج ہیں:

''سیرت نبویؐ کا یہ حصہ آنحضرتؐ کے ان حالات ومشاہدات اور کیفیات کے بیان میں ہے جن کا تعلق اس عالم سے ہے جو ہمارے اس مادی عالم اور اس کے مادی قوانین کے حدود سے باہر ہے۔ جس طرح ہماری یہ مادی دنیا ایک نظام خاص پر چل رہی ہے مثلاً رات کے بعد دن نمودار ہوتا ہے، خزاں کے بعد بہار آتی ہے، ستارے غروب ہوتے ہیں تو آفتاب نکلتا ہے، گرمی جاتی ہے تو جاڑے آتے ہیں، پھول اپنے وقت پر کھلتے ہیں، درخت اپنے موسم میں پھلتے ہیں، ستارے اپنے متعین اوقات پر ڈوبتے اور نکلتے ہیں۔ اس طرح روحانی عالم بھی اپنا ایک خاص نظام رکھتا ہے۔ اس کا بھی ایک آسمان اور زمین ہے۔ وہاں بھی تاریکی اور روشنی ہے خزاں اور بہار ہے۔ فصل وموسم ہے۔

آسمانہاست در ولایت جاں　　کارفرمائے آسماں جہاں'' [۱]

۱۔ معارف، فروری، ۱۹۸۵ء، ص ۱۰۳۔۱۰۴

سید صباح الدین صاحب نے سید سلیمان ندوی کی سیرۃ النبی جلد سوم کے کئی اقتباس اس مضمون میں نقل کر کے لکھا ہے کہ سید صاحب نے فلسفیانہ مباحث جیسے خشک موضوع کو اپنی تحریروں کو روانی سے دلچسپ بنا کر اپنے انشا پردازی کا جوہر دکھایا ہے۔

سیرت النبیؐ جلد چہارم میں سید سلیمان ندوی کا قلم پہلے سے زیادہ تیز اور سبک رو ہو گیا تھا۔ اس جلد کو لکھتے وقت آپ کی عمر ۵۳ سال ہو چکی تھی لیکن قلم پہلے سے زیادہ جوان اور رعنا ہو گیا تھا۔

چوتھی جلد کا موضوع منصب نبوت ہے۔ اس میں پیغمبر اسلام کی بعثت کے وقت دنیا اور خصوصاً عرب کی مذہبی اور اخلاقی حالت، خیر الامم بننے کی صلاحیت، تبلیغ نبوی کے اصول اس کی کامیابی کے اسباب، اسلام کے عقائد میں ایمان کی مختلف قسمیں جزا و سزا، دوزخ و جنت، قضا و قدر، نبوت کی حقیقت، نبی کی ضرورت، وحی، وحی متلو، وحی غیر متلو، اجتہاد، حکمت وغیرہ جیسے موضوعات پر مباحث ہیں۔ ان کو سمجھنے اور سمجھ کر سمجھانے کے لئے بیسویں صدی کا ذہن جس زبان، اسلوب اور طرز ادا کا طلب گار ہے سید صاحب نے اسی کو اختیار کر کے اس کو مطمئن کیا ہے۔

سید صاحب کے قلم کا ایک بڑا وصف یہ بھی ہے کہ وہ جب چاہتے ہیں اپنی تحریر میں پر از تاثر تقریر کی لذت پیدا کر دیتے ہیں۔ اس کے نمونے اس چوتھی جلد میں جا بجا ملیں گے۔ ایک نمونہ کلام ملاحظہ ہو:

> ''عرب میں سرتاپا روحانی انقلاب پیدا کر دینا تمام عالم کے سامنے کامل ترین اور آخری شریعت پیش کرنا، دنیا کے گوشہ گوشہ کو ترانۂ توحید اور سرور و محبت سے معمور کرنا، ظلمت کدہ عالم کو سراج منیر بن کر بقعۂ نور بنا دینا، گمراہوں کو راستہ بتانا، بھولوں کو یاد دلانا، بندوں کا رشتہ خدا سے جوڑنا، غلط اوہام کو مٹانا، اخلاق فاضلہ کا سکھانا، گناہوں کے دفتر کو دھونا، انسانوں کو شیطانوں کے دام فریب سے نکال کر فرشتوں کی صف میں کھڑا کرنا، دنیا کو رفق محبت لطف و شفقت اور برادرانہ مساوات کی تعلیم دینا، حکمت و دانائی، پند و موعظت اور تہذیب و تمدن کے رموز سکھانا، روحانیت کی برباد شدہ دنیا کی دوبارہ تعمیر اور قلوب و ارواح

کے ویران گھروں کی از سر نو آبادی، الغرض خاتم النبین کا اصلی کام ایک شریعت ابدی کی تاسیس، مذاہب عالم کی اصلاح، فن اخلاق کی علمی و عملی تکمیل، قانون الٰہی کا اظہار غرض اور تہذیب نفوس کی معراج اخیر تھی۔ اور یہ سب اس پر آشوب زمانے میں ہوتا رہا جس کے لیل و نہار بظاہر صرف جملوں کے تیر بار ان کے روکنے میں صرف ہوئے۔'' [۱]

یہ صرف لفظوں اور جملوں کا انبار نہیں بلکہ ہر لفظ اور ہر فقرہ میں خیالات کی ایک دنیا آباد کر دی گئی ہے۔ سید سلیمان ندوی نے دل کی کیفیت کو حدیث کے ذریعہ بھی سمجھایا ہے اور قرآن مجید کے ذریعہ بھی۔ اس کو اس طرح سمجھایا ہے۔

''قرآن پاک نے دل و قلب کی تین کیفیتیں بیان کی ہیں۔ سب سے پہلے قلب وسلیم (سلامت رو دل) جو ہر گناہ سے پاک رہ کر بالطبع نجات اور سلامت روی کے راستہ پر چلتا ہے۔ دوسرا اس کے مقابل ''قلب'' اثیم (گنہ گار دل) یہ وہ ہے جو گناہوں کی راہ اختیار کرتا ہے اور تیسرا قلب منیب رجوع ہونے والا دل ہے جو اگر کبھی بھٹکتا ہے اور بے راہ بھی ہوتا ہے تو فوراً نیکی اور حق کی طرف رجوع ہو جاتا ہے۔'' [۲]

یہ قسمیں بتانے کے بعد سید صاحب اپنے انشاء کے مخصوص رنگ میں لکھتے ہیں:

''غرض یہ سب نیرنگیاں اسی ایک بے رنگ مستی کی ہیں جس کا نام دل ہے۔ ہمارے اعمال کا ہر محرک، ہمارے اسی دل کا ارادہ اور نیت ہے۔ اسی بھاپ کی طاقت سے اس مشین کا ہر پرزہ چلتا اور حرکت کرتا ہے۔'' [۳]

۱۔ معارف، فروری ۱۹۸۵ء، ص ۱۱۴

۲۔ ایضاً، ص ۱۱۷

۳۔ ایضاً، ص ۱۱۷

سید صباح الدین صاحب سید سلیمان ندوی کی سلاست روانی کے متعلق لکھتے ہیں:

''عقیدہ ایمان عمل صالح اور حسن عمل کے دارومدار کی وضاحت کس خوبصورتی سے کردی ہے۔ جس کو سمجھنے میں ایک عام قاری کو بھی دقت نہیں ہوگی۔ انداز بیان کی یہی سلاست اور سریع الفہمی ان کی تحریر کی خوبی ہے۔''

اس کے علاوہ جلد چہارم میں تاریخی واقعات بھی آگئے ہیں جس میں آپ کا انداز بیان مورخانہ ہوگیا ہے۔ سیاسی افراتفری میں مذہب کا جو حال ہے سید صاحب نے اس کی بھی دل خراش انداز میں تصویر کھینچی ہے۔

سیرت النبی جلد پنجم : سیرت النبیؐ جلد چہارم کی اشاعت کے دو سال کے بعد سیرۃ النبی جلد پنجم ۱۹۴۳ء میں شائع ہوئی۔ چوتھی جلد کا موضوع عقائد تھا۔ پانچویں جلد کا موضوع عبادات ہے۔ اس میں عبادت کی حقیقت اور اسلام میں اس کی قسمیں بیان کی گئی ہیں۔ پھر اس کے فرائض خمسہ، نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور جہاد کی تاریخی اہمیت وافادیت اور حکمت ومصالح بیان کئے گئے ہیں۔ لیکن مصنف نے اس کو اس انداز میں بیان کیا ہے کہ پڑھتے وقت ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہم کو کچھ ایسی باتیں معلوم ہو رہی ہیں جو پہلے نہیں معلوم تھیں جبکہ وہ معلوم ہوتی ہیں۔ لیکن سید صاحب کے انداز بیان نے اس چیز کو نیا بنا دیا ہے۔ سید صاحب کلام پاک کی چھوٹی بڑی اور لمبی آیتوں کو اپنی تحریروں میں نگینے کی طرح جڑ دیتے ہیں۔ جب اس کا مطلب سمجھاتے ہیں تو محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے سامنے دل نواز باتوں اور دلنشین تحریروں کا خوان یغما بچھا ہوا ہے۔

اس جلد میں جسمانی عبادات کی فضیلت وحکمت اور ان کے مصالح بیان کرنے کے بعد قلبی عبادت کا ذکر کیا ہے۔ جس کا تعلق نفس کی اندرونی کیفیتوں سے ہے۔ سید صاحب کے خیال میں ان قلبی عبادات میں سرفہرست تقویٰ ہے، تقویٰ کے ساتھ اخلاص، توکل، صبر وشکر، بھی بطور خاص ذکر کیا گیا ہے۔ تقویٰ کا بیان نہایت جامع اور مفصل انداز میں کیا ہے اور پورے وزن کے ساتھ ایک معلم کی طرح اس کو سمجھاتے ہوئے تحریر کیا ہے کہ کوئی عارف باللہ ہی لکھ سکتا ہے۔ سید صاحب تمام باتوں کو قرآن مجید کے حوالے سے قلم بند کرتے

ہیں کہ پڑھنے والے کو احساس ہوتا ہے کہ جو چیزیں ان کے تحت شعور میں دبی تھیں وہ ابھر رہی ہیں۔

سید صاحب کی تحریروں کی امتیازی خصوصیات یہی ہیں کہ وہ تمام مباحث کو نہایت حکیمانہ اور دلنشین انداز میں اس طرح پیش کرتے ہیں کہ موضوع خالص مذہبی ہونے کے باوجود اتنا دلچسپ ہو جاتا ہے کہ پڑھتے وقت کافی لطافت اور شیرینی وسکون محسوس ہوتا ہے۔ سیرت النبی جلد ششم ۱۹۳۹ء میں شائع ہوئی جو ۸۸۸ صفحات پر مشتمل ہے۔ اس وقت سید صاحب کی عمر پچپن سال کی ہو چکی تھی۔ مگر اس کی ضخامت اور اس کے مسائل کے مباحث سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان کی تصنیفی زندگی کی جوانی، رعنائی اور دل آویزی برقرار تھی اور پہلے ہی کی طرح ان کے قلم کا طاؤس رقص کرتا نظر آتا ہے۔

جلد ششم کا موضوع اسلام میں اخلاقیات ہے یعنی اس میں اسلام کی اخلاقی تعلیمات کی مرقع آرائی کی گئی ہے اور اخلاق کے ہر پہلو پر مفصل اور بہ دلائل بحث کی گئی ہے تاکہ اخلاق کی سچی تعلیمات اور اس کی اہمیت وافادیت واضح ہو جائے۔ شروع میں اسلامی اخلاق کے اوصاف وامتیازات گنوائے گئے ہیں پھر دنیا کے تمام معلمین اخلاق میں آنحضرت ﷺ کے امتیازی اوصاف کو بیان کیا گیا ہے۔ سید صاحب حضور ﷺ کے عملی اخلاق کے جلوؤں کو اس طرح دکھاتے ہیں کہ: ایک شخص نے آ کر ام المومنین عائشہ صدیقہؓ سے دریافت کیا کہ آنحضرت ﷺ کے اخلاق کیا تھے۔ فرمایا کیا تم نے قرآن نہیں پڑھا۔ کان خلقه قرآن۔ جو قرآن میں الفاظ کی صورت میں ہے وہی حامل قرآن کی سیرت میں بصورت عمل تھا۔

وہ عملی صورت کیا تھی اس سلسلے میں سید صباح الدین صاحب سید سلیمان ندوی کے قلم سے نکلے عشق رسول ﷺ سے سرشاری جذبات کو رقم کرتے ہیں۔

> ''اگر غریبوں اور مسکینوں کی امداد واعانت کا حکم دیا تو پہلے خود اس فرض کو ادا کیا۔ خود بھوکے رہے اور دوسروں کو کھلایا اگر آپ نے اپنے دشمنوں اور قاتلوں کو معاف کرنے کی نصیحت کی تو پہلے خود اپنے دشمنوں اور قاتلوں کو معاف کیا۔'' [۱]

۱۔ سیرت النبی، جلد ششم، ص ۲۴، بحوالہ معارف، فروری ۱۹۸۵ء، ص ۱۳۸

اس سلسلہ میں اسلام کے نظام اخلاق کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے اور یہ واضح ہو جاتا ہے کہ اسلام نے تہذیب وشائستگی کے لئے کس قدر بلند و بالا اصول پیش کئے ہیں۔ جس کی بنیاد پر ایک ایسا صالح معاشرہ بنایا جاسکتا ہے جو انسانی معیار کا مثالی نمونہ ہو۔ اس جلد میں بعض جگہوں پر فقہی مسائل کا ذکر آگیا ہے۔ مگر عموماً فقہی جزئیات میں الجھنے سے گریز کیا ہے۔ اہل علم نے اس حصہ کو پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ مولانا مناظر احسن صاحب گیلانی نے اس پر ایک مبسوط تبصرہ لکھا جو معارف ۱۹۴۸ء کے کئی نمبروں میں شائع ہوا۔ حضرت سلیمان ندوی اس تبصرہ کے متعلق لکھتے ہیں:

> ''پچھلے پرچہ میں سیرۃ النبی علی صاحبا الصلوٰۃ والتسلیم کی چھٹی جلد پر جو آنحضرت ﷺ کی اخلاقی تعلیمات پر مشتمل ہے ایک ذمہ دار صاحب قلم کے قلم سے جو تبصرہ بصیرت افروز ہو رہا ہے وہ خاکسار مولف کی پوری چوتھائی صدی کی خدمت کا ایسا معاوضہ ہے جس کے لئے وہ سراپا سپاس گزار ہے۔ یہ تبصرہ بجائے خود اس تاریک زمانہ میں جس کو روشنی کا زمانہ کہا جاتا ہے فکر وعمل کے لئے چراغ راہ ہے۔ ضرورت ہے کہ اہل نظر اس کو بار بار پڑھیں اور اس تہ تک پہنچیں۔'' [۱]

اخلاقیات کے موضوع پر بلاشبہ اردو میں سب سے عمدہ جامع اور بلند پایہ تحقیقی تصنیف ہے۔ سید صاحب کا کمال ہے کہ انھوں نے سلسلہ سیرت میں اخلاقیات کے ان تمام پہلوؤں کو روشن ترین سیرت نبویؐ کا موثر ترین مجموعہ بنادیا۔

سیرۃ النبی جلد ہفتم: یہ سید صاحب کی ایک نامکمل اور ادھوری تصنیف ہے۔ وہ اپنی جلد ششم کے بعد اسلام میں معاملات اور سیاسیات کی جو تعلیمات دی گئی ہیں ان پر ایک مستقل جلد لکھنا چاہتے تھے، لیکن دیگر مصروفیات اور بعض ذاتی مسائل کی وجہ سے نہ لکھ سکے۔ اس کے علاوہ جلد ہفتم لکھتے وقت ان کا زیادہ وقت

۱۔ حیات سلیمان، شاہ معین الدین احمد ندوی، ص ۳۸۰

''حیات شبلی'' کی ضخیم جلد کی تدوین پر بھی صرف ہوا۔ ان وجوہات کی بنا پر ان کی ساتویں جلد تیار نہ ہو سکی۔ اس جلد میں سید صاحب معاملات اور سیاسیات کے متعلق اسلامی تعلیمات کو واضح کرنا چاہتے تھے۔ معاملات سے سید صاحب کی مراد وہ مسائل ہیں جن کی حیثیت قانون کی ہے۔

سید صاحب نے اسلامی سیاست کی اسلامی روح کو جس پر زور موثر اور خوبصورت انداز میں قلم بند کیا ہے وہ موجودہ دور کے اسلامی ممالک کے حکمرانوں کے لئے مشعل ہدایت ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

> ''اصل یہ ہے کہ سیاسی مفکرین کی نظر حکومت کی ظاہری اشکال کے گورکھ دھندوں میں پھنس کر رہ گئی اور اسلام کی نظر اس کے اندر حقیقت پر ہے۔ اس کے نزدیک حکومت کی ظاہری شکل یعنی انتخاب کا طریقہ، ارباب شوریٰ کی تربیت اور تعین، ان کے فرائض و حقوق، ان کے انتخاب، اظہار رائے کے طریقے اور دیگر متعلقہ مسائل اہمیت کے قابل نہیں۔ اصل چیز حکومت کے امیر و رئیس اور اس کے ارکان و عمال کا تقویٰ ہے۔'' [۱]

تتمہ : تین ہزار دو سو چھیاسٹھ صفحے کی سیرۃ النبی کی پانچ جلدیں لکھ کر سید صاحب نے جوئے شیر علوم اسلامیہ کے فرہاد کا لقب حاصل کیا۔ لیکن اسی فرہاد نے ان جلدوں کے ذریعہ سے اپنی انشا پردازی کا جو قصہ شیریں تیار کیا وہ اسی کے ساتھ ان کا دوسرا اہم کارنامہ ہے۔ ان میں جو انداز بیان ہے وہ دنیا کے کسی زبان کے عظیم ترین مصنفوں کے اسلوب کے مقابلہ میں رکھا جا سکتا ہے۔

سیرۃ النبیؐ کی ان پانچ جلدوں میں کہیں تو اس کا اسلوب ایسا ہے جو کسی باوقار مفسر کا ہونا چاہئے۔ کہیں اس کا انداز بیان وہ ہے جو باوزن محدث کا ہوتا ہے۔ کہیں اظہار رائے وہی ہے جو ایک دیدہ ور فقیہ کے یہاں تلاش کیا جاتا ہے۔ کہیں طرز استدلال وہ ہے جس کی ایک مخلص متکلم سے توقع کی جاتی ہے۔ کہیں فکر کی گہرائی ایسی دکھائی دیتی ہے جو ایک فلسفی کے طرز ادا میں دکھائی جاتی ہے کہیں رجز خوانی کا وہ

۱۔ سیرۃ النبی جلد ہفتم، ص ۱۹۱، بحوالہ معارف، فروری ۱۹۸۵ء، ص ۱۴۴

انداز ہے جو سالار کاروں کے منہ سے سنائی دیتا ہے۔ کہیں وہ حدی خوانی ہے جو منزل کے طے کرنے میں مدد دیتی ہے۔ ان اجزائے ترکیبی سے سیرۃ النبی میں سید صاحب کی تحریروں میں وہ انشا پردازانہ رنگ پیدا ہوگیا ہے جس کے سہارے اس کے مطالعہ میں نشاط وانبساط کی کیفیت طاری رہتی ہے۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب سید سلیمان ندوی کی حضورﷺ سے شیفتگی و وارفتگی کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ سیّد صاحب کو رسولﷺ سے غیر معمولی محبت، شیفتگی اور وارفتگی رہی اس لئے ان کی سیرۃ النبی کی پانچوں جلدوں میں ان کے خون جگر کی لالہ کاری، سوز دل کی چنگاری، علوئے ہمت کی اولوالعزمی اور حسن ذہن کی عفت مآبی پورے طور پر نظر آتی ہے۔ اس لئے ان جلدوں کی تحریروں میں ایمان کی طہارت، صراط مستقیم پر چلنے کی ہدایت اور نہ صرف مسلمانوں بلکہ تمام انسانوں کو زندگی سنوارنے کی بشارت کی چاندنی چھٹکی ہوئی ہے۔ اسی کی بدولت ان جلدوں میں ان کے اسلوب طرز ادا اور انداز بیان کے وقار، کمال اور جمال کی ایک خاص قسم کی آن بان اور شان پیدا ہوگئی ہے جو کسی دوسرے کے یہاں نہیں ملے گی۔

محبت خاں محبتؔ اور ان کا کلام (جناب ڈاکٹر سید لطیف حسین، جون ۱۹۶۴ء)

اس مضمون میں مضمون نگار نے محبت خان محبت کی مجموعی حالات زندگی اور ان کے کلام کا ذکر مختصر طور پر کیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ محبت خاں محبت غزل گو مثنوی نگار تھے۔ فارسی عربی اور پشتو میں بھی کہتے تھے۔ انھوں نے فارسی کا ایک لغت اور ایک آمد نامہ بھی تحریر کیا۔ انھیں موسیقی میں بھی مہارت حاصل تھی، صاحب سیف بھی تھے۔ ادیب صاحب نے اس مضمون میں محبت خاں محبت کی پوری زندگی اور ان میں رونما ہوئے واقعات کا ذکر حوالوں کے ساتھ کیا ہے اور ان کی تصانیف پر بھی روشنی ڈالی ہے جس میں عربی، فارسی، پشتو، اردو شاعری پر مشتمل ایک دیوان، مثنوی اسرار محبت، لغت فارسی آمد نامہ کا ذکر کیا ہے جس میں آخری دو کتابیں ادیب صاحب کو دستیاب نہیں ہوسکیں۔ مثنوی کے قلمی مطبوعہ نسخے دستیاب ہیں مکمل دیوان کا نسخہ ہندوستان میں نہیں ہے۔

ادیب صاحب نے اس مضمون میں ان کے تلمذ سے متعلق بھی گفتگو کی ہے۔ محبت خاں محبت نے کس کی شاگردی اختیار کی تذکرہ نگاروں کا اس سلسلے میں اختلاف ہے۔ مضمون نگار تمام تذکرہ نگاروں کے بحث و دلائل کے بعد اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ:

''محبت اپنی شاعری کے ابتدائی دور میں خواجہ حسن سے باہمی صلاح کے طور پر مشورۂ سخن کرتے رہے جس کا تعلق شاگردی و استادی کے ضابطوں سے نہیں تھا۔ ۱۷۷۴ء سے ۱۷۷۵ء میں جب وہ لکھنؤ آئے تو انھوں نے جعفر علی حسرت کی شاگردی اختیار کی۔ حسرت کے انتقال کے بعد اپنی فکر کو رہنما بنایا اور کسی کی شاگردی کو نہیں قبول کیا۔ اس طرح اول و آخر وہ جعفر علی حسرت سے ہی وابستہ رہے اور انھیں خواجہ حسن درد اور جرأت کا شاگرد بتانا صحیح نہیں ہے۔''[۱]

اٹھارہویں صدی عیسوی کے آخری ربع میں جو محبت خاں کی شاعری کا دور ہے، اردو زبان ادبی و لسانی اعتبار سے راہ ترقی پر گامزن تھی۔ ساتھ ہی اردو زبان میں فارسی اور عربی الفاظ کا اضافہ ہو رہا تھا۔ یہ دور دکھنی اور ہندوی کا ناسخ تو نہیں لیکن فارسی و عربی لغات کے اضافے اور ان کی صحت کے ساتھ استعمال کا زمانہ ضرور ہے۔ اس وقت تک اردو شاعری میں بھاشا کی نرماہٹ باقی تھی اور فارسی خیالات اور الفاظ کے استعمال سے اثرات شعری دو آشتہ ہو گئے۔ محبت خاں محبت نے فارسی سے استفادہ کیا مگر ایک خاص تناسب سے۔ اس اعتبار سے محبت خاں محبت کی شاعری کافی اہم ہے۔

مثنوی اسرار محبت، محبت خاں کی مشہور تصنیف ہے۔ اسی کے ذریعہ تاریخ ادب اردو میں محبت کا تعارف ہوا۔ اس مضمون کو تحریر کرتے وقت مضمون نگار کے سامنے مثنوی اسرار محبت کا رام پور کا نسخہ موجود تھا۔ یہ مخطوطہ دریائے عشق بکٹ کہانی، مثنوی لطف، مثنوی انور، قصہ سوداگر بچہ اور بارہ ماسہ کے ساتھ مجلد ہے۔ اس پوری جلد کا نام اسرار محبت رکھ دیا گیا ہے۔ مضمون نگار مثنوی سے متعلق لکھتے ہیں:

۱۔ معارف، جون ۱۹۶۴ء، ص ۳۸۳

''ان مثنویات کو جمع کرنے کی غرض یہ تھی کہ عشقیہ اشعار جمع کئے جائیں۔ کتاب پر نہ تمہید ہے نہ ترقیمہ اس لئے یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اسرار محبت کو کب اور کس نے نقل کیا۔ کاتب کی لاپرواہی کا ثبوت ہر صفحے پر موجود ہے۔ کتابت نہایت بدنما اور بے زیب ہے۔ ایسی تحریر کو کتابت کہنا ذوق سلیم پر بار ہے۔ کاتب نے ضمنی عنوانات کے لئے بقدر دو سطر کے جگہ چھوڑ دی تھی مگر عنوانات نہیں لکھے۔ لیکن مخطوطہ اچھی حالت میں ہے۔'' [۱]

مثنوی کے کل پانچ سو اکیانوے اشعار پچیس صفحات پر مشتمل ہیں۔ مثنوی کا سنہ تصنیف، مصرعہ تاریخ کے مطابق ۱۱۹۷ھ مطابق ۱۷۸۳ء ہے۔ محبت خاں محبت نے اس مثنوی کو مسٹر جانسن (ممتاز الدولہ) کی فرمائش پر نظم کا جامہ پہنایا لیکن ادیب صاحب کے مطابق اس مثنوی میں میر حسن کی خصوصیات نہیں۔

محبت خاں محبت کی وفات میں بھی اختلاف ہے۔ تذکرہ نگاروں کا ایک گروہ ۱۲۲۲ھ مطابق ۱۸۰۷ء مانتا ہے لیکن مضمون نگار کے مطابق ۱۳ صفر ۱۲۲۴ھ مطابق ۳۰ / مارچ ۱۸۰۹ء زیادہ صحیح ہے جو الطاف علی صاحب نے حیات حافظ رحمت خاں میں درج کیا ہے۔

سید سلیمان ندوی کے اسلوب بیان پر ایک نظر (نقوش سلیمانی کی روشنی میں، اپریل ۱۹۵۶ء، جناب ادیب ایم، اے)

سید سلیمان ندوی کا شمار بیسویں صدی کے چند اکابر علماء میں ہوتا ہے جنھوں نے اردو زبان کو ادب و تنقید اور تاریخ و اسلامیات کا سرمایہ دار بنایا۔ سید صاحب ایسے وسیع النظر مورخ اور صاحب کمال ادیب تھے جنھوں نے اپنے استاد کے جوہر کو مزید جلا دی۔ ان کی علمی خصوصیات میں چار چاند لگائے تو دوسری طرف اسلامی علوم و ادب میں نہ صرف تحقیق کا حق ادا کیا، بلکہ فلسفہ جدیدہ کی روشنی میں واقعات کو

۱۔ معارف، جون ۱۹۶۴ء، ص ۴۵۸

سمجھنے اور سمجھانے کے لئے نئے انداز اور اسلوب بھی نکالے۔ ادیب صاحب سید صاحب کے اسلوب سے متعلق لکھتے ہیں:

''سید صاحب کا اسلوب بیان ہر موضوع میں ایک خاص شان رکھتا ہے۔ جو اصول فن کے اعتبار سے اس کے لئے موزوں، حسیت اور متین ہوتا ہے۔ زبان کے اعتبار سے بھی ان کا ایک رنگ نہیں ہے۔ جب وہ ہندوستانی زبان میں بولتے اور لکھتے ہیں تو ہندوستان کی عمومی و مشترک زبان کا نمونہ ہمارے سامنے ہوتا ہے جو عربی و فارسی کے شکل اور عالمانہ الفاظ اور تراکیب سے خالی سنسکرت اور بھاشا کے نامانوس اور ثقیل لفظوں سے پاک ہوتا ہے..... جب علمی تحقیق و ادبی تنقید پر قلم اٹھاتے ہیں تو اردوئے معلیٰ کی شیریں اور دل آویز زبان کی موجیں بہاتے ہیں۔ عبارت میں تشبیہ و ترکیب لفظی و مناسبات معنوی کے حسن سے رنگ آمیزی کے عناصر سمو دیتے ہیں جس سے غرض یا تو کسی مسئلہ کی تفہیم ہوتی ہے یا حسن ادا کا بانکپن یا ایجاز و اختصار کے ساتھ ایک وسیع مبحث کو دلنشین پیرایہ میں ادا کرنے کا خیال..... غرض علامہ سید صاحب کی زبان اور اسلوب بیان میں بحیثیت مجموعی ان کے استاد شبلی مرحوم کی سلاست و روانی تلاش و تجسس وسعت فکر و نظر اور استقصاء۔ مولوی محمد حسین آزاد کی شوخی و زندہ دلی اور وحید الدین سلیم کی متانت، سادگی اور ادبی کاوش جلوہ گر ہے۔''[1]

اس کے علاوہ مضمون نگار نے سید صاحب کی خطابت و انشا پردازی، تہنید اور ایک نقاد کی حیثیت سے بھی اس کا جائزہ لیا ہے۔

۱۔ معارف، اپریل ۱۹۵۶ء، ص ۲۴۶

علامہ شبلی کی تنقید نگاری (پروفیسر عبدالمغنی، اپریل مئی ۱۹۸۸ء)

اس مضمون میں مضمون نگار نے علامہ شبلی کی تنقید نگاری پر روشنی ڈالی ہے اور واضح کیا ہے کہ علامہ شبلی فلسفہ تنقید کے بجائے عملی تنقید پر توجہ دیتے ہیں۔ اور ادبی تصورات پر مباحث میں ان کا مرکز حوالہ اور معیار نظر مغربی خیالات کے بجائے مشرقی افکار ہیں جس کی تشریح وہ مقلد کے بجائے مجتہد کی طرح کرتے ہیں۔ مولانا شبلی کے عملی تنقید کا شاہکار نمونہ موازنہ انیس و دبیر مشرقی طرز تنقید کا بہترین نمونہ ہے۔ اس لحاظ سے علامہ شبلی پہلے نقاد ہیں جنھوں نے اس پیمانے پر عملی تنقید کا بہترین نمونہ پیش کیا ہے۔ اس طرح علامہ شبلی کی تنقید نگاری مشرق میں تنقید نگاری کی بہترین روایات میں ایک عظیم الشان توسیع و اضافہ ہے۔

شبلی کی تنقید ادب حقیقی معنوں میں فن لطیف بالخصوص شاعری کے ذریعے انسانی زندگی کی مسرت و بصیرت کے امتزاج کا ایک دائمی نسخہ تجویز کرتی ہے جس میں مثنوی مرثیہ اور غزلیات شامل ہیں۔ چاہے وہ فارسی میں ہوں یا اردو میں۔ دوسری اصناف شاعری مثلاً رباعی اور قصیدہ بھی ان اجزاء میں شامل ہیں۔

مضمون نگار نے اس مضمون میں علامہ شبلی کے تنقیدی کمالات کا جائزہ لینے کے لئے ان کی اہم ادبی تصانیف سے چند اقتباسات پیش کئے ہیں۔ علامہ شبلی کی سب سے بڑی تنقیدی دستاویز شعرالعجم میں بھی عملی تنقید کے نمونے اپنے مخصوص ادبی تصورات کے مطابق پیش کئے ہیں۔

شعرالعجم کے حصہ اول میں شبلی نے شاعری کے تنقید تصور پر جو بحث اٹھائی ہے اس کی تفصیل و تکمیل انھوں نے حصہ چہارم میں کی ہے۔ اس کے علاوہ مضمون نگار نے مضمون میں علامہ شبلی اور مولانا حالی کے ذہنی کیفیت کا اندازہ لگانے کے لئے دونوں کا تقابلی مطالعہ اس طرح کیا ہے:

> ''وزن قافیہ و ردیف کی مشکلات کے باوجود ان کی خاص خوبیوں کے دونوں قائل ہیں۔ لیکن مولانا کی نگاہ میں قافیہ و ردیف کی وہ اہمیت نہیں جو علامہ شبلی کی نگاہ میں ہے۔ صنائع و بدائع کی طرح قافیہ کی گراں باری کا ذکر جس انداز سے مولانا حالی کرتے ہیں علامہ شبلی نہیں کرتے ..... مولانا حالی و علامہ شبلی کے

انداز نظر کا فرق لفظ و معنی کے بحث سے بھی ظاہر ہے۔ الفاظ کی اہمیت کے دونوں قائل ہیں اور معانی سے کوئی صرف نظر نہیں کرتا۔ لیکن لفظ و معنی کے ارتباط اور معنیٰ کی تقدیم پر جو تاکید کی نشان دہی علامہ شبلی لگاتے ہیں وہ مولانا حالی نہیں لگاتے۔'' ۱

علامہ شبلی نے شعرالعجم کی پانچویں اور آخری جلد میں صوفیانہ شاعری، اخلاقی شاعری اور فلسفیانہ شاعری کے موضوعات سے جو فکری بحثیں کی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ تنقیدی افکار کے معاملوں میں ان کے تصورات مولانا حالی سے زیادہ وسیع ہیں۔ اس کے علاوہ مقالات شبلی جلد دوم کے ''عربی و فارسی شاعری'' کا جو موازنہ علامہ شبلی نے کیا ہے وہ بھی ان کے تنقیدی تفکر کی وضاحت کرتا ہے۔

کلیم الدین احمد نے اپنی تصنیف ''اردو تنقید پر ایک نظر'' میں علامہ شبلی کی تنقید نگاری سے متعلق تحریر کیا ہے کہ:

''حالی نے اردو میں نئی تنقید کی ابتدا کی تھی اور قدیم تنقید سے کنارہ کشی اختیار کرنے کی کوشش کی تھی۔ شبلی نئی اور پرانی تنقید کے بیچ میں معلق نظر آتے ہیں۔'' ۲

مضمون نگار نے اپنے اس مضمون میں کلیم الدین احمد کے اس خیال کی تردید کی ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''یہ ایک امید افزا آغاز تھا مگر اس کا انجام اقتباس میں جس خیال پر ظاہر ہوا ہے وہ مایوس کن ہے۔ اس فرق کی وجہ کلیم الدین احمد کے مطالعہ کی خامی اور تنگ نظری ہے۔ وہ علامہ شبلی اور مولانا حالی کو ایک ہی پیمانے پر رکھ کر دونوں کے متعلق ایک ہی جیسا حکم لگا دیتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے اندر قوت تمیز کی کمی ہے۔ اس کے علاوہ علامہ شبلی کی تنقید کو پوری طرح سمجھنے کی کوشش

۱۔ معارف اپریل ۱۹۸۸ء، ص ۲۸۱

۲۔ اردو تنقید پر ایک نظر، کلیم الدین احمد، ص ۱۰۹

بھی انھوں نے نہیں کی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ علامہ کے تمام تنقیدی مباحث ان کے سامنے نہیں ہیں یا وہ ان سے صحیح نتیجہ نکالنے کے لئے آمادہ نہیں۔'' [۱]

عبادت بریلوی نے اپنی کتاب اردو تنقید کے ارتقاء میں علامہ شبلی کے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے مضمون نگار اس مضمون میں ان سے متفق نظر آتے ہیں۔ البتہ بریلوی صاحب نے علامہ شبلی کی عملی تنقید میں خوبیوں کے ساتھ ساتھ کچھ خامیاں بھی بتائی ہیں۔ مثلاً علامہ شبلی نقاد سے زیادہ معانی و بیان کے عالم نظر آتے ہیں۔ مضمون نگار نے اس پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''بریلوی صاحب کا یہ تبصرہ تو بالکل مہمل ہے.....معانی و بیان کے عظیم ترین عالم وہ یقیناً تھے اور اردو ادب نے ان سے بڑا عالم پیدا نہیں کیا ہے، مگر وہ نقاد بھی اس درجے کے تھے جس درجے کے عالم تھے بلکہ دراصل یہ ان کی علمیت ہی ہے جو انہیں اپنے وقت کا سب سے بڑا نقاد ادیب بنانے کا باعث ہوئی۔'' [۲]

مضمون نگار نے علامہ شبلی کے اسلوب بیان اور ان کے تنقیدی اثرات کا بھی ذکر کیا ہے۔ علامہ شبلی کی تنقید نگاری کی جامعیت و خصوصیت سے متعلق لکھتے ہیں کہ:

''ایک کامل نقاد کی تمام خصوصیات علامہ شبلی کی ادبی شخصیت میں موجود ہیں۔ اول تو وہ ناقد ہونے کے ساتھ ساتھ ادیب اور شاعر بھی تھے.....دوسرے یہ کہ وہ ایک بہت بڑے عالم ہیں اور اردو کا کوئی نیا پرانا نقاد علمیت میں ان کا مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔ وہ یقیناً تاریخ انسانی کے عظیم ترین علما میں ایک تھے..... بلاشبہ علامہ شبلی مشرقی علوم کے ماہر تھے اور بحری علوم سے ان کی جو کچھ واقفیت تھی اگرچہ وہ اچھی خاصی تھی.....لہٰذا جن نکتے پر غور کرنے کی

۱۔ معارف مئی ۱۹۸۸ء، ص ۳۳۱۔۳۳۲

۲۔ اردو تنقید کا ارتقاء، عبادت بریلوی، ص ۱۹۵

ضرورت ہے وہ صرف یہ ہے کہ اردو تنقید کی روایت میں علامہ شبلی کی انفرادیت کیا ہے؟ یہ تو مسلم ہے کہ علامہ شبلی و مولانا حالی نے تذکروں کی تنقید نگاری کو وسعت و ترقی دے کر ادبی تنقید کا وہ اسلوب پیدا کیا جو رائج الوقت ہے۔'' [۱]

مولانا شبلی نعمانی کا نثری اسلوب (عبدالخالق صاحب، پٹنہ، اپریل ۱۹۷۳ء)

خالق صاحب نے اس مضمون میں مولانا شبلی نعمانی کے نثری اسلوب کا جائزہ لینے سے پہلے اسلوب کا مفہوم واضح انداز میں متعین کرتے ہوئے مولانا شبلی کے نثری اسلوب پر روشنی ڈالی ہے۔ مولانا شبلی ایک ایسے انشا پرداز تھے جو نثر کے خارجی اجزا پر عالمانہ اور فنکارانہ عبور رکھنے کے ساتھ ساتھ ایک وقیع تہہ دار متنوع اور نکھری ہوئی شخصیت کے حامل تھے، جس کی وجہ سے ان کا اسلوب بڑا قابل قدر، بے مثال اور اردو ادب کے لئے مایہ افتخار ہے۔ ان کا فن اس لئے بھی زندہ و پائندہ تابناک تابدار رہے گا کہ انھوں نے اپنے فن میں خون جگر کو بھی شامل کیا ہے۔ اور وہ فن کبھی مر نہیں سکتا جس میں خون جگر کی آمیزش کی گئی ہو۔ شبلی کا شمار ان خوش نصیب ادیبوں میں ہوتا ہے جنہیں قبول عام اور شہرت دوام کا شرف اپنی زندگی میں ہی حاصل ہو گیا تھا۔ یہ اردو زبان کی خوش قسمتی تھی کہ اردو کو شبلی جیسا خادم ملا جس نے گیسوئے اردو کی شانہ آرائی کر کے اس میں حسن و نکھار پیدا کر دیا۔

مولانا شبلی نے جب تصنیف و تالیف کا آغاز کیا تو نہ صرف مسلمانوں میں بیداری پیدا کی بلکہ نثر اردو کے دامن کو گلہائے رنگا رنگ سے بھر دیا۔ انھوں نے جس موضوع کی طرف توجہ کی اس کا حق ادا کر دیا۔ جس چیز کو لیا اسے پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ آپ کے اندر علمی مذاق قدرت کا عطیہ تھا جس کو آپ کے اساتذہ نے اور بھی نکھار دیا۔ اس سے بڑھ کر یہ کہ سرسید کی جوہر شناس نظر نے اس گوہر نایاب کو اور نکھار دیا جس سے ان کی شہرت و شخصیت میں چار چاند لگ گئے۔ خالق صاحب نے شبلی کے اسلوب بیان سے متعلق

۱۔ معارف، مئی ۱۹۸۸ء، ص ۳۳۵

تحریر کیا ہے:

''مولانا شبلی ایک صاحب طرز انشا پرداز تھے۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ انھوں نے اپنی تصنیفوں میں ایک ہی اسلوب اختیار کیا ہے۔ موضوع کے لحاظ سے ان کا اسلوب بدلتا رہتا ہے۔ مگر سب میں انفرادیت کی شان ہوتی ہے۔ یہی انفرادیت ان کو دوسرے ادیبوں سے ممتاز کرتی ہے۔ مولانا نے مختلف موضوعات کی وضاحت کے لئے مختلف اسالیب اختیار کئے ہیں اور جس موضوع پر لکھا ہے اس کا حق ادا کر دیا ہے۔ جہاں علمی طرز کی ضرورت تھی وہاں علمی طرز اور جہاں سادگی وسلاست اور فصاحت وصراحت کی ضرورت وہاں سادگی وسلاست اختیار کی ہے مگر ان کی سادگی میں بھی پرکاری ہے۔''[۱]

مولانا کے اسلوب سے متعلق خالق صاحب نے اپنے مضمون میں ڈاکٹر سید عبداللہ کی اس رائے کو پیش کیا ہے۔ سید عبداللہ لکھتے ہیں:

''ان کے اسلوب کی اولین صف اس کی وہ قوت اور جوش ہے جو ان کے احساس کمال اور احساس عظمت کی پیداوار ہے۔ یہ احساس جب کسی مقصد عظیم کے ساتھ مل جاتا ہے تو مصنف کے اظہارات میں غیر معمولی جوش اور قوت پیدا کر دیتا ہے..... شبلی کی نثر کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں فکری قوت منطقی توانائی کے ساتھ ساتھ لطف اور اثر بھی پایا جاتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ فکر کے خانوں میں تخیل کا رنگ بھرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا تخیل دراصل اسی رجحان نظری کے زیر اثر مبالغہ واغراق کی وہ صورتیں اور تصویریں تلاش کرتا ہے جو خود مصنف کی پر جوش ہیجان پسند طبیعت کی پیداوار ہونے کے

۱۔ معارف اپریل ۱۹۷۳ء، ص ۲۷۴

ساتھ ساتھ قارئین و سامعین کے لئے بھی جوش انگیزی اور ہیجان خیزی کا
سامان بہم پہنچاتی تھیں۔'' [۱]

غرض یہ کہ مولانا شبلی کی نثر کافی سادہ سلیس ہوتی ہے جس میں ہر طرح کے خیالات کو آسانی کے ساتھ ادا کیا جاسکتا ہے۔ خشک موضوعات کو بھی واضح اور سہل پیرایہ بیان میں ادا کرتے ہیں جس سے اسلوب کی دلکشی اور جاذبیت کم نہیں ہوتی۔

علامہ شبلی کی شعر فہمی اور شعر العجم کا ایک مطالعہ

(ضیاء الدین اصلاحی، اکتوبر۔نومبر ۱۹۹۳ء)

شبلی نے ہر صنف ادب میں اپنی جولانی طبع کا مظاہرہ کیا ہے۔ چاہے وہ تاریخ ادب ہو، سوانح و تنقید ہو، کلام و فلسفہ ہو، ہر میدان میں انھوں نے کارہائے نمایاں انجام دیئے۔ نثر کے ساتھ ساتھ نظم میں بھی آپ نے طبع آزمائی کی اور اردو فارسی دونوں میں شاعری کے جوہر دکھائے۔ لیکن اردو غزلیں فارسی کے مقابلے میں ہلکی ہیں۔ آپ کے اندر شعر گوئی سے زیادہ شعر کو سمجھنے کی صلاحیت تھی۔ اس مضمون میں ضیاء الدین صاحب نے علامہ شبلی کی شعر فہمی کا اظہار شعر العجم کے حوالے سے کیا ہے۔

شعر العجم اور موازنہ انیس و دبیر یہ دونوں کتابیں بلاغت میں علامہ کی نکتہ دانی، شعر میں باریک بینی، و ژرف نگاہی، نقد شعر میں بصیرت اور سخن فہمی کے لحاظ سے بھی ان کی شاہکار تصنیف ہے۔ شعر العجم کی سخن فہمی سے متعلق ضیاء الدین صاحب لکھتے ہیں:

''شعر العجم علامہ کی سخن فہمی اور فن شعر میں ژرف نگاہی کا تماشا گاہ ہے۔ اس میں نقد شعر کی ان کی قوت و بصیرت حد کمال پر دکھائی دیتی ہے۔ جب وہ اشعار کی گرہیں کھولنے پر آتے ہیں اور بلاغت کے رموز بیان کرتے ہیں تو وجدان

۱۔ بہترین مقالات، اختر جعفری، ص ۵۵۹، بحوالہ معارف اپریل ۱۹۷۳ء، ص ۲۸۳

جھوم جھوم اٹھتا ہے۔ اشعار کا مطلب بیان کرنے میں دقیقہ سنجی اور نکتہ آرائی کرتے ہیں تو ذوق سلیم عش عش کرنے لگتا ہے۔ وہ شاعر کتنا خوش قسمت ہے جس کے شعر علامہ کے انتخاب میں آئے یا جن کی لطافتوں اور نزاکتوں کی جانب وہ متوجہ ہوئے۔ حقیقت یہ ہے کہ جن شعروں سے عام اور سطحی لوگ سرسری گزر جاتے ہیں علامہ کا شعر فہم اور نکتہ شناس ذہن ان کے حقائق و دقائق بیان کر کے ان کو کیا سے کیا بنا دیتا ہے اور زمین سے آسمان پر پہنچا دیتا ہے۔ شعر العجم کے خوردہ گروں اور نکتہ چینوں کو علامہ کی روح عالم بالا سے صدا ضرور دیتی ہوگی۔

نواسنجیوں نے تیری اے انیس ہر اک زاغ کو خوش بیاں کر دیا'' [۱]

علامہ شبلی کی رمزیت کے اسباب اور بھی ہیں لیکن سخن شناسی اور سخن فہمی ان کی غیر معمولی خوبی اور بڑی نمایاں خصوصیت ہے۔ جس میں وہ اعلانیہ ممتاز ہیں:

اس مضمون میں ضیاء الدین صاحب شعر کی حقیقت اور شاعر کی تعریف کے عنوان سے متعلق لکھتے ہیں کہ ''شعر العجم کے مشمولات سے فارسی زبان و ادب پر علامہ کے عبور اور اس میں ان کی نکتہ دانی اور سخن فہمی کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ شعر کی حقیقت اور نوعیت پر جو بحث و گفتگو کی ہے وہی ان کے نکتہ سنج اور شعر فہم ہونے کا مکمل ثبوت ہے۔

ارسطو کے بیان کے مطابق شعر ایک قسم کی مصوری یا نقالی ہے لیکن علامہ کہتے ہیں مصور صرف مادی اشیا کی تصویر کھینچ سکتا ہے۔ بخلاف اس کے شاعر ہر قسم کے خیالات جذبات اور احساسات کی تصویر کھینچ سکتا ہے۔ علامہ کے نزدیک شاعری اصل میں دو چیزوں کا نام ہے۔ محاکات اور تخیل۔ ان میں سے کوئی ایک بات بھی پائی جائے تو شعر شعر کہلانے کا حقدار ہے۔ باقی اوصاف یعنی سلاست، روانی، صفائی، حسن

۱۔ معارف، اکتوبر ۱۹۹۳ء، ص ۲۴۷

بندش وغیرہ کو وہ شعر کے اجزائے اصلی کے بجائے عوارض و مستحسنات کا نام دیتے ہیں۔

ضیاءالدین صاحب نے محاکات اور تخیل کے بارے میں بھی شبلی کے خیالات کی ترجمانی کی ہے۔

وہ لکھتے ہیں:

علامہ کے نزدیک (محاکات) کسی چیز یا کسی حالت کا اس طرح ادا کرنا کہ اس شئے کی تصویر آنکھوں میں پھر جائے تصویر میں گو مادی اشیا کے علاوہ حالات یا جذبات کی تصویر کھینچی جاسکتی ہے جب کہ تخیل سے متعلق لکھتے ہیں:

''قوت تخیل کے ذریعہ شاعر نیا دعویٰ کرتا ہے اور خالی دلائل پیش کرتا ہے۔ ممکن ہے منطقی اس کی دلیل نہ تسلیم کرے لیکن قوت تخیل کے ذریعہ اس نے جن کو اپنا معمول کرلیا ہے ان کو اسے تسلیم کرنے میں مطلق تامل نہیں ہوسکتا.....
اگرچہ تخیل و محاکات دونوں شعر کے عنصر ہیں مگر شاعری دراصل تخیل کا نام ہے۔ اس سے محاکات میں جان آتی ہے۔ قوت محاکات جو کچھ دیکھتی یا سنتی ہے اس کو الفاظ کے ذریعہ بعینہ ادا کردیتی ہے۔ ان چیزوں میں ایک خاص ترتیب پیدا کرنا تناسب اور تواقف کا کام میں لانا ان پر آب و رنگ چڑھانا قوت تخیل کا کام ہے.....قوت تخیل ہر ایک چیز کو سو سو دفعہ دیکھتی ہے اور ہر دفعہ اس کو اس میں ایک نیا کرشمہ نظر آتا ہے۔''[1]

شاعری کے عوارض سے متعلق ضیاء الدین صاحب اصلاحی نے علامہ شبلی کے قلم کی گلکاریا بیان کی ہیں جس میں تشبیہ و استعارہ جدت ادا کو بھی شاعری کے عوارض و مستحسنات میں بتایا ہے۔ ا کے علاوہ زبان کی خصوصیات اور مناسب الفاظ کے استعمال پر بھی زور دیا ہے۔

مولانا ضیاءالدین اصلاحی نے علامہ شبلی کی شعر فہمی کے کمال کا جائزہ دوسری حیثیت سے بھی لیا۔

ا۔ معارف اکتوبر ۱۹۹۳ء، ص ۲۵۴۔۲۵۵

''علامہ نے اشعار کا ترجمہ اور تشریح کرنے کے ضمن میں اکثر ترکیبوں کے معنی بتائے ہیں۔ اس سے شعر کی گرہیں بھی کھل جاتی ہیں اور دوسرے متعدد نکتے ہاتھ لگتے ہیں۔ وہ فارسی زبان کی سیکڑوں ایسی ترکیبیں بتاتے ہیں جن کی بدولت اس میں بہت بڑے وسیع نازک اور رنگین خیالات نہایت لطافت کے ساتھ ادا ہوئے ہیں۔ بعض جگہ اس طرح کی ترکیبوں کو لا کر شاعر نے ایک بہت وسیع خیال کو بہت اختصار کے ساتھ ادا کر دیا ہے۔''[۱]

اس کے علاوہ واقعہ کے بعض اجزا کو چھوڑ کر وسیع مضمون کو مختصر کر دینا علامہ کی خوبی تھی۔ علامہ کا نکتہ شناس اور شعر فہم ذہن کہیں اس حقیقت کو واشگاف کرتا ہے۔ کسی شے کے تمام اجزا کی محاکات ہر جگہ ضروری نہیں۔ شاعر اکثر کوئی واقعہ یا سماں باندھتا ہے اور تمام حالات کا استقصا نہیں کرتا۔ لیکن چند ایسی خصوصیات کو جو نمایاں ہوتی ہیں ادا کر دیتا ہے کہ پورا واقعہ یا پورا سماں آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ اس کے علاوہ شبلی ایک نکتہ یہ بیان کرتے ہیں کہ بعض اوقات مخالف پہلو دکھانے سے محاکات کی تکمیل ہوتی ہے۔ اکثر کسی حالت کے زیادہ نمایاں کرنے میں یہ طریقہ کام دیتا ہے اس کے علاوہ واقعہ کے ذکر میں اجمال، قدر مشترک کا ذکر، خیال کی لطافت و نزاکت، دقت آفرینی و خیال بندی، تشبیہیں بلاغت کلام، اظہار جذبات و جوش بیان، شوخی و ظرافت، تلمیحات، اشعار کا تقابل، عیب و قبح کی نشاندہی، ان تمام عنوانات پر علامہ شبلی کی شعر فہمی اور ان کے خیالات کی ترجمانی کی ہے۔

''علامہ کے نزدیک شاعری کی اصلی حقیقت جذبات کا اظہار ہے یعنی شاعر پر کوئی جذبہ طاری ہو اور وہ ان جذبات کو اس طرح ادا کرے کہ دوسروں پر بھی وہی اثر چھا جائے خواجہ صاحب کے اظہار جذبات اور جوش بیان کا اندازہ ان اشعار سے ہوگا جو علامہ کے حسن انتخاب کا نتیجہ ہیں۔ ان کے پرزور ترجمہ سے

۱۔ معارف نومبر ۱۹۹۳ء، ص ۳۲۵

علامہ کی شعر فہمی وسخن شناسی بھی سامنے آئے گی۔

شراب وعشق نہاں چیست کار بے بنیاد　　زدیم برصف رنداں وہر چہ باداباد

چھپ کر شراب پینا بے اصول کام ہے رندوں کی صف پر ٹوٹ کر گرتا ہوں جو ہونا ہوگا ہوگا۔"

شوخی طبع کی لطافت وترجمہ کی دلآویزی سے بھرا ہوا یہ اشعار ملاحظہ ہو۔

واعظ شہر کہ مردم ملکش می خوانند　　قول ما نیز ہمیں است کہ وآدم نیست

واعظ کو لوگ فرشتہ کہتے ہیں اس قدر تو ہم کو بھی تسلیم ہے کہ وہ آدمی نہیں (باقی فرشتہ ہے یا انسان اس کا فیصلہ ہوتا رہے گا)"[1]

مولانا سید سلیمان ندوی کی مقدمہ نگاری

(ڈاکٹر سید یحییٰ نشیط، مہاراشٹر، ستمبر۔اکتوبر ۱۹۹۸ء)

اردو تنقید کے اولین نمونوں کو سامنے رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں عربی تنقید کی پوری طرح اتباع کی گئی ہے۔ آب حیات، مقدمہ شعر وشاعری، شعر العجم، موازنہ انیس و بیر اور غالب کے مکاتیب و تقاریر کے تنقیدی نکات وغیرہ میں نقد عرب کے رائج اصولوں اور معانی و بیان کی تکنیکی باریکیوں کو بالراست اپنایا گیا ہے۔

اس کے علاوہ عربی تنقید میں مقدمہ نگاری کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ عربی کے بعض مصنفین اور بعض کتابیں ان کے مقدموں کی وجہ سے معروف ومشہور ہوئے۔ مقدمہ نگاری دراصل کسی فنی کتاب کو پرکھنے کی ایک کسوٹی ہے جو اصناف تنقید میں تبصرہ نگاری اور دیباچہ/تعارف سے زیادہ وسعت وعمق کی حامل ہوتی ہے۔

۱۔ معارف، نومبر ۱۹۹۳ء، ص ۳۴۳۔۳۴۴

مقدمہ نگار کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ وہ متعلقہ موضوع کے تمام گوشوں سے کلی طور پر واقف ہو یا کم از کم ان پر گہری نظر رکھتا ہو ورنہ وہ صحیح طور پر پرکھنے کا حق ادا نہیں کر سکتا۔ اردو تنقید میں مقدمہ نگاری کی اس روایت کو کافی فروغ حاصل ہوا بلکہ ایک طرح سے اردو تنقید کی ابتداء ہی مقدمہ نگاری سے ہوئی ہے۔ اس سلسلے میں اولین تنقید نگاروں میں الطاف حسین حالی کی مقدمہ شعر و شاعری اور محمد حسین آزاد کی آب حیات کے مقدمے کی وجہ سے اردو نقد میں مشہور و معروف دکھائی دیتی ہیں۔ مضمون نگار سید سلیمان ندوی کی مقدمہ نگاری سے متعلق لکھتے ہیں کہ:

''سید سلیمان ندوی کی نگارشات کا جب جائزہ لیا جاتا ہے تو ان کی مقدمہ نگاری میں متذکرہ اصولوں کو نہایت جانبدارانہ انداز میں برتا گیا ہے۔ انھوں نے اپنے مقدموں میں نفس نقد کی تمام باریکیوں کو دیانت داری سے اپنایا ہے۔ یوں بھی وہ ادب کی تنقید میں رواداری و مروت کے قائل نہیں رہے۔ اس میدان میں نہ اقبال کی پرواہ کی نہ مولانا عبدالماجد دریابادی کو چھوڑا۔ جب بھی موقع ملا نہایت شرافت کے ساتھ اکابرین کی فنی و ادبی غلطیوں کا برملا اظہار کر دیا ہے۔ کبھی ٹوکا کبھی تنبیہ فرمادی۔ زیادہ تعریف یا بیجا تنقیص کے سید صاحب کبھی روادار نہیں رہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے مقدموں میں موضوع کو صحیح میزان پر تلا ہوا پاتے ہیں۔ سید صاحب کے مقدمے اتنے ٹھوس جامع اور موضوع کو گرفت میں لئے ہوئے ہوتے ہیں کہ کتاب کے موضوع کے تمام گوشے چاہے وہ تاریخی نوعیت کے ہوں یا اصول بلاغت کے فلسفیانہ افکار کی باریکیوں پر محمول ہوں یا منطقیانہ رد و قدح کے حکمت کے پہلو کے ہوں یا تفسیری نکات کے، شاعرانہ معنی آفرینی کے ہوں یا نثری اقدار کے۔ کتاب کے مطالعہ میں قاری کے ذہن میں کھلتے چلے جاتے ہیں۔ مقدمہ نگار کا یہی

فریضہ بھی ہوتا ہے کہ وہ قاری کی صحیح رہنمائی کرے۔ان بنیادی اصولوں کے تحت
جب مولانا سید سلیمان ندوی کے مقدموں کا جائزہ لیتے ہیں تو دوسری طرف
کتاب کی صحیح قدر و قیمت متعین کرنے میں ممد و معاون ثابت ہوتے ہیں۔'' [۱]

سید صاحب کے مقدمہ نگاری کی ایک خاص خصوصیت یہ ہے کہ وہ مقدمہ کے آغاز میں ہی کتاب کی نشاندہی کر دیتے ہیں۔طویل تمہید اور بے حد تفصیل سے اپنے مقدموں کو بودا اور پھس پھسا نہیں ہونے دیتے۔اس سلسلے میں درج ذیل کتابوں کا ذکر کیا گیا ہے۔

۱۔مقدمہ تفسیر جواہر جز اوّل، ۲۔حضرت مولانا محمد الیاس اور ان کی دینی دعوت کا مقدمہ، ۳۔مکاتیب شبلی پر مقدمہ، ۴۔مکاتیب مہدی پر مقدمہ، ۵۔مقدمہ گلستان امجد، ۶۔کلام شاد پر مقدمہ، ۷۔مقدمہ یادگار عشق، ۸۔مقدمہ شعلۂ طور، ۹۔خمستان، ۱۰۔مقدمہ مسدس حالی، ۱۱۔مقدمۂ خیابان، ۱۲۔مقدمۂ عطر سخن، ۱۳۔حقیقت علمی شاعری۔

ان تمام کتابوں پر مقدمہ لکھ کر سید صاحب نے مقدمہ نگاری کی روایت کو بحسن و خوبی آگے بڑھایا، اور نقد و جرح میں اصولوں سے سر مو انحراف نہیں کیا۔یہی خوبی ہے کہ سید صاحب کا مقدمہ قارئین کتاب کو دھوکے میں نہیں ڈالتا اور جو کچھ مقدمہ میں بیان کر دیا گیا ہے قاری کتاب کے صفحات میں ٹھیک ویسا ہی پالیتا ہے۔

اردو کے ادبی رسائل و جرائد کا ایک اہم مسئلہ قارئین

(ضیاء الدین اصلاحی، دسمبر ۱۹۹۸ء)

مولانا ضیاء الدین اصلاحی نے یہ مقالہ اسی موضوع پر ہونے والے اتر پردیش اردو اکاڈمی کے سمینار منعقدہ ۱۶/اگست ۱۹۹۸ء کو پڑھا تھا۔ضیاء الدین صاحب نے بعض دوستوں کی خواہش پر اسے

۱۔ معارف، ستمبر ۱۹۹۸ء، ص ۱۹۴۔۱۹۵

معارف میں شائع کروایا۔

مذکورہ موضوع پر ضیاء الدین صاحب نے اپنے خیالات کا اظہار قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔ مضمون نگار نے اس بات کا تذکرہ کیا ہے کہ ہندوستان کی آزادی کے بعد اردو زبان کس طرح گردشوں کا شکار ہوئی۔ حکومت ہند نے اردو زبان کو فنا کرنے کی کوشش کی۔ اسکولوں میں اردو کی تعلیم بند کردی گئی۔ اس کو حاصل کرنے کے سارے مواقع ختم ہوگئے۔ اس سلسلے میں اتر پردیش، بہار، مدھیہ پردیش، راجستھان، پنجاب، ہریانہ، ہماچل پردیش میں جہاں آزادی سے پہلے اردو زبان کا عام رواج تھا ختم کردیا۔ اور بچوں کو اردو تعلیم حاصل کرنے سے محروم کردیا گیا۔

۱۹۴۷ء کے فسادات میں اردو پر افتاد بھی آئی۔ ہندوستان میں اردو کے دو بڑے اور عظیم الشان ادارے انجمن ترقی اردو ہند اور مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ کو آگ لگا دی گئی۔ حیدرآباد کا دارالترجمہ جلا دیا گیا۔ نتیجتاً لاکھوں روپے کی کتابیں راکھ کا ڈھیر بن گئیں۔ ایسی حالت میں اردو کے نئے قارئین کا پیدا ہونا مشکل تھا۔

شمالی ہند میں آزادی سے پہلے ہر مذہب کے طالب علم اردو پڑھتے تھے لیکن آزادی کے بعد اردو تعلیم ایک مخصوص مذہب تک ہی محدود ہو کر رہ گئی۔ مسلمانوں میں تو اردو کے کچھ قاری موجود بھی ہیں لیکن ہندوؤں میں ان کی تعداد مفقود ہوگئی۔ نتیجتاً اردو کے ادبی رسائل و جرائد اپنے قارئین کے بڑے طبقے سے محروم ہوگیا۔

اس کے علاوہ مسلم گھرانوں میں بھی تعلیم کا تناسب کم ہونا بھی ایک اہم مسئلہ ہے جو مسلمان تعلیم یافتہ ہیں ان کی دلچسپی انگریزی زبان میں ہونا ..... بھی ایک اہم مسئلہ ہے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں میں جو لوگ صنعت و حرفت اور مختلف پیشوں سے وابستہ ہوتے ہیں وہ بچوں کو اعلیٰ تعلیم دینے کے بجائے انہیں اپنے کاروبار یا معاشی مسائل میں لگا دیتے ہیں۔ نتیجتاً انہیں ادبی رسائل و جرائد کے قاری بننے کا موقع نہیں ملتا۔

اس کے علاوہ ہر شعبہ کے لوگ خواہ وہ پروفیسر ہوں، ریڈر ہوں، لیکچرر ہوں یا معلم انجمن کے سکریٹری

سب لوگ رسالہ خریدنے کے بجائے اعزازی طور پر حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

مضمون نگار کا ماننا ہے کہ آزادی کے بعد اردو کا رواج کچھ زیادہ ہوا لیکن اس تناسب سے ادبی رسائل و جرائد کے قارئین میں اضافہ نہیں ہو رہا ہے۔ اس کی دو وجہیں ہیں۔ ایک تو ابتدائی اور بنیادی تعلیم کا ہے جس کی جڑ ہی کاٹ دی گئی ہے اور لوگ مادری زبان اردو پر ضروری حد تک توجہ نہیں دیتے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ آزادی کے بعد اردو کا تعلیمی معیار بہت فروتر ہوا ہے۔ لیکن درسگاہوں اور دانش کدوں کا تعلیمی معیار نہایت پست ہو گیا ہے۔ اور طلبہ اردو الفاظ کے صحیح تلفظ اور ان کے برمحل استعمال سے بے بہرہ ہوتے ہیں۔ ایسے لوگوں سے اردو کے سنجیدہ باوقار علمی و ادبی رسالوں کے قاری بننے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔

اس کے علاوہ پر آشوب حالات زندگی کے گوناگوں مسائل اور الجھنوں نے بھی لوگوں کے ذوق مطالعہ کو متاثر کیا ہے اور سنجیدہ اور اعلیٰ ادب کے مطالعہ کے عادی نہیں ..... پست طبیعت، سطحیت پسندی اور زندگی کی کشاکش نے سنجیدہ علمی و ادبی رسائل و جرائد تک کے قارئین کی تعداد محدود کر دی ہے۔

موجودہ دور میں اردو کا رشتہ ذریعہ معاش سے کاٹ دیا گیا ہے۔ بڑھتی مہنگائی نے بھی اردو سے قارئین کو دور کر دیا ہے۔ مضمون نگار نے مذکورہ باتیں اردو کے قارئین سے متعلق بیان کی تھیں۔ اس کے بعد رسالوں کی کمی و کوتاہی کا بھی ذکر کیا ہے کہ عام طور پر ادبی رسائل کے پیش کش کا انداز اور مواد یکساں ہوتا ہے۔ اگر ہر ادبی رسالے باہم کسی قدر مختلف ہوں ان میں تنوع اور رنگا رنگی اور جدت ہو تو یہ قارئین کے لئے پرکشش دل آویز ہوگا، اور ان کی تعداد اشاعت بھی اس کی وجہ سے بڑھ جائے گی۔ اس کے علاوہ اردو رسالے قارئین کے خطوط کا جواب نہیں دیتے۔ ان کے مشوروں اور تجویزوں پر توجہ نہیں دیتے۔ اگر انہیں فروگزاشتوں سے آگاہ کیا جاتا ہے تو اس کا برا مانتے ہیں جس سے قارئین دور اور بیزار ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ہمیں اردو کے معیار کو بلند کرنا ہے تو اردو والوں کو اسے بہتر بنانے کے لئے جدوجہد کرنی ہوگی۔ اردو کا باقاعدہ رواج اور اس کی معقول تعلیم کا انتظام کرنا ہوگا جس سے اردو کے ادبی رسائل و جرائد کے قارئین میں اضافہ ہوگا۔

اردو کا سب سے پہلا اخبار (جناب خواجہ راحت حسین اکبرآبادی، اپریل ۱۹۵۱ء)

اس مضمون میں مضمون نگار نے اردو کا سب سے پہلا اخبار ''آگرہ اخبار'' کا ذکر کیا ہے۔ یہ اخبار پہلے بابو لال چھبی کی ملکیت میں تھا پھر اس کو خواجہ یوسف علی نے خرید لیا۔ تاریخ ادب اردو میں رام بابو سکسینہ نے آگرہ اخبار کا ذکر کیا ہے۔ داستان تاریخ اردو میں مولوی حامد حسن قادری نے بھی اردو میں آگرہ اخبار سے متعلق ہی لکھا ہے۔ ان تمام باتوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آگرہ اخبار غالباً ۱۸۳۰ء میں جاری ہوا۔ پہلے اس کے مالک بابو لال چھبی اور ایڈیٹر بابو لال گوبند تھے۔ ۱۸۶۳ء میں مضمون نگار کے والد خواجہ یوسف علی نے اخبار اور مطبع دونوں کو خرید لیا۔ اس وقت اس اخبار کا دوسرا دور شروع ہوا۔ مضمون نگار نے اردو کے پہلے اخبار سے متعلق لکھا ہے کہ:

> اردو کا سب سے پہلا اخبار آگرہ اخبار تھا۔ شروع میں اخبار کی شکل یہ تھی کہ سرورق پر تاج محل کی تصویر تھی۔ خبروں کی ترتیب یہ تھی کہ پہلے دہلی کی خبر پھر میرٹھ کی خبریں پھر لکھنؤ کی خبر وغیرہ ہوتی تھی۔ ایک کالم کے اوپر لوکل لکھا جاتا تھا جس میں آگرہ کی خبریں ہوتی تھیں اور مقامی سیاست پر تبصرہ ہوتا تھا اور یہ کالم مولوی خواجہ یوسف علی صاحب خود لکھتے تھے۔''[۱]

اقبال کا پیغام عمل (مرزا صفدر علی ایم اے، اپریل ۱۹۵۱)

انسان کا وجود ایسی ذہنی و روحانی قوت کا متحمل ہے جس کی کوئی حد نہیں۔ اس سلسلے میں مضمون نگار اقبال کا پیغام رقم کرتے ہیں کہ ''زمان و مکان کی یہ لامحدودیت انسان کے ہاتھوں مسخر ہونے کا یقین دلاتی ہے اور انسان کا فرض ہے کہ وہ ایزدی اشاروں پر غور کر کے تسخیر کائنات کے طریقوں کو پوری طرح

۱۔ معارف، اپریل ۱۹۵۱ء، ص ۳۰۵

سمجھے.....اقبال کہتے ہیں کہ انسان ایک مضطرب وجود ہے جو حصول نصب العین کے لئے وقف ہے اس کے مقابلہ میں دوسری چیزوں کو طاق نسیاں کے حوالہ کر دیتا ہے۔ اپنے لئے ہر طرح کی اذیت پیدا کرنے کے درپے اور اظہار خودی کے نت نئے ذرائع کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے، اور اپنی تمام کمزوریوں کے باوجود کائنات فطرت پر فضیلت رکھتا ہے۔ دوسری لامحدود قوتیں جب اس کو اپنی طرف راغب کرتی ہیں تو وہ اندرونی قوتوں سے کام لے کر انھیں اپنی مرضی کے مطابق ڈھال لیتا ہے اور ان سے استفادہ حاصل کرتا ہے۔ اگر چہ اس کا مقدر ناموافق اور تن نازک پھول کی پتی کی طرح ملائم ہے پھر بھی کوئی دوسرا اس کے مقابلہ میں اس قدر طاقت ور، پر عظمت اور خوبصورت نہیں ہے۔ اس کی انا جو ہر لمحہ بلندی کی طرف گامزن اور ارتقاء کے مراحل طے کرتا چلا جاتا ہے حیات کی ایک نوعیت سے دوسری نوعیت کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ اس کے مقسوم میں ہے کہ کائنات کو اس کے حصول مقاصد میں مدد لے اور خود اپنے مقدر کی تعمیر کے ساتھ ساتھ کائنات کے مقدر کی تعمیر کرے وہ اس طرح کہ کبھی وہ اپنے آپ کو اس کی قوتوں کے مطابق اور کبھی ان کو اپنے مقاصد میں مدد دے، اور خود اپنے مقدر کی تعمیر کے ساتھ ساتھ کائنات کے مقدر کی تعمیر کرے.....اس تعمیر و تعبیر میں خدا اس کا معاون و مددگار بن جاتا ہے۔ بشرطیکہ اقدام انسان کی جانب سے ہو۔ لیکن اگر وہ اقدام نہ کرے اور اپنے وجود کی اندرونی عظمت کو ترقی نہ دے تو اس کی روح پتھر کی طرح جامد ہو جاتی ہے اور وہ جمادات کی سطح پر پہنچ جاتا ہے۔

نزول آدم سے پہلے ہر ذرہ کائنات اپنے مقصد کے لئے فضائے بسیط میں سرگرداں تھا۔ جو الا نگاہ حیات ایک فاتح اعظم کی ضرب پیہم کے لئے بیقرار تھی.....روح ارضی اپنے محبوب سے ہم آغوشی کے لئے مضطرب تھی.....لیکن کائنات کی جو قوتیں آدمؑ کا استقبال کرنے اور ان کے قدم چومنے کے لئے آگے بڑھی تھیں وہ دھیرے دھیرے اس کی ترقی کی راہ میں حائل ہونے لگیں۔ ایسی حالت میں کیا آدم ان کے سامنے سر تسلیم خم کر دے۔ علامہ اقبال اس سلسلے میں پیغام عمل دیتے ہیں کہ:

''مخالف قوتوں کا وجود ضروری ہے۔ ان سے نبرد آزمائی ہی میں نئی قوتیں اور

صلاحیتیں ان کو زیر کرنے کے لئے ابھرتی ہیں جو کشمکش کے بغیر ناممکن ہے۔ ان ہی کے بقول ذہنی کاوش جو ان مزاحمتوں پر غالب آنے کے لئے کی جاتی ہے وہ نہ صرف زندگی کو گراں قدر بناتی ہے اور بصیرت کو چمکاتی ہے بلکہ حیات انسانی کے تجربات کے نازک اور پراسرار پہلوؤں تک ماہرانہ رسائی کے لئے تیار کرتی ہے۔ مادی اشیاء کے تسلسل تغیر سے ہمارا تخیلی ارتباط ہمیں غیر مادی اشیاء کے متعلق ذہنی خاکہ بنانا سکھاتا ہے۔ حقیقت اپنی خاص شکلوں میں رہتی ہے اور انسان کی ذات جس کو مخالف ماحول میں زندگی گزارنا ہے ظاہر کو نظر انداز نہیں کرسکتی ہے۔ قوائے ذہنی اور روحانی کے ذریعے تمام قوتوں پر تصرف حاصل کیا جاسکتا ہے جس سے نہ صرف علم بلکہ انسانی اقتدار مکمل ہوتا ہے ورنہ قوائے مادی جو انسانی وجود پر حاوی ہو کر اس کو نیست و نابود کردیں گے اس کے لئے ہر کوہ گراں سے ٹکرانا ضروری ہے۔''[1]

اس کے علاوہ علامہ اقبال کا یہ بھی ماننا ہے کہ وہ انسان جس کے کام مشین کی طرح سراسر جبری ہیں وہ خیر کی تخلیق نہیں کرسکتا کیونکہ خیر کی تخلیق کے لئے پہلی شرط آزادی اور دوسری شرط کسی چیز یا کام یا حرکت کے متعلق صحیح اور مکمل علم ہے۔ علم حاصل کرنے کی تمام تر ذمہ داری انسان پر عاید ہوتی ہے اور انسان کو یہ علم براہ راست قدرت کی طرف سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ پیغمبروں، اماموں اور اوتار کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ خیر کی تحقیق کے لئے صرف علم کافی نہیں ہوتا بلکہ عمل پیہم اور حیات کے ماحول سے نبرد آزمائی بھی ضروری ہے۔

۱۔ معارف، اپریل ۱۹۵۱ء، ص ۴۶۲

مثنوی اسرار خودی پر ایک نظر ڈاکٹر سید وحید اشرف، شعبہ عربی و فارسی و اردو، مدراس یونیورسٹی، اگست ۱۹۷۸ء

اس مضمون میں مضمون نگار نے مثنوی اسرار خودی پر روشنی ڈالی ہے۔ مثنوی اسرار خودی کی اشاعت نے پوری دنیا میں اقبال کی شہرت کا ڈنکا بجا دیا۔ اسی طرح جس طرح گیتا نجلی کی اشاعت کے بعد مغربی دنیا میں ٹیگور کی عظمت و شہرت کا ڈنکا بجا۔ اس مضمون میں اقبال نے انفرادی زندگی کے حقائق بیان کئے ہیں۔ نشو و نما اور استحکام کے اصول بتائے ہیں اور دنیا کو جو اندھیرے میں بھٹک رہی تھی منزل مقصول کی راہ دکھائی ہے اور اسے بتایا ہے کہ انسانی زندگی کا مقصد متاع تن آسانی کا اکٹھا کرنا نہیں بلکہ مادّیت الٰہی ہے۔ گویا اقبال خودی کے چشمے سے جوئے زندگی کاٹ کر لایا ہے اور ہر تشنہ کامی خودی کے آب حیات سے دور کر دینے کا آرزومند ہے۔ اسرار خودی کا سب سے پہلا انگریزی ترجمہ نکلسن نے کیا اور بڑے بڑے ادیب و شعرا نے اقبال کو خراج تحسین پیش کیا۔

مضمون نگار نے اس مضمون میں انگلینڈ کے ایک مشہور شاعر و نقاد کا ایک اقتباس بھی نقل کیا ہے جو اسرار خودی کی اشاعت پر لکھا گیا تھا۔ اس مضمون میں انھوں نے اقبال کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔

مغرب میں علامہ اقبال کو زیادہ تر ترجمہ کے ذریعہ سمجھا گیا ہے۔ لیکن شاعر کے اندر جو پرکاری و فن کاری اصل زبان میں موجود ہوتی ہے وہ ترجمہ میں منتقل نہیں کی جا سکتی۔ چنانچہ جو لوگ فارسی زبان کا علم نہیں رکھتے وہ اقبال کے کلام کی شیرینی اور دلکشی سے لطف اندوز نہیں ہو سکتے کیونکہ اقبال نے دنیا کو جس فکر کی عظمت سے متاثر کیا وہ فارسی زبان میں پہلی بار اسرار خودی کے ذریعہ آشکار ہوئی۔ اور اقبال کی عالمگیر مقبولیت اسی کلام کی آفاقیت کی دلیل ہے۔

اسرار خودی کے اشعار اگرچہ چند موضوعات کے تحت لکھے گئے ہیں لیکن یہ پوری زندگی کو محیط ہے۔ اقبال نے اس مختصر شعری مجموعہ میں قوموں کے عروج و زوال کے اسباب کی نشاندہی کی ہے۔ اور اپنی شاعری سے ادب اور زندگی کو ہم معنیٰ بنا دیا ہے۔ مضمون نگار نے اقبال کی خودی سے متعلق اس طرح روشنی

ڈالی ہے۔

''اقبال کی شاعری کے کسی بھی حصے پر اظہار رائے کرتے وقت ان کے تصور خودی کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ خودی اور اقبال لازم وملزوم ہیں۔ خودی اقبال کی علامت بن گئی ہے۔ اقبال کے نزدیک انسانی قدروں کی بلندی کے لئے خودی کو بلند کرنا ناگزیر ہے۔ ان کی شاعری اسی نظریۂ خودی کی تفسیر وتبلیغ ہے۔ یہ موضوع ان کی پوری شاعری پر محیط ہے۔ یہی عشق ـــــ یہی جوہر انسانیت ہے ـــــ اسی کی بقا سے انسانیت کی بقا ہے۔ اور اسی کی موت سے انسانیت کی موت ہے۔ اسی لئے اس کا تحفظ انسان کا سب سے پہلا فرض ہے۔ اس پیغام کو اقبال نے فارسی زبان میں سب سے پہلے اسرار خودی کے ذریعہ عام کیا۔''[۱]

اس کے علاوہ اقبال کا ماننا ہے کہ خودی مسلسل اور درجہ بدرجہ استحکام پذیر اور ارتقا پذیر ہوتی ہے۔ خودی عمل کے لئے بے تاب ہوتی ہے۔ چنانچہ خودی وعمل ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم ہیں۔

مضمون نگار نے اس مضمون میں خودی کی تعریف کرنے کے بعد ان موضوعات کا احاطہ کیا ہے کہ خودی کس طرح مستحکم ہوتی ہے اور کیونکر ضعیف ہو جاتی ہے۔، ملت اسلامیہ میں اس کے ضعف کے کیا اسباب ہیں؟ خودی کے استحکام کے نتائج کیا ہیں؟ خودی کی تربیت کس طرح ہوتی ہے؟ ان تمام امور پر روشنی ڈالی ہے۔

علامہ اقبال کے یہاں عشق اور خودی کہیں کہیں ہم معنیٰ نظر آتے ہیں۔ مضمون نگار نے علامہ اقبال کی خودی میں آرزو اور عشق کا بھی ذکر کیا ہے جس سے محرومی کا نتیجہ خواری، غلامی اور ناداری ہے۔ جو حریت فکر کو چھین لیتی ہے اور خودی کو کمزور اور ناتواں بنا دیتی ہے۔ اقبال نے گدائی اور دست دراز کرنے کی ممانعت کی ہے۔ اقبال کے نزدیک زندگی عمل کا نام ہے۔ ایسا عمل جو انسانیت کی حفاظت و بقا اور ترقی کا

۱۔ معارف، اگست ۱۹۷۸ء، ص ۱۰۲

ضامن ہو۔ان کے سارے کلام سے یہی درس ملتا ہے کہ

یقیں محکم عمل پیہم محبت فاتح عالم　　جہاد زندگانی میں ہیں یہ مردوں کی ہیں شمشیریں

اقبال کی تعلیم کی یہی وہ آفاقیت ہے جو ان کو تمام انسانوں کا شاعر بنا دیتی ہے۔

خودی کی تربیت کیونکر ہوسکتی ہے۔اس سلسلے میں بھی اقبال نے تمام ملت اسلامیہ کو خصوصی طور سے مخاطب کیا ہے۔اقبال نے اسرار خودی میں ہندوؤں کو بھی مخاطب کیا ہے۔ان کا ماننا ہے کہ ہندو اور مسلمان دونوں اپنے راستے سے ہٹے ہوئے ہیں، دونوں کو عشق و محبت کی جو تعلیم ان کے مذاہب سے ملی ہوئی ہے ان سے وہ عملاً محروم ہیں۔دونوں ہی اس زمین کو جنت نما بنانے اور اس کی راہ میں آنے والی صعوبتوں کو برداشت کرنے کے بجائے زندگی اور عمل سے فرار اختیار کئے ہوئے ہیں۔اسی لئے انھوں نے شیخ کی زبان سے برہمن کو خطاب کیا ہے۔

ماندہ ایم از جادۂ ایم تسلیم دور　　تو ز آزر من ز ابراہیم دور

اقبال کے جہاد زندگی تسخیر کائنات اور خودی کے نظریے سے شاہین و عقاب وغیرہ کے بطور علامت استعمال کرنے سے بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہوگئی کہ وہ جہاد بالسیف کے ذریعہ مسلمانوں کو زمینوں پر قبضہ کرنے اور دوسری قوموں کو اپنا محکوم بنانے کی دعوت دیتا ہے۔اس کی تائید میں وہ اقبال کا یہ نعرہ ''مسلم ہیں ہم وطن ہیں سارا جہاں ہمارا'' بھی پیش کرتے ہیں۔اس خیال کی تردید کرتے ہوئے مضمون نگار نے اپنا یہ نظریہ پیش کیا ہے۔

''ان لوگوں نے یا تو اقبال کے نظریہ خودی کو سمجھنے کی کوشش نہیں کی اور یا ان کا تجاہل عارفانہ ہے۔''[۱]

اس قول کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ مسلمان ساری دنیا کو اپنا تابع فرمان بنالیں۔اقبال کی تعلیم آفاقی تعلیم ہے۔انھوں نے اپنے وطن اور برادران وطن کی محبت کے ساتھ تمام دنیا کے لوگوں سے محبت

۱۔　معارف، اگست ۱۹۷۸ء، ص ۱۰۹

کرنا سیکھایا ہے۔لیکن عقلی طور پر یہ اسی وقت ممکن ہے جب کہ ہم پوری زمین کو اپنا وطن سمجھ لیں اور اس کے سب بسنے والے انسانوں کو ایک ہی نسل قرار دیں۔اور تمام جغرافیائی اور تاریخی حد بندیوں کو ڈھا دیں۔اور اس تعلیم کے لئے مسلمانوں کو اس لئے مخاطب کرتے ہیں کہ ان کا عقیدہ ہے کہ تمام انسان آدمؑ کی اولاد ہیں۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کے آخری پیغمبرؐ نے نسل ورنگ، ملک وقوم اور اونچ نیچ کے تمام دنیاوی امتیازات عملاً ختم کر کے عدل کا ایک نمونہ بھی پیش کیا ہے۔اقبال کے فلسفہ خودی سے متعلق مضمون نگار رقم طراز ہیں:

''اقبال جس فلسفۂ خودی کی تبلیغ کرنا چاہتے ہیں اس کا تقاضہ یہ تھا کہ تمام جدید فلسفیانہ نظریات سے آگاہی حاصل کریں اور فلسفہ ان کے نظریہ خودی سے متصادم ہو اس کی خامی کو آشکارا کیا، اور جہاں کوئی بے اعتدالی نظر آئی اس میں اعتدال پیدا کیا۔اس کے بغیر اقبال کا فلسفہ خودی پورے زور وقوت کے ساتھ ذہنوں میں نافذ نہیں ہوسکتا تھا۔انھوں نے برگساں کے نظریہ زمان سے جب آگاہی حاصل کی تو اس میں جزوی حقیقت نظر آئی۔ برگساں نے اپنے تصور زمان کو پیش کر کے دہریت کی تبلیغ کی۔ اس کے علاوہ برگساں کا نظریہ زماں خودی کو ضعیف بناتا ہے۔اس لئے اقبال کے لئے ضروری ہوگیا کہ وہ اپنے نقطۂ نظر سے وقت کو دیکھیں اور ایسا نظریہ پیش کریں جس سے خودی کو تقویت حاصل ہو۔کیونکہ ہر وہ چیز جو خودی کو ضعیف کرنے والی ہے وہ ان کے نزدیک غیر حقیقی ہے۔حقیقت خودی کے مترادف ہے۔اقبال کو اپنے نظریۂ زمان کی تشکیل میں دو اسلامی اقوال سے بھی معاونت حاصل ہوئی۔ایک تو خود حدیث قدسی جو لا تسبو الدھر کے مضمون کی حامل ہے اور دوسرا قول امام شافعیؒ کا الوقت السیف۔''[1]

علامہ اقبال اپنے فلسفیانہ افکار کو شعر کے بجائے صرف نثر میں بیان کر سکتے تھے۔ان کا مقصد

۱۔ معارف، اگست ۱۹۷۸ء، ص ۱۱۱۔۱۱۲

شاعری کے بجائے انسانیت خاص طور سے مسلمانوں کو اپنا پیغام پہنچانا تھا۔لیکن اس پیغام کے لئے انھوں نے وسیلہ شعر کو بنایا۔

یہ سچ ہے کہ اقبال کے اشعار کافی پر اثر ہوتے ہیں جو ان کے ایک عظیم شاعر ہونے کا ثبوت ہے۔ اقبال کے اشعار میں اتنا جادو ہوتا ہے کہ وہ پڑھنے کے ساتھ ہی دل پر اثر انداز ہو جاتے ہیں۔ اقبال کی شاعری عام روایتی شاعری نہیں۔ اگر چہ اقبال کے کلام میں اردو و فارسی شاعری کے سبھی علائم موجود ہیں، لیکن اقبال نے ان سب سے دوسرا کام لیا ہے۔اس کے علاوہ اقبال عقاب وشاہین باز وگرگس جیسی علامتوں کا بھی اختراع کیا ہے، اور انہیں استعمال کیا ہے۔لیکن اس میں کہیں اجنبیت کا احساس نہیں ہوتا۔حقیقت میں اقبال نے نہ صرف اپنے افکار سے زبان وادب کو مالا مال کیا ہے بلکہ انھیں نئے امکانات سے روشناس کر کے انھیں بلیغ تر اور حسین تر بنانے کی کوشش کی ہے۔اس کے علاوہ فلسفہ کے دقیق و پیچیدہ مسائل کو بھی اتنے سہل انداز میں بیان کیا ہے کہ فلسفہ جیسے خشک موضوع میں بھی شاعرانہ لطف کم نہیں ہوا ہے۔

اقبال کی ایک غزل کا تشریحی تجزیہ (تاج پیامی صاحب، آرہ جولائی ۱۹۹۵ء)

اس مضمون میں مضمون نگار نے اقبال کی تصنیف بال جبریل کی ایک غزل کا تشریحی تجزیہ پیش کیا ہے۔سب سے پہلے انھوں نے اقبال کی شاعرانہ عظمت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

> ''اقبال نے غزل کی دنیا میں بھی اجتہاد کیا۔انھوں نے غزل کی ہیئت وروایت کو برقرار رکھتے ہوئے اس میں کئی طرح کی توسیع کی۔آپ کی بیشتر غزلیں مسلسل ہیں۔ بال جبریل کی بہت سی غزلیں دعائیہ ہیں۔ انھوں نے غزل کو فلسفیانہ خیالات سے مالا مال کیا اور ایسی نادر تشبیہات اور ایسے عجیب استعارات سے آشنا کیا ہے جن سے یہ پہلے نا آشنا تھی۔''[۱]

۱۔ معارف، جولائی ۱۹۹۵ء، ص ۴۸

چونکہ غزل کی روایت فارسی زبان سے اردو میں آئی۔لیکن اقبال کی غزل کا آہنگ عجمی کے بجائے حجازی ہے۔مضمون نگار نے بال جبریل کی ایک غزل مع تشریح وتجزیہ اس مضمون میں پیش کی ہے جس میں حجاز کا بے باکانہ آہنگ ہے۔غزل درج ہے۔

اگر کج رو ہیں انجم آسماں تیرا ہے یا میرا　　مجھے فکر جہاں کیوں ہو جہاں تیرا ہے یا میرا

اس شعر میں آسمان اور زمین کی بات کہی گئی ہے۔آسمان پر انسان نہیں بستے زمین پر بستے ہیں،مگر دونوں جگہ کج روی ہے۔آسمان میں نجم یعنی ستارے ہوتے ہیں اور وہ بھی کج رو ہیں وہ بھی ٹیڑھی میڑھی چال چلتے ہیں۔سیدھی راہ نہیں چلتے۔ماہرین فلکیات جانتے ہیں کہ ستارے اپنے اپنے مدار پر گردش کرتے ہیں اور مدار دائرہ اور حلقہ کو کہتے ہیں جس کی شکل بیضوی ہوتی ہے۔یہی سبب ہے کہ ستارے کج رو ہیں۔

شاعر خدا سے مخاطب ہے اور کہتا ہے کہ تو خالق ہے اور یہ آسمان اس کے ستارے بھی تیرے پیدا کردہ ہیں۔اگر ستارے ٹیڑھی چال چلتے ہیں تو اس کا ذمہ دار میں نہیں ہوں۔

دوسرے مصرعہ میں بھی شاعر صحیح کہتا ہے کہ مجھے فکر جہاں کیوں ہو۔کیونکہ یہ جہاں یعنی دنیا بھی خدا کی پیدا کی ہوئی ہے۔اور اگر اس میں خرابی ہے تو اس کی فکر خدا ہی کو ہونی چاہئے۔دنیا کی خرابی سے مراد دنیا کی کج روی ہے۔آسمان کے انجم کی طرح اہلِ زمین بھی کج رو ہیں۔جب سے دنیا قائم ہے یعنی قابیل نے جب سے ہابیل کو قتل کیا اس وقت سے آج تک انسان اس زمین پر فتنے پھیلا رہا ہے اور خونریزیاں کر رہا ہے۔

مضمون نگار نے مذکورہ غزل کا چوتھا شعر مع تشریح وتجزیہ اس طرح درج کیا ہے:

محمدؐ بھی تیرا جبرئیل بھی قرآن بھی تیرا　　مگر یہ حرف شیریں ترجماں تیرا ہے یا میرا

اس شعر کے پہلے مصرع میں محمدؐ، جبریل اور قرآن کی بات کہی گئی ہے۔دوسرے صحیفوں اور پیغمبروں کا ذکر نہیں کیا گیا ہے۔اس کی وجہ یہ ہے کہ محمدؐ آخری پیغمبر ہیں جن پر جبرئیلؑ خدا کا آخری صحیفہ قرآن لے کر حاضر ہوئے۔اقبال اقرار کرتے ہیں کہ یہ تینوں خدا کے ہیں۔پہلا مصرعہ بالکل صاف ہے۔

دوسرے مصرعے میں لفظ یہ کے بارے میں کچھ لوگوں کا کہنا ہے کہ یہ قرآن کے لئے استعمال ہوا ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ قران کے ساتھ محمد بھی اور کسی حد تک جبرئیلؑ بھی خدا کے ترجمان ہیں۔ اس لئے یہ کا لفظ قرآن کے لئے نہیں آیا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اوپر کے مصرع کو ''مگر'' سے الگ کیا گیا ہے۔ یعنی شاعر کوئی نئی بات کہنا چاہتا ہے۔ اب دو ترکیبیں بنتی ہیں۔ یہ حرف شیریں اور شیریں ترجمان۔ اگر یہ حرف کو شیریں ترجمان مان لیا جائے تو غلط ہوگا۔ کیونکہ کوئی حرف یا کلام قرآن کے مقابلہ میں شیریں ترجمان نہیں ہوسکتا۔ اس لئے یہ حرف شیریں کی ترکیب درست ہے۔ اقبال نے یہ کا لفظ اپنی شاعری کے لئے استعمال کیا ہے۔ جسے وہ حرف شیریں کہتے ہیں۔ آج بھی بہت سے لوگ نظم و نثر میں خدا کی تعریف و توصیف بیان کررہے ہیں۔ انھیں حرف شیریں کہہ سکتے ہیں۔

تاج صاحب آخر میں لکھتے ہیں کہ: اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان اپنے کارناموں کو اپنا کہہ سکتا ہے یا نہیں۔ اقبال جبریہ عقیدہ کے قائل نہیں۔ ان کے نزدیک خدا نے انسان کو قادر بنا کر بھیجا ہے۔ اقبال خالق دو جہاں سے کہتے ہیں

تو شب آفریدی چراغ آفریدم　　یعنی تو نے رات پیدا کی تو میں نے چراغ پیدا کیا

مذکورہ شعر کی طرف آتے ہیں تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ قرآن خدا کا کلام ہے اور حرف شیریں اقبال کا کلام ہے۔ یہ حرف شیریں یعنی اقبال کا کلام کس کا ترجمان ہے۔ خدا کا یا اقبال کا؟ اقبال جانتے ہیں کہ محمدؐ کے بعد اب کوئی اور پیغمبر نہیں آنے والا۔ آپؐ کی حدیث ہے:

> ''میرے بعد اب کوئی نبی نہیں'' اور قرآن کے بعد جبرئیلؑ کوئی دوسرا آسمانی صحیفہ لے کر نہیں آئیں گے۔ اس لئے اب خدا کا ترجمان یہ حرف شیریں ہیں۔ یعنی اقبال کا کلام اور یہ بات صحیح اور درست بھی ہے کیونکہ اس غزل کے ساتھ ہی اقبال کا بیشتر کلام خدا کا ترجمان ہے۔ اسی لئے لوگ اقبال کو شاعر اسلام بھی کہتے ہیں۔ لیکن یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ اقبال نے فکر و فن کو ہم آہنگ

کر دیا اور یہ ان کی شاعرانہ عظمت کا ثبوت ہے۔''[۱]

مذکور غزل میں علامہ اقبال کا اسلوب دلچسپ اور متحیر خیز ہے۔ اقبال کے اس بے باکانہ انداز سے پہلے اردو غزل ایسے اسلوب سے نابلد تھی۔ اقبال کی یہ غزل ان کے وسعت مطالعہ کی نمائندگی کرتی ہے۔ مذہبی تلمیحات، اجرام فلکی سے ناواقفیت اور دنیا کے حالات کو غزل کے قالب میں ڈھال کر پیش کرنا ہی اقبال کا شاعرانہ کمال ہے۔ اور اس اعتبار سے اقبال کی یہ غزل اپنے آہنگ اور موضوع دونوں ہی اعتبار سے اجتہادی ہے۔ اقبال نے غزل کی تنگنائے کو وسعت بخشی اور اس کو نئے اسلوب، نئے مضامین، نئے استعارات وتشبیہات اور تلمیحات سے سرمایہ دار بنا دیا۔ اقبال نے اپنی غزل میں خدا سے جس بے باکانہ انداز سے خطاب کیا ہے اب سے پہلے اردو یا فارسی کے کسی شاعر نے نہیں کیا۔ اس سلسلے میں اقبال کی مذکورہ غزل کا دوسرا مطلع درج ہے۔

اگر ہنگامہ ہائے شوق سے ہے لامکاں خالی　　خطا کس کی ہے یارب لامکاں تیرا ہے یا میرا

غرض یہ کہ اقبال نے اپنی شاعری میں اقدام وعمل انسان کی عظمت اور خودی کا درس دیا ہے۔ انھوں نے نظم کے پیمانے کو مئے تغزل سے لبریز کیا ہے۔ اس سلسلے میں ان کی نظم خضر راہ، ساقی نامہ اور مسجد قرطبہ ہر اعتبار سے اعلیٰ پیمانے کی نظمیں ہیں۔

علامہ اقبال کی مکتوب نگاری پر ایک نظر (پروفیسر اکبر رحمانی، جلگاؤں، اپریل ۱۹۹۸ء)

اس مضمون میں مضمون نگار نے خطوط نگاری کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھا ہے کہ خطوط دلی جذبات واحساسات کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ کبھی کبھی مکتوب نگار اس یقین کے ساتھ اپنی نجی زندگی کے اسرار سے پردہ اٹھا دیتا ہے کہ یہ رازدارانہ باتیں مکتوب الیہ تک ہی محدود رہیں گی اور دوسروں پر ظاہر نہ ہوں گی۔ چونکہ خطوط شخصی اور نجی ہوتے ہیں اس لئے مکتوب نگار ایسی باتیں بھی بے جھجک بیان کر دیتا ہے

۱۔　معارف، جولائی، ۱۹۹۵ء، ص ۵۶۔۵۷

جن کو کسی مصلحت اور اصول اخلاقیات کی بنا پر دوسروں کے سامنے کھل کر بیان نہیں کر سکتا۔

چونکہ انسان جب خط لکھتا ہے تو بہت ہی بے تکلفی کے ساتھ قلم برداشتہ لکھتا ہے۔ کیونکہ خط لکھتے وقت مکتوب نگار کا مقصد اس کی طباعت نہیں ہوتا۔ اس لئے اکثر مشاہیر نے اپنے نجی خطوط کی اشاعت کو پسند نہیں کیا ہے۔ غالب بھی اپنے خطوط کی اشاعت کو پسند نہیں کرتے تھے۔ اسی طرح علامہ اقبال بھی اپنے خطوط کی اشاعت کو پسند نہیں کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اقبال کی زندگی میں ان کے خطوط کا کوئی مجموعہ نہیں چھپا۔ خواجہ حسن نظامی نے علامہ کے چند خطوط اتالیق خطوط نویسی میں شائع کر دیے جس سے علامہ اقبال کو کافی پریشانی ہوئی تھی۔ چنانچہ علامہ اقبال ایک خط میں نیاز الدین احمد خاں کو لکھتے ہیں:

> ''مجھے یہ سن کر تعجب ہوا کہ آپ میرے خطوط محفوظ رکھتے ہیں۔ خواجہ حسن نظامی بھی ایسا ہی کرتے ہیں۔ کچھ عرصہ ہوا جب انھوں نے بعض خطوط کو ایک کتاب میں بھی شائع کر دیا تو مجھے اور پریشانی ہوئی۔ کیونکہ خطوط عجلت میں لکھے جاتے ہیں اور ان کی اشاعت مقصود نہیں ہوتی۔ عدیم الفرصتی تحریر میں ایک ایسا انداز پیدا کر دیتی ہے جس کو پرائیوٹ خطوط میں معاف کر سکتے ہیں مگر ان کی اشاعت نظر ثانی کے بغیر نہیں ہونی چاہئے۔ اس کے علاوہ میں پرائیوٹ خطوط کے طرز بیان میں خصوصیت کے ساتھ لاپرواہ ہوں۔ امید ہے کہ آپ میرے خطوط کو اشاعت کے خیال سے محفوظ نہ رکھتے ہوں گے۔''[1]

علامہ اقبال کی یہ خواہش تھی کہ ان کے خطوط اشاعت کے خیال سے محفوظ نہ رکھے جائیں۔ وہ اپنے زمانے کے خاص حالات اور لوگوں کے مزاج کی وجہ سے ایسا سوچتے تھے۔ ہاں اگر چہ خطوط نظر ثانی کے بعد اور اپنے پس منظر اور حواشی کے ساتھ شائع کئے جاتے تو علامہ کو بھی اعتراض نہ ہوتا۔ علامہ خطوط کی ادبی اہمیت سے اچھی طرح واقف تھے۔ چنانچہ حاجی محمد احمد خاں صاحب کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

۱۔ معارف، اپریل ۱۹۹۸ء، ص ۲۸۷

''شاعر کے لٹریری اور پرائیویٹ خطوط سے اس کے کلام پر روشنی پڑتی ہے اور اعلیٰ درجہ کے شعرا کے خطوط شائع کرنا لٹریری اعتبار سے مفید ہے۔'' [۱]

اقبال کی یہ رائے ان کے مکاتیب پر بھی صادق آتی ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور فرماتے ہیں:

''اقبال کے کلام کی سب سے اچھی شرح ان کے خطوط ہیں۔'' اور دوسری طرف محمد عبداللہ قریشی کے نزدیک علامہ کی شخصیت کے گوناگوں پہلوؤں کو سمجھنے کے لئے ان کے نجی اور ذاتی خطوط کے عظیم سرمائے کو سب سے اہم کلیدی حیثیت حاصل ہے۔

اس کے علاوہ مضمون نگار نے علامہ اقبال کے مکاتیب سے متعلق پروفیسر غلام حسین ذوالفقار، ممتاز حسن کے خیالات بھی اس مضمون میں بیان کئے ہیں۔ ڈاکٹر عبداللہ چغتائی مکاتیب اقبال کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مکاتیب اقبال کے ضمن میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ زندگی کے رازہائے سربستہ پر اور زندگی کے حقائق پر جس طرح ان کے خطوط سے روشنی پڑتی ہے وہ دیگر ذرائع اظہار سے توانا ہے۔ ان کے خطوط جہاں ان کی شخصی زندگی کا آئینہ ہے وہاں متعلقہ عہد کے سوانح اور وقائع کی سچی تصویر پیش کرتے ہیں۔'' [۲]

علامہ اقبال کی شخصیت اور ان کے خیالات ونظریات اور ان کے کلام کو سمجھنے کے لئے مکاتیب اقبال کی اشاعت بہت ضروری تھی۔ اس کے بغیر کلام اقبال کو سمجھنا ناممکن ہے۔ مکاتیب اقبال کے سارے مجموعے ان کی وفات کے بعد وقفے وقفے سے شائع ہوئے۔ چونکہ خطوط علامہ کی اجازت اور نظر ثانی کے بغیر شائع ہوئے ہیں اس لئے انہیں علامہ کی باقاعدہ تصنیف نہیں کہا جاسکتا۔

علامہ کے نزدیک خط کا جواب لکھنا اسلامی اور اخلاقی فریضہ تھا۔ وہ خط کا جواب لکھنے میں کافی

۱۔ معارف، اپریل ۱۹۹۸ء، ص ۲۸۹

۲۔ ایضاً، ص ۲۸۹

مستعدی اور جلدی دکھاتے تھے۔اس سلسلے میں مضمون نگار نے سید قدیر نیازی کا یہ اقتباس نقل کیا ہے:

''حضرت علامہ خط و کتابت میں بڑے مستعد تھے۔ان کا ہمیشہ معمول تھا کہ خط کا خود ہی مطالعہ کرتے تھے خود ہی اس کا جواب لکھتے اور دیکھتے کہ کسی ضروری سے ضروری بات کا ذکر تو نہیں رہ گیا۔ جواب بھی ہمیشہ اولین فرصت میں رقم فرماتے۔'' [۱]

زندگی کے آخری ایام میں مختلف امراض میں مبتلا ہونے کے باوجود وہ اپنے عقیدت مندوں کے خط کا جواب اتنی ہی جلدی اور مستعدی کے ساتھ لکھوا کر بھیجتے تھے۔مضمون نگار علامہ اقبال کے خطوط سے متعلق لکھتے ہیں:

''اقبال نے اپنے زمانہ طالب علمی سے لے کر وفات تک اپنے اعزہ و اقارب، دوستوں، عقیدت مندوں، مداحوں، شاعروں، نقادوں، اخبارات کے ایڈیٹروں اور سیاسی و مذہبی رہنماؤں کو ہزاروں خط لکھے۔لیکن اب تک بقول صابر کلوروی ۱۸۸۳ بقول عبداللہ قریشی ۱۲۳۲ اور بقول ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی ۱۳۷۵ خطوط مختلف مجموعوں کی صورت میں منظر عام پر آچکے ہیں۔ مکاتیب اقبال کے دریافت کا سلسلہ ابھی تک ہنوز جاری ہے۔کئی خطوط دریافت ہو چکے ہیں۔ ہماری معلومات کے مطابق مطبوعہ خطوط کی تعداد ۱۴۰۰ سے اوپر تک پہنچ چکی ہے اور آئندہ اس میں برابر اضافہ کا امکان ہے۔'' [۲]

علامہ نے اردو اور انگریزی کے علاوہ فارسی اور جرمنی زبانوں میں بھی خط لکھے۔مگر انھوں نے سب سے زیادہ خطوط اردو میں لکھے ہیں۔اب تک مکاتیب کے جو مجموعے شائع ہو چکے ہیں ان کی تفصیل و

۱۔ معارف، اپریل ۱۹۹۸ء، ص ۲۹۲

۲۔ ایضاً، ص ۲۹۷

کیفیت درج ذیل ہے۔

(۱) **شاداقبال** : یہ اقبال کے اردو خطوط کا پہلا مجموعہ ہے جو ۱۹۴۲ء میں شائع ہوا۔ جسے محی الدین قادری زور نے مرتب کیا تھا۔

(۲) **اقبال بنام شاد** : یہ مجموعہ جون ۱۹۸۶ء میں بزم اقبال لاہور سے شائع ہوا۔ اس مجموعے کو محمد عبداللہ قریشی نے مرتب کیا۔

(۳) **Letters of Iqbal to Jinnah** : علامہ اقبال کے ۱۳ خطوط کا مجموعہ ہے جو ۱۹۷۳ء میں شائع ہوا۔ یہ خطوط جناح کی زندگی ہی میں مرتب ہوا اور اس کا دیباچہ خود جناح نے لکھا تھا۔ تاریخی اعتبار سے یہ مجموعہ نہایت اہم ہے۔

(۴) **اقبال نامہ (حصہ اوّل)** : علامہ اقبال کے خطوط کا یہ مجموعہ عطاء اللہ لیکچرر معاشیات مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے مرتب کر کے ۱۹۴۴ء میں شائع کروایا تھا۔

(۵) **Iqbal Letters to Atiya Begum** : عطیہ بیگم کے نام سے اقبال کے نو انگریزی خطوط کا مجموعہ فروری ۱۹۴۷ء میں بمبئی سے شائع ہوا تھا۔ اس میں مکاتیب کے علاوہ اقبال کی بعض نظموں کے عکس ان کی وضاحت اور عطیہ کی یادداشتیں بھی شامل ہیں۔

(۶) **اقبال نامہ (حصہ دوم)** : شیخ عطاء اللہ نے اسے ۱۹۵۱ء میں لاہور سے شائع کیا تھا۔

(۷) **مکاتیب اقبال بنام خان محمد نیاز الدین خان** : یہ علامہ اقبال کے ۷۹ اردو خطوط کا مجموعہ ہے جو ۱۹ جنوری ۱۹۱۶ء سے ۱۵ جون ۱۹۲۸ء کے درمیانی عرصے پر محیط ہے۔ بزم اقبال لاہور نے شائع اسے کیا۔

(۸) **مکتوبات اقبال** : سید نذیر نیازی کے نام علامہ اقبال کے ۱۸۳ خطوط کا یہ مجموعہ اقبال اکاڈمی کراچی نے ستمبر ۱۹۵۷ء میں شائع کیا۔ مجموعہ خود مکتوب الیہ نے مرتب کیا ہے۔

(۹) **انوار اقبال** : بشیر احمد ڈار کی یہ کتاب اقبال اکاڈمی کراچی نے مارچ ۱۹۶۷ء میں شائع کی تھی، جو مکاتیب کے علاوہ علامہ کی تقاریظ، مضامین، بیانات، سفر مدراس کی روداد اور ان کے ابتدائی کلام پر بھی

مشتمل ہے۔

(۱۰) **Letters & Writings of Iqbal** : بشیر احمد ڈار کا مرتبہ یہ مجموعہ نومبر ۱۹۶۷ء میں اقبال اکیڈمی کراچی نے شائع کیا جو مکاتیب کے علاوہ دیگر تحریروں پر بھی مشتمل ہے۔

(۱۱) **مکاتیب اقبال بنام گرامی** : غلام قادر گرامی کے نام علامہ اقبال کے نوے خطوط کا یہ مجموعہ محمد عبداللہ قریشی کے مبسوط مقدمہ اور مفید حواشی کے ساتھ اقبال اکاڈمی کراچی نے اپریل ۱۹۶۹ء میں شائع کیا تھا۔ جون ۱۹۸۱ء میں اقبال اکاڈمی پاکستان لاہور نے دوبارہ اس کی عکسی اشاعت کی ہے۔

(۱۲) **خطوط اقبال** : ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی کا مرتب کردہ یہ مجموعہ ۱۹۷۶ء میں مکتبہ خیابان لاہور سے شائع ہوا ہے جس کا عکسی اڈیشن ہندوستان میں ادارہ بیسویں صدی دہلی نے شائع کیا۔

(۱۳) **روح مکاتیب اقبال** : اس مجموعہ کو محمد عبداللہ قریشی نے مرتب کر کے خطوط کو اقبال ہی کے الفاظ میں تلخیص کر کے گویا دریا کو کوزے میں یا سمندر کو صدف میں بند کر دیا ہے اور عطر کھینچ لیا ہے۔ جو پھول جس گلدستے سے چنا ہے اس کا حوالہ دیا ہے۔

(۱۴) **Letters of Iqbal**: ۱۰۴ انگریزی خطوط کا یہ مجموعہ بشیر احمد ڈار نے مرتب کیا اور اقبال اکاڈمی پاکستان لاہور نے ۱۹۶۷ء میں اسے شایع کیا۔ اس میں عطیہ فیضی اور خیام کے نام انگریزی خطوط بھی ہیں۔ اس طرح بشیر احمد ڈار نے ۱۹۶۷ء میں Letters and Writings of Iqbal کے نام سے جو مجموعہ مرتب کیا تھا اس کے خطوط بھی اس مجموعہ میں شامل ہیں۔

(۱۵) **اقبال نامے** : ڈاکٹر اخلاق اثری کی مرتبہ یہ کتاب ۱۹۸۱ء میں بھوپال سے شائع ہوئی تھی۔ اقبال نامے کے دوسرے ایڈیشن میں آٹھ غیر مطبوعہ اردو اور انگریزی خطوط کے عکس شامل ہیں جو پہلے نہ تھیں۔

(۱۶) **مکاتیب اقبال بنام شیخ اعجاز احمد** : علامہ اقبال کے خاندانی حالات عقائد اور دیگر کوائف پر ان کے بھتیجے شیخ اعجاز احمد (جو کہ قادیانی ہیں) کی یادداشتوں و تاثرات پر مشتمل کتاب مظلوم اقبال ۱۹۸۵ء میں کراچی سے شائع ہوئی۔ یہ کتاب ۲۴ جون ۱۹۱۴ء سے ۲ دسمبر ۱۹۳۷ء کے درمیانی عرصے پر محیط ہے۔

ترتیب تاریخ وار ہے۔ ہر خط سے پہلے پس منظر و پیش منظر بھی ہے۔

(۱۷) آندھرا پردیش آرکائیوز میں مکاتیب اقبال : حیدر آباد کے جواں سال محقق اور اسسٹنٹ ارکائیوسٹ سید شکیل احمد نے اپنے محکمہ قدیم حیدر آبادی فائلوں سے اقبال کے سات غیر مطبوعہ انگریزی خطوط کا پتہ چلایا ہے۔ خطوط اور ان کے متعلق حواشی و تشریحات اور سوانح کے بعض پہلوؤں سے متعلق بعض نئے حقائق و معلومات کو مرتب کر کے سید شکیل احمد نے اسے پہلے اقبال اکاڈمی حیدر آباد دکن کے مجلّہ اقبال ریوی کی خصوصی اشاعت (مئی ۱۹۸۴ء) میں شائع کیا۔ پھر اقبال نئی تحقیق کے نام سے مارچ ۱۹۸۵ء میں کتابی صورت میں شائع ہوا۔

(۱۸) خطوط اقبال بنام دیگے تاسٹ : اقبال کی جرمن زبان کی ٹیوٹرمس دیگے تاسٹ کے نام علامہ کے ۲۷ غیر مطبوعہ خطوط ڈاکٹر سید اختر درانی نے اپنی کتاب ''اقبال یورپ میں'' شائع کئے ہیں جو ۱۹۸۵ء میں اقبال اکاڈمی پاکستان لاہور کے زیر اہتمام ڈاکٹر جاوید اقبال کی تقریظ کے ساتھ شائع ہوئی۔

(۱۹) خطوط اقبال بنام عبدالعزیز مالواڑہ : میاں عبدالعزیز مالواڑہ کے نام اقبال کے انیس خطوط (پانچ دعوتی رقعات اور چند متفرقات) کا ایک غیر مطبوعہ ذخیرہ ادارہ ثقافت اسلامیہ لاہور کی مساعی سے منظر عام پر آیا ہے۔

(۲۰) اقبال جہاں دیگر : راغب حسن کے نام اردو انگریزی میں لکھے ہوئے یہ ۴۴ خطوط فرید الحق ایڈوکیٹ نے مرتب کیا اور ۱۹۸۱ء میں گرونیری پبلشرز کراچی نے اسے شائع کیا ہے۔

(۲۱) Iqbal his Political Ideas at Cross Road : مرتبہ احمد مارچ ۱۹۷۹ء پرنٹ ویل پبلی کیشنز علی گڑھ۔ اس میں اقبال کے نو خطوط مع عکس شامل ہیں۔

(۲۲) کلیات مکاتیب اقبال : جناب ظفر حسین برنی نے علامہ اقبال کے ذخیرہ مکاتیب کو پانچ جلدوں میں مدون کرنے کا منصوبہ بنایا ہے۔ اس کی تین جلدیں اب تک دہلی اردو اکاڈمی کے زیر اہتمام منظر عام پر آچکی ہیں۔ جلد اول ۱۲۰۰ صفحات پر مشتمل ہے۔ جلد دوم ۱۲۴۴ اور جلد سوم ۱۱۶۸ صفحات پر۔ سید مظفر

حسین برنی نے اقبال کے کل معلوم خطوط کی تعداد ۱۵۰۰ بتائی ہے اور ایک جگہ ۱۴۵۰ لکھی ہے۔ یہ کلیات دراصل مکاتیب اقبال کی ایک انسائیکلو پیڈیا ہے۔

ڈاکٹر اقبال کی اردو (مولوی محمد محمود زماں خاں صاحب رام پور مئی ۱۹۲۸ء)

یہ مقالہ مئی ۱۹۲۸ء میں معارف میں شائع ہوا۔ اقبال کی شاعری کو جیسے جیسے عوام میں مقبولیت حاصل ہوئی ان پر اعتراضات کرنے والوں کی تعداد بھی بڑھنے لگی۔ ان اعتراضات کرنے والوں نے ان کے فکر و خیالات پر تنقید کی گنجائش نہ پا کر ان کے زبان و محاورات کو اعتراض کا نشانہ بنایا۔ یہ مقالہ جولائی ۱۹۲۷ء کے ''مرقع'' لکھنؤ میں شائع ہوا جس کے جواب میں محمود زماں صاحب نے یہ مضمون لکھا۔ وہ تمہید میں لکھتے ہیں:

> ''جولائی ۱۹۲۷ء کے مرقع لکھنؤ میں لکھنؤ کے ایک حکیم صاحب نے جو متعدد رسالوں کے مصنف ہیں، ڈاکٹر اقبال کی اردو زبان اور محاورات پر بہت سے اعتراضات کئے ہیں، اس سے کسی کو انکار نہیں کہ اقبال کی زبان اردو وہ زبان نہیں جس پر سخن وران لکھنؤ کو ناز ہے۔ ان کی شاعری ضلع جگت، روزمرہ خاص خاص محاورات میں پابندی سے آزاد ہے اور یہ کوئی چھپا راز نہیں۔ یہ چیز ہمیشہ سے سب کو معلوم ہے اور سب اس کو جانتے ہیں اس کے لئے کسی نئی تحقیق، جدید کاوش، اور تازہ کشف، حقیقت کی ضرورت نہیں۔ پابند وضع اور اہل تقلید قدیم جماعت ہمیشہ ان کی زبان پر ناک بھوں چڑھاتی رہی ہے، لیکن یہ دیکھ کر افسوس ہوا کہ اس غصہ و غضب اور طیش کی حالت میں مضمون نگار کو صحیح و غلط اور صواب و خطا کی تمیز بھی نہی رہی اور متعدد غلطیوں کے ارتکاب سے خواص کی نظر میں خود اپنے کو مضحکہ انگیز بنالیا۔'' [۱]

۱۔ معارف، مئی ۱۹۲۸ء، ص ۳۶۰

شاعری کی دنیا میں لفظ و معنی کی جنگ بہت پرانی ہے اور اس کی لڑائی عربی، فارسی اردو میں قائم ہے اور قائم رہے گی۔ جو شعراء الفاظ کی صحت اور شان و شوکت کے قائل ہیں ان کو معنیٰ کی طرف توجہ کرنے کی بہت کم فرصت ملتی ہے۔ لفظ و معنی کی یہی جنگ غالب اور مومن کے درمیان بھی جاری تھی۔ ڈاکٹر اقبال کی شاعری اس معرکہ کی پہلی مثال نہیں ہے۔ مضمون نگار نے حکیم صاحب کا پہلا اعتراض جو انھوں نے اقبال کے ایک شعر پر کیا ہے رقم کرتے ہوئے کہتے ہیں۔ اقبال کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

آہ تو اجڑی ہوئی دلی میں آرامیدہ ہے　　گلشن ویمر میں تیرا ہم نوا اخوبیدہ ہے

حکیم صاحب نے آرامیدہ و خوابیدہ کے الفاظ پر اعتراض کیا ہے کہ ہم اسے اردو کہیں یا فارسی۔ اس موقع پر مضمون نگار نے غالب، خواجہ وزیر، حکیم مومن خاں مومن اور آتش کے اشعار سے مثالیں دے کر یہ واضح کیا ہے کہ اس طرح کے الفاظ کے استعمال سے اردو، فارسی میں تبدیل نہیں ہو جاتی ہے۔ اس سلسلے میں مضمون نگار نے غالب کی مثالیں پیش کی ہیں جن پر فارسیت کا غلبہ ہوتے ہوئے بھی ناقد نے انھیں موجد سخن اور مصلح اعظم تسلیم کیا ہے۔ مضمون نگار نے غالب کے فارسی اشعار مثال کے طور پر پیش کئے ہیں۔ اس کے علاوہ شعرائے لکھنؤ خواجہ وزیر، آتش کے اشعار بھی مثال کے طور پر پیش کئے ہیں۔ خواجہ آتش کی تو پوری ایک غزل اسی رنگ میں ہے۔ کشیدہ ہونا، بریدہ ہونا، دریدہ ہونا، رسیدہ ہونا۔ اس کے علاوہ حکیم صاحب نے اقبال کے بعض اشعار میں مذکر و مونث کو تنقید کا نشانہ بنایا ہے جس پر مضمون نگار نے پوری وضاحت کے ساتھ تردید کی ہے اور اقبال کے اشعار کو صحیح ثابت کیا ہے۔

اقبال کی نظم ''پہاڑ اور گلہری'' پر حکیم صاحب نے زبان کی جو غلطیاں نکالی ہیں وہاں یہ بھی دکھایا ہے کہ گلہری کی جگہ مینڈک ہوتا تو بہت لطف دیتا۔ کیونکہ اقبال نے پانی میں ڈوب کر مرنے کی بات کی ہے۔ موصوف کی اس بات سے لطف اندوز ہوتے ہوئے مضمون نگار لکھتے ہیں:

> ''ارشاد ہے کہ ''یہاں مینڈک ہوتا تو بہت لطف دیتا'' لیکن کون کہے کہ حضرت وہ تو پانی کا جانور ہے۔ پانی میں کس طرح ڈوب مر کر آپ کی چشم تماشائی کے

ارمان نکال سکتا ہے۔ اس کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ ''کیا کہنا کی تکرار ناگوار ہے'' افسوس ہے کہ اس ناگواری خاطر کا علاج قطعاً ناممکن ہے۔ کیونکہ غرور اور شعور کے قوافی علیحدہ کر کے صرف ردیف میں تکرار ہوئی ہے اور ردیف کا مکرر آنا فن عروض میں لازمی اور لابدی ہے۔ البتہ حضرت ناقد ردیف ہی کے خلاف ہو گئے ہوں گے اور فن شاعری میں نئی اصلاح چاہتے ہوں تو نہ صرف سر اقبال کی ردیف کو غلط کہنا پڑے گا بلکہ از اول تا آخر تمام اردو اور فارسی شاعری کو حرف غلط کی طرح صفحات کتب وقلوب سے محو کرنا پڑے گا۔'' [۱]

اس کے علاوہ حکیم صاحب نے اس نظم میں عقل اور سمجھ وشعور پر بھی تنقید کی ہے جس کا مضمون نگار نے دلیل کے ساتھ جواب دیا ہے۔

مضمون نگار نے اقبال کی نظم ''گائے اور بکری'' کو بھی اس مضمون میں رقم کیا ہے جس پر موصوف حکیم صاحب نے نظیر اکبر آبادی کے مقابلہ میں رکھنے کے لئے کافی تلاش وعرق ریزی کا ثبوت دیا ہے۔ آخر میں مضمون نگار نے موصوف کے سوالوں کا جواب دیتے ہوئے تحریر کیا ہے:

''میں یہ تسلیم کرنے کے لئے تیار ہوں کہ ڈاکٹر صاحب کوئی مافوق الفطرت ہستی نہیں ہیں۔ غلطیوں کا ان سے سرزد ہونا بالکل ممکن ہے۔ کیونکہ اقلیم سخن میں تقریباً دنیا کے تمام گراں پایہ شعراء معمولی فروگزاشتوں کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ شاعری کی ایک صنف غزل میں محدود رہ کر بندھے الفاظ و محاورات کے ساتھ کلام کو ظاہری عیوب سے پاک وصاف کر لینا کوئی دشوار کام نہیں ہے۔ البتہ مختلف اصناف سخن کے وسیع میدان میں قدم رکھ کر معمولی جزئیات کا سختی سے پابند رہنا نہایت مشکل ہے جس سے نہ کوئی اردو کا شاعر بچ سکا ہے نہ فارسی کا۔'' [۲]

۱۔ معارف، مئی ۱۹۲۸ء، ص ۳۶۹

۲۔ ایضاً، ص ۳۷۲

حکیم صاحب نے علامہ اقبال کی شاعری پر اعتراض کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

''ان کو (ڈاکٹر صاحب) کو عشق سے جھوٹوں سابقہ نہیں پڑا..... مشرقی شاعر کو غزل کہتے وقت ضرور عاشق بن جانا چاہئے ورنہ غزل کہنا چھوڑ دے.....''

مضمون نگار نے حکیم صاحب کے اس مضحکہ خیز خیالات کا جواب کافی مزاحیہ انداز میں دیا ہے۔

''معلوم نہیں حکیم صاحب نے مرض عشق کی حقیقت کیا سمجھی ہے۔ میرے نزدیک تو عشق کی چسک اور تڑپ جس قدر ڈاکٹر صاحب کے اشعار اور قلب میں پائی جاتی ہے، دوسرے شعرا کے کلام میں اس کا ملنا بہت دشوار ہے۔ شاعر کے لئے احساس کا ہمہ گیر ہونا لازمی ہے۔ جو نہ صرف غزل کے دائرہ میں ایک خیالی محبوب تک محدود ہو بلکہ ہمہ تن عشق و محبت سے پر ہو۔ کائنات کے ذرہ ذرہ کو محبت کی نگاہوں سے دیکھے اور ہر واقعہ سے متاثر ہو کر اپنے درد دل کا اظہار کرے اور کوئی شک نہیں ڈاکٹر صاحب سرتاپا درد اور مجسم آرزو ہیں۔ اس لئے قدرت کے ہر منظر سے ہم آغوش ہونے کے لئے بے تاب ہیں۔ ان کا درد عشق جزیرہ، سسلی، تصویر درد، پیام عشق، محاصرۂ ادرنہ، مسلمان شمع اور ترانہ ملی سے بخوبی ظاہر ہو سکتا ہے۔ البتہ بوس و کنار اور ہم آغوشی کے تفصیلی مناظر ضرور موجود نہیں ہیں اور میرے خیال سے ایک مہذب اور مصلح قوم شاعر کا یہ فرض اولین ہے کہ رکاکت و امتذال سے خود بھی بچے اور دوسروں کو بچائے اور اگر سر محمد اقبال صاحب اس عمر میں حکیم صاحب کے اس طبی مشوروں کو قدر کی نگاہ سے دیکھیں تو کیا کہنا۔'' [۱]

۱۔ معارف، مئی ۱۹۲۸ء، ص ۳۷۳

ماحصل

ماحصل

دارالمصنفین کا شمار ہندوستان کے اہم علمی اداروں میں ہوتا ہے۔ یہ ادارہ علامہ شبلی کی علمی، ادبی، تاریخی، تحقیقی، مذہبی، تنقیدی زندگی کی عظیم الشان یادگار ہے۔ دارالمصنفین قائم کرنے کا خیال علامہ شبلی کے ذہن میں ایک تمثیلی شکل میں نمودار ہوا۔ چونکہ علامہ شبلی ایک ایسے ادارے کے خواہش مند تھے جہاں سے مسلمانوں میں بیداری کی لہر پیدا ہو اور انھیں صحیح رہنمائی حاصل ہو سکے۔ اس کے علاوہ تصنیف و تالیف کا بہترین نظم و نسق ہو اور بے غرض ہو کر لکھنے پڑھنے والوں کے لئے سہولیات حاصل ہوں۔ شبلی مسلمانوں کے تئیں ایک ایسی جماعت کے خواہاں تھے، جو مذہب، تاریخ و ادب، تہذیب و تمدن کو اسلامی طرز ادا میں پیش کر سکے۔ انہیں خیالات کی تائید کے لئے ان کے ذہن میں ایک دارالمصنفین کا خیال پیدا ہوا، اور وہ اسے عملی شکل دینے میں منہمک ہو گئے، غرض یہ کہ عوام اسلامیہ کی تالیفات میں رنگ بھرنے کے لئے مولانا شبلی نے دارالمصنفین کے قیام کا فیصلہ کیا۔ تاکہ ایک طرف یہ ادارہ مصنفین کے لئے صحیح تربیت کا کام انجام دے سکے اور ملک میں اعلیٰ درجے کے مصنفین پیدا ہوں۔ جو شبلی کے مقاصد کے پیش نظر اپنی تصنیف و تالیف کا سلسلہ قائم کریں۔ ساتھ ہی مصنفین کی تصنیفی ضروریات و مطالعہ کے پیش نظر ایک وسیع کتب خانہ قائم ہو۔ اور ایسا ماحول پیدا ہو جس سے سبھی لوگ آپس میں استفادہ کر سکیں، ساتھ ہی پریس اور تجارتی مکتبہ کا انتظام خوش اسلوبی سے قائم کر کے مصنفین کو طباعت و اشاعت کی دشواریوں سے بچایا جا سکے۔

دارالمصنفین کے قیام کا مقصد علامہ شبلی کے نزدیک مسلمانوں کے مذہبی علوم کی بقا اور ان کے بزرگوں کی چھوڑی ہوئی علمی دولت کی حفاظت، ان کے اسلاف کے عظیم الشان کارناموں سے آگاہی حاصل کرنا تھا۔ اپنے ان مقاصد کی تکمیل کے لئے شبلی نے ۱۹۱۴ء میں ''الہلال'' کلکتہ کے ذریعہ اس منصوبے کو پورے ملک کے سامنے پیش کیا۔ انگریزی زبان میں بھی اپنے اس خیال کا اظہار کیا۔ اپنے خاص دوستوں کی توجہ اس طرف مبذول کرائی۔ اہل علم نے مولانا کے اس خیال کا پرتپاک خیر مقدم کیا۔

چنانچہ علامہ شبلی نے اپنے وطن اعظم گڑھ میں دارالمصنفین کو قائم کرنے کا فیصلہ کیا، اور اس کے لئے اپنے باغ، بنگلہ اور دوسرے اعزّہ کی اجازت سے خاندان کی زمینیں اور جس قدر کتابیں اس کے پاس دستیاب تھیں دارالمصنفین کے لئے وقف کردیں۔ دارالمصنفین کے لئے کچھ نظم ونسق اور قواعد وضوابط بھی مرتب کئے، لیکن ابھی سب پایہ تکمیل کو پہنچنے ہی والا تھا کہ مولانا شبلی ۱۸ر نومبر ۱۹۱۴ء کو اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔

علامہ شبلی کی وفات کے تیسرے دن ۲۱ر نومبر ۱۹۱۴ء کو ان کی وصیت کے مطابق ان کے ادھورے کاموں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے کے لئے مولانا حمید الدین فراہی اور ان کے تلامذہ نے ایک مجلس ''اخوان الصفا'' کے نام سے تشکیل کی جس کے صدر مولانا حمید الدین فراہی، ناظم مولانا سید سلیمان ندوی، رکن مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا مسعود علی ندوی، مولانا شبلی متکلم، قرار پائے۔ اس مجلس کا اولین مقصد سیرت النبیؐ کی تکمیل اور دارالمصنفین کی تاسیس تھا۔

دارالمصنفین کا بنیادی مقصد اردو زبان کی خدمت اور اس زبان میں علم وادب کی مستند اور محققانہ کتابوں کی طباعت واشاعت تھی۔ اس کے علاوہ عربی وانگریزی کی بھی بہت سی کتابوں کو دارالمصنفین نے شائع کیا۔ اپنے وسیع کتب خانہ، برقی پریس، کمپیوٹر سیٹ کی وجہ سے یہ ادارہ پورے ملک میں ایک انفرادیت کا حامل ہے۔

اس ادارے کے رفقائے کرام واہل قلم دنیاوی مصروفیت سے بے نیاز ہوکر پورے خلوص وسچائی اور سادگی وقناعت کے ساتھ علم کی خدمت میں یکسوئی کے ساتھ لگے ہوئے ہیں۔ اس ادارے سے فارغ طلباء کو تحقیق وجستجو، تصنیف وتالیف، غور ومطالعہ اور وسیع معلومات کے لئے مستعد کیا جاتا ہے۔ ساتھ ہی ان کی ذہنی ودماغی تربیت اور تحریری مشق کے لئے سامان فراہم کیا جاتا ہے۔

دارالمصنفین نے مستند تحقیقی اور قابل قدر کتابیں بھی شائع کیں۔ اس ادارے کے رفقائے کرام نے علم وفن، تاریخ وتحقیق، تنقید، ادب وانشاء کی خدمت کی اور اپنی پوری زندگی دارالمصنفین کے لئے وقف کردی، ان رفقائے کرام میں مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالسلام ندوی، مولانا مسعود علی ندوی،

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی، سید صباح الدین عبدالرحمٰن، مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی، مولانا ضیاء الدین اصلاحی کا نام خصوصیت کا حامل ہے۔ ان رفقائے کرام نے اپنی زندگی کا بیش قیمتی حصہ اس ادارے کے لئے وقف کر دیا۔

مولانا سید سلیمان ندوی کا شمار دارالمصنفین کے معماران اعظم میں ہوتا ہے۔ سید سلیمان ندوی بھی اپنے استاد علامہ شبلی ہی کی طرح جامع الاذوق اور متنوع الکمالات شخصیت کے مالک تھے۔ علامہ شبلی کے زیر تربیت آپ میں مضمون نگاری کا شوق پیدا ہوا۔ ''الندوہ'' میں علمی و تحقیقی موضوعات پر مضامین لکھ کر اپنے جامع الفنون اور بہترین تحریری لیاقت کا ثبوت دیا۔ شبلی نے اپنی مایہ ناز تصنیف سیرت النبیؐ کی تالیف میں آپ کو اپنا لٹریری اسسٹنٹ بنایا اور سیرت کے تکمیل کی وصیت کی۔

استاد کی وفات کے بعد سید سلیمان ندوی صاحب نے شبلی کے تخیل کے مطابق دارالمصنفین کو مولانا مسعود علی ندوی کے انتظامی تعاون، مولانا عبدالسلام ندوی کے علمی اشتراک اور اپنے خون جگر سے بقول سید صباح الدین عبدالرحمٰن (علم کا قرطبہ، فن کا الحمراء اور فضل کا بیت الحکمت بنا دیا) اس طرح یہ ادارہ علامہ شبلی کے تخیل سے بھی آگے بڑھ گیا۔

دارالمصنفین کے تصنیفی کام کا آغاز سید سلیمان ندوی نے اپنے تصنیف ''ارض القرآن'' کی پہلی جلد سے کیا۔ اہل علم کو اس کتاب کی روشنی میں دارالمصنفین کا روشن مستقبل نظر آیا۔ اس کے علاوہ سید صاحب نے مختلف موضوعات پر متعدد کتابیں لکھیں جس میں لغات جدیدہ، سیرت النبیؐ، خطبات مدراس، سیرت عائشہؓ، رحمت عالم، عرب و ہند کے تعلقات، عربوں کی جہاز رانی، خیام، حیات شبلی، اس کے علاوہ مقالات و خطبات و مقدمات کا مجموعہ نقوش سلیمانی بھی کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ مولانا عبدالسلام ندوی بھی دارالمصنفین کے معماروں میں خاص مقام رکھتے ہیں۔ آپ نے دارالمصنفین کے وجود اور تصنیف و تالیف کے علمی و ادبی معیار کو نہ صرف برقرار رکھا بلکہ اسے بلندیوں پر پہنچا دیا۔ آپ نے اپنی صلاحیتوں سے اپنے استاد کے خواب کو شرمندۂ تعبیر کیا اور زندگی کی آخری سانس تک استاد کے مشن کی تکمیل کے لئے

آستانۂ شبلی پر جمے رہے، اور مرنے کے بعد ہی اس سے جدا ہوئے۔ تصنیف و تالیف کے علاوہ کسی اور مشاغل سے آپ کو دلچسپی نہیں تھی۔ زندگی بھر علم وفن کی خدمت سے وابستہ رہے۔ آپ کا قلم علم وادب کے ہر میدان میں رواں دواں رہا۔ عبدالسلام صاحب کی فطرت میں شبلی کا علمی، تحقیقی اور تہذیبی ورثہ شعوری یا غیر شعوری طور پر موجود تھا۔ آپ کا انداز بیان بالکل منفرد اور جداگانہ تھا۔ دارالمصنفین کے طویل قیام میں آپ صرف تصنیف و تالیف کے کام میں مشغول رہے، اور اپنی لامحدود صلاحیتوں کے بنا پر لازوال نقوش یادگار چھوڑے ہیں، جن میں اسوہ صحابہ، اسوہ صحابیات، سیرت عمر بن عبدالعزیز، تاریخ فقہ اسلامی، حکمائے اسلام، امام رازی، ابن خلدون، انقلاب الامم، شعرالہند اور اقبال کامل اپنی مثال آپ ہے۔ شعرالہند تو شبلی کی شعرالعجم کی طرح ہماری اردو شاعری کا بیش قیمتی سرمایہ ہے۔

دارالمصنفین کے معماروں میں مولانا مسعود علی ندوی بھی خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ آپ کے اندر تصنیف و تالیف کا ملکہ تو موجود نہیں تھا، لیکن عزم ونظم کا مادہ اور غیر معمولی انتظامی و تنظیمی صلاحیت کے بنا پر آپ مولانا شبلی کے معتمد خاص بن گئے تھے۔ اور دارالمصنفین کی تاسیس کے بعد اس کا نظم ونسق آپ ہی کے سپرد کیا گیا، جس کو آپ نے اپنی لامحدود صلاحیتوں سے بہت منظم و مستحکم ادارہ بنا دیا۔

مولانا شاہ معین الدین احمد ندوی سید سلیمان ندوی کے جانشین تھے۔ ندوہ سے فارغ ہونے کے بعد سید صاحب کی خواہش پر دارالمصنفین آئے اور زندگی کی آخری سانس تک تحقیق و تدقیق اور تصنیف و تالیف میں لگے رہے۔ مختلف موضوعات پر ایک درجن سے زائد کتابیں اور متعدد مضامین و مقالات لکھ کر علم وادب کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔

سید صاحب کے بھوپال جانے کے بعد عملی طور پر دارالمصنفین کی تمام تر ذمہ داریاں شاہ صاحب کے کاندھوں پر آ گئی۔ سید سلیمان ندوی صاحب کے پاکستان منتقل ہو جانے کے بعد شاہ صاحب شعبۂ علمی کے ناظم بنائے گئے۔ شاہ صاحب تقریباً نصف صدی تک دارالمصنفین سے وابستہ رہے اور اس کی خدمت کو دنیا کا بیش قیمتی عطیہ سمجھا۔ آپ متعدد تعلیمی اور علمی اداروں اور تنظیموں کے رکن تھے۔ شاہ صاحب کی علمی

وادبی خدمات کا اعتراف اہل علم کے علاوہ ارباب حکومت ہند نے ۱۹۷۰ء میں صدر جمہوریہ ایوارڈ برائے ادبی خدمات عطا کر کے کیا۔ شاہ صاحب نے دارالمصنفین کی عزت وعظمت اور اس کی علمی شہرت اور شاندار روایات کو برقرار رکھنے میں کوئی کمی نہیں چھوڑی۔ شاہ صاحب ادیب وانشا پرداز، شعروادب کے رمز شناس، صحابہ کرام کے سوانح نگار، مورخ اسلام، دین رحمت کے شارح، اور معارف کے ایڈیٹر تھے۔ آپ نے شبلی وسلیمان کی علمی روح وروایات کو برقرار رکھنے میں اپنی ساری ادبی وعلمی صلاحیتوں کو صرف کر دیا۔ آپ کی تصانیف میں مہاجرین حصہ دوم، سیر الصحابہ ششم، ہفتم، عرب کی موجودہ حکومتیں، تاریخ اسلام، تابعین، ادبی نقوش، دین رحمت، حیات سلیمان، ان تمام تصنیفات کا شمار دارالمصنفین کے اہم کتابوں میں ہوتا ہے۔

سید صباح الدین عبدالرحمٰن کا نام بھی معماران دارالمصنفین میں ہوتا ہے۔ آپ ملک کے نامور ''صف اول کے ادیب وانشاء پرداز'' کی حیثیت سے مشہور تھے۔ آپ کی علمی وادبی اور مذہبی خدمات کا اعتراف بہت فراخ دلی کے ساتھ آپ کی زندگی میں ہی کیا گیا تھا۔ آپ نے بہت ہی کم مشاہرہ پر صبر کے ساتھ نصف صدی تک دارالمصنفین کی تاریخی، ادبی خدمات انجام دیں۔ اپنے پیش رؤوں کی طرح آپ بھی دارالمصنفین کو اپنا قیمتی اثاثہ سمجھتے تھے۔ اور اپنی ادبی وتحقیقی کاوشوں سے دارالمصنفین کی علمی شہرت کو قائم ودائم رکھا اور اسے ترقی کی طرف گامزن کیا۔

صباح الدین صاحب ہندوستان کے بہت سے علمی، ادبی، مذہبی، اکاڈمیوں، انجمنوں اور سوسائٹیوں کے چیئرمین اور ممبر تھے۔ ان کی خدمات کے پیش نظر حکومت بہار، حکومت اتر پردیش، اردو اکاڈمی یو پی، اردو اکاڈمی بہار اور دوسرے اداروں کی طرف سے آپ کی تصانیف پر انعامات و ایوارڈ ملے۔

فارسی زبان وادب پر مسلمہ قابلیت کے بنا پر ۲۸/مارچ ۱۹۸۱ء کو حکومت ہند نے آپ کو صدر جمہوریہ ایوارڈ سے بھی نوازا۔ آپ نے تقریباً تیرہ سال تک دارالمصنفین کے سربراہ کی حیثیت سے اپنے

اسلاف کے روایات کی پاسبانی کی۔ آپ کو ہر موضوع پر عبوریت حاصل تھی۔ مختلف موضوع پر بہت سی تصانیف کا بڑا وسیع ذخیرہ چھوڑا جس میں بزم تیموریہ، بزم صوفیہ، بزم مملوکیہ، ہندوستان کے مسلمانوں حکمرانوں کے عہد کے تمدنی جلوے، ہندوستان کے سلاطین علما اور مشائخ کے تعلقات پر ایک نظر، ہندوستان امیر خسرو کی نظر میں، ظہیر الدین محمد بابر، ہندوستان کے بزم رفتہ کی سچی کہانیاں، ڈاکٹر سید محمود، ہندوستان کے عہد ماضی میں مسلمان حکمرانوں کی مذہبی رواداری، مولانا محمد علی کی یاد میں، غالب مدح و قدح کی روشنی میں (جلد اوّل دوم)، صوفی امیر خسرو، بزم رفتگاں اوّل دوم، سلاطین دہلی کے عہد میں ہندوستان سے محبت و شیفتگی کے جذبات، اسلام اور مستشرقین، مولانا شبلی پر ایک نظر، اسلام میں مذہبی رواداری، سید سلیمان ندوی کی تصانیف ایک مطالعہ، مغل بادشاہوں کے عہد میں ہندوستان سے شیفتگی و محبت کے جذبات، ان کے علاوہ صباح الدین صاحب نے بے شمار مضامین لکھے۔ شبلی اور سید سلیمان ندوی کی تصانیف کے انگریزی ترجمے بھی کئے۔ سید صباح الدین صاحب کی تاریخ نگاری پر سید سلیمان ندوی کو کافی بھروسہ اور امیدیں تھیں جس کو آپ نے پورا کیا۔ علم وادب، تاریخ و تحقیق، تنقید و صحافت اور تصنیف و تالیف کے ایوانوں میں آپ کی گونج ہمیشہ سنائی دیتی رہے گی۔

مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی نے بھی دارالمصنفین جیسے وقیع، تحقیقی و تصنیفی ادارہ کی سرپرستی کی اور آخیر میں اس کی نظامت کے بار کو بھی سنبھالا، اور نہایت ذوق وشوق کے ساتھ یہاں کے علمی کاموں میں مصروف رہے۔ کسی بھی موضوع کو قلم بند کرتے وقت ایسا انداز اختیار کرتے کہ ان کی بات دل پر اثر انداز ہو جاتی۔ آپ کو یکسوئی کے ساتھ تصنیف و تالیف کی طرف توجہ دینے کا موقع نہیں ملا۔ رسالوں میں منتشر مضامین کے علاوہ مولانا کی جو کتابیں اور رسالے علاحدہ سے شائع ہوئے ہیں، ان سے ایک طرف موضوع کا تنوع ظاہر ہوتا ہے تو دوسری طرف ان موضوعات پر مولانا کی اچھی گرفت کا پتہ چلتا ہے۔ جس میں ہماری بادشاہی، ہندوستان کی کہانی، حدیث نبوی کے اولین صحیفے، عربی زبان کے دس سبق، مثالی حکمراں، دنیا اسلام سے پہلے اور اسلام کے بعد، خصوصیت کے حامل ہیں۔ مولانا ضیاء الدین اصلاحی بھی

دارالمصنفین کے اہم رکن کی حیثیت رکھتے تھے۔ آپ ۱۹۵۷ء میں دارالمصنفین سے وابستہ ہوئے اور شاہ معین الدین احمد ندوی کے زیر تربیت رہے۔ اور انھیں سے تصنیف وتالیف اور ترجمہ خاص طور سے ادب و انشاء کی دلآویزی کا ہنر سیکھا۔ آپ نے بے شمار ادبی وعلمی مضامین و مقالات اور کتابیں تحریر کیں۔ سید صباح الدین صاحب کے بعد دارالمصنفین کی سب سے زیادہ خدمت ۱۹۵۷ء سے ۲۰۰۸ء تک کی، آپ کی تصانیف قرآن وحدیث کی تعلیم، عرب و ہند کے تعلقات، تذکرہ شخصیات، مختلف موضوعات سے متعلق ہیں۔ جن میں ایضاح القرآن، تذکرۃ المحدثین، ہندوستان عربوں کی نظر میں، مسلمانوں کی تعلیم، مولانا ابوالکلام آزاد، مذہبی، افکار، صحافت اور قومی جدوجہد، چند ارباب کمال، انتخاب سہیل وغیرہ خصوصی اہمیت کے متحمل ہیں۔

مولانا اصلاحی نے اپنی پوری زندگی کو دارالمصنفین کے لئے وقف کردیا اور اس کی عزت وعظمت کو برقرار رکھا۔ چراغ سے چراغ روشن رکھنے کی اپنے اسلاف کی روایات کی پابندی کی۔ اس کے انتظام و انصرام کو مضبوط کیا۔ آپ ہندوستان کے ممتاز علمی اداروں کے رکن رکین اور سرپرست تھے، ندوۃ العلماء لکھنؤ، دارالعلوم تاج المساجد بھوپال، مدرسۃ الاصلاح سرائے میر، جامعۃ الفلاح بلریا گنج، مولانا آزاد کالج اسرہٹہ، جامعہ محمدیہ منصورہ مالیگاؤں، اردو اکاڈمی لکھنؤ، ہندوستان اکاڈمی الہ آباد، مجلس تحقیقات و نشریات اسلامی لکھنؤ، اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کورٹ کے ممبر ورکن منتخب ہوئے۔ آکاش وانی گورکھپور کی ایڈوائزری کمیٹی کے بھی ممبر رہے، آپ کی خدمات کا اعتراف بھی اہل علم ونظر نے فراخ دلی کے ساتھ کیا۔ چنانچہ یوپی اردو اکادمی لکھنؤ اور بنگال اردو اکادمی نے انعامات سے سرفراز کیا۔ آل انڈیا میر اکادمی نے آپ کو نوائے میر اور امتیاز میر ایوارڈ سے نوازا۔ سابق صدر جمہوریہ ہند عالی جناب ڈاکٹر شنکر دیال شرما نے اپنے دور صدارت میں مولانا کو صدارتی ایوارڈ سے نوازا اور سند توصیف عطا کیا۔

مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ مذکورہ بالا رفقائے کرام نے دارالمصنفین کو بام عروج پر پہنچانے اور شبلی وسید سلیمان ندوی کی روایات کو برقرار رکھنے کے لئے اپنی زندگی کا بیش قیمتی حصہ دارالمصنفین کی بے

لوث خدمت میں وقف کردیا اور اپنے اسلاف کے کارنامے کو زندہ و تابندہ رکھا۔ دارالمصنفین کے علمی و تحقیقی معیار کو بلند رکھنے کے لئے محنت وعرق ریزی کا مظاہرہ کیا اور اپنی تصانیف کے ذریعہ اس کے وقار و معیار کو بلند کیا۔

اردو ادب کے علاوہ دارالمصنفین نے فارسی وعربی ادب سے متعلق کتابیں بھی شائع کیں۔ اردو ادب سے متعلق کتابوں میں ''موازنہ انیس و دبیر'' جو اردو کی مقبول ترین علمی تنقید کا اولین نمونہ ہے، اس میں شبلی نے اردو کے مشہور مرثیہ گو میر انیس اور مرزا دبیر کے کلام کا آپس میں موازنہ کیا ہے۔ اس میں مرثیہ سے متعلق بہت ہی اہم باتیں ملتی ہیں۔ یہ کتاب تاریخی اور تنقیدی دونوں اعتبار سے اہمیت کے حامل ہیں۔ اس کی اہمیت کا اعتراف بہت سے نقادوں نے بھی کیا ہے۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ کتاب تنقید و تنقیص کا نشانہ بنی۔ علامہ شبلی کو میر انیس کا جانب دار اور وکیل قرار دیا گیا، لیکن ان خامیوں کے باوجود اس کتاب سے بہتر تو کیا اس کے برابر بھی کوئی کتاب آج تک اردو تنقید میں نہیں پیش کی جاسکی۔ یہ کتاب ہماری ادبی تاریخ میں سنگ میل کا درجہ رکھتی ہے۔ شبلی کے مقالات و مکاتیب بھی کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ علامہ شبلی جب تک اپنے منتخب کردہ موضوع کا تنقیدی جائزہ لے کر مطمئن نہیں ہوتے تھے وہ قلم نہیں اٹھاتے تھے۔ آپ کے مقالات کی زبان عالمانہ اور انداز بیان محققانہ ہوتا ہے۔ آپ کی تحریروں میں بے پناہ اعتدال و توازن پایا جاتا ہے۔ آپ کے مقالات میں نہ تو الفاظ کی جلوہ گری ہوتی ہے اور نہ ہی بلا مقصد صنائع و بدائع کا استعمال، آپ جو بھی تحریر کرتے ہیں اعتماد و وثوق کے ساتھ، تاکہ آپ کے قلم سے نکلی ہوئی بات علمی دنیا میں پایۂ اعتبار سے ساقط نہ قرار دی جائے۔ یہی تخلیقی صلاحیت آپ کے معاصرین میں آپ کو بالکل منفرد مقام عطا کرتی ہے۔ علامہ شبلی کے مکاتیب بھی ایک طرف علمی و ادبی معلومات کا ذخیرہ فراہم کرتے ہیں، تو دوسری طرف اپنے دلکش اور پرزور اسلوب بیان کی وجہ سے ادب عالیہ کا نمونہ ہیں۔

''کلیات شبلی'' علامہ شبلی کی اردو شاعری کا مجموعہ ہے۔ علامہ نے اگرچہ فارسی اور اردو دونوں میں

شاعرانہ کمالات دکھائے، آپ کے لئے شاعری ایک تفریحی مشغلہ تھا، جس کی وجہ سے آپ کی شاعری کا سرمایہ بھی محدود و مختصر ہے، لیکن اہم ہے۔ شبلی کی شاعری انقلابی لب ولہجہ کا پیش خیمہ اور گہرے غور وفکر کا نتیجہ ہے۔ آپ کی نظمیں اعلیٰ فنکاری اور اثر آفرینی کی بدولت اردو ادب کا بہترین سرمایہ ناز ہیں، ان میں وہ آفاقی عناصر موجود ہیں جو ہر آنے والے دور میں ان کی اہمیت اور قدر و قیمت کو محفوظ رکھنے کے لئے کافی ہیں۔

''حیات شبلی'' کی تصنیف میں سید سلیمان ندوی نے اپنا پورا تصنیفی کمال اور زور قلم صرف کر دیا ہے۔ سید صاحب کی یہ کتاب سوانحی اعتبار سے کافی اہم ہے۔ اس کتاب کی تالیف کر کے سید صاحب نے استاد کے خواہشات کی تکمیل کی۔ اس میں علامہ شبلی کے علمی و عملی کاموں کا تذکرہ کافی تفصیل سے کیا گیا ہے۔ اس کتاب میں سید صاحب نے علامہ شبلی کی تعریف و تحسین کے ساتھ تنقید کا حق بھی ادا کیا ہے۔ اس کتاب میں علامہ شبلی کی سیرت و عظمت کا درجہ حقیقت میں بلند نظر آتا ہے، لیکن اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ حیات شبلی کی اچھائیوں کو منظر عام پر لانے کی کوشش کی گئی ہے۔ محاسن کے مقابلے میں معائب کا پلڑا بھاری ہے، پھر بھی سید صاحب نے جگہ جگہ شبلی کی خامیوں کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ مثلاً شبلی میں روحانیت کی کمی ہے، وہ پابندیٔ اتقیا اور مذہبی تورع و تقدس جو علمائے دین کا خاصہ ہے، ان میں نہیں تھا۔ حیات شبلی میں سید صاحب نے سرسید کو شبلی کا معاصر ٹھہرانے کے بجائے ان کا مقابل ٹھہرایا ہے اور کئی جگہوں پر انھیں سرسید پر فوقیت بھی دی ہے جس کی وجہ سے یہ کتاب تنقید کا نشانہ بھی بنی ہے۔ لیکن تمام خامیوں کے باوجود ''حیات شبلی'' کی تاریخی حیثیت سے انکار ممکن نہیں۔ اردو سوانح عمریوں کے ذخیرہ میں حیات شبلی اسی طرح ممتاز ہے جیسے ستاروں کے جھرمٹ میں چاند۔ اس کی اہمیت اپنی جگہ مسلّم ہے اور اس کو علی العموم پسند بھی کہا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ شیخ محمد اکرام نے شبلی نامہ میں لکھا ہے کہ ''سید سلیمان ندوی نے حیات شبلی لکھ کر حالی سے وہ تاج فضلیت چھین لیا ہے جو حیات جاوید کی بدولت ان کے سر پر تھا۔''

اقبال کامل بھی دارالمصنفین کی مایہ ناز ادبی تصنیف ہے۔ عبدالسلام ندوی کو اس بات کا احساس ہوا کہ اقبالیات پر بے شمار کتابیں، رسالے اور مضامین ہونے کے باوجود کوئی جامع اور مکمل تصنیف نظر نہیں

آئی جو علامہ اقبال کے بلند و بالا شخصیت کو واضح اور مکمل طور پر نمایاں کر سکے، اور ہر زاویے سے مکمل ہو، مولانا عبدالسلام ندوی نے اس کمی کو پورا کرنے کے لئے یہ کتاب تصنیف کی۔ اس کتاب میں علامہ اقبال کے کلام کی تمام ادبی خوبیوں کو جدید طریقہ تنقید سے منظر عام پر لانے کی کوشش کی ہے۔ ان کی غلطیوں کی نشاندہی کر کے محاسن و معائب کو واضح انداز میں پیش کیا ہے۔

عبدالسلام ندوی کی شعر الہند بھی پہلی اردو شاعری کی تاریخ ہے، جس میں اردو شاعری اور اس کے مختلف اصناف اور مختلف ادوار و ترقی سے بحث کرتے ہوئے اس کے مختلف پہلوؤں پر نہایت سلیقہ کے ساتھ روشنی ڈالنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اور ساتھ ہی تنقیدی نقطۂ نظر سے بھی کام لیا گیا ہے۔ اس کتاب نے علمی و ادبی دنیا کو اپنی طرف متوجہ کیا اور کافی مقبولیت حاصل کی۔ لیکن اہل علم نے جہاں اس کی خوبیوں کو سراہا وہیں اس کی کمیوں کی طرف بھی اشارہ کیا۔ الغرض یہ کتاب اپنی تحقیقی خامیوں، انشاء کی بے کیفیوں، اشعار کی زیادتی اور تنقیدی اختصار کے باوجود اپنی جگہ ایک مکمل تنقیدی کتاب ہے۔

مولانا عبدالسلام ندوی صاحب اور سید سلیمان ندوی صاحب کے مضامین جو انھوں نے معارف میں وقتاً فوقتاً لکھا تھا، دارالمصنفین نے انہیں کتابی شکل میں شاہ معین الدین احمد ندوی سے مرتب کروا کے مقالات عبدالسلام اور مقالات سلیمان (تین جلد) کے نام سے شائع کروا کر ادب کے سرمائے میں گراں قدر اضافہ کیا ہے۔

''حیات سلیمان'' سید سلیمان ندوی کی سوانح عمری ہے۔ یہ کتاب حیات شبلی کے طرز ادا پر لکھی گئی ہے۔ چونکہ اس میں سید صاحب کی تحریروں کے اقتباسات کثرت سے دیئے گئے ہیں، جس کی وجہ سے ایک طرح سے اس کی حیثیت خودنوشت کی بھی ہوگئی ہے۔ شاہ صاحب نے یہ کتاب لکھ کر شائقین کی تشنگی کو دور کر دیا ہے۔ یہ کتاب انشاء اور زبان و بیان کے لحاظ سے بھی بہت اہم اور قابل قدر ہے اور اردو کے سوانحی ادب میں ایک بہترین اضافہ ہے، اور اہل علم اور اصحاب ذوق دونوں کے لئے ایک قیمتی تحفہ ہے۔

حکیم سید عبدالحئی صاحب کی کتاب ''گل رعنا'' کا شمار بھی دارالمصنفین کی ادبی تصانیف میں ہوتا

ہے۔ اردو زبان کی تاریخ میں اس کو کافی اہمیت ہے۔ اس کتاب میں شعراء کا تذکرہ ہے، اس کتاب کا زیادہ تر حصہ آب حیات کا فیض ہے۔ لیکن محمد حسین آزاد کی کتاب کی تقلید کرنے کے باوجود آزاد کی رائے سے انھوں نے جتنا اختلاف کیا ہے، شاید ہی کسی نے کیا ہو۔ زیادہ تر نقادوں کے نزدیک یہ کتاب تنقید سے عاری ہے، لیکن مصنف گل رعنا نے کہیں اس بات کا دعویٰ نہیں کیا ہے کہ وہ تنقیدی کتاب لکھ رہے ہیں یا شعراء کا تذکرہ مرتب کر رہے ہیں۔ اس لئے بار بار اس کتاب کا ذکر کرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس کتاب کی ایک خاصیت یہ ہے کہ اس میں فٹ نوٹس دیئے ہیں جس میں بہت سے ایسے افراد کے حالات ہیں جن کے بارے میں ہماری معلومات بہت کم تھیں۔ دوسری خصوصیت ان شعراء کے کلام کا انتخاب ہے جو اعلیٰ معیار کے ہیں۔ انھوں نے شعراء کے نمائندہ اشعار کو نقل کر کے ان ہی کی روشنی میں شاعری پر رائے زنی کی ہے۔

''غالب مدح وقدح کی روشنی میں'' اس کتاب کو سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب نے کافی غور وخوض ومعروضیت کے ساتھ غالبیات کا تنقیدی جائزہ لے کر قلم بند کیا ہے۔ اس کتاب میں سید صاحب نے کافی محنت اور دیدہ ریزی کے ساتھ غالب سے متعلق کتابوں کا مطالعہ گہرائی وگیرائی سے کیا جو قابل تحسین ہے۔ آپ کی کوششوں سے ایک ایسی کتاب منظر عام پر آئی جس میں غالب موافق ومخالف تحریر کا ایک طویل ذخیرہ موجود ہے۔ اس کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں سید صاحب نے تحریر کی دلکشی اور رعنائی کو ہر حال میں برقرار رکھا ہے۔ یہ کتاب سید صباح الدین عبدالرحمٰن کی ادبی تحقیق وتجزیہ نگاری کا بہترین نمونہ اور غالبیات میں اہم اضافہ ہے۔

اس کے علاوہ سید صباح الدین عبدالرحمٰن صاحب کی کتاب ''حضرت مولانا سید سلیمان ندوی کی علمی ودینی خدمات پر ایک نظر'' بھی اہمیت کی حامل ہے۔ یہ سید صاحب کا مرتب کردہ تین مقالات کا مجموعہ ہے۔ یہ تینوں مقالے سید صباح الدین صاحب نے محمد عمران خاں ندوی کی اجازت سے علاحدہ شکل میں دارالمصنفین سے شائع کرایا۔ ان تینوں مقالات میں سید سلیمان ندوی کی تمام کتابوں پر بحیثیت مجموعی عالمانہ

وناقدانہ تبصرہ کیا گیا ہے۔ یہ کتابچہ سید صاحب کو ایک نگاہ میں سمجھنے کے لئے ممد ومعاون ثابت ہوسکتا ہے۔

''سید سلیمان ندوی کی تصانیف کا ایک مطالعہ'' میں سید صباح الدین صاحب نے سید سلیمان ندوی کے حالات وکمالات کا مختصر مگر جامع مرقع پیش کیا ہے، اور ان کے حسب ذیل پندرہ تصانیف پر تعارف وتبصرہ کیا ہے۔ سید صباح الدین صاحب نے اس کتاب میں ایک ایک تصنیف پر اس طرح روشنی ڈالی ہے، اور اس کے محاسن کو اس طرح بیان کیا ہے کہ پڑھنے والوں پر زیادہ دیرپا اور گہرے اثرات مرتب کرتا ہے، ساتھ ہی تبصرہ نگار کی تعبیر وبیان پر مکمل گرفت، وسعت معلومات اور ادب وانشاء کی حلاوت وشیرینی کا ایک نادر مرقع پیش کرتا ہے۔

عبدالرزاق قریشی صاحب کی کتاب ''مرزا مظہر جانجاناں اور ان کا کلام'' بھی دارالمصنفین کی ادبی تصانیف میں ایک بہتر اضافہ ہے۔ اس کتاب میں مرزا مظہر جانجاناں کے عہد کو سیاسی، معاشرتی لحاظ سے ہندوستان کی تاریخ کا پرآشوب دور بتایا ہے۔ اس کتاب کے مقدمہ میں مغلیہ سلطنت کی پوری تاریخ کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی شاعری کا پس منظر پیش کیا ہے۔ غرض یہ کتاب مرزا صاحب کے حالات و کمالات کو سمجھنے کا بہترین وسیلہ ہے۔

''اردو زبان کی تمدنی اہمیت'' بھی قریشی صاحب کے قلم کی امانت ہے۔ اس کتاب میں قریشی صاحب نے اردو زبان میں ہندوستان کی تمدنی زندگی کے تمام شعبوں کا ذکر کیا ہے۔ شاہ معین الدین احمد ندوی نے ایک مقالہ ''اردو زبان کی لسانی اور تمدنی اہمیت'' کے عنوان سے ہندوستان اکیڈمی الہ آباد کی ایک کانفرنس میں پڑھا تھا جو زیادہ طویل نہیں تھا، لیکن بہت مقبول ہوا۔ قریشی صاحب اس مقالہ سے کافی متاثر ہوئے اور انھوں نے رسالہ نوائے ادب میں علیحدہ علیحدہ ابواب قائم کرکے مضمون لکھنا شروع کیا۔ لیکن وہ اس کو پایہ تکمیل تک پہنچانے سے پہلے اس دار فانی سے کوچ کر گئے۔ ان کی یہ نامکمل سعی جب شائع ہوکر ناظرین کے ہاتھوں میں آئی تو کافی دلچسپی سے پڑھی گئی۔ قریشی صاحب کی یہ کتاب فہرست مضامین کے اعتبار سے طویل ہے جو مصنف کی جانفشانی، وسعت مطالعہ اور تحقیق وجستجو اور لگن کا پتہ دیتی ہے۔ اس

کتاب کے مطالعہ سے اردو بولنے والوں خصوصاً مسلمانوں کی تمدنی اور تہذیبی زندگی کا پورا نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔

مولانا ضیاء الدین اصلاحی کی تصنیف ''مولانا ابوالکلام آزاد، افکار، صحافت اور قومی جدوجہد'' کا شمار دارالمصنفین کی نئی ادبی کتابوں میں ہوتا ہے۔ اس کتاب کو پڑھنے کے بعد اس بات کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ مولانا نے آزاد کے تمام مذہبی افکار و خیالات، صحافتی امتیازات و کمالات، قومی و سیاسی جدوجہد کو حقیقتاً انھیں کی تحریروں اور قولوں کو بنیاد بنا کر لکھا ہے جو اردو ادب کے سرمایے میں ایک بہترین اضافہ ہے۔

اس کے علاوہ یوسف حسین خاں کی کتاب ''اردو غزل'' بھی اپنی نوعیت کی پہلی جامع اور مبسوط کتاب ہے جس میں غزل کی تاریخ و ارتقاء سے بحث کے بجائے اس کی ماہیئت، فنی امکانات، بنیادی و ثانوی موضوعات پر سیر حاصل تبصرہ ہے۔ غزل کے سماجی محرکات اور اس فن کے مستقبل پر یوسف صاحب کے تنقیدی انداز ان کے روشن خیالی کی دلیل ہے۔ یہ کتاب غزل شناسی کے میدان میں کافی اہمیت کی حامل ہے۔

دارالمصنفین سے ادبی، علمی، تنقیدی، مذہبی موضوعات پر کتابوں کی اشاعت کے ساتھ ساتھ ایک علمی رسالے کا اجراء بھی شامل تھا۔ خود علامہ شبلی نے اس کا نام ''معارف'' تجویز کیا تھا۔ لیکن ابتدا میں دارالمصنفین کا اپنا پریس نہ ہونے کی وجہ سے معارف فوراً جاری نہ ہوسکا۔ جون ۱۹۱۶ء میں ادارے کا اپنا پریس قائم ہوا تو رسالے کا اجراء بھی عمل میں آیا، اور معارف کا پہلا شمارہ جولائی ۱۹۱۶ء میں منظر عام پر آیا۔ اس رسالے کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ رسالہ شروع سے آج تک پوری پابندی کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ اردو زبان کا کوئی دوسرا رسالہ شاید ہی اس خصوصیت کا متحمل ہو۔

معارف اس وقت منظر عام پر آیا جب ملک و قوم کو ایک بلند معیار رسالے کی ضرورت تھی۔ اس رسالے کے شائع ہونے پر تعلیم یافتہ طبقہ نے اس کا پُر جوش استقبال کیا۔ اردو کے موجودہ اخبارات و رسائل نے اس رسالے کی حوصلہ افزائی کی۔ معارف بنیادی طور پر ایک علمی رسالہ ہے، لیکن اس کے مضامین میں تنوع پایا جاتا ہے۔ اس میں زیادہ تر مضامین علمی و تحقیقی ہوتے ہیں، لیکن اس میں ادبی مضامین

بھی بڑی تعداد میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ معارف کے ابتدائی دور کے مقالات کافی اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ مقالات قرآن و حدیث، تفسیر، اصول تفسیر، فقہ، فتاویٰ، سیر وسوانح، آثار صحابہ جیسے موضوعات کا احاطہ کرنے کے ساتھ ساتھ فلسفہ، منطق، ہیئت، طب جیسے عقلی علوم کا بھی احاطہ کیا ہے۔ اس کے لکھنے والے زیادہ تر قدیم علوم کے ساتھ ساتھ جدید علوم پر بھی دسترس رکھنے والے اصحاب قلم تھے۔

معارف میں عربی، فارسی اور اردو ادبیات کے موضوعات پر بھی مستقل مقالے ہوتے ہیں۔ رسالے کی نوعیت کو برقرار رکھنے کے لئے اخبار علمیہ اور آثار ادبیہ کے بھی مستقل کالم ہوتے ہیں۔ غرض یہ کہ رسالہ معارف اپنی جامعیت اور افادیت کے لحاظ سے درحقیقت مطالعہ کا عنوان ہے۔

رفقائے دارالمصنفین نے علم وفن، تاریخ وتحقیق وتنقید، ادب وانشاء کی جو بے لوث خدمت کی ہے، اہل علم اس سے اچھی طرح واقف ہیں۔ یہاں کے مصنفین نے تحقیق کی تلاش اور حسن ترتیب میں کافی جانفشانی اور دیدہ ریزی کا ثبوت دیا ہے۔ یہ اہل قلم بغیر تحقیقی سند کے اپنی کوئی بات پیش نہیں کرتے، خواہ وہ کسی بھی موضوع سے متعلق ہو۔ دارالمصنفین نے اپنی تصنیفی صلاحیتوں سے تاریک ذہنوں کو جلا بخشی ہے۔ اس لئے دارالمصنفین کے موجودہ رفقائے کرام پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ آئندہ بھی اپنے اسلاف کے کارناموں کو اہل علم کے سامنے پیش کرنے اور دارالمصنفین کی شاندار روایات کو برقرار رکھنے کی حتی الامکان کوشش کریں گے اور چمنستان شبلی اور سلیمان پر کسی طرح کے حرف کو آنے نہیں دیں گے۔

میں نے اس مقالے میں دارالمصنفین کی مختصر تاریخ، اس کے اہم رفقائے کرام کا ذکر کرتے ہوئے دارالمصنفین کی ادبی تصانیف اور معارف کے اہم ادبی مضامین کا تعارف کرتے ہوئے تحقیقی و تنقیدی انداز میں جائزہ لینے کی ایک معمولی سی کوشش کی ہے۔ لیکن مجھے اس بات کا احساس ہے کہ میری یہ کوشش حرف آخر نہیں، ابھی اس موضوع پر کام کرنے کی گنجائش ہے۔ اس پر مزید کام کیا جاسکتا ہے۔

کتابیات

کتابیات

کتاب	مصنف/مرتب	مطبع	سنہ اشاعت
الف			
آثار اقبال	غلام دستگیر رشید	ادارہ اشاعت اردو، حیدرآباد دکن	۱۹۴۴ء
افکار سلیمانی	مجیب اللہ ندوی	ندوۃ التالیف والترجمہ جامعۃ الرشاد، اعظم گڑھ	۱۹۹۶ء
ادبی نقوش	شاہ معین الدین احمد ندوی	سرفراز قومی پریس، لکھنؤ	ستمبر ۱۹۶۰ء
ادبی اشارے	ڈاکٹر سلام سندیلوی	نسیم بک ڈپو، لاٹوش روڈ لکھنؤ	س ن
اقبال کامل	عبدالسلام ندوی	معارف پریس، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ	۱۹۶۴ء
اردو ادب میں تنقید کی اہمیت	قیوم صادق احمد پوری	مرہٹواڑہ ادبی سرکل احمد پور عثمان آباد، مہاراشٹر	
اردو تنقید نگاری	ڈاکٹر عبادت بریلوی	سود لیتھو پریس، دہلی	ستمبر ۱۹۷۰ء
اردو تنقید پر ایک نظر	کلیم الدین احمد	پٹنہ لیتھو پریس، پٹنہ	۲۰۰۲ء
اردو تنقید میں نفسیاتی عناصر	محمود الحسن رضوی	ادارہ فروغ اردو، امین آباد، لکھنؤ	نومبر ۱۹۶۸ء
اردو غزل	یوسف حسین خاں	معارف پریس، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ	۲۰۱۰ء
اردو غزل کی تنقید	ڈاکٹر شاہدہ بیگم	انٹرنیشنل پرنٹنگ پریس، علی گڑھ	۲۰۰۰ء
اردو سوانح نگاری آزادی کے بعد	حسن وقار گل	ذکی سنز پرنٹرز، آئی چندریگر روڈ، کراچی	۱۹۹۷ء
اسلوب تنقید	عبدالمغنی	عاکف بک ڈپو، مٹیا محل، دہلی	۱۹۸۹ء
اردو میں تنقید	احسن فاروقی	ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ	س ن
اردو تنقید کا ارتقاء	عبادت بریلوی	ایم کے پرنٹرز، ۵۵ چوڑیوالان، دہلی	۱۹۹۶ء
اردو زبان کی تمدنی اہمیت	عبدالرزاق قریشی	معارف پریس، شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ	۱۹۸۲ء
اقبال	مجنوں گورکھپوری	یونین پرنٹنگ پریس، دہلی	اکتوبر ۱۹۵۵ء
ب			
بزم رفتگاں اوّل	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	معارف پریس شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ	۲۰۰۷ء
بانگ درا	محمد اقبال	شیروانی آفسٹ پرنٹرز، دہلی	۱۹۸۲ء

پ

پرانے چراغ	سید ابوالحسن علی ندوی	نامی پریس، لکھنؤ	۱۹۷۵ء

ت

تنقیدات عبدالحق	مولوی عبدالحق	مکتبہ چنگاری، گلی قاسم جان، دہلی	۱۹۵۶ء
تنقیدی سرمایہ	عبدالشکور	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	س ن
تاریخ ادب اردو	رام بابو سکسینہ	بزم خضر راہ، غفار منزل، جامعہ نگر دہلی	اگست ۲۰۰۰ء
تجزیہ تنقید	ناظر کاکوری	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	۱۹۵۸ء
تنقیدی نقوش	ڈاکٹر عبدالقیوم	اعتقاد پبلشنگ ہاؤس، اردو بازار، دہلی	۱۹۷۲ء
تنقیدی اشارے	آل احمد سرور	ادارہ فروغ اردو، لکھنؤ	۱۹۶۴ء
تنقید کیا ہے	آل احمد سرور	لبرٹی آرٹ پریس، مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی	۱۹۹۰ء
تذکرہ سرسید	محمد امین زبیری	لاہور یونائیٹڈ لمیٹیڈ	۱۹۶۸ء
تنقیدیں	خورشید الاسلام	اسرار کریمی پریس، الہ آباد	۱۹۷۷ء

ج

جدید اردو تنقید اصول و نظریات	شارب ردولوی	اتر پردیش اردو اکادمی، لکھنؤ	۱۹۸۱ء

چ

چند ارباب کمال اردو	مولانا ضیاء الدین اصلاحی	معارف پریس شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ	۱۹۸۳ء

ح

حیات شبلی	سید سلیمان ندوی	معارف پریس شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ	اکتوبر ۲۰۰۸ء
حیات سلیمان	شاہ معین الدین احمد ندوی	معارف پریس شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ	۱۹۸۰ء
حیات عبدالحیٔ	سید ابوالحسن علی ندوی	جے کے آفسٹ دہلی	نومبر ۱۹۸۸ء
حضرت مولانا سید سلیمان ندوی علمی و دینی خدمات پر ایک نظر	سید صباح الدین عبدالرحمٰن	معارف پریس شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ	۲۰۰۲

خ

خطوط شبلی	محمد امین زبیری	شمس مشین پریس، آگرہ	س ن

د

دارالمصنفین اعظم گڑھ کی ادبی خدمات ڈاکٹر خورشید نعمانی ردولوی رحیمی پریس، بمبئی ۱۹۷۷ء

دارالمصنفین کی تاریخ اور علمی خدمات اول ڈاکٹر خورشید نعمانی ردولوی معارف پریس شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ ۲۰۰۴ء

دارالمصنفین کی تاریخ اور علمی خدمات دوم ڈاکٹر خورشید نعمانی ردولوی معارف پریس شبلی اکیڈمی اعظم گڑھ ۲۰۰۴ء

دارالمصنفین کی تاریخی خدمات ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی خدابخش اورینٹل پبلک لائبریری، پٹنہ ۲۰۰۲ء

دارالمصنفین کی ادبی خدمات ڈاکٹر شباب الدین اصلیہ آفسٹ پرنٹرس، دہلی ۲۰۰۸ء

س

سرسید کی ادبی خدمات اور ہندوستان کی نشاۃ ثانیہ قدسیہ خاتون اسرار کریمی پریس، الہ آباد س ن

سرسید احمد خاں اور ان کے نامور رفقاء کی نثر کا فنی وفکری جائزہ ڈاکٹر سید عبداللہ ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ س ن

سرسید کی دینی برکتیں عبدالحلیم شرر مطبع کریمی، لاہور ۱۹۱۳ء

سرسید کا اصلاحی مشن ڈاکٹر توقیر عالم فلاحی اردو پرنٹنگ پریس، دہلی ۱۹۹۸ء

سید سلیمان ندوی حیات وخدمات سید محمد ہاشم مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ ۱۹۹۵ء

سید صباح الدین عبدالرحمان ڈاکٹر شہریار احمد طوبی پبلی کیشنز، حیدرآباد جنوری ۱۹۹۹ء

حیات وخدمات

سید صباح الدین حیات اور کارنامے ڈاکٹر خورشید عالم احسان بک ڈپو، لکھنؤ ۲۰۰۹ء

ش

شبلی نامہ شیخ محمد اکرام الواعظ صفدر پریس، لکھنؤ ۱۹۶۵ء

شبلی نعمانی کے مقالات کا تنقیدی جائزہ ڈاکٹر عبدالرحیم انصاری دی آزاد پریس، سبزی باغ، پٹنہ ۱۹۹۰ء

شعرالہند جلد اول مولانا عبدالسلام ندوی معارف پریس شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ ۱۹۴۹ء

شعرالہند جلد دوم مولانا عبدالسلام ندوی معارف پریس شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ ۱۹۵۴ء

شبلی ایک دبستان آفتاب احمد صدیقی ایجوکیشنل پریس پاکستان چوک، کراچی س ن

شبلی نقادوں کی نظر میں ناز صدیقی نیشنل فائن پریس، چارکمان، حیدرآباد ۱۹۷۶ء

ع

علم وحلم وفضل کی شمع فروزاں — ڈاکٹر آدم شیخ — انجمن اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ بمبئی ۲۰۰۱ء
شاہ معین الدین احمد ندوی

علامہ سید سلیمان ندوی شخصیت و ادبی خدمات — نعیم احمد صدیقی — آفسٹ پریس گورکھپور ۱۹۸۵ء

علامہ شبلی معنویت کی بازیافت — ڈاکٹر شباب الدین — معارف پریس شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ ۲۰۰۸ء

غ

غالب مدح وقدح کی روشنی میں جلد اوّل — سید صباح الدین عبدالرحمان — معارف پریس شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ ۲۰۰۵ء

غالب مدح وقدح کی روشنی میں جلد دوم — سید صباح الدین عبدالرحمان — معارف پریس شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ ۲۰۱۰ء

ک

کلیات شبلی اردو — شبلی نعمانی مرتب سید سلیمان ندوی — معارف پریس شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ ۲۰۱۲ء

گ

گل رعنا — حکیم سید عبدالحئی — معارف پریس شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ ۱۳۵۳ھ

م

موج کوثر — شیخ محمد اکرام — فیروز سنز لمیٹڈ، لاہور ۱۹۶۳ء

مسلمانوں کا روشن مستقبل — سید طفیل احمد منگلوری — بدر پریس پرنٹرز لاہور ۱۹۴۵ء

مطالعہ سرسید احمد خاں — مولوی عبدالحق — عامر آفسٹ پرنٹرس، دہلی ۱۹۹۷ء

مکاتیب شبلی اوّل — شبلی نعمانی — معارف پریس شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ ۲۰۱۰ء
مرتب سید سلیمان ندوی

مکاتیب شبلی دوم — شبلی نعمانی — معارف پریس شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ ۲۰۱۲ء
مرتب سید سلیمان ندوی

مطالعہ سلیمانی — مرتبہ مسعود الرحمان ندوی، محمد حسان ندوی — جمال پرنٹنگ پریس دہلی جون ۱۹۸۶ء

مشاہیر کے خطوط — ضیاء الدین اصلاحی — معارف پریس شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ اکتوبر ۱۹۹۲ء

مضامین ڈار — محمد ابراہیم ڈار — ڈار پبلی کیشن، بمبئی س ن

مقالات شبلی جلد اوّل — شبلی نعمانی — معارف پریس شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ ۱۹۳۰ء
مرتب سید سلیمان ندوی

مقالات شبلی جلد دوم	شبلی نعمانی مرتب سید سلیمان ندوی	معارف پریس شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ	۱۹۳۱ء
مقالات شبلی جلد سوم	شبلی نعمانی مرتب سید سلیمان ندوی	معارف پریس شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ	۱۹۳۲ء
مقالات شبلی جلد چہارم	شبلی نعمانی مرتب سید سلیمان ندوی	معارف پریس شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ	۱۹۳۴ء
مقالات شبلی جلد پنجم	شبلی نعمانی مرتب سید سلیمان ندوی	معارف پریس شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ	۲۰۰۷ء
مقالات شبلی جلد ششم	شبلی نعمانی مرتب سید سلیمان ندوی	معارف پریس شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ	۲۰۰۹ء
مقالات شبلی جلد ہفتم	شبلی نعمانی مرتب سید سلیمان ندوی	معارف پریس شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ	۲۰۰۷ء
مقالات شبلی جلد ہشتم	شبلی نعمانی مرتب سید سلیمان ندوی	معارف پریس شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ	۲۰۱۰ء
موازنہ انیس و دبیر	شبلی نعمانی	معارف پریس شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ	۲۰۰۴ء
موازنہ انیس و دبیر	مرتبہ رشید حسن خاں	مکتبہ جامعہ لمیٹیڈ، نئی دہلی	۱۹۶۹ء
موازنہ انیس و دبیر	مرتبہ ڈاکٹر فضل امام	ایجوکیشنل بک ہاؤس، علی گڑھ	س ن
مقالات سلیمان جلد اوّل	سید سلیمان ندوی مرتبہ صباح الدین عبدالرحمان	معارف پریس شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ	۲۰۰۶ء
مقالات سلیمان جلد دوم	شاہ معین الدین احمد ندوی	معارف پریس شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ	۲۰۰۶ء
مقالات عبدالسلام	شاہ معین الدین احمد ندوی	معارف پریس شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ	۲۰۱۱ء
مولانا ابوالکلام آزاد مذہبی افکار	ضیاء الدین اصلاحی	معارف پریس شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ	۱۹۹۸ء
صحافت اور قومی جدوجہد			
مرزا مظہر جانجاناں اور ان کا کلام	عبدالرزاق قریشی	معارف پریس شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ	ستمبر ۲۰۰۴ء
مقدمہ حالی	ڈاکٹر وحید قریشی	ایم کے آفسٹ پرنٹرز چوڑیوالان، دہلی	۲۰۰۲ء

مقالات ہاشمی	نصیرالدین ہاشمی	تاج کمپنی لمیٹیڈ، ریلوے روڈ، لاہور	۱۹۳۹ء
مسلم ثقافت ہندوستان میں	عبدالمجید سالک	دین محمدی پریس، لاہور	اگست ۱۹۵۷ء
مرزا مظہر جانجاناں کا عہد اور ان کی اردو شاعری	سید تبارک علی نقشبندی	ثمر آفسٹ پرنٹرز، دہلی	۱۹۸۸ء
متعلقات شبلی	ڈاکٹر الیاس احمد اعظمی	معروفی کمپیوٹر، اعظم گڑھ	۲۰۰۸ء
مولانا سید سلیمان ندوی کی تصانیف ایک مطالعہ اوّل		معارف پریس شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ	۱۹۸۸ء
مثالی حکمراں	مولانا عبدالسلام قدوائی ندوی	تعلیمات اسلام، امین آباد پارک، لکھنؤ	س ن

رسائل

برہان، دہلی	سعید احمد اکبرآبادی	نومبر ۱۹۵۶ء
نیا دور لکھنؤ	یادرفتگاں نمبر	مارچ تا ستمبر ۱۹۸۸ء
تعمیر حیات لکھنؤ	یادرفتگاں نمبر	۱۹۸۰ء
ادیب، علی گڑھ	شبلی نمبر	۱۹۶۰ء
آج کل		نومبر ۱۹۵۵ء
فکر و نظر، سہ ماہی، علی گڑھ	شبلی نمبر	۱۹۹۶ء
البصیر	شبلی نمبر	۱۹۵۷ء
نقوش	مکاتیب نمبر	
نگار	نیاز فتح پوری	فروری ۱۹۲۶ء
برہان دہلی		اپریل ۱۹۷۴ء
فکر نظر، سہ ماہی، پاکستان	سید صباح الدین عبدالرحمٰن نمبر	۱۹۸۸ء
معارف		جولائی ۱۹۱۶ء
معارف		جولائی ۱۹۱۷ء
معارف		ستمبر ۱۹۱۷ء
معارف		جنوری ۱۹۴۴ء

معارف	جنوری ۱۹۴۵ء
معارف	جنوری ۱۹۵۵ء
معارف	فروری ۱۹۵۵ء
معارف	اکتوبر ۱۹۳۴ء
معارف	اگست ۱۹۶۲ء
معارف	نومبر ۱۹۹۱ء
معارف	جنوری ۱۹۲۲ء
معارف	جنوری ۱۹۹۵ء
معارف	اگست ۱۹۴۵ء
معارف	اگست ۱۹۴۶ء
معارف	اکتوبر ۱۹۴۳ء
معارف	جولائی ۱۹۳۳ء
معارف	اپریل ۱۹۵۲ء
معارف	مئی ۱۹۵۲ء
معارف	جون ۱۹۵۲ء
معارف	جنوری ۱۹۶۳ء
معارف	جولائی ۱۹۸۸ء
معارف	مارچ ۱۹۷۳ء
معارف	اپریل ۱۹۷۳ء
معارف	ستمبر ۲۰۰۰ء
معارف	اکتوبر ۱۹۴۲ء
معارف	نومبر ۱۹۲۹ء
معارف	دسمبر ۱۹۳۷ء
معارف	فروری ۱۹۸۵ء
معارف	جون ۱۹۶۴ء

معارف		اپریل۱۹۵۶ء
معارف		اپریل۱۹۸۸ء
معارف		مئی۱۹۸۸ء
معارف		اکتوبر۱۹۶۳ء
معارف		ستمبر۱۹۹۸ء
معارف		اکتوبر۱۹۹۸ء
معارف		دسمبر۱۹۹۸ء
معارف		اپریل۱۹۵۱ء
معارف		اگست۱۹۷۸ء
معارف		جولائی۱۹۹۵ء
معارف		اپریل۱۹۹۸ء
معارف		مئی۱۹۲۸ء
معارف	سلیمان نمبر	
معارف		جنوری۱۹۵۷ء
معارف		اپریل۲۰۰۸ء
معارف		نومبر۲۰۱۰ء
معارف		مارچ۲۰۰۷ء
معارف		مئی۱۹۸۸ء

THESIS